اسراریہ کشف صوفیہ

1068ھ مطابق 1658ء

تصنیف

سید محمد کمال سنبھلی واسطی

تدوین و تصحیح متن و ترجمہ و حواشی

ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی

اسراریہ کشف صوفیہ

(1068ھ مطابق 1658)

تصنیف

سید محمد کمال سنبھلی واسطی

تدوین وتصحیح متن وترجمہ وحواشی

ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/335روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1884

ASRARIA KASHF-E-SUFIYA

By: Dr. Misbah Ahmad Siddiqi

ISBN :978-93-5160-134-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746 فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: بھارت گرافکس، C-83، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز۔1، نئی دہلی 110020

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

مقدمہ مترجم

سید محمد کمال سنبھلی واسطی ابن سید لعل عہد جہانگیری و شاہ جہانی کے ایک صاحب نسبت نقشبندی بزرگ اور صاحب تصانیف ادیب و شاعر تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب امروہہ کے معروف بزرگ حضرت شاہ شرف الدین حسن معروف بہ شاہ ولایت امروہہ کے تعلق سے خلیفہ چہارم امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے 24 رواسطوں کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔ جو اس طرح ہے

''سید محمد کمال سنبھلی واسطی بن سید لعل بن سید بُدھ بن حامد بن سید چاند بن سید معروف بن سید امجد بن عزیز اللہ (عزیز الدین) بن سید شاہ شرف الدین معروف بہ شاہ ولایت امروہہ بن سید علی بزرگ بن سید مرتضیٰ بن سید ابوالمعالی بن سید ابوالفضل واسطی بن سید داؤد بن حسین بن سید علی بن سید ہارون بن سید جعفر ثانی بن امام علی النقی بن جواد محمد تقی بن امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین شہید بن امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ ورضی اللہ عنہم۔ [1]

---

1 ماخوذ ''اسراریہ کشفِ صوفیہ''

سید محمد کمال سنبھلی کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ شرف الدین حسن شاہ ولایت سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد حکومت (721تا725ھ) میں اپنے والد سید علی بزرگ اور ایک کثیر جماعت کے ساتھ ملتان کے راستہ سے ہندستان تشریف لائے اور سرزمینِ امروہہ پر قیام فرمایا۔ صاحب مقاصد العارفین حضرت شاہ عضد الدین محمد جعفری آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ترجمہ: مخدومی قدس سرہٗ علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے اور شریعت محمدی پر انتہائی ثابت قدم تھے۔ اور کوئی ایک سنت بھی نہیں چھوڑتے تھے'' [1]

حضرت شاہ شرف الدین شاہ ولایت علیہ الرحمہ نے امروہہ میں 739ھ/1330 کو وفات پائی۔ آپ کا مزار مبارک زیارت گاہِ عوام وخواص ہے۔ آپ سے بے شمار خرقِ عادت واقعات وکرامات مشہور ہیں۔

حضرت شاہ ولایت کے پانچویں پوتے سید چاند بعض وجوہ سے امروہہ کی سکونت چھوڑ کر قصبہ بھوج پور چلے گئے تھے وہاں سے حضرت شیخ عمر شہ سنبھلی کے اصرار پر سنبھل ہجرت کی اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں امروہہ کے ایک مؤرخ مولانا آل حسن نخشی لکھتے ہیں:

''(ترجمہ) سید چاند بن سید معروف بن سید مجد الدین بن سید عزیز اللہ بن مخدوم (شرف الدین شاہ ولایت) قصبہ بھوج پور میں سکونت رکھتے ہیں۔ اور وہ اہل معانی تھے انھوں نے نیک اعمال اور کردار کے ساتھ زندگی بسر کی اور شیخ عمر شہ سے قربت کی وجہ سے جو کہ عالم و فاضل تھے سنبھل میں سکونت اختیار کی'' [2]

شیخ عمر شہ سنبھلی نے اپنی بیٹی مسماۃ بی بی خدیجہ کو سید چاند کے صاحبزادے سید حامد کے نکاح میں دے دیا اور تحفتاً ایک حویلی، باغات ودیگر بہت سی جائیداد بی بی خدیجہ کو دی جس کے

---

1 مقاصد العارفین (فارسی) مؤلفہ حضرت شاہ عضد الدین محمد جعفری تدوین پروفیسر نثار احمد فاروقی ص 404 مطبوعہ 1984

2 نخبۃ التواریخ (فارسی) مؤلفہ آل حسن نخشی ص 51 مطبوعہ 1888

بارے میں سید محمد کمال سنبھلی لکھتے ہیں:

"(ترجمہ) بی بی خدیجہ عرشہ کی بیٹی سید حامد کے نکاح
میں آئیں اسی سبب حویلی، باغ املاکِ دیگران بی بی کے نام
کیا۔ اسی وجہ سے اس گھرانے نے سنبھل میں سکونت اختیار
کی۔ آج بھی اس باغ میں آم کے چند پیڑ ہیں جو 'چندن پٹی'
کے نام سے مشہور ہے اور وہ حویلی "سیدواڑہ" کہلاتی ہے۔"[1]

ان ہی سید حامد بن سید چاند کے پوتے تھے سید لعل جو مادرزاد ولی، شریعت وطریقت کے جامع اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ 976ھ/ جنوری 1569 میں آپ کی ولادت ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مرتضیٰ خاں وشیخ سلیم خواہرزادہ مرتضیٰ خاں کی فوج میں ملازمت اختیار کی بعد میں سید بھوہ بخاری کی فوج میں سپاہی کے عہدے پر رہے اور 63 رسال کی عمر میں 12 رر جب 1039ھ/ 18 رفروری 1620 کو شجاعت حیدری کی یاد تازہ کرتے ہوئے کشمیر کے علاقہ خوشاب میں جامِ شہادت نوش کیا۔ وہیں تدفین ہوئی، ان کا مزار مبارک پختہ بنا ہوا ہے اور زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔ اس بارے میں سید محمد کمال سنبھلی لکھتے ہیں:

(ترجمہ) میں 1051ھ (1641) کو سفر قندھار کے دوران
اپنے والد (سید لعل) کی قبر پر گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں
کے لوگوں نے اپنے عقیدے کے مطابق ان کی قبر کو پتھروں
سے آراستہ کر رکھا ہے اور جمعرات و جمعہ کی شب کو اس چہار
دیواری پر چراغاں کرتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں و
مرادیں مانتے ہیں۔[2]

سید لعل شیخ رفیع الدین ابن شیخ قطب عالم ابن شیخ عبدالعزیز چشتی علیہ الرحمہ کے مرید و معتقد تھے۔ سید محمد کمال نے شیخ رفیع الدین کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

---

1 اسراریہ کشف صوفیہ (فارسی) قلمی

2 "اسراریہ کشفِ صوفیہ" فارسی قلمی نسخہ رام پور وندوۃ العلما لکھنؤ۔

''(ترجمہ) شیخ رفیع الدین، میرے والد کے شیخ ہیں۔
میرے والد نے ذکر باطن ان سے حاصل کیا ہے اور اطمینان
قلب وحضور وآگاہی کو پہنچے میرے والد فرماتے تھے کہ میں
اُن کے والد (شیخ قطب عالم) سے ملا ہوں اور بہت سارے
مشائخ کو دیکھا ہے۔'' 1

اسراریہ کشفِ صوفیہ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ سید لعل نے شیخ ابا بکر سنبھلی، شیخ قطب عالم، شیخ عبدالوہاب لونی، شیخ سراج الدین، شیخ فتح اللہ سنبھلی وغیرہ بالخصوص حضرت خواجہ محمد باقی باللہ علیہ الرحمہ سے بھی ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ بلکہ ان کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ انھیں سید لعل کے فرزند تھے سید شاہ محمد کمال سنبھلی واسطی۔

سید محمد کمال سنبھلی واسطی کی ولادت 2/ربیع الاوّل 1011ھ/22/اگست 1602 میں بعہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ محلّہ چودھری سرائے سنبھل میں ہوئی۔ ''اعظم'' مادۂ تاریخ ولادت ہے۔ سید محمد کمال نے اپنی پیدائش اور نام کے بارے میں خود اس طرح وضاحت کی ہے:

''(ترجمہ) 1011ھ ہجری کو میں سنبھل میں پیدا ہوا تو
میرے والد کو دہلی خبر بھیجی اور ان سے کہا کہ اس بچے کا کیا نام
رکھیں۔ آپ نے فرمایا کہ ''محمد'' اور سنبھل میں میرا نام کمال
رکھا گیا تھا۔[2] تو میرے والد مجھے دونوں ناموں
''کمال محمد'' سے پکارتے تھے۔'' 3

سید محمد کمال کی رسم ''بسم اللہ'' 6/رجب 1020ھ/3/اکتوبر 1611 کو نو سال کی عمر میں مہرولی کی مسجد میں (جو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کے مزار مبارک سے متصل

---

1 ''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' فارسی قلمی نسخہ رام پور وندوۃ العلما لکھنؤ۔

2 راقم الحروف نے اپنے اس مقالہ اور اپنی تدوین ''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' میں آپ کا نام احتراماً ہر جگہ محمد کمال ہی لکھا ہے۔ میرے نزدیک محمد بعد میں لکھنا سوئے ادب ہے۔

3 ''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' فارسی قلمی نسخہ رام پور وندوۃ العلما لکھنؤ۔

ہے) ایک بزرگ حضرت شاہ عالم کے سامنے منعقد ہوئی اس بارے میں بھی سید محمد کمال کا بیان ملاحظہ ہو:

''(ترجمہ) 6/رجب کو حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی قدس سرہٗ کے عرس کے دن ان ہی کی مسجد میں جو انھوں نے اپنی زندگی میں تعمیر کرائی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس مسجد کے صحن کے پتھر ان بزرگ (معتقدین) نے اُٹھائے تھے جو ان کے ساتھ رہتے تھے اور اس جگہ رکھے یہ مسجد منور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کے مزار سے متصل ہے۔ خوش نصیبی کہ یہیں ایک بزرگ ''شاہ عالم'' کے ذریعہ میری رسم بسم اللہ ادا ہوئی[1]۔ یہ بزرگ شیخ عبدالعزیز چشتی قدس سرہٗ کی اولاد میں سے تھے۔ یہ دن آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

یہ پوری طرح وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ سید محمد کمال سنبھلی نے کن کن اساتذہ سے کیا کیا پڑھا البتہ ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کے مطالعہ سے ان کے بعض اساتذہ کے نام اور انھوں نے ان سے کیا کیا پڑھا ہے ضرور معلوم ہو جاتے ہیں۔ ''اسراریہ کشف صوفیہ'' میں سید محمد کمال نے مختلف مقامات پر اپنے بعض اساتذہ کرام کا ضمناً ذکر کر دیا ہے۔ جیسا کہ وہ شیخ فتح اللہ سنبھلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''(ترجمہ) میں چھوٹا تھا ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ میرے پڑوسی تھے اور مجھ پر عنایت و مہربانی فرماتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہا کہ آج کل کیا پڑھ رہے ہو، سناؤ۔ میں نے گلستانِ (سعدی) کے یہ دو شعر پڑھے۔ قطعہ

---

1 ''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' فارسی قلمی نسخہ رام پور و ندوۃ العلما لکھنؤ۔

دلقت بچہ کار آید و تسبیح و مرقع　　خود را ز عمل ہائے نکو ہیدہ بری دار
حاجت بکلاہِ برکی داشتنت نیست　　درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار [1]

انھوں نے قطعہ کے معنی بہت ہی عجیب دلائل و دقائق کے
ساتھ بیان فرمائے۔اور بہت خوشی و مسرت کے ساتھ نعرہ لگایا
کہ حاضرین بھی بہت محظوظ ہوئے اور ان کی اس کیفیت پر
تمام حاضرین گرویدہ ہوگئے ،اسی زمانے میں آپ نے مجھے
کسی استاد(شاعر) کا یہ شعر یاد کرایا اور اس کے مفاہیم و
معانی سمجھائے:

[2]
سر برہنہ من نیم دارم کلاہ چار ترک　　ترک دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ خویش و ترکِ ترک"

اس بیان کے بعد سید محمد کمال سنبھلی لکھتے ہیں کہ''میں نے بچپن میں نماز و روزہ کے مسائل انھیں (فتح اللہ) سے سیکھے تھے۔

اسی طرح شیخ سراج الدین اوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''(ترجمہ) میں بچپن سے ان کو جانتا تھا،نو سال کا تھا کہ
انھوں نے مجھے تمام ضروری مسائل و احکام کے ساتھ نماز
سکھائی اور ان کی صحبت سے مجھے بہت فائدہ پہنچا اور
انھوں نے مجھے چند چیزیں بھی پڑھائیں (مثلاً) نزہت
الارواح، و غنیۃ(غنیۃ الطالبین) وغیرہ جس وقت میں ان
سے نزہت الارواح پڑھتا تھا اس وقت وہ بوڑھے ہو چکے

1　ترجمہ: یہ تسبیح و مرقع اور گدڑی کس کام آئے گی۔خود کو ملامت کرنے والے اعمال سے بری کر لے۔ اونی کپڑے کی ٹوپی رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔درویش صفت ہو جا اور ترکی ٹوپی کو چھوڑ۔

2　ترجمہ: میں ننگے سر نہیں ہوں (یعنی بے فکر نہیں ہوں) اپنے سر پر چار ٹوپیاں رکھتا ہوں جو یہ ہیں کہ دنیا کی ہوس چھوڑ دی ہے، عاقبت کی فکر چھوڑ دی ہے،اپنی ذات کی خواہش چھوڑ دی ہیں اور سب سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ یہ مغرورانہ سوچ چھوڑ دی ہے کہ میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔

تھے۔اور (نزہت الارواح کے) حقائق و معارف پر وہ واہ
واہ کرتے اور مست و بےخود ہو جاتے۔"[1]

ایک جگہ سنبھل کے دوسرے بزرگ فتح اللہ سنبھلی (اس نام کے سنبھل میں دو بزرگ گزرے ہیں) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں نے ان سے ادبیات فارسی میں چند چیزیں پڑھیں ہیں خود سید محمد کمال کا بیان ملاحظہ ہو

"(ترجمہ) ان سے بھی چند اسباق فارسی نظم و نثر کے
پڑھے۔اور وہ "اعجاز خسروی" کے مسائل و دقائق کے حل
کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اس کے صنائع بدائع
بیان کرنے میں انھیں بڑا ملکہ تھا۔"[2]

اسی طرح سید محمد کمال ہندی شعر گوئی میں شیخ محمد فاضل ابن شیخ محمد صادق کے شاگرد تھے اس بارے میں بڑے احترام کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں۔انھیں کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"(ترجمہ) محمد فاضل (پسر شیخ محمد صادق) اپنے زمانے کے
جوانوں میں بے مثال عالم ہیں، نیک صحبت اور اچھے شاعر
ہیں، فارسی اور ہندی میں مکمل دسترس حاصل ہے۔میں ہندی
زبان اور اس کے دوسرے فنون میں ان کا شاگرد ہوں۔وہ
عجیب و غریب فنون کے ماہر تھے۔"[3]

فن معما گوئی میں شیخ محمد طیب امروہوی کے شاگرد تھے۔آپ نے شیخ طیب سے معما کہنے کے قواعد وضوابط سیکھے تھے۔ان کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"(ترجمہ) شیخ طیب معما کے فن میں بڑی مہارت رکھتے
تھے۔ایک دن انھوں نے مجھے بھی معما کہنے کے قواعد وضوابط
سکھائے۔میں نے دوسرے دن ہی سات معمے کہے، اور ان

---

1 "اسراریہ کشف صوفیہ" (فارسی قلمی)
2 "اسراریہ کشف صوفیہ" (فارسی قلمی)
3 "اسراریہ کشف صوفیہ" (فارسی قلمی)

کو دکھائے۔ وہ حیران ہوئے اور میری بہت تعریف کی[1]۔''

ان حضرات کے علاوہ بھی سید محمد کمال سنبھلی نے اپنے بعض اساتذہ کرام کے نام لکھے ہیں مگر ان کے بارے میں یہ نہیں لکھا کہ آپ نے ان سے کیا پڑھا۔ جیسا کہ شیخ عیسیٰ سنبھلی و شیخ فاضل اور شیخ عبدالکریم وغیرہ کے بارے میں، شیخ عیسیٰ سنبھلی کے ذکر میں لکھا ہے:

''(ترجمہ) میں نے اگر چہ ان کی شاگردی نہیں کی ہے لیکن ان سے بہت عقیدت رکھتا ہوں اور وہ مجھ پر بہت لطف و مہربانی فرماتے ہیں اور مجھے اس راہ (تصوف) کی ساری اچھی نصیحتیں کرتے ہیں[2]۔''

شیخ ابوالمکارم کے ذکر میں شیخ فاضل و شیخ عبدالکریم کا نام لے کر لکھتے ہیں:

''(ترجمہ) میں برابر شیخ فاضل و شیخ عبدالکریم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں جو کہ میرے استادوں میں سے ہیں۔''

لیکن شیخ عبدالوہاب لونی کے بارے میں بڑی وضاحت سے لکھتے ہیں کہ میں نے ان سے دیوان حافظ پڑھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

''(ترجمہ) وہ (شیخ عبدالوہاب لونی) اسی سال کے تھے اور میں جوان تھا۔ اس وقت میں نے ان سے ''دیوانِ حافظ'' پڑھا ہے۔''

سید محمد کمال سنبھلی واسطی سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت خواجہ عبداللہ معروف بہ خواجہ خرد ابن حضرت خواجہ محمد باقی باللہ معروف بہ خواجہ بیرنگ کے مرید وعقیدت مند اور خلیفہ تھے۔ آپ گیارہ سال کی عمر میں حضرت خواجہ بیرنگ کی صورت حضور سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے پہلی بار خواب میں مشرف ہوئے پندرہ سال کی عمر میں یعنی 1026ھ/1617ء کو اپنے شیخ خواجہ محمد عبداللہ معروف بہ خواجہ خرد سے مسجد فیروزی میں ملے۔ اور ان کے پیچھے عصر کی نماز ادا کی اس وقت خواجہ خرد سولہ سال کے تھے اور سید محمد کمال سنبھلی سے آٹھ مہینے چار دن بڑے تھے۔

---

1 ''اسرار یہ کشف صوفیہ'' (فارسی قلمی) 2 ایضاً

سید محمد کمال سنبھلی لکھتے ہیں کہ انھوں نے مجھ سے معلوم کیا۔ تمھارا کیا نام ہے اور تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے حقیقتِ حال عرض کی۔ پھر انھوں نے دل کو کھینچ لینے والی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور مجھے اپنا دیوانہ بنالیا اور اپنی محبت کے دریا میں اچھی طرح قید کرلیا۔ اس کے بعد میں انھیں دور و نزدیک سے دیکھتا تو ان کے جمال و کمال پر فریفتہ ہو جاتا اور خود سے بے گانہ ہو جاتا۔ اپنے اس حال پر میں نے ایک رباعی کہی ہے کہ:

زاں روز کہ در کوے تو بشتافتہ ام　　روے خود را ز غیر بر تافتہ ام

عشاق جہاں بصورت قانع و بس　　من صورت و معنی بتو دریافتہ ام [1]

سید محمد کمال سنبھلی اپنے پیرو مرشد خواجہ محمد عبداللہ خرد سے انتہاء درجہ کی محبت و انسیت اور عقیدت رکھتے تھے۔ بلکہ یہ محبت و عقیدت عشق کے درجہ میں داخل تھی۔ خواجہ خرد نے انھیں 1035ھ/ 1626 میں خلافت و اجازت سے سرفراز کیا۔ خواجہ محمد عبداللہ خرد بھی سید محمد کمال سے غایت درجہ محبت و انسیت رکھتے تھے، اپنے مکتوبات میں بڑی عزت اور احترام کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں۔ دیکھیے چند مکتوبات کے القاب

1　در خدمت اُخوی سید کمال از مخلص خود سلام و تحیہ قبول نمایند.......

2　برادر با جان برابر................

3　سیدنا مولانا سید کمال................

4　اُخوی اعزی حبیبی سید کمال............

سید محمد کمال ہر سال اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی تشریف لے جاتے مگر 1073ھ/ 1662 میں کسی اہم مجبوری کے سبب اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی نہیں جا سکے تو خواجہ خرد خود سنبھل تشریف لائے اور ایک مہینہ ایک دن سید محمد کمال کے گھر تشریف فرما رہے۔ جب دہلی رخصت ہوئے تو اس کا بیان خود سید محمد کمال سے سنیے:

''چون سال ہزار و ہفتاد و سہ رفتن من بدہلی پیش شیخ خود از

1　اس دن کہ میں تیری گلی میں دوڑا ہوا آیا تھا۔ اور اپنے چہرے کو میں نے غیر سے پھیر لیا تھا دنیا کے تمام عشاق ایک صورت پر قانع ہیں اور بس۔ میں تیری صورت اور تیری اصل جاننا چاہتا ہوں۔

سبب مانع قوی میسر نشده آخر در تاریخ یازدہم ربیع الآخر از
سال مذکور، وے از راہِ لطف وکرم سنبھل تشریف ارزانی فرمود
ومرا نیک بنواخت، مصرعہ

''شاہاں چہ عجب گر بنواز ند گدا را''[1]

و یک ماہ و یک روز بغریب خانہ گذرانده باز بدہلی روانہ شدند
من ہم تا بحسن پور رفتم ۔ وقتے کہ مرا وداع کرد، بکاے بسیار،
بے اختیار برمن غالب آمد ۔ چنانچہ نفس اندرگلومن گرہ می
بست آخر سراین گریۂ غیر معہود معلوم گشت کہ در سال دیگر شیخ مرا
چندین امراض لاحق شد''

''ترجمہ: 1073ھ/1062 کو میں ایک اہم مجبوری کے سبب
اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی حاضر نہیں ہو سکا۔ آخر کار آپ
گیارہ ربیع الاول (1073) کو مجھ پر لطف و مہربانی فرماتے
ہوئے خود سنبھل تشریف لائے اور بہت نوازا۔ مصرعہ

''شاہاں چہ عجب گر بنواز ند گدارا''

آپ ایک مہینہ ایک دن غریب خانہ پر رہے اور پھر دہلی
تشریف لے گئے میں آپ کے ساتھ حسن پور تک گیا۔ جس
وقت آپ نے مجھے رخصت کیا تو مجھے بے اختیار رونا آیا اور
میری آواز گلے میں رُندھ گئی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اس بے پناہ
رونے کا سبب کیا تھا کہ میرے شیخ کو دوسرے سال ہی چند
امراض لاحق ہو گئے۔''

حضرت خواجہ محمد عبداللہ خرد نے 25/جمادی الاول 1074ھ/ 15/دسمبر 1663 کو
وفات پائی۔ ان کا مزار مبارک دہلی میں اپنے والد بزرگوار حضرت خواجہ محمد باقی باللہ معروف بیرنگ

---

1 بادشاہوں سے یہ بات کیا دور ہے کہ وہ گداؤں کو نواز دیں

کے آستانہ میں ہے۔سید محمد کمال نے جب ان کے انتقال کی خبر سنی تو بہت دل برداشتہ ہوئے اور عرصہ تک دیوانوں کی طرح بے چین رہے خود لکھتے ہیں:

''چون این خبر جان کاہ سنبھل رسید، چند روزے من دیوانہ وار مسلوب العقل افتادم و این ماجرا بس دراز است۔''

ترجمہ: جان کو پگھلا دینے والی یہ خبر جب سنبھل پہنچی تو میں کئی دنوں تک دیوانوں کی طرح بے خود پڑا رہا اور یہ معاملہ بہت لمبا ہے (جو بیان سے باہر ہے)

سید محمد کمال نے اپنے زمانہ کے بہت سے مشاہیر صوفیہ کرام کو دیکھا اور ان سے فیض اٹھایا جیسا کہ وہ جگہ جگہ اسراریہ میں لکھتے ہیں بالخصوص حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، مولانا حسام الدین معروف بخواجہ ابرار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، شاہ محمد میر لاہوری، سید احمد غریب، میر محمد مراد بدخشی، مولانا حسن کشمیری، ملا محب علی ٹھٹھی، میر عماد وغیرہ کو آپ نے خوب دیکھا۔ان کی صحبت سے فیض اُٹھایا اور اس پر فخر محسوس کیا۔میں چند ایک کا ذکر کرتا ہوں۔آپ نے خواجہ حسام الدین کی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں ایک مرتبہ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر تھا کہ خواجہ حسام الدین تشریف لائے۔میری طرف دیکھ کر معلوم کیا کہ یہ جوان کون ہے۔میرے شیخ نے عرض کیا کہ میرا نیازمند ہے۔میں انتہائی ادب کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ گھور گھور کر مجھے دیکھ رہے تھے۔آپ نے یہ شعر پڑھا جو مجھے آج بھی یاد ہے

خاک شو خاک تا بروید گل   گل بجز خاک نیست مظہر کل[1]

اسی طرح ایک صوفی بزرگ سید احمد غریب کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''من وے را در سال ہزار و بست داند، ہمان جا دیدہ ام، و وے را ہمہ مدت برفتہ از دنیا۔پیرے بود خمیدہ پشت خداوند اخلاق و کرم و علم و عمل۔من نو جوان بودم، ملازمت وے نمودم و وے ہمیشہ مرا ترغیب بصفت احسان و فتوت نمودے و از صفت ذمیمہ دل آزاری کہ بدترین صفاتست، منع فرمودے و

---

1 خاک ہو جا خاک تا کہ تیرے اندر سے پھول (ثمر) پیدا ہوں۔کیونکہ گل بغیر خاک کے مظہر کل نہیں ہے۔

این دو بیت خواند ے''

در راہِ خدا دو کعبہ آمد منزل   یک کعبۂ صورتست و یک کعبۂ دل
تاتوانی زیارت دلہا کن   کافزوں بود از کعبہ قلوب مقبل[1]

ترجمہ: میں نے ان کو 1020ھ/1610 میں اسی جگہ دیکھا ہے۔ اور آپ اسی زمانہ میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ صاحب اخلاق، صاحب علم وعمل اور مہربانی فرمانے والے بوڑھے (بزرگ) تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ میں جوان تھا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا وہ ہمیشہ مجھے احسان وکرم کی تعلیم دیتے اور دل آزاری جو ایک بدترین صفت ہے اس سے منع فرماتے اور یہ دو شعر پڑھتے

درراہِ خدا.............................

اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''من بارہا بدیدار وے رسیدہ ام واز الطاف واعطاف وے بہرہ ور گردیدہ''

ترجمہ: میں اکثر ان سے ملاقات کے لیے گیا ہوں اور ان کے الطاف ومہربانی سے مشرف ہوا ہوں۔

ادیب وشاعر اور عالم وفاضل ہونے کے ساتھ ہی میدانِ تصوف میں بھی سید محمد کمال کا بڑا مرتبہ تھا۔ وہ فضائل صوری ومعنوی سے پوری طرح متصف تھے۔ اس زمانے کے مشاہیر صوفیہ کرام نے ان کے صاحب رتبہ وصاحب کمال ہونے کی بشارت دی۔ یہاں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

میر سید فیروز سنبھلی کے ذکر میں سید محمد کمال خود لکھتے ہیں:

''میر سید فیروز، روزے مرا گفت کہ مرا (نسبتِ تو) در خواطر

---

1 یہ فارسی زبان وادب کے معروف شاعر وادیب اور صوفی بزرگ خواجہ عبداللہ انصاری کی رباعی ہے جس کا ترجمہ ہے۔ ''خدا کے راستہ میں دو کعبے آتے ہیں ایک کعبہ تو وہ صورت (عمارت) ہے اور ایک کعبہ (انسان کا) دل ہے تجھ سے جہاں تک بن پڑے تو دلوں کی زیارت کر جو کعبہ سے زیادہ مقبول ہے۔

گذرانذم کہ آیا ہیچ نصیبہ ازین راہ دست دادہ است، بدین اندیشہ، شبے بخوابے شدم دیدم بسیارے از مشائخ کبار و فقراء باوقار برصفِ مصلی نشستہ، انتظارِ امام می کشند تا تو رسیدہ وپیش آن جماعہ رفتہ وامام بودہ''[1]

ترجمہ: میر سید فیروز نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ مجھے تمھارے متعلق دل میں یہ آیا کہ تمھیں اس راستے (تصوف) میں کچھ مرتبہ حاصل ہوا ہے کہ نہیں۔ اسی فکر میں رات کو سو گیا خواب میں دیکھا کہ بہت سارے مشائخ (صوفیہ) اور بڑے فقرا صف باندھے بیٹھے ہیں اور امام کا انتظار کر رہے ہیں اتنے میں تم آئے اور اس جماعت کی امامت کی۔

سید محمد کمال سنبھلی واسطی سنّی العقیدہ، حنفی مسلک اور سلسلہ تصوف میں نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور تصوف کے تمام سلاسل میں نقشبندی سلسلے کو سب پر فوقیت دیتے تھے۔ ان ہی کا ایک بیان ''اسراریہ کشف صوفیہ'' سے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''نزدِ اہل دانش وبینش چنانچہ دین محمدی از ادیان ممتاز است و مذہب بوحنیفہ از مذاہب امتیاز دارد، سلسلہ نقشبندیہ از سلاسل دیگر مستثنیٰ است ونسبت این بزرگواران فوق ہمہ نسبت ہاست''[2]

ترجمہ: عاقل اور ہوش مند لوگوں کے نزدیک جیسا کہ دین محمدی تمام دینوں میں ممتاز ہے (اسی طرح) تمام مسلکوں میں امام ابوحنیفہ کا مسلک امتیاز رکھتا ہے تصوف کے سلسلوں میں نقشبندیہ سلسلہ دوسرے سلسلوں سے الگ ہے۔ اور نقشبندی بزرگوں کی نسبت تمام بزرگوں سے اوپر ہے۔

خلافت واجازت: سید محمد کمال سنبھلی کو حضرت خواجہ عبداللہ خرد سے دو سلسلوں نقشبندیہ وقادریہ میں خلافت حاصل ہے۔ ایک جگہ خلافت واجازت ملنے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اہل دنیا کی صحبت چھوڑنے سے جو دولت وسعادت نصیب ہوئی تھی اور طریقہ نقشبندیہ وقادریہ کی تعلیم کی اجازت اور دونوں سلسلۂ شریف کی خلافت سے مشرف ہونے کا یہ مختصر

---

1 بحوالہ اسراریہ کشف صوفیہ   2 ''اسراریہ کشف صوفیہ'' درذکر خواجہ محمد صدیق۔

حال ہے۔اس کی تفصیل میں نے اپنے رسالہ ''سفر وطن''
میں لکھی[1] ہے۔''

ذریعہ معاش

سید محمد کمال سنبھلی اپنے والد کی طرح مغل فوج میں ملازم رہے۔انھوں نے جہاں گیر بادشاہ اور شاہ جہاں بادشاہ کی فوج میں ملازمت کی۔جس کا ذکر اسراریہ کشف صوفیہ میں مختلف مقامات پر ضمناً آیا ہے۔اگر چہ ان بیانات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے باقاعدہ کس سن میں ملازمت شروع کی اور کب ترک کی البتہ حافظ صالح تھانیسری کے ذکر میں رستم خان دکنی کے بارے میں جو ایک بیان دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بائیس سال کچھ مہینے ملازمت کی۔ان کا بیان ملاحظہ ہو:

''من چون پیش ازین بدوازہ سال و دہ سال و چند ماہ باوے
بودہ ام لشکری۔وے مرا لطف بسیار کردے۔''

ترجمہ: جب میں ان سے پہلے (رستم خاں دکنی) بارہ سال اور دس سال چند ماہ ان کے ساتھ ان کی فوج میں سپاہی رہا۔وہ مجھ پر بہت مہربانی فرماتے۔

شیخ عبدالرحیم سنبھلی کے ذکر میں اپنی ملازمت چھوڑنے کا ذکر کیا ہے۔اس عبارت سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کس زمانہ کی بات ہے۔یہ بیان بھی ملاحظہ ہو:

''من باوے سخت دوستم و مرا باوے اتفاقست در ظاہر و باطن۔
تا من لشکری بودم وے لشکری بود۔چون من تارک شدم وے
تارک شد۔وے بمن می گوید۔چون برادر خود را امروز کہ وطن
آشنا ترا دارم و من ہم چنان می دانم و می گویم۔''

ترجمہ: وہ اور میں آپس میں پکے دوست تھے۔مجھ میں اور ان میں اندرونی اور باہری طور پر بہت یکسانیت تھی یعنی جب میں لشکری تھا تو وہ بھی لشکری تھے۔جب میں نے ملازمت چھوڑی تو انھوں نے بھی چھوڑی۔وہ مجھ سے کہتے تھے کہ میں اپنے شہر (سنبھل) میں تجھے اپنے بھائی کے برابر

1 ترجمہ ''اسراریہ کشف صوفیہ''

سمجھتا ہوں۔ میں بھی انھیں اسی طرح مانتا اور کہتا تھا۔

البتہ آپ کے ایک بیان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ 25/سال کی عمر سے پہلے ہی جہانگیر بادشاہ کی فوج میں ملازم تھے۔ اسراریہ میں شیخ فرخ نارلونی کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ

> ''(ترجمہ) جس زمانے میں، میں سید بھوّہ کے ساتھ لشکری تھا تو وہ جہانگیر بادشاہ کے حکم پر دہلی سے رانا کے شہر کو روانہ ہوئے۔ 1036[1] ھ میں جب ہم نارنول پہنچے تو ایک بڑی مجلس دیکھی جس میں سماع میں پھول اور خوشبوؤں کا بہت زیادہ استعمال ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس طرح کی مجلس ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ آج ''گل شیخ فرخ'' کا عرس ہے۔''

اسراریہ کشف صوفیہ کے ایک اور بیان سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ سید محمد کمال 40/سال کی عمر تک تو ہر حال میں فوجی ملازمت میں تھے۔ یہ بیان بھی قابل ذکر ہے۔ شاہ دولہ کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

> ''(ترجمہ) میں 1051[2] ہجری میں قندھار سے واپسی پر غزنین کے راستے کابل پہنچا۔ اور اس اثنا میں ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ اس قبر پر کوئی عمارت، کوئی سجاوٹ اور کوئی چبوترہ وغیرہ نہیں تھا۔ اس کی قبر نو کیلے پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔''

وفات واولاد

سید محمد کمال سنبھلی نے کب وفات پائی اس کی تحقیق باوجود تلاش کے ابھی تک نہیں ہو سکی۔ ایک روایت کے مطابق اتنا ضرور معلوم ہوا کہ آپ کا مزار چودھری سرائے سنبھل کے قبرستان میں ہے۔ سڑک کے کنارے ہے۔

---

1 اس وقت آپ کی عمر، تاریخ ولادت کے اعتبار سے 25/سال ہوگی۔

2 1011ھ تاریخ پیدائش کے حساب سے اس وقت آپ کی عمر 40/سال ہوتی ہے۔

سید محمد کمال سنبھلی واسطی کے چار فرزند تھے۔ جن کے نام مختلف مقامات پر اسراریہ میں یہ آئے ہیں۔ سید کاظم (پیدائش 1035ھ) سید اعظم، وحید الدین سید ابوالمعالی، وسید عبدالوالی۔ مورخ امروہہ محمود احمد عباسی نے ''تحقیق الانساب'' میں ان چاروں فرزندوں کے نام لکھے ہیں۔ سید محمد کمال، ابا بکر سنبھلی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے مجھے میرے بچپن میں بشارت دی تھی کہ تمھارے چار بیٹے ہوں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان بیٹوں میں سید اعظم، سید محمد کمال کی زندگی ہی میں لاولد انتقال فرما گئے تھے۔ سید محمد کاظم کے ایک بیٹے علی رضا تھے۔ علی رضا کے سید حمزہ اور سید حمزہ کے ایک فرزند نذر علی اور نذر علی کے بھی ایک ہی بیٹے علی احمد ہوئے۔ علی احمد کے ایک دختر مسماۃ وزیر النساء تھیں۔

سید محمد کمال کی تصانیف

سید محمد کمال سنبھلی واسطی ایک اچھے قلم کار صاحب طرز ادیب اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کے علاوہ پانچ تصانیف اور ہیں جو ابھی تک پردہ اسرار میں ہیں۔ اسراریہ میں بعض جگہوں پر ان تصانیف کے نام آئے ہیں اور اسی سے ان کے بارے میں کچھ مختصر معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں۔ جو یہاں تحریر کی جاتی ہیں۔

1۔ جمع الجمع:

یہ کتاب سید محمد کمال کی ''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' سے پہلی تصنیف ہے جو بزرگانِ دین کے حالات اور تصوف کے رموز و نکات پر مشتمل ہے۔ اسراریہ میں اس کتاب کا ذکر مختلف انداز میں چھ مرتبہ آیا ہے۔ یہ کتاب خاصی ضخیم بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے ذکر میں انھوں نے اسراریہ میں اکثر جگہ یہ لکھا ہے کہ اس واقعہ کی تفصیل میں نے ''جمع الجمع'' میں لکھی ہے۔ یعنی ''اسراریہ کشف صوفیہ'' جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے وہ اس کے مقابلے مختصر ہے۔ تفصیل ''جمع الجمع'' میں ہے۔ یہاں صرف ایک عبارت جو انھوں نے ''اسراریہ کشف صوفیہ'' میں اپنے والد کی شہادت کے بارے میں لکھی ہے۔ یہاں نقل کرتا ہوں۔ جس سے معلوم ہوگا کہ ''جمع الجمع'' نہ صرف تفصیلی بیانات پر مشتمل ہے بلکہ ''اسراریہ کشف صوفیہ'' سے پہلے لکھی گئی ہے۔

''مجملے این قصہ درخاتمہ بیاید و تفصیل آن من در نسخہ

''جمع الجمع'' کہ پیش ازین سالہا نوشتہ ام۔''

ترجمہ: مختصراً یہ قصہ اس کتاب (اسراریہ) کے آخیر میں آئے گا اور اس کی تفصیل ''جمع الجمع'' (میں دی) ہے جو اس سے کئی سال پہلے میں نے لکھی ہے۔

اسراریہ کشف صوفیہ کے آخری صفحات میں آپ نے اپنے والد سید لعل کی شہادت اور اس سے متعلق چند اہم واقعات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

2 سفروطن

یہ کتاب سید محمد کمال سنبھلی واسطی کے اسفار کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ سید محمد کمال نے اپنی زندگی میں جہاں جہاں کا سفر کیا اس شہر میں جن صوفیہ، علما اور شعرا سے ملاقاتیں کیں۔ سفر میں کیا کیا عجائبات دیکھے اور کن کن دشواریوں سے گزرے ان تمام کی تفصیلات اس کتاب ''سفروطن'' میں درج ہیں۔ سید محمد کمال نے سمرقند، بخارا، غزنین، لاہور، دہلی، سہارنپور، برہانپور، کشمیر، بنگال، اجین، جالندھر، گوپامئو، فریدآباد، فیروزآباد، گڑمکتیسر، حسن پور، امروہہ، مرادآباد وغیرہ کے سفر کیے۔ ان ہی اسفار کی تفصیل اس کتاب میں پیش کی ہے۔ اس کتاب کا ذکر اسراریہ کشف صوفیہ میں دو مرتبہ آیا ہے۔ اور اسراریہ کے تینوں نسخوں میں اس کا نام ایک جگہ ''سفروطن'' اور دوسری جگہ ''سفر: روطن'' درج ہے۔ یہ کتاب بھی ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کے مقابلے ضخیم معلوم ہوتی ہے۔

3 پیم چرت

پیم چرت سید محمد کمال سنبھلی واسطی کی تیسری تصنیف ہے جو آپ کا منظوم ہندی کلام ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سید محمد کمال عربی، فارسی، ہندی، پنجابی اور پشتو کے قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ ان کے ایک معاصر مورخ کا کہنا ہے کہ وہ فارسی سے بہتر ہندی زبان کے شاعر ہیں۔ سید محمد کمال سنبھلی، خود سنبھل کے ایک شاعر مشفی سنبھلی کے ذکر میں خواجہ محمد یعقوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خواجہ محمد یعقوب پسر خواجہ محمد صادق طفاے شیخ من کہ
جوانیست فہمیدہ وسنجیدہ فقراء خود دیدہ را تاریخ نوشتہ بہ عبارتے

شیرین۔ واندرین تاریخ من فقیر عاجز را ہم آوردہ ونسبت من
ہم نوشتہ کہ شعر ہندی وے بہ از فارسی ویست[1]"

ترجمہ: خواجہ محمد یعقوب جو میرے شیخ کے ماموں خواجہ محمد صادق کے بیٹے ہیں۔ جوان سمجھدار اور سنجیدہ ہیں۔ آپ نے جن صوفیہ کو دیکھا ہے ان کی ایک تاریخ بہت اچھے انداز میں لکھی ہے اور اس تاریخ میں مجھ فقیر عاجز کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی ہندی شاعری فارسی شاعری سے بہتر ہے۔

پیم چرت منظوم ہندی زبان میں عقل وعشق کے مباحثہ، تصوف کے رموز و نکات اور معارف پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ذکر بھی اسرار یہ میں تین مرتبہ آیا ہے۔ ایک عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے جس سے اس کتاب کا موضوع اور نام معلوم ہوتا ہے۔

"من آن سید ضیاء الدین را اولاً در امروہہ دیدہ ام، ہنگامۂ
عرس شیخ ابن۔ سروپا برہنہ وتہبند کے در زیر۔ آزادانہ ومستانہ
درآمد رو بروے من نشست۔ من رسالہ "پیم چرت" ہندئ
خود می خواندم، وے نیک شنودن گرفت تا دریافتم کہ وے
صاحب دریافت است[2]"

ترجمہ: میں نے ان سید ضیاء الدین کو پہلی مرتبہ امروہہ میں دیکھا شیخ ابن کے عرس کے موقع پر جو سر سے پیر تک ننگے تھے۔ صرف ایک لنگوٹ بندھا تھا۔ وہ مستانہ انداز میں بے دھڑک آئے اور میرے سامنے بیٹھے۔ میں اپنا رسالہ "پیم چرت" ہندی پڑھ رہا تھا۔ انھوں نے دھیان سے سننا شروع کیا تب میں نے جانا کہ وہ صاحب علم، دل والے ہیں۔

4. پیم اشلیکہ

سید محمد کمال کا یہ رسالہ بھی ہندی زبان میں منظوم تصنیف ہے۔ جو سلوک کے دس مراتب پر مشتمل ہے اور اس کے اکثر اشعار "اسراریہ کشف صوفیہ" کے مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ سید محمد کمال سنبھلی کا بیان ہے کہ "شیخ ملا ظاہر پانی پتی جو اشلیکہ کے فن میں ماہر تھے ان کی

1 اسراریہ کشف صوفیہ (فارسی قلمی) 2 ایضاً

صحبت میں، میں اس فن سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور بہت سے اشعار اس فن میں کہے اور جمع کیے بعد میں اس مجموعہ کا نام ''پیم اشلیکہ'' رکھا۔ اور اپنے شیخ کے سامنے پڑھے وہ بہت زیادہ خوش اور متاثر ہوئے۔ اس کتاب کا ذکر اسراریہ میں صرف دو مرتبہ آیا ہے جو اس طرح ہے:

''....وقت مرا این طرز خوش آوردہ بود تمام رسالہ بہندی اشلیکہ گفتم مشتمل بر مراتب عشرہ سلوک و جذبہ توحید مسمّی بہ ''پیم اشلیکہ'' چون پیش شیخ خود عرض کردم نیک پسند فرمود''[1]

ترجمہ: اس وقت مجھے یہ طرز بہت پسند آئی۔ میں نے ایک مکمل رسالہ ہندی اشلیکہ کہا۔ جو سلوک اور جذبہ توحید کے دس مراتب پر مشتمل ہے اس کا نام ''پیم اشلیکہ'' رکھا۔ جب اپنے شیخ کے سامنے پڑھا تو انھوں نے بہت پسند فرمایا۔

5. پیم امابن

یہ رسالہ بھی ہندی زبان میں منظوم تصنیف ہے رموزِ تصوف اور سلوک و احسان کے واقعات پر مشتمل ہے۔ سید محمد کمال سنبھلی میر عماد کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے یہ تینوں رسالے پیم چرت، پیم اشلیکہ اور پیم امابن میر عماد کو سنائے وہ بہت زیادہ خوش اور مسرور ہوئے۔ خود سید محمد کمال سنبھلی کا بیان ملاحظہ ہو:

''....شبے بار دیگر در خانقاہ شیخ من باوے صحبتِ اشعار ہندی بمیان آمد من رسالہ پیم چرت، پیم اشلیکہ و پیم امابن خود، بروے خواندم بسیار خوش وقت شد۔''

ترجمہ: ایک رات میرے شیخ کی خانقاہ میں پھر اِن (میر عماد) کے سامنے ہندی شاعری کا ذکر آیا میں نے اپنے رسالے پیم چرت، پیم اشلیکہ، اور پیم امابن ان کو سنائے وہ بہت خوش ہوئے۔

6. رسالۂ اعظم

ان نثری و منظوم تصانیف کے علاوہ سید محمد کمال سنبھلی کی ایک اور اہم نثری تصنیف

---

1 اسراریہ کشف صوفیہ (فارسی قلمی)

''رسالۂ اعظم'' بھی ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کی وفات پر لکھی جس میں سید اعظم کے حالات و کوائف اور میدانِ تصوف میں ان کے کمالات و درجات کا بیان ہے۔ یہ کتاب 9/ستمبر 1648 کے بعد کی تصنیف ہے کیونکہ ان کے بیٹے سید اعظم کا انتقال 1648 میں ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو سید محمد کمال کا بیان:

''آن روز پنج شنبہ سیزدہم رمضان از سال ہزار و پنجاہ و ہشت
بہوش تمام در یادِ خدا و شیخ من برفتہ۔ من تفصیل احوالِ وے در
رسالہ عظیمہ کہ خاص بنام وے است نوشتہ ام''

ترجمہ: آج جمعرات کے دن 13/رمضان 1058ھ (9/ستمبر 1648) کو وہ (سید اعظم) پورے ہوش و حواس کے ساتھ اللہ اور میرے شیخ کو یاد کرتے ہوئے چلا گیا۔ میں نے اس کے احوال کی ساری تفصیل ایک بڑے رسالہ میں جو اُسی کے نام سے (رسالۂ اعظم) ہے میں لکھی ہے۔

اس طرح سید محمد کمال سنبھلی واسطی کی کل تصانیف کی تعداد مع اسراریہ کشف صوفیہ سات ہوتی ہے۔ مگر ''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' کے علاوہ تمام تصانیف نہ صرف پردۂ اسرار میں ہیں بلکہ ابھی تک اسراریہ کے ان حوالوں کے علاوہ ان کا نام و نشان تک نہیں معلوم۔[1]

اسراریہ کشفِ صوفیہ

اسراریہ کشف صوفیہ سید محمد کمال سنبھلی کی مشہور و معروف تصنیف ہے جو انتہائی عالمانہ و محققانہ تاریخ و تذکرہ ہے۔ جس میں بے شمار نادر و نایاب تاریخی احوال مندرج ہیں۔ بعض ایسے صوفیہ، علما اور شعرا کے حالات بھی اس میں محفوظ ہیں جو ہمیں کسی بھی دوسرے تذکرے یا تاریخ میں نہیں ملتے۔ اسراریہ شمالی ہندستان کے مشاہیر صوفیہ کرام کے حالاتِ زندگی اور میدانِ تصوف میں ان کے مقام و مرتبہ نیز صوفیانہ رموز و نکات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سید محمد کمال نے ان صوفیہ کے حالات زیادہ تفصیل سے نقل کیے ہیں جن سے وہ خود ملے یا اس صوفی بزرگ کے کسی مرید نے وہ حالات قلمبند کرائے۔ اس میں ہندو جوگیوں کے حالات بھی لکھے ہیں یہ بھی اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ دوسرے اپنے زمانہ کی صوفی عورتوں اور مجذوبوں کے حالات بھی خاصی تفصیل سے ملتے ہیں۔

---

1 نوٹ: اگر کسی صاحب علم کو ان تصانیف کا کوئی سراغ لگے تو احقر کو ضرور اطلاع دیں، عین نوازش ہوگی۔

اس طرح اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ ایک بہت ہی اہم خصوصیت ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کی یہ ہے کہ ہمیں عہد وسطیٰ کے میدانِ تصوف کے اہم مراکز اور اہم صوفیہ کے حالات تو اکثر تاریخ اور تذکروں میں مل جاتے ہیں مگر علاقائی اور مقامی صوفیہ کے اہم مراکز اور صوفیہ کے حالات صرف اسی سے ملتے ہیں۔ اس کی زبان نہایت سادہ روان اور آسان ہے۔ سید محمد کمال کو فارسی نثر لکھنے پر اچھی قدرت و دسترس حاصل ہے۔ جہاں جہاں تصوف کے اہم نکات بیان کیے ہیں وہاں عبارت ضرور کچھ صقیل اور علمی انداز کی ہوگئی ہے۔ امروہہ کے نامور عالم وادیب مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ اسراریہ کشف صوفیہ اور اس کے مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''...... یہ کتاب گیارھویں صدی ہجری کی ایک بہترین تاریخ
ہے مگر افسوس ہنوز طباعت سے آشنا نہیں ہوسکی۔
.... سید محمد کمال ایک اچھے ادیب اور مصنف معلوم ہوتے ہیں۔
...... اسراریہ کا طرزِ نگارش بڑا عجیب اور دل کش ہے۔ بات
میں سے بات نکالتے ہیں...... اگر اسراریہ شائع ہو جاتی تو
گیارہویں صدی ہجری کے رجال کی بڑی کافی معلومات
مورخین زمانہ کو میسر آجاتیں۔[1]''

اسی طرح پروفیسر نثار احمد فاروقی ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''سید کمال سنبھلی کی فارسی تالیف ''اسراریہ'' جو بدقسمتی سے آج
تک شائع نہیں ہوسکی، تاریخ اور تذکرے کی بہت اہم اور بیش
قیمت معلومات سے بھرپور کتاب ہے۔ اس سے اس عہد کے
کتنے ہی بزرگوں کے وہ حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں جو کسی
دوسرے ماخذ میں نہیں ملتے۔ اب فارسی سمجھنے والے تو کہاں
رہے، اگر اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہی ہو جاتا تو ہماری
تاریخ کے مصادر میں ایک نہایت وقیع اضافہ ہوگا۔[2]''

---

1 تذکرہ خواجہ باقی باللہ۔ مؤلفہ مفتی نسیم احمد فریدی ص 39-40

3 پیش لفظ۔ تاریخ سنبھل یعنی مصباح التواریخ۔ ص 20 مؤلفہ مولانا عبدالمعید صاحب سنبھلی۔

سید محمد کمال سنبھلی نے مندرجہ ذیل دیار و امصار کے مشاہیر صوفیہ، علما، شعرا اور مجاذیب کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً سنبھل، سرسی، مراد آباد، امروہہ، حسن پور، دہلی، آنولہ، بریلی، اناؤ، اجین، میرٹھ، سہارن پور، سندیلہ، گنتور، گوپاموٴ، بلگرام، ہرگاؤں، لونی، نارنول، الہ آباد، لاہور، سندھ، پنجاب، گجرات، پانی پت، قندھار، غزنی و کابل وغیرہ۔

اسراریہ میں تقریباً دو سو نوے شخصیات کے حالات فہرست کے حساب سے ہیں اور اتنے ہی لوگوں کے کوائف و تعلیمات ضمناً تحریر ہیں ان لوگوں کے نام فہرست میں نہیں ہیں اس طرح ان شخصیات کا شمار بارہ سو کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک سو پندرہ اماکن کے نام ملتے ہیں، اسراریہ میں جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے وہ تقریباً سولہ ہیں یعنی نفحات الانس، رسالہ قشیریہ، فوائد الفواد، رشحات، کشف المحجوب، اخبار الاخیار، تاریخ مشتاقی، گلستانِ سعدی، بوستانِ سعدی، فتوحات، فصوص الحکم، سیر العارفین، ثمرات القدس، تاریخ فیروز شاہی، دیوان حافظ وغیرہ اور جن کتب کے نام مختلف وجوہات کی بنا پر اس کتاب میں آئے ہیں ان کا شمار ایک سو تین ہے۔

سید محمد کمال سنبھلی اگرچہ خود نقشبندیہ سلسلہ میں مرید تھے اور اس سلسلہ میں انھیں خلافت و اجازت بھی حاصل تھی مگر انھوں نے اپنی تالیف ''اسراریہ کشف صوفیہ'' میں چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، شطاریہ، غوثیہ اویسیہ وغیرہ تمام سلاسل کے صوفیہ کرام کا ذکر کیا ہے۔ اور اکثر جگہ ان کی تعلیمات و عقائد سے بھی بحث کی ہے اور اکثر صوفیہ کے ملفوظات اور کلمات صادقہ تحریر کیے ہیں۔

سید محمد کمال سنبھلی نے یہ کتاب اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ عبداللہ خرد کے حکم و اشارے پر بعہد ابوالمظفر شہاب الدین شاہ جہاں بادشاہ صاحب قران ثانی 1068ھ/ 1657 میں ستاون سال کی عمر میں لکھنی شروع کی اور ایک سال کی قلیل مدت یعنی 1069ھ/ 1658 میں اس کو مکمل کیا۔ ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کے آخیر میں خود سید محمد کمال نے قطعۂ تاریخ بھی لکھا جو مندرجہ ذیل ہے

این نسخۂ ذکر اہل دلہاء کرام — کزوی ہمہ بوی اُنس آید بمشام
زان بوی رسید بادۂ مقصود بکام — در سال ہزار و شصت و نہ گشت تمام

1069ھ

''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' اس کا تاریخی نام ہے جس سے 1068ھ سن برآمد ہوتا ہے جو اس کے آغاز کا سن ہے۔ اختتام کا نہیں۔ مؤلف اسراریہ کا خود کا بیان جو انھوں نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے اس طرح ہے کہ:

> ''ترجمہ: اکثر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ان برگزیدہ ہستیوں کے احوال پر ایک کتاب آسان اور مختصر طور پر لکھوں مگر دنیاوی مصروفیات نے مہلت نہیں دی اب 1068ھ میں اپنے پیر و مرشد کے حکم و اشارے پر میں نے اس کتاب کو پوری طرح خلوص نیت سے لکھنا شروع کیا اور اس کتاب کا نام ''اسراریہ'' رکھا جس کا پورا تاریخی نام ''اسراریہ کشف صوفیہ'' (1068ھ) ہے۔''

مگر انتہائی تعجب وحیرت کی بات ہے کہ ''اسراریہ کشف صوفیہ'' ابھی تک مؤرخین زمانہ کی نظروں سے اوجھل رہی صرف امروہہ میں علامہ محمود احمد عباسی نے اس کتاب سے بطور خاص استفادہ کیا ہے۔ اگرچہ امروہہ کے ہر مؤرخ نے اسراریہ کا ذکر کیا ہے۔ امروہہ سے باہر صرف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ وحضرت مولانا عبدالحی لکھنوی مؤلف ''نزہۃ الخواطر'' اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اس سے استفادہ کیا۔ سنبھل والوں کو ابھی تک اسراریہ کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہے جب کہ یہ کتاب سنبھل میں لکھی گئی اور سب سے زیادہ ذکر اس میں سنبھل اور وہاں کے صوفیہ اور شعرا کا ہے۔

''اسراریہ کشف صوفیہ'' کے اب تک تین قلمی نسخے معلوم ہیں جن میں سب سے قدیم ترین نسخہ اب تک کی معلومات کے مطابق نیشنل میوزیم دہلی میں محفوظ ہے۔ جس کو امروہہ کے معروف نوادر فروش جناب توفیق احمد قادری چشتی نے 6/فروری 1983 کو نیشنل میوزیم میں محفوظ کرایا۔ یہ مخطوطہ چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ خط شکستہ اور باریک ہے۔ ہر صفحہ 21/سطری ہے۔ یہ نسخہ سب سے پہلے امروہہ میں حکیم محبت علی خاں عباسی، صاحب ''آئینۂ عباسی'' کے پاس رہا ہے۔ اس پر انھوں نے اپنے قلم سے بہت سے حاشیے بھی لکھے۔ اس کے بعد عبدالرحیم برتر امروہوی صاحب ''تاریخ واسطیہ'' کے پاس رہا آخیر میں مؤرخ امروہہ محمود احمد عباسی نے اس سے بہت

زیادہ استفادہ کیا۔ ''تذکرۃ الکرام'' میں امروہہ کے بہت سے صوفیہ کے حالات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ان کے بعد یہ نسخہ جناب توفیق احمد قادری کو ملا۔ شنگرفی روشنائی سے سرخیاں لکھیں ہیں۔اس کا ناقل ہندی کلام نقل کرنے میں اکثر جگہ غلطی کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہندی نہیں جانتا۔ سال کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ البتہ بعض قرائن سے نسخہ کی قدامت معلوم ہوتی ہے۔اس نسخہ کے بارے میں مفتی نسیم احمد صاحب فریدیؒ لکھتے ہیں:

''تیسرا نسخہ امروہہ میں تھا جو غالباً مولف ہی کے زمانہ کا بلکہ ان کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ وہ بھی اس وقت امروہہ میں موجود نہیں۔''[1]

''اسرار یہ کشف صوفیہ'' کا دوسرا قلمی نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے کی زینت ہے۔ یہ نسخہ چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخہ خط شکست اور نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ تاریخ کتابت اور کاتب کا نام اس میں بھی نہیں ہے۔ یہ نسخہ نیشنل میوزیم والے نسخہ کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کاتب کی عربی بھی کمزور معلوم ہوتی ہے۔ نسخہ احتیاط سے لکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے املے کی غلطیاں بہت کم ہیں، اس کے ہر صفحہ پر پندرہ سطریں ہیں سرخیاں جلی قلم اور لال روشنائی سے لکھی گئی ہیں۔ بعض صفحات پر حواشی بھی لکھے ہیں جو دوسرے قلم سے ہیں۔

اسراریہ کا تیسرا معلوم نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ یہ بھی چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ خط معمولی نستعلیق ہے۔ بعض جگہ خطِ شکست بھی استعمال ہوا ہے۔ اس نسخہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کاتب معمولی پڑھا لکھا شخص ہے۔ املے کی غلطیاں بہت ہیں اور ہندی زبان بھی نہیں جانتا۔ عربی عبارتیں بھی اکثر غلط نقل ہوئی ہیں۔ ہر صفحہ پر سطور کی تعداد الگ ہے۔ بعض پر 15 اور بعض صفحات پر 19 سطریں ہیں۔ یہ نسخہ 16 ربیع الثانی 1340ھ/1922 کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے کاتب سید نورالحسن ولد سید مدد علی ساکن سنبھل ہیں۔

ایک اور قلمی نسخہ اسراریہ کشف صوفیہ کا سنبھل میں کسی صاحب کے پاس تھا اس کے بارے میں مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدیؒ لکھتے ہیں:

''دوسرا نسخہ سنبھل میں کسی صاحب کے پاس ہے۔''[2]

---

1 تذکرہ خواجہ باقی باللہ ص 39

2 ایضاً

اس طرح ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کے چار نسخوں کا علم ہوتا ہے مگر راقم الحروف کو ابھی تک صرف تین نسخوں کا ہی علم ہو سکا۔ جس کے دو قلمی نسخوں ندوۃ العلماء لکھنؤ اور کتاب خانہ رضارام پور کے زیر اکس راقم الحروف کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ نیشنل میوزیم والا قلمی نسخہ کا زیر اکس احقر کو دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس نسخہ کا آدھا ادھورا استفادہ احقر نے نیشنل میوزیم دہلی ہی میں کیا۔

یہ ہے سید محمد کمال واسطی سنبھلی کی مختصر سوانح اور ان کی تالیفات بالخصوص ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کا اجمالی تعارف۔ سید محمد کمال واسطی سنبھلی کی تالیفات اور خود ان کی شخصیت پر احقر کی تحقیقی کاوشیں جاری ہیں۔ اگر کسی صاحب علم کو اس بارے میں کوئی بھی معلومات ہو تو وہ برائے مہربانی احقر کو ضرور مطلع کریں۔

ایک ضروری التماس

اصل صوفیہ کرام کے متعلق یہ بات ضرور ذہن نشین رہے کہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں مگر ان کے بعض احوال و اقوال شریعت و سنت سے کلی طور پر مطابقت نہیں رکھتے، اس لیے بعض حضرات ان سے بدظن ہو جاتے ہیں اور بعض مخلصین ان کی محبت میں ایسے غرق ہوتے ہیں کہ وہ بھی جادۂ شریعت پر گامزن نہیں رہ پاتے۔ حقیقت کو روایات میں کھو دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان نفوس قدسیہ کے روشن خیالات اور مفید تعلیمات سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے ایک اقتباس کا یہاں حوالہ انتہائی ضروری ہے، آپ فرماتے ہیں:

> ''اوّل تو تاریخی روایات کلیتًا علمی روایت کے برابر موثق معتبر نہیں ہوتیں، دوسرے احوال مشائخ (میں) محبین واعداد و مفرطوں کے مخمصہ میں پھنس جاتے ہیں۔ اس لیے حقیقت واقعات میں بسا اوقات مستور ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر اگر کسی جگہ کوئی روایت جادۂ شریعت سے علاحدہ ملے تو نہ شوقِ اتباع میں اس پر عمل جائز اور نہ اس کی وجہ سے صاحب واقعہ کے ساتھ بدگمانی جائز ہے[1]۔''

---

1 تذکرہ خواجہ باقی باللہ ص39

بس ان نفوس قدسیہ کے ساتھ

''نہ انکار می کنم نہ ایں کار می کنم''

والا معاملہ رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھی کو قرآن وسنت پر ثابت قدم رکھے۔ آمین

میں آخر میں اپنے برادر گرامی محترم عبدالصبور کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کی بہ احسن وجوہ کمپوزنگ کا کام انجام دیا۔

دوسرے محب گرامی مولوی فخر الاسلام صاحب کا بھی تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب کی بڑی باریک بینی سے پروف ریڈنگ کے فرائض انجام دیے اور ان تمام مخلصین کا بھی شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے جو میرے اس طرح کے کاموں کو سراہتے اور میری مدد و معاونت فرماتے ہیں۔ بالخصوص برادر گرامی قدر عالی جناب جانِ عالم صاحب (آئی.اے.ایس.) عالی جناب ڈاکٹر حکیم سراج الدین ہاشمی (موسس ہاشمی گرلس ڈگری کالج وچیئر مین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ) ومشفقی جناب توفیق احمد قادری چشتی، جن کی حوصلہ افزائی ہمیشہ میرے قلم کو رواں رکھتی ہے۔ میں اپنے ان سبھی اعداو مخالفین کا بھی ممنون ومشکور ہوں جو میری کاوشوں پر اپنی نگہِ کج بیں سے نکتہ چینی کرتے ہوئے مجھے اور مہمیز کر کے تیز تر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
محلہ گھیر مناف، امروہہ

MOB.: 09997161315
E-mail:drmisbahamr@rediffmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد والہ و اصحابہ اجمعین . اما بعد!

فقیر حقیر کمال محمد سنبھلی واسطی کہتا ہے کہ بچپن سے ہی اسے اولیاء اللہ جن کی شان میں لا ولیاء ذکر اللہ ثابت ہے،[1] کی صحبت و خدمت میں حاضر باشی کا شرف حاصل رہا ہے اور اس راہ ولایت کی باتیں سننے کا بارہا اتفاق ہوا ہے، بار بار دل میں یہ خیال آتا تھا کہ ان سب باتوں کو اجمالی طور پر سادہ اور بے تکلف عبارت میں لکھے لیکن مصروفیات کی زیادتی نے لکھنے کی اجازت نہیں دی کہ سنہ ایک ہزار اڑسٹھ ہجری میں قدوۃ العرفاء والمحققین حجۃ العظماء الموحدین سیدنا وشیخنا خواجہ محمد عبداللہ[2] ادام اللہ تعالیٰ برکاتِ وجودہٖ علی مفارق الطالبین[3] نے اُسی کام کے کرنے کا حکم دیا جس کا خود میرا دل خواہش مند تھا۔

تعمیل ارشاد مرشد کو ضروری جانتے ہوئے صدق ارادت اور خلوص نیت کے ساتھ فوراً شروع کر دیا اور اس تالیف کا نام بھی ان ہی کے اشارے سے "اسراریہ" رکھا اور "اسراریہ کشف صوفیہ" (1068ھ)

---

1 اولیاء کے لیے ہر وقت خاص ذکر ہے۔

2 اصل نسخۂ فارسی میں یہ نام محمد عبیداللہ ہے۔

3 اللہ تعالیٰ ان کی برکاتِ وجود طالبین کے سروں پر قائم و دائم رکھے۔

بس ان نفوس قدسیہ کے ساتھ

''نہ انکار می کنم نہ ایں کار می کنم''

والا معاملہ رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھی کو قرآن وسنت پر ثابت قدم رکھے۔ آمین

میں آخر میں اپنے برادر گرامی محترم عبدالصبور کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کی بہ احسن وجوہ کمپوزنگ کا کام انجام دیا۔

دوسرے محبّ گرامی مولوی فخرالاسلام صاحب کا بھی تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب کی بڑی باریک بینی سے پروف ریڈنگ کے فرائض انجام دیے اور ان تمام مخلصین کا بھی شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے جو میرے اس طرح کے کاموں کو سراہتے اور میری مدد و معاونت فرماتے ہیں۔ بالخصوص برادر گرامی قدر عالی جناب جانِ عالم صاحب (آئی۔اے۔ایس۔) عالی جناب ڈاکٹر حکیم سراج الدین ہاشمی (موسس ہاشمی گرلس ڈگری کالج وچیئر مین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ) ومشفقی جناب توفیق احمد قادری چشتی، جن کی حوصلہ افزائی ہمیشہ میرے قلم کو رواں رکھتی ہے۔ میں اپنے ان سبھی اعداو مخالفین کا بھی ممنون ومشکور ہوں جو میری کاوشوں پر اپنی نگہِ کج بیں سے نکتہ چینی کرتے ہوئے مجھے اور مہمیز کرکے تیز تر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
محلّہ گھیر مناف، امروہہ

MOB.: 09997161316
E-mail:drmisbahamr@rediffmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد واله و

اصحابه اجمعین . اما بعد!

فقیر حقیر کمال محمد سنبھلی واسطی کہتا ہے کہ بچپن سے ہی اسے اولیاء اللہ جن کی شان میں لاولیاء ذکر اللہ ثابت ہے،[1] کی صحبت و خدمت میں حاضر باشی کا شرف حاصل رہا ہے اور اس راہ ولایت کی باتیں سننے کا بارہا اتفاق ہوا ہے، بار بار دل میں یہ خیال آتا تھا کہ ان سب باتوں کو اجمالی طور پر سادہ اور بے تکلف عبارت میں لکھے لیکن مصروفیات کی زیادتی نے لکھنے کی اجازت نہیں دی کہ سنہ ایک ہزار اڑسٹھ ہجری میں قدوۃ العرفاء والمحققین حجۃ العظماء الموحدین سیدنا وشیخنا خواجہ محمد عبداللہ[2] ادام اللہ تعالیٰ برکات وجودہ علی مفارق الطالبین[3] نے اُسی کام کے کرنے کا حکم دیا جس کا خود میرا دل خواہش مند تھا۔

تعمیل ارشاد مرشد کو ضروری جانتے ہوئے صدق ارادت اور خلوص نیت کے ساتھ فوراً شروع کر دیا اور اس تالیف کا نام بھی ان ہی کے اشارے سے "اسراریہ" رکھا اور "اسراریہ کشف صوفیہ" (1068ھ)

---

1 اولیاء کے لیے ہر وقت خاص ذکر ہے۔

2 اصل نسخۂ فارسی میں یہ نام محمد عبیداللہ ہے۔

3 اللہ تعالیٰ ان کی برکاتِ وجود طالبین کے سروں پر قائم ودائم رکھے۔

اس کی تاریخ تالیف کا سال ہے۔

معلوم ہونا چاہیے اس کتاب میں جہاں بھی ''شیخ من'' آیا ہے وہاں خواجہ محمد عبداللہ مراد ہیں اور ''من'' سے یہ مؤلف کتاب۔ میرے احوال (باطنی و ظاہری) جو میرے شیخ کی بابرکت صحبت اور توجہ سے ظاہر ہوئے ہیں کا مجمل ذکر خاتمے میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

اس کتاب کے پڑھنے والوں کے مکارم اخلاق سے امید ہے کہ جب اہل اللہ کے ذکر کی برکت سے ان کا وقت (دل) خوش ہو جائے (یعنی توجہ الی اللہ نصیب ہو جائے) تو اس کتاب اور اس کے مؤلف کو دل سے بھلا نہ دیں بلکہ اس کو بھی دعائے خیر میں یاد رکھیں۔

واللہ المتسعان و علیہ االتکلان [1]

---

1 اللہ ہی مددگار ہے اور اسی پر بھروسہ ہے۔

خواجہ محمد عبداللہ خرد

خواجۂ خرد کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ میرے شیخ ہیں۔ ان کی پیدائش 6/رجب المرجب1010ھ کو ہوئی تھی۔ اور لفظ رضی سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ ان کے والد بزرگوار صاحب التصرف الانفسی والافاقی خواجہ بیرنگ خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہٗ نے ان کی ولادت کے وقت ایک مژدہ سنایا جس کا مصرعہ تاریخ یہ ہے

''ماہ رجب بود صباششم''

(ماہ رجب کی 6/تاریخ کی صبح تھی) ان کی دولتِ ولایت مادرزاد تھی، جب 6 ماہ کے ہو گئے اُن کو خواجہ بیرنگ کی خدمت میں لایا گیا اور دعا کی درخواست کی گئی کہ یہ فرزند دولت باطنی و مرتبہ وجاہت میں اپنے جدِ مادری (نانا) خواجہ یعقوب کے مثل ہو۔ خواجہ بیرنگ نے فرمایا کہ یہ مولانا عبدالرحمٰن جامی[1] کے مثل ہوگا۔ اُسی دن سے ہدایت وولایت کے آثار ان سے ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ بہت چھوٹی عمر میں حافظ کلام مجید ہوئے اور 14 سال کی عمر میں شیخ احمد سرہندی کے پاس پہنچے اور پہلی ہی صحبت میں ان پر توحید کے معنی منکشف ہو گئے اور شیخ احمد ان کی فطرت شریف اور

---

1 نورالدین عبدالرحمٰن مولانا جامی ابن نظام الدین احمد کی پیدائش 817ھ/1415 - وفات 18/محرم 898ھ/1493، مدفن ہرات، بے مثال ادیب وشاعر اور صوفی بزرگ تھے۔ بہت سی نظم ونثر کی کتابوں کے مصنف تھے۔

استعداد لطیف کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ ان کو ہمیشہ اپنے مریدین میں سے فرمایا کرتے تھے اور دوسری ملاقات کے بعد طریقہ نقشبندیہ میں اجازت ارشاد اپنے ہاتھ سے لکھ کر عنایت کر کے رخصت فرمایا۔ بہت کم وقت میں صوفیہ کے علوم اور اس راہِ ولایت کے معارف ان کے دل پر ایسے کھلے کہ کتنی ایسی دقیق تصانیف علم توحید و معرفت کے باب میں عربی اور فارسی زبان میں اُن سے ظاہر ہوئیں کہ اگر شیخ ابن عربی اس دور میں ہوتے تو وہ بھی از روئے انصاف یہی فرماتے کہ ''بخ بخ این مثلک الیوم فی علم التوحیدیا خواجہ خرد''[1] آپ خواجہ حسام الدین احمد کی صحبت میں بھی رہے ہیں اور مقامِ بلند حاصل کیا ہے۔ شیخ الہداد کی بھی صحبت انھوں نے اُٹھائی ہے اور طریقہ نقشبندیہ اور قادریہ میں ارشاد کی اجازت پائی ہے۔ خواجہ بیرنگ سے بھی خواب میں تلقین اسم ذات سے شرف اندوز ہوئے۔ اکابر اولیاے سلف کی ارواح طیبات کے فیض روحانی کی مہربانیاں ان کے شامل حال رہی ہیں۔ آپ بہت سے مشائخ کبار کی صحبت میں پہنچے ہیں اور بہرور ہوئے ہیں۔ اس کی تفاصیل اپنے مقام پر آئیں گی۔ انشاء اللہ۔ انھوں نے مولانا جامی کی طرح ہنگام جوانی میں ہی چاشنی عشق اور مشرب عاشقی کو اختیار کر لیا تھا۔ دنیا اس معاملے میں ان کی مخالف تھی مگر وہ سب سے فارغ۔

کار جامی عشق خوبانست، ہر سو عالمے در پئے انکار او، او ہمچناں درکار خویش[2]

اس زمانے میں عجیب عجیب حال اور انوکھے انوکھے راز ان پر ظاہر و منکشف ہوتے تھے چنانچہ ایک دن ان کا محبوب، روحانی طور پر ان کے گوشہ خانہ میں حاضر ہوا اور انھیں ایک گلدستہ دیا، جلوہ دکھایا اور ایک لمحے کے بعد غائب ہوگیا۔ اور وہ گلدستہ ان کی زندگی تک باقی رہا۔ ایک دن ان کا حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کی زیارت سے واپسی پر اپنے محبوب (کی صورت مثالی سے) راستے میں آمنا سامنا ہو گیا حالانکہ اس وقت، میں اور وہ نوجوان ایک اور مقام پر ان کو یاد کر

---

1 ''واہ، واہ اے خواجہ خرد علم توحید میں ترا ثانی کہاں؟

2 جامی کا کام حسینوں سے عشق کرنا ہے اگرچہ ہر طرف سے دنیا اس کی مخالفت پر تلی ہے مگر وہ اسی طرح اپنے کام میں لگا ہے۔

3 اولیاء اللہ کے محبوب اس طرح کے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کے محبوب تھے۔

رہے تھے۔ ایک بار ایک امیر عظیم الشان ان کے معشوق کو اپنے ہمراہ جبراً ایک دوسرے ملک لے گیا جب کافی مدت جدائی کو ہوگئی ایک دن اس کی محبت میں مغلوب العشق ہو کر ہاتھ کے ناخن سے زمین کھرچتے ہوئے بولے "ہم نے اس ظالم امیر کو اکھیڑ دیا" ان ہی دنوں خبر پہنچی کہ وہ امیر دنیا سے چلا گیا تب وہ نوجوان بہت لمبی مسافت طے کر کے درویشانہ لباس میں ان کے پاس پہنچا۔ ایک بار ان کے محبوب نے ایام بیماری میں 9 دن کچھ نہ کھایا جب انھوں نے سنا انھوں نے بھی 9 دن رات کچھ نہیں چکھا اپنی اس بات سے وہ مجھے تنہائی میں مطلع کر چکے تھے۔ اس کے باوجود عشق کی ایسی حالتِ شور انگیزی میں جسے چاہتے طریقہ نقشبندیہ میں بزودرتوجہ کیفیت معہودہ (نسبت خواجگان) تک پہنچا دیتے۔ ان کے مریدین میں سے بہت سے مرتبہ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔

آپ صفت علم و عمل، خلق و کرم، فقر و فنائے ذاتی سے اس طرح سے متصف ہیں کہ اولیاء سلف و خلف میں کم ہی کوئی اس جامعیت کے ساتھ سنا اور دیکھا گیا ہوگا اور وہ خود ان کمالات اور سب لوگوں سے نظر اٹھائے ہوئے ہمیشہ نیستی محض اور احدیت کے سمندر میں غرق و مستھلک رہتے ہیں۔ علوم متداولہ کی درس و تدریس، استفادہ و افادۂ شعر و شاعری وغیرہ جوان کے کمالات و فضائل کے کمترین درجے ہیں، ان کے حال حقیقی کا پردہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کے احوال اور اسرار باطنی سے کوئی پوری طرح واقف نہیں ہے مگر جتنے سے اللہ سبحانہ نے کسی کو واقف کرا دیا ہے۔ اور اگر عوام میں سے کوئی ان کے بارے میں زبان طعن کھولتا ہے اور آپ سن لیتے ہیں، تہمت الزام اپنے سر رکھ لیتے ہیں اور اس شخص کو بُرا نہیں کہتے ہیں بلکہ اچھا کہتے ہیں اور اگر کوئی ان کی کوئی چیز چرا لیتا ہے پتا چلنے پر بھی اس سے وہ چیز واپس نہیں لیتے ہیں بلکہ فرماتے ہیں "کتنی اچھی بات ہے کہ کوئی ہمارے پاس آتا ہے۔" ان کی کتنی ہی کتب متداولہ لوگ مانگ کر لے جاتے ہیں۔ اگر واپس لے آئیں خوش۔ نہ لائیں خوشتر۔ ان کا سلوک اپنوں، پرایوں کے ساتھ ایک جیسا ہے۔ ان کے آشناؤں میں سے ہر کوئی شخص اُن کے ناآشنا کو اپنے جیسا آشنا سمجھتا ہے۔ مصرعہ

آشنا داند کہ ایں بے گانہ نیست

وہ آئینۂ خلق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور عامل کرم علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ ایک دن وہ موسم گرما کی گرم ہوا میں پیدل بازار جا رہے تھے، میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ایک جواتی نے ان سے جوتوں کی

درخواست کی جلد پیر سے نکال کر اس کو دے دیے اور ساتھیوں میں سے کسی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خوش وخرم ننگے پیر ہو گئے۔ ایک دن بازار میں بیٹھے ہوئے پیاسے بچھڑے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹ بھر پانی پلایا۔ میں اُن کے ساتھ تھا (سوچا) کہ وہ خاکساری و نیازمندی کے دریا سے جود وسخا کے باغ کو پانی دے رہے ہیں۔ ایک بار ایک نا آشنا شخص نے ان سے قبا طلب کی۔ بے تامل بدن سے اتار کر اسے دے دی۔ اس شخص نے کہا کہ اے میرے خواجہ، فلاں شخص کی جو قبا آپ کے پاس رکھی ہے میں وہ چاہتا ہوں انھیں یاد آ گیا وہ بھی اس کے حوالے کر دی۔ میں نے یہ مصرعہ کہا

"دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست"[1]

ایک زمانے میں ایک جوان ان کے ساتھ رہتا تھا اور ان کے احسان و اکرام کا مورد بنا رہتا تھا۔ ناگاہ اپنی کم ظرفی سے، ایک حمائل جو ولایتی خط میں تھی۔ میں نے کبھی ایسی حمائل نہ دیکھی تھی، اس نوجوان نے اُن کی کتابوں میں سے چرالی اور بھاگ گیا کیونکہ میں اسے مقفل نہ کر سکا تھا میں افسوس کناں اس کی جستجو میں تھا۔ انھوں نے فرمایا "جب مجھے کوئی افسوس وغم نہیں، تو تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ ایک دوست کچھ وقت اس کی قیمت وغربت سے محفوظ و مسرور ہی ہو جائے گا۔" ایک مرتبہ تین کتابیں نفحات الانس، بحرالحقائق وغیرہ اور وہی صحیح نسخے تھے۔ سب ایک کارواں سرائے میں بھول سے رہ گئے۔ میں نے چاہا کہ تلاش کروں کہ ان کی نگرانی میرے ذمہ تھی۔ انھوں نے فرمایا "مجھے تلاش سے کیا واسطہ، جو کچھ آتا ہے آئے اور جو کچھ جاتا ہے جاتا رہے، ہمارا مشرب تو بس یہ ہے" وہ کسی دنیوی چیز کی کوئی قدر و قیمت اپنے دل میں ذرہ برابر بھی نہیں سمجھتے تھے کہ کسی چیز کے آنے جانے سے انھیں کوئی خوشی اور غم ہوتا۔ مولانا جامی نے حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی منقبت میں جو کہا ہے آج ان پر صادق آتا ہے۔

مثنوی

زد بجہان نوبت شاہنشاہی کوکبۂ فقر عبیداللہی
آنکہ ز حریت فقر آگہ است خواجۂ مخدوم عبیداللہی است
لجۂ بحر احدیت دلش صورت کثرتِ صدف ساحلش

---

1 اگر دوست مہربان ہو تو دشمن کیا بگاڑ سکے گا۔

ہست دران لجۂ ناقہ یاب   گنبد نُہ طویٔ فلک آفتاب
روے زمین کش نہ سر نہ تمست   در نظرش چون روے یک ناخن است
یک روے ناخن کہ بدست آیدش   کے برہ فقر شکست آیدش[1]

بادشاہ صاحب قرانِ[2] ثانی اُن کا شمار بڑے فقرا اور عارفوں میں فرماتے ہیں۔ بڑی خواہش کے ساتھ بڑے اعزاز واکرام سے اپنے پاس بلا کر رکھتے ہیں اوران کی صحبت بابرکت سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ آپ اس اعزاز واکرام کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں بلکہ دنیا کے چھوٹوں کو اس کے بڑوں کے مقابلہ میں دوست تر رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خواجہ بزرگ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے۔ ہم نے ایک دیوانے کے اس شعر سے جسے وہ ایک رات بار بار کہہ رہا تھا بڑا اسبق لیا ہے

نیکواں را دوست دارد ہر کہ باشد در جہاں
گر بداں را نیک داری گوے بردی از میاں[3]

ان کی بے تعینی وآزادی غیر اللہ سے اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ آج میرے شیخ ایک ایسے شخص ہیں کہ جنھیں کوئی بھی نہ صاحب کرامات جانتا ہے نہ صاحب حال ومقام۔ مقام وحال اُن کے ہاتھ میں مجبور ہے اور کرامات تو ان کی دولت معنوی کی کمترین شے ہے اس کار ولایت کے امام اور سردار طائفہ وہ ہیں اور سارا جہان ان کے فیض سے بھرا ہوا ہے۔ تصوف اُن کے وجود پر فخر کرتا ہے۔ حقائق ومعرفت کو ان کی ذات وصفات سے شرف ہے۔ اس کام کو جس طرح انھوں نے انتہا تک پہنچایا ہے وہ بس اللہ سبحانہ و

---

1 مثنوی۔ ترجمہ: فقر عبید اللّٰہی نے جہاں میں شاہنشاہی نوبت بجادی ہے یعنی آج فقر خواجہ عبید اللہ احرار کا دنیا میں شہرہ ہے۔ یہ خواجہ مخدوم عبید اللہ ہیں جو فقر کی آزادی سے خوب آگاہ ہیں۔ ان کا دل احدیت کے سمندر کی موج ہے اور صورت اس کے ساحل کے صدف کی کثرت اور اس ناقہ یاب موج میں 9 تہوں والے فلک کا گنبد بھی غرق ہے۔ زمین کی سطح جس کا کوئی اور چھور نہیں اُن کی نظر میں ایک ناخن کی مانند ہے۔ اگر دنیا کی اشیا میں سے ناخن برابر بھی اُن کو ملے تب بھی وہ فقر سے نہ گھبرائیں گے۔

2 ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ۔

3 ترجمہ: نیکوں کو تو سبھی دوست رکھتے ہیں سبقت کی گیند تو تب لے جائے گا جب بروں کو بھی دوست رکھے۔

تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اب سے چند سال پہلے میں نے ان کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا۔ اس کے سارے مضامین جوراست ودرست اور مطابق واقع ہیں انھیں پسند آئے ہیں۔ جس کے دوشعر یہ ہیں

خواجۂ خردی بصورت لیک با معنیٰ بزرگ جمع کر دی صورت و معنیٰ دیں و پر نزند [1]

وے بدے جامی بعلم و حال و امروز از کمال خواجۂ احراری و فردا شوی خود نقشبند [2]

میں نے ایک عالی مرتبہ درویش سے سنا ہے کہ کہتے تھے کہ اگر آج شیخ ابن عربی اور مولوی جامی ہوتے قلم کو ہاتھ سے رکھ دیتے اور ان کی طرف متوجہ ہوکر ان کے کلمات بابرکات کے منتظر ہوکر بیٹھتے۔ اُن کے کلمات بابرکات میں سے بعض باتیں یہ ہیں: انھوں نے فرمایا ''شریعت کی منشائے مقام احدیت ہے جو مقام وحدت سے بالاتر ہے۔ اس مقام میں ''اقربیت'' کی حقیقت اصحاب کمال پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس مقام میں جاکر معلوم ہوتا ہے کہ جب وحدت، اتحاد وعینیت کے کمال کو پہنچتی ہے اور اس اتحاد سے آگے نکل جاتی ہے تب اثنینیت ظہور کرتی ہے۔ اور شریعت کا مصدر بن جاتی ہے۔ سبحان ان یدرک حقائق ذاتہ و صفاتہ احدٌ فھو العالم بذاتہ و صفاتہ [3]

آپ ہی فرماتے ہیں'' آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے دن حکم الٰہی ہوا کہ مکہ میں داخل ہوں تو کہیں ''جاء الحق و زھق الباطل '' (حق آگیا اور باطل چلا گیا) جب آپ (ﷺ) مکہ میں داخل ہوئے کعبہ کے گرد 360 بُت دیکھے۔ آپ (ﷺ) کے دست مبارک میں ایک لکڑی تھی اس لکڑی سے بتوں کو گراتے تھے اور کہتے جاتے تھے ''جاء الحق و زھق الباطل '' (حق آگیا اور باطل چلا گیا) طالب کو چاہیے کہ اپنے دل کو کعبۂ حقیقی جانے کہ وہ قبلہ توجہ الی اللہ ہے اور ساری معنوی عبادات (صبر شکر رضا وغیرہ) کا بھی ذریعہ وآلہ۔ اور اس کعبۂ دل کے نزدیک خواہشات

---

1 بظاہر آپ کا نام خواجۂ خرد ہے مگر از روے باطن خواجۂ بزرگ ہیں۔ آپ نے ظاہر و باطنِ شریعت کو جمع کر رکھا ہے مگر کمال کے دعوے سے مبرا ہیں۔

2 ابتدائے سلوک میں وہ از روے علم وحال جامی بنے اور آج کمالاتِ خواجۂ احرار سے متصف ہیں، کل انشاءاللہ خواجۂ نقشبند ہوجائیں گے۔

3 اللہ سبحانہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اس کی ذات وصفات کا ادراک کر سکے۔ پس وہ خود ہی اپنی ذات و صفات کی حقیقت جاننے والا ہے۔

نفسانی کے بہت سے بت ہیں جو دل کو احاطہ کیے ہوئے ہیں اور اس پر تصرف کیے ہوئے ہیں، پس چاہیے کہ اس کعبۂ دل کی جانب رُخ کر کے ان کلمات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اور تلاوت قرآن کی نیت سے دائیں جانب سے دل میں ''جـاء الـحـق'' وارد کرنے اور بائیں جانب سے ''وزهـق البـاطل'' کو باہر لے جانے کا تصور کرتے ہوئے ذکر کرے۔ پہلے مرحلے میں دل میں ظہور حقیقی کو ملاحظہ کرے اور دوسرے مرحلے میں غیر مقصود حقیقی کے دل سے باہر آنے کا تصور کرے اور اس کا وِرد رکھے۔ امید ہے اگر اللہ چاہے گا حقیقت تک پہنچ جائے گا۔ یہ طریقہ الہام غیبی سے معلوم ہوا تھا اور مدتوں سے دل میں محفوظ تھا، آج جب کہ 15 رشعبان سنہ ایک ہزار پچیس ہے بیان کرنے کی توفیق ہوئی۔ والسلام علی النبی و آلہ۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے ''حق کی حقیقت جو کہ وجود صرف ہے، حقیقتاً تمام قیود و تعینات سے پاک لیکن بطور ظہور تمام تعینات اور تقیدات سے متعین اور مقید ہے۔ محققین عرفان نے فرمایا ہے کہ آں حضرت سبحانہ کا دہ تعین جامع اور مظہر اتم جس میں سارے دیگر تعینات اور ظہورات کی اصل پوشیدہ ہے، حقیقت محمدی اور روح احمدی ہے (ﷺ) اُن کے لباس عنصری بشری میں ملبوس کیے جانے سے قبل۔ لہٰذا اس حقیقت علیا کی طرف رجوع اور توجہ کیے بغیر حق حاصل نہیں ہوسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ توجہ اور رجوع کئی سبب اور صورتوں میں ہوتا ہے۔ تاکہ یہ حکم انبیاء، اولیاء، سابقین اور ملائکہ کی تنقیص شان کا سبب نہ بنے۔ مقصد یہ ہے کہ طالب صادق کا مطلوب حقیقی جو کہ تقید سے عاری ہونے اور حقیقت مطلق کے اتصال سے عبارت ہے، حاصل ہونے کی اس کے علاوہ کوئی راہ ہی نہیں ہے کہ تمام شرعی احکام کو بجالا کر بعض خصوصی اعمال کا جو کہ اس قید تقید سے آزادی کا سبب بنتے ہیں، شغل رکھے۔ چاہیے کہ پہلے وجودِ واحدیت کا تقلیداً ایسا اعتقاد درست کرے جیسا کہ محققین صوفیہ کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اُن اعمال اور اشغال پر عمل پیرا ہو۔ چونکہ وصول کے طریقے بہت ہیں اور مشائخ کے ہر گروہ نے وہی طریقے اپنے لیے اختیار کیے ہیں جس میں انھوں نے اپنا نفع زیادہ دیکھا ہے۔ طالب کا وظیفہ یہ ہونا چاہیے کہ اسی گروہ کی محبت و اعتقاد کے ساتھ متابعت اختیار کرے، جس کا طریقہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرنِ اول یعنی صحابۂ کرام کے زیادہ مشابہ ہو۔ (فقیر) اب مزید اور کیا لکھے۔

والسلام علی النبی وآلہ۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے" یہ ایک خط ہے مسمّٰی بہ 'مُبِسرّہٗ' " اس ہیچ بلکہ کم از ہیچ کی جانب سے۔ اس سالک طریقت، محرم حقیقت، برادر روحانی ورفیق ربانی کی طرف، کہ ایک خاص سنت الٰہی جو نہاں خانہ ہائے تقدیر سے جلوہ گاہ ظہور میں آتی ہے۔ جملہ چار کلموں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں کا ہر کلمہ گنج بے نہایت کا ایک طلسم ہے۔

اول کلمہ:

سب سے پہلے نہ ہستی ہے نہ نیستی۔ بعدہٗ صرف ہستی ہے نیستی نہیں۔ اس کے بعد نہ ہستی ہے نہ نیستی۔ نیستی سے ہستی کو پہنچ، پھر ہستی سے بھی چھٹکارا پالے۔

دوسرا کلمہ

"تو ہستی کو نیستی اور نیستی کو ہستی سمجھتا ہے۔ جس جگہ کہ مجھے پہنچنا ہے وہاں نہ نیستی ہے نہ ہستی۔

تیسرا کلمہ

نیستی خواب سے زیادہ نہیں ہے مگر ہستی واقعتاً بیداری کا نام ہے لیکن تجھے اس خواب و بیداری سے بھی گزر جانا چاہیے۔ نہ خواب میں رہ نہ بیداری میں۔ نیستی اور ہستی ایک دوسرے کی متقابل صفات ہیں۔ (پھر بھی) وہ بغیر اس کے نہیں ہے اور یہ بغیر اُس کے نہیں۔ یہ جانی پہچانی بات ہے کہ ربوبیت، بے عبودیت ظاہر نہیں ہوتی اور بندگی بغیر رب کے صورت پذیر نہیں ہوسکتی۔ تو اپنی بندگی سے کہ تیرے بغیر نہیں ہوتی، آزادی چاہ (یعنی خودی سے) اس مقام پر پہنچ کر تو پائے گا کہ "الصوفی غیر مخلوقٍ " کے کیا معنی ہیں" والفقر لایحتاجُ" کا کیا مطلب ہے۔ "اِنَّ لِربوبیت لَسِرٌّ ولو ظهر لبطلت العبودیت (وھو) ھو وانت حاجبٌ" (ربوبیت کا ایک بھید ہے اگر وہ ظاہر ہوجائے تو عبودیت باطل ہوجائے۔ وہ وہی ہے تُو صرف پردہ ہے) نظیری نے بہت ہی خوب کہا ہے رباعی

اے در قِدَم و حدوث عالم حیراں پیوستہ میانِ این و آں سرگرداں
رمز ے بشنو، بہ تست قائم دو جہاں پیش از تو و بعد از تو، نہ این است و نہ آں[1]

---

1 اے مخاطب، تو حدوث وقدمِ عالم کی فکر میں ہمیشہ حیران وسرگرداں کیوں ہے ایک راز کی بات سن، دونوں جہاں تجھ سے ہی قائم ہیں۔ تجھ سے قبل اور تیرے بعد نہ حدوث ہے نہ قِدَم۔

اس سے اس جانب اشارہ ہے۔ تیری خودی سے ہی تمام صورت فراہم ہوتی ہیں۔ بس اپنی خودی سے گزر جا دیکھ ربوبیت کی آنکھ تجھ پر لگی ہوئی ہے۔ پس جب تو درمیان سے اُٹھ جائے گا (اس وقت) صرف عشق رہ جائے گا عاشق اور معشوق سے قطعاً پاک گویا ذات بحت ہو جائے گا ربوبیت اور عبودیت سے آزاد۔

چوتھا کلمہ

بزرگوں نے فرمایا ہے۔ اوّل اوّل ذات محض ہے، جب ظہور کی طرف متوجہ ہوتی ہے ایک مجمل دانش پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی تعبیر علم سے کی جاسکتی ہے۔ یہ مجمل علم و دانش سارے علوم کو مشتمل ہوتی ہے، پھر بے نہایت سمجھ بوجھ یعنی دانش پہنچتی ہے، تیسری بار اس علم و دانش کا ظہور یعنی نمائش ہوتی۔ ظہور کے تین مرتبے نمائش روح، نمائش مثال اور نمائش جسم مقرر ہوتے ہیں۔ حضرات پنجگانہ اس ظہور کے مراتب ہیں

انھوں نے ہی کہا ہے "قولہ تعالیٰ، والھکم الله واحد " یہ آیت کریم توحید الوہیت کا افادہ صرف ایک ذات واحد میں کر رہی ہے جو کہ توحید صفاتی ہے۔ "قولہ تعالیٰ قل ھو اللہ احد " یہ آیت کریمہ افادۂ توحید ذاتی کرتی ہے اس لیے کہ لفظ "اللہ" علَم ہے یعنی نام ہے اور ذات پر دلالت کرتا ہے یعنی وہ ذات محض ایک ہے دوسرے کا اس کے علاوہ (حقیقتاً) کوئی وجود نہیں ہے۔ فافہم۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ جو چیز بھی مخلوق ہے "رَبَّنَا ما خَلَقْتَ ھذا باطلا " کے حکم سے باطل نہیں ہے اور جو کچھ اللہ کے سوا ہے بحکم "الا کل شیُ ما خلا اللہ باطلُ " باطل ہے۔ تو جو بھی مخلوق ہے اللہ کا غیر نہیں ہے۔

انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ کبریائی میری چادر ہے اور بزرگی و عظمت میرا پاجامہ ہے، جو کوئی ان دونوں کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑا کرے گا میں اس کو دوزخ میں ڈال دوں گا۔ کبریائی ہر صورت (مخلوقہ) میں اس کے ظہور سے عبارت ہے اور ہر صورت کا رجوع اس کی جانب سے عبارت ہے یعنی ہر معنی میں اس کا ظہور ہے اور ہر معنی کا رجوع اس کی ذات کی طرف ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ صورتوں میں سے ہر صورت اور معنی میں سے ہر وہ معنی جو خود کو موجود حقیقی کے برخلاف موجود مستقل جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا ہے۔ جدائی کے بُعد

میں مبتلا رہتا ہے اور اس کی اپنی حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی۔ مگر کیوں کہ معنیٰ صورت کے پردہ میں پوشیدہ ہے لامحالہ اس صورت پر واقعتہً ''انی'' کی تعبیر صحیح ہوتی ہے (نہ کہ حقیقتاً)

انھوں نے فرمایا۔ ''الحمدللہ وحدہ والصلوٰۃ (والسلام) علی من لا نبی بعدہ '' جاننا چاہیے کہ شریعت صورت حقیقت ہے اور حقیقت معنیٰ شریعت۔ صورت باطن سے اور باطن صورت سے انفکاک اور انفصال نہیں رکھتی معنیٰ یعنی باطن تک بے توسط صورت جو کہ باطن کا پردہ ہے، پہنچنا محال ہے۔ اور صرف صورت پر ہی اکتفا کرنا اور باطن سے جو مقصود صورت ہے غافل رہنا صریح نقصان ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا تحریر کروں:

درخانہ اگر کس است یک حرف بس است　　　بانگ دو کردم اگر در دہ کس است

انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ غیر ایک لفظ بے معنیٰ ہے کیونکہ اس کا باطن عین وہی ہے نہ کہ غیر۔ پس غیر کا کوئی معنیٰ ہی نہیں بلکہ غیر ایک لفظ ہے جو خود سے بے خود ہے کہ اس کا لفظ بھی معنیٰ ہی کی مانند ''عین'' ہی ہے۔ پس غیر لاشی محض ہے۔ جب تو عین کہے تب حق کو پائے گا اور جب غیر کہے تب بھی حق کو پائے گا۔ مرتبہ وحدت صرف سے جو کہ وجود صرف ہے تیرے مرتبہ موہوم محض تک بلکہ موہوم محض سے اسفل تک وجود کے سارے مرتبے جن کا بزرگوں کی کتابوں میں مفصل بیان پایا جاتا ہے ''ہمہ اوست'' ہیں موہوم محض کیا ہوتا ہے؟ کہ لاشی صرف'' (محض کچھ بھی نہیں) کا مفہوم اس کے ظہور پر صادق آتا ہے۔ دوسری بات یہ جان کہ جب اصلیت میں ظہورات کے مختلف درجات و اعداد بھی وحدت کے مظہر نہیں ہیں تو مراتب اور مرتبوں والے بھی وحدت کے سوا کچھ نہ ہوں گے۔ اس مقام پر آ کر سب کچھ غائب ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں رہتا۔

انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ کبھی عشق بول کر اس سے افراط محبت مراد لیتے ہیں اور اس نسبت کا منتہیٰ چاہے اتحاد حقیقت ہو چاہے بُعد صوری۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　از جدائیہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند[1]

1　از مثنوی مولانا روم۔ ترجمہ: سنو بانسری کیا کہتی ہے اپنے محبوب سے جدائی کی شکایت کر رہی ہے کہ جب سے مجھے جنگل سے جدا کیا ہے مرد و زن بھی میری غم بھری آواز سے رو رہے ہیں۔

اس میں اس بھید کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ ساری شریعتیں اور طریقت کے احکام اسی نسبت عشق ومحبت کی تحصیل کے لیے ہیں۔

انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ کبھی نسبت پہلے ظاہر ہوتی ہے اس کے بعد راہ سلوک کے مقامات اور معرفت کی منزلوں کا حصول رونما ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ پہلے حال والے معشوق اور دوسرے حال والے کو "عاشق" کہتے ہیں اور ایک معنی میں تو سبھی معشوق ہیں۔ کیونکہ محبت جب تک محبوب کی جانب سے ظاہر نہ ہو محب کی محبت نہیں ہوتی۔ "یُحبھم و یحبونه"[1]

انھوں نے ہی کہا ہے۔ اس وجہ سے کہ حقیقت عاشق ومعشوق دونوں میں ایک ہی کارفرما ہے چاہے وہ عشق مجازی ہو چاہے عشق حقیقی۔ جب ایک کے اندر نسبت حُب ظہور کرتی ہے لامحالہ بسبب اتحادِ حقیقت دوسرے میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ حال کا فرق صرف تقدم وتاخر میں ہوتا ہے جیسا کہ ابھی بیان ہوا۔ جانب معشوق ہمیشہ غالب ہوتی ہے کہ دوسری جانب کو اپنی جانب خود بخود کھینچتی ہے۔ اس وجہ سے کہ کمزور کو طاقتور گھر سے بے گھر کر دیتا ہے۔ عاشق ہمیشہ اضطراب میں رہتا ہے اور معشوق ہمیشہ برقرار۔ عاشق ہمیشہ غمگین رہتا ہے اور معشوق ہمیشہ خوشحال۔ جب وہ ذاتِ واجب الوجود تمام اوصاف کاملہ میں ممکن سے قوی تر اور اکمل ہے (اسی لیے) تمام ممکنات سے زیادہ جالب و غالب ہے۔ یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے کہ ہر کسی کی عقل کی وہاں تک رسائی نہیں۔ اس کی ذات اس کی ذات میں، اس کی صفات اس کی صفات میں مل جاتی ہیں اور ہر صفت اپنی ہم جنس میں جذب ہو جاتی ہے۔ مثلاً علم علم میں، قدرت قدرت میں، محبت محبت میں، وعلیٰ ہٰذا القیاس (اسی قیاس پر) دوسری صفات بھی جب حرکت میں آتی ہیں اور مقصود تک پہنچ جاتی ہیں اسی کی ذات وصفات میں گم ہو جاتی ہیں۔ اس مرتبہ میں حُیثیت بھی باقی نہیں رہتی۔ جب ذات ہی چلی گئی تو باقی کیا رہ گیا۔ فنائے حقیقی اس مقام پر حاصل ہوتی ہے یہی نہایت النہایت ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے قرب ہے۔ کمالِ معرفت قرب کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ ملا جسے ملا۔ جو چیز ظل کے اس کے اصل کی طرف انجذاب کا سبب ہے وہی چیز حُبِّ ظل کے، اپنی اصل یعنی محبوب کی جانب انجذاب کا سبب بنتی ہے جب عاشق کی ذات (درنسخہ حب) معشوق کی ذات میں جو اصل ہے جذب ہو جاتی ہے تو

---

1 پہلے وہ ان سے محبت کرتا ہے اور (پھر) وہ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں) سے اسی جانب اشارہ ہے۔

تمام (صفات) کے ضلال بھی اپنے اصول میں جذب ہو جاتے ہیں۔ یعنی فعل، فعل میں، صفت صفت میں، ذات ذات میں، اگر چہ اس انجذاب کا واسطہ بھی حقیقت میں ذات بحت[1] ہی ہے لیکن انجذاب حب کی صورت میں اصل (ذات) ممکن تمام صفات کے اصول کے ساتھ ذہن میں باقی رہتی ہے میں نے جان لیا کہ کچھ نہیں جانا۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے ''بعضے حسن مجازی اور اس کے عشق میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ یہ لوگ حسن حقیقی کی صورتوں اور آثار سے تو خوب محظوظ ہوتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ انھیں کس چیز سے حصہ ملا ہے اس لیے اس نہ جاننے سے مرتبہ معرفت سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اسی قصور کی وجہ سے آخرت میں ان سے مواخذہ کیا جائے گا اور عذاب دیے جائیں گے۔ یہ لوگ اس وقت تک عذاب میں رہیں گے جب تک کہ ان پر معرفت کا دروازہ نہیں کھولا جاتا ہے، اس وقت جنت نعیم میں داخل ہو جائیں گے۔ اور ایک گروہ حسن حقیقی اور اس کے عشق کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ حسن وعشق حقیقی سے محظوظ ہوتے ہیں حالانکہ بظاہر ان کی مجازی صورتوں سے بھی قدرے فائدہ مند ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آخرت میں عذاب کا منہ بھی نہ دیکھیں گے اور جنت نعیم میں داخل ہوں گے۔ لیکن ساری کی ساری جنتی لذتوں کا احاطہ نہ کر پائیں گے۔ بس، شہود ورویت کے بعض مراتب ان کو نصیب ہوں گے۔ ایک فرقہ وہ بھی ہوگا جو نہ مجاز میں مقید تھے نہ حقیقت میں۔ مجاز میں حقیقت اور حقیقت میں مجاز کو دیکھتے ہیں۔ ان کا عشق حسن مجازی اور حسن حقیقی دونوں سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور شہود کے تمام مراتب اور جنت کی تمام لذّات سے نصیب ور ہوں گے۔ اسی طرح جہنم میں بھی ان گروہوں کا نمونہ بعضے اصحاب جہنم کی نسبت بہ ترتیب اسی نمونے سے ہوگا بلکہ جہنم کی بقا اور اس کا کمال بغیر اہل جہنم کے وجود کے میسر نہیں ہوگا۔ یہ لوگ جس طرح دنیا میں سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے وہاں جہنم میں بھی ان کبرائے جہنم میں داخل ہوں گے جنھیں عذاب شدید دیا جائے گا۔ آخرت میں جہنم ان پر برپا ہوگا۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے ''فیضع الجبار قَدَمَہٗ فِی النار.. الخ'' اشارہ اس کا نمونہ ہے۔ اس عالی قدر جماعت کو عشق مجازی میں اتنے اسرار ظاہر ہوتے ہیں

1 ذات بحت۔ یعنی وجود حق سبحانہٗ وتعالیٰ بلا اعتبار صفات وتعینات، اصطلاح صوفیہ میں، وجود، ہستی، ہست، ذات صرف، ذات ہُو، ذات ساذج سب ایک ہی معنی میں ہیں۔

کہ اگر ان کو ظاہر کریں "قطع البلعوم" (عمل گردن زدنی) ان کے حق میں درست آتا ہے۔ سبحان اللہ عین بُعد کی حالت میں ان پر قرب کے اتنے اسرار ظاہر ہوتے ہیں کہ طبقات آسمان بھی ان کو تحریر کرنے سے قاصر ہیں۔

انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ایک شخص نے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے جامع نصیحت فرمایئے۔ فرمایا۔ "قُل امنتُ باللہ. ثم استقم" (کہہ ایمان لایا میں اللہ پر، پھر اسی پر مستقیم رہ) یہ کلمہ "امنت باللہ" تمام کمالات امکانیہ کو جامع ہے۔ اگر تو شریعت کے علوم اعمال اور اسی طرح طریقت کے علوم و اعمال اور اسی طرح حقیقت کے علوم و احوال میں اچھی طرح غور کرے سب اسی کلمہ "امنت باللہ" میں مندرج ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے فرصت دی تو انشاء اللہ سبحانہ تفصیل سے بیان کیے جائیں گے اور اس باب میں ایک رسالہ مرتب ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تین ابواب پر مشتمل ہوگا جس میں حقیقت فنا اور نیستی، ارتفاع اعمال اور علوم احوال د مقامات وحدت کبریٰ کا بیان ہوگا۔

انھوں نے ہی فرمایا کہ عارف رومی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے

ہر چہ گیرد علتی علت شود　　کفر گیرد کاملے ملت شود

اس کلام حقیقت انتظام کا سیاق وسباق معلوم ہی نہیں ہے کہ کما حقہ اس کی تحقیق کی جا سکے۔ لیکن سرسری طور پر پہلی نظر میں جو کچھ دل میں آیا ہے تحریر کرتا ہوں۔ اگر اس کے صواب وخطا پر مطلع ہو جائیں تو آپ کے کرم و مہربانی سے یہ بات دور نہیں ہے کہ صواب کی تائید اور خطا کی اصلاح فرمائیں۔ اس شعر کے سلسلہ میں اکثر اذہان میں جو اعتراض پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ بیمار دوا کے استعمال سے کیوں ٹھیک نہیں ہوتا اور دوا سبب بیماری کیوں بن جاتی ہے۔ اسی طرح کامل الایمان جو صحت کاملہ رکھتا ہے کفر کو اختیار کر کے جو صحت ایمان کو زائل کرنے والا ہے کیوں بیماریٔ کفر میں مبتلا نہ ہوگا اور اس کا کفر کس طرح دینی بیماری اور زہر بننے کے بجائے تریاق محض یعنی ملت بن جائے گا۔ یہ اشکال واقعی بہت قوی ہے جس کا رفع لفظ "علتی" اور "کامل" کے معنی کی تحقیق پر موقوف ہے۔ پس یہ جاننا چاہیے کہ "علتی" وہ شخص ہے جو شقی ازلی ہے کیونکہ اس کی استعداد کلی شقاوت وسعادت سے محرومی کا تقاضہ کرتی ہے۔ اور "کامل" وہ شخص ہے جس کی استعداد کلی کے

مطابق علم ازلی کے حکیم نے سعادت ابدی کو اس کے نام لکھ دیا ہے۔ علتی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات وصفات کے وصول کی راہ میں آنے والے موانع میں مشغول کر دیا گیا ہے، اب اگر کوئی علتی یعنی شقی ازلی بظاہر اسباب سعادت کو اختیار بھی کیے ہوئے ہے ان اسباب سعادت میں بعض مقتضیات شقاوت ازلی بھی ملے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اسباب سعادت عین اسباب شقاوت بن جاتے ہیں۔ جیسے کہ حلوا بذات خود سبب بقاے زندگی اور لذت بخشی ہے لیکن اگر اس میں ذرا سا زہر بھی ملا دیا جائے تو وہ زہر اس کے سارے اجزا میں سرایت کر جاتا ہے پھر وہ حلوا بھی زہر کا حکم لے لیتا ہے اور موت اور تکالیف کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کامل الایمان بظاہر مباشر کفر و نافرمانی بھی ہو جاتا ہے جو شقاوت ازلی کے قوی تر اسباب میں سے ہے لیکن چونکہ اس کا باطن ایمان محض بن چکا ہے وہ کفر جو کہ زہر ایمان کا حکم رکھتا ہے، ایمان جس کی تاثیر سم سے سمیت کو ختم کرنے کا کام کرتی ہے۔ کامل الایمان کا وہ ظاہری کفر بھی ایمان کے ہی حکم میں ہو جاتا ہے۔ کامل الایمان شخص سمندر کی مانند ہے اور کفر اور گناہوں کی مثال گندگیوں کی سی ہے جو اس بحر محیط میں مل کر لاشئے محض بن جاتی ہیں۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ شاید عارف کامل سے تکالیف شرعیہ اٹھالی جاتی ہیں اور وہ حکم شرع سے خارج ہو گیا ہے۔ حاشا وکلا عارف بھی عامی کی طرح اور کامل بھی ناقص کی طرح دائرہ شریعت میں داخل ہے۔ جب تک عقل کہ معرفت کا کمال اس کے وجود سے مربوط ہے قائم و باقی ہے تکالیف شرعیہ کا ساقط ہو جانا محال ہے اور اس کا معتقد ملحد اور زندیق ہے۔ ''ھذا ھو المعتقد المجمع علیہ بین العلماء والصوفیاء باسرھا[1] ''

لیکن کفر و معصیت سے کسی عارف کی مباشرت کسی غیر عارف کی ان چیزوں سے مباشرت سے الگ ہوتی ہے اگر چہ عوام الناس دونوں میں تفاوت کو نہ سمجھیں۔ عارف و عامی کا یہ فرق بہت سی صورتیں رکھتا ہے اور مثالوں سے بعض صورتیں واضح بھی ہو جاتی ہیں۔ عارف اپنے نفس کو قتل کرتا ہے اگر چہ قتل کی کوئی وجہ ظاہر نہ ہوئی ہو۔ عارف کا اپنی نفس کشی کا یہ عمل صورت ظاہرہ میں اکبر کبائر ہے لیکن چونکہ عارف یہ کام بامر الٰہی کرتا ہے جو اس کے باطن میں اس کو ہوا ہے۔ پس عارف کا اپنے نفس کو ہلاک کرنا امتثال امر الٰہی اور طاعت عظیمہ ہوگا، حالانکہ دوسروں کے لیے معصیت

---

1 یہی وہ عقیدہ ہے جو علما اور صوفیہ کے درمیان کلی طور پر متفق علیہ ہے۔

کبیرہ مانا جائے گا۔ جیسا کہ حضرت ابوالعباس خضر[1] نے کیا تھا جن کا قصہ ''قرآن مجید'' میں مذکور ہے۔ عارف کبھی کبھی دوسروں کو دکھانے کے لیے بھی کام کرتا ہے حالانکہ ریاکاری سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں لیکن عارف کا دکھاوا اخلاص کا حکم رکھتا ہے جو کہ قبولیت اور اللہ کی درگاہ میں صحتِ اعمال کا سبب ہے کیونکہ غیر حق اس کی نظر سے بالکل ساقط ہو گیا ہے اور ہر وہ عمل جس کی نسبت عارف اپنی طرف کرتا ہے حق تعالیٰ سے خود بخود منسوب ہو جاتا ہے۔ عارف کا عُجب، حمد اور شکر کا حکم رکھتا ہے۔ کبھی عارف سے بظاہر طلب دنیا ظاہر ہوتی ہے حالانکہ اس کی یہ طلب دوسروں کے زہد سے بہتر ہوتی ہے اور اس کا جزع و فزع غیر عارف کے صبر سے اچھا ہوتا ہے۔ اس طرح تمام صفات میں عارف کا معاملہ الگ ہے۔

موسیٰ اندر درخت آتش دید سبز تر می شد آن درخت از نار
شہوت و حرص مرد صاحبدل این چنین دان و این چنین انگار[2]

اب ہم مطلب کی طرف آتے ہیں۔ مقامِ کفرِ حقیقت میں کسی عارف سے جتنے بھی اسرار ظاہر ہوتے ہیں عوام کے نزدیک سارے کے سارے کفر ہیں۔ واقعی جب تک کوئی مقامِ کفرِ حقیقت سے متصف نہ ہو، کفر ہی ہے۔ اگر کوئی دوسرا ایسی باتیں کہے یا اعتقاد رکھے کافر ہو جائے گا لیکن عارف چونکہ معاملے کی تہہ کو پہنچ چکا ہے اس حال میں اس کا وہ کفر عین دین و ایمان ہے۔ کوئی شخص اگر ابتداء راہ سلوک میں ''لا موجود الا اللہ'' کا عقیدہ رکھے حالانکہ ابھی تک نے اس سیر الی اللہ کی مسافت کو طے بھی نہیں کیا ہے جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے اس کا ''لا موجود الا اللہ'' پر اعتقاد کفر ہو جائے گا۔ البتہ اگر قطع راہ سلوک الی اللہ سے قبل کسی عارف کی گفتگو سے، تحقیق حال سے پہلے ہی کسی طور، معاملہ اس کی عقل میں آ جائے اور سمجھ جائے تو بھی کفر نہ ہوگا۔ لیکن جیسا کہ چاہیے (عموماً) ایسا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ وحدت وجود کا اس طرح کا عقیدہ جو مخالف شریعت ہو کفر

---

1 حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ کہ حضرت خضر نے کشتی میں سوراخ کر دیا، ایک بچے کو قتل کر دیا اور ایک گرتی ہوئی دیوار کو درست کر دیا۔ کی طرف اشارہ ہے۔

2 ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے لوٹتے وقت درخت میں آگ لگی دیکھی کہ وہ درخت اس آگ سے اور زیادہ ہرا ہو رہا ہے۔ کسی صاحب دل کے اندر رونق پیدا ہونے والی شہوت اور حرص کو ایسا ہی خیال کر ایسا ہی جان)

کے علاوہ کیا چیز ہے؟ ابتدا میں یہ عقیدہ چاہے علم ہو چاہے حال اس سے مخالفتِ شریعت کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس حال سے جو قرآن وحدیث پر قول وعمل کے بغیر ہو، کفر اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم نے بہت سے لوگوں میں معائنہ کیا ہے۔ اگر بات صرف گفتگو تک ہی محدود ہے اور ظاہرا اعمالِ شرعی میں لگا ہوا ہے، نجات کی امید ہے اور اگر صاحب حال بھی ہے اور مقید باعمال (شرعیہ) بھی ہے تب بھی نجات کی امید ہے اور اگر صاحب حال تو ہے مگر شرعی اعتقاد اور فقہی اعمال سے کورا ہے۔ وہ شخص بدترین خلائق ہے الّا یہ کہ مسلوب العقل ہو گیا ہو۔ یہاں ایک بہت باریک بات ہے کہ اگر اس سلب عقل کا باعث اس کا حالِ توحید صوری ہے تو گویا وہ از خود کفر میں داخل ہوا ہے، اس کا خاتمہ کفر پر سمجھو اور اگر سلب عقل کا سبب کوئی مرض تھا نجات کی امید ہے۔
اس موقع کے مناسب ایک باریک بات (لطیفہ) ہے مگر بالفعل اس کے بیان کا موقع نہیں۔ میں نے یہ جو کچھ تحریر کیا ہے اس توحید صوری کی تردید میں لکھا ہے جو اس زمانے میں پھیلی ہوئی ہے اور ان لوگوں کی رد میں جو اس کے قائل و مباشر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور تمام مسلمین کو اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔ توحید کے بہت سے مراتب ہیں۔ سب سے کامل تر توحید، توحید محمدی (ﷺ) ہے کہ ابن عربی نے بحیثیت خاتم ولایت جزوی قلبی، اس کے اسرار شریفہ کے بیان کی تکمیل کی ہے۔
فقیر کو چونکہ چند دن ضعف رہا۔ دماغ یا تو ضعف کے سبب یا دوسرے آزار سے جو لازمۂ بشریت ہیں کہ عارفین اور انبیاء کی ارواح بھی طبعاً ان آزار میں عوام کی مانند ہیں، تھکا تھکا سا ہے اسی وجہ سے تفصیل سے نہیں لکھ سکا امید ہے کہ یہ اجمال ہی تفصیل کی راہ دکھا دے۔
وہ ہی فرماتے ہیں: ''اللہ لا الہ الا ھو، لا الہ الا انت سبحانک[1]، لا الہ الا انا'' باقی کیا بچا۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے محبت پیدا ہوئی ہے تاکہ اللہ بندے (کا) بن جائے[2]۔ انھوں نے ہی فرمایا

---

1 اشارہ اس حدیث قدسی کی جانب ہے ''مازال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتیٰ یسمع بسمعی و یبصر ببصری و یبطش بایدی و یمشی برجلی'' میرا بندہ ہمیشہ نوافل سے میری نزدیکی چاہتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں جب میں اس کو چاہنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے..الخ (بحوالہ اصطلاحات صوفیہ از شاہ محمد عبدالصمد ص 113)

2 توحید نسبتوں کے سقوط کا نام ہے۔

ہے کہ ''سبحان اللہ'' ہمارے اندر سے بندہ جاتا رہا جو دلیل نسبت تھا اِلٰہ ہو گیا ہے۔ ''التوحید اسقاط الاضافات '' انھوں نے ہی کہا ہے ''بندہ اس وقت بندہ بنتا ہے جب اس کو خود بخود دیکھے۔''الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ[1]، لم اعبد مالم اراہ[2] '' سے بھی اسی جانب اشارہ ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے'' خالق نے جب اپنی توحید کو چھپایا مخلوق بن گیا''

انھوں نے ہی فرمایا ہے ''عالَمْ '' اور حق کے درمیان کلمہ '' من '' کا ربط ہے کیونکہ کہ عالم اُسی سے ناشی ہے اور کلمہ ''با '' کا بھی ربط ہے کہ عالم اسی کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ صدور اور رجوع، ازل سے ابد تک اور تمام اوقات وزمان میں ہے۔ کیونکہ یہ عالم حق کی معیت میں ہے اور حق سے ہی برآمد ہوا ہے جیسے کہ موج دریا سے نکلتی ہے اور کلمہ ''فی '' بھی عالم اور حق کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے کیونکہ عالم حق میں ہے اور حق عالم میں ہے کہ ایک صورت میں مَظہر اور ایک صورت میں یہ مُظہر اور کلمہ ''واؤ'' بھی رابطے کا کام کرتا ہے کیونکہ معیت ذاتی، صفاتی اور فعلی بلاشبہ تحقیق شدہ حقیقتیں ہیں۔ اور کلمہ ''عین '' بھی۔ کیونکہ عالم ایک صورت میں عینِ حق ہے اور دوسری صورت میں حق عینِ عالم۔ اور کلمہ ''لیس '' بھی کیونکہ ایک صورت میں عالم عالم ہے اور حق حق ہے۔ نہ تو عالم حق ہے اور نہ حق عالم ہے اور ایک صورت میں تمام وجوہ سے منزّہ ہے اور عالم اور حق کے درمیان کوئی رابطہ ثابت نہیں ہے اس اعتبار کو ''لاتعین '' کہتے ہیں۔

انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ حقیقت مطلقہ کے وصول کی علامت یہ ہے کہ تجھ میں سے انانیت (مراد ''انی انا اللہ '' ہے) مرا بھارے اور یہ انانیت ہر چیز پر حاوی ہو اور تو ہر چیز کو بلا تکلف ''میں'' کہہ سکے۔ اس مقام پر معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ پردۂ تعین انانیت کوئی پردہ نہیں ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ جب صورت کا حجاب جس سے دوئی پیدا ہوتی ہے برطرف ہو چکا ہوتا ہے تو ان اسرار کی باتوں کو جیسا کہ چاہیے تو خوب سمجھ سکتا ہے۔ اگر تیری استعداد و قابلیت اس علم محال کے حاصل کرنے کی ہمت کر لے تو اہل کمال کے روبرو انکسار تمام اور حسن ظن سے پیش آ کر یگانگی کی راہ میں قدم رکھ اور نایافت سے ہرگز مت ڈر کہ ڈرنا راہ سلوک سے باز رکھتا ہے۔ ہمت بلند رکھ اور مردانہ وار اس راہ

---

1 احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔

2 جب تک میں نے اس کو دیکھ نہ لیا اس کی عبادت نہ کی۔

میں چل۔ میں بس تجھ سے صرف اس بات کا خواہش مند ہوں کہ کسی بھی صورت میں کسی بھی حالت میں مخالف شرع شریف نہ ہو وحدت وشریعت ہم لباس ہیں اگر چہ شروع میں تو یہ بات نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن آخر الامر ضرور سمجھ جائے گا۔ اے عزیز شریعت حقیقت کی صورت ہے اور حقیقت شریعت کا باطن ہے۔ جب تو عالم صورت میں رہتا ہے تو تجھے صورت سے چارہ کار نہیں ہے۔ تو حق کی صورت ذاتی ہے اور دیگر تمام صورتیں تجھ میں نمایاں ہیں۔ جب تو خود کو پہچان لے گا اور پا جائے گا حق کو بھی پالے گا۔ پھر تو دیکھے گا کہ ہر چیز کی حقیقت تجھ میں ہے اور تو حق ہے (یعنی حق سے جدا نہیں ہے) حق حق۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ نے فرمایا ہے کہ احدیت پر (توحید شہودی) وحدت (توحید وجودی) مقدم ہے علم کے اعتبار سے اور موخر ہے وجود کے اعتبار سے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے توحید دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک توحید ظلی کہ ابتداے سلوک سب کچھ حق پایا جاتا ہے اور دوسری توحید ذاتی اکملی کہ عروج تام کے بعد وحدت کا شہود کثرت میں میسر ہوتا ہے اور یہ اصالتاً ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے۔ "**انا اعطیناک الکوثر** " سے اسی جانب اشارہ ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ کسی عزیز نے کہا ہے کہ "**وصولک الی اللہ تعالیٰ وصولک الی العلم بہ والا فجل ربّنا ان یتعقل بہ شئ اویتصل ھو شئ** " (تیرا اللہ تعالیٰ تک وصول صرف علم وصول کے مقام تک ہے ورنہ تو ہمارا رب جل شانہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اسے سمجھ سکے یا وہ کسی چیز سے متصل ہو) علم بہ وصول پیدا کرنا چاہیے ورنہ وصول بحق تعالیٰ ممکن نہیں ہے۔ توحید شہودی یعنی علم بوصول میں حال دایم میسر ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے وہ دور ہی کب تھا جو قریب ہوتا اور اس سے کب جدا تھا کہ واصل ہوتا۔ "**ھو آلان کما کان** " (وہ اب بھی ایسا ہی ہے جیسا پہلے تھا) انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ جو کچھ شرع میں آیا ہے حق ہے اور جو کچھ صوفیہ فرماتے ہیں کہ غیر حق کوئی چیز موجود نہیں ہے یہ بھی حق ہے کہ ہمارے نزدیک سب کچھ حق ہے۔ یہ بھی انھوں نے فرمایا ہے۔ حضرت غوث اعظم کو خطاب ہوا۔ "**قل لا صحابک بالفقر ثم بالفقر فاذاتم فقرھم فلا ھم الا انا** " (اپنے اصحاب سے کہئے کہ فقر اختیار کریں۔ پھر فقر سے بھی فقر اختیار کریں جب ان کا فقر ختم ہو جائے گا تو پھر وہ نہ رہیں گے مگر میں) جب فنائے حقیقی کلی حاصل ہو جاتی ہے تو مرتبہ بقا باللہ ظہور کرتا ہے۔ "**فلاھم الا انا متحقق** " (بجاے ان کے میں ہوں محقق ہو جاتا

ہے)ہو جاتا ہے۔
انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ایک حقیقت ہے جو حقیقتیں بن گئی ہیں ایک ذات ہے جو بہت سی ذوات بن گئی ہے ایک صفت ہے جو بہت سی صفات بن گئی ہے۔ایک ہی نور ہے مختلف انوار کے ساتھ جلوہ گر ہے اور ایک ہی صورت ہے جو متعدد صورتوں میں ظاہر اور باہر ہے۔انھوں نے ہی فرمایا ہے۔حقیقتِ مطلقہ صور مقیدہ میں ظاہر ہے۔ وحدت بصورت کثرت جلوہ گر ہے۔ آیۂ کریمہ ''نسوا اللہ فانساھم انفسھم ''اس میں فنائے کلی کی طرف لطیف اشارہ ہے۔انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ''من عرف اللہ لا یضرہ ذنبٌ ''یعنی عارف سے ایسا گناہ واقع نہیں ہوتا ہے کہ اس کے نقصان کا سبب بن جائے۔مگر وہ گناہ جو معرفت سے پہلے ہو گیا ہو، ایسا نہیں ہے۔رہے مخلوق کے حقوق کے متعلق مظالم کے مطالبات، امید ہے کہ حق سبحانہ دعوے دار یعنی مظلوم کو اس عارف کی جانب سے راضی کر دے گا۔انھوں نے ہی کہا ہے کہ شیخ ابن عربی اور شیخ علاء الدولہ کے درمیان علم و معرفت کا فرق ہے کہ شیخ ابن عربی کا علم اس علم سے بلند تر ہے جو شیخ علاء الدولہ رکھتے ہیں لیکن لفظ ولایت میں دونوں برابر ہیں اور دونوں کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔انھوں نے ہی کہا ہے۔اس اختلاف کو جو وجود مطلق کے باب میں شیخ ابن عربی اور شیخ علاء الدولہ کے درمیان واقع ہوا ہے شیخ علاء الدولہ کے بعض مخلصوں نے اختلافِ لفظی کی جانب لوٹایا ہے مگر پھر بھی نزاع باقی ہے کیونکہ شیخ ابن عربی عالم کو موجود خارجی نہیں جانتے اور اعیان ثابتہ کو''صور علمیۂ ذات ملبس بصفات'' کہتے ہیں۔ان دونوں اصولوں میں وہ شیخ علاء الدولہ ان کے مخالف ہیں۔اس بارے میں انھوں نے (خواجہ خرد نے) یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ دونوں تحقیقیں خواجہ بیرنگ کے کلام سے لی ہوئی ہیں۔انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانہ دنیوی میں فرمایا تھا''الیوم تسد کل فرجۃ الافرجۃ ابی بکر ''(آج مسجد نبوی کا ہر چھوٹا دروازہ سوائے ابو بکر کے دروازے کے بند کر دیا جائے گا)اور بعض روایات میں بجائے فرجہ کے خوجہ واقع ہوا ہے۔آج سارے دروازے بند کر دیے جائیں گے ابو بکر کے دوازے کے سوا۔رضی اللہ عنہ۔اس کلام سے مراد وہ نسبت محبت ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے تھی۔اس کو نسبت حبّی سے تعبیر کرتے ہیں جو مقصود تک پہنچانے والی ہے اور حق یہ ہے کہ مرنے کے بعد کوئی نسبت علاوہ

نسبت حق کے فائدہ مند نہیں ہے۔
انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ شیخ ابن عربی نے ''فتوحات'' میں لکھا ہے کہ قطب کے لیے دو امام لازم ہیں ایک دائیں جانب دوسرا بائیں جانب۔ جب قطب عالم فنا سے عالم بقا کی جانب چلا جاتا ہے بائیں جانب والا امام اس کی جگہ خلیفہ اور نائب بنایا جاتا ہے اور دائیں جانب والا امام بائیں جانب کا امام ہو جاتا ہے اور دائیں جانب کسی نئے شخص کو امام بنا دیتے ہیں۔ انھوں نے ہی کہا ہے قطب کی دو قسمیں ہیں ایک قطب ارشاد کہ پیغمبر خدا اپنے عہد میں بذات خود قطب ارشاد تھے۔ دوسرا قطب ابدال کہ (آں حضرت) پیغمبر علیہ السلام کے زمانے میں اویس قرنی قطب ابدال ہوئے ہیں۔ اسی لیے پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے ''انّی لاجد نفس الرحمن من تلقاء الیمن'' (البتہ مجھے یمن کی جانب سے رحمٰن کی بو آتی ہے)
انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ایک عزیز نے کہا ہے کہ ''دنیا میں دو جواں مرد ہیں ایک حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے اویس جو عاشقی میں ممتاز ہیں۔'' انتہی۔ (اس پر) انھوں نے فرمایا کہ یہ کلام معرفت کی بات نہیں ہے۔ اس کلام سے خطا کی بو آتی ہے کیونکہ نبی اور اُمتی میں تقابل اچھی بات نہیں ہے کہ اویس قرنی تو خود ذات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عکسوں میں سے ایک عکس ہے چونکہ ان کی قابلیت کی استعداد ہدایت کی مقتضی تھی (تو پیغمبر کی صفات کی روشنی سے منور ہو گئے اور) اس درجے کو پہنچ گئے جیسے کہ آفتاب دھلے ہوئے کپڑے کو سفید کر دیتا ہے مگر دھوبی کے چہرہ کو کالا کر دیتا ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے۔ عارف کو کبھی اپنی تعریف بھلی معلوم ہوتی ہے کبھی بری لگتی ہے۔ جس وقت اس کی نظر اپنی حقیقت پر پڑتی ہے تعریف اچھی لگتی ہے کیونکہ اس وقت وہ مقام ربوبیت میں ہے اور کبھی اس کی نظر جب اپنے تعین پر ہوتی ہے تعریف ناپسند ہوتی ہے کیونکہ اس وقت وہ مقام عبودیت میں ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ زمانی نام کا ایک ملحد تھا جو علم ظاہر و باطن سے باخبر تھا۔ ایک دن اس نے خواجہ بیرنگ کے روبرو آ کر پوچھا۔ ''ماحقیقت الارض'' آپؒ نے فرمایا ''ہر چیز کی حقیقت ہمارے نزدیک ایک ہے۔ اس نے کہا جو کچھ آپ نے فرمایا حقیت ہے حقیقت نہیں ہے۔ آپ مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔ اس سلسلہ میں میرے شیخ خواجہ خرد نے یہ بھی فرمایا۔ خواجہ بیرنگؒ کے سکوت کا سبب یہ لگتا ہے کہ جب آپ پر سائل کی بوئے نفسانیت ظاہر ہوئی

کہ اس استفسار سے اس کی غرض چال اور دھوکہ ہے کچھ نہ فرمایا اور بات کو خوشی اور تبسم کے ساتھ ختم کر دیا ورنہ حقیت اور حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے اور جو حقائق اہل معقول نے بیان کیے ہیں قیاس اور تمثیل محض ہیں حقیقت میں حقیقت پر اعتراض کے علاوہ کچھ نہیں جیسا کہ صوفیہ کے نزدیک مشہور و مقرر ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ خواجہ احمد لاہوری نے فرمایا ہے کہ ایک دن میں خواجہ قطب الدین کے مزار کی زیارت کے لیے خواجہ بیرنگ کے ہمراہ گیا تھا جب قبر متبرکہ کے نزدیک پہنچے خواجہ قطب الدین تمام اہل قبور کے ہمراہ ظاہر ہوے، اور سب کھڑے ہو گئے مگر ایک شخص نہیں ہوا، بیٹھا رہا۔ جب ہم گھر کی طرف لوٹے میں نے خواجہ بیرنگ سے دریافت کیا وہ شخص کون تھا جو کہ نہیں اٹھا تھا۔ فرمایا کہ وہ مجذوب تھا۔ انھوں نے ہی فرمایا۔ ایک دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امیر المومنین علی رضی عنہ کے گھر تشریف لائے اور پوچھا اے فاطمہ علی کہاں ہیں؟ کہا ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ علی مسجد کے صحن میں سوئے ہوئے ہیں اور ان کا سر اور پشت خاک آلود ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قم یا ابو تراب" (اے ابوتراب اُٹھ) انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ نے اہل بیت کی منقبت میں یہ شعر فرمایا ہے [1]

این سلسلہ از طلاے ناب است   ایں خانہ تمام آفتاب است

انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ بیرنگ کے آستانے کے پردے کھچے ہوئے ہیں جب میں اندر داخل ہوا دیکھا کہ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم مجمع اصحاب کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ میں نے جا کر سر کو قدم مبارک میں رکھ دیا ہے۔ آں حضرت میری تعظیم کے لیے اٹھے ہیں اور مجھے زمین سے اٹھا کر آغوش میں لے لیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک نہایت لطیف محل میں آیا ہوں وہاں ایک فقیر ظاہر ہوا ہے اور میرا ہاتھ پکڑ کر سماع کر رہا ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ سماع کر رہا ہوں۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگا کہ تو قطب ہوگا میں نے کہا آپ کے بعد۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ابتدا حال میں کہ 20 سال کی عمر ہو گی میں ایک بزرگ عزیز جو شہر کے اکابر میں سے تھے، کے پاس گیا۔ انھوں نے مجھ سے معلوم فرمایا کہ آیۂ کریمہ "اللہ نور السموات والارض" کے کیا معنی ہیں؟

---

1 ترجمہ یہ سلسلہ چمکتا ہوا سونا ہے۔ یہ پورا گھرانا سورج کی طرح روشن ہے۔

میں نے کہا نور بمعنیٰ ''الظاھر بذاتہٖ و المظھر لغیرہٖ''[1] کہنے لگے ''جو کچھ تو نے کہا مجھے قبول نہیں ہے کہ نور وجود کے معنی میں ہے۔ میں نے عرض کیا۔ پس حاصل دونوں کا ایک ہے کیونکہ وجود اس معنی میں ہے کہ ''الوجود لذاتہٖ و الموجود لغیرہٖ''[2] جتنا میں عرض مطلب کرتا تھا وہ انکار کرتے تھے۔ انھیں عالم حقائق کی خبر نہ تھی۔ اسی بنا پر میری بات قبول نہ کی۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ایک دن میں نے خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب میرا گورستان سے گزر ہوا دیکھا کہ ایک قبر سے ایک صورت ظاہر ہوئی جلی ہوئی اور سیاہ، میرے سامنے آ کر کچھ کہہ رہی ہے جو سمجھ میں نہ آتا تھا آخر کار مجھے پتا چل گیا کہ عذاب میں گرفتار ہے اور سزائے سخت میں مبتلا ہے۔ مجھ سے مدد کا طالب ہے۔ میں نے حق جل وعلیٰ کی طرف توجہ کی تا کہ وہ عذاب سے چھوٹ جائے۔ ایک ساعت نہ گزری تھی کہ وہ صورت غائب ہوگئی۔ امید ہے کہ اس نے عذاب سے نجات پالی ہوگی۔ واللہ اعلم بحقیقت الحال۔

انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تمام عمر کوئی رات مجھ پر ایسی نہیں گزری کہ میں سویا ہوں اور صبح کو زندہ اٹھنے کی امید دل میں باقی رہی ہو۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ میں ابتدا حال میں دعائے ''اشباہ السما'' صحرا میں جا کر پڑھا کرتا تھا۔ مختلف صُور مبارکہ بہت زیادہ ظاہر ہوتی تھیں چنانچہ جنگل کے رہنے والے (جانور یا آہوانِ صحرائی) انھیں دیکھ کر بھاگا کرتے تھے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ایک رات میں نے شیخ ابن عربی کو خواب میں دیکھا کہ آغا رشیدا، بادشاہ وقت کی نوکری چھوڑ کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر کے اُن کے ہمراہ ہے۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ شیخ ابن عربی وَلایت محمدیہ کی ایک خاص نوع کے خاتم تھے اور امام مہدی ایک دوسری نوع کے خاتم وَلایت ہوں گے اور مہتر عیسیٰ مطلق خاتم وَلایت ہوں گے اور وہ تمام اولیاء امتِ محمدیہ میں تمام اولیاء سے اکمل ہیں حتیٰ کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ بعض مشائخ نے

---

1 نور الظاہرُ بذاتہٖ (ایسا نور جو اپنی ذات سے ظاہر) اور المظہر بغیرہٖ (دوسروں کے لیے مظہر) کے معنی میں ہے۔

2 وجود اپنی ذات کے لیے اور موجود دوسروں کے لیے۔

خود کو خاتم الولایت محمد یہ کہا ہے، آپ اس سلسلہ میں کیا فرماتے ہیں؟ خواجہ بیرنگ نے جواب دیا۔
ایسے ہی خود خواجہ بزرگ شیخ بہاء الدین محمد نقشبند قدس سرہٗ[1] ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے۔
''اس بات سے جو بزرگوں نے کہی ہے کہ توجہ بغیب ہویت کرنی چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل معقول کی یہ بات کہ توجہ مجہول مطلق کی جانب مانند معلوم (مطلق) نہیں ہوتی محل اشتباہ رکھتی ہے اور حق بات تو یہ ہے کہ توجہ مطلق ہو جاتی ہے اگر چہ علم نہ ہو جیسا کہ وجدان صحیح سے پتہ چلتا ہے۔
انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ہر جگہ اس کا ظہور اور اس کا نور ہے لیکن انسان ظہور اتم اور مظہر اعظم ہے اور حق سبحانہ، اپنی تمام صفات کے ساتھ اس میں جلوہ گر ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ خواجہ نقشبند نے فرمایا ہے کہ توحید کے راز تک پہنچا جا سکتا ہے لیکن معرفت کے بھید تک پہنچا دشوار ہے۔ اس معرفت سے مراد معرفت تفصیلی ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ صاحب عروۃ الوثقیٰ نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ خضر نے خود کو لوگوں میں چھپالیا ہے اور بار بار شادی کی ہے اور ان کی اولاد ہوئی ہے۔ ایک بار مدینے میں شتر بان آپس میں لڑ رہے تھے ایک پتھر خضر کے سر پر لگا اور ان کا سر پھٹ گیا مدتوں بیمار رہے۔ لوگ ان کی عیادت کو آیا کرتے تھے۔ لیکن مولانا نظام الدین نیشاپوری نے کہا ہے کہ یہ خضر سر شکستہ دوسرے ہیں جو کہ خضر ترکاں تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نظام الدین نیشاپوری چونکہ انھوں نے صاحب ''عروۃ الوثقیٰ'' جن کا نام علاء الدین ہے، کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ خضر کے صحبت داروں میں سے ہیں، ان سے خضر کے احوال معلوم کر رہے تھے۔ شیخ علاء الدین نے اپنی کتاب ''عروہ'' کی تحریر کے مطابق ہی جواب دیا۔ مولانا نظام الدین کو صاحب عروہ کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ مولانا نیشاپوری کہتے تھے کہ میں خضر ترحمان کو دریافت کرتا تھا مگر شیخ، خضر ترکان کی بات کرتے تھے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے جو جماعت مسلوب العقل ہو جاتی ہے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ مجاذیب کا ہے دوسرا مجانین کا جو حیوانات کی طرح بن جاتے ہیں۔ جو کچھ حیوانات کو معلوم ہوتا ہے انھیں بھی اس کا علم ہوتا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ مجنونوں کے سامنے نہ جانا چاہیے ہو سکتا ہے کہ کسی بات کا انھیں علم ہو اور ظاہر کر دیں حالانکہ وہ بات ظاہر

---

1 حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ پیدائش 4 رمحرم 718ھ/ 26 رفروری 1319، وفات 2 ررجب 802ھ بروز پیر مطابق 28 رفروری 1400، مزار مبارک چغانیان۔

کرنے اور کہنے کی نہ ہو۔ اہل ارشاد کے پاس جانا چاہیے اگر چہ ان کو بھی ساری چیزیں منکشف ہیں لیکن یہ لوگ اہل صحو و تمکین ہیں جس چیز کو حق تعالیٰ پوشیدہ رکھتا ہے یہ بھی پوشیدہ رکھتے ہیں اور کسی کا عیب ظاہر نہیں کرتے مگر ضرورت پڑنے پر۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ وَلایت ''واؤ'' کے فتحہ کے ساتھ قرب باطنی سے عبارت ہے اور اتحاد بحق سبحانہ سے مُعَنْوَن۔ نسبت قرب انتقال کے بعد بڑھ جاتی ہے اور عالم میں متصرف بھی ہوتی ہے۔ وِلایت ''واؤ'' کے کسرے کے ساتھ منصب سے کنایہ ہے کہ خدمت عالم اس سے متعلق ہے جیسے قطبیت اور ابدالیت وہ انتقال کے بعد منقطع ہو جاتی ہے اور اس شخص کے بجائے دوسرے کو خلیفہ اور نائب بنایا جاتا ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ابتدائے حال میں، میں کبھی کبھی سیر کیا کرتا تھا اور راستے کے کنارے ایک نداف تھا کہ لوگ اس کے بڑے معتقد تھے اور اس کو غوث کہا کرتے تھے میرا جب بھی اس کوچے سے گزر ہوتا وہ میرے حق میں دعائے نیک کرتا (میں نے بھی اس نداف کو دیکھا ہے۔ کمال) انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ قرب دو قسم کا ہوتا ہے ایک یہ کہ بندہ ظاہر ہو اور حق پوشیدہ۔ چنانچہ ''بی یسمع و بی یبصر و بی ینطق'' (وہ مجھ سے دیکھتا ہے اور مجھ سے سنتا ہے اور مجھ سے بولتا ہے۔ یعنی میری توفیق سے) اس پر شاہد ہے۔ اس کو قربِ نوافل کہتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ حق ظاہر ہو اور بندہ اس میں فنا اور مستہلک ''ان اللہ ینطق علی لسان عمر'' میں اسی قرب کی طرف اشارہ ہے اسے قربِ فرائض کہتے ہیں۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ شیخ جلال تھانیسری اولیائے حق میں سے ایک تھے جب آخر عمر میں حالت نزاع کو پہنچے، شیخ کو بے خودی اور بے شعوری بے حد ہو گئی تھی اور لوگ اس واقعہ سے متحیر تھے۔ شیخ نے یہ بیت پڑھی۔

قومے ز وجود خویش فانی[1] رفتہ چوں حروف در معانی

انھوں نے ہی فرمایا کہ آخری دم استغراق اور استہلاک بہت ظاہر ہوتا ہے اسی سلسلے میں یہ بھی فرمایا بعض لوگوں کو مرض الموت میں بے چینی دنیا سے انقطاع کلی نہ ہونے اور آخرت کی جانب عدم توجہ کے سبب ہوتی ہے۔ اگر خلق سے کامل انقطاع ہو جائے تو مرض الموت میں علاوہ راحت کے اور کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ ایک عزیز نے مجھ سے پوچھا کیا کوئی دلیل قرآن و حدیث

---

1 جو لوگ اپنے آپ سے فنا ہو جاتے ہیں وہ دنیا سے ایسے جاتے ہیں جیسے حروف معنی میں ڈوب جاتے ہیں۔

سے عالم کے حادث ہونے کی ملتی ہے؟ میں نے کہا یہ حدیث ''کان اللہ ولم یکن معہ شیء'' (اللہ تھا اور اس کی معیت میں کچھ نہ تھا۔) عالم کے حادث ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور میں نے یہ کہا کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جو کبار اصحاب میں سے ہیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سوال کیا کہ ''این کان ربنا قبل ان یخلق الخلق'' (ہمارا رب مخلوق کے خلق کرنے سے پہلے کہاں تھا؟) آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کان فی العماء مافوقه هوا و ماتحته هوا'' (وہ عماء میں تھا اس کے اوپر بھی ہوا تھی اور نیچے بھی ہوا تھی) یہ بھی حدیث کی دلیل ہے۔ اس عزیز نے کہا شاید قبل سے قبل ذاتی مراد رکھتے ہوں۔ میں نے کہا یہ بات ظاہر حدیث کے خلاف ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ آیۂ کریمہ ''فویلٌ للغاشیة قلوبهم عن ذکر الله''[1] ایسی جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو بے دلانہ طریقے پر یا غفلت قلب کے ساتھ صرف زبانی ذکر میں لگی ہوئی ہے، پس اس جماعت کا حاصل آخرت کی سختی ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ سید محمد مکی جو کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلفا میں سے ہیں، نے لکھا ہے کہ عبد مناف جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد ہیں، ان کے ایک بھائی تھے جو اب بھی زندہ ہیں اور کسی پہاڑ میں رہتے ہیں۔ میں نے ان سے ملاقات کی ہے اور صحبت اُٹھائی ہے۔ (واللہ اعلم) انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میرے شیخ[2] نے توحید کے غلبے میں خواجہ بیرنگ کو چند شعر لکھ کر بھیجے تھے جن میں کا ایک یہ ہے

اے دریغا کیں شریعت، ملت اعمائی است
ملت ما کافری و ملت ترسائی است

خواجہ بیرنگ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ تم کو شریعت کے آداب کی رعایت ضروری ہے وہ شعر ملحدانہ جو تم نے لکھے تھے ان کا قائل مقبول الٰہی نہ ہوگا۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمایا ہے کہ ''یشیب ابن آدم ''ویشبُّ فیہ

---

1 تو ان کے لئے خرابی ہے جن کے دل اللہ کے ذکر سے پردے میں ہیں۔

2 مراد شیخ احمد سرہندی ہیں (مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب نمبر 6)۔

خصلتان[1] الحرص و طول الامل ''اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اولیاء حق بھی بڑھانے میں ان دو مذموم صفتوں سے خالی نہ ہوں اور یہ بات بہت دشوار ہے۔ اور اس مشکل کا حل جو دل میں آتا ہے یہ ہے کہ جوانی ہی ان دونوں صفتوں کے وجود اور بقا کو متقاضی ہے لیکن اگر کسی نے جوانی میں ہی ان دونوں مذموم صفات کو خود سے ختم کر دیا ہو وہ جوانی سے موت تک ان مذموم صفات سے پاک صاف رہے گا۔ ہاں اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ''یشیب ابن آدم و یتولد او یحدث فیہ خصلتان ''مشکل ہو جاتی۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ایک حدیث میں ''العزلت منیة الصدیقین'' وارد ہوا ہے۔ کیونکہ صدیقین تکمیل اور ارشاد کے مرتبے پر قائم ہوتے ہیں اس لیے مخلوق خدا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تنہائی نہ ملنے کی وجہ سے عزلت کی تمنا ان کے دل میں جاگزیں رہتی ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ درویش، طالب حق کو چاہیے کہ جب تنگیٔ معاش اور ضروریاتِ زندگی غلبہ کریں تو کسی بھی دنیادار کے گھر نہ جائے بلکہ اگر پہلے سے آنا جانا تھا بھی تو اب احتیاطاً آنا جانا ترک کر دے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ شیخ ابن عربی نے فتوحات میں لکھا ہے کہ بعض لوگ جو دوسروں کی ماؤں، بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں پر نگاہ حرام ڈالتے ہیں بڑے بے غیرت ہیں کیا اس کام کو جائز قرار دیتے ہیں کہ لوگ ان کی ماؤں، بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں پر نگاہ حرام ڈالیں؟ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ''گناہ سے توبہ کر، دنیا سے بے رغبت بن اور اسباب کو نظروں سے گرا دے اور جو کچھ غیب سے بغیر کوشش کے ملے اسی پر قناعت کر کے لوگوں سے کنارہ کش رہ، ذکر بالتوجہ الی اللہ میں مشغول رہ اور اسی پر صبر کے ساتھ جم جا اور محبوب کے ظہور کا منتظر رہ اور قرب و بعد، قہر و لطف، خیر و شر بحکم تقدیر جو کچھ ظاہر ہو ہر چیز سے راضی اور خوش رہ کہ سب کچھ اسی کی صفت حکمت اور اسی کے فعل اور اسی کی جانب سے ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ فقیر حقیر کو خواجہ بیرنگ نے ذکر اسم ذات خواب میں تلقین فرمایا اور متوجہ ہوئے اور کیفیتِ نسبتِ معہودۂ اکابرِ نقشبندیہ ظاہر ہوئی۔ یہ سب حضرت شیخ احمد سرہندی کی خدمت میں پہنچنے کے بعد ہوا ہے گویا انھیں کا فیض اس کا محرک ہے۔ اس سلسلے کے بعض اکابر نے نفی اور اثبات کے معنی یہ لکھے ہیں کہ ''لا الٰہ'' میں کثرت کا رجوع وحدت میں ملاحظہ کرے اور ''الا اللہ'' میں کثرت

1 آدم علیہ السلام کی اولاد بوڑھی ہوتی جاتی ہے اور اس میں دو خصلتیں حرص اور لمبی آرزو جوان ہوتی جاتی ہیں۔

کی صورتوں میں وحدت کے ظہور کو دیکھے اور اس فقیر کے دل میں اسم ذات کے ذکر کا ایک مخصوص طریقہ القا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی حقیقت کہ روح اور جسم کا مجموعہ ہے پر متوجہ ہو کر لفظ ''اللہ'' کو اس پر وارد خیال کرے چنانچہ اس اسم اعظم کے غلبے، دبدبے اور عظمت سے یہ دونوں موہوم چیزیں عدم اور فنا میں چلی جاتی ہیں اور ان کی جگہ وہ حقیقت مشہود ہوتی ہے۔ اس طرح سے نفی اور اثبات کا حاصل مطلب اسم ذات میں درج ہو جاتا ہے۔ یہ ذوقِ خاص خواجہ بیرنگ کی اسی تلقین خاص کا نتیجہ ہے جو انھوں نے خواب میں فرمائی تھی خواجہ بیرنگ نے اس طریق کو بہت تقویت پہنچائی ہے اور اس نسبت کو بہت شائع کیا ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ مبتدی ''لا معبود الا اللہ'' کا لحاظ رکھے اور متوسط ''لا مقصود الا اللہ'' اور منتہی ''لا موجود الا اللہ'' کو ملحوظ رکھے اور ''لا متصرّف الا اللہ'' بھی آیا ہے۔

حضرت خواجہ نقشبند نے فرمایا ہے ''لا الــــــہ'' معبودانِ طبعی کی نفی اور ''الا اللہ'' معبود حقیقی کا اثبات ہے اور ''محمد الرسول اللہ'' اطاعت کے مقام میں داخل ہونا ہے۔ یہ فقیر عرض کرتا ہے کہ کلمہ طیبہ کی یہ تحقیق حضرت خواجہ احرار کی کتاب ''فقرات'' میں جو طریق سلوک خاص نقشبندیہ اور معرفت الٰہی میں بےنظیر ہے، ثبت ہے۔ سبحان اللہ کیا قہرمان وسطوت ہے جو اس کلام قدسی سے ظاہر ہے اور دوسرا طریقہ توجہ اور مراقبے کا ہے کہ اس معنیٰ بے کیف وکمیت کو جو اسم مبارک ''اللہ'' سے مفہوم ہوتا ہے بلا کسی عربی فارسی یا دوسری زبان کی عبارت کے تلفظ کے ملاحظہ کرے اور اس معنیٰ کو دھیان میں رکھ کر تمام جوارح مدرکہ اور قوی کے ساتھ قلب صنوبری کی طرف متوجہ ہو اور اسی معنیٰ پر مداومت رکھے اور اس کی نگرانی میں یہاں تک تکلف برتے کہ وہ وقت آجائے کہ کلفت درمیان سے جاتی رہے کیونکہ سالک کے وجود میں جذبے کا تصرف ہونے سے پہلے اس معنیٰ کا لحاظ رکھنا نہایت مشکل ہوتا ہے چاہیے کہ معنیٰ مقصود کو ایک نور جو تمام موجودات علمی اور عینی کو بسیط اور محیط ہو، کی صورت میں خیال میں جمائے اور اس نور کے ساتھ تمام جوارح مدرکہ اور قوی کے ساتھ قلب صنوبری کی طرف اس وقت تک توجہ رکھے کہ وہ صورت درمیان سے اٹھ جائے اور مقصود حاصل ہو جائے۔

درکون و مکاں نیست عیاں جز یک نور ظاہر شدہ آں نور بانواع ظہور
حق نور و بانواع ظہورش عالم توحید ہمین است و دگر وہم و غرور[1]

اس طائفہ عالیہ نقشبندیہ کے اکثر اکابر قدس اللہ اسرارہم نے توجہ اور مراقبے کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے اور دونوں کو ایک ہی چیز بتلایا ہے جیسا کہ ابھی ذکر ہوا لیکن حضرت عَلیہ صدر مسند ارشاد وہدایت، جامع نعوت و خصائصِ ولایت حضرت خواجہ عبیداللہ احرار قدس سرۂ[2] دونوں میں فرق کر کے فرماتے ہیں کہ مراقبہ باب مفاعلہ سے ہے جو دونوں جانب سے مراقبے کا تقاضا کرتا ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ مراقبے کو میں اس معنی میں بیان کروں کہ ''مراقبہ بندے کی اللہ تعالیٰ کی ذات سے آگاہی اور علم کا نام ہے، اس خیال کے ساتھ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اُس سے دائمی طور پر باخبر ہے اور اس کے ساتھ ہے۔'' جیسا کہ امام ابوالقاسم قشیری قدس سرۂ[3] نے اپنے رسالے (قشیریہ) میں خود بیان فرمایا ہے کہ بندے کے علم میں ہر وقت یہ بات رہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ میرے حال سے مطلع ہے، مراقبہ کہلاتا ہے اور حضرت خواجہ بزرگ قدس سرۂ نے فرمایا ہے کہ مراقبے سے مقام وزارت الٰہی اور ملک وملکوت میں تصرف کرنے کے درجے کو پہنچا جا سکتا ہے۔ باطن کو ہر وقت نور الٰہی سے منور رکھنے کا نام مراقبہ ہے۔ مراقبے کے مَلکہ سے ہمیشہ جمعیت خاطر اور مخلوق خدا کے دلوں میں قبولیت کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ بعضے اکابر طریقت قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم نے فرمایا ہے کہ مراقبہ یہ ہے کہ بندہ خود کو ہر لحہ اللہ تعالیٰ کے روبرو جانے اور ہر جانب سے خود کو جنت میں داخل دیکھے اور حق تعالیٰ کو ہر عیب سے پاک جانے۔ علاوہ ازیں مراقبہ اور توجہ کے اور معنی بھی

---

1 کون ومکاں میں سوائے ایک نورالٰہی کے کچھ بھی ظاہر نہیں ہے، وہی ایک نور مختلف قسم کے ظہورات میں ظاہر ہو گیا ہے۔ وہ نور نورِ حق ہے جو نوع نوع شکلوں میں ظاہر ہو کر عالم بن گیا ہے۔ توحید یہی ہے اس کے علاوہ سب وہم وگمان اور دعویٰ محض ہے۔

2 اسم مبارک عبیداللہ، ولادت ماہِ رمضان المبارک 806ھ/1404، باغستان، مضافات تاشقند، وفات 29/ربیع الاوّل 895ھ/19/فروری 1490۔

3 نام عبدالکریم ابن ہوازن القشیری مرید خاص حضرت شیخ بوعلی دقاق۔ وفات ماہ ربیع الاوّل 465ھ/دسمبر 1072 مصنف رسالہ ''قشیریہ'' اور تفسیر ''لطائف الارشادات''۔ رسالہ قشیریہ اصطلاحات صوفیہ، رموز ونکات تصوف اور احسان وسلوک پر ایک نادر معلومات سے بھری کتاب ہے۔

بزرگوں نے بیان کیے ہیں۔ اور ہر ایک نے اپنے مقام کی خبر دی ہے اور جس راہِ سلوک سے وہ گزرا ہے اسی کی شناخت کرائی ہے۔ اسم ذاتِ الٰہی کا ذکر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا مختار طریقہ ہے لیکن ان کا طریقہ مخفی طور پر اسم الٰہی کا لفظ (اللہ) ہے۔ اگر چہ وقوف قلبی طریقۂ نقشبندیہ کی ضروریات میں سے ہے یعنی قلب صنوبری کی جانب توجہ کرنا لیکن اس توجہ الی القلب کا مقصد صرف جمعیت کو بہم پہنچانا ہے۔ ایسا شخص جو متوجہ الی القلب ہو جس چیز کی طرف بھی توجہ کرے اور اس توجہ کو حقیقت الحقائق کی جانب یکسو کر دے تو انشاءاللہ مقصود کو پہنچ جائے گا کیونکہ تمام اشیا وجود حقیقی کے بالمقابل حقیقتاً کوئی وجود ہی نہیں رکھتیں۔ میرا، دلی ارادہ ہے کہ اس طریقۂ نقشبندیہ کے تمام آداب کو تفصیل کے ساتھ ایک رسالے میں علاحدہ لکھا جائے۔ اس جگہ اسی قدر کافی ہے۔

انھوں نے ہی فرمایا ہے ''خلوت در انجمن'' اس بات سے عبارت ہے کہ عین صحبت خلق کی صورت میں ذات حق میں اس طرح مشغول ہو کہ مخلوق کی صحبت اس کی مشغولی میں مزاحم نہ ہو بایں طور کہ وہ اپنے اشغال پر مطلع بھی رہے تا کہ اسے خلوت کہا جا سکے۔ ایک دوسرے معنی خلوت در انجمن کے یہ ہیں کہ کثرت خلق میں وحدت کا مشاہدہ کرے اور ہر ایک شے میں تنہا اسی ذات کو ملاحظہ کرے۔

''سفر در وطن'' اس سے عبارت ہے کہ اخلاقِ ذمیمہ سے اخلاقِ حمیدہ کی جانب رجوع کرے اور ایک دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنی صورت سے اپنی حقیقت کی طرف جائے یعنی کثرت سے وحدت کی طرف منتقل ہو۔ ایک اور معنی یہ ہیں کہ جہاں بھی جائے سب میں حق کا مشاہدہ کرے اور ہر جگہ حق کو مظاہر میں متحرک دیکھے۔ چنانچہ جب کوئی شخص صفت ''خلوت در انجمن'' سے متصف ہو جاتا ہے تو اسے اپنے آپ سے بھی بے خبری ہو جاتی ہے، اس وقت وہ عین صحبت وجلوت میں بھی خلوت میں ہوتا ہے اور ''سفر در وطن'' فنا کے بعد کسی واصل کی صفات الٰہی میں سیر سے عبارت ہے کہ اس مقام میں اسے صفاتِ الٰہی سے متصف بھی کہا جا سکتا ہے۔ اے عزیز درحقیقت یہ دونوں صفات یعنی ''خلوت در انجمن'' اور ''سفر در وطن'' وجود الٰہی کی صفات ہیں اور سالک مظہر الٰہی ہونے کی وجہ سے ان دونوں سے محظوظ ہوتا ہے، یہ بات خوب سمجھ لیں۔

''نظر بر قدم'' سے مراد یہ ہے کہ چلنے پھرنے میں نظر قدم پر جمائے رکھے تا کہ کوئی دیکھی ہوئی چیز آفتِ دل کا سبب نہ بن جائے۔ اور دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ جس صفت سے بھی متصف ہو اس

صفت کا حق ادا کر کے دوسری صفت کی طرف نکل پڑے اور ایک دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ چلنے میں اس قدر جلدی دکھائے کہ قدم نظر سے پیچھے نہ رہے کہ طریقۂ جذبہ میں یہی مناسب ہے۔ یا یہ (معنیٰ ہیں) کہ ''نظر بر قدم'' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کو پیروی کی غرض سے نظر میں رکھنا ہے یا یہ مطلب ہو کہ اپنے شیخ طریقہ کے نقش قدم کی پیروی کا خیال رکھنا۔ یا قدم سے مراد کسی کامل مکمل کی صورت بشری ہو اور قدم اس کو اس واسطے کہتے ہیں کہ سب سے آخری تجلی ہے ''حتی تضیٰ اظہار قدم فیقول قف[1] '' سے اسی جانب اشارہ ہے۔ ہوش دردم یہ ہے کہ سانس کی آمد و رفت میں کوئی سانس بھی غفلت میں نہ گزرے یا یہ مراد ہے کہ ''نفس الٰہی (بوئے الٰہی) کا ہوش رکھتا ہو جو کہ ممکنات کا مادہ اور ذات الٰہی کا فیض ہے اور ہر شے میں ظاہر ہے اس حیثیت سے کہ وہ حقیقت حق مطلق ہے صورتاً سب سے پہلا ظہور ہے۔ اور انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی انانیت ہی اسم اعظم ہے (یعنی ''اِنّی اَنا اللہ '') اور ہر جگہ اس کا ظہور ہے اور اس انانیت کا بوجہ اکمل واتم ظہور انسان کی انانیت میں ہے بلکہ انانیت انسانی ہی ہے جو سب میں ظاہر ہے۔ خوب سمجھ لو۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے، وہ نسبت جو کہ بغیر کسی واسطے کے ذات الٰہی سے قائم ہے، نسبت علم ہے۔ اس کے علاوہ تمام حقائق الٰہیہ اور کونیہ اسی نسبت علم کے توسط سے ذات الٰہی سے قائم ہیں۔ اور حقائق کونیہ جو کہ خارج میں دکھائی دیتے ہیں اور بخشش وجود حقیقی کے سبب ان کا اعتبار قائم ہے، وہ بھی نسبت علمی سے مستغنی نہیں ہیں۔ علم کی نسبت حقیقی نسبت ہے۔ علم کے علاوہ دیگر نسبتیں اضافی ہیں یعنی وہ ایسی نسبتیں ہیں کہ علم ان کے وجود کا سبب ہے۔ کمالِ کمال یہ ہے کہ ذات بحت طالب کے پیش نظر رہے۔ اس مرتبہ کمال پر پہنچ کر علم بھی کل کا کل سالک سے نکل جاتا ہے، یہاں علم کا نام و نشان بھی نہیں رہتا صرف جہل و حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ حضرات خواجگان نقشبندیہ کی نسبت یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب کرے۔ اور یہ بھی انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ تمام مجاذیب کو اس علم کی کوئی حاجت نہیں کہ ''جُـزو لا یتجـزیٰ'' کے حقائق کے راز ان پر ظاہر ہوں۔ اس مقام میں کوئی افلاطون مزاج یعنی ایسا شخص جو فکر عالی سے بہرہ ور ہے اور

---

1 یہاں تک کہ آگے قدم کی گنجائش نہ رہی (تو معراج میں) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ''محمد'' ٹھہر جائیں۔

ذوقِ تیز کی کشادگی بھی اس کو حاصل ہے، اس بچے کی مانند ہے جو الف با (ا،ب) بھی نہیں جانتا اور اس کو میں اور تو کی بھی شناخت نہیں وہ مقام مجذوب کو تو کیا پہنچے گا۔ اس مقام کے بارے میں ایک بات لکھی جاتی ہے، میرا گمان یہ ہے کہ افرادِ امت میں سے جس نے بھی اس بات کو کہا ہے اس کی تکفیر ضرور کی گئی ہے اور وہ بات یہ ہے "کون اور کائن حقیقتاً وجود الٰہی ہے" (یعنی کائنات اور جو اس کا بنانے والا ہے حقیقتاً واجب الوجود ہی ہے) اگر چہ چند نادان اسے نہ سمجھ سکیں گے مگر میں نے عقل کی بات عرض کر دی ہے۔ جو سمجھا سمجھا اور جس نے چکھا چکھا اور جو نہ سمجھا نہ سمجھا اور جس نے نہ چکھا نہ چکھا۔ اور انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے 7 رمضان 1052ھ میں اتوار کی رات کو میں نے خواب دیکھا کہ "الف لام را الرا اور الٓم" (الم را) کے ایک ہی معنی ہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ خواب میں دکھایا گیا کہ لطف محمد اور قرب محمد آئے ہیں۔ فقیر نے استقبال کیا ہے۔ اور پہلے لطف محمد سے ملا اور اس کے بعد قرب محمد سے۔ ذوق اور وجد نے اس فقیر کو لے لیا اور اسی حال میں کہتا تھا کہ آپ لطف محمد ہیں اور آپ قرب محمد ہوتے ہیں اور یہ دونوں "ماوراء النهر" کے بزرگوں کی صورت میں تھے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہا گیا کہ اس طرح دعا کرنی چاہیے۔ "الٰہی بحرمت محمد نقشبند و اصحاب نقشبند" اور اس آیۃ کی طرف اشارہ لگتا تھا "ومن يتق الله يجعل له مخرجاً و يرزقه من حيث لا يحتسب"[1] اور انھوں نے ہی کہا ہے کہ ایک رات میں نے عبدالحکیم کو خواب میں دیکھا کہ وسواس کی بیماری کہ اس کا مادہ ضعف دل ہے، کے دفع کے لیے اجازت دے رہے ہیں کہ پچاس مرتبہ سورہ فاتحہ سحر کے وقت یا صبح کو پڑھنی چاہیے اور یہ بھی کہا کہ ایک کو یہی بیماری ہوگئی تھی اس نے پڑھی اور وہ بیماری رفع ہوگئی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ اس کا ثواب حضرت النساء عالم فاطمہ زہرا کی روح کو پہنچانا چاہیے۔ اور انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نے واقعے میں خود کو سر سے پیر تک ننگا دیکھا، دن رات ایک وادی ریگزار اور خاردار میں سرگرداں ہوں اور آفتاب شدت گرمی سے تابناک بنا ہوا ہے اور آسمان کی جانب سے ندا آرہی ہے "جو راہ تو چل رہا ہے یہ راہ محبت ہے ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) اسی راہ

1 اور جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے تنگیوں سے نکلنے کی صورت پیدا فرما دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچاتے ہیں جس جگہ سے اسے کوئی سان گمان بھی نہ ہو۔

سے گزر رہے ہیں اور میں خوش وخرم اور آزادنہ چلا جارہا ہوں''

انھوں نے ہی فرمایا ہے۔''ایک رات کو واقعے میں خود کو ایک بہت بڑے صحرا میں دیکھا جس میں بہت بڑی بڑی مصفیٰ عمارتیں ہیں جن کے ستون نہایت بلند و بالا ہیں اور اس صحرا میں ایک عالیشان پُر لطف باغ بھی ہے وہ مقام، مقام بہشت ہے اور میں اس میں داخل ہو گیا ہوں، میرے سب یاران و متعلقین بھی میرے ساتھ ہی اندر آئے ہیں لیکن ایک شخص مجھے نہیں ملا حالانکہ وہ اسی زمانے میں دنیا سے رخصت ہوا تھا۔ ایک بار میرے شیخ ابتدا حال میں محمد قلی کی عیادت کے لیے جسے تپ کی بیماری لاحق تھی تشریف لے گئے چونکہ وہ اسے بہت عزیز رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں۔ اس بیماری کے دفع کی جانب متوجہ ہوئے اور اس کا بخار اپنے آپ پر لینا شروع کر دیا۔ لمحے بھر میں اسے صحت ہوگئی اور اٹھ بیٹھا اور میرے شیخ بخار لے کر گھر لوٹے۔ وہی شیخ محمد قلی کہتا ہے کہ ایک دن ایک بدطینت مردم آزار ہندو کہ مخلوق اس کے ہاتھ سے جان سے عاجز ہوگئی تھی میرے شیخ کے روبرو گستاخانہ آیا اور حد درجہ بے ادبی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میں غصے میں بھرا ہوا اپنا ہاتھ خنجر کے دستے تک لے گیا اور چاہتا تھا کہ اسے خنجر ماروں۔ میرے شیخ نے فرمایا ''چند دن صبر کرنا چاہیے، دیکھیے کیا ہوتا ہے؟'' چند روز کے بعد اس ہندو کو راجپوتوں کی ایک جماعت سے سابقہ پڑ گیا اور مارا گیا اور جہنم میں پہنچ گیا۔ ایک بار حافظ مہر علی کہ میرے شیخ کے دوستوں میں سے تھے، سفر میں تھے۔ سنبھل پہنچ کر سنا کہ فلاں صحرا میں راہ زن لوٹ مار کر رہے ہیں۔ مغموم اور فکرمند ہوئے اور یہ ارادہ کیا کہ آگے نہ جائیں۔ میرے شیخ کو خواب میں دیکھا کہ حافظ کو اپنی حمایت میں لیے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ جس جگہ کا تو نے ارادہ کیا ہے وہاں جا، ڈر مت۔ خطرناک مقامات میں ایک شخص کمیت گھوڑے پر سوار تیر وکمان ہاتھ میں لیے ہوئے بائیں طرف سے سامنے آئے گا اور تجھے اس جگہ سے سلامت گزار دے گا۔ اس خواب سے اُن کے دل میں قوت پیدا ہوئی اور روانہ ہو گئے۔ اسی خطرناک صحرا میں ایک سوار اسی کیفیت سے سامنے آیا، تیر کمان میں چڑھائے ہوئے۔ بغیر کسی مزاحمت کے وہاں سے گزر گئے اور بہ سلامت منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ ایک بار میرے شیخ نے ایک مستحق اعانت درویش کے بارے میں دہلی کے حاکم کو سفارشی رقعہ لکھا وہ حاکم، بادشاہ کے قریب ہونے کی وجہ سے مغرور، جاہ ونخوت سے بھرا ہوا

تھا، بولا'' ہم اس جماعت کے معتقد نہیں ہیں اور رقعہ پھینک دیا۔ جب یہ بات میرے شیخ کو پہنچی
ان کے دل کو لگ گئی اور انھیں ایام میں وہ حاکم بیمار ہو گیا کیونکہ اس کی اہلیہ پہلے ہی سے ایسی
معاملوں میں شیخ کی طرف رجوع کرتی تھی اور میرے شیخ حافظ موسیٰ کو جو کہ بہت مخلص ہیں اور
حضرت کے خدام میں بہت نیک طبیعت ہیں توجہ اور اعمال کا حکم فرماتے اور مقصود حاصل ہو جاتا
تھا۔ اس بار بھی وہ اپنے شوہر کی بیماری کے سلسلے میں حاضر ہوئی اور حافظ صادق نے جو میرے شیخ
کے دوستوں میں سے ہیں اور صاحب معنیٰ ہیں۔ انشاء اللہ ان کا ذکر آگے آئے گا، اس عورت کی
سفارش کی۔ میرے شیخ نے کچھ نہ فرمایا انھوں نے دوبارہ عرض کیا شیخ نے پھر بھی تغافل کیا جب
زیادہ بضد ہوئے تو فرمایا کہ اس بار وہ اٹھنے والا نہیں ہے اور اس نے اُسی مرض میں جان دے
دی۔ ایک بار میرے شیخ کے خادم نے شیخ کی ملکیت کی تفصیل دکھا کر بادشاہ کے وزیر سے ملکیت
کی سند چاہی۔ وزیر نے کہا ہم اسے (درست) نہیں سمجھتے جب تک تحقیق نہ کر لیں ہم سند نہیں
دیتے۔ خادم نے آکر حقیقت حال شیخ سے بیان کر دی۔ اس بات کے اثر سے ان کے مزاج میں
ایک تبدیلی آئی اور فرمایا'' قبر میں جا کر سمجھے گا'' اسی زمانہ میں وہ وزیر ایک سخت بیماری میں مبتلا
ہو گیا اور دنیا سے چلا گیا۔ ایک بار ایک دنیادار نے میرے شیخ کی شکایت ایک بڑے امیر شخص جو
اس کے اقربا میں سے تھا، سے کی۔ جب میرے شیخ نے سنا تو فرمایا۔ وہ چند دن میں جانے والا
ہے۔ اسی زمانے میں اس کے متعلقین میں سے کسی نے اسے زہر دے دیا اور وہ بڑی سختی اور
تکلیف اٹھا کر مر گیا۔ ایک روز میرے شیخ کا خادم ایک جھاڑی میں الجھ گیا۔ ناگاہ ایک گبریلہ اس
کے سامنے آکر کھڑا ہوا اور اس کے مارنے کا ارادہ کیا۔ اس نے میرے شیخ کو شفیع بنایا۔ اسی اثنا
میں میرے شیخ کی صورت مبارکہ حاضر ہوئی اور اس کو سلامتی کے ساتھ گزار دیا۔ شیخ نظام الدین
کہتے ہیں کہ میں خواجہ خرد کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک دن شہر دہلی کے بزرگ زادوں میں سے
ایک شخص نے میرے شیخ کو لکھا، اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی خدمت میں عربی کا ایک سبق
پڑھ لیا کروں۔ میرے شیخ نے اس رقعے کے حاشیے پر لکھ بھیجا کہ نصف رمضان تک توقف کرنا
چاہیے۔ اس کے بعد جو بھی ہے ظہور میں آنا ہے۔ یہ بات شروع رمضان میں پیش آئی تھی۔ اس
نے معلوم کرایا'' نصف رمضان تک توقف تک کس بات کا انتظار ہے کہ جس کا اشارہ فرمایا ہے۔

اس نے اس بات کو اپنے خیال میں دنیا سے رخصتی پر محمول کیا۔ آپ نے جواب دیا ''ایسا ہی دل میں آیا تھا'' آخرالامر 14 رمضان المبارک 1073ھ (1663) کو وہ جوان دنیا سے چلا گیا۔
ایک رات میرے شیخ کے باورچی خانے میں آگ لگ گئی اور جو کچھ اس گھر میں تھا سب جل گیا۔ آگ بجھ جانے کے بعد ایک شخص نے میرے شیخ کی مسواک اس راکھ سے صحیح سالم نکال لی اس کا کوئی ریشہ بھی نہ جلا تھا۔ ایک درویش نے اپنا قصہ بیان کیا کہ میں لاہور میں ایک بار سخت بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ زندگی کی امید ختم ہو چکی تھی۔ دل پُر درد سے آہ سرد کھینچتا تھا کہ ایک رات خواب میں دیکھا کہ بہت سے درویش بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان ایک پر وقار و باعظمت بزرگ چہار زانوں بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں اور ان کا اسم شریف کیا ہے۔ لوگوں نے کہا خواجہ خرد نقشبندی ہیں کیونکہ میں اس نام سے آشنا تھا فوراً اُٹھ کر ان کے قدموں میں جا پڑا اور اس بلا سے جس میں مبتلا تھا، کے دفع کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا اور کچھ پڑھ کر مجھ پر دم کیا۔ جب میں خواب سے بیدار ہوا بدنی تکلیف بالکل جا چکی تھی۔ اس کے بعد وہ درویش ایک بار دہلی میں شیخ کے پاس آیا اور یہ رباعی پڑھی

رباعی

ہر پاکہ بخدمت رسد سر گردد مقصود دو عالمش میسّر گردد
ما مِسیم و کیمیائید شما ہر مِس کہ بکیمیا رسد زر گردد[1]

ایک درویش نے فرمایا کہ میں نے دنیا کی بہت سیر کی ہے اور بہت سے مشائخ کبار اور دوستانِ حق کو دیکھا ہے۔ لیکن جیسی کیفیات اور وجد اور حال خواجہ خرد کی صحبت میں ظاہر ہوا کسی جگہ ظاہر نہ ہوا اور یہ بھی فرمایا کہ ایک دن میں سفر سے واپسی پر ان کی صحبت میں پہنچا اور سلام کیا۔ انھوں نے مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ اور قریب آ۔ میں قریب پہنچا۔ وہ کچھ پڑھ رہے تھے اس کی آواز میرے کان میں پہنچی۔ میرا حال دِگرگوں ہو گیا اُن پر گر پڑا اور اپنے آپے سے گزر گیا۔ جب مجھے افاقہ ہوا وہ اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ جب میں نے زمانہ غیبت کی تفتیش کی معلوم ہوا کہ چار گھنٹے سے زیادہ گزر

---

1 ہر وہ پیر جو تیری خدمت میں پہنچا سر بن گیا اور اس کو مقصود دو عالم حاصل ہو گیا۔ ہم تو مِس ہیں اور آپ کیمیا ہیں۔ جو، تانبا کیمیا کے پاس پہنچ جائے سونا بن جاتا ہے۔

گئے ہیں اور یہی حال لمبی مدت تک ہوتا تھا۔ اسی درویش نے فرمایا ہے کہ ایک وقت میں سفر میں تھا کہ ناگاہ چار شخص قطاع الطریق (راہ زن) میں سے ظاہر ہوئے۔ ہم سفر مضطرب ہو گئے۔ رہزنوں نے کہا جو کچھ تمھارے پاس ہے ہمیں دے دو ورنہ ہم طاقت کے زور سے تم سے لے لیں گے۔ ہم لوگ حیران کھڑے تھے کہ میں اسی اثنا میں خواجہ خرد کی جانب متوجہ ہوا دیکھا کہ وہ سامنے کھڑے ہیں اور غضب تمام کے ساتھ اس جماعت کو گھور رہے ہیں۔ وہ سب متفرق ہو کر بھاگ گئے اور ہم نے اس طرح ان رہزنوں سے چھٹکارا پایا۔ خواجہ سلام اللہ میرے شیخ کے فرزند ہیں فرماتے تھے کہ دوسری بار جب میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ لاہور گیا سخت بیمار ہو گیا اور مرنے کے قریب ہو گیا۔ میرے بھائی خواجہ کلمۃ اللہ میرا یہ حال دیکھ کر سخت بے چین ہو گئے۔ اسی درمیان میرے والد صاحب دروازے سے اندر داخل ہوئے اور میرے پاس کھڑے ہو گئے اور کچھ پڑھا ایک لمحے میں، میں بے تکلف ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے ہی (یعنی خواجہ سلام اللہ) نے فرمایا ہے کہ ایک دن ایک عزیز نے میرے والد صاحب سے کہا کہ کل میں فلاں فاضل قرّا کے پاس تھا میں نے دریافت کیا کہ مسئلہ وحدت وجود کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ انھوں نے کہا چند گمراہ لوگ یہ راہ چلے ہیں اور انھوں نے دولت سعادت کے سرے کو ہاتھ سے دے دیا ہے۔ میں نے کہا۔ بہت سے اکابر اولیاء اللہ کے کلام میں یہ بات آئی ہے اور مولوی جامی کا مشرب بھی یہی ہے۔ ''قـرّاء'' نے کہا۔ ''جامی خامی کا قول کیا اعتبار رکھتا ہے (خواجہ سلام اللہ کہتے ہیں کہ) یہ بات سنتے ہی میرے والد صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا اور بہت دیر تک کوئی بات نہیں کی پھر فرمایا۔ ہم نے اس کو حضرت مُلّا جامی کے سپرد کر دیا ہے اس کا کام تمام ہو جائے گا۔ اسی ہفتے بلا کسی بیماری کے وہ قرّا مر گیا۔ ایک بار میرے شیخ کے مریدوں میں سے ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کر لی مگر بوقتِ خلوت عاجز رہ گیا۔ بہت سی قوت باہ کی دوائیں کھائیں بہت سے علاج کرائے فائدہ نہ ہوا یہاں تک کہ دو سال اسی حال میں بیت گئے۔ ایک دن بطور مہربانی آپ نے اس جوان سے کہا ''جا اپنی۔ بیوی کے پاس جا کر سو'' وہ بہت کچھ شرمندگی اُٹھائے ہوئے تھا، تیار نہ ہوا۔ بہت تاکید کے ساتھ بڑی مشکل سے اُس جوان کو بھیجا اور درویش (یہاں غالباً خود محمد کمال صاحب اسرار یہ مراد ہیں) سے فرمایا کہ اس رات مراقب بیٹھ اور توجہ کر۔ خود بھی متوجہ

ہوئے۔صبح کی نماز میں خبر پہنچی کہ فتح ہوگئی۔سید غلام محمد امروہوی جو کہ میرے شیخ کے خاص خلفا اور بڑے اصحاب میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ ایک وقت میرے چھوٹے بھائی سید وصال محمد دہلی میں بیمار ہوگئے۔حاذق اطبا ہر چند اُن کا علاج کرتے تھے کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا آخر تمام اطبا نے ان کے علاج سے معذوری ظاہر کردی اور اُن کے مرض کو مرض الموت سمجھ لیا گیا۔ جب ہم لوگ ان کی زندگی سے ناامید ہوگئے ناگاہ ایک دن خواجہ خرد تشریف لائے اور بیمار کی عیادت کی۔ میں نے نہایت عاجزی، انکساری اور الحاح کے ساتھ حقیقت حال عرض کی۔تھوڑی دیر متوجہ بیٹھے پھر فرمایا گرم پانی پلائیں ٹھیک ہو جائیں گے۔آپ کے فرمانے کے بموجب جب گرم پانی پلایا گیا اسی وقت ان کے مرض میں تخفیف ہوگئی اور تیسرے دن بالکل ٹھیک ہوگئے۔میں (سید محمد کمال) ایک بار اپنے شیخ کی خانقاہ میں بیمار پڑ گیا لیکن اس بیماری میں ہر روز چار یا پانچ بار جب بھی وہ تشریف لائے میں ان کی تعظیم کے لیے اٹھ جاتا تھا آخر کار ایک رات میں نے اپنا حال نہایت تنگ دیکھا چنانچہ ہذیان بکنا شروع کردیا جب کچھ شعور ہوتا خود سے کہتا کہ ان کو بلا کر عرض کروں کہ ''شیخا'' آپ کی عمر دراز ہو، جو زمین آپ نے اپنے دفن کے لیے تجویز کی ہے اس کے پایان مجھے دفن کر دیجیے گا۔جب صبح ہوئی وہ میرے پاس پہنچے اور توجہ کی بالفور مجھے تخفیف ہوگئی اور میں اچھا ہو گیا۔یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اپنے شیخ کے احوال اور خوارق عادات سے جو کچھ میں نے دیکھا ہے اور شیخ کے مخلصین سے اُن کے جو احوال سنے ہیں اور ان تصنیفات سے جن میں میرے شیخ کے احوال لکھے ہیں، اگر اُن سب کو چن کر تفصیل یا اجمال سے ہی اس جگہ لکھوں کتاب بہت طول ہو جائے گی ناچار اس کو کسی اور وقت پر موقوف کیا جاتا ہے۔انشاء اللہ۔اور اللہ تعالیٰ کی عنایات سے یہ امید ہے کہ ان کے سوانح کو علاحدہ باب میں تفصیل سے تحریر کروں اس وقت اسے اختصار کے طور پر بیان کیا ہے۔''اَللهُ و لـي التـوفيـق و بـه نستعين ''ایک سخت رکاوٹ کے سبب 1073ھ 1663 میں میرا اپنے شیخ کے پاس دہلی جانا میسر نہ ہوا تو وہ خود از راہ لطف و کرم سنبھل تشریف فرما ہوئے اور مجھے اپنی عنایات سے خوب خوب نوازا۔ مصرعہ

شاہاں چہ عجیب گر بنوازند گدا را

اور ایک ماہ اور ایک روز غریب خانے پر گذار کر واپس دہلی روانہ ہوگئے۔میں بھی حسن پور تک ان

کی معیت میں گیا۔ جس وقت مجھے الوداع کہا۔ بے اختیار گریہ مجھ پر طاری ہو گیا حتیٰ کہ دم گلے میں اٹکتا تھا آخر کار اس گریہ غیر معہود کا سبب معلوم ہوا کہ اگلے سال میرے شیخ کو کئی مرض لاحق ہو گئے اور ان گونا گوں بیماریوں کے باوجود طالبان و مستعدین راہ سلوک کو فیض پہنچانے کے لیے متوجہ رہتے۔ اسی مدت بیماری میں بار بار فرماتے تھے کہ ہم عنقریب دنیا سے چلے جائیں گے۔ سننے والے اس بات سے بے چین ہوتے تھے تو اُن کو دلاسا دلاتے اور تسلی کر دیتے تھے کہ یہ باتیں میں صبر و رضا کی راہ دکھانے کی غرض سے کہتا ہوں۔ دل کو پریشان نہ کریں اور اپنے بیٹوں کو بلا بلا کر لطف و عنایات فرماتے تھے۔ ایک دن صبح سویرے اپنے فرزندان کو بلایا۔ کیونکہ خواجہ غلام بہاء الدین سب سے نزدیک رہتے تھے جلدی پہنچ گئے۔ اُن سے فرمایا کہ میرے قریب ہو جاؤ، جو کچھ خواجہ بیرنگ و شیخ احمد (مجدد الف ثانی)، خواجہ حسام الدین اور شیخ اللہ داد سے ہمیں پہنچا ہے تجھے بخشا۔ انھوں نے عرض کیا میں آپ کے قربان جاؤں آپ کیا فرماتے ہیں؟ اور انھوں نے اپنا سر اپنے والد کے قدم سے ملا اور کہا جو کچھ آپ عطا فرماتے ہیں میں نے قبول کیا اور اسی وقت اس کاتب حروف (سید محمد کمال) کو یاد فرمایا اور ارشاد فرمایا "ہم اس سے راضی ہیں اس سے کوئی بھی عمل ایسا سرزد نہیں ہوا کہ جو ناپسند ہو۔" اور یہ بھی فرمایا کہ وہ ہمارے جانے کے بعد اس جگہ آئے گا۔ اُن دنوں میں تین رات مستقل میرے شیخ سنبھل میں مجھے خواب میں نظر آئے کہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں۔ اپنے دل کو تھام کر رکھ کہ تجھ سے بہت کام لینے ہیں اور اس راہ کی نصیحتیں فرماتے تھے جیسے کہ اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے۔ مجھ سے کئی بار فرمایا تھا کہ جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تو، تو یہ یہ کام کرے گا اور میں عرض کرتا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے دنیا سے چلا جاؤں اور وہ زمین جس کو آپ نے اپنے دفن کے لیے تجویز کیا ہے مجھے اس کے پائیں (پائیتی) دفن فرمائیں۔ یہ سن کر فرمایا تجھ سے تو بہت کام لینے ہیں۔ اسی طرح وصیتیں فرماتے تھے۔ آخر کار وہ دو دن تک گھر سے باہر نہ نکلے اور گھر والوں کو نصیحتیں فرماتے رہے۔ کلمات مسنونہ "امنت باللہ و ملائکتہ.. الخ" وغیرہ کلمہ طیبہ اور اسم ذات زبان پر جاری رہتا تھا زندگی میں جب کبھی بعض بزرگوں کے بارے میں سنتے تھے کہ بحالت بے خودی دنیا سے چلے گئے تو فرمایا کرتے تھے کہ ہم انشاء اللہ بتائیں گے کہ جانے کا طریقہ کیا ہے۔ آخر کار ایک دن صبح صبح فرمایا بہت سا کھانا پکائیں اور غریبوں کو تقسیم کریں۔ جب لوگ تقسیم کر چکے انھوں نے تین بار کلمہ طیبہ کو زبان سے ادا کیا اور

اپنی گدڑی اوڑھی اور فرمایا کہ دروازہ بند کر دیں۔ حاضرین سمجھے کہ آرام کے لیے لیٹنا چاہتے ہیں جب ایک لمحے بعد دیکھا وہ واصل بخدا ہو چکے تھے۔'' رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ '' (ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ ہو) خواجہ غلام بہاء الدین فرماتے ہیں کہ میں والد صاحب کے جنازے کا ایک پایہ پکڑے ہوئے چل رہا تھا جب خواجہ بیرنگ کے چبوترے کے نزدیک پہنچے میں نے دیکھا کہ حضرات نقشبندیہ کی ارواح طیبات آپ کا استقبال کر رہی ہیں اور ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ جب ہم نے تابوت کو اس چبوترہ پر رکھ دیا میں نے والد صاحب کو دیکھا کہ مقبرہ خواجہ بیرنگ کے سامنے تابوت میں متوجہ بیٹھے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں'' اے صاحب اس وقت میں بے خود ہو گیا تھا اس طور پر کے اپنے آپ کو بالکل نہیں پاتا تھا'' پھر آپ کو خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی قبر کے برابر مغرب کی طرف دفن کر دیا گیا۔ وہ تاریخ 25 رجمادی الاوّل بروز بدھ 1074ھ (14 ردسمبر 1664) تھی اور ان کی عمر شریف اس وقت 63 سال دو ماہ اور 19 دن تھی۔ (1) جب یہ دل دہلانے والی خبر سنبھل پہنچی میں چند دن دیوانہ وار مسلوب العقل پڑا رہا، یہ لمبا قصہ ہے۔ القصہ پہلی رات میرے چھوٹے بیٹے عبدالوالی نے خواب میں دیکھا کہ میرے شیخ جس باغیچے میں ایک ماہ اور ایک دن رہے تھے خواجہ نقشبند کی صورت میں فاخرہ لباس پہنے ہوئے اس باغیچے میں کھڑے ہیں اور اسی خواب میں دیکھا کہ خواجہ بیرنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں پھر اس کے بعد اپنی صورت میں ظہور فرماتے ہیں اور معارف کی نصیحتیں کر رہے ہیں۔

میں (سید محمد کمال) اس کتاب کا مؤلف جب اپنے شیخ کے وصال کے بعد مرقد منور کی زیارت کے لیے دہلی حاضر ہوا اور قبر مبارک کے نزدیک بیٹھا ایک عجیب حال پیش آیا۔ چنانچہ اس وقت خود کو فانی مطلق پاتا تھا اور اپنے شیخ کی صورت مبارکہ کو اپنے روبرو بشاشت تمام کے ساتھ دیکھتا تھا۔ اس کے بعد میں سنبھل چلا گیا۔ اکثر شب اپنے شیخ کو خواب میں دیکھتا تھا اور جیسا لطف وعنایت اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے ویسا ہی لطف وکرم اب بھی پاتا تھا۔ اُن خوابوں کی تفصیل بہت دراز ہے۔ میرے شیخ کی تواریخ بعضے عزیزوں نے ''بہ نقشبند ثانی'' برآمد کی ہے۔ اس فقیر نے یہ کہی ہے

''خواجہٗ ما عارف باللہ شیخ محی الدین بود''

1074ھ

شیخ احمد سرہندی[1]

خواجہ بیرنگ کے بڑے اصحاب میں سے ہیں۔علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور صاحب احوال عظیمہ ہیں۔لسانِ وقت تھے۔اُن کے مکتوبات میں بہت سی عجیب وغریب تحقیقات ملتی ہیں جن کے ادراک سے عقل عاجز ہے۔وہ اسرار الٰہی کے واقف اور فیض لامتناہی کا سرچشمہ ہیں۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ ایک بار شاہ کمال کیتھلی جو کاملان وقت میں سے تھے سرہند تشریف لائے۔اس زمانے میں شیخ احمد چند ماہ کے تھے۔اُن کے والد شیخ عبدالاحد نے ان کو شاہ کمال کیتھلی کی گود میں دیا۔ شاہ صاحب نے اُن کو قبول کرتے ہوئے فرمایا ''یہ ہمارا فرزند ہے'' اور اپنا آب دہن مبارک ان کے دہن میں ڈالا۔اس کے بعد ان کی راہیں کھل گئیں۔وہ میرے شیخ (خواجہ خرد) کے شیخ ہیں۔بہت سے مریدان کامل رکھتے ہیں۔میرے شیخ کی کارکردگی اور فراست کے دلدادہ ہیں۔میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ میں بارہ یا تیرہ سال کا تھا کہ شیخ الہداد نے بغیر کسی طلب کے مجھے تلقین ذکر کی اور جمعیت کے آثار ظاہر ہوئے۔جب میں نے شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات دیکھے، مجھے ان سے ملاقات کی تمنا ہوئی اور میں سرہند روانہ ہو گیا اور ہر منزل میں اُن کو خواب میں دیکھتا تھا۔اور ان کی مہربانیاں شریک حال پاتا تھا۔جب میں سرہند میں داخل ہوا کیفیت نے مجھ پر غلبہ کیا اور جب اُن کے دیدار سے مشرف ہوا ایک حالت عظیم اور کیفیت بزرگ ظاہر ہوئی۔کشف صوریہ کے بعد جو اول چیز ظاہر ہوئی وہ توحید تھی حالانکہ توحید کے بہت سے مراتب ہیں لیکن ان کی صحبت کی برکت سے توحید کے اکثر مراتب ظاہر ہو گئے۔ولایت محمدی کا دریا جس کا حاصل محبوبیت ہے اور دریائے ولایت موسوی جو محسبیت سے عبارت ہے یکجا ہو گئے اور اس اجتماع سے ایک انوکھا حال حاصل ہوا۔شعر

ازاں افیوں کہ ساقی در مے افگند   حریفاں را نہ سرماند نہ دستار[2]

---

1 شیخ احمد معروف بہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ابن شیخ عبدالاحد فاروقی، آپ کا اسم گرامی احمد، لقب بدرالدین، کنیت ابوالبرکات اور امام ربانی عرفیت ہے۔تاریخ پیدائش 4رشوال 971ھ/ 26رجنوری 1562 ہے اور تاریخ وفات 29رصفر 1034ھ/ 10ردسمبر 1624 ہے۔مزار مبارک سرہند (پنجاب) میں مرجع خلائق ہے۔آپ کو سب سے پہلے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے ''مجدد الف ثانی'' کہا تھا۔

2 وہ افیون جو ساقی نے شراب میں ڈال کر دی ہے اس سے دوستوں کا نہ سر بچا نہ دستار۔

یہ بھی میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ''عارف کا ظاہر متہم بہ شرکت اور باطن موحد ہوتا ہے'' میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ وہ (یعنی شیخ احمدؒ) خطرہ قلبی اور خطرہ دماغی میں فرق کیا کرتے تھے۔ اس کی تحقیق جس وقت اُن سے سنی جاتی تھی وجداناً حاصل بھی ہو جاتی تھی کہ دماغ کا خطرہ دل کی جانب آتا محسوس ہوتا تھا اور پھر دل کے نواح میں گم ہو جاتا تھا۔ مجھے دہلی رخصت کرتے وقت یہ اجازت نامہ لکھ کر دیا۔

''الحمد لله و السلامُ علی عباده الذین اصطفٰے امّا بعد! فانّ الولد الاغر الا مجد والکرم، الا رشد محمد عبد الله لمّا سَلَکَ طریقةَ اولیاءِ الله و وصلَ اِلی مقاماتهم العُلیٰ مِنْ طریقةِ اندراج النهایة فی البدایة آجزته لتعلم هذه الطریقة العلیه النقشبندیه کما اجازنی شیخی و مولانی قدس سرّه ، المسئول من الله سبحانه استقامة علی جادة اکابر هذهٖ الطریقة العلیه. شکر الله تعالیٰ سعیهم والسلام علی من اتبع الهدیٰ ولـذم متابعةالمصطفٰی علیه و علٰی جمیع اِخوانهٖ و اتباعهٖ الصلوٰت والتسلیمات العلی والتحیات والبرکات.[1]

---

1 الحمد للہ والسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی اما بعد۔ جب لائق فرزند قابل عزت و احترام محمد عبد اللہ طریقہ اولیاء اللہ میں منسلک ہوئے اور بطریق اندراج النہایت فی البدایت مقامات عالیہ تک پہنچے۔ میں نے ان کو اس طریقۂ علیہ نقشبندیہ کی تعلیم کی اجازت دی جیسے کہ مجھے میرے شیخ اور مولیٰ نے دی تھی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اُن کی اس طریقے کے اکابر کے راستہ پر استقامت کا سوال کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کو مشکور اور مقبول فرمائے۔ والسلام علی من اتبع الهدیٰ ولزم متابعة المصطفی، علیه و علی جمیع اخوانه واتباعه والصلوات والتسلیمات العلی والتحیات والبرکات۔ کہ ان حضرات کا طریقہ سلوک وجذبہ فنا وبقا سے وراء ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ خاص ہے اور اُن کی صحبت کی برکت سے ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین میں اس نسبت نے بوجہ اتم ظہور کیا ہے۔ جتنے بھی بزرگان دین گزرے ہیں بہت کم اس نسبت خاصّہ سے حصہ پائے ہوئے ہیں۔ ہزار سال کے بعد وہی نسبت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان صحابۂ کرام کے طفیل میں اتم اور اکمل طور پر مجھ میں ظاہر ہوئی ہے۔

پھر اس اجازت نامے کی پشت پر تحریر فرمایا ''جس وقت کہ میں خواجہ بیرنگ کی صحبت میں رہتا تھا وہ نسبت ظاہر ہوتی تھی اور میں نے اس کو تحقیق کیا تھا (کہ واقعی یہ نسبت نسبت صحابہ کرام خصوصاً نسبت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہے)

یہ بھی میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ (حضرت مجدد الف ثانیؒ) نے فرمایا۔ اگر چہ ہماری حقیقت کو حقیقت کعبہ کے ساتھ اتحاد واقع ہوا ہے لیکن پھر بھی صورت، صورت کی مشتاق ہے اور حج ہم پر فرض ہے لیکن وہاں کی حاضری نظر کشفی میں دکھائی نہیں دیتی۔ میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ ایک دن رابعہ بصریہ سے واقعہ میں افضلِ مخلوقات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے رابعہ کیا تو مجھے دوست رکھتی ہے؟'' جواب دیا ''یا رسول اللہ حق سبحانہ کی محبت اس طرح میرے دل میں جگہ کیے ہوئے ہے کہ آپ کی محبت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن میرا حال ایک بار اس کے برعکس تھا۔ حضرت رابعہ کی بات سے نقص کی بو آتی ہے اور میرا حال اصلی ہے اور بوئے کمال رکھتا ہے۔

میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ انھوں نے فرمایا ''یادداشت دوام تجلی ذات سے عبارت ہے۔ شیخ ابن عربی نے اس تجلی کو برقی کہا ہے اور دوام کا انکار کیا ہے جیسا کہ رسالہ فصوص (فصوص الحکم) میں لکھا ہے۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ میرے دماغ سے بھی خطرۂ غیر بالکل رفع ہو چکا ہے۔ میرے شیخ نے اسی سلسلے میں کہا کہ شیخ ابن عربی کے دوسرے بعض کلمات سے دوام تجلی کا جواز بھی سمجھ میں آتا ہے۔ میرے شیخ نے ہی کہا ہے کہ اپنے شیخ کی صحبت میں جب میری سیر مرتبۂ وحدت کو پہنچ گئی اس مقام پر قرب کی انتہا پائی۔ پھر اس جگہ سے ترقی کر کے احدیت کے مرتبے کو پہنچا۔ اس مرتبے میں اقربیت پائی اور شرعی تنزیہات اکمل طور پر ظاہر ہوئیں۔ اس مقام کے بارے میں شیخ احمد (قدس سرہٗ) نے فرمایا ہے کہ جب مجھے مرتبہ علم سے جو وحدت ہے جہاں تک اللہ نے چاہا عروج واقع ہوا۔ تنزل کے بعد میں نے دیکھا کہ شیخ ابن عربی مرتبۂ علم میں ڈیرا جمائے ہوئے ہیں اور تفوق کی نظر رکھتے ہیں اور امید یہ ہے کہ آخر میں مقام فوق یعنی اقربیت سے بہرہ ور ہو گئے ہوں گے۔

میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ انھوں نے کہا ہے 'ما شاء اللہ کان و مالم یشاء لم یکن ولا

حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ''ان علوم کو جو فنافی اللہ[1] اور بقافی اللہ[2] سے تعلق رکھتے ہیں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو مجھ پر اپنی عنایت سے منکشف کر دیا اسی طرح میں نے ہر چیز کی حقیقت اور اصلیت کو جان لیا کہ کیا ہے اور سیر فی اللہ[3] کس معنیٰ میں ہے اور تجلی ذاتی برقی کیا ہوتی ہے اور محمدی المشرب کون ہے اور اس طرح کی دوسری باتیں بھی منکشف ہوگئیں۔ اور یہ کہ ہر مقام میں مجھے اس کے لوازمات اور ضروریات کو دکھاتے ہیں اور ان سے گزارتے ہیں شاید ہی ایسی کوئی چیز رہی ہوگی جس کی اولیاء اللہ نے نشاندہی کی ہے کہ چھوٹی ہو اور نہ دکھائی گئی ہو۔ مانا جس نے مانا نہ مانا جس نے نہ مانا۔ یہ بندہ جس طرح چیزوں کی ذات کو بنائی ہوئی جانتا ہے اصل قابلیات اور استعداوات کو بھی مجعول اور مصنوع جانتا ہے۔ وہ سبحانہ قابلیات کا محکوم نہیں ہے۔ اور یہ بات اُس کی شان کے خلاف ہے کہ کوئی چیز اس پر حاکم ہو۔ یہ بھی میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ''واما بنعمۃ ربک فحدث '' یہ درویش حلقہ یاراں میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنی خرابیوں پر نظر کرتا تھا۔ یہ نظر اس حد تک غلبہ کیے ہوئے تھی کہ خود کو زمرہ فقرا کے بالکل برعکس سمجھتا تھا۔ اسی دوران حال بموجب حکم ''من تواضع للہ رفعہ اللہ '' اللہ تعالیٰ نے اس دور افتادہ کو خاک مذلت سے اٹھایا اور یہ صدا اس کے سر میں دیتے تھے کہ ''و غفرت لک ولمن توسل بک الی بوسطٍ او بغیر وسطٍ الی الیوم القیامۃ[4] '' اور بار بار اسی معنیٰ کی تکرار سے نوازتے تھے حد یہ ہے کہ شک وشبے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی۔ ''والحمدللہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ '' اس کے بعد اس راز کے افشاء کا حکم فرمایا

---

1 فنافی اللہ: سالک کا جملہ مراتب صفات ومدارج عروج ونزول طے کر کے ذاتِ حق سبحانہ میں محو ہو جانا۔

2 بقاباللہ: سالک کے اس مقام کو کہتے ہیں کہ جب وہ اپنے وجود کی نفی کر کے اپنے آپ کو ذاتِ حق سبحانہ کے ساتھ باقی سمجھے یعنی ماسوائے اللہ کو معدوم اور ذات باری تعالیٰ کو موجود سمجھے۔

3 سیر فی اللہ: وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کو دیکھنا، اسی کو سیر باللہ عن اللہ کہتے ہیں اور یہ مقام بقا بعد الفنا حاصل ہوتا ہے۔ جس کے بعد سالک کامل ہو کر طالبانِ حق کی تعلیم وتلقین میں مشغول ہوتا ہے اور ان کی تکمیل کرتا ہے۔ (ہر سہ حواشی ماخوذ از: اصطلاحات صوفیہ)

4 تجھے اور جو تیرا متوسل ہے قیامت کے دن تک کسی واسطے سے ہو یا بے واسطہ ہو سب کی مغفرت کر دی گئی۔

اگر بادشاہ بر در پیرزن بیاید تو اے خواجہ سبلت مکن[1]

''اِنَّ رَبَّکَ واسعُ المغفرہ[2] '' یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ کسی عارف کی غفلت کسی غیر عارف کی غفلت کی مانند نہیں ہوتی جیسا کہ کتاب ''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ الاسلامؒ نے فرمایا ہے کہ ابوعبداللہ خفیف سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تصوف کیا چیز ہے؟ جواب دیا: ''وجود اللہ فی حین الغفلت '' (ظاہری غفلت کے اوقات میں بھی باطناً اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا (دائمی) احساس رہنا۔) یہ بھی میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ لوگ اس گمان میں ہوں گے کہ میں ''فصوص الحکم'' سے استفادہ کرتا ہوں۔ مقصود یہ ہے کہ ایک گھڑی خود کو استغراق فی اللہ سے غافل رکھوں۔ یہ بھی میرے شیخ نے کہا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جس گھر میں خواجہ بیرنگ بیٹھا کرتے تھے اس گھر میں کیفیت اس طرح ظہور کرتی تھی کہ مستفیضین جب اس گھر میں آتے تھے ایسا گمان کرتے تھے کہ گویا (اللہ تعالیٰ کے) پیروں میں گر پڑے ہیں۔ یہ بھی میرے شیخ نے کہا ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ بیماری کے زمانہ میں جو لمبی ہوتی جارہی تھی فرماتے تھے کہ تم نے دائرہ بیعت کو بہت وسیع کر دیا ہے، اب میں بہت کمزور ہو گیا ہوں (کہ سب پر متوجہ ہونا دشوار ہو گیا ہے) میں نے عرض کیا۔ تا کہ کسی نیم پیر کے ہاتھ میں نہ پڑ جائیں۔'' یہ بھی میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ ان کے والد شیخ عبدالاحد شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے اصحاب میں سے تھے اور ان ہی کے زمانہ میں ہندستان کے سربرآوردہ (مشہور) لوگوں میں سے تھے۔ اور 998ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد شیخ احمد سرہندیؒ کو میرے شیخ نے تعزیت میں لکھا۔ دوہر

احد ہوت شش میم پرت سورت ہوئی دیکھو کہت کوئیں پربھو کہوتر روپ سوی

میں نے اوائل حال میں اپنے شیخ خواجہ خرد کی منقبت میں یہ ہندی شعر لکھا تھا۔ دوہرہ

بنهو احمد بیم بده جنس چهانة تن مانه ہنس پرکنہ موتھ پر کہتو احمد کو برچھانہ

میرے شیخ نے فرمایا کہ میں سرہند میں اپنے شیخ کی صحبت میں تھا۔ ایک دن حافظ رحمت کے باغ کی سیر کو گیا وہاں بخار آگیا اور حرارت بڑھ گئی پھر اپنے شیخ کی خدمت میں روانہ ہوا، دیکھا کہ

1 اگر بادشاہ کسی بوڑھی عورت کے دروازہ پر آئے تو اے خواجہ تو اپنی موچھیں نہ اکھیڑ (یعنی حسد سے نہ جل)

2 یہاں تک حضرت مجدد الف ثانیؒ کا اپنا بیان تھا۔

میرے پیر دروازہ پر منتظر کھڑے ہیں۔ مجھے اندر لے گئے اور توجہ فرمائی ایک لمحے میں بخار چلا گیا۔ اسی سلسلے میں یہ بھی میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ ضعف بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے مجھے مشغولیت کے اوقات میں محبت شیخ میں کیفیات اور احوال اس طرح ظہور کرنے لگے گویا کہ بارش میں برستے بادل کی جھڑی لگ گئی ہو اور اس نے تمام سمتوں کو گھیر لیا ہو۔ شیخ احمد کی وفات 29 رصفر 1034ھ (10 ردسمبر 1624) ہے اور اُن کی قبر سرہند میں ہے۔ ''الموت هو جسرٌ یوصل الحبیب الی الحبیب'' ان کی تاریخ وصال ہے۔ وہ مریدان جو حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سے مستفیض ہیں آج تمام ہندوستان بلکہ دنیا میں دوسروں سے بہتر اور آگے پہنچے ہوئے ہیں جیسا کہ اظہر من الشمس ہے۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ میں نے ان کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ منکر نکیر کے ساتھ کیا معاملہ گذرا۔ فرمایا منکر نکیر نے پوچھا کہ ''مــــــن ربک؟'' میں نے کہا کہ ''اس دریائے عشق الٰہی کو نہیں دیکھتے کہ کیسا جوش میں بھرا ہوا بہہ رہا ہے۔'' اس کے بعد وہ سرنگوں واپس چلے گئے۔ ایک دن میں جوانی کے زمانے میں دو دوستوں سید فیروز اور شیخ مصطفیٰ کے ساتھ مسجد فرید آباد کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا دیکھا کہ ایک بزرگ نورانی طلعت مسجد سے نکل رہے تھے۔ سید فیروز نے کہا شیخ احمد سرہندی یہی ہیں۔ میں بے اختیار اس جگہ سے نیچے آیا دوڑ کر ان کے پیر چومنے کی سعادت سے مشرف ہوا انھوں نے اپنے دونوں دست مبارک سے میرا سر اُٹھایا اور بے حد لطف و مہربانی فرمائی۔ آج چالیس سال سے زیادہ ہو گئے کہ ان کے چہرہ منور کی صفائی میری آنکھ میں اور ان کے پُر انوار دیدار کی لذت آج بھی میرے دل میں ویسی ہی ہے جیسی اُس روز تھی۔ اس نظر کی برکت اور اس التفات کے فیض سے مجھے خواجگان نقشبندیہ مد فیوضہم وقدس اللہ اسرارہم کی نسبت جو رابطہ اخلاص، دولت ارادت اور محبت حاصل ہے اور (انشاء اللہ) رہے گی، امید رکھتا ہوں کہ اسی رابطے کی بدولت ان مقربان عظیم الشان کے محبین اور مخلصین کے زمرے میں ہی میرا حشر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور جود و کرم کے صدقے۔ ایک دن ابتدائے حال میں جب میں اپنے شیخ کی صحبت میں تھا۔ حضرت شیخ احمد (مجدد الف ثانیؒ) کا ذکر دوران گفتگو آیا۔ میرے شیخ نے اُن کے احوال کے اس قدر عجائب و غرائب ارشاد فرمائے کہ سننے والے حیرت زدہ رہ گئے کہ ایسے احوال و مقامات تاریخ کی کسی

کتاب میں کسی بزرگ کے نہ دیکھے گئے اور نہ کسی سے سنے گئے۔ جب رات ہوئی میں اپنے شیخ کے نزدیک ہی سوگیا۔ اور حضرت شیخ احمد (قدس سرہٗ) کو خواب میں دیکھا کہ نہایت عالی شان کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حد درجہ تجرید، تفرید، حیرت و جمال اُن سے ظاہر ہو رہا ہے اسی حالت میں ایک خصوصی نگاہ مجھ پر ڈالی کہ اس کے اثر سے مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور دیر تک طاری رہی جب آنکھ کھلی تو یہ خواب میں نے اپنے شیخ خواجہ خرد سے بیان کیا۔ فرمایا۔ تمھیں مبارک ہو یہ خواب قبولیتِ الٰہی کا باعث ہے۔ اس کے بعد جب بھی مجھے سرہند جانے کی سعادت واقع ہوتی ہے۔ ویسا ہی حال اور ویسی ہی کیفیت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کی قبر پر مراقبے سے ظاہر ہوتی ہے۔

خواجہ حسام الدین احمد

وہ خواجہ بیرنگ کے (قدس سرہٗ کے جو کہ عظمائے مشائخ اور کبرای اہل تصوف میں ہیں) اصحاب کبار میں سے ہیں۔ اس بزم بے رنگ کے سردار اور سر حلقۂ طائفہ ہیں۔ ان کا لقب خواجہ ابرار ہے اور ان کا نسب درمیانی سلسلوں کے واسطوں سے خواجہ ابوالحسن بصری (قدس سرہٗ) تک پہنچتا ہے۔ خیر المقربین امام زاہدان کے اجداد مادری میں سے ہیں۔ ان کے اجداد کرام میں سے بعض حضرات سلاطین تیموریہ کے مصاحب اور ہم نشین تھے اور بعض امرائے کارگزار بھی گزرے ہیں۔ ان کے اجداد میں سے مبارک شاہ نام کے ایک صاحب کی صاحب قِران اوّل سلطان تیمور کے یہاں بڑی عزّت اور آبرو تھی جیسا کہ ان فرامین سے جو اُن کے نام صادر ہیں صاف ظاہر ہے۔ جب خواجہ ابرار ۵ سال کے ہوئے ان کے والد میر نظام الدین احمد نے اُن سے دریافت کیا "سب سے بہترین چیز دنیا میں کیا ہے؟ انھوں نے کہا "اللہ کی یاد اور اس کی محبت" ان کے والد میر نظام الدین احمد جو کہ غازی خاں کے لقب سے مشہور تھے، اکبر بادشاہ کے امرا میں سے تھے اور علم و دانش میں سر حلقہ اکابر علما و دانشمندانِ وقت میں سے تھے۔ جب میر نظام الدین کی 992ھ-991ھ میں وفات ہوگئی۔ بادشاہ نے خواجہ ابرار کو امارت کی خدمت کے لائق، اور شائستہ دیکھا تو ان کی تربیت کر کے امرا میں داخل کرلیا۔ جب ان کو اس راہ کا جذبہ و داعیہ پیدا ہوا تو شاہی نوکری سے خلاصی کی غرض سے ظاہراً خود کو دیوانہ بنا دیا اور

درباری رسم ورواج کے خلاف کام کرنے شروع کر دیئے۔ ایک دن لوگ اُن کو اسی حالت میں بادشاہ کے سامنے لے گئے۔ جشن نوروز تھا، انھوں نے دیوانہ وار ادھر اُدھر نگاہ ڈالنی شروع کی اور یہ شعر پڑھا

ایں ہمہ طمطراق کن فیکون ذرۂ نیست پیش اہل جنون[1]

بادشاہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی کہ وہ دیدہ ودانستہ دیوانے بنے ہوئے ہیں تو انھیں رخصت کر دیا اور وہ قباپوشی چھوڑ کر عباپوش بن گئے۔ اور خواجہ بیرنگ کی صحبت بابرکت سے وابستہ ہو گئے اور بہت تھوڑی سی ہی مدت میں کمال و تکمیل کے مرتبے کو پہنچ گئے۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ''جس دن بادشاہ نے مجھے نوکری سے برطرف کیا اور جاگیر و منصب واپس لے لیا، ایسا خوشی، انشراح وسرور سے بھرا دن میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'' میرے شیخ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر شاہ ابوالمعالی قادری نے انھیں یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا

در عالم پیر ہر کجا برنائیست عاشق بادا کہ عشق خود سودائیست[2]

یہ بھی میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ اپنے ابتدائی حالِ راہ سلوک میں ایک رات انھوں نے خواب میں حضرت (محمد) مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ اُن سے فرما رہے ہیں ''تیرا باپ مقبول الٰہی ہے اور تو اس سے بھی مقبول تر ہوگا۔'' میرے شیخ کا فرمان ہے کہ خواجہ ابرار حالانکہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ سے مجاز بیعت تھے بلکہ ان کی جانب سے تاکیداً اجازت یافتہ تھے لیکن کبھی بھی مشیخت اور ارشاد طالبان کی جانب کماحقہ متوجہ نہ ہوئے مگر باوجود عشق الٰہی کے بے پناہ غلبے اور دریائے محبت حقیقی کی ایسی طغیانی کے کہ اگر کسی دوسرے میں ویسی پائی جائے تو وہ مرہی جائے، پھر بھی انھوں نے ایسے احسن طریقہ پر اخلاق و معاملات شرعی کے ساتھ زندگی گذاری کہ اس سے بہتر کی کسی سے توقع کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ کیسے کیسے اور کس قدر ایسے اعمال ظاہری اور وظائف بدنی میں لگے رہتے تھے کہ اُن کے اہل زمانہ (مشائخ) کے نہ کبھی سننے میں آئے اور نہ کہیں دیکھے گئے۔ ماشاء اللہ کیا ہی خوب استعداد اور قوت باطنی اُن کے شامل حال تھی۔ خواجہ بیرنگ کے وصال کے بعد اُن کے

---

1 دنیا کی یہ ساری چمک دمک اہل جنون کی نظر میں ایک ذرے کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔

2 اس بوڑھے جہان میں جہاں بھی کوئی بے کار نوجوان ہو، اے کاش عاشق بن جائے کہ عشق خود مستقل ایک کاروبار ہے۔

جانشین حقیقی وہی تھے۔ کیفیت باطنی میں وہ (خواجہ صاحب کے سب خلفا) میں قوی تر تھے۔ وہ اسی حال سرمدی کے حامل تھے جو تصوف اور شریعت کے بین بین پایا جاتا ہے۔ اُن کے تمام احوال انبیاء کے احوال سے موافقت رکھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں ہے۔

میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ ایک دن خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے خاص مصاحبین میں سے کسی نے حضرت خواجہ بیرنگ سے اُن اصحاب کے احوال اور کیفیات کو الگ الگ دریافت کیا۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ نے ہر ایک کے ایک خاص وصف کو بیان کر کے تعریف فرمائی لیکن جب ان کی باری آئی تو بڑے پُر ذوق لہجے میں فرمایا "واللہ وہ ان سب کمالات کے جامع ہیں۔" ان کے مشیخت اور ارشاد طالبان کے منصب کو اختیار نہ کرنے میں جبکہ وہ اجازت یافتہ بھی ہیں ایسا لگتا ہے کہ ان کا مطمع نظر وہ اتحاد نسبت رہی ہو جو انہیں خاص کر خواجہ بیرنگ سے تھی۔ بعد میں کسی نے خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی یہ بات (کہ واللہ وہ ان سب کمالات کے جامع ہیں) ان سے کہی تو وہ برجستہ بول اٹھے "اگر میں ایسا ہوں تو صحبت شریف کی برکت سے جو کچھ ناچیز نے پایا ہے ظاہر ہے کہ دوسرے بھی وہ دولت رکھتے ہوں گے۔

میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دن ایک تقریب میں خواجہ ابرار اور شیخ تاج الدین کی نسبتوں کے فرق کو بیان فرمارہے تھے کہ خواجہ ابرار علم و معرفت میں زیادہ ہیں اور شیخ تاج الدین احوال اور کیفیات میں بڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے دریافت کیا افضل کون ہے؟[1] جواب میں فرمایا کہ "صاحب علم و معرفت افضل ہے" میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ شیخ تاج الدین باوجود اس بات کے کہ شیخ اللہ بخش (گڑھ مکتیسری) کی صحبت میں سلسلہ عشقیہ کا سلوک طے کر چکے تھے، اپنے شیخ کے انتقال کے بعد اپنی بلند استعداد کے طفیل خواجہ ابرار کے ترغیب دینے سے انہی کی معرفت خواجہ بیرنگ قدس سرہ کی صحبت سے پیوستہ ہو گئے اور تھوڑی ہی مدت میں مراتب عالیہ اور بے انتہا الطاف و انعامات سے نوازے گئے۔ خواجہ بیرنگ سے اتحاد طریق اور (تاثیر) صحبت پر خواجہ بیرنگ کے تمام اصحاب ان سے رشک کرتے تھے۔ خواجہ بیرنگ کے وصال کے چند سال بعد حرمین شریفین کے لیے سفر اختیار کیا اور ایک قرن سے زیادہ زمانہ وہاں رہے۔ اس طرح ایک عالم

1 ان کا ذکر یہاں ضمناً آ گیا ہے ورنہ ان کا مستقل تذکرہ آئندہ آئے گا۔ انشاء اللہ

ان کی صحبت کی برکت سے طریقت ونسبت (نقشبندیہ) سے مالا مال ہوگیا۔ وہ شیخ الحرم تھے، بڑے صوفیۂ وقت اور صاحبان تصانیف عالیہ میں سے ایک تھے۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ شیخ تاج الدین نے فرمایا ہے کہ کعبے کی حقیقت، انسانی حقیقت پرفوقیت رکھتی ہے اور حقیقت محمدیہ، حقیقت کعبہ پر، شیخ تاج الدین بدھ کے دن قبل مغرب 18/ جمادی الاولی 1051ھ (14/ اگست 1641) کو دنیا سے رخصت ہوگئے اور جمعرات 19/ جمادی الاولی 1051ھ کو مکہ معظمہ میں حرم شریف کے نزدیک اپنے بنائے ہوئے ہی ایک رباط میں دفن کیے گئے۔ ان کی قبر کی زیارت کی جاتی ہے اور لوگ حصول برکت کے لیے وہاں آتے ہیں۔ میرے شیخ نے خواجہ ابرار کے بارے میں فرمایا کہ خواجہ ابرار نے مجھے خواب میں اپنے پاس بلایا اور بیعت کیا۔ جب میں نے طریقہ کے جاننے کی خواہش کی تو فرمایا کہ تم تو خود جانتے ہو۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے۔ ایک بار میں نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ ابرار کا چہرۂ مبارک چودھویں رات کے چاند کی مانند چمک رہا ہے اس وقت میرے دل میں یہ القا ہوا کہ اس طرح دعا کرنی چاہیے "الٰہی اس خاک پاک کے طفیل جس پر خواجہ حسام الدین ابرار نے قدم رکھا"۔ یہ بھی میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ میں نے ایک دن اُن سے پوچھا کہ اس راہ کے بعض سالک کہتے ہیں کہ ان کا سلوک پورا ہوگیا ہے حالانکہ ابھی انھیں اس پر عبور حاصل نہیں ہے یہ کس طرح درست ہے؟ انھوں نے جواباً فرمایا کہ فنا کے مراتب بہت سارے ہیں۔ بعض مراتب پر ہی انھیں استحقاق اجازت حاصل ہوگیا ہوگا۔ میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نے خواجہ ابرار سے پوچھا کہ محبت افضل ہے یا معرفت؟ فرمایا محبت افضل ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا "حبیب" کہا ہے۔ یہ بھی میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ آیا ان کے اصحاب میں سے کوئی شخص خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی نسبت باطنی پر مطلع تھا اور اس کو اس کی تحقیق وحصول بھی میسّر ہوگیا تھا؟ فرمایا۔ خواجہ بیرنگ کبھی کبھی مجھ سے یا شیخ تاج الدین سے اُن احوال کے بارے میں جو خواجہ موصوف پر وارد ہوتے تھے دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ناچیز عرض کرتا تھا کہ جو چیز باطن قلب میں مدفون ہو اس کو خدا کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ آخری زمانہ حیات میں خواجہ بیرنگ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی بھی سلسلہ ہو اس کو ہم سے اس کے لائق فیض پہنچتا ہے اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ قطب وقت کو بھی ہم سے فیض پہنچتا ہے۔ مختلف سلسلوں کے مشائخ اپنی نسبتوں کو حضرت خواجہ تک پہنچاتے تھے اور آپ جہاں تک ہوسکتا تھا ان

کے مذاق کی رعایت فرماتے تھے میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے۔خواجہ بیرنگ کے وصال کے وقت خواجہ ابرار کسی دوسرے ہی عالم میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت ان کے حال پر کیا کیا مہربانیاں فرمائی ہوں گی (اللہ ہی جانتا ہے) میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ، وصال کے وقت اپنا دست مبارک خواجہ ابرار کے چہرے پر پھیرتے تھے اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔

میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شیخ مرتضٰی سنبھلی کا بیان ہے کہ ایک دن میں خواجہ بیرنگ کے آشیانۂ شریف سے خواجہ ابرار کے ہمراہ قلعہ میں آرہا تھا۔توحید کی بات چل پڑی اس وقت میں نے ان کے سکوت کو اپنے خیال ناقص میں عجیب جانا۔اس کے بہت زمانے بعد ایک وقت توحید کا راز اور اس کی معرفت اُن کی جانب سے مجھ پر منعکس ہوگئی میں حیرت میں پڑ گیا وہ کیا بات تھی کہ کوئی بات نہیں فرمائی تھی اور یہ کیا ہے؟ انھوں نے میری جانب نظر کی اور مسکرادیے۔اس سے میں یہ سمجھا کہ ظاہراً ایسا ہونا چاہیے اور باطنی طور پر ایسا۔ یہ گویا وہی بات ہوئی جیسی کہ کتاب ''رشحات''[1] میں اسی قسم کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں شیخ بہاء الدین عمر کی خدمت میں حاضر ہوا جیسا کہ ان کی عادت شریفہ تھی پوچھا کہ شہر میں کیا چیز[2] ہے؟ میں نے عرض کیا ''دو چیز'' معلوم فرمایا وہ کیا کیا؟ میں نے عرض کیا۔شیخ زین الدین اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ''سب کچھ اسی کی جانب سے ہے اور سید قاسم اور ان کے متبعین کہتے ہیں کہ ''سب کچھ وہی ہے'' آپ کیا کہتے ہیں۔شیخ نے فرمایا کہ شیخ زین الدین اور ان کے دوست ٹھیک کہتے ہیں کھڑے ہوگئے اور قول شیخ زین الدین کی تقویت میں ایک دلیل دی جب میں نے غور کیا تو ان کے تمام دلائل قول شیخ سید قاسم اور ان کے ساتھیوں کو تقویت پہنچانے والے تھے۔ میں نے عرض کیا آپ کے دلائل تو قاسمیوں کے قول کی تائید کررہے ہیں۔شیخ اس سے زیادہ قوی تر دلیل زبان پر لائے سید قاسم اور ان کے متبعین کے قول کی تقویت میں۔اس وقت میرے دل میں یہ آیا

---

1 رشحات: رشحات عین الحیات فخر الدین علی متخلص بہ صفی ابن مولانا حسین بن علی واعظ کاشفی بیہقی کی رموز و نکات تصوف اور حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے احوال پر مشتمل ایک عمدہ کتاب ہے جو 909 ہجری 1503 میں لکھی گئی۔فخر الدین علی صفی نے 926ھ/1520 میں وفات پائی۔

2 مطلب یہ کہ شہر میں کون کون بزرگ ہستیاں ہیں یا یہ کہ دربارۂ تصوف شہر میں کیا چرچے ہیں؟

باطنی طور پر سید قاسم کے قول کا اعتقاد رکھے لیکن ظاہراً خود کو شیخ زین الدین کے قول پر دکھائے''
انتہیٰ۔ الحمدللہ والمنۃ کہ یہ بندہ حصۂ ایمان وعلم سے جو کچھ بھی رکھتا ہے اور درویشوں سے نیازمندی
جو اسے حاصل ہے سب کچھ خواجہ ابرار کی عنایتوں اور کرم فرمائیوں کے طفیل ہے۔ رسالہ ''قدسیہ
بہائیہ'' ان سے پڑھا ہے۔ اور اسے ختم خواجگان کی اجازت ان سے ملی ہے۔ میرے شیخ نے ہی
فرمایا ہے ایک بار لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ (کچھ لوگ) فلاں جوان کا نکاح فلاں کی بیٹی
کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی کیا مرضی ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ وہ جوان تیرنا نہیں جانتا۔
اس بات سے سوال کرنے والے متعجب ہوئے دوبارہ پھر وہی سوال کیا اور وہی جواب سنا۔ آخر
بے بات سمجھے ہی نکاح کر دیا۔ نکاح کو زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وہ جوان غسل کرنے کے لیے دریا
پر گیا اور غوطہ لگایا، پانی میں ڈوب گیا۔ کہتے ہیں کہ جب خواجہ ابرار کی عمر 66 سال کو پہنچ گئی ایک دن
خواجہ سراج الدین نے اپنے فرزند سے فرمایا۔ جس وقت میرے والد صاحب اس دنیا سے گئے
میری عمر 15 سال تھی اور آج تو بھی 15 ہی سال کا ہے۔ اتفاق کہ انہی دنوں اکبرآباد میں بیمار پڑ
گئے۔ جس دن ان (خواجہ ابرار) کی جسمانی طاقت بالکل جواب دے گئی تھی ایک نعت خواں کو
اپنے سامنے بلا کر بٹھایا اور مولانا جامی کی غزل ''اے دل من صید دام زلف تو'' پڑھنے کا اشارہ
فرمایا۔ یہی غزل پڑھی گئی۔

اے دلِ من صیدِ دامِ زلف تو   دامِ دلہا گشتہ نامِ زلفِ تو
زلف تو بالائے مہ دارد مقام   پس بلند آمد مقامِ[1] زلفِ تو
لائق رخسارِ گلرنگ تو نیست   جز نقاب مشک فامِ زلفِ تو
دادہ تشریف غلامی بندہ را   زلف تو اے من غلامِ زلفِ تو

---

1 اے میرے محبوب آپ کی زلفوں میں میرا دل قید ہے۔ آپ کی زلفوں کا نام کتنے ہی دلوں کا قید خانہ بن گیا ہے۔ آپ کی زلفیں چاند سے بھی اونچا مقام رکھتی ہیں۔ واقعی آپ کی زلفوں کا کتنا بلند مرتبہ ہے۔ آپ کے گل رنگ رخساروں کے نقاب لیے صرف آپ کی مشک دار کالی زلفیں ہی ہیں۔ جب آپ کی زلفوں نے بندے کو غلامی کا شرف بخشا ہے تو میں بھی آپ کی زلفوں کا حقیقی غلام بن گیا ہوں۔

رم کند از دام مرغان، وین عجب   جانِ بے آرام، رامِ زلفِ تو
بندشد در زلف تو دلہا تمام   دام و بند آمد تمام زلفِ تو

صبح اقبال است طالع، ہر نفس
بندہ جامی را زشامِ زلفِ تو [1]

اس وقت ان کے ایک خلیفہ قاضی افضل جو کہ عالم تھے، انھوں نے یہ شعر پڑھا

دل آرامے کہ داری دل درو بند   دِگر چشم از ہمہ عالم فرو بند [2]

یہ شعر سن کر ایک وحشت ان کی پیشانی پر ظاہر ہوئی۔ اسی وقت دوست محمد نے کہا۔ پچاس ساٹھ سال کے قریب ہو گئے، حضرت والا نے دنیا سے اپنی آنکھیں سی رکھی ہیں۔ اس بات پر آنکھ کے اشارے سے ''ہاں'' کہا اور آپ کے چہرے پر خوشی و انشراح کا عالم طاری ہو گیا۔ دوسرے دن یکم ماہ صفر کو 1043ھ (1633) میں دنیا سے چلے گئے۔ اُن کی نعش کو ایک مدت کے بعد دہلی لایا گیا اور خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی قبر کے برابر میں دفن کر دیا گیا۔ ''شیخ جنید'' ان کی تاریخ ولادت کہی گئی ہے۔

میں ان کی تاریخ وفات کہتا ہوں ''شیخ جنید ما کجا؟'' میں نے یہ قطعہ تاریخ وفات بھی کہا ہے۔

تاریخ ولادت بزرگ خواجہ حسام دین وحق   شیخ جنید گفتہ اند بر حسب کمال او
روز وصال او بدہ شنبہ غرہ صفر   شیخ جنید ما کجا گفت کمال سالِ او

جب ابتدائی زمانہ میں میں نے خواجہ ابرار سے ملاقات کی بڑا لطف اور عنایت فرمائی اور میرے احوال معلوم کیے۔ شیخ ابا بکر کہ جن کا ذکر آئندہ آئے گا بولے۔ ایک لشکری ہے اور ایسا ہے اور ایسا ہے۔ انھوں نے بطور کراہیت فرمایا ''لشکری''۔ ان کا یہ کہنا گویا ایک تیر تھا جو میرے دل پر لگا۔ اور وہ تیر اس دن تک جب کہ میں نے نوکری ترک کی نہ نکلا۔ ایک بار میں اپنے شیخ کی صحبت میں تھا وہ تشریف لائے اور بیٹھ گئے اور میرے شیخ سے میرے بارے میں معلوم کیا کہ یہ جوان کون ہے؟

---

1 کتنی عجیب بات ہے کہ پرندے تو دام سے بھاگتے ہیں اور میری جان بے آرام آپ کی زلفوں کے جال میں سکون پاتی ہے۔ آپ کی زلفوں میں دنیا جہاں کے دل قید ہیں۔ آپ کی زلفیں تو مکمل قید خانہ ہی بن کر رہ گئیں۔ بندہ جامی کے لیے آپ کی شامِ زلف یعنی کالی زلفوں کے طفیل ہر لمحہ نئی صبح اقبال طلوع ہوتی ہے۔

2 جو آپ کا حقیقی محبوب ہے یعنی خدا تعالیٰ اسی سے دل لگایئے باقی تمام جہاں سے آنکھ بند کر لیجیے۔

میرے شیخ نے فرمایا کے نیازمندوں میں سے ایک غریب، نامراد ہے۔ میں انتہائی ادب سے سر جھکائے ہوئے تھا انھوں نے مجھ پر ایک تیز نگاہ ڈالی اور یہ شعر پڑھا جو میں نے یاد کرلیا

خاک شوخاک تا بروید گل   کہ بجز خاک نیست مظہر کل[1]

یہ سن کر میرے دل نے جو پایا، پایا۔ بڑی امید حصول مطلب کی بندھ گئی۔ میرے شیخ نے ابتداے سلوک میں "تفسیر بیضاوی" کے بعض مقامات کی شرح لکھی تھی جو بہت ہی خوب دقائق اور حقائق سے بھری ہوئی تھی۔ اسے خواجہ ابرار کی خدمت میں لے گئے جب انھوں نے پڑھی خوش ہو گئے اور شاباشی دی اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے اور فرمایا "میرے آقا یہ توفیق، عطیات الٰہی سے ایک خاص عطیہ ہے لیکن مصلحت یہ ہے کہ ابھی چند دن اس کو خود تک ہی محدود رکھیں، کسی کو نہ دکھائیں تاکہ اس زمانہ کے حاسدین کے شرّ العین سے محفوظ رہیں۔ شرّ العین کے بارے میں یہ آیت کریمہ ہے۔ "یا بُنّی لا تد خلوا من باب واحدٍ واد خلوا من ابوابٍ متفرقه "(اے بیٹوں ایک دروازے سے داخل مت ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل شہر ہونا) ایک دن ان کی محفل میں تصوف پر گفتگو تھی۔ انھوں نے میرے شیخ کی نسبت فرمایا۔ ان تصوف کے حقائق اور دقائق کا حل کامل طور پر ان سے ہی کیا جا سکتا ہے کہ یہ علم تصوف صوفیا محققین تمام کا تمام ان ہی کو نصیب ہوا ہے اور آج اس زمانے میں ان کے علاوہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ ایک دن اوران کی مجلس میں "ذات بحت" کی بات چلی۔ میرے شیخ نے فرمایا ذات بحت کی بو کی یافت تو واقع ہے مگر اس کی دریافت ممکن نہیں ہے (کہ اس کی کیفیت کو سمجھا نہیں جا سکتا) وہ بہت محظوظ ہوئے۔ اسی درمیان ایک اور صاحب آئے اور اس بارے میں کچھ کہنا شروع کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ ٹھہرو، جو کچھ کہنا چاہئے خواجہ (خرد) نے کہہ دیا ہے اور جو حقیقت ہے اس کو وہ جانتے بھی خوب ہیں، بس۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ شیخ نعمت اللہ شیخی کا بیان ہے کہ میں نے خواجہ ابرار کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا کہ قرآن مجید کی آیات مشک سے ان کی قبر پر لکھ دی گئیں ہیں۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ خواجہ ابرار فرماتے تھے کہ ایک بار میں اجمیر میں ایک نشیبی زمین میں لگے خیمہ میں رہتا تھا۔ ایک رات ایک بزرگ نورانی صورت اوپر اس جگہ سے جو کہ بالا گڑھ کہلاتی ہے جہاں سید حسین جنگ سوز

---

1 خاک ہو جا تا کہ تجھ میں گل اگیں کہ علاوہ خاک کے کوئی بھی اللہ کی ذات وصفات کا مظہر نہیں ہے۔

کا مرقد ہے اور وہاں بڑے بڑے شہدا آسودہ ہیں اور ان کا واقعہ مشہور و معروف ہے مجھے اشارہ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اس مقام کہ اوپر آ جا۔ اس خیمہ کو اکھاڑ کر میں فوراً گڑھ (قلعہ) پر چلا گیا اور وہاں خیمہ لگا لیا۔ اتفاق دیکھیے کہ اسی شب بہت سخت بارش ہونی شروع ہوئی اور لوگوں کا اکثر سامان جو اس نشیبی زمین میں تھا سیلاب بہا کے لے گیا۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ ایک بار ایک شخص چاہ فیروزی کے بارے میں ان سے جھگڑا کرتا تھا کہ یہ آدھا کنواں تیرا ہے اور آدھا میرا ہے۔ وہ برداشت کرتے تھے آخر ایک دن زبان سے نکل گیا دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اتفاقاً انہی دنوں میں وہ کنواں گر گیا پھر انھوں نے اپنے شیخ زادوں کے تعاون سے اسے دوبارہ ٹھیک کیا اور لوگوں کے جھگڑے سے نجات پائی۔

شیخ الہداد

آپ خواجہ بیرنگ کے بڑے اصحاب میں سے تھے۔ تہذیب اخلاق تصوف باطن اور دوام حضور میں رسوخ تام رکھتے تھے۔ ان کی صفائی باطن یہاں تک تھی کہ ہمیشہ ارواحِ مشائخ سے روحانی طور پر وابستہ رہتے تھے اور صرف ادنی توجہ میں جس بات کا حل چاہتے تھے، مرحوم مشائخ کی ارواح سے تحقیق کر لیتے تھے۔ استخارے میں بھی ان کا جدا انداز تھا کہ لمحے بھر میں مرضی و نامرضیِ مولیٰ انھیں معلوم ہو جاتی تھی۔ وہ تمام جزوی حالات میں بھی استخارے کی رعایت فرماتے تھے۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ خوارق سے ان کی تعریف نہیں کی جا سکتی بلکہ خوارق کو ان سے عزت ہے۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ خواجہ ابرار فرمایا کرتے تھے کہ اوائل حال میں جب میں انھیں نہایت صلاح و سلامتی، تہذیب صفات اور استقامت میں دیکھتا تھا تو خود سے کہتا تھا۔ کمالِ اولیاء یہی ہے۔ اس کے بعد وہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت میں اس سے بہت اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ خواجہ ابرار فرمایا کرتے تھے کہ غایت لطافت کے سبب وہ فرشتہ صفت ہو گئے ہیں۔ اور خواجہ ابرار نے بادشاہ صاحب قرانِ ثانی سے ایک تقریب میں اُن کی تعریف میں فرمایا تھا کہ بظاہر اگر چہ وہ اس عالم میں رہتے ہیں مگر حقیقتاً وہ اس عالم میں نہیں رہتے، دوسرے ہی عالم میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد میرے شیخ نے اُن کے بارے میں فرمایا کہ وہ سراپا

نور ہو گئے ہیں۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ ان کا فرمان ہے کہ ایک دن میں خواجہ بیرنگ کی قبر کی زیارت کے لیے گیا۔ آپ قبر سے باہر آئے اور کہا "بسم اللہ" میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ انسان کی بقا اس کی روح کی بقا ہے۔ جو وحدت کبریٰ میں استغراق سے عبارت ہے۔ میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں ایک دن ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور ان کے دل سے اللہ اللہ کے ذکر کی آواز اچھی طرح اپنے کانوں سے سن رہا تھا۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ ان کے دل کی بے حد صفائی حال اور لطافت کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کو اپنے حضور طلب نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے احوال کی تحقیق شیخ الہداد کے حوالے تھی۔ وہ تحقیق کرنے کے بعد حضرت والا کی خدمت میں عرض کر دیا کرتے تھے یعنی صاحب حلقہ وہی تھے۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ کے دوستوں سے ایک شخص کا دو تین روز یہ حال رہا کہ وہ سارے عالم کے چھپی خبروں کو آئینے کی مانند دیکھتا تھا اور دن رات حضرت خاتمیت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت کے آئینے میں محو نظارہ رہتا تھا اور ان کے رُخ مبارک میں اصحاب کبار اور دیگر بزرگوں کی تصویریں علی الترتیب دیکھتا تھا اور حضرت خاتمیت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ کے پیچھے حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صورت تھی۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ ان کا فرمان ہے کہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ آخری زمانہ حیات میں طالبان کی جانب خود بنفس نفیس توجہ نہیں کرتے تھے بلکہ ارشاد طالبان کا کام اپنے خلفا کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ بھی میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ ان کا قول ہے کہ اسی دوران ایک بار خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ نے ایک شخص کو اپنے روبرو بلا کر فرمایا کہ میری دونوں ابروؤں کے درمیان دیکھو۔ صرف نظر کرنے ہی سے ذکر نفی و اثبات اس کے دل میں جاری ہو گیا۔ اور ایک انوکھی کیفیت اس کی ہو گئی۔ ذکر کا یہ فیضان انعکاسِ قلبی تھا حالانکہ اس وقت خواجہ بیرنگ کی زبان پر الفاظ ذکر نہیں آئے تھے۔ میرے شیخ کا ہی قول ہے کہ خواجہ بیرنگ نے فرمایا کہ یہاں آنے سے قبل شیخ الہداد نے جلال مخشی سے رسالہ قدسیہ میں بیان کردہ علوم صوفیہ کو دریافت کر لیا تھا لیکن انھیں تحقیق حال نہیں ہوئی تھی (جو یہاں آکر ہوئی) یہ بھی میرے شیخ کا قول ہے کہ بعضے اشخاص جو خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے حلقۂ ذکر میں صرف بیٹھ جاتے تھے انھیں بھی کیفیات باطنی سے حصہ مل جاتا تھا اور ان لوگوں نے ایسا کہیں نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ بندے

(خواجہ خرد) کے حال پر خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی توجہ کی مدت کل ملا کر دو سال رہی ہے (پھران کا وصال ہو گیا)۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ مشائخ شہر میں سے ایک صاحب کو حضرت خواجہ بیرنگ سے بہت محبت تھی اور خود پر خواجہ کے تصرفات غریبہ ملاحظہ فرماتے تھے، اُن کی یہ عادت تھی کہ جس شخص کی صورت دیکھ کر نئے ماہ کے چاند کا دیکھنا سارے مہینے مبارک رہتا۔ پہلے اس پر نظر ڈالتے پھر چاند پر۔ ایک رات جب کہ چاندرات تھی بغیر کسی ایسے شخص کی صورت دیکھے چاند پر نظر پڑ گئی چاہتے تھے کہ آنکھ بند کر لیں کہ اچانک خواجہ بیرنگ کی صورت مبارک کو ہوا میں مشاہدہ کیا اور ان کے دل کی یہ خلش جاتی رہی انھوں نے ہی خواجہ بیرنگ کو شیخ چراغ (شیخ نصیرالدین) دہلوی کے عرس کے زمانے میں جب حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ اکبرآباد (آگرہ) تشریف لے گئے تھے ایک شاہباز کی صورت میں بکمال بزرگی دیکھا کہ تمام مجلس پر پر کھولے (سایہ کیے) ہوئے ہیں۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے بعض اصحاب سے سنا گیا ہے کہ ایک دن خواجہ بیرنگ چارپائی پر کپڑا اُڑھے لیٹے ہوئے تھے (مگر کوئی حرکت محسوس نہ ہوتی تھی) جب (کپڑا اٹھا کر) دیکھا گیا تو چارپائی پر کوئی بھی چیز نہ تھی۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ شہر کے روسا میں سے ایک صاحب تھے جن کی عمر پچاس سال ہو گئی تھی لیکن بلوغ کی لذت سے ناآشنا تھے۔ اسی عمر میں اپنے شیخ کے حکم سے ایک خاتون سے نکاح کر لیا۔ ہر چند تلاش کر کے قوت باہ کی دوائیاں کھائیں مگر کارگر نہ ہوئیں۔ قریب ایک سال گزر گیا۔ باوجود نہایت زہد وورع اور تقویٰ کے مشروع و نامشروع دوائیاں بھی استعمال کر لیں مگر کوئی فائدہ ظاہر نہیں ہوا۔ (تب انھوں نے) زیادہ شرمندگی کی وجہ سے گھر سے فرار کی ٹھان لی۔ ایک دن یہ بات کسی نے خواجہ بیرنگ کے کانوں تک پہنچائی کہ وہ شرم سے یہ چاہتے ہیں کہ شہر بدر ہو جائیں۔ حضرت کو ان کے حال پر رحم آیا، فرمانے لگے بیچارہ کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ ایک دن حضرت والا سواری پر ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ اچانک وہ شخص سامنے آ گئے۔ کیونکہ وہ عالم تھے تعظیم کے ارادے سے خواجہ بیرنگ سواری سے نیچے اتر آئے۔ ان صاحب نے نہایت نیازمندی کے ساتھ اُن کے پائے مبارک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ حضرت والا نے انھیں آغوش میں لے لیا۔ دو تین بار اپنا سینہ ان کے سینے سے رگڑا اور آہستہ سے ان کے کان میں فرمایا کہ آج رات تم دونوں میاں بیوی ننگے ہو کر سونا۔ وہ صاحب کہتے ہیں کہ اسی

وقت سے میں اپنے آپ میں جوانی کی قوت محسوس کرنے لگا اور میں نے اپنی اہل خانہ سے بصد شرم وحیا کہا کہ ایک بزرگ نے ایسا فرمایا ہے۔طنز واستہزا کے طور پر مسکرا کر بولی۔مصرعہ

آنہم اندر عاشقی بالاے غم ہاے دگر [1]

صرف حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی حکم برداری کے طفیل فتح ہوئی اور ایسی قوت حاصل ہوئی جو مدتوں تک ختم نہ ہوئی۔میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ 1051ھ میں جو کہ شیخ الہداد کی وفات کا سال ہے۔انتقال سے دو ماہ قبل اس بندے کو اپنے قریب بلا کر بڑی مہربانی اور لطف وکرم فرمایا پھر فرمایا کہ خواجہ بیرنگ سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ تمھیں پہنچا دیا اور اسی طرح جو الطاف غوث اعظم اور مشائخ چشت کی ارواح کے میرے شامل حال رہے ہیں سب تمھیں پیش ہیں۔اس فقیر نے اظہار تواضع کیا اور جو کچھ اُن کی عنایات ہوئیں جان ودل سے قبول کیں۔

یہ فقیر اپنے شیخ ومولیٰ شیخ احمد (سرہندی) قدس سرہٗ کے لطف وکرم اور ان شیخ الہداد قدس سرہٗ کی عنایات ومہربانیوں کو یکساں خیال کر کے، اپنے اور اپنے دوستوں کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ سے بڑی امیدیں لگائے ہوئے ہے اور اجازت نامے کے کاغذات کو اپنی نجات کا سامان جانتا ہے۔اور بزرگوں کے محبوب خواجہ حسام الدین احمدؒ قدس سرہٗ کی مہربانیوں کو خیال کر کے جو جو امیدیں وابستہ ہیں سب پر الحمدللہ ثم الحمدللہ کہتا ہے اور حسن ظن رکھتا ہے کہ جب ایسے ایسے بزرگ میرے مصدقِ صدقِ حال ہیں تو امید ہے کہ آنکھ جھپکنے کے برابر وقت کے لیے بھی جہنم کو نہ دیکھوں اور مجھ پر خاص رحمت الٰہی ہو۔

میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ شیخ الہداد کا بیان ہے کہ مجھے یٰسین شریف پڑھنے کا اشارہ ہوا ایک خاص مقدار کے ساتھ (خواجہ خرد فرماتے ہیں) اسے مجھے بھی بتلایا، اور اجازت کے مواقع بھی گنائے اور مجھے اسے پڑھنے کی اجازت دی، اس وقت میرے حق میں ان کی زبان مبارک پر بہت بڑی بشارت کے الفاظ آئے اور کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ تو پڑھے۔انھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھا کہ فرمارہے ہیں ''قطب نوحی یہی ہے'' اسی وجہ سے وہ اسُ مقام سے حصہ پائے ہوئے تھے اور روحانیت اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی استفادہ فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی فرماتے

---

1 چلو، عاشقی میں دوسرے غموں کے ساتھ ایک غم یہ بھی سہی۔

تھے کہ سب سے پہلے مجھے خواجہ نقشبند کی روحانیت نے تلقین ذکر اسم ذات فرمائی ہے۔
شیخ الہداد نے خواجہ خرد کو جو اجازت نامہ دیا ہے وہ اجازت نامہ درج ذیل ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ علی خیر خلقہ محمد و الہ و اصحابہ اجمعین ۔ اما بعد! معلوم ہمہ اخوانِ طریقت باد کہ باشارت غیبی اذن بزرگان قدس اللہ اسرارہم انچہ از حضرت پیر دستگیر قطب عارفان و عاشقان حضرت خواجہ محمد باقی قدس اللہ سرہٗ بفقیر الہداد درین راہ رسیدہ بود بفرزند عزیز خواجہ محمد عبداللہ را بخشید و گذرانید و ایشان را خلیفۂ خود ساخت و وصیّت نمود کہ بعد از من ہمہ مردم کہ بمن رابطہ طریقہ دارند (بآن عزیز رجوع نمایند) و اجازت داد، آن فرزند عزیز را کہ ہر حاجتی کہ بطلب بیعت مجرد یا بہ تعلیم طریقہ نقشبندیہ می رسد قبول نمایند و شجرہ پیران طریقہ بدہند و نیز الطافے را کہ از حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ باین فقیر است بآن فرزند عزیز را گذرانید و ہم چنین الطافے و عنایتے کہ حضرات چشتیہ دارند بآن فرزند گذراند و وصیّت نمود آن فرزند عزیز را کہ بعد از من بر ہر طالبے و فرزندانِ من و ہر کہ بمن تعلق و قرابتے دارد طریقہ محبت و رعایت و خدمت بر قدر قدرت و امکان مرعی دارند و از خدا می خواہم کہ آن فرزند عزیز را بر احکام شریعت و آداب طریقت و انوار حقیقت استقامت بخشد بحرمت النبی و آلہ و صلی اللہ علیہ وسلم۔"

تاریخ دوازدہم شہر شعبان المعظم تحریر یافت[1]

---

1 بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی خیر خلقہ محمد، وآلہ واصحابہ اجمعین، اما بعد۔ تمام اخوان طریقت کو معلوم ہو کہ بزرگان سلسلۂ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کے اذن غیبی سے اس فقیر الہداد کو جو کچھ حضرت پیر دستگیر قطب عارفان و عاشقان حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس اللہ سرہٗ سے اس راہ میں پہنچا فرزند عزیز خواجہ محمد عبداللہ کو بخشا اور پیش کر دیا اور انہیں اپنا خلیفہ بنادیا اور یہ وصیت کی کہ میرے بعد تمام لوگ جو مجھ سے رابطۂ طریقہ رکھتے ہیں آں عزیز سے رجوع کریں اور اس بات کی اجازت دی کہ جو بھی، چاہے صرف طالب بیعت ہو یا طالب تعلیم طریقہ نقشبندیہ خدمت میں حاضر ہوا سے قبول کریں۔۔۔۔جاری

میرے شیخ نے ہی کہا ہے کہ ایک رات کو تراویح کی نماز کے بعد رمضان المبارک میں ہر تسبیح کے بعد نعت خواں سے (مولانا جامی کا) یہ شعر سن کر وجد میں آتے تھے اور گشت لگاتے تھے

جذبۂ عشق رخش می بُرد ز خود جامی را　　　باد آسود دریں خواب گراں تا دم شور[1]

خواجہ ابرار اور دوسرے بزرگان اُن کی تعظیم کو کھڑے ہو گئے اور ان کے حال کی کیفیت سب حاضرین میں سرایت کر گئی شیخ عبدالحق دہلویؒ نے لکھا ہے کہ خواجہ بیرنگ فرماتے تھے کہ ہمارے میاں الہداد توجہ اور حضور میں آب رواں کی مانند ہیں جو کبھی نہیں ٹھہرتا۔ تمام دوستوں میں اس صفت میں ممتاز اور منفرد ہیں۔ ان کی وفات کی تاریخ 23 رشعبان 1051ھ (20 رنومبر 1641) ہے اور ان کی قبر خواجہ بیرنگ کے چبوترے پر ہے۔ ان کی تاریخ وصال میرے شیخ نے ''شیخ فانی'' کہی۔ میں نے بھی سنبھل میں توارد سے یہ قطعہ تاریخ کہا ہے

جنید وقت طیفور زمانی　　　فرید عصر قطب الدین ثانی

جناب شیخ الله داد را بود　　　بہ یغمائے ہدایت میزبانی

مہِ شعبان روز بست و سوئم　　　شد از دنیا بملکِ جاودانی

دریغا ہیچ کس از رفتنِ او　　　بجز رضوان نکردہ شادمانی

چو پر سیدم ز دل تاریخ فوتش　　　دلم از غیب گفتا ''شیخِ فانی''[2]

بقیہ......... اور اس کو پیران طریقہ کا شجرہ دے دیں مزید یہ کہ جو جو لطف اس فقیر پر حضرت غوث اعظم کی روحانیت کے ہوئے ہیں آں فرزند عزیز پر پیش کر دیئے اسی طرح جو جو لطف و عنایات حضرات اکابر چشتیہ کی خود پر پاتا ہے سب کی سب آں فرزند کی نذر ہیں اور اس بات کی وصیت کرتا ہے کہ اس فرزند عزیز ہر اس طالب پر جو میرے بعد آئے، اور میرے بیٹوں پر یا جو کوئی بھی مجھ سے تعلق یا رشتہ داری رکھتا ہے، طریقہ محبت و رعایت اور خدمت کو حسب امکان اور بقدر طاقت روا رکھیں۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس فرزند عزیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اور طفیل میں احکام شریعت، آداب طریقت اور انوار حقیقت پر استقامت بخشے۔ 12 رشعبان المعظم کو تحریر ہوا

1　اس کے چہرہ کے جذبۂ عشق نے جامی کو از خود رفتہ کر دیا، اللہ کرے حشر تک اسی خواب گراں میں آسودہ (حال) رہے۔

2　جنید وقت، طیفور زماں، فرید عصر، قطب الدین ثانی شیخ الہداد جو دولت ہدایت کے میزبان تھے 23 رشعبان المعظم 1051ھ کو دنیا سے ملک جاودانی کو رخصت ہوئے۔ افسوس علاوہ داروغہ جنت کے کوئی ان کے جانے سے خوش نہ ہوا۔ جب میں نے دل سے ان کے انتقال کی تاریخ پوچھی تو میرے دل میں غیب سے القا ہوا ''شیخ فانی'' 1051ھ

ایک بار خواجہ ابرار نے مکّے کے سفر کا ارادہ کیا اور اس ارادے کے استخارے کی غرض سے ان سے عرض کیا۔ انھیں واقعہ میں یہ آیت ظاہر ہوئی ''و جعلنا من بین ایدھم سدا و من خلفھم سدا'' اس کیفیت حال کو خواجہ ابرار سے کہا۔ خواجہ ابرار بس اکبر آباد تک ہی پہنچے، دو سال وہاں گزارے، اس مدت میں ہر چند سفر کا ارادہ کیا لیکن میسر نہ ہوا۔ شیخ حسین سنبھلی فرماتے ہیں کہ محمد صادق۔ دونوں حضرات (یعنی شیخ حسین سنبھلی اور شیخ محمد صادق) کا ذکر آئندہ آئے گا۔ ایک مدت سے اولاد کی تمنا اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں مجھ سے کہا کہ اس بارے میں ان سے درخواست کروں۔ میں نے ایک مناسب وقت میں اُن سے التجا کی۔ انھوں نے کچھ دیر بعد یہ راز مجھ سے کھل کر بیان کیا کہ محمد صادق سے صرف یہ کہنا کہ اگر تقدیر میں ہے، ہو جائے گا اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہنا کیونکہ مجھ پر ایسا ظاہر ہوا ہے کہ کوئی فرزند اُن کے نصیب میں نہیں ہے۔ آخر ایسا ہی ہوا کہ اُن کے دنیا سے چلے جانے تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ایک صبح (مسجد) جانے کے لیے گھر سے باہر نکلے اور چاہا کہ دو رکعت نماز ادا کریں صف پر قدم رکھا ہی تھا کہ ہٹا لیا اور بولے دیکھو جو چیز صف کو لگی ہوئی ہے صاف کردو۔ خادم نے دیکھا اور بولا کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا دوبارہ دیکھو، تو دیکھا کہ ایک بچھو صف کے نیچے ہے جلد اسے دور کیا تب وہ صف پر آئے اور نماز پڑھی۔ چونکہ اوایل حال میں خواجہ الھداپنی اہلیہ کو ''دیوانی'' کے لفظ سے پکارا کرتے تھے۔ آخر کار وہ بی بی ایک قسم کے جنون میں مبتلا ہوگئیں اس وجہ سے بڑی ایذائیں انھیں پہنچاتی تھیں وہ اُن کا تحمل ایسے طور سے کرتے تھے اور ایسی سلامتی اور مہربانی سے اُن سے پیش آتے تھے جو صرف اہل کمال کو ہی میسّر ہوتی ہے۔ جب وہ بی بی 1063ھ (1653) میں دنیا سے رخصت ہوئیں، میں اپنے شیخ کی خدمت میں تھا اُن کی قبر پر جا کر میں نے یہ مصرعہ تاریخ کہا

فانیہ رفت ازیں جہا ں بجناں

سب لوگوں نے (یہ مصرعہ تاریخ) پسند فرمایا۔

خواجہ عبیداللہ کلاں[1]

''خواجہ کلاں'' سے معروف ہیں۔ وہ میرے شیخ کے بھائی ہیں۔ خواجہ حسام الدین احمد کے صحبت یافتہ ہیں۔ علوم ظاہری اور باطنی کے عالم ہیں۔ بڑے نیک اخلاق۔ اُن کے فضائل اور کمالات حوصلۂ بیان سے زیادہ ہیں۔ اُن کے قلم سے جو تصانیف عالیہ نکلی ہیں۔ بہت ہی نادر اور با قیمت ہیں۔ اُن کی تصنیفات میں سے ایک ''طبقات حسامی'' ہے جسے آپ نے شیخ حسام الدین احمد معروف بخواجہ ابرار کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اور بہت تھوڑے عرصے میں مکمل کی ہے۔ جس میں مختلف سلاسل کے بہت سے مشائخ کے احوال واسرار اور حقائق کا بیان بڑی تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگر تمام سلسلوں کے مشائخ کے سوانح واحوال، اذواق واسرار جدا جدا جمع کر کے مرتب کیے جائیں تو کئی کتابیں ظہور میں آجائیں گی اور ہر سلسلے والے کو تفصیل کے ساتھ ایک ایک کتاب کافی ہو جائے گی۔ ایک دن انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا، بڑا لطف وکرم فرماتے ہوئے مجھے وہ کتاب دکھائی (اتنے کم عرصے میں) اس کی ضخامت، نفاست، جمع وتدوین کی خوبی کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی تھی۔ میں بہت محظوظ ہوا حالانکہ وہ ہمیشہ ہمت واستقامت کے ساتھ گوشہ گیر رہتے ہیں مگر پھر بھی معاملات میں قدم راسخ رکھتے ہیں۔ جود وکرم ان کی صفت ذاتی ہے۔ اُن کا اصلی طریق، طریقۂ غربت، شکستگی اور نامرادی ہے۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ[2] کے وصال کے وقت وہ دو سال اور چار ماہ کے تھے۔ میرے شیخ کا یہ بھی فرمانا ہے کہ شیخ محمد ہاشم سنبھلی کا بیان ہے کہ ایک بار

---

1 مفتی نسیم احمد فریدیؒ کی تحقیق ہے کہ خواجہ خرد ''خواجہ عبیداللہ'' ہیں اور خواجہ کلاں خواجہ عبداللہ ہیں لیکن کئی مؤرخین نے خواجہ خرد کا نام عبداللہ لکھا ہے۔ گمان غالب ہے کہ خواجہ محمد باقی باللہؒ نے اپنے دادا پیر خواجہ عبیداللہ احرار قدس سرہٗ سے بے پناہ محبت وعقیدت کے سبب اپنے بڑے بیٹے کا نام خواجہ عبیداللہ احرار کے نام پر ''عبیداللہ'' رکھا ہو۔ ان کے چھ ماہ بعد آپ کی دوسری زوجہ سے ایک اور فرزند ہوئے جن کا نام آپ نے عبداللہ رکھا ہو۔

2 محمد رضی الدین ابن عبدالسلام بدخشی حضرت خواجہ محمد باقی باللہ معروف بخواجہ بیرنگ (بے رنگ) کی ولادت 5/ذی الحجہ 971ھ/15/جولائی 1564 کو کابل میں ہوئی اور وفات 25/جمادی الثانی 1012ھ/30/دسمبر 1603 کو دہلی میں ہوئی۔ آپ کا مزار دہلی میں مرجع خلائق ہے۔

خواجہ بیرنگ فرمار ہے تھے کہ ہم سے اُسے ایک چیز پہنچی ہے اور خواجۂ کلاں کی طرف اشارہ فرماتے تھے۔ خواجہ بیرنگ کی وفات 25/ جمادی الآخر 1012ھ کو ہوئی ہے۔ میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ خواجہ بیرنگ کو باوجود پرانی دائمی بیماریوں کے کہ بظاہر صحیح اور تندرست نظر آتے تھے تیز بخار لاحق ہو گیا تھا۔ جب آپ آخری مرض میں تھے فرمانے لگے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ خواب میں تشریف لائے اور بہت عنایات فرمائیں آخر میں حکم فرمایا کہ ''لباس زیب تن کرو'' اس واقعے کو سنا کر مسکرائے اور فرمایا اگر ہم زندہ رہے ایسا ہی کریں گے ورنہ کفن ہی ہمارا لباس ہے۔ اسی بیماری میں ایک دن شیخ عبدالحق دہلویؒ سے فرمایا کہ پچھلی شب بدن کے جوڑ درہم برہم ہو گئے تھے اور نزاع کی حالت ظاہر ہوگئی تھی۔ آدھی رات تک یہی کیفیت رہی، پھر آرام ہوگیا۔ اگر مرنا اسی کا نام ہے کیا خوب نعمت ہے کہ اس سے باہر آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ''اسراریہ'' کی تکمیل کے بعد خواجہ کلاں 18/ جمادی الثانی 1073ھ (1664) کو بڑی جمعیت قلب اور سکون و آرام کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی قبر اُن کے شیخ خواجہ حسام الدین ابرار قدس سرہٗ کی قبر کے جوار میں ہے۔ جب میرے شیخ نے اسی سال (1073ھ) مذکور میں سنبھل تشریف لاکر ایک مہینہ اور ایک دن فقیر خانے پر گزار کر دہلی لوٹتے ہوئے راستے میں شیخ منور بن شیخ عنایت اللہ، جو کہ ایک باصلاحیت صالح نوجوان ہیں اور شیخ الہداد قدس سرہٗ کے پوتوں میں ہیں کے مکان پر نزول کیا۔ اسی رات زینے کی پیڑی سے (پھسل کر) اُن کے پیر میں بہت سخت چوٹ آئی اور اسی رات خواجہ کلاں دہلی کے اندر دنیا سے چل بسے۔

میرے شیخ نے اسی بابت مجھے خط میں یہ عبارت لکھ کر بھیجی کہ ''سبحان اللہ[1]

ہم پائے مرا شکستند وہم باز وے مرا''

میں نے اُن کی تاریخ وفات یہ لکھی ہے۔ قطعہ

چون رفت خواجہ عبیداللہ از سرا ے فنا — کدام دیدہ ز مژگان کہ دُرّ اشک نسفت

ہزار جان ز فراقش چو گل گریبان چاک — ہزار دل زجدائیش ہمچو زلف آشفت

کمال از پے سال وصال آن خواجہ — چون فکر کرد۔'' بشد آن خواجہ کلان'' بر گفت[2]

---

1 سبحان اللہ تقدیر الٰہی نے میرا پیر بھی توڑ دیا اور میرا بازو (بھائی) بھی۔ محاورتاً بھائی کو قوت بازو کہتے ہیں۔

2 جب خواجہ عبیداللہ اس سرائے فانی سے رخصت ہوئے کون سی آنکھ نے اپنی پلکوں سے اشکوں کے موتی نہ پروئے۔ ہزاروں جانوں نے ان کے فراق میں گل کی مانند اپنے گریباں چاک کر لیے ہیں اور ہزاروں دل ان کی جدائی میں زلفوں کی طرح پریشان ہیں کمال نے جب ان خواجہ کلاں کے وصال کی تاریخ کی فکر کی تو ''بشد آن خواجۂ کلان'' کہہ اُٹھا۔

خواجہ حجت اللہ

وہ میرے شیخ کے بیٹے ہیں۔اُن کی ولادت آخری ربیع الاول 1040ھ (1630) کو ہوئی۔اُنھیں دولتِ مادر زاد حاصل تھی۔ میرے شیخ کو ان سے خاص محبت تھی۔بچپن ہی سے آثارِ ولایت و ہدایت اُن میں ظاہر و ہویدا تھے۔صلاح اور سلامتی کے طور طریقے اُن سے اس قدر ظاہر ہوتے تھے کہ زمانے بھر میں کم ہی کسی اور سے ایسی لطافت اور خوبی کے ساتھ دیکھے اور سنے گئے ہوں۔وہ کھیل کود کی جانب جیسا کہ بچپن کا تقاضہ ہوتا ہے بہت ہی کم متوجہ ہوتے تھے۔انھیں (گناہوں سے) پاک دامنی حاصل تھی۔ برابر علوم دینی اور اشغال باطنی میں لگے رہتے تھے۔ جب گیارہ سال کی عمر کو پہنچے اسی زمانے میں میرے شیخ سنبھل تشریف لائے یہاں انھیں واقعہ میں ایسا دکھایا گیا کہ (کوئی کہتا ہے) جلد آیئے اور اس فرزند (گرامی قدر) کا دیدار کیجیے۔وہ وہاں پہنچے اور بیمار ہو گئے۔ایک مدت کے بعد وہ پسر بھی بیمار ہو گیا۔اور تین دن کے بعد جمعہ کے دن 12/ جمادی الاولی 1050ھ (1640) کو چل بسا۔اس بے انتہا صدمے اور صبر کی حالت میں میرے شیخ کی بیماری اور بڑھ گئی اور ضعفِ دل انتہا کو پہنچ گیا۔یہی حال پانچ سال تک رہا۔اس بیٹے کی جدائی میں آپ نے بہت سے اشعار کہے ہیں ازاں جملہ ایک قطعہ اور ایک غزل یہ ہے

غزل

بیگانہ گشت حیف زما آشنائے ما — نتوان بصبر داد قضائے جدائے ما
گہ وصل و گہ فراق گہے ناز و گہ نیاز — عدلست ہر چہ می کند آن بت بجائے ما
رفت آنکہ بود روشنیٔ چشم و دل بدو — خالی گذاشت خانۂ ما کد خدائے ما
عہد ظہور در نظر عشق یکدم است — ایں ابتدائے ماست یکے انتہائے ما
حجت برفت معتکفِ کوے دوست شد — اے وائے ما ز دوریٔ او وائے وائے ما[1]

1 ہائے افسوس ہمارا آشنا ہم سے بیگانہ ہو گیا۔ ہمارے بچھڑے ہوئے کو صبر سے بھی نہیں لوٹایا جا سکتا۔ کبھی وصل ہے کبھی فراق ہے کبھی ناز ہے کبھی نیاز ہے۔ وہ محبوب حقیقی ہمارے ساتھ جو بھی کرتا ہے عین انصاف ہے۔ وہ چلا گیا جو میرے دل و نظر کی روشنی تھا۔ ہمارے گھر کے مالک نے ہمارا گھر خالی کر دیا۔ ہماری ابتدائی اور انتہائی دنیوی زندگی کے ظہور کا زمانہ عشق کی نظر میں بس ایک دم کی برابر ہے۔ گویا ہماری یہ ابتدا ایک انتہا ہے۔ حجۃ اللہ چلا گیا اور دوست کے کوچے میں جا کر معتکف ہو گیا۔ ہائے حسرت ہماری اس کی دوری سے ہماری ہائے ہائے۔

قطعہ

پسرم در چہل رفت چون پدر
پدرم در چہل برفت و مرا
گشتم از رفتنش چنان و رفت
او چو کہ من مہربانِ پسرم
پدرم مہربان نیست جہان در
...................................[1]

میرے شیخ کا بیان ہے کہ میں نے شیخ الہداد سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ جن دنوں خواجہ حجت اللہ بیمار تھے حضرت خواجہ بیرنگ[2] کی روحانیت ان کے حال پر بہت مہربان تھی۔ میرے شیخ نے اسی سلسلے میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس دختر کو جوان سے منسوب تھی، چاہا کہ ان کے چھوٹے بھائی خواجہ غلام بہاء الدین سے منسوب کردیں۔ ایک عزیز نے ان کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں (کہ میں نے) سنا ہے کہ اس دختر کو دوسرے کے نامزد کرنا چاہتے ہیں، اس شخص نے کہا جی ہاں۔ تو فرمایا۔ میں اس کو اپنے نکاح میں لاتا ہوں۔ میرے بیٹے کے انتقال کے قریبی دنوں میں ہی وہ لڑکی بیمار ہوئی اور دنیا سے چلی گئی۔ ان دونوں کی قبر خواجہ بیرنگ کی قبر کے نزدیک مغرب رویہ ایک چبوتر کے اوپر ہے۔ میرے شیخ نے ان کے انتقال کے بعد مقام صبر و رضا سے متعلق معارف و حقائق کی باتیں، نذر الٰہی کی تراکیب، ایصال ثواب کی وصیت کے ساتھ ساتھ اُن کے مجمل سوانح حالات بھی مجھے لکھ کر بھیجے جو آگے آتے ہیں۔ میں نے نذر الٰہی کی ترکیب موافق چالیس (40) جمعے تک عمل کیا اور جس مہم کے لیے یہ نذر گذرانی تھی وہ مہم اختتام کو پہنچ گئی۔ اسی دوران رستم خاں دکنی کے ہمراہ قندہار چلا گیا کہ اس وقت ان کا لشکری تھا۔ وہ حمزہ سلطان، سیستان کے زمیندار پر حملے کی غرض سے کیونکہ اس نے بغاوت کردی تھی بحکم بادشاہ متعین تھے۔ ہم لوگ قندھار سے پانچ فرسنگ ہی اس طرف پہنچے ہوں گے کہ آگے ہمیں چالیس یا پچاس فرسنگ تک آب و دانہ اور چارہ بھی ساتھ لے جانا پڑا۔ جب زمین سیستان میں پہنچے تو مجھے خیال ہوا کہ اگر

---

1 میرے والد صاحب کا چالیس سال کی عمر میں وصال ہو گیا تھا۔ والد صاحب کی طرح ہی اب جبکہ مری عمر چالیس سال ہے میرا بیٹا گزر گیا۔ وہ میرا فرزند میرا مہربان جب دنیا سے چلا گیا تو اس کے انتقال سے میں ایسا ہو گیا ہوں کہ جیسے میرا پدر مہربان دنیا میں نہیں رہا۔

2 اصل مخطوطے میں اس جگہ خواجہ بزرگ ہے جو غالباً سہو کتابت ہے۔

رستم خاں نے زبردستی پانی کے باندھ پر قبضہ کرلیا تو مصیبت آب ودانہ وچارہ سے نجات مل جائے گی مگر جنگ وجدل میں کافی وقت لگے گا کیونکہ پانچ ہزار قزلباشی ایرانی سوار حمزہ کی مدد کے لیے آئے ہوئے تھے اور اگر پانی کے بند پر قبضہ نہیں ہوتا ہے تو مختلف قسم کی خرابی اور پریشانی درپیش تھی۔اسی اثنا میں خواجہ حجت اللہ کے پہلے عرس کی تاریخ آگئی۔ میں نے اپنے شیخ کی وصیت کے مطابق کھانا تیار کرایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فقرا یعنی درویشوں کی دعوت کی۔کھانے سے فارغ ہوکر سب حاضرین نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے اور خواجہ حجۃ اللہ کی روح مبارک کو وسیلہ بناتے ہوئے کہا۔اے حجۃ اللہ آپ ولی مادرزاد ہیں، اس نسبت کی حرمت کے طفیل جو آپ کو اللہ تعالیٰ سے ہے ہمارے واسطے اس مہم سے خلاصی کی دعا فرمایئے۔دعا کو ایک گھڑی نہ گزری تھی اور درویشوں کا دعا کرنے والا مجمع ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کہ قندھار کے حاکم کی معرفت بادشاہ صاحب قران ثانی کا خط اس مہم کی ممانعت کا آپہنچا۔ دوسرے روز ہم لوگ پھر قندھار لوٹ آئے اور تیسرے روز اپنے ہم وطن ہندستانیوں سے ملاقاتی ہوئے۔ وہ رقعہ جس میں طریقۂ نذر الہامی وصیت اور دیگر سوانح حالات خواجہ حجۃ اللہ ہیں، یہ ہے۔تقدیر میں جو لکھا تھا وہ تو ہوگیا مگر اس کے چلے جانے سے فقیر بہت آزردہ خاطر اور دل شکستہ ہے۔اللہ اس کے دشمن ذاتی نفس (وشیطان) کو رسوا کرے کہ ہمیشہ اپنی روزافزوں بدخوئی سے نفس چست وچالاک کے تقاضے سے کہ جس نے آدم علیہ السلام کو بھی، بہت بڑی عزت ملنے کے بعد کہ فرشتوں سے بھی سجدہ کرایا) قسمت ازلی سے مقام عزت یعنی جنت سے نکلوادیا۔ذرا سی بات سے تذبذب میں پڑ گیا اور عجیب عجیب فکروں اور وسوسوں میں جن سے نہ خالق راضی ہے اور نہ ہی مخلوق کو پسند خاطر ہیں، مبتلا ہوگیا ہے۔اس فرزند دلبند کے انتقال پُر ملال سے، بہت غمگین اور بڑی تکلیف میں ہوں۔(میں جانتا ہوں کہ) میرے اس حال سے آپ بالکل خوش نہ ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم سے رضائے الٰہی کی انتہائی دولت کے حصول کی سعادت سے اعتراف قصور کے باوجود، دولتِ صبر سے بے بہرہ نہیں رہا ہوں اور اس حادثہ جانکاہ کو عدل محض جان کر

ہر چہ ساقی ماریخت عین الطافست

ایسی مصیبت میں کہ میرے لیے زمین سے آسمان تک ہر شے غم سے بھر گئی ہے، محض فضل الٰہی سے

رضا بالقضا نصیب ہوگئی ہے کیونکہ میں آں برادر کو (خواجہ محمد کمال)[1] بالیقین اپنا حقیقی دوست سمجھ کر اپنے شریک غم و ماتم جانتا ہوں۔ اس لیے صبر بلکہ رضا کہ آں عزیز الوجود سے یہی آرزو کرتا ہوں اور ایصال ثواب کی وصیت کرتا ہوں۔ امید تو یہ ہے کہ وصیت سے بھی زیادہ ایصال ثواب ضرور آپ نے کیا ہوگا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تھوڑی سرگذشت اس واقعے کی ذکر کروں اور اپنے محبوب روحانی جس نے چند روز کے لیے ہم نامرادوں سے دور رہنا گوارا کرلیا ہے، کی لکھوں۔ اے برادر، اے جان برادر! اس سے قبل کہ یہ بلا میرے حوالے ہوتی تقدیر الٰہی نے مجھے پہلے محرم سے ہی بیمار کردیا اور بلاؤں کی قید سے آشنا بنادیا۔ چنانچہ محرم، صفر اور ربیع الاوّل تمام کا تمام عجیب شدائد میں گزر رے۔ ربیع الآخر میں کچھ تخفیف ہوگئی جب جمادی الاوّل آیا، جو کہ اس محبوب جانی کے وصال کا مہینہ ہے، اس مہینے کی آٹھویں تاریخ کو جلا دینے والے بخار نے مجھ پر غلبہ کیا اور میرے سارے اعضا کو توڑ کر رکھ دیا۔ دسویں رات کہ بدھ کی رات تھی بخار کا اثر اس کے بدن مبارک پر ظاہر ہوا اور بدھ کے روز بخار نے شدت اختیار کرلی۔ چنانچہ تمام دن بے ہوش رہا جمعرات کی رات کچھ بُری نہ تھی۔ جمعرات کے دن سارے وقت باتوں میں مشغول رہا۔ ہر قسم کی باتیں کرتا تھا اور خوش و خرم بیٹھا تھا۔ جب جمعے کی رات آئی حالت دگرگوں ہوگئی اور عجیب عجیب جملے اس کی زبان سے نکلتے تھے اور کسی شخص کو علاوہ میرے پہچانتا نہ تھا۔ میں جو کہتا تھا یا پوچھتا تھا معقول جواب دیتا تھا چنانچہ میں نے پوچھا کس حال میں ہو؟ کہا "شکر ہے" میں نے کہا شب بہت گزر چکی ہے آرام کرو، سو جاؤ۔ کہا "بہت اچھا" اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ غیبی صورتیں (یعنی ملائکہ) ظاہر ہوگئیں ہیں۔ اور ان سے باتیں کرتا ہے۔ ایک بار اسی بے خودی میں آیۃ الکرسی تمام کی تمام پڑھی اور دوسری ادعیہ بھی جو اسے میں نے یاد کرائیں تھیں پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد خاموش ہوگیا اور بالکل بات نہ کی۔ حتیٰ کہ تقریباً ایک گھڑی دن چڑھ آیا۔ اور اچانک حالت بدل گئی اور اس وقت زبان کھولی اور "اسم اللہ" کے ذکر میں مشغول ہوگیا۔ اسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی معیت اور خوشنودی سے جاملا۔ بالجملہ جیسا کہ صلاح آثار حافظ مہر علی نے خواب میں ایک بزرگ سے سنا کہ فرمارہے ہیں "وہ ولی مادرزاد تھا اور شہادت کا درجہ پایا" (بدولت جہاد نفس) واقعی ایسا ہی

1 یہاں برادر سے ہر جگہ سید محمد کمال سنبھلی مراد ہیں۔

تھا۔ سچ کہا ہے اور ٹھیک دیکھا ہے۔ بہت سی اور بھی باتیں ہیں جو شہادت پر دلالت کرتی ہیں کہ شہیدوں کا لباس کہتے ہیں سبز ہے۔ جو بہشت کے بہترین رنگوں میں سے ہے۔ فقیر کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ وہ مظلوم ہو گیا ہے۔ جمعہ کی رات کو اس عالم فانی سے کوچ کیا ہے، اس تقریب میں اس کی زبان پر ایک جملہ آیا تھا۔ اے برادر! اس کی پیدائش سے قبل بندے نے بہت سے خواب دیکھے تھے جو کہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ درگاہ خداوندی کا برگزیدہ ہوگا۔ پیدائش کے دن سے وصال تک جو کہ گیارہ سال اور بیالیس دن ہوتے ہیں اس قدر خوارق میں نے اس کے دیکھے ہیں کہ کیا لکھوں۔ بعضے تو میں نے ثبت اوراق بھی کر لیے ہیں۔ انشاء اللہ کسی وقت تمھیں دکھاؤں گا یا بھیجوں گا۔ لوگوں سے اس قسم کی چیزوں کی حکایت سے شرم بھی آتی تھی اور نظر لگنے کا بھی خوف واندیشہ رہتا تھا۔ آخری وہی ہوا۔

قد کان ما اخاف، بکون انا الی اللہ راجعون[1]

ان کے انتقال کے بعد ایک روز ایک درویش نے مجھ سے کہا کہ میں نے ان کو خواب میں دیکھا ہے اور دو شخصوں کا ایک تنکہ قرض اپنے اوپر بتا رہے ہیں ان دونوں شخصوں کے نام بھی بتائے اور کہا کہ گھر جا کر کہہ دینا کہ ادا کر دیں۔ جب تحقیق کی گئی ایسا ہی نکلا۔ خود، فقیر نے اس کو پندرہ بیس روز متصل خواب میں دیکھا۔ ہر روز بہترین صورت میں دیکھا مگر فی الحال اس کے بیان کی فرصت نہیں۔ ایک بقال کی ہمارے محلے میں دکان تھی۔ وہ اس سے اکثر جو دل چاہتا تھا خریدتا تھا۔ اس کو (حجۃ اللہ) انتقال کے بعد بخار کی بیماری لگ گئی اور سولہ روز لگاتار بخار میں تپتا رہا چنانچہ اس کے سب گھر والوں اور شناساؤں نے اس کا مرنا یقین کر لیا۔ ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ اس بقال کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہہ رہا ہے ''اُٹھ کہ صحت یاب ہو جائے گا'' لیکن بات یہ ہے کہ (تیرے لیے) ہماری نذر یہی بخار کی بیماری ہے۔'' جب اس کو ہوش آیا تو دیکھا کہ بخار جا چکا تھا۔ تیسرے دن بندے کے پاس آ کر تمام قصہ بیان کیا۔ اسی طرح ''جانی'' جو بندے کا خادم ہے ایک مہینے بیمار رہا آخر اُس کو خواب میں دیکھا کہا کہ جا صحت پائے گا۔ دو تین دن کے بعد صحت ہو گئی۔ میرے پاس آیا اور جو خدمت اس کے سپرد تھی اس میں لگ گیا۔ غرض یہ ہے کہ اس مرحوم کی خوبیوں

---

1 وہ بات ہو ہی گئی جس سے میں ڈر رہا تھا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعون کہ۔

کو میں لکھ نہیں سکتا اس قدر یقین سے معلوم ہے کہ اس کو درگاہ ربوبیت میں قبول عظیم بخشا گیا ہے۔
اور جس کام کے لیے اس کو وسیلہ بناتے ہیں اور نذر مانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے غالب امید
یہی ہے کہ وہ کام ہو جاتا ہے۔ بس یہ چاہیے کہ حسن ظن رکھے۔ فضائل مآبی خواجہ محمد صدیق بن خواجہ
محمد صادق اس کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے عرس کی رات کو میں نے
اُن کو اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اے بھائی! یہ حکایت کرامت کی قبیل سے ہے جو بظاہر اس کی
شہادت اور ولایت پر دلالت کرتی ہے۔ وصال کے واقعہ کے ایک مہینے قبل بلکہ اس سے زیادہ وقت
سے نماز میں اس قدر رنگار ہتا تھا کہ پنج وقت مسجد جاتا تھا اور جماعت سے نماز ادا کرتا تھا۔ ان دنوں
اکثر آخرت اور قبر کے حالات کو فقیر سے پوچھتا رہتا تھا اور تحقیق کرتا رہتا تھا۔ اہل سنت کے ضروری
عقائد اور نماز کے مسائل خوب یاد کر رکھے تھے۔ اس کے طور طریق کو دیکھ کر اس کی مقبولیت کی قوی
امید بندھی تھی۔ بچوں کے طور طریق سے ایسا بیگانہ تھا کہ دیکھ کر نظر لگ جانے کا خوف اور اندیشہ ہوتا
تھا۔ جس حال میں حافظ مہر علی نے دیکھا تھا، آج رات کہ منگل کی شب یکم رجب ہے اسی حال میں
میں نے خواب دیکھا کہ دستار بھی سبز ہے اور کپڑے بھی سبز ہیں۔ ایک رات اس کی والدہ نے
خواب میں دیکھا کہ گھر آیا ہے۔ والدہ نے دوڑ کر خود سے چمٹا لیا اور بولیں ''اے بیٹے تو کہاں تھا؟
اور یہاں کیسے پہنچا؟'' کہنے لگا'' کیونکہ آپ بہت رویا کرتی تھیں (آپ کی تسلی کے لیے) مجھے بھیجا
ہے۔'' اس کے بعد والدہ نے پوچھا'' وہاں کیا کرتا تھا'' بولا'' اگر میں بتلاؤں بھی تو کیا آپ سمجھ
جائیں گی؟'' وہ بولیں'' مجھ میں سمجھداری نہیں ہے۔'' کہنے لگا'' سمجھدار تو آپ بہت ہیں مگر جس
عالم میں میں ہوں آپ کو اس کی سمجھ نہیں ہے۔'' آخر اس برگزیدۂ درگاہ خداوندی کا کیا حال لکھوں
جس کی (بزرگی کی) انتہا نہیں، قرآن پاک کو ایسا ضبط کیا تھا کہ جہاں سے بھی ایک سطر یا دو
سطر پوچھتے تھے فوراً زبانی پڑھ کر کہتا کہ فلاں رکوع فلاں سپارہ ہے۔ حفظ کی یہ حالت بہت کم کسی کو
میسر ہوتی ہے۔ صَرْف کے قواعد مع عبارات ازبر تھے مجھے قوی امید تھی کہ چودہ پندرہ سال میں
فاضل ہو جائے گا۔ نصیب اعدا ایسا ہی ہونا تھا، کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے حادثے کے بعد بندے
پر اس قدر ضعف طاری ہو گیا تھا کہ میں بھی خوش ہونے لگا تھا کہ اب اس محبوب جانی سے جا ملوں گا
لیکن قسمت نے ساتھ ہی نہ دیا۔ اب یہ ہے کہ جتنے دن اس عالم میں گزارنے کے لکھے ہیں

فقیر نے یہ سوچا ہے کہ جب قوت آجائے گی تو زیارت حرمین شریفین کا عزم کرے، آگے مرضی مولیٰ۔ اللہ جانے کیا ہو۔ جو عاشق اپنے محبوب سے جدا ہو جائے اس کا اس کے علاوہ کیا چارہ ہے کہ صحرا میں نکل جائے اور اپنے غم کو کوہ و بیابان میں لیے لیے بھٹکتا پھرے۔ اے بھائی جبکہ میں تم کو اس کا مخلص زادہ بلکہ خود کو تمھارا بھائی اور اس کو تمھارا برادر زادہ جانتا ہوں یہ امید التماس کرتا ہوں کہ دعا استغفار اور توجہ سے اس کی مدد کریں۔ اگر ہو سکے کلمہ ''لا الـٰہ الا اللہ'' کا ختم جس کی مقدار ستر ہزار ہے اس کی روحانیت مقدسہ کے لیے پڑھیں اور دوسروں سے بھی فرمائیں خاص کر حافظ مہر علی سے کہ مرحوم ان سے نسبت شاگردی رکھتا تھا، میری جانب سے کہیں کہ وہ بھی یہ ختم پڑھیں جتنی بار ہو سکے بہتر ہے اور اگر ختم قرآن ہو سکے تو کیا خوب۔ اس بندے کی وصیت تمھیں خاص کر یہ ہے کہ اس کے وصال کے دن کہ ۱۲ ربیع الاوّل اس کی تاریخ ہے، ایصال ثواب سے یاد رکھیں اور اپنے بیٹوں سے بھی یہ وصیت کر دیں اور کہہ دیں کہ وہ بھی یہ تاریخ ضرور یاد رکھیں اور جو کچھ ممکن ہو سکے اس دن بے تکلف بخش دیں۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ صدقات سے مرنے والوں کو نفع پہنچتا ہے جیسا کہ ''عقائد نسفی'' میں لکھا ہے۔ کیونکہ بندہ اسے بہت دوست رکھتا تھا اور تم کو بھی اپنا ایک جان دو قالب جانتا ہے اس لیے اس قسم کی گستاخی کرتا ہے۔ اس کی نذر کا طریقہ یہ ہے۔ ''اگر کسی شخص کا کوئی مطلب ہو اول کوئی چیز نذر کرنی خود پر لازم کر لے اور مطلب پورا ہونے کے بعد اس کو ادا کرے۔ نذر کا باندھنا جمعہ کے دن ہونا چاہیے کہ اس کے وصال کا دن ہے اور اسی جمعہ سے ہر جمعہ کو جس سے ایک مسکین کا پیٹ بھر جائے کھانا تیار کر کے کسی مسکین کو دے دے تاکہ وہ کھا لے اور سورہ فاتحہ پڑھ کر دونوں کا ثواب اس کی روح کو پہنچائے۔ یہ عمل چالیس جمعہ تک کرے۔ اگر شیرینی ہو تو بہتر ہے ورنہ کوئی بھی کھانا جس کا مقدور ہو۔ مسکین یا درماندہ فقیر اگر صالح ہو تو بہتر ہے ورنہ کوئی بھی ہو مگر ہو مسلمان، اسے دے دے۔ امید یہ ہے کہ چالیس جمعے نہ گزریں گے کہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ انشاء اللہ سبحانہ۔ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد جو نذر مانی تھی، ادا کرے۔ اگر ممکن ہو اس کی والدہ یا سگے بھائی کو دے دے ورنہ کسی نیک صالح فقیر کو دے دے۔ نذر کا یہ طریقہ الہامی ہے جو حق سبحانہ نے میرے دل میں القا کیا ہے۔ اس کی قبولیت کی بہت امید ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ مقام صبر بلکہ مقام رضا بلکہ مقام محبت سے متعلق کچھ

لکھوں۔اے بھائی جان لیں کہ صبر سلوک کے اُن دس مقامات میں سے ایک ہے کہ طریقہ شطاریہ جن میں منحصر ہے جیسا کہ حضرت نجم الدین کبریٰ کے رسالے ''دہ اصل'' میں مذکور ہے اور رضا آخری دسواں مقام ہے۔صبر کے معنی بلاؤں کے آنے کے وقت اپنے نفس کو جزع فزع اور نامناسب (غیر شرعی) امور سے روکے رکھنا ہے۔یہ معنیٰ کراہیت باطن اور الم دل کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں لیکن رضا کراہیت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی کیونکہ رضا خوشنودی کے معنی میں ہے اور خوشنودی کراہیت کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہوسکتی۔رضا متحقق نہ ہوگی جب تک مقام محبت تک نہ پہنچا جائے گا۔کیونکہ محبّ محبوب کے تمام افعال سے راضی ہے اور اس کے قہر کو اس کے لطف جیسا سمجھتا ہے بلکہ اہل محبت غلبات محبت میں کہتے ہیں کہ محبوب کا قہر اس کے لطف سے زیادہ لذت بخش ہے کیونکہ لطف میں تو مرادِ نفس محبّ اور مراد محبوب کا امتزاج ہے لیکن قہر خالص مراد محبوب ہی ہے۔ اسی لیے محبّ صادق افراطِ محبت میں اپنے نفس کی مراد سے دستبردار ہو جاتا ہے اور جب ہر تمنا دل سے رخصت ہو جاتی ہے تو مقام محبت تک پہنچ جاتا ہے[1]۔اور اگر ابھی بھی کوئی آرزو دل میں لیے بیٹھا ہے تو محبت کے کمال سے بے بہرہ ہے اور کسی دوسرے ہی خیال میں ہے ابھی اس کو حقیقت کمال محبت کی ہوا ہی نہیں لگی ہے۔مصرعہ

[2]
در عشق چنیں بوالعجبی ہا باشد

اے بھائی محبّ اور محبوب، عاشق و معشوق کے مابین یہ نسبت ہے کہ محبوب کی لذت، پریشانی محبّ کی خواہاں ہے معشوق عاشق کے رنج والم سے خوش ہوتا ہے۔جب کسی عاشق کو اس راز کا پتہ چل جاتا ہے تو معشوق کے قہر کو اس کے لطف سے زیادہ لذت بخش سمجھتا ہے۔الم عاشق سبب لذت معشوق ہوتی ہے اور لذت و راحت و سکون عاشق دیکھ کر معشوق کو رنج اور تکلیف ہوتی ہے۔حالِ عاشق معشوق کے حال کا آئینہ ہوتا ہے اور معشوق کا حال عاشق کے حال کا آئینہ ہے کیونکہ کسی شے کا آئینہ اس کے مقابل کی چیز ہوتی ہے۔(اندھیروں سے اُجالے پہچانے جاتے ہیں) چیزیں اپنی

---

1 فراق و ہجر بھی آخر گوارا ہو گیا دل کو مجھے ان کی خوشی اپنی خوشی معلوم ہوتی ہے
(مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ)

2 (عشق میں ایسے ہی عجائبات ہوتے ہیں)

ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ مگر یہ معاملہ بس اسی دم تک ہے جب تک کہ عاشق و معشوق کے درمیان دوئی کی قوسین ناز و انداز اور لذت باقی ہے۔ جتنا اس کا الم بڑھتا ہے اُتنی ہی اسے لذت وخوشی ہوتی ہے۔ لیکن جب عاشقی اپنی حدوں سے آگے نکل جاتی ہے تو پھر اس کی لذت اُس کی لذت اِس کا الم اُس کا الم والا معاملہ ہو جاتا ہے لیکن اس حال کو دوام نہیں یہ تو کوند جانے والی بجلی کی طرح ہے طلوع ہوتے ہی چھپ جاتی ہے کہ مقام وحدت میں قرار حقیقت کمال انسانی کے تقاضے کے خلاف ہے کیونکہ جامعیت حضرت انسان اس حال کے خلاف کو مقتضی ہے (یعنی الرب ربٌ العبد عبدٌ) اے برادر اہل دل مجاز کو آئینہ حقیقت کہتے ہیں، جانتے اور مانتے ہیں۔ وہ حقیقت کو مجاز میں دیکھتے ہیں (یعنی اگر پیاس ہے تو پانی بھی ضرور ہے۔ اگر غم ہے تو خوشی بھی ضرور ہے اگر بندہ ہے تو بندہ پرور بھی ضرور ہے یا یہ کہ صفات مجاز، صفات حقیقت کے عکوس ہیں عکس سے عاکس کا سراغ لگاتے ہیں) اور وہاں سے حقیقت کی تحقیق کرتے ہیں۔ لذت والم کا اجتماع مجاز میں تو ظاہر ہے ہی لیکن حقیقت میں اس کا ادراک سخت مشکل ہے۔ عقل وہم وخیال بلکہ کشف سے بھی وراء ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حاشیۂ ادراک مرتبۂ مقدسہ میں لذت و الم کی دید شنود اور تعبیر سے عاجز ہیں۔ الٰہیات کے حکما کا قول ہے کہ مرتبہ مقدسہ میں لذت والم ہے مگر بلا کیف ہے کہ ذات وصفات الٰہی کیفیات سے پاک ہیں (لیس کمثلہٖ شئٌ وھو السمیع العلیم)۔ دائمی طور پر مرتبہ مقدسہ میں لذت والم متحقق ہے یہ معنی تھوڑے غور وفکر سے دریافت ہو سکتے ہیں مگر ایسا کون ہے جو معشوق حقیقی میں اُن کا ادراک کر سکے اور علم و حقیقت میں معشوق حقیقی کو کما حقہ جان سکے (اور بیان کر سکے) کہ کوئی بھی عبارت اس کے مطابق نہیں ہے۔ لفظ ''الم'' بیشک اس سے متعلق ہے لیکن اضافت اس کے مطابق نہیں کہ شریعت اس سے مانع ہے بلکہ حقیقت بھی اسے منع کرتی ہے۔ کیا کیا جا سکتا ہے کہ بہت اسرار راہ حقیقت اس باب سے ہیں کہ ان کے بیان کے لیے کوئی بھی عبارت بنائی ہی نہیں گئی اور اگر کوئی عبارت استعمال ہوتی ہے تو وہ الحاد و زندقہ ہوگی۔ بلکہ اُن اسرار میں کے کچھ تو ایسے ہیں جو اعتبار اور تخیل سے بھی وراء الورا ہیں نہ اُن کو عقیدہ بنانا درست۔ نہ انھیں سوچا جا سکتا ہے نہ تصور اور تخیل کرنا صحیح، تو ان کے تلفظ اور تعبیر کی کیا جگہ باقی رہتی ہے۔ اللہ، اللہ۔ عبارت کیا ہوتی ہے

کہ اشارت بھی قاصر ہیں ۔ یہاں اس بات سے بات میں اور مشکل پیدا ہوگئی۔اے بھائی یہ جان لو کہ عبارت اور اشارت جو بیان کے طور طریق ہیں وہ بھی لفظ و تکلم سے ہی عبارت ہو سکتے ہیں ۔ یا وہم و تخیل اور تصور سے کہ یہی تین مرتبے اظہار و بیان، معنی کے ہیں، خوب سمجھ لو کہ یہ بات بہت باریک ہے کہ مقتضائے وقت سے زیر بیان آ گئی ہے ورنہ، نہ تو حال مخاطب ہی اس کی حقیقت تک پہنچا ہے اور نہ حال متکلم مگر صرف ایک معنی کہ جسے گہری نظر والا ہی پا سکتا ہے۔ تلفظ و تکلم میں بھی عبارت اور اشارت حال ظاہر ہے کہ الفاظ قرآن کا بھی ایک ظاہر ہے ایک باطن[1] ہے ۔ تو تصور، تخیل، تعقل اور اعتقاد کا معاملہ تو اور بھی مخفی ہے تو پھر بجز اعتراف عجز انسانی اس کی حقیقت کو جانا ہی نہیں جا سکتا۔ یہیں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اشارت عبارت تخیل تصور اور اعتبار اس الم کے علم تک کیسے پہنچ سکتے ہیں یعنی ہرگز نہیں۔ میں مانتا ہوں اشارت اور تخیل عبارت کی طرح ہی اس سے قاصر ہیں اور اعتقاد جو مطلوب شریعت ہے اور تمام اہل کلام عقائد اور اہل استدلال اور اہل کشف اس تک پہنچے ہیں۔ ماشاءاللہ وہ مرتبہ مقدسہ اعتقاد عقل ناقص کے تعقل، اہل کشف کے انکشاف سے ورا ہے۔ سارے اصحاب وجدان اور ارباب فنا یہاں عاجز ہیں اور اس کے الم کے ادراک سے بے بہرہ ہیں۔ کیونکہ عاشق حقیقی جب معشوق حقیقی کے نزدیک پہنچتا ہے معشوق کے اوصاف کے دقائق سے آگاہی حاصل کرتا ہے اور معشوق اپنے الم کو بوجہ غیرت جو کہ وہ اس کا مزاج ہے، اُس سے ہرگز ظاہر نہیں کرتا ہے۔ اے بھائی عشق میں الم لازمی ہے۔ عشق جس طرح عاشق میں ہوتا ہے معشوق میں بھی ہوتا ہے بلکہ جامعیت مطلقہ عاشق و معشوق میں "عشق" ہی ہے کیونکہ معشوق خود پر اپنے عاشق سے زیادہ عاشق ہے تو ضروری ہے کہ اَلم سے خالی نہ رہے جس وقت کہ عاشق معشوق کے وصال سے لذت یاب ہوتا ہے عاشقی سے گزر کر عین معشوق ہو جاتا ہے اس وقت عاشق اپنے آپ سے خالی ہو کر اپنے معشوق کے عالم میں گرفتار ہو جاتا ہے یعنی مستغرق ہو جاتا ہے۔ اس معنی میں غور کریں اور اتنے لکھے پر ہی قانع رہیں اور اس سے زیادہ لکھنا نہیں ہے۔ بندہ بالفعل وہی نیت رکھتا ہے جیسا کہ ایک بزرگ اظہار اسرار کی شکایت زبان پر لاتے ہوئے کہتے ہیں:

1 یعنی الفاظ و کلام بھی صرف ظاہر ہی کو بیان کرتے ہیں۔

ومن بعد هذا ما یدق صفاته ما کتمه احظیٰ لذی و اجمل[1]

اے بھائی بعضے دوسرے راز اُس باب سے ہیں کہ عقائد میں اُن کے بیان کا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ نہ علم عقائد اُس کی اطلاع دیتا ہے اور نہ ہی ان کو عقیدہ بنایا جا سکتا ہے۔ نہ اس کا تخیل کیا جا سکتا ہے، نہ تلفظ ممکن ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ ایک نفس الامری (حقیقی) چیز ہے۔ اس مقام پر علم و جہل ایک ہی شے کے تعلق سے متحقق ہو چکا ہے۔ ہائے، ہائے عقل لاچار یہاں پہنچ کر بے کار و درماندہ ہو کر حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ عشق الٰہی کے دیوانوں کے علاوہ کوئی اس راز کو نہیں پا سکتا۔ افسوس صد افسوس ان کے علاوہ کوئی اور زبان عطا ہی نہیں کی گئی ساری زبانیں ان ہی تین زبانوں میں منحصر ہیں۔ دریافت کے بھی اسی لیے (مذکورہ بالا) تین ہی مرتبے ہیں بس۔ شریعت، طریقت اور دریافت کے مذکورہ بالا مراتب سب کے سب اُن پوشیدہ اسرار کی تحقیق میں کوتاہ دست ہیں۔ اگر ان تینوں مرتبوں کے سوا کوئی اور مرتبہ اور زبان بھی ہوتی اور اگر ان اسرار کی حکایت زبان پر آتی بھی تو کوئی مخاطب نہ ہوتا، کوئی ایسا موجود نہ ہوتا کہ وہ سمجھے۔ اس مقام کے بارے میں یوں کہتے ہیں کہ اس کی زبان خاموش ہے مخاطب اور متکلم وہی ایک ذات ہے۔ حقیقت عارف موجود عارف معدوم۔ تم نے بھی یہ مقولہ سنا ہوگا۔ تم نے قرآن میں پڑھا ہے کہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت یوسف علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جدائی میں کتنی تکلیف اُٹھائی ہے اور یہ بات بھی نبی کے شایانِ شان نہیں کہ مقام صبر اور مقام رضا اُن کو حاصل نہ ہوا ہوگا۔ لیکن یہاں ایک بھید ہے کہ عاشق عارف کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہیں۔ سابقہ کلام میں اس کا مجمل بیان گزرا ہے جو اس مشکل کو حل کرتا ہے۔ اے بھائی صبر و رضا عین بلا اور الم میں متحقق ہے کہ مراد معشوق ہے۔ لیکن تمھیں معلوم ہے کہ جدا جدا لباسوں میں جدا جدا لذتیں ہوتی ہیں۔ عاشق کے لیے مختلف لباسوں میں مختلف لذتیں جو ایک دوسرے کی غیر ہیں جمع ہو جاتی ہیں (جیسے تلخ و شیریں، گرم و سرد) اور یہ جو کہتے ہیں کہ عاشق قہر میں بہ نسبت لطف لذت زیادہ پاتا ہے یہ بات نہیں ہے کہ اسے تکلیف نہیں ہوتی۔ تکلیف تو ہے مگر راحت کی صورت میں۔ لذت ہے اَلَم کی صورت میں۔ اَلَم جو

---

1 اس مقام سے گزر کر صفاتِ الٰہی کی تجلی بے کیف ہو جاتی ہے۔ اب میرے نزدیک جو کچھ اس نے چھپایا ہے اس سے زیادہ حسین و جمیل اور لذت بخش ہے جس کا اس نے اظہار کر دیا۔

کہ زیادہ قوی تر ہے، لذیذ تر اور لذت خالص ہے، جو بھی اس حقیقت سے باخبر ہو جاتا ہے بعید نہیں ہے کہ اس مرکب (لذت والم) کا اذعان (قلبی اور روحانی) رکھتا ہو۔ اَلم مرکب (جس میں خوشی بھی غم میں ملی ہو) کی جو خاصیت ہے وہ اَلم انفرادی میں نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ سارا عالم ظاہر مرکب ہے۔ یہاں خوشی اور غم نے ایک مرکب صورت اختیار کر رکھی ہے اور ایک عجیب رنگ پیدا کر لیا ہے، جس کی انفرادی صبر و رضا والے خبر نہیں رکھتے۔ بعض اولیائے کاملین سے جو اس قسم کی حکایتیں منقول ہیں وہ اسی تحقیق پر محمول ہیں۔ فافہم (جیسا کہ ہمارے آقا و مولا حضور صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انتقال میں آبدیدہ تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ اے ابراہیم بیشک ہم تیرے غم میں مغموم ہیں مگر کہیں گے یہی ''انا للہ و انا الیہ راجعون'' اس مقام میں لذت اور الم ایک دوسرے کے مقابل اور مزاحم ہیں (اس طرح کہ) جتنا ان حضرات کا غم قوی ہوتا ہے اتنی ہی لذت صبر و رضا بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔''

خواجہ رحمت اللہ

وہ میرے شیخ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ علوم ظاہری اور باطنی کے عالم اور طریق میں مستقیم الحال ہیں۔ راہ صوفیہ کے حقائق، دقائق (اور اصطلاحات) کو خوب جانتے ہیں اور اُن کا نہایت وافی اور شافی اور مٹھاس سے بھرا صداقت سے لبریز بیان فرماتے ہیں۔ بہت سے صاحب استعداد اس راہ کے اُن سے بہرہ یاب ہیں۔ ہمت بلند رکھتے ہیں۔ (ان کی) بے تعلقی اور آزادی اس سے بھی بلند تر ہے۔ میرے شیخ اُن کی اس بارے میں بہت تعریف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''فقر و فنا کے معنی اس میں کامل طور پر ظہور کیے ہوئے ہیں اور اس حالت میں دن رات ترقی کر رہا ہے۔ میرے شیخ نے اُن کو دونوں سلسلہ شریفہ کی اجازت یہ لکھ کر دی کہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ امّا بعد فقد

اجزت الولد الاغر الاکرم الخواجہ رحمت اللہ ان یاخذا

لـمريد و يعطى البيعت فى السلسلتين النقشبنديه و القادريه و يكتب الشجرتين فى سلسلة المريدين يلقّن الزكر خاصةً فـى سلـسـلة الـنـقشبٰـنـديه و اسالُ اللهَ استقامتهٗ علىٰ طريقة التصوف. والذين ان ارادالمريد بيعت القادريه فاعطِ. [1]

وہ نہایت نیک اخلاق ہیں۔ دورانِ گفتگو انصاف کی بات کرتے ہیں۔ ایک بار جمعے کے روز چند فضلا حضرات اُن کے پاس حاضر تھے اور آپس میں ''یافت الٰہی'' کے سلسلے میں بحث کر رہے تھے۔ اُن میں سے بعض کہہ رہے تھے کہ اس کی یافت عقل سے ممکن ہے نہ کہ نقل سے۔ کیونکہ مشاہدہ، مکاشفہ تو عقل ہی سے متعلق ہیں اگر منقولات کو یافت میں دخل ہوتا تو سارے علما ظاہر عارف باللہ ہوتے۔ اور بعض دوسرے حضرات اس کے خلاف کہہ رہے تھے کہ کلام ربانی اور احادیث نبوی اور اہل تصوف کے علوم اس راہ کے ہادی ہیں، اُن پر کما حقہٗ عمل پیرا ہو کر مقصد تک پہنچا جا سکتا ہے اور حقیقت کا سراغ لگ سکتا ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ عام طور پر ان کے حکم پر گامزن نہیں ہوتے۔ اس لیے محروم رہتے ہیں۔ مگر بہت ہیں جو انھیں کے وسیلے سے معرفت الٰہی اور اسرارِ حقیقت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ دونوں فریق اپنی اپنی تائید میں قوی دلائل پیش کر رہے تھے۔ وہ دونوں کی باتوں کو اپنی طبع انصاف پسند کی ترازو سے تول رہے تھے اور اس کے منتظر تھے کہ کوئی اور معتدل بات فیصلے کی سامنے آ جائے۔ اسی دوران، میں (سید محمد کمال) پہنچ گیا ساری بحث سنی۔ انھوں نے مجھ سے کہا تو بھی اس گفتگو میں جو کچھ جانتا ہے بول۔ میں نے عرض کیا'' آقائی میں کس لائق ہوں جو اس بارے میں لب کشائی کروں اور آپ جیسے کے آگے کیا مجال سخن ہے۔ کیونکہ وہ مجھے اس راہ کا اہل جانتے ہیں اور میرے حال پر خاص لطف و عنایت رکھتے ہیں، (اس

1 بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، امابعد! میں اپنے فرزند انور و اکرم خواجہ رحمت اللہ کو اجازت دیتا ہو کہ وہ لوگوں کو مرید کیا کرے اور اُن سے دونوں سلسلوں نقشبندیہ اور قادریہ میں بیعت لیا کرے اور دونوں سلسلوں کے شجرے لکھ کر دے دیا کرے۔ خاص کر سلسلہ نقشبندیہ کے ذکر (خاص) کی تلقین مریدوں کو کیا کرے اور اگر کوئی مرید صرف سلسلہ قادریہ میں ہی بیعت ہونا چاہے تو بھی بیعت کر لے (اور اس سلسلے کے ذکر خاص کی تلقین کر دیا کرے) میں اللہ تعالیٰ سے تصوف کی راہوں میں اس کی استقامت کا سوالی ہوں۔'' (انتہی کلامہ)

لیے) دوبارہ تاکیداً بولے ''جو کچھ تیرے دل میں آئے ظاہر کر کہ بحث ومباحثے اور باتوں کی راہ تو بہت دراز ہے۔'' تو میں نے کہا ''جہاں حق سبحانہ کی یافت ہے اس جگہ نہ عقل کارگر نہ نقل۔ نہ ذکر نہ فکر۔ نہ ریاضت نہ مجاہدہ۔ نہ کشف نہ توجہ نہ مراقبہ۔ نہ یہ نہ وہ۔'' انھوں نے دریافت فرمایا ''پھر کیا؟'' میں نے عرض کیا ''ایسا اشارہ جس کی تعبیر نہ ہو سکے، ایسا ایما جو بے رمز ہو۔ چنانچہ کسی کو جیسے وہ چاہتے ہیں (مذکورہ بالا صفات واعمال کی برکت کے طفیل) بغیر کسی سان گمان کے خود بخود بغیر اس کی شرکت (اعمال وافعال) کے یافت سے نواز دیتے ہیں۔ ان کی ذات ''ہمہ است بے ہمہ در ہمہ''[1] اور ''الآن کما کان''[2] کی صفت سے متصف ہے۔'' وہ انصاف کو بروئے کار لائے اور فرمایا: ''اَحْسَنْت (تو نے خوب کہا)، تجھ سے بہتر میں نے کوئی ویدہ ور نہیں دیکھا۔ عدل وانصاف کے سلسلے کی مجھے اس وقت ایک حکایت یاد آئی۔ کہتے ہیں کہ مولانا جامی رمضان کے مہینے کی چاند رات کو سلطان حسین مرزا[3] والی ایران کے ہمراہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہرات کے فضلا بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا جامی نے چاند کو دیکھ کر اپنی غزل کا یہ مطلع کہا[4]

شاخ خم ابروت مرا پشت دوتا کرد در شہر چو ماہ نوام انگشت نما کرد

اُن کا یہ شعر مشہور ہو گیا۔ ایک مجذوب نے جوان ہی دنوں کچھ وقت پہلے شیراز کے علاقے میں آئے تھے جب یہ شعر عوام سے سنا تو بولے۔ اگر مولوی (جامی) ''شاخ خم ابروت'' کی جگہ ''طاق خم ابروت'' کہتے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ اُن کا یہ مقولہ جیسے ہی مولوی جامی نے سنا۔ بہت خوش ہوئے اور اُن مجذوب کی خدمت میں آکر از روئے عدل وانصاف عرض کیا۔ ''بارک اللہ۔ آپ باباخیالی ہیں۔'' اور ان کی بادشاہ سلطان مرزا سے جو اُن کا معتقد تھا، ملاقات کرائی، اس طرح ان مجذوب کا کام بلند ہو گیا اور وہ اس کے بعد باباخیالی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

---

1 سب میں سب کچھ وہی ہے بغیر کسی کی شرکت کے۔

2 وہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا اوّل سے تھا۔

3 ابوالغازی سلطان حسین بایقرا۔ بادشاہ ہرات۔ وفات 912ھ/1506

4 تیرے ابروؤں کے طاق کے خم نے میری کمر دوہری کر دی ہے۔ اب لوگ میری طرف ماہ نو کی طرح انگلی سے اشارہ کرتے ہیں گویا کہ میں مہینے کی پہلی تاریخ کا باریک چاند ہوں۔

خواجہ کلمۃ اللہ

وہ بھی میرے شیخ کے بیٹے ہیں۔ اس کار (ولایت و محبت) میں مشغول و مشغوف اور اس کے امام ہیں، نوجوانی، شجاعت اور جوان مردی کے ساتھ ساتھ۔ کیونکہ میرے شیخ کے والد ترک خلج کی قوم میں سے ہیں کسی وقت میں ان کے اجداد کرام بڑے معزز اور مکرم عہدوں پر فائز تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق وغیرہ بہت سے ہندوستان کے بادشاہ ترک خلج گزرے ہیں، ترکان خلج کے احوال سلاطین ہند کے سوانح تواریخ سے تفصیل سے معلوم کیے جا سکتے ہیں لیکن میرے شیخ ایک سیدزادی، میر فولاد کی دختر کے بطن سے ہیں۔ میر فولاد بڑے بزرگ یگانۂ روزگار اور ذی شان گزرے ہیں۔ اِن دنوں خواجہ کلمۃ اللہ بادشاہ صاحب قِران ثانی کی فوج میں لشکری ہیں۔ بادشاہ ان سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کی مزاج پرسی کرتے رہتے ہیں وہ قباپوشی میں رہ کر اہل احتیاج کے کام آتے ہیں اور فقر و معرفت کے میدان میں بھی کوشاں ہیں۔ مولوی جامی کی اس رباعی کی موافقت میں دولت ظاہری اور باطنی سے حصہ کامل لیے ہوئے ہیں۔ رباعی

سر رشتۂ دولت اے برادر بکف آر ایں عمر گرامی بخسارت مگذار
دایم ہمہ جا با ہمہ کس باہمہ کار می دار نہفتہ چشم دل جانب یار[1]

منقول ہے کہ پہلے زمانے میں بادشاہ کے دربار میں ایک چوبدار تھے کہ کتنے ہی مظلوم اُن کی کوشش سے دربار بادشاہ سے بامراد ہوتے تھے۔ اور کتنے ہی محتاج ان کے وسیلے سے مقصد کو پہنچتے تھے۔ خواجہ خضر ہر رات کو اُن کے پاس آتے اور ہم صحبت رہتے تھے۔ انھوں نے خواجہ خضر کی صحبت کی دولت کو غنیمت جان کر وہ نوکری چھوڑ دی (سوچا ایسا نہ ہو کہ دنیا میں پھنس کر صحبت خضر سے محروم ہو جاؤں) اور گوشہ نشین ہو گئے۔ اسی دن سے خواجہ خضر نے اُن کی صحبت میں آنا بند کر دیا۔ ایک رات انھوں نے نہایت الحاح وزاری کی خواجہ خضر حاضر ہوئے تو اُن سے عرض کیا کہ مجھ سے کیا قصور ہوا کہ آپ نے آنا ترک کر دیا۔ انھوں نے فرمایا ''جس وقت تو محتاجوں اور مظلوموں کی

---

1 اے بھائی دو جہاں کی دولت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھام لے۔ اس عمر گرامی کو گھاٹے کے کام میں صرف مت کر۔ ہمیشہ، ہر جگہ، ہر ایک کے ساتھ، ہر کام کے وقت پوشیدہ طور پر نگاہ دل کو دوست کی جانب لگائے رکھ۔

خدمت اور کارگزاری میں لگا ہوا تھا میں بھی آتا تھا جب سے تو نے وہ کام چھوڑ دیا میں نے بھی تجھے چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے یہ بات سنی تنہائی کو ترک کر کے پھر وہی شغل اختیار کر لیا۔ خواجہ کلمۃ اللہ کہتے ہیں کہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ مرد کامل وہ ہے جو صاحب شریعت وطریقت ہے جبکہ ان دونوں باتوں میں سے کسی میں بھی فتور واقع ہو جائے، اس کو کامل نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے (جلوت میں ہوتے ہوئے) وہ خطرہ (وسوسہ) جو آدمی کے دل کو متفرق (ومنتشر) کر دے اور پریشان کر دے وہ میرے مزاحم نہیں ہوتا۔ متعدد کاموں کی فکر کبھی بھی میرے دل میں وسوسہ پیدا نہیں کرتی۔ کتاب ''رشحات'' میں بیان کرتے ہیں کہ۔ خواجہ اولیاء کبیر نے بخارا کے بازار میں نے سرائے صرافان کے دروازہ پر دفع خواطر کا ایک چلہ کیا ہے اس میں چالیس دن رات میں کوئی وسوسہ کسی دن اُن کو پیش نہیں آیا۔ خواجہ احرار قدس سرہٗ اس قسم کے اقرار کو خواجہ کبیر اولیاء سے نہایت عجیب اور بڑی بات سمجھتے ہوئے حیرت زدہ ہو کر انگلی دندانِ مبارک میں دبا کر فرماتے ہیں کہ خواجگان (سلسلۂ نقشبندیہ) قدس اللہ اسرارہم کے طریقے میں تو بہت تھوڑی مدت میں سالک اس مرتبے پر پہنچ جاتا ہے کہ جو آواز بھی کان میں بڑتی ہے ذکر بن جاتی ہے۔ خواجہ احرار ہی فرماتے ہیں کہ خواطر کے جو معنیٰ خواجہ اولیاء کبیر سے منقول ہیں، یہ نہیں ہے کہ کوئی وسوسہ آتا ہی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ کوئی وسوسہ اُن کی نسبت باطنی میں مزاحم نہیں ہوتا تھا۔ جیسے کہ اوپر تیرتا ہوا کوڑا نہر کے بہتے پانی کو نہیں روکتا ہے۔ (اسی سلسلے میں خواجہ احرار قدس سرہٗ نے یہ بھی) فرمایا کہ میں نے خواجہ علاء الدین غجدوانی سے جو خواجہ بہاء الدین (نقشبند) قدس سرہٗ کے اجل اصحاب میں سے تھے، پوچھا کہ کیا آپ کا دل اس طرح ہے کہ اس میں خطرہ غیر نہیں آتا۔ کہنے لگے ایسا تو کبھی کبھی ہوتا ہے اور یہ شعر پڑھا

چوں بغایت پیر شد ایں خورداں[1] غم نباید در درون عاشقان

فرمایا کہ غم نہ چاہیے کہا ہے یہ نہیں کہا کہ غم نہیں آتا۔ اس مشغولیت کی تائید خواجہ علاء الدین عطارؒ کا مقولہ کرتا ہے کہ خطرات مانع مشغولی حق نہیں ہوتے کیونکہ طبعاً اُن سے بچنا دشوار ہے۔ بیس سال

---

1 جب یہ بچے (فقرا یعنی عاشقان الٰہی) بہت زیادہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اُن کے دل میں غم نہیں ہونا چاہیے۔

خواجہ کلمۃ اللہ

وہ بھی میرے شیخ کے بیٹے ہیں۔اس کار (ولایت ومحبت) میں مشغول ومشغوف اور اس کے امام ہیں، نوجوانی، شجاعت اور جوان مردی کے ساتھ ساتھ۔ کیونکہ میرے شیخ کے والد ترک خلج کی قوم میں سے ہیں کسی وقت میں ان کے اجداد کرام بڑے معزز اور مکرم عہدوں پر فائز تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق وغیرہ بہت سے ہندوستان کے بادشاہ ترک خلج گزرے ہیں، ترکان خلج کے احوال سلاطین ہند کے سوانح تواریخ سے تفصیل سے معلوم کیے جاسکتے ہیں لیکن میرے شیخ ایک سیدزادی، میر فولاد کی دختر کے بطن سے ہیں۔ میر فولاد بڑے بزرگ یگانۂ روزگار اور ذی شان گزرے ہیں۔ اِن دنوں خواجہ کلمۃ اللہ بادشاہ صاحب قران ثانی کی فوج میں لشکری ہیں۔ بادشاہ ان سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کی مزاج پرسی کرتے رہتے ہیں وہ قباپوشی میں رہ کر اہل احتیاج کے کام آتے ہیں اور فقر ومعرفت کے میدان میں بھی کوشاں ہیں۔ مولوی جامی کی اس رباعی کی موافقت میں دولت ظاہری اور باطنی سے حصہ کامل لیے ہوئے ہیں۔ رباعی

سر رشتۂ دولت اے برادر بکف آر　　ایں عمر گرامی بخسارت مگذار

دایم ہمہ جا با ہمہ کس باہمہ کار　　می دار نہفتہ چشم دل جانب یار[1]

منقول ہے کہ پہلے زمانے میں بادشاہ کے دربار میں ایک چوبدار تھے کہ کتنے ہی مظلوم اُن کی کوشش سے دربار بادشاہ سے بامراد ہوتے تھے۔ اور کتنے ہی محتاج ان کے وسیلے سے مقصد کو پہنچتے تھے۔ خواجہ خضر ہر رات کو اُن کے پاس آتے اور ہم صحبت رہتے تھے۔ انھوں نے خواجہ خضر کی صحبت کی دولت کو غنیمت جان کر وہ نوکری چھوڑ دی (سوچا ایسا نہ ہو کہ دنیا میں پھنس کر صحبت خضر سے محروم ہو جاؤں) اور گوشہ نشین ہو گئے۔ اسی دن سے خواجہ خضر نے اُن کی صحبت میں آنا بند کر دیا۔ ایک رات انھوں نے نہایت الحاح وزاری کی خواجہ خضر حاضر ہوئے تو اُن سے عرض کیا کہ مجھ سے کیا قصور ہوا کہ آپ نے آنا ترک کر دیا۔ انھوں نے فرمایا ''جس وقت تو محتاجوں اور مظلوموں کی

1　اے بھائی دو جہاں کی دولت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھام لے۔ اس عمر گرامی کو گھاٹے کے کام میں صرف مت کر۔ ہمیشہ، ہر جگہ، ہر ایک کے ساتھ، ہر کام کے وقت پوشیدہ طور پر نگاہ دل کو دوست کی جانب لگائے رکھ۔

خدمت اور کارگزاری میں لگا ہوا تھا میں بھی آتا تھا جب سے تو نے وہ کام چھوڑ دیا میں نے بھی تجھے چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے یہ بات سنی تنہائی کو ترک کر کے پھر وہی شغل اختیار کر لیا۔ خواجہ کلمۃ اللہ کہتے ہیں کہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ مرد کامل وہ ہے جو صاحب شریعت و طریقت ہے جبکہ ان دونوں باتوں میں سے کسی میں بھی فتور واقع ہو جائے، اس کو کامل نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے (جلوت میں ہوتے ہوئے) وہ خطرہ (وسوسہ) جو آدمی کے دل کو متفرق (ومنتشر) کر دے اور پریشان کر دے وہ میرے مزاحم نہیں ہوتا۔ متعدد کاموں کی فکر کبھی بھی میرے دل میں وسوسہ پیدا نہیں کرتی۔ کتاب ''رشحات'' میں بیان کرتے ہیں کہ۔ خواجہ اولیاء کبیر نے بخارا کے بازار میں نے سرائے صرافان کے دروازہ پر دفع خواطر کا ایک چلہ کیا ہے اس میں چالیس دن رات میں کوئی وسوسہ کسی دن اُن کو پیش نہیں آیا۔ خواجہ احرار قدس سرہٗ اس قسم کے اقرار کو خواجہ کبیر اولیاء سے نہایت عجیب اور بڑی بات سمجھتے ہوئے حیرت زدہ ہو کر انگلی دندانِ مبارک میں دبا کر فرماتے ہیں کہ خواجگان (سلسلہ نقشبندیہ) قدس اللہ اسرارہم کے طریقے میں تو بہت تھوڑی مدت میں سالک اس مرتبے پر پہنچ جاتا ہے کہ جو آواز بھی کان میں بڑتی ہے ذکر بن جاتی ہے۔ خواجہ احرار ہی فرماتے ہیں کہ خواطر کے جو معنیٰ خواجہ اولیاء کبیر سے منقول ہیں، یہ نہیں ہے کہ کوئی وسوسہ آتا ہی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ کوئی وسوسہ اُن کی نسبت باطنی میں مزاحم نہیں ہوتا تھا۔ جیسے کہ اوپر تیرتا ہوا کوڑا نہر کے بہتے پانی کو نہیں روکتا ہے۔ (اسی سلسلے میں خواجہ احرار قدس سرہٗ نے یہ بھی) فرمایا کہ میں نے خواجہ علاء الدین غجدوانی سے جو خواجہ بہاء الدین (نقشبند) قدس سرہٗ کے اجل اصحاب میں سے تھے، پوچھا کہ کیا آپ کا دل اس طرح ہے کہ اس میں خطرہ غیر نہیں آتا۔ کہنے لگے ایسا تو کبھی کبھی ہوتا ہے اور یہ شعر پڑھا

چوں بغایت پیر شد ایں خورداں[1] غم نباید در درون عاشقاں

فرمایا کہ غم نہ چاہیے کہا ہے یہ نہیں کہا کہ غم نہیں آتا۔ اس مشغولیت کی تائید خواجہ علاء الدین عطارؒ کا مقولہ کرتا ہے کہ خطرات مانع مشغولی حق نہیں ہوتے کیونکہ طبعاً اُن سے بچنا دشوار ہے۔ بیس سال

---

1 جب یہ بچے (فقرا یعنی عاشقان الٰہی) بہت زیادہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اُن کے دل میں غم نہیں ہونا چاہیے۔

ہو گئے ہیں کہ میں خطرات کی نفی میں کوشاں ہوں اب بھی کبھی کبھی خطرہ غیر دل میں آ جاتا ہے لیکن دل سے گزر جاتا ہے قرار نہیں پکڑتا۔ خطرات کی آمد کو منع کرنے کا دعویٰ بڑی جرأت کا کام ہے۔ بعضے بزرگوں کا تو یہ خیال ہے کہ خطرات کا کوئی اعتبار نہیں (آتے ہیں آنے دو، خود لانے کی سعی نہ کرو)۔ لیکن جیسا کہ پہلے گزرا کہ اگر خطرہ دل میں قرار پکڑ جائے تو اس سے راہ فیض مسدود ہو جاتی۔ ''رشحات'' میں ہی ہے کہ۔ خطرات کی کئی قسمیں[1] ہیں۔ رحمانی، ملکی، نفسانی، شیطانی۔ ''خواجہ کلمۃ اللہ کا قول ہے کہ۔ ایک دن میں والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے ہاتھ میں ایک بیاض تھی جس میں بہت عمدہ اشعار تھے۔ میرے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اُسے دیکھوں۔ والد صاحب نے میری جانب رُخ کیا اور بولے۔'' لے دیکھ اور اُسے مجھے دے دیا۔ پھر میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر چند دن میرے پاس چھوڑ دیں تو اس سے پسندیدہ اشعار کا انتخاب کروں۔ دوبارہ فرمایا'' چند دن اپنے پاس رکھ لو۔'' میں نے لے لیا اور شکریہ بجالایا تب مجھے پتہ چلا کہ مشرف القلوب ہیں یعنی کشف قلوب کی دولت انھیں حاصل ہے۔'' پوشیدہ نہ رہے کہ میں نے اپنے شیخ سے اس قسم کے اشراق باطن (روشن ضمیری کے واقعات) اس قدر ملاحظہ کیے ہیں اور اُن کے دوستوں سے بھی اتنے سنے ہیں کہ اگر انہیں یکجا کردوں تو علاحدہ سے ایک کتاب مرتب ہو جائے گی۔ خواجہ کلمۃ اللہ میرے حال پر اس قدر لطف اور عنایت رکھتے تھے کہ میں اس کی شکر گزاری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا اور میرا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ تحریر وتقریر اس کے بیان سے عاجز ہیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے تنہائی میں فرمایا کہ فلانے کئی سال گزر گئے کہ میں تیرے بارے میں سوچ کر اپنے آپ سے کہتا تھا کہ میرے والد صاحب کے ہزاروں مریدین اور احباب ہیں لیکن تجھ جیسا دوست صادق اور طالب موافق اُن میں کوئی بھی نہیں۔ جب میں نے یہ

---

1 اس کی چار قسمیں ہیں: (1) خطرہ رحمانی یا خطرہ ربانی۔ وہ خطرہ ہے جو سالک کو ذات حق سبحانہ کی طرف متوجہ کرے۔ (2) خطرہ ملکی۔ وہ ہے جو سالک کو عبادت کی طرف رجوع کرے۔ (3) خطرہ نفسانی: جو سالک کو حظ نفس اور خواہشات دنیا کی طرف متوجہ کرے۔ اس کا دوسرا نام ہاجس (دل میں گزرنے والا) ہے۔ (4) خطرہ شیطانی: وہ ہے جو رغبت دلاتا ہے معصیت اور شر وفساد کی اور بجا آوری احکام خداوندی کی مخالفت کرتا ہے۔ (ماخوذ از: اصطلاحات صوفیہ)

بات والد صاحب کی زبان مبارک سے بھی بارہا سنی تو میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میرا خیال اور فراست صحیح و درست نکلی۔

اُن کی وفات پنج شنبے کے دن 17 / رمضان 1071ھ (1661) کو "اسراریہ" کی تکمیل کے تین سال بعد قصبہ اورنگ آباد میں ہوئی۔ ایک زمانے کے بعد ان کی نعش کو وہاں سے لاکر خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے چبوترے پر شیخ الہداد کے نزدیک دفن کیا۔ میں نے اُن کی تاریخ وفات کہی

کلمۃ اللہ خواجۂ راہ ہدیٰ	چوں برفت، اندر جہاں شادی نماند
دوستاں را از تن آسائش گذشت	بیدلاں را در دل آزادی نماند
سال تاریخ وصالش عقل گفت	کلمۃ اللہ عارفے ہادی نماند

خواجہ کلمۃ اللہ کے ایک بیٹے تھے جن کا نام خواجہ محمد تقی تھا اور وہ میر کے نام سے مشہور تھے۔ وہ میر عماد کے نواسے تھے، ان کا ذکر خواجہ احمد کے ذکر میں آئے گا۔ آثار سعادت و ہدایت اس جوان کی پیشانی پر روشن ہیں۔

خواجہ سلام اللہ

وہ بھی میرے شیخ کے بیٹے ہیں۔ تصوف اور اس راہ کے لائق اور علوم حقائق کے عالم ہیں۔ انھوں نے مشرب عاشقی کو شریعت کے ساتھ خوب ملا رکھا ہے۔ علم کو حال کے ساتھ جمع کر رکھا ہے۔ سفر بہت کرتے ہیں۔ فقرا اور مشائخ وقت سے صحبت رکھتے ہیں۔ آپ کو اپنے والد صاحب سے ارشاد طریقہ نقشبندیہ کی اجازت ہے۔ متعدد طلبا ان کی صحبت کی برکت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ اپنے والد کے بعد دقیق مصنفات جیسے "قرائح عربی" اور "طریق الوصول الی اصول الاصول" وغیرہ کو اپنے والد صاحب سے پڑھا ہے اور توحید و معرفت کے اُن علوم (عجیبہ) و غریبہ کی تحقیق کی ہے اور ان کا شافی و کافی بیان کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد صاب کے ملفوظات کو جمع کیا ہے۔ اُن میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا ہے کہ۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے والد محترم ایک خانقاہ میں تشریف فرما ہیں اور صادر و وارد کی خدمت میں مشغول ہیں۔ میں نے کہا۔ میرے شیخ میں بھوکا ہوں مجھے سیر کیجیے۔ انھوں نے کوئی چیز اپنی بغل

سے نکال کر مجھے دی جسے میں نے جیسے ہی کھایا مجھ پرغیب کی بہت سی باتیں ظاہر ہوگئیں جن کا نہ کہنا ہی مناسب ہے اور چھپانا ہی اولیٰ ہے۔ میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ شیخا! توحید کیا ہوتی ہے اور کیا معنی ہیں۔ والد صاحب نے فرمایا ''جس وقت (اسی خواب میں) تیرا وجود نہ رہے تب توحید ہوتی ہے اور جب تک تو ہوگا'' شرک اور کفر اسی کو کہتے ہیں (اگر تو اچھی طرح غور کرے)۔ انھوں نے (ملفوظات میں) یہ بھی لکھا ہے۔ ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میرے والد صاحب ایک صحرا میں جا رہے ہیں کسی نے اُن سے معلوم کیا ''توحید وجودی ہے یا شہودی'' جواب دیا۔ اوّل صحیح ہے کیونکہ دوسری میں نسبت ہے۔ اور نسبت کی، توحید میں گنجائش نہیں۔ اس شخص پر بات اثر کر گئی اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد میری طرف رُخ کیا اور فرمایا ''جا اپنا کام کر تو اس کام کے اہل نہیں'' مشائخ جس کام کو گناہ سے بھی بدتر سمجھتے تھے اور جانتے تھے تو نے اسے اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے، اور اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے'' والد نے یہ بات اس بنا پر فرمائی کہ انھیں دنوں مجھ سے خود رائی کی ایک حرکت صادر ہوئی تھی خواب میں والد صاحب کی یہ ڈانٹ سن کر میرے دماغ میں ایک شورش پیدا ہوئی اور میری گریہ و زاری کم نہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد والد نے (ایک دن) فرمایا ''میں اس وقت خوش ہوں گا جب توبہ کرے۔ آخر میں نے آئندہ ایسی حرکت سے توبہ کی اور از سر نو کام میں لگ گیا اس کے بعد جو ہوا سو ہوا۔ انھوں نے ملفوظات میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک بار میرے والد محترم کو پیٹ کی بیماری ہو گئی وہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص بولا ''فلاں دوا اس مرض میں بہت نافع ہے اور فلاں علاج بہت مفید ہے۔'' والد صاحب نے میری جانب چہرہ پھیر کر فرمایا ''جو کچھ حق سبحانہ نے چاہا ہے وہی ہوگا۔ اس سے بہتر اور اچھا اور کیا ہوگا کہ دوست دوست کے نزدیک پہنچ جائے اور یار یار سے جا ملے؟ اور مولانا روم قدس سرہٗ کے یہ دو شعر پڑھے

گر اجل مرد است گو، پیش من آئی — تا در آغوشم بگیرم تنگ تنگ

من زِ او جانے ستانم جاوداں — اُو زمن دلقے بگیرد رنگ رنگ[1]

---

1 موت سے کہو اگر مرد ہے میرے پاس آئے تا کہ میں اسے اپنی آغوش میں بھر کر بھینچ لوں، میں اس کے وصال سے ہمیشہ رہنے والی جان حاصل کر لوں اور وہ میری رنگ برنگ کے پیوندوں والی گدڑی کو لے جائے یعنی میری دنیاوی تکالیف کا خاتمہ ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا کہ جب مولانا روم کی عالم آخرت میں حاضری کا وقت آیا ملک الموت دور سے دکھائی دیئے۔

پیشتر آ، پیشتر آ جانِ من   پیش رو در حضرت سلطان من[1]

خواجہ سلام اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک عزیز نے میرے والد سے پوچھا "حسن و جمال کا مشاہدہ نفس کو لذت بخشتا ہے یا روح کو؟" میں نے عرض کیا "مشاہدۂ حسن و جمال بعض کے حق میں لذت نفسی ہو اور بعض کے روحی۔ ممکن ہے" میرے والد نے ارشاد فرمایا "فرض کر لو اگر (مشاہدۂ حسن و جمال) لذت روحی کا ہی باعث ہے تب بھی اس سے پرہیز کرنا چاہیے کہ حسن و جمال حقیقی کے سامنے خاک بھی نہیں

آنچہ می باید و نمی آید   آنچہ ی آید و نمی شاید[2]
یار می باید و نمی آید   غیر ی آید و نمی شاید

اور مولانا روم کا یہ شعر پڑھا

عاشقی ہا کز پئے رنگے بود   عشق نبود عاقبت ننگے بود[3]

انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے۔ ایک دن "نفحات الانس" کی بعض باتوں کو میں والد محترم سے دریافت کر رہا تھا انھوں نے ہر بات کے واضح بیان کے بعد فرمایا "اس کتاب میں مشغولی ایک ایسی سعادت ہے جو کہنے سننے سے بالا ہے، پھر فرمایا "اے بیٹے میں چاہتا ہوں کہ تو میری طرح جاہل نہ رہے۔ "الف" اور "با" کے فرق کو پہنچان لے اگر چہ میں "الف" اور "با" میں فرق نہ کر سکا یعنی "الف" کو "با" سے جدا نہ جانا۔ "الف" اور "با" میرے نزدیک ایک ہیں۔ کیونکہ "الف"

---

1 اے میری جان آگے بڑھ، آگے بڑھ اور جلد سے جلد میرے سلطان یعنی محبوب حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ جا۔

2 جسے میں چاہتا ہوں وہ تو آتا نہیں اور جو آتا ہے اس کی مجھے چاہت نہیں میں دوست کو چاہتا ہوں وہ آتا نہیں، غیر آتا ہے اس کی مجھے چاہت نہیں۔

3 مجازی حسن و جمال کا عشق عشق نہیں ہوتا وہ تو آخر کار باعث رسوائی اور بدنامی کا سبب ہے۔

مرتبہ اطلاق یعنی مرتبہ تنزیہہ[1] ہے اور "با" مرتبہ تعین یعنی مرتبہ تشبیہ ہے۔ اور میرے نزدیک تنزیہہ اور تشبیہ ایک ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ امیر المومنین[2] شیخ[3] محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں۔ "وقع الباء بنقطةِ التی تحت الالف " ("ب" الف کے نیچے نقطے کے طور پر واقع ہے یعنی باللہ یا باسم اللہ) تعین اول جو کہ مرتبہ وحدت ہے حقیقت محمدی ہے امیر المتکلمین شیخ ابن عربی قدس سرہٗ بھی تعین اول میں شریک ہیں جیسا کہ خود انھوں نے اپنے کلام میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرے والد نے فرمایا ہے کہ "فقیر وہ شخص ہے کہ جو اپنے دشمن سے دوستی کرے اور ہر شخص کا اعزاز و اکرام کرے اور کسی شخص کو بھی دوئی کی آنکھ سے نہ دیکھے۔ فرضاً اگر کوئی گالی دے فقیر کو چاہیے کہ اس کے لیے دعائے نیک کرے یا کوئی چیز گالی کے بدلے اُسے دے تا کہ اس کا دل خوش و خرم ہو جائے۔ اس کے بعد یہ دو شعر اپنی جانب سے پڑھے

ہر کہ با دشمن نورزد دوستی
رہ نیابد در جناب کبریا

---

1 تنزیہہ: اس کے کئی معنی ہیں ایک یہ کہ ذات حق تعالیٰ کو جملہ عیوب اور نقائص امکانیہ سے پاک جاننا۔ دوسرے یہ کہ ان تعینات سے بالا درجہ (جس کو احدیت اور ذات بحت اور وجود مطلق کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں) مرتبہ تنزیہہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ ذات اس مرتبہ میں ہر اسم وصفت سے مبرا و منزہ ہے اور بعض مرتبہ وحدت اور مرتبہ واحدیت کو بھی مرتبہ تنزیہہ کہتے ہیں۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ ذات حق سبحانہ باوجود مختلف شانوں میں ظاہر ہونے کے اور اپنی صفات و اسما میں آشکارہ ہونے کے ویسے ہی منزہ ہے چنانچہ اسی کی طرف اشارہ ہے "الان کما کان" (وہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا اول میں تھا) کیونکہ ذات کے سوا کوئی دوسری ہستی نہیں ہے۔ ع بخدا غیر خدا در دو جہاں چیزے نیست۔ اور صفات عین ذات ہیں لہٰذا وہ ذات باوجود اس کثرت اور مراتب ظہور اور تعینات کے اپنی بساطت و صرافت اور احدیت پر ہے ان معنی کو عالم کثرت میں ملاحظہ کرنا اور کل عالم کو ایک دیکھنا ایک سمجھنا "تنزیہہ" ہے۔

2 اصل فارسی متن میں امیر المومنین ہے لیکن صحیح امیر المتکلمین ہونا چاہیے۔

3 شیخ محی الدین معروف بہ ابن عربی بڑے صوفیہ کرام میں سے تھے۔ عقیدہ وحدۃ الوجود کے سخت قائل تھے۔ بعض فقہا اور علما نے ان پر بہت اعتراضات کیے ہیں اور زیادہ تر صوفیہ کرام انھیں ولی کامل مانتے ہیں۔ آپ کی ولادت 17 رمضان 560ھ/1165ء بمقام مرسیہ اندلس میں ہوئی اور وفات 22 ربیع الاول 638ھ/1241ء کو دمشق میں ہوئی۔ فصوص الحکم اور فتوحات ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

ذرہ سان می بودہ سرگردان شدم تا کجا آن آفتاب کبریا[1]

انھوں نے اپنے والد محترم حضرت خواجہ خردؒ کے ملفوظات میں تحریر فرمایا ہے کہ میرے والد صاحب نے فرمایا۔ ایک عالم تھے، انھوں نے چاہا کہ ''نفحات الانس'' از سرنو مرتب کریں تا کہ ایک طبقے کے مشائخ کو دوسرے طبقے کے مشائخ سے الگ الگ بیان کردیں بعض صاحب ثروت لوگوں کے اشارے سے شروع بھی کردیا۔ اُن کے بعض دوستوں نے اس کام سے منع بھی کیا لیکن کچھ اثر نہ لیا۔ انہیں ایام میں جس ہاتھ سے وہ لکھتے تھے لشی (لرزہ) طاری ہوئی اور روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور پھر وہ اسی حالت میں دنیا سے چلے گئے۔ خواجہ سلام اللہ ہی لکھتے ہیں کہ ایک دن میں کھڑا ہوا والد محترم کو پنکھا جھل رہا تھا اور وہ سر نیچا کیے بیٹھے تھے، اچانک پنکھا اُن کے سر میں لگ گیا۔ حاضرین مضطرب ہو گئے مگر اُن میں کوئی حس و حرکت ظاہر نہیں ہوئی سر اُٹھایا اور فرمایا۔ جو شخص استہلاک اور استغراق کا غلبہ رکھتا ہے اس سے غیر کی اطلاع غیر کی خبر اور غیر کا اثر اٹھالیا جاتا ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ایک دن میرا محبوب (روحانی طور پر) میرے حجرے میں آیا، بیٹھا، جلوہ گری کی اور لمحے بھر میں غائب ہوگیا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک دن اوائل حال میں دعاؤں کے پڑھتے وقت چنبیلی کے چار پھول میرے ہاتھوں میں آگرے جو لطف و کرم اُن کا مجھ پر تھا اور میں اُن سے جو راز و نیاز رکھتا تھا اس کی شرح نہیں ہو سکتی

وے ہمی داند مرا یارے کیست؟ من ہمی دانم بوے کارے چیست؟[2]

ان کے دو بیٹے ہیں ایک خواجہ فضل اللہ دوسرے خواجہ کلیم اللہ۔ دونوں باغ ولایت و معرفت کے تازہ پھول ہیں۔

خواجہ غلام بہاء الدین محمد

وہ بھی میرے شیخ کے فرزند ہیں ان کا نام بہاء الدین محمد ہے۔ بچپن میں ہی شیخ الهداد سے بیعت کی،

1 جو اپنے دشمن سے دوستی نہیں برتتا وہ کبریا کی بارگاہ میں راہ نہیں پاتا۔ میں ذرّے کے مانند اس آفتاب کبریا کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ آیا وہ کہاں ہے۔

2 وہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کا دوست ہے۔ میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے اس سے کیا کام ہے۔

اس کے بعد اپنے والد کی صحبت سے فیض یاب ہو کر احوال عظیمہ کے مالک بنے۔ عجیب وغریب حالات وواقعات اُن پر وارد ہوتے ہیں اور بڑے بلند اسرار کا مشاہدہ فرماتے ہیں۔ وہ ہی فرماتے ہیں ''خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی میرے حال پر ظاہراً اور باطناً بہت مہربانیاں ہیں۔ ان ہی کا قول ہے کہ ایک دن میں اپنے والد صاحب سے سفر میں ایک منزل سے بھی زیادہ دور ہو گیا تھا کہ وہاں سے کسی شخص کی آواز آنا ممکن نہیں تھی میں اپنے والد صاحب کی زبان مبارک سے اسم اعظم کی آواز اچھی طرح سن رہا تھا۔ وہی کہتے ہیں کہ ایک دن میں خواب میں سورج سے ہم آغوش ہوا اور اس نیر اعظم کے نور میں گم ہو گیا تھا۔ وہی فرماتے ہیں کہ ایک دن سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی فرشتوں نے میری انگلی میں پہنائی اسی خواب کے اندر حکومت سلیمانی ظاہر ہوئی، چرند پرند حاضر ہو گئے۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ بعض اوقات جب میں راتوں کو حجرے میں تنہا رہ گیا ہوں عجیب وغریب احوال سامنے آئے ہیں چنانچہ ایک دن دیکھا کہ چھت اور دیوار پھٹ گئی ہیں چاند ستارے بالکل گم ہو گئے ہیں۔ اس قسم کے احوال اوائل حال میں ان پر بہت طاری ہوتے تھے جن کی تفصیل لمبی ہو جائے گی۔ ان کی صحبت میں بڑی تاثیر ہے۔ ایک بار میرے شیخ نے اُن کے احوال مجھ کو یہ لکھے کہ ''اس کی نسبت بہت بلند ہے۔ بزرگوں کی توجہات ہمیشہ اس کے شامل حال ہیں۔ چنانچہ ان کی قوی توجہ کے آثار بہت سے لوگ خود میں محسوس کرتے ہیں اور ان کی صحبت کی برکت سے عجیب وغریب احوال وکیفیات سے بہرہ ور ہیں۔ یہ حقیر (سید محمد کمال) بھی ان کی صحبت سے متاثر ہوا، چنانچہ ایک دن میں نے ان سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ پر توجہ کریں تا کہ مجھے جمعیت حاصل ہو جائے۔ انھوں نے تواضع کا اظہار کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی۔ جب میں بہت زیادہ مصر ہوا اور کہا کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مجھ پر کیفیات طاری ہوں صرف یہ پتا لگ جائے کہ میری نسبت کیا ہے۔ وہ متوجہ ہوئے فقیر نے خود کو خالی کر لیا تھا۔ تھوڑی سی توجہ سے ہی ایک کیفیت عظیم ظاہر ہوئی چنانچہ ایک گھڑی تک بندے کو خود سے غَیبتِ[1] تام واقع ہوئی اور ان کی صحبت سے اُٹھنے کے بعد بھی دیر تک اس کا اثر رہا۔ غرض یہ کہ وہ ہمہ تن مورد الطاف وعنایات الٰہی ہیں اور ہمہ وقت یاد الٰہی اور حضور و آگاہی میں مصروف ہیں۔ اخلاق بزرگان سے معمور ہیں۔ وہ اتنے مہذب ہیں کہ بیان اس کی

1 غَیبت: جملہ ماسوائے اللہ بلکہ اپنی خودی اور آپے سے بھی گم ہونا اور ذات کے حضور میں رہنا۔

گنجائش نہیں رکھتا اس سب کے باوجود مقید شریعت مطہرہ ہیں۔ الحمد للہ علی ذالک

ایک مرتبہ میں اُن کی صحبت میں ایک ایسی کیفیت عالی سے مستفیض ہوا کہ اس سے بالا تر کوئی کیفیت نہیں۔ (واقعی) آج وہ صاحب ہمت عالی ہیں۔ ان کے علوم و معارف تو اُن کی ہمت سے بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ جب وہ حقائق الٰہیہ کا بیان کرتے ہیں تو ان کی باتیں ایسی بلند پایہ اور عجیب ہوتی ہیں کہ ہر شخص کی عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو پاتی۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ الاسلام (قدس سرہ) نے فرمایا ہے کہ صوفی وہ ہے جو حسب حالِ وقت زندگانی گزارتا ہو۔'' انتہی۔ ان کا قول ہے کہ کوئی شخص تب تک مطلب کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ مخلوق سے فرار نہ اختیار کرے (یعنی باطنی طور پر) کیونکہ یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ صوفی حسب حال وقت زندگانی کرتا ہے یعنی جیسی کیفیت دل ذوق، شوق، خوف، سکون، استغراق وغیرہ اس پر طاری ہوتی ہے اس کا حق ادا کرتا ہے۔ آخر کار ان ہی اشواق واذواق کے توسط سے ہستی مطلق سے متحقق اور ملحق ہو جاتا ہے اسی کو فناء الفنا کہتے ہیں۔ یہ مقام ہی منتہی کا مقام ہے۔ اور وہ مقام کیفیات، متوسط کا مقام ہے۔ کبھی کبھی منتہی کو بھی متوسط کے مقام سے یعنی کیفیات سے بہرہ مند فرماتے ہیں اور متوسط کی توجہ سے اسی مقام سے اپنے رنگ دیتے ہیں کیونکہ منتہی ایک ایسا آئینہ ہے جو ساری کدورتوں اور آلائشوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔ جو چیز بھی اس کے روبرو لاتے ہیں اسی کا رنگ وصورت قبول کر لیتا ہے۔ یہ قول ابوالحسن خرقانیؒ کے بارے میں کسی شیخ کا ہے کہ خرقانی منتہی تھے۔ مرید اُن سے بہت کم فائدہ حاصل کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منتہی کوئی نسبت نہیں رکھتا (یعنی نسبت کیفی) وہ تمام احوال اور کیفیات سے بری ہوتا ہے۔ ارشاد طالبان کے لیے نسبت کیفیت ضروری ہے جس کی وجہ سے مریدوں اور مسترشدوں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اگرچہ منتہیان کو خدائے عز وجل نے یہ مقام بخشا ہے کہ جب چاہتے ہیں اپنے مقام سے نزول کر کے جس کیفیت کو بھی چاہیں ''خود پر طاری کرلیں اور طالب پر اس کو منعکس کر دیں۔ لیکن اُن کا یہ تنزل بھی ارادہ حق تعالیٰ پر موقوف ہے۔ لیکن ان منتہیان حضرات کی اکثر و بیشتر عادت ہمیشہ تمام نسبتوں سے خود کو معطل رکھنا ہے۔ انھوں نے بہت سے عارفانہ شعر کہے ہیں اور شناسا تخلص کرتے ہیں۔ یہ چند شعر ان ہی کے ہیں

قید بود از علم رسمی در حجاب   زان سبب عارف بغم الفت گرفت[1]

رباعی

تا چند بگردابِ تمنا باشی   مانند حباب بے سر و پا باشی
چون موج بہر سو چہ روی سر گرداں   یک چند ہمی نشیں کہ دریا باشی[2]

میں نے "اسراریہ" کا نسخہ یہیں تک لکھا تھا کہ ان کا ایک خط ذیل کے ان دو شعروں کے ساتھ میرے پاس سنبھل پہنچا۔ یہ بات بھی میں نے اُن کے جملہ تصرفات میں سے ایک دیکھی

شب و روزم چہ نالم از شب و روز   کشم خود را بدر یا شام جان سوز
چہ آن روز و شب تارم کہ دارم   فراغ از مہر و ماہ گیتی افروز[3]

ان کا فارسی کلام تو بہت ہے عربی کے یہ دو شعر بھی انہیں کے ہیں

رایت لکل موهوم وجود   هو الموجود والموهوم حقاً
ولم یقبل لما جاءت بفهم[4]   ....[5]

ایک بار میں نے یہ رباعی کہہ کر ان کے پاس لکھ بھیجی تا کہ وہ اپنی پسند ناپسند بتائیں

گویند کہ ذاتِ صرف بے رنگ و نشان   وین کثرت اشیاء ہمہ وہم است گمان

---

1 کیونکہ علم رسمی کے سبب عارف حجاب میں تھا اسی لیے غم (عشق) سے الفت کر لی ہے۔

2 تو کب تک بے سر و پا بلبلے کی مانند تمناؤں کے بھنور میں مبتلا رہے گا۔ موجوں کی طرح کیوں ہر جانب بھاگا پھرتا ہے کچھ دیر۔ بیٹھ کر تو دیکھ کہ دریا ہو جائے گا۔

3 میں صبح سے شام تک دن رات کیوں روتا رہتا ہوں۔ اور خود کو شام غم جاں سوز کی جانب کھینچتا رہتا ہوں وہ سیاہ دن اور وہ کالی رات جو میری ہے کیا رات ہے کہ میں دنیائے دل کو روشن کرنے والے مہر و ماہ یعنی اپنے محبوب حقیقی سے دور ہوں۔

4 میں نے ہر موہوم کا وجود دیکھا ہے۔ موجود اور موہوم وہی ایک ذات ہے۔ لیکن میزان عقل پر جب یہ بات صحیح نہیں اترتی تو عقل کے مارے یہی کہنے لگتے ہیں کہ حقیقت میں ہمارا وجود خارجی ہی صرف وجود ہے اس ذات وحدہ لاشریک لہ کا کوئی وجود خارجی نہیں ہے۔

5 یہ مصرعہ اصل فارسی نسخہ میں مندرج نہیں ہے۔ مترجم و مدون۔

گر بے رنگ است ذات و اشیا وہم — پس و پیش چہ ماند کن سرّ ے ازآن [1]

انھوں نے پسند فرمائی اور اس کی نہایت غامض اور دقیق شرح تفصیل کے ساتھ لکھ کر بھجوائی کہ اس شرح کے لیے ایک اور شرح درکار ہے تب کہیں سمجھ میں آئے گی۔ اس وقت مجھے ایک ظرافت سے بھری مثال یاد آئی ہے وہ یہ ہے کہ فوج میں ایک لاہوری لشکری سے ایک ہندی (اردو) جاننے والے نے پوچھا تیری کتنی تنخواہ مقرر ہوئی ہے۔ اس نے اپنی لاہوری زبان میں کہا۔ ''ونز یہ روپیہ'' ہندی نے کہا۔ ''ونز یہ روپیہ'' کتنے کو کہتے ہیں۔ بولا۔ ''دہ نے دہ'' ہندی نے کہا۔ ''اے عزیز دوست یہ پوچھنا تو ایک ہی مشکل تھی جب تو نے اس کی شرح کی تو تین گنی مشکل ہوگئی۔ خواجہ غلام بہاء الدین کے دو فرزند ہیں ایک خواجہ علاء الدین محمد دوسرے خواجہ حسام الدین محمد۔ دونوں (پوتے) میرے شیخ کے مقبول اور محبوب ہیں۔ ولایت اور ہدایت کے آثار دونوں کی پیشانی سے ظاہر ہیں۔ میرے شیخ نے علائی کے بارے میں یہ غزل کہی ہے

زبان کجاست کہ گویم مدیح خواجہ علائی	بہ از دلست زبان فصیح خواجہ علائی
ہزار اشارۂ لفظ صریح خواجہ علائی	زہے لطافت طبعش کہ باز یافتہ گرد
زہر فساد مزاج صحیح خواجہ علائی	ہمیشہ باد مصوّن تا بود زمین و زمان
جمال ماہر و وجہہ صبیح خواجہ علائی	بشام و صبح بود طاعن دو کوکب جان
ہزار ماہ غلامِ ملیح خواجہ علائی [2]	باو برابری ماہ از خسارت ہست

1 کہتے ہیں کہ ذات بحت بے رنگ اور بے نشان ہے۔ اور اشیا کی یہ کثرت بھی وہم وگمان سے زیادہ کچھ نہیں جبکہ ذات الٰہی بے رنگ ہے اور یہ چیزیں ایک وہم سے زیادہ نہیں۔ اب بتاؤ پھر کیا بچا، اسی سے حقیقت کا راز پا جا۔

2 خواجہ علائی کی زبانِ فصیح اس کے دل سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ میرے پاس ایسی زبان کہاں کہ میں خواجہ علاء الدین کی تعریف کروں۔ اس کی کیا خوب لطافت طبع ہے کہ اس کی زبانِ صریح کے ہزاروں اشارے بار بار پلٹ کر اس ہی کے پاس آجاتے ہیں کہ کوئی انہیں سمجھ نہیں پاتا۔ اللہ کرے اس کا مزاجِ صحیح جب تک زمین زمان ہیں ہر فساد سے محفوظ رہے۔ اس کے چاند سے زیادہ روشن چہرے کا حسن و جمال صبح وشام چاند سورج پر طعنہ زن ہے۔ چاند سے اس کی برابری کی بات کرنا اس کے حسن کی توہین ہے۔ ہزاروں چاند اُن کے حسن ملیح کے غلام ہیں۔

خواجہ علائی (علاء الدین محمد) کی تاریخ ولادت[1] ضیاء دہلوی نے جو کہ عالم فاضل ہیں اور ان کا ذکر انشاء اللہ آئندہ آرہا ہے یہ قطعہ کہا ہے

قطعہ

خواجہ غلام بہاء الدین محمد آنکہ در گیتی — زشان او گل از باغ معرفت بشگفت
یگانۂ کز و اسرار گفتہ ذات و صفات — خدائے عز و جل ہیچ رنگ برو نہ نہفت
بلند منزلتی کز کمال جذبہ شوق — زہر قدم خس و خارِ حیات بُرفت
چون از عنایت دلدار رفت فرزندے — کہ گوہرے بدین حسن قلم نیاز د سفت
زر وے شوق نمودم طلب زہاتف غیب — زسال مَقدم او "نقشبند ثانی" گفت[2]

حسام الدین کی تاریخ ولادت اُن کے والد خواجہ غلام بہاء الدین شناسا نے یہ کہی ہے۔

قطعہ

چو حسام الدین ما از لطفِ حق — آفتاب آئین رسید و ماہ رو
کرد عقل ما ز سال مَقدمش — "خواجہ ابرار آمد"[3] گفتگو[4]

---

1 آپ کی تاریخ ولادت کا مادۂ تاریخی ضیاء دہلوی نے "نقشبند ثانی" لکھا ہے جس سے ۱۰٦۷ھ سن برآمد ہوتا ہے جو عیسوی سن 1657 کے مطابق ہے۔

2 خواجہ غلام بہاء الدین محمد جن کے صدقے میں دنیا میں معرفت الٰہی کے باغوں میں پھول کھل گیے۔ واقعی وہ ایسے یگانہ روزگار ہیں کہ ذات وصفات الٰہی کے راز اُن پر عیاں ہوگئے ہیں اور خدائے عز و جل نے (نسبت کا) کوئی رنگ ان سے چھپا نہ رکھا۔ وہ ایسے بلند مرتبہ ہیں کہ انھوں نے کمال جذبۂ شوق سے زندگی کے ہر ہر قدم کے خس وخار پر جھاڑو پھیر دی ہے۔ محبوب حقیقی کی عنایات سے اُن کے یہاں ایک فرزند پیدا ہوا۔ وہ ایک ایسا درخشاں گوہر آبدار ہے کہ ایسا حسین پھول (شاید ہی) دست قدرت نے پرویا ہوگا۔ میں نے از روئے شوق اس کے دنیا میں تشریف لانے کی تاریخ ہاتف غیب سے طلب کی تو اس نے نقشبند ثانی کہی۔

3 "خواجہ ابرار آمد" سے آپ کی تاریخ ولادت 1064ھ برآمد ہوتی ہے جو 1654 کے مطابق ہے۔

4 جب میرا فرزند (حسام الدین) اللہ کی مہربانی اور لطف سے آفتاب رنگ اور چاند جیسے چہرے والا پیدا ہوا۔ تو میری عقل نے اس کی تاریخ ولادت "خواجہ ابرار آمد" کہی۔

اور میں نے اُن کی تاریخ ولادت کا یہ قطعہ سنبھل سے لکھ کر بھیجا تھا۔

چون حسام الدین برون آمد ز غیب　　شادی آمد در دل و غمہا نہفت
دیدہ ہاے دوستان شد باغ باغ　　سینہ ہاے مخلصان گل گل شگفت
صد دعاے خیر از راہ نیاز　　بس دلِ من گفت کان مژدہ شنفت[1]
ہم دلم تاریخ وے از روے صدق　　خواجۂ ابرار باز آمد بگفت

حق سبحانہ میرے شیخ کی تمام اولاد کو کمالات صوری اور معنوی تک پہنچاے اور عمر دراز بخشے۔ (آمین)

خواجہ عبدالقادر

یہ بھی میرے شیخ کے صاحبزادے ہیں۔ بچپن ہی سے اُن کا طریقہ آزادی اور خلق سے بے تعلقی رہا ہے۔ غربت اور نامرادی کی صفت سے نہایت درجہ متصف ہیں۔ اوصاف حسنہ کے لیے مشہور و معروف، حقیقت میں وہ کسی خاص ربط و وصف تعلق یعنی تعلقات کی قید میں مقید نہیں ہیں

تعلق حجاب است و بے حاصلی　　چوں پیوند با بگسلی واصلی[2]

وہ (ظاہرا) سب سے آشناء ہیں اور (باطنا) سب سے بیگانہ۔ آزادانہ لمبے لمبے سفر کر کے فقرا کی صحبت میں پہنچتے ہیں۔ میرے شیخ نے کہا ہے۔ ''جب اس کی پیدائش کا وقت نزدیک پہنچا ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ مجھ سے کہہ رہے ہیں غوث اعظم سے ربط قائم کر یعنی ان کا مرید ہو جا۔ میں نے کہا۔ اخلاص اور نیاز مندی جو میں اُن کی نسبت رکھتا ہوں وہ اس سے بڑھ کر ہے کہ بیان ہو لیکن روحانی ارتباط خواجہ نقشبند سے رکھتا ہوں۔ پھر بولے۔ کچھ بھی سہی غوث اعظم کا مرید ہونا چاہیے۔ تین بار یہی فرمایا اور میں نے یہی جواب عرض کیا اور اسی زمانے میں یہ لڑکا

1　جب حسام الدین پیدا ہوئے۔ دلوں سے غم دور ہوئے اور خوشیاں چھا گئیں۔ دوستوں کی آنکھیں باغ باغ ہوگئیں اور مخلصوں کے سینوں میں پھول کھل گئے۔ میرے دل نے بطور نیاز مندی سیکڑوں دعائے خیر دیں جب یہ مژدہ سنا اور میرے دل نے اُن کی تاریخ پیدائش بھی صدق محبت کے ساتھ ''خواجہ ابرار باز آمد'' کہی۔

2　غیر کے تعلقات محبوب کی راہ میں پردے ہیں اور بے حاصلی کا سبب بنتے ہیں۔ جب بھی تو دل سے غیر اللہ کے رشتے توڑ دے سمجھ لے کہ تو واصل ہو گیا۔

پیدا ہوا۔ میں نے شیخ الہداد سے رجوع کیا اور عرض کیا۔" میں اس فرزند کو غوث اعظم کا مرید کرتا ہوں، شیخ اس بارے میں توجہ کریں اور اس کا نام جو آپ کو ظاہر ہو وہی رکھا جائے گا۔" شیخ نے توجہ الی اللہ کے بعد فرمایا۔ میں نے واقعہ میں دیکھا کہ خواجہ نقشبند، غوث اعظم اور خواجہ بیرنگ قدس اللہ اسرارہم کی ارواح طیبات ایک جگہ جمع ہوئی ہیں اور میں نے مطلب کو غوث اعظم سے عرض کیا۔ آپ نے خواجہ نقشبند کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ لڑکا ان کے سلسلے سے ہے۔ خواجہ نقشبند نے فرمایا" میں اور آپ ایک ہیں لیکن خواجہ (شیخ الہداد) نے آپ سے رجوع کیا ہے۔ غوث اعظم نے فرمایا" تو اس کا نام ہر دو ولایت پر مشتمل ہوگا۔ خواجہ عبدالقادر ایسے ہی ہوئے۔ جب بھی میں اپنے شیخ کی خدمت میں جاتا ہوں خواجہ عبدالقادر مجھ پر اس قدر لطف و عنایت فرماتے ہیں کہ اس کی شرح ممکن نہیں اور میں اس کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

خواجہ محمد عاشق

وہ بھی میرے شیخ کے فرزند ہیں۔ اگر چہ ان کا نام عاشق ہے مگر میرے شیخ کے محبوب ہیں اور میرے شیخ کے مقبول نظر بھی ہیں۔ بہت نیک اخلاق ہیں۔ ہمت[1] میں اور بھی بڑھ کر ہیں۔ ان کا طریقہ (اخلاق و مروت، صدق و سلامتی، توکل و قناعت) اُن کے معاملات سے ظاہر و نمایاں ہے۔ جو بھی ان کی خدمت میں جاتا ہے ان کے اخلاق اور مروت، اور وسعت قلبی سے خوش ہو کر اُٹھتا ہے۔ گوشۂ قناعت میں اپنے یاران طریقہ اور مریدوں میں خوش دلی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور اپنے بزرگان سلسلہ کے طریقے پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں دوسروں کے طریقے ان کی ہمت عالی میں نہیں جچتے۔ دنیا اور دنیا داروں کی پیروی ان کی ہمت بلند کے کبھی دامن گیر نہیں ہوتی۔ اس زمانے میں "طریقۂ صابری" ان کے حال پر صادق آتا ہے۔ رباعی

جانان بقمار خانہ رندے چندند

تصوف میں اصل کار غیروں سے کٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میرے نزدیک کوئی شعر اس رباعی سے بہتر نہیں جو پہلوان محمود نوربار نے کہی ہے

---

1 ہمت بمعنی توجہ الی اللہ۔

جانان بجمار خانہ رندے چندند [1]

اس کے بعد فرمایا-اگر کوئی "لا الہ الا اللہ" کی حقیقت کو جاننا ہو تو ان کے اس کلام سے سمجھ جائے گا کہ پہلوان محمود کی (بیان کردہ) حقیقت کسی قیدِ تعین میں گرفتار نہیں ہے۔اور وہ (خود بھی) تجلی ذاتی سے شرف یاب تھے۔ان کے سارے یاران طریقت سب کے سب اہل صدق و صلاح ہیں۔ جوان کی راستی حال و صلاح پر گواہ عدل اور ناطق مدح ہیں۔"

خواجہ محمد عاشق کا بظاہر سب سے محبت کا تعلق ہے مگر بباطن وہ سب سے بے تعلق ہیں جیسی کہ اس سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگوں کی روش ہے

از درون شو آشنا و از برون بیگانہ وش　　این چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہان [2]

ان کی شادی (نکاح) میں جو کہ ۱۰۶۸ھ میں ہوئی تھی میرے شیخ کی بشاشت اور نشاط قلب (قابل دید) اور دل کش تھی۔اس میں میرے شیخ اور خواجہ بیرنگ کے دوستوں کی بڑی پُر رونق مجلس تھی۔ جب وقت نکاح آیا، میرے دل میں خیال آیا کہ شادیٔ نکاح کی تاریخ ایسی ہونی چاہیے جس کی عبارت مبارکباد پر مشتمل ہو لیکن تاریخ کہنے کے لیے وقت کم تھا (کیونکہ مبارکباد کا وقت وقتِ نکاح ہی ہوتا ہے) میں نے اپنے شیخ کے باطن سے رجوع کیا، ایک لمحہ میں جتنی دیر میں نکاح پڑھا گیا برجستہ یہ جملہ میرے لبوں پر آ گیا۔ میں کھڑا ہوا اور اپنے شیخ سے مبارکباد کا مذکورہ جملہ "صاحب من طوی محمد عاشق جیو مبارکباد" عرض کیا۔فرمایا" تاریخ نکاح بھی یہی ہے" میں نے کہا۔"جی ہاں" میرے شیخ اور سارے حاضرینِ مجلس بہت خوش ہوئے۔خواجہ محمد عاشق کا مجھ پر بہت کرم اور عنایت ہے جس کا بیان ممکن نہیں۔

خواجہ عبدالرؤف

یہ بھی میرے شیخ کے صاحبزادے ہیں۔غربت، شکستگی، مسکنت اور نیاز مندی کی اعلیٰ صفات سے

---

1 اس رباعی کے دیگر تینوں مصرعے اسراریہ کے دستیاب تینوں نسخوں میں نہیں ہیں۔

2 باطنی طور پر تو اللہ تعالیٰ سے آشنا ہو کر رہے اور ظاہراً ایسا ہو جیسے حقیقت سے بیگانہ ہے۔ایسا زیبا طریقہ دنیا میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

متصف ہیں۔ کم بولنا، لوگوں سے بہت کم صحبت رکھنا ان کا معمول ہے۔ بڑے صاحب ہمت ہیں اور ہر خرد و کلاں سے تواضع برتتے ہیں اور نیازمندی سے پیش آتے ہیں۔ ہمیشہ اقامت صفات خیر (شرع) میں کوشاں رہتے ہیں۔ اپنے باطنی حالات کو نظرِ اغیار سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اپنے گوشۂ گمنامی میں مست رہتے ہیں۔ باوجود اس غریبی اور نامرادی کے کسی سے کوئی طلب نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ ایک عالی مرتبہ بزرگ نے فرمایا ہے کہ ہم نے جو کچھ پایا ہے غریبی کی بدولت پایا ہے

ما غریبا نیم و غربت کارِ ماست بلکہ غربت رونق بازار ماست[1]

سرورِ جہاں و جہانیاں علیہ افضل الصلوٰۃ (والسلام) واکمل التحیات اپنے اصحاب کو ان صفات کے پیدا کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ''کن فی الدنیا کانک غریبٌ او کعابری سبیل و عد نفسک من اصحاب القبور[2]''

خواجہ عبدالرؤف کی کیا سعادت ہے اور کیا ہی نجابت، شرافت اور نظافت ہے کہ ان اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں۔ آخر وہ میرے شیخ خواجہ خرد کے بیٹے اور خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے پوتے (ہی تو) ہیں۔ بڑے صابر اور آزاد مزاج، باہمت و فتوت ہیں جیسا کہ اس سلسلہ عالیہ کے بزرگوں کا شعار ہے۔ ''رشحات'' میں ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ نے اپنے ابتدائی حالات کے سلسلے میں فرمایا کہ میں مرزا شاہ رُخ[3] کے زمانے میں ایک بار ہرے (ہرات) میں تھا اور میرے پاس ایک فلس (پیسہ) بھی نہ تھا۔ بس ایک دستار تھی کہ بہت سے کپڑے کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے پر لپیٹ کر (سر پر) باندھ لیتا تھا۔ ایک دن میں شاہی بازار سے گذر رہا تھا ایک فقیر نے مجھ سے سوال کیا۔ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو اُسے دیتا۔ میں نے دستار سر سے اتاری اور نان بائی کے آگے ڈال

---

1 ہم غریب ہیں اور غربت ہمارا کام ہے۔ بلکہ غربت ہمارے بازار کی رونق ہے۔

2 حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دنیا میں ایسے رہ جیسے تو مسافر ہے اور اجنبی ہے اور اپنے آپ کو اہل قبور یعنی مردوں میں گن زندوں میں مت سمجھ۔

3 مرزا شاہ رُخ ولد امیر تیمور گورگانی پیدائش 14/ربیع الآخر 779ھ/1395 بمقام سمرقند خراسان، ماژندران، بجستان، اصفہان اور شیراز کا حاکم رہا۔ 807ھ/1404ھ میں تخت پر بیٹھا۔ 850ھ/1446 میں 71/سال کی عمر میں وفات پائی (بحوالہ تزک جہاں گیری)

دی اور کہا- یہ دستار پاک ہے یعنی صاف ستھری ہے۔ دیگ دھونے کے بعد سکھانے کے لیے دیگ پوچھنے کے کام آسکتی ہے اسے لے لے اور فقیر کو کھانے کو دے دے۔ نان بائی نے اس کو کھلا پلا کر خوش کر دیا اور بادب تمام دستار میرے پاس لایا مگر میں نے نہ لی اور وہاں سے آگے چل دیا۔

شیخ الہداد (سنبھلی)

آپ خواجہ سراج الدین محمد بن خواجہ ابرار کے جد مادری تھے۔ انوار و برکات اور استقامت کے آثار بوجہ اتم ان سے ظاہر تھے۔ ہمیشہ جامع مسجد فیروزی میں حاضر ہو کر نماز بجماعت ادا کرنے کا نہایت التزام رکھتے تھے۔ سو برسوں کے بعد بھی اپنی حیات مبارکہ کے آخری زمانے تک اپنی روش پر قائم رہے۔ نگاہ بالکل کمزور نہ ہوئی تھی۔ جمعیت قلب ان کے اوقات کی متکفل تھی۔ ابتداء میں شیخ بہلول مجذوب[1] کی صحبت میں رہے ہیں۔ شیخ بہلول کی وفات کے بعد جس سال میرے شیخ خواجہ خرد کی ولادت ہوئی ہے خواجہ بیرنگؒ کی صحبت میں پہنچے ہیں اور طریقہ نقشبندیہ کے شغل میں مشغول رہ کر بہت تھوڑی مدت میں عنایات عالیہ سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔ میرے شیخ کا کہنا ہے کہ کار درویشی میں ایسی استقامت اور کوشش بلیغ کا جو کہ صرف اہل کمال کو میسر ہوتی ہے، ان کی ذات سے ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ میرے شیخ نے ان کی ایک حکایت بھی بیان فرمائی کہ ابتدائے کار میں انھیں خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ سے عشق ہو گیا تھا۔ خواجہ بیرنگ مصلحتاً انھیں اپنے سے دور کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان کی استعداد باطنی دوسرے سلسلوں کے مناسب ہے (دور ہو کر) وہ اور زیادہ سرگرمی اختیار کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دن شیخ تاج الدین دہلی سے (اپنے وطن) سنبھل تشریف لائے اور ان کے مکان پر رات کو قیام کیا۔ انھوں نے خواجہ بیرنگ کا یہ جملہ جب شیخ تاج الدین سے سنا سراسیمہ ہو کر کثرت شوق میں گرتے پڑتے حیران اور مستوں کی مانند دوڑتے ہوئے دہلی پہنچے اور خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے روبرو دو زانوں بیٹھ گئے۔ جب اُن کی نظر خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے جمال پر پڑی پھولوں کا ڈھیر سمجھ کر غلبۂ

---

1 آپ کا نام شیخ عبدالرزاق تھا۔ شاہ قمیص قادری کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ نے 14 رجب بروز جمعرات 1007ھ/1599 کو وفات پائی۔ (بحوالہ ذکر جمیع اولیاء دہلی)

محبت میں اپنی گود میں دبوچ لیا اور انھیں دبوچے ہوئے سارے صحن میں لوٹتے تھے۔ حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ نے تھوڑی دیر کے لیے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنحضرت کبھی نیچے ہوتے کبھی اوپر۔ آنحضرت کے بدن مبارک کو بہت تکلیف پہنچ رہی تھی کیونکہ وہ (شیخ الہداد) بہت زبردست طاقتور شخص تھے۔ آپ قدس سرہٗ نے فرمایا۔ کیا تجھے مجھ سے کچھ کام ہے؟ کہا "مجھے جو کام ہے آپ سے ہی ہے بس آپ ہی میرا مقصد ہیں" آپ قدس سرہٗ نے کہا۔ تو مجھے خود ہی کیوں مار رہا ہے؟ اس کہنے کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ تب انھوں نے فرمایا۔ "میرے چہرے کو دیکھ" بس دیکھتے ہی فوراً کھڑے ہو گئے اور الگ باادب زمین پر جا بیٹھے۔ اور ان پر اس جرأت (بے جا) سے شرمندگی طاری ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ اس روز میں نے آنحضرت کی آنکھوں میں ایک چیز دیکھی جس کی لذت آج تک نہیں بھولا۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ ان کی اہلیہ بی بی دولہ کو خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی پہلی ہی صحبت میں عالم ملکوت کا انکشاف ہو گیا تھا اور بہت قلیل مدت میں مقامات عالیہ پر پہنچ گئیں۔ حضرت قدس سرہٗ ان کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ان کی قدر نہیں جانتے وہ ایسی ہو گئیں ہیں کہ اگر رابعہ بصریہ اس زمانے میں ہوتیں ان کے حلقہ میں بیٹھا کرتیں۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ نے جب چاہا کہ بی بی دولہ کو خلافت عطا فرمائیں تو شیخ تاج الدین کو ان کے پاس بھیجا کہ پہلے اُن کے تصرف اور قوت توجہ باطنی کا امتحان کریں تا کہ جب اطمینان ہو جائے اس وقت خلافت دیں۔ شیخ تاج الدین نے بی بی دولہ سے فرمایا کہ ایک شخص کو اپنے دروازہ پر بٹھا کر اس پر توجہ ڈالیں۔ انھوں نے ویسا ہی کیا اور وہ شخص بے خود ہو گیا اور گر پڑا۔ اس وقت بی بی کو خلافت عطا فرمائی اور ارشاد مسترشداں کا حکم فرمایا۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ اِن شیخ الہداد (سنبھلی) سے فرمایا کرتے تھے کہ "میرے پاس کیوں آتا ہے خود تیرے گھر میں شیخ کامل موجود ہے اس سے کیوں نہیں رجوع کرتا" میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ بہت سی نیک عورتیں بی بی دولہ کی صحبت میں شغل باطنی سے مستفید ہو گئیں تھیں۔ اور بے خودی کی کیفیت تک پہنچ گئی تھیں۔ شیخ الہداد سن 1050ھ (1650) میں انتقال کر گئے اور بی بی دولہ سن 1058ھ (1649) میں دنیا سے رخصت ہوئیں۔ میں شیخ (شیخ الہداد) سے آشنا تھا وہ مجھ پر بڑی شفقت اور لطف فرماتے تھے۔ کبھی کبھی میں اُن کو دیکھتا تھا کہ بارش میں باوجود کیچڑ پانی کے اپنے خادم جس کا نام رجب تھا، کے ساتھ

نماز عشاء کے لیے مسجد میں بڑے شوق سے آتے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا کہ ولی کامل کو دیکھنا نصیب ہے۔ وہ اولیاء سابقین کی یاد دلاتے تھے۔

شیخ رستم

وہ بہت بزرگ اور کاملین میں سے ہیں۔ صاحب احوالِ عظیم ہیں۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ "وہ طریق استقامت تجرد اور اخفائے نسبت میں بے نظیر ہیں۔" انھوں نے چند روز میں ہی طریقہ نقشبندیہ کے سلوک کو ایک اشارۂ غیبی پر خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت میں رہ کر کمال کو پہنچا دیا تھا۔ خواجہ بیرنگ کے انتقال کے بعد آخر عمر تک خواجہ ابرار کی صحبت میں رہ کر اور زیادہ مجاہدہ کیا جس کا تصور بھی ہم ناقصین کی عقلیں نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ صاحب ہمت و دعا اور صاحب تصرف و توجہ ہیں۔ ارواح طیبہ کے ساتھ نسبت قوی رکھتے ہیں۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ ان کا قول ہے کہ ایک دن خواجہ بیرنگ مجھ سے ایک بات دریافت فرما رہے تھے مگر مجھ سے جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔ جواب دینے کے دوراں میں نے اُن کے روئے مبارک پر نظر ڈالی، میری آنکھ تاب جمال سے خیرہ ہو گئی اور آنسو نکل آئے جیسے کہ سورج کو دیکھتے وقت ہو جاتا ہے۔ میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ خواجہ ابرار نے فرمایا کہ وہ اگر چہ خواجہ بیرنگ کے زمانۂ حیات میں خرد سال تھے مگر پھر بھی ان کے بڑے اصحاب میں گنے جاتے تھے۔ ان کے سلوک کی تکمیل کے بعد خواجہ بیرنگ جو برتاؤ اپنے خلفاء سے کرتے تھے وہی سلوک اُن کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ ان کی موجودگی اور غیر حاضری دونوں میں۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ ان کی نیک عادات اور بہترین خصلتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خواجہ بیرنگ اور ان کے گھر کے خرد و کلاں کے ساتھ انھیں جتنی محبت ہے اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ واقعی وہ عقیدت و محبت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اتنی اخلاص و محبت کم ہی کسی میں پائی جاتی ہے۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ میں ایک دن گھڑی بھر کے لیے حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی قبر کے پاس مراقب ہوا جب اس جگہ سے اُٹھ کر چلا تو میں نے شیخ رستم سے کہا کہ اس جگہ ذات حق کے علاوہ کوئی چیز نہیں، وہ اس بات سے بہت محظوظ ہوئے۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ ان کا مقولہ ہے کہ میں نے شیخ رفیع الدین کی وفات کے بعد ایک رات اُن کو خواب میں دیکھا کہ مجھ

سے کہہ رہے ہیں کہ میرے پاس آجا۔ اسی اثنا میں خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ ظاہر ہوئے اور شیخ رفیع الدین سے فرمایا۔ اے فلاں! ابھی چند دن مجھے اس سے کچھ کام ہے۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ اس زمانے میں بندہ ان کو خواجہ بیرنگ کے اصحاب میں جان کر اُن سے مشکلاتِ راہ رجوع کرتا رہا ہے اور ان کی عنایات کے آثار اپنے اندر پاتا ہے اور اُن کو اپنی ظاہر و باطن کی مہمات میں جائے پناہ خیال کرتا ہے۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ ان کی والدہ بی بی قطب کو میں نے بوقت احتضار دیکھا کہ غلبہ نسبت اور دبدبہ حال سے ایسا لگتا تھا گویا وہ شیر پر سوار ہیں اور خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی محبت میں غرق ہیں، تڑپ رہی ہیں بڑی پُر نور نظر آرہی ہیں جیسا کہ اولیاء اللہ کی مائیں ہوتی ہیں۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا کہ خواجہ ابرار نے بادشاہ صاحب قران ثانی کے استقرار اور امور خلافت کی درستگی کے سلسلے میں جو جو دعائیں کیں ہیں اور توجہ خاص مبذول رکھی ہے شیخ رستم نے انھیں (خود سے) بادشاہ کے سامنے ظاہر کر دیا۔ انھیں آگاہ اور آشنا کر دیا۔ اسی لیے بادشاہ انھیں نیکانِ زمان سے سمجھتا ہے۔ اور ان کے ساتھ لطف و کرم اور نیاز مندی کا سلوک کرتا ہے جیسا کہ سب دیکھتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ اللہ کا شکر ہے ابھی وقت باقی ہے کہ لوگ ''حسبتاً للہ'' (اللہ کے لیے) کام کرنے کے لیے دوڑتے ہیں اور اپنے آپ کو دوستانِ خدا کی خدمت میں بغرض خدمت گزاری پیش کرتے ہیں۔ میں نے ان کی بہت سی کرامتیں دیکھی ہیں اور دوسروں کی زبان سے بھی بارہا سنی ہیں۔ مجھے اس کا بھی کامل یقین ہے کہ اگر عقل مرد ہوتی تو ان کی شکل میں ہوتی۔ ان کے ایک فرزند شیخ محمد قلی ہیں انھوں نے جب کہ تین دن کے تھے ''کلمہ طیبہ'' بزبان فصیح (مکمل حروف کی ادائیگی کے ساتھ) پڑھا تھا۔ یہ خواجہ ابرار کے منظور نظر ہیں اور میرے شیخ کے مقبول خاطر۔ آج ظاہراً باطناً (میرے شیخ سے) بہرہ مند فیض الٰہی ہیں اور ان کے مصاحب، مزاج فہم ہیں۔ شیخ محمد قلی کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے بچپن میں اپنے والد سے عرض کیا کہ اس جگہ سے جھروکۂ بادشاہی بہت دور ہے میں دیکھ نہیں پاتا۔ بولے ایک ساعت صبر کر۔ اسی اثنا میں دیکھتا ہوں کہ ایک فیل دماں اکبر آباد کی جانب سے آیا اور دوسرا بھی اسی طرح مست جھومتا ہوا سکندر آباد کی جانب سے آیا اور دونوں آپس میں جنگ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے گُتھ گئے۔ دیر تک یہی نظارہ رہا آخر دونوں کشتی لڑتے ہوئے دریائے جون میں جا گرے میں نے یہ

تماشائے بےنظیر دیکھا۔'' شیخ محمد قلی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ایک رات میں نے خواب میں ایک صحرائے عظیم دیکھا جس میں ایک بہت بڑا حوض پانی سے بھرا ہوا ہے جو قبلہ رو تھا اس حوض پر بہت سے مشائخ کبار اور درویشانِ عالی مقدار تشریف فرما ہیں اور خواجہ ابرار اس حوض کے جنوبی برج کے قریب شمال کی طرف منہ کیے بیٹھے ہیں۔ اسی اثناء میں خواجہ خرد تجرد و بے تعینی کی حالت میں خوش خوش شیر پر سوار اس جگہ پہنچے۔ ان کو دیکھ کر تمام مخلوق ان کی تعظیم کے لیے کھڑی ہوگئی اور یہ کہہ رہے ہیں کہ خواجۂ خرد آگئے، خواجۂ خرد آگئے اس وقت ایسا نظر آیا کہ بہت سے لوگ ہوا میں حوض کے پانی پر کھڑے ہوئے ہیں اور حوض اُن سے بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے شیخ عبدالحق (محدث دہلوی) کی کتاب تصحیح لغات ''شرح مشکوۃ'' فارسی سے بہت سے کارآمد باتیں اور احادیث انتخاب کر کے نئے انداز میں جمع کی ہیں۔ واقعی یہ نیا انداز ہے نہایت دل پسند۔ اس تالیف کا انھوں نے ''سراج المشکوٰۃ'' نام رکھا ہے۔ یہ ہی اُس کتاب کا تاریخی نام بھی ہے۔ ان کا انتقال 1073ھ/1663 میں ہوا۔ میں نے اُن کی تاریخ (وفات) کہی

اے خوشا زیستن و مردنِ آن زندہ دلے ۔۔۔ کہ بدرد و غم او عمر نہ برباد گذشت

شد محمد قلی آزاد ازین دیر فنا ۔۔۔ دولتے یافت کہ وے بےغم ودل شاد گذشت[1]

زان دوئی کردہ ز دل دور بگفتم تاریخ ۔۔۔ آہ صد آہ محمد قلی آزاد گذشت

اسرار یہ کے مکمل ہونے کے چار سال بعد محمد قلی کے پسر حافظ عنایت اللہ جو ایک غریب اور نادار شخص ہیں فرماتے ہیں کہ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ خواجہ ابرار مسجد فیروزی میں آ کر کسی کو بلاتے ہیں۔ شیخ حسن جو کہ شیخ رستم کے برادر نسبتی (سالے) تھے اور دنیا سے چلے گئے تھے مجھے لے کر آئے۔ شیخ یوسف جو کہ شیخ الہداد کے بھتیجے تھے اور ان کا بھی انتقال ہو گیا تھا وہاں حاضر تھے بولے

---

1 اس زندہ دل شخص کا کیا خوب جینا اور مرنا ہے (جو اللہ کے درد و عشق میں مرے) جو عمر اللہ تعالی کے درد و غم میں گذری وہ برباد نہیں ہوئی۔ محمد قلی اس دارفنا سے آزاد ہو گئے۔ انھیں انتقال کے وقت ایسی دولت ملی کہ (وہ ہنستے ہوئے) بےغم اور خوش خوش گئے۔ میں نے دل سے اسی لیے دوئی کو دور کر کے تاریخ وفات کہی ''آہ صد آہ محمد قلی آزاد گذشت'' افسوس صد افسوس محمد قلی آزادی کے ساتھ گزر گئے۔ (نوٹ: اس مصرعہ تاریخی میں ایک ''آہ'' کے چھ عدد شمار نہیں ہوں گے تب سن مذکورہ 1073ھ برآمد ہوگا۔

حافظ کو نہیں بلایا ہے بلکہ شیخ رستم کو بلاتے ہیں حتی کہ شیخ رستم کو خواجہ ابرار کے حضور لے آئے۔ اُن دنوں شیخ رستم نے بیماری سے صحت پائی تھی، صرف کمزوری باقی تھی (کہ) ایک دن حضرت قطب الدین قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے بیمار ہو کر گھر لوٹے۔ میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا خوب ہوش میں تھے مجھ پر بہت لطف فرمایا۔ میر محمد زاہد کے صاحبزادے میر حسن سے (میرے متعلق) کہا کہ فلاں اچھا آدمی ہے۔ فاتحہ پڑھی، (دعا دی) اور مجھے رخصت کیا۔ میرے شیخ فرماتے ہیں کہ ۱۱ر جمادی الاولی کو بغرض عیادت حاضر ہوا اُن کا آخری وقت تھا مگر ہوش و آگاہی حاصل تھی اسی رات کو 1072ھ میں دنیا سے چلے گئے۔ جب اُن کو خواجہ بیرنگ کے چبوترے کے کنارے قبر میں دفن کیا، بڑی لطافت کے ساتھ بارش کا ترشح شروع ہو گیا جب ان کو قبر میں اتارا گیا اُن کا چہرہ دیکھا تو نہایت نورانی تھا مجھے اس سے بے پناہ مسرت حاصل ہوئی۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ میں نے ایک رات انھیں خواب میں دیکھا کہ ایک جگہ کھڑے ہوئے ہیں مجھے معلوم ہے کہ وہ دنیا سے چلے گئے ہیں میں اُن کے پاس گیا اور پوچھا کہ آپ پر کیا گزری؟ بولے۔ اچھی گزری، میں نے پوچھا کوئی تشویش ناک بات تو پیش نہیں آئی۔ بولے تھوڑی، لیکن الحمدللہ خیر سے ختم ہو گئی۔ میں نے پھر معلوم کیا کہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کو دیکھا؟ بولے، دیکھا۔ میں نے پھر پوچھا کہ خواجہ ابرار کو دیکھا؟ (بولے) ہاں۔ میں نے کہا پھر تو تمھاری آنکھ کو بوسہ دینا چاہیے کہ ان حضرات کے دیدار سے مشرف ہوئیں ہیں۔ اُن کی تاریخ وفات پر میں نے یہ قطعہ کہا۔ قطعہ

شیخ رستم صاحب صدق و صفا   چوں بسوے خلد اعلی بُرد راہ
سال تاریخ و صالش عقل گفت   کو حبیب خواجۂ ابرار آہ[1]

---

1 جب صاحب صدق و صفا شیخ رستم نے خلد کی راہ لی عقل نے ان کی تاریخ وصال کہی، ''کو حبیب خواجۂ ابرار آہ'' آہ وہ خواجۂ ابرار کا حبیب کہاں ہے

شیخ مرتضیٰ سنبھلی

وہ صاحبِ عشق ومحبت اور صاحبِ معرفت ووجدان تھے۔ کیا ہی خوش مشرب، ذوق لطیف، نسبت قوی اور اعلیٰ حال رکھتے تھے۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ ان کا قول ہے کہ جب میں خواجہ بیرنگ کی صحبت بابرکت سے مشرف ہوا میری درخواست کے بغیر ہی اُن کے رابطۂ محبت باطنی نے مجھے پکڑ لیا۔ جب میں اُن کی صحبت سے اُٹھ کر گھر آیا تو ان کی صورت مبارک نے ساری سمتوں کا احاطہ کر رکھا تھا یعنی جس طرف نظر کرتا تھا انھیں کی صورت نظر آتی تھی۔ بڑا حیران ہوا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے لشکر کی نوکری نہیں چھوڑی تھی۔ جب میں نے چاہا کہ نظر بھر کر ان کی صورت دیکھوں تو وہ درمیان سے غائب ہوگئی۔ یہ اکبرآباد کی بات تھی۔ جب آپ دہلی تشریف لائے میں رخصت (چھٹی) لے کر دہلی حاضر ہوا اور بیعت کی درخواست کی اس وقت آنحضرت کھڑے ہوئے تھے مجھے ایک گوشے میں لے گئے اور فرمایا (شغل) رابطہ کریں۔ میں نے عرض کیا رابطہ کیا ہوتا ہے؟ سراپا حیا بن کر فرمایا ہماری صورت کا تصور کرو۔" میں نے حقیقت حال عرض کی۔ بہت لطف وکرم فرمایا اور (پھر) دہلی آنے کا اشارہ فرمایا اور کہا کہ رمضان قریب ہے اگر ہو سکے ان ایام میں آئیں۔" میرے شیخ ہی کا فرمانا ہے کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ آخر میں صورت مبارکہ کا ربط ٹوٹنا شروع ہوگیا تو اس حالت سے مجھے بڑی بے چینی ہوئی میں نے خواجہ بیرنگ سے عرض کیا۔ فرمانے لگے کہ اس نے اپنا کام کر دیا اب کیا کرے گا۔ میرے شیخ کا ہی بیان ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ چالیس دن کم وبیش مجھ پر ایسے گزرے ہیں کہ ہر روز ایک تازہ حال اور صفت کا ظہور ہوتا تھا۔ جب وہ وارد ہوتا، فوراً کوئی شخص آتا کہ خواجہ بیرنگ بلاتے ہیں۔ جب میں خدمت مبارکہ میں پہنچتا خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ فرماتے کیا تم پر یہ حال اور یہ کیفیت طاری ہوئی ہے؟ میں عرض کرتا "جی ہاں!" پھر فرماتے "جاؤ اپنے کام میں لگو" سبحان اللہ وہ کیا خوب طریقۂ ارشاد تربیت تھا جو حضرت والا رکھتے تھے۔ ایک نظر میں وہ کام ہو جاتا تھا جو سالہا سال کی ریاضتوں میں بھی میتسر نہ ہوتا۔ جب مسجد سے باہر تشریف لاتے ایک ساعت کھڑے ہوتے اور ان لوگوں میں سے جو ہمراہ ہوتے جس کسی کے لیے چاہتے نظر فرماتے اور جس صفت تازہ کو چاہتے پیدا ہو جاتی تھی۔ میرے شیخ ہی

نے فرمایا ہے کہ ایک دن نظر اندازی کے وقت مجھے ایک حال پیدا ہوا کہ میں خود کو غیر جان کر کہتا تھا کہ یہ تو مر گیا۔ تین دن تک یہی حال رہا ان تین دن میں اپنے آپ سے کہتا تھا کہ فلاں بڑا اچھا آدمی تھا افسوس مر گیا۔ اُن دنوں (جیسا کہ ابھی ذکر کیا تھا) ہر روز نیا حال بھیجتے تھے۔ ایک دن ایک حال کا ورود ہوا مگر کوئی بلانے نہیں آیا۔ میں خود گیا تا کہ عرض کروں مگر اس کا موقع نہ تھا آپ مسجد کے تہہ خانے میں ایک چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے کوئی کتاب ہاتھ میں تھی جسے دیکھ رہے تھے جب مجھے دیکھا کتاب ہاتھ سے رکھ کر اشارے سے فرمایا۔ ''کہیے'' ہر چند میں نے عرض حال کرنا چاہا مگر بولا نہ گیا۔ آپ تیز نگاہ سے مجھے گھور رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ ''کہیے'' میرے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا رعب و ہیبت کی وجہ سے میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ دیر تک یہی معاملہ رہا بہت دیر بعد وہ گھبراہٹ کچھ کم ہوئی لیکن بایاں ہاتھ ابھی تک کانپ رہا تھا بس میں اتنا عرض کر سکا کہ میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ فرمایا ''جاؤ بغیر بلائے مت آئیو'' جب اس جگہ سے اُٹھا، باہر آیا، دیکھا کہ مجھ پر ایک ہول طاری ہے ایک ساعت تک دیوار سے تکیہ لگائے کھڑا رہا یہاں تک کہ حالت بحال ہوئی۔ اس کے بعد میں چند دن تک بخار کی بیماری میں مبتلا رہا۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ایک دن ایک حال عظیم وارد ہوا میں اس سے لذت یاب تھا اور صحن مسجد میں خراماں خراماں گشت لگا رہا تھا۔ ناگاہ آپ مسجد میں تشریف لائے، مجھے اُس حال میں دیکھا آپ کو پسند نہ آیا۔ ایک گھڑی بعد سید احمد پہنچے اور میرے سینے پر ہاتھ مارا کہ کیا حال ہے اور چلتے بنے۔ اس عمل کے ساتھ ساتھ ہی وہ حال جاتا رہا۔ میں بے قرار ہو گیا اور خیال کیا کہ یہ سید کا کام ہے اور یہ کہ سید نے ہی یہ تصرف کیا ہے۔ میں سید کے پیچھے بھاگا اور وحشت بھرے لہجے میں کہا ''یہ کیا (عمل) تھا جو تم نے کیا ہے؟ سید احمد یہ سن کر ہنس پڑے جتنا میں سنجیدگی سے بات کرتا تھا سید اور زیادہ ہنستے تھے۔ آخر جب دیکھا کہ میں بہت زیادہ وحشت زدہ ہو گیا ہوں تو بولے کہ میری طرف سے کچھ بھی واقع نہیں ہوا آپ نے مجھے بھیجا تھا میں نے جو کچھ بھی کیا ان کے حکم کے بموجب کیا ہے مجھے تمہارے کسی حال میں کوئی دخل نہیں۔ میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ایک دن ایک عورت نے خواجہ بیرنگ کو خواب میں دیکھا کہ نہایت لطافت اور خوبی کے ساتھ جلوہ فرما ہیں۔ یہ سن کر مسرور ہو گئے اور اس خواب کی کیفیت (تعبیر) حاضرین سے دریافت کی۔ آپ کے دوستوں

میں سے شیخ کمال[1] نے کہا۔ ذات احدیت کی حقیقت نے ظہور فرمایا تھا۔ جواب سن کر خوش ہوئے۔
میرے شیخ نے مجھ سے فرمایا کہ اسی قسم کے احوال عارف کامل سے ظاہر ہوتے ہیں وہ عارف اس حال میں جس طرح سے جس کام کو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اسی طرح ظاہر فرما دیتے ہیں بغیر اس کی شرکت نفس کے کیوں کہ وہ ان نجاستوں سے پاک ہو چکا ہوتا ہے۔

از غیر خدا چوں غسل کردی ۔۔۔ خود بار دگر نجس نہ گردی[2]

میرے شیخ نے کہا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ایک دن لوگ خواجہ بیرنگ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا سادھوڑہ جو کہ آپ کے دوستوں میں سے ہے (شاید) آپ نے اس پر کوئی تصرف کر دیا ہے وہ زمین پر پڑا ہوا ہے اور آپ کی طرف رخ ہے۔ مدّت ہو گئی بے جنبشِ دست و پا ہے۔ اس حال میں کہ اس کے سینے اور ماتھے پر خراشیں پڑی ہوئی ہیں اور خون میں لت پت ہے۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ ایک دن وہ (بذات خود) خواجہ ابرار کے سامنے اپنی درماندگی کا اظہار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے خواجم! مجھے کوئی حال اور کوئی مقام نصیب نہ ہوا، اسی طرح بیکار رہ گیا۔ خواجہ ابرار نے فرمایا۔ تمھاری یہ بات اس شرابی کی مانند ہے کہ ایک دن شراب خریدی اور پی، شورش پیدا ہوئی اور بدمستیاں کیں اور گریبان پارہ پارہ ہو گیا اس کے بعد اس کی نظر اس شراب بیچنے والے پر پڑی اور غصے میں کہا۔ تو نے مجھے کیسی شراب دی ہے کہ اس کا بالکل اثر نہ ہوا۔ بولا ہاں علامت بے کیفی اور ہوشیاری تمھارے طور طریق سے ظاہر ہے۔ میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ۔ مجھے شیخ مرتضیٰ سے بے حد عقیدت ہے اور ان کا بھی جو لطف و کرم مجھ پر رہا ہے بیان کے لائق نہیں۔ میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ ایک بار شیخ تاج الدین سنبھل میں تھے شیخ مرتضیٰ ان کی خدمت میں پہنچے۔ اُن سے تصرف اور توجہ کا اظہار ہوا جسے انھوں نے اپنے حال نسبت کے خلاف سمجھا اور ملول ہو گئے آخر ان کی صحبت سے اُٹھ آئے۔ جب دہلی آئے خواجہ بیرنگ نے پوچھا تم شیخ تاج الدین کی صحبت میں پہنچے یا نہیں؟ انھوں نے صورت حال عرض کی فرمایا۔ اب جب کبھی تم شیخ تاج الدین کی صحبت

---

1 شیخ کمال قریشی۔ سیاحت کی غرض سے ہندستان تشریف لائے اور قلعہ دہلی کے کنارے سکونت فرمائی۔ 1025ھ/1616ء میں انتقال فرمایا۔ (بحوالہ ذکر جمیع الاولیاء دہلی)

2 جب تو ایک بار غیر اللہ کی نجاست سے پاک ہو گیا تو دوبارہ اب کبھی (انشاء اللہ) نجس نہ ہوگا۔

میں پہنچو سے تو اگر وہ تصرف کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد پھر کبھی ایسا نہیں ہوا۔
میرے شیخ نے ہی فرمایا ہے کہ شیخ مرتضٰی نے کہا ہے کہ میں کبھی کبھی شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی کی قبر پر
[illegible] ایک دن شیخ کی صورت ظاہر ہوئی اور میرے اوپر توجہ ڈالی، مجھے جذب پیدا ہوا۔
اسی دوران خواجہ بیرنگ کی صورت ظاہر ہوئی۔ میرے اور شیخ (فتح اللہ ترین) کے درمیان حائل
ہوگئی۔ اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تجھے مجھ سے حصہ پہنچے مگر تیرا یہ فعل اجازت نہیں دیتا۔ ایک دن
میرے شیخ کے سامنے مولانا جامی کی اس رباعی کا ذکر آیا۔

ہمسایہ و ہمنشیں و ہمرہ ہمہ اوست   در دلق گداو اطلس شہ ہمہ اوست
در انجمن فرق و نہان خانہ جمع   باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

شیخ مرتضٰی نے فرمایا۔ افسوس مولانا جامی جیسا عارف کامل شخص قسم کھا کر ''ہمہ اوست'' کہتا ہے اور
''او'' کو ''از و'' سے تبدیل نہیں کرتا اور اس کا کچھ اعتبار نہیں کرتا۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ مجھے شیخ
مرتضٰی سے بہت نیازمندی ہے اور جو جو مہربانیاں وہ مجھ پر مبذول رکھتے تھے ان سے آخرت میں
بے شمار امیدیں رکھتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ شیخ مصطفٰی پدر شیخ مرتضٰی بڑے سچے اور عاشق بزرگ تھے۔
جوانی کے ایام میں ایک ہندو لڑکی پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ دختر بھی رضامند ہوگئی۔ چھپ کر تنہائی میں
اس کی خواہش سے اسے مسلمان کر کے نکاح میں لے آئے۔ ہندوؤں کی جماعت حاکم وقت کے
دربار میں فریادی ہوئی کہ شیخ نے بڑے ظلم کا کام کیا ہے (کہ زبردستی اس کو مجبور کر کے ایسا کیا
ہے)۔ حاکم نے قاضیوں کو طلب کیا اور اس دختر کو پردے سے عدالت میں حاضر کیا۔ قاضی نے
دختر سے معلوم کیا کہ اگر شیخ نے تجھ سے زور زبردستی کر کے شادی کی ہے تو میں اُن کو گرفتار کر کے
تیرے قبیلے کے حوالے کیے دیتا ہوں اور اگر تو شیخ سے راضی ہے اور خود مسلمان ہوئی ہے تو بتا۔ سچ
کیا ہے۔ لڑکی بولی ''میں نے مصطفٰی کو اور مصطفٰی کے دین کو قبول کیا۔'' اس اقرار سے ارباب شرع
اور حاکم مطمئن ہو گئے اور لڑکی کو شیخ کے سپرد کر دیا۔ شیخ مرتضٰی اسی سے پیدا ہوئے۔ ایک دن شیخ
مرتضٰی نے مجھ سے کہا کہ ہمت اور توجہ میں بڑا سخت اثر ہوتا ہے صاحب توجہ چاہے کوئی بھی ہو
(مسلمانیت کی کوئی قید نہیں) جیسا کہ (اس ہند میں) مشہور ہے کہ پرانے زمانے میں ایک برہمن
تھا جو ایک بت کی پرستش کرتا تھا۔ ایک دن کسی کام سے باہر جانے لگا تو اپنے بیٹے سے کہا۔ جیسا

کہ میں کھانے کے وقت پہلے بت کو بھوجن کراتا ہوں پھر خود کھاتا ہوں تو بھی ایسا ہی کرنا۔ بیٹے نے کہا۔ ''جی پتا جی'' جب کھانے کا وقت ہوا کیونکہ لڑکا یہی سمجھتا تھا کہ بت بھی ہماری ہی طرح واقعتاً کھاتے ہیں اور پجاریوں کی اصطلاح کو نہ سمجھا۔ ایک برتن میں دودھ لیا اور کہنا شروع کیا۔ دودھ پیو جی، دودھ پیو جی۔ کہتے ہیں کہ جب اسے یہی رٹ لگاتے لگاتے کافی دیر ہوگئی اور اس کی خوشامد حد سے گزر گئی بت نے سرا اٹھایا اور تھوڑا سا دودھ پی لیا۔ جب اگلا دن ہوا برہمن گھر لوٹ آیا، بیٹے سے بت کو بھوجن کرانے کی بات پوچھی۔ بیٹے نے ساری کیفیت بیان کی اور کہا کہ جب میں نے بہت زیادہ خوشامد اور اصرار کیا تو تھوڑا سا دودھ پیا۔ (اس بات کو مذاق سمجھا) اور یہ سن کر برہمن نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ بعد میں وہ لڑکا درویش صادق بن گیا۔ کتاب جمع قاضی محمد میں مسطور ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ فرماتے ہیں ''ہمت، خیال کے کسی خاص کام پر متوجہ کرنے کو کہتے ہیں یہ ارادے کے مسلط کرنے کا نام ہے اس طور پر کہ اس وقت کوئی اور خطرہ دل میں بالکل خطور نہ کرے۔ جب کوئی ایسا کرے گا تو اس کا یہ فعل مرادوں کے حصول کا سبب بن جائے گا۔ کہتے ہیں کہ جب کسی کو کوئی مہم درپیش ہو اسی مہم کے مناسب اسمائے الٰہی کی جانب متوجہ ہو۔ اگر بیمار ہے تو اسم مبارک ''الشافی'' کی طرف اگر فقیر ہے تو اسم مبارک ''الغنی'' کی طرف متوجہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس۔ پھر آگے یوں فرماتے ہیں کہ اگر شرائط توجہ صحیح طور سے بجالائی جائیں تو ان اسمائے مبارکہ کی طرف کمال توجہ، کامیابی اور نجات کا سبب ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یقین اور صدق دل کے ساتھ اپنی ساری توجہ کو ان اسمائے مبارک کی جانب متوجہ کر دے تو دنیاوی ہو یا اُخروی، ہر دو سعادتیں اس کو (اگر مصلحت خداوندی اس کی متقاضی ہوئی تو) ضرور حاصل ہوتی ہیں۔ بے رضائے الٰہی ہمت کام نہیں آتی۔ اگر کوئی بے رضائے الٰہی ہمت کو بروکار لاتا ہے ضرور مغلوب (ارادہ الٰہی) ہو جائے گا (یعنی ناکام ہوگا) اسی لیے اگر کوئی غیر مسلمان بھی اپنی کلّی توجہ کو کسی خاص کام کے پورا ہونے کے لیے لگا دیتا ہے تو اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ یہ بات تاثیر ہمت کی بنا پر ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی اس میں شرط نہیں ہے۔ شیخ مرتضیٰ نے ایک بار، شروع زمانہ میں میرے شیخ سے میری نسبت (بطور خوش گمانی) ایک نیک بات کہی تھی جسکا اثر بعد مدّت دراز ظاہر ہوا۔ جب وہ میرے وطن سنبھل میں رہتے تھے تو میرے شیخ مجھے لکھا کرتے تھے کہ اُن کی

صحبت کو غنیمت جانو۔ جب میں ان کی ملاقات و دیدار کے لیے حاضر خدمت ہوتا تھا تو وہ بڑی شفقت لطف وعنایت سے پیش آتے اور بڑی اچھی صحبت نصیب ہوتی۔ ایک دن میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ فلاں فقیر جو کہ محقق آگاہ اور عارف باللہ ہیں کیا وجہ ہے کہ کبھی نماز پڑھتے ہیں کبھی نہیں پڑھتے۔ ابھی یہ خطرہ میرے دل میں مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ انھوں نے فرمایا کہ وہ فقیر یہ کہتے ہیں کہ مجھے نماز سے منع کرتے ہیں (یعنی استغراق میں پہنچا دیتے ہیں)۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ عبدالقادر قدس سرہ سے کہا گیا ''سنا ہے کہ آپ میزاب رحمت کے نیچے (کعبے میں) نماز ادا کرتے ہیں'' فرمایا کہ کسی سے ذکر نہ کرنا میرا سر ہمیشہ (روحانی طور پر) صحن کعبہ میں سجدہ ریز رہتا ہے۔ اسی کتاب میں ہے کہ عین القضات ہمدانی نے اپنے کسی رسالے میں لکھا ہے کہ محمد معشوق طوسی (بظاہر) نماز نہ پڑھتے تھے۔ (مگر) میں نے خواجہ محمد حمویہ اور خواجہ احمد غزالی سے سنا ہے کہ روز قیامت صدیقین کو یہ تمنا ہوگی کہ کاش ہم وہ خاک ہی ہوتے جس پر کسی دن محمد معشوق کا قدم پڑ گیا ہوتا۔ اسی کتاب میں ہے کہ محمد معشوق ایک دن قبا پہنے ہوئے طوس کی جامع مسجد میں داخل ہوئے۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر نے اُن کی تعریف میں اہل مسجد سے کچھ کہنا چاہا ان محمد معشوق نے قبا کا بند کھینچ کر اشارے سے شیخ ابوسعید کو خاموش کرنا چاہا لیکن شیخ ابوسعید کی زبان خود بخود کھل گئی اور بولے۔ اے سلطان عصر! اے سرور جود! قبا کے بند کھول دیجیے کہ آپ نے (اپنے اس عمل تصرف سے) ساتوں زمین و آسمان کے بند لگا دیے ہیں۔ اسی کتاب میں ہے کہ شیخ ابوعبداللہ خفیف سے پوچھا کیا سبب ہے کہ وہ شام کو نماز نہیں پڑھتے۔ فرمایا وہ ہمیشہ غیب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ عالم غیب کی باتیں ان پر غالب آ گئی ہیں، مقام حیرت میں جا پڑے ہیں اس لیے اعمال ظاہری سے معذور ہیں۔'' ایک دن میرے دل میں آیا کہ میں شیخ مرتضٰی سے عرض کروں کہ جتنا میں ذکر باطنی میں اشتغال رکھتا ہوں کیا بات ہے کہ اس کے اثر کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ جیسے ہی یہ کہنے کی میں نے سوچی وہ فوراً کہنے لگے۔ بایزید بسطامی کی صحبت میں ایک مرید ہمیشہ ذکر میں مشغول رہتا تھا لیکن اس کا کچھ بھی اثر اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ بایزید قدس سرہٗ نے اسے سلطان الذاکرین کا لقب دیا۔ جب اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا۔ اگر تم میں کا کوئی دوسرا ذکر کا اثر نہ دیکھتا تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا۔ وہ اگر چہ کوئی اثر اپنے ذکر میں نہیں پاتا مگر پھر بھی آگے بڑھا جاتا ہے۔ ذکر سے نہیں

رکتا۔ اسی سے متعلق مجھے ''نفحات الانس'' کی ایک حکایت یاد آئی اور وہ وہم جاتا رہا اور میری تسلی خاطر ہوگئی۔ وہ حکایت یہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ۔علی بن موفق نے 74 حج کیے تھے۔ ایک بار حج کے دوران اپنے آپ سے از روئے تاسف فرمانے لگے۔ میں یہاں بار بار آتا ہوں مگر آج تک نہ میرا دل ہی دل بتانہ میرا وقت ہی وقت بتانہ مجھے یہ معلوم ہو سکا آیا میں کل آخرت میں سعیدوں میں شمار ہوں گا یا میں شقی ہوں۔'' اسی رات حق تعالیٰ کی خواب میں زیارت کی، کہہ رہے ہیں۔''اے موفق کے بیٹے کیا تو جسے پسند نہیں کرتا کبھی اسے اپنے گھر بلاتا ہے۔ اگر میں تجھے پسند نہ کرتا تو کیا تجھے یہاں بلاتا۔''

شیخ مرتضیٰ کی آخری بیماری میں مجھے سخت اضطراب نے گھیر لیا۔ ایسا نہ ہو کہ میں ان کی صحبت سے جدا ہو جاؤں۔ اس بارے میں میں نے کتاب ''نفحات الانس'' کھولی تو اتفاق دیکھئے یہ شعر سامنے آیا

اگر نالد کسے نالد کہ یارے در سفر دارد ۔۔۔ تو بارے از چہ می نالی کہ یارے در بغل دارد [1]

ان پر ایک دن اسی بیماری میں بے خودی طاری ہوگئی۔ حاضرین نے گمان کیا کہ رخصت ہوئے۔ ایک عزیز کہنے لگے۔ افسوس ایسے بزرگ بھی (بغیر کلمہ پڑھے) جا رہے ہیں۔ انھوں نے آنکھ کھولی اور اشارے سے کہا مجھے بیٹھاؤ، جب بیٹھ گئے کچھ دیر مراقب رہے پھر سر اُٹھایا اور ذکر جہر کرنے لگے اور چلے گئے۔ 16 ربیع الاول 1074ھ (1638) کی رات میں میرے شیخ فرماتے تھے کہ خواجہ بیرنگ نے بھی جاتے وقت ذکر جہر کیا تھا اسی سلسلے میں یہ بھی فرماتے تھے کہ جن حضرات نے ذکر جہر کیا ہے اس میں یہ نیت کرتے ہیں کہ ہم ہر سانس کو آخری سانس جانتے ہیں اور دنیا سے جاتے ہوئے آخری وقت میں ذکر جہر سنت ہے۔ دیکھو اس بات کی اولیاء حق کی نظر میں کیا قدر و منزلت ہے۔ کتاب ''رشحات'' میں ہے کہ مولانا سیف الدین نے جو کہ اس زمانے کے اکابر علما میں سے تھے حضرت عزیزان سے دریافت کیا کہ آپ ذکر جہر کس نیت سے کرتے ہیں فرمانے لگے کہ تمام علما کے اجماع سے آخری سانس میں آواز سے ذکر کرنا اور اس کی تلقین کرنا اس حدیث کے مطابق ''**لقنوا امواتکم بشہادت لا الہ الا اللہ**'' ''اپنے مرنے والوں کو ''لا الہ الا اللہ'' کی تلقین کرو'' سے

---

1 روبے تو وہ روے، جس کا محبوب چلا گیا ہو، لیکن تو کیوں روتا ہے تیرا محبوب تو تیری بغل میں ہے

جائز (وسنت) ہے اور درویشوں کے نزدیک ہر سانس آخری سانس ہے۔" میں نے شیخ مرتضیٰ کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ کہا

آن صاحب کمالِ خدا شیخ مرتضیٰ — از عالم فنا چو بدارالقرار رفت
صبر و قرار رفت بہم دل زعاشقان — ناگاہ ہم چو ماہ و شے از کنار رفت
از عالم فنای چو شبلی بحال خود — چون رفت چون جنید بعلم و وقار رفت
تاریخ فوت او چو طلب کردم از خرد — ہاتف ز غیب گفت آہ "نقیب دیار رفت"[1]

1074ھ

اُن کے بیٹے شیخ نجم الدین جو نوجوان ہیں اور حقیقتِ کار کی سمجھ انھیں حاصل ہے فرماتے ہیں کہ جب میرے والد صاحب کا وقت آخر ہوا شیخ بہاء الدین ابن شیخ محمود حاضر تھے کہنے لگے "شیخ من! اپنے بیٹے کو کس کے سپرد کرتے ہیں" پوچھا "میرے والد نے دنیا سے رخصتی کے وقت مجھے کس کے سپرد کیا تھا؟ کہا "اللہ تعالیٰ کے" کہنے لگے "تو میں بھی اس کو اللہ کے ہی سپرد کرتا ہوں۔" وہ ہی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے سرہانہ یہ تازہ غزل ان کے خط سے لکھی ہوئی پائی۔

نہ میل مُردن و نے شوق زیستن دارم — نہ ذوق خلعت و نے خواہشِ کفن دارم
نہ دل کشد بسوے باغ و بیشہ دصحرا — نہ حظِ عُزلت و نے عیش انجمن دارم
نہ حبّ صحبت مردم نہ حبّ تنہائی — نہ ی گزم زسخن نے سرِ سخن دارم[2]

---

1 جب وہ صاحب کمال خدا، شیخ مرتضیٰ عالم فنا سے عالم بقا کو سدھارے تو عاشقوں کے دلوں کے ساتھ ساتھ ان کا صبر و قرار بھی چلا گیا کیونکہ وہ چاند جیسے چہرے والا محبوب اچانک ان کی گود سے چھن گیا وہ عالم فنا سے ابوبکر شبلی اور جنید بغدادی کی طرح علم و وقار کے ساتھ رخصت ہوے۔ میں نے جب ان کی تاریخ وفات کی تلاش کی تو ہاتف غیب نے میرے دل میں غیب سے القا کیا کہ "نقیب دیار رفت" بزرگی رکھنے والا چلا گیا۔

2 نہ تو مجھے مرنے کی تمنا ہے نہ جینے کی خواہش۔ نہ مجھے خلعت کا شوق ہے نہ ہی کفن کی چاہت۔ نہ تو میرا دل باغ کی جانب کھنچ رہا ہے نہ صحرا کو چاہتا ہے۔ نہ خلوت گزینی پسند ہے نہ انجمن کے عیش کا دلدادہ ہوں۔ نہ تنہائی سے محبت نہ لوگوں سے صحبت کی خوشی۔ نہ بات کرنے سے مجھے تکلف نہ بولنے کا خیال ہی دل میں رکھتا ہوں۔

نہ عزم طاعت و نے قصد جرم و عصیانم ‏ ‏ چگو نہ عرض دہم حالتے کہ من دارم
ہزار شکر رضاے بہر طریق گناہست ‏ ‏ سر نیاز بدر گاہ ذوالمنن دارم [1]

حافظ جلال الدین

صاحب وجد و حال اور صاحب ذوق ہیں۔ شروع میں وہ عبدالشہید احراری کے مرید رہے ہیں اس کے بعد خواجہ بیرنگ کی صحبت اختیار کی ہے اور بہت تھوڑی مدت میں بہرہ مند اور فیض یاب ہو کر درجۂ کمال کو پہنچے۔ میرے شیخ کا فرمانا ہے کہ انھوں نے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں بہت دیکھا ہے (مزاج) آنخضرت سے نسبت تمام رکھتے تھے ان کے چہرے سے حقانیت کا نور جھلکتا تھا۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا کہ جس دن حافظ جلال الدین نے وفات پائی میں نے خواجہ ابرار کو فرماتے سنا کہ وہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے تصرفات کے بہت زیادہ مورد رہے ہیں۔ میں نے بہت سے مردان راہ سے بارہا سنا ہے کہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے وجود عنصری (جسم) کی حرکت سے جس طرح کے تصرفات اور کیفیات ظاہر ہوتے تھے ویسے پہلے زمانوں کے بزرگوں اور کاملوں سے بھی ظہور پذیر نہ ہوئے ہوں گے۔ جب بھی آپ جنبش فرماتے، وہ کیفیات جو دوسروں سے بڑی توجہ وتصرف سے ظاہر ہوتی ہیں محض بدن سے ہی واقع ہو جاتی تھیں جب بھی آپ کوچہ و بازار سے گزرتے تھے بچے کھیلنے سے رک جاتے تھے اور آپ کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے بعضے تو پیروں میں آگرتے تھے اور ست و بیخود ہو جاتے تھے۔ دکانداروں کی آنکھیں بھی آپ پر گڑ جاتی تھیں اور اپنے کاروبار کو بھول جاتے تھے۔ ایک بار ایک راجپوت نے آپ قدس سرہٗ کو کہیں جاتے دیکھا، کھڑا ہو گیا اور بولا ''خدا اسی شکل کا ہوگا'' ایک بار میں نے یہ رباعی کہی تھی

رباعی

اے خواجہ نقشبند و اے صاحب ما ‏ ‏ اے خواجۂ احرار شہِ ملک بقا

---

1 نہ اطاعت کا عزم ہے نہ ہی جرم وعصیاں کا ارادہ ہے۔ میں کیسے بتاؤں میری کیا حالت ہے؟ ہر راستہ پر بھٹکنا گناہ ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے راستے کی توفیق دی بس اسی ذوالمنن کی درگاہ میں اپنا سر جھکائے ہوئے ہوں۔

اے خواجۂ بیرنگ محمد باقی اے خواجہ خورد یک نظر بہر خدا

میں ابھی بلوغ کی شرعی حد کو نہ پہنچا تھا کہ مسجد فیروزی میں نماز جمعہ کے لیے حاضر تھا۔ خواجہ ابرار، شیخ الہداد اور بہت سے بزرگان (دین) اس جگہ موجود تھے۔ حافظ جلال الدین بڑی دلکش درد بھری آواز اور چشم گریاں کے ساتھ خطبۂ جمعہ پڑھ رہے تھے مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ آج 40 سال سے زائد ہو گئے مگر میرے دل سے وہ حال اب تک رخصت نہیں ہوا۔ حافظ صاحب کی وفات 1037ھ (1628) میں ہوئی ہے۔

میر سید احمد

آپ خواجہ بیرنگ کے محرمان خاص میں سے ہیں۔ بڑے بزرگ، عالی مشرب، عالی ظرف اور لطیف نسبت کے مالک تھے۔ ذوق شریف رکھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ خواجہ بیرنگ سید احمد کو بھیجتے کہ جاؤ مسجد میں جو احباب بیٹھے ہیں اُن کے احوال باطن کی خبر لاؤ۔ سید احمد جاتے اور ان کی کیفیات سے اطلاع بہم پہنچاتے تھے۔ اسی طرح آپ کو اکابر اولیا اور مشائخ کے مزارات پر بھیجتے اور اپنی مشکلات کا حل دریافت کراتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بجائے پسندیدہ جواب کے ایسا جواب لاتے تھے کہ جسے سن کر آزردہ خاطر ہو کر لوٹتے تھے۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے ظاہری اور باطنی تصرفات اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ بیان میں آسکیں۔ میرے شیخ کا ہی قول ہے کہ میری والدہ نے فرمایا کہ خواجہ بیرنگ اکثر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے تھے ایک بار آئینے میں میری صورت میں تصرف فرمایا کہ میری صورت ان کی صورت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ خواجہ بیرنگ میری والدہ صاحبہ پر نہایت الطاف وعنایات اور توجہات عالیہ فرماتے تھے۔ ایک رات کو دوسرے گھر میں رات گذار رہے تھے وہیں سے میری والدہ صاحبہ پر متوجہ تھے اس توجہ سے ان پر اعلیٰ احوال کا ظہور ہوا اور وہ تجلیِ خاص سے مشرف ہو گئیں۔ صبح آکر پوچھتے ہیں کہ رات کیا حال رہا۔ والدہ نے حقیقت حال عرض کی تو فرمایا۔ حق کا وصال یہی ہے۔ میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ سید احمد کی اس حقیر پر بہت عنایت تھی کئی بار سنا گیا کہ وہ میرے حق میں دعا فرماتے ہیں۔ جس روز اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں اس دن جو بھی ان کو دیکھ کر باہر آتا اس سے محبت الٰہی کی بو آتی تھی اور وہ خواجہ

بیرنگ کی نسبت شریفہ کا حامل بن کر نکلتا تھا۔ میرے شیخ ہی کا فرمان ہے کہ سید احمد نے فرمایا کہ خواجہ بیرنگ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جب ہم بہشت میں جائیں گے تو تجھے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ کہتے ہیں کہ خواجہ بیرنگ کے ایک مرید پر ایک ایسا حال طاری ہوا جو خواجہ صاحب کو اچھا نہ لگا۔ اس دن سید (احمد) حاضر خدمت تھے حضرت خواجہ بیرنگ نے کوئی چیز دیوار کے سوراخ میں رکھ دی فوراً ہی اس کا حال جاتا رہا۔ کسی خاص مصلحت سے اس کو اس تصرف کی اطلاع نہیں کی۔ وہ پریشان ہو گیا اور حقیقت حال کو سید سے کہا۔ سید نے تنہائی میں حضرت والد سے عرض کیا کہ بے چارہ برباد ہوتا ہے حضرت نے اس چیز کو سوارخ سے نکال لیا اور آپ مسکرا دیے۔ اس کا وہ حال پھر عود کر آیا اور بھی زیادتی کے ساتھ۔ ''رشحات'' میں ہے کہ میر عبدالاوّل حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کے اصحاب کبار میں سے تھے۔ اور آپ کے روحانی فرزند اور حقیقی داماد تھے۔ شروع میں وہ نیشاپور سے حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کی خدمت میں رہنے کی غرض سے ماوراء النہر آئے ہیں اور طریقہ رابطہ اختیار کیا ہے سات سال کی مدت تک اس نسبتِ شریفہ میں رسوخ کے لیے قیام فرمایا ہے اور اس کی شرائط کما حقہ بجالائے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب بھی حضرت والا کی نگاہ ان پر پڑتی وہ فوراً حاضر خدمت ہوتے مگر حضرت والا انھیں اپنی مجلس سے بھگا دیتے اور ان سے سخت باتیں کرتے۔ سات سال کے (امتحان) کے بعد انھیں فرزندی میں قبول کیا اور اپنی صبیہ شریف کو ان کے نکاح میں دے دیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ خواجہ بیرنگ لوگوں کو بیعت سے مشرف فرمانے کے بعد سید صاحب کے حوالے فرما دیتے۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی خلوتِ خاص میں بہت کم لوگ جا سکتے تھے مگر سید صاحب کی خوب آمد و رفت رہتی تھی۔ بہت مریدوں کی کارکشادان ہی سید صاحب کی سفارش کے طفیل ظہور پزیر ہوتی تھی۔ 1050ھ (1640) میں دنیا سے کوچ کیا۔ شروع میں میں نے سید کو اپنے شیخ کی مجلس میں دیکھا تھا انھوں نے میرے شیخ سے میرے بارے میں دریافت کیا تھا کہ یہ جوان کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ ایک نامراد صالح نوجوان ہے۔'' اسی وقت سے وہ مجھے بہت دوست رکھتے ہیں۔ وہ باتیں جو خواجہ بیرنگ کی خلوت خاص میں ہوتی تھیں انہیں مجھ سے بیان کیا کرتے۔ اِن سید احمد نے خواجہ بیرنگ کا ایک واقعہ مجھے سنایا کہ ایک رات خواجہ بیرنگ عشاء کی نماز کے بعد عالم استغراق میں آ کر مسجد کے دروازہ سے باہر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ سے کمر کو پکڑ رکھا تھا۔

اسی حال میں تھے کہ موذن نے صبح کی اذان کہی اور نمازی مسجد میں نماز کے لیے آنے لگے۔ افاقہ ہوا تو فرمایا رات مجھ پر ایک ساعت کی مانند گزر گئی۔

شیخ عبدالغفور سنبھلی

خواجہ بیرنگ کے خلفا میں سے ہیں۔ کمال استقامت، نسبت عالی اور استغراق تام سے متصف تھے۔ طریقت و معاملت کو جذبے کے ساتھ ملائے ہوئے تھے۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں ایک دن صفِ مسجد پر مراقب بیٹھا ہوا تھا اسی دوران واقعہ میں دیکھا کہ نقشبندیہ اور چشتیہ دونوں سلسلوں کے اکابر باہم جمع ہیں دیکھا کہ سارے نقشبندی اکابر ذات بحت کی جانب متوجہ ہیں اور اکابر چشتیہ میں خواجہ معین الدین سے خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی تک سبھی ذات بحت کی طرف متوجہ ہیں باقی (حضرات) صفات کی طرف توجہ رکھتے ہیں۔ میں خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے سامنے سے گزرا، خواجہ نے فرمایا۔ اے فلاں آ کہ میں تجھے ایک چیز دوں۔ اسی دوران خواجہ بیرنگ نے میرا ہاتھ پکڑا اور گویا ہوئے "یہ ہم میں سے ہے" خواجہ قطب الدین نے فرمایا۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر ہم سے بھی اُسے کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ اُسی وقت موذن نے تکبیر کہی اور میں اپنے ہوش میں آ گیا مگر یہ خیال دل میں رہا کہ وہ کون سی چیز تھی جسے خواجہ قطب الدین کرامت فرمانا چاہتے تھے۔ تین چار دن کے بعد میں نے خواجہ قطب الدین کو پھر خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ وہ کیا چیز تھی جو آپ عنایت کرنے والے تھے۔ "وہ سوز جو تیرے سینے میں ہے۔" وہ ہمیشہ کوہ جامد کی طرح گوشہ نشین تھے گویا کہ ایک ٹھاٹھیں مارتا مستقیم الحال دریا (سمندر) ہو۔ وہ ہمیشہ رسومات صوفیہ سے دامن کش رہے نہ ہی کبھی رسمی صوفیوں کے خوش کن دعاوی کے جال میں پھنسے۔ ان کا فرمانا ہے کہ "فوائد الفواد" میں ہے۔ "اس راہ محبت میں خودکاری ہی سے آگے بڑھا جا سکتا ہے نہ کہ نری تمناؤں اور دعاوی سے"۔ "نفحات الانس" میں ہے کہ ابو صالح حد ثانی[1] نے فرمایا ہے کہ میں بغرض زیارت ابوالخیر تیناتی کے گھر میں داخل ہوا تو انھوں نے مجھ سے سوال کیا۔ اب کہاں کے سفر سے لوٹے ہو؟ میں نے کہا کہ طرطوس سے پھر دریافت کیا "امسال کہاں کے سفر کا

1 آپ کا نام 'ہارون' ہے۔ از نفحات الانس

ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا "مکّے کی نیت ہے۔ فرمانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایک چیز عطا فرمائی مگر تم نے اس کی قدر نہ کی اور اس کو اچھی طرح نہ پہچانا۔ اسی (بے قدری) نے تمھیں آبادی اور ویرانوں میں سفروں سے پراگندہ کر دیا ہے۔ میں نے عرض کیا "اے شیخ کیا آپ حج و غزا کے سفروں کی بات کرتے ہیں؟ کہنے لگے۔ ہاں حج و غزا کو ہی کہہ رہا ہوں۔ کیوں اپنے وقت کو غنیمت نہیں سمجھتے اور سفر سے باز نہیں آتے۔" شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری قدس سرہٗ نے فرمایا ہے "ایک مرید حضرت ابوالقاسم مروزی کے پاس گیا اور ان سے سواری طلب کی کہ میں سفر میں جانے والا ہوں پیر نے پوچھا "کیوں جا رہے۔" بولا "اگر دریا کا پانی بہنا بند کر دے تو گندہ ہو جاتا ہے۔" پیر نے کہا "وہ جھیل کیوں نہیں بن جاتا کہ چلنا بھی نہ پڑے اور صاف شفاف بھی رہے۔" شیخ عبدالغفور سنبھلی کو شیخ مرتضیٰ سنبھلی سے کیا ہی محبت اور بھائی چارگی تھی۔ دونوں خواجہ بیرنگ کی قبر منور کی زیارت کی غرض سے عرس کے دنوں میں بارہا ساتھ ساتھ دہلی حاضر ہوئے ہیں۔ سنبھل جاتے تو جو معتقدین ان سے ملاقات کے لیے حاضر خدمت ہوتے، (وہ اپنے) گھر سے کوئی کھانے کی چیز لاتے اور ان کی دعوت کرتے۔ اگر کوئی ملاقاتی اس راہ کی باتیں اُن سے پوچھنے لگتا تو تجاہل عارفانہ کے ساتھ کسی دوسرے بزرگ کی طرف اشارہ کر دیا کرتے تھے کہ

"دانائے راز را زیبا بود تجاہل"[1]

میں (سید محمد کمال) ان سے بہت بار ملا ہوں اور وہ مجھے بہت دوست رکھتے تھے کبھی نہیں فرماتے تھے کہ اب چلے جاؤ۔ خلوت میں وہ مجھ سے راہ سلوک کی گفتگو اشاروں کنایوں کی زبان میں کیا کرتے تھے اور خواجہ بیرنگ کی حکایات بڑے لطف کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے کہ سن کر میرا بھی دل کھنچا جاتا تھا۔ اپنے حالات کی اطلاع اور اصلاح کی غرض سے میری ہمیشہ ان سے خط و کتابت رہی ہے جواب میں ان کے بہت سے خطوط میرے پاس ہیں جو اکثر خلوت گزینی اور عزیمت کی ترغیب میں لکھے گئے ہیں۔ ایک بار انھوں نے مجھے یہ جواب لکھا "سلامتی اکیلے رہنے میں ہے"

پشت بر دیوار کن خلوت نشیں   از وجود خویش ہم خلوت گزیں[2]

---

1 راز کو جاننے والے کے لیے لاعلمی کا اظہار زیبا ہے۔

2 دیوار سے پشت لگا کر خلوت میں بیٹھ جا بلکہ اپنے وجود سے بھی پردہ کر لے

اس راہ میں بڑی چیز استقامت ہے۔اللہ نصیب کرے۔کام میں لگے رہیں۔اللہ تعالیٰ سے بس اللہ تعالیٰ ہی کو مانگیں۔

نمی خواہد کمال از یار جز یار　بیا موزند درویشاں گدائی[1]

ایک بار لکھا کہ

فقر چہ (خوب) بگوید ہرکو عاقل است　زان کہ در خلوت صفاہا حاصلست[2]

خلوت چہ (خوب) بہ جلوتہائے خلق　سر نبرو ے آن کہ گیرد پاے خلق

ایک بار یہ لکھا کہ (ابتدائے سلوک میں) کسی کتاب کا مطالعہ حتیٰ کہ کلام اللہ شریف کی تلاوت بھی حصول فنا وحیرت میں کارآمد نہیں ہوتی اور مقصد مقصد سلوک مبتدی یہی ہے۔''رشحات'' میں ہے کہ مولانا محمد روحی فرماتے ہیں کہ ایک بار مولانا سعدالدین کاشغری میرے کمرے میں آئے۔طاق پر کلامِ پاک رکھا ہوا دیکھا تو دریافت فرمایا۔یہ کیا کتاب ہے؟ میں نے عرض کیا۔کلام اللہ شریف ہے۔فرمایا ابھی تلاوت بیکار ہے شروع میں مبتدی کو چاہیے کہ سلوک طریقہ نفی واثبات میں مشغول ہو۔تلاوت قرآن پاک متوسطین کا کام ہے۔پھر نماز ہے جس کی ادائیگی کما حقہ منتہی حضرات ہی کا کام ہے۔مبتدی کے لیے تو سب سے اہم کام شغل نفی واثبات ہے۔شیخ عبدالغفور کی وفات ماہ جمادی الاوّل 1059ھ (1649) میں ہوئی۔ان کی قبر ان کے گھر کے آگے ہے۔میں نے ان کی تاریخ وفات یہ کہی ہے

عبدغفور از دار جہان رفت　بزرگِ کامل و شیخ جہان رفت

بجانِ اہل شوق و عشق و عرفان　بسا افسوس و فریاد و فغان رفت[3]

1　بھیک مانگنے کا سلیقہ تو بس اولیاء اللہ ہی سکھاتے ہیں کمال دوست سے دوست کے سوا کچھ بھی نہیں چاہتا۔

2　فقر کیا ہی اچھی چیز ہے اسے وہی پسند کرتا ہے جو عقلمند ہے۔کیونکہ خلوت سے صفائی حاصل ہوتی ہے اور خلوت کیا ہی خوب ہے بمقابلہ جلوت کے کیونکہ جو شخص مخلوق کے پیروں پر پڑتا ہے اس کا سر سلامت نہیں رہتا یعنی بے عزت ہو جاتا ہے۔

3　حضرت عبدالغفور دنیا سے کیا گئے۔ایک بزرگ کامل اور شیخ جہان سے چلا گیا۔اہل شوق اور اہل عشق و عرفان الٰہی کی جانوں پر صد درجہ غم وافسوس، فریاد وفغاں طاری ہے۔

بیُمنِ ہمت بیرنگ خواجہ ہمہ عمرش چو عمر عارفان رفت
چو پر سیدم ز دل تاریخِ فوتش بگفتا" قطب سنبھل زین جہان رفت[1]"

1059ھ

اُن کے چلے جانے کے بعد ان کے جوان بیٹے عبدالواسع میرے ساتھ دہلی پہنچے اور میرے شیخ سے استفادۂ علوم دینی میں مشغول ہو گئے۔ نیک آدمی تھے، مدتوں وہاں رہے۔ میرے شیخ کا کہنا ہے کہ عبدالواسع خوب آدمی تھے، بڑے خوش فہم اور ظریف۔

ایک دن ایک نبض شناس کو جو کہ حذاقت میں بے نظیر تھا اپنی نبض دکھائی کہ میرا حال بتاؤ اس نے نبض دیکھ کر کہا '' جلد ہی شادی کر لو ورنہ تمھاری بینائی جاتی رہے گی'' انھوں نے اس کی بات کو مذاق سمجھا اور اس کے کہنے پر عمل نہ کیا۔ (کچھ عرصے بعد ان کی بینائی کم ہونے لگی) جب سنبھل آئے تو ان کی بینائی بالکل ہی جا چکی تھی۔ میری کبھی کبھی ان سے ملاقات رہتی۔

اُن کی صحبت میں کیا خوب وقت گزرتا تھا۔ بینائی جانے کے بعد بھی وہ بہت سالوں زندہ رہے۔

ایک دن میں اُن کے والد صاحب کی قبر کی زیارت کے لیے گیا۔ وہاں ایک جنازہ دیکھا۔ معلوم کیا کس کا جنازہ ہے؟ لوگوں نے کہا۔ عبدالواسع کا۔ میں نے بھی نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ انھیں ان کے والد محترم کی قبر کے پاس میں دفن کر دیا گیا۔ 1068ھ (1658) میں شیخ عبدالغفورؒ کے ایک بھائی جن کا نام شیخ رفیع الدین تھا۔

وہ ایک خوش منظر اور روشن لقا شخص تھے۔ جامع مسجد سنبھل کے خطیب تھے۔ خطبہ بڑی دل کش اور پُرسوز آواز میں پڑھتے تھے۔

---

1 خواجہ بیرنگ۔قدس سرہٗ کی ہمت توجہ اور دعا کے طفیل ان کی ساری زندگی عارفین کی طرح گزری ہے۔ جب میں نے اپنے دل سے ان کی تاریخ وفات دریافت کی تو وہ بولا "قطب سنبھل زیں جہاں رفت" قطب سنبھل اس دنیا سے چلا گیا۔

شیخ نعمت اللہ شیخی [1]

وہ شیخی کے لقب سے مشہور ہیں۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری قدس سرہٗ کی اولاد میں ہیں۔ تلاش حق میں بچپن میں ہی 1008ھ میں خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت سے پیوستہ ہو گئے اور طریق نقشبندیہ کا سلوک طے کیا۔ خواجہ بیرنگ کا ان کے حال پر بڑا لطف و کرم تھا۔ صفائی حال اور لطافت نسبت ان کی شخصیت سے عیاں تھی۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ایک دن خواجہ بیرنگ نے مجھے طلب فرمایا اور ایک کام کے لیے حکم دیا۔ اس وقت آپ پر حالت قبض طاری تھی ان کی اس کیفیت کا مجھ پر عکس پڑ گیا۔ جب میں باہر نکلا اور اس کام میں لگا تو مجھ پر اسی دوران ایک ایسی حالت غالب آئی کہ میں نے خود کو ہلاک کرنے کا قصد کر لیا اور لحظہ لحظہ یہ ارادہ قوی ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جہاں کوئی بلند جگہ دیکھتا میرے دل میں آتا کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دوں۔ ہلاکت کی مختلف صورتیں ذہن میں آتی تھیں مگر ہلاکت کی وجہ کچھ سمجھ میں نہ آتی۔ قریب تھا کہ اپنے کو مار ڈالوں مگر کافی دیر گزرنے کے بعد یہ خیال خود بخود ہی کم ہونا شروع ہوا یہاں تک کہ بالکل زائل ہو گیا۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ ان کا قول ہے کہ ایک دن خواجہ بیرنگ اپنے آخری ایام میں خواجہ قطب الدین کے آستانے پر تشریف لے گئے وہاں جا کر روح خواجہ قطب الدین کی جانب متوجہ ہوئے کہ معلوم کریں کہ اُن کی مٹی کہاں ہے۔ بہت سے مشائخ کی ارواح طیبہ حاضر تھیں۔ ان میں سے خواجہ مسعود بک [2] نے کہا آپ کی مٹی اس شہر کی نہیں ہے۔ اسی طرح بہت سے

---

1. حضرت شیخ عبداللہ انصاری ابن ابو منصور ہروی کی ولادت 2 رشعبان 396ھ/1006 میں ہوئی۔ سلسلۂ نسب مشہور صحابی، حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ اپنے وقت کے بڑے علماء اور صوفیہ میں سے تھے۔ اور صاحب طرز ادیب وشاعر بھی۔ عباسی خلیفہ مقتدی باللہ نے 1083 میں آپ کو "شیخ الاسلام" کے خطاب سے نوازا۔ 22رذی الحجہ 481ھ/1088 میں وفات پائی۔ "اسرار یہ کشف صوفیہ" اور "نفحات الانس" میں جہاں بھی "شیخ الاسلام" آیا ہے، وہاں آپ ہی مراد ہیں۔

2. شیر خاں مسعود بک سلطان فیروز شاہ کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ شیخ رکن الدین بن شہاب الدین امام کے مرید تھے۔ "مراۃ العارفین" و "تمہیدات" وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ غزلیات و قصائد کا ایک ضخیم دیوان بھی ان کی یادگار ہے۔ 8رجب 858ھ/1454 میں وفات پائی۔

شہروں اور مواضعات کا نام لیا کہ وہاں کی بھی نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا۔ بلکہ آپ کی خاک اس عالم کی ہی نہیں۔ خواجہ بیرنگ نے ان دوستوں سے جو اس جگہ اس وقت حاضر تھے دریافت کیا کہ اس معنوی کلام کی کیا تعبیر (تاویل) ہو سکتی ہے۔ اُن بزرگوں نے بہت سی صورتیں بتائیں مگر حضرت والا کو پسند نہ آئیں۔ اس کے بعد مجھ سے دریافت فرمایا۔ میں نے جواب دیا جو آپ کو اچھا لگا اور فرمایا تو نے اچھی بات کہی وہ یہ کہ بعض اکابر کے پاک جسموں پر ارواح کے احکام جاری فرمائے جاتے ہیں۔ (آپ بھی انھیں میں سے ہیں) اُن کی وفات 9 ربیع الاوّل 1065ھ/1655 کو ہوئی۔ میں نے ان کی تاریخ وصال کہی

صد آہ کہ شیخ نعمت اللہ برداشت رخت از زمانہ
معروف بہ شیخی ار چہ بودہ شیخی بدہ پیش اُو فسانہ
''شیخی نماند'' گفت ہاتف تاریخ وفاتِ آن یگانہ[1]

1065ھ

ان کی میرے (سید محمد کمال) حال پر بڑی مہربانی تھی۔ جب بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اپنے حالات (باطنی وظاہری) کی بڑی دل آویز باتیں بیان فرماتے۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی تاثیر نسبت کو جو کہ اکسیر کا حکم رکھتی ہے بڑے بہترین انداز میں بیان کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے اس زمانے میں جیسے کہ چیزیں سامنے دکھائی دیتی ہیں غلبۂ حال میں پیچھے سے بھی نظر آتی ہیں مجھے بھی دکھائی دیتی تھیں۔ پس وپیش واضح طور پر یکساں لگتا تھا۔ ان ہی کا قول ہے کہ دہلی میں ایک مجذوب تھے جو صاحب استغراق تھے ہمیشہ زمین پر پڑے رہتے تھے۔ جب بھی خواجہ بیرنگ اس کوچے سے گزرتے وہ فوراً اٹھتے اور آپؒ کے پیچھے چند قدم چلتے اور خوشی خوشی یوں کہتے ''یہ مجھ سے بڑے جا رہے ہیں۔''

---

1 صد افسوس کہ شیخ نعمت اللہ نے دنیا سے رخت سفر باندھ لیا۔ اگر چہ وہ شیخی کے لقب سے مشہور تھے مگر شیخی تو ان کے نزدیک ایک فسانہ محض تھی۔ ہاتف غیب نے کہا کہ اس یگانہ روزگار کی تاریخ وفات ''شیخی نماند'' کہ شیخی نہیں رہے۔

خواجہ محمد صادق

وہ میرے شیخ کے ماموں ہیں۔ عالم و فاضل تھے۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی اُن پر بہت توجہات اور عنایات تھیں۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ''خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے زمانہ حیات میں مجھ پر ایک حال طاری تھا جس کا بیان ممکن نہیں۔ چند ماہ تو ایسے گزرے کہ مجھے خود کی خبر نہ تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر رقت طاری ہوتی تھی۔'' حقیقت یہ ہے کہ یہ نسبت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی نسبت باطنی کا اثر معلوم ہوتی ہے۔ وہ حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ سے عقیدت اور نیاز مندی میں مستقیم الحال تھے۔ میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ جب ان پر اس نسبت کا غلبہ ہوا تو خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت بابرکت سے پیوستہ ہو گئے آخر کار ہمیشہ کے لیے خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی ہم سائگی میں جگہ حاصل کر لی۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ ان کے فضائل اور کمالات بے شمار ہیں۔ بڑی بڑی لطیف تالیفات ان کے قلم سے ظاہر ہوئی ہیں جیسے ''ناقد اسماء الرجال''، ''کلمات الصادقین'' وغیرہ۔ 1052ھ (1642) میں اوائل رمضان میں باہوش تمام ذکر کرتے ہوئے دنیا سے گئے۔ میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے ایک بار مولانا جامی ایک کوچے سے گزر رہے تھے۔ برہمند رنام کا ایک نوجوان جو بہت حسین و جمیل تھا، اوباشانہ طریقے پر بال بکھیرے ہوئے ایک دیوار پر چڑھا بیٹھا تھا۔ آپ نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔ اسے جوش پیدا ہوا مستی میں اس دیوار سے اتر کر ان کے سینے سے لپٹ گیا۔ آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے اور فرمایا ''الٰہی اس کی 120 سال عمر ہو، یہ ایک قلندر کا باپ ہے۔'' گھر والوں نے جب یہ ماجرا دیکھا آ کر اسے ہٹایا اور لے گئے پھر اسے کھینچے ہوئے آپ کی خدمت میں لائے اور پیروں میں ڈال دیا اور معذرت کی کہ اس بے ادب، از کار رفتہ کو معاف فرمائیں اور توجہ فرمائیں کہ آدمی بن جائے۔ آپ نہایت مسرور و خوش ہوئے دو غزلیں کہیں اور ایک بار اس کو پڑھوائیں۔ (ایک بار میں ہی) اس نے اچھی طرح پڑھیں اور یاد کر لیں۔ پھر وہ صاحب علم و دانش ہوا۔ جب اس کی عمر 115 یا 116 سال کی تھی تو دہلی آیا تھا۔ میں نے اس کو دیکھا ہے اور میں نے وہ دونوں غزلیں اس کی زبان سے سنی ہیں۔ اُن دونوں غزلوں میں کا ایک مصرعہ یہ ہے:

''طاقت مہمان نداشت خانہ بمہمان گذاشت''[1]

میں جب بھی اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوتا خواجہ محمد صادق مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے اور خواجہ بیرنگ کی عجیب وغریب حکایات سنا کر میرا دل خوش کرتے تھے۔ وہ اپنے رسالے ''حکایات الراشدین'' کے آخر میں جس کا نام ہی اس کی تاریخ (1032ھ) ہے لکھتے ہیں کہ : خداوند سبحانہ کا شکر کس زبان سے ادا ہوسکتا ہے (پھر) یہ رباعی اللہ تعالیٰ کے الطاف وکرم کے شکریہ کے طور پر لکھی ہے۔

رباعی

صدشکر کہ شد دین نبی آئینم و ز رب بوحنیفہ شد تلقینم
صد شکر کہ از راہ فنا و بقا در سلسلۂ خواجہ بہاء الدینم[2]

دانشور اور اہل علم حضرت کے نزدیک جیسے کہ دین محمدی تمام دینوں سے ممتاز ہے اور مسلک امام ابوحنیفہ تمام مذاہب سے امتیاز رکھتا ہے ویسے ہی سلسلۂ نقشبندیہ تمام سلاسل میں فوقیت رکھتا ہے کیونکہ ان بزرگوں کی نسبت دیگر تمام نسبتوں سے فائق ہے۔

دوسروں کی انتہا ان کی ابتدا میں مندرج ہے۔ ایک بار میں ان کی کتاب ''کلمات الصادقین'' کا مطالعہ کر رہا تھا، حضرت نورالدین محمد کا ذکر تھا اتفاقاً اسی دوران سید فیروز کے بیٹے کے نام رکھنے کی تقریب آ گئی مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے کہا نورالدین۔ پتہ چلا کہ اتفاقاً منجموں نے بھی یہی نام بتایا ہے۔ وہ فرزند مقبول بحکم الٰہی 14 سال کی عمر میں دنیا سے چلا گیا۔ خواجہ محمد صادقؒ کے ایک صاحبزادے خواجہ محمد صدیق ہیں جو میرے شیخ کے بڑے تلامذہ میں سے ہیں اور میرے شیخ کی صحبت میں (بغرض استفادۂ باطنی) رہتے ہیں۔ عالم وفاضل ہیں اور اس کام کے لائق ہیں۔ ہمیشہ جامع مسجد فیروزی میں علوم دینیہ یقینیہ کے درس میں مشغول رہتے ہیں اس حال میں کہ اپنے گوشۂ غربت، مسکینیت میں، گوشہ نشینی اور عزلت میں خوش رہتے ہیں۔

---

1 مہمان کی خدمت گزاری کی جب خود میں طاقت نہ دیکھی تو گھر مہمان کے لیے چھوڑ دیا۔

2 اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہوں اور مجھے مسلک ابوحنیفہ کی تلقین کی گئی ہے۔ صد شکر ہے کہ فنا و بقا کی راہ سے یعنی سلوک صوفیہ میں خواجہ بہاءالدین نقشبند کے سلسلہ میں ہوں۔

اسراریہ کی تکمیل کے بعد 1071ھ (1661) میں انتقال ہوا اور ان کی قبر خواجہ بیرنگ کے چبوترے سے متصل بنائی گئی۔

خواجہ محمد ملیح

وہ میرے شیخ کے بڑے بھائی خواجہ کلاں سلمہ کے ماموں ہیں۔ بزرگان نقشبندیہ میں سے ہیں۔ میرے شیخ کا بیان ہے کہ شاہی نوکری سے ترک تعلق کرنے کے بعد خواجہ بیرنگ کی صحبت اختیار کر لی تھی۔ صلاح وسلامتی کے طور طریق پر گامزن تھے۔ (مختلف) عبادات واوراد میں لگے رہتے تھے۔ میرے شیخ فرماتے تھے کہ میں نے ان کو آخری دنوں بیماری کی حالت میں دیکھا تھا۔ (رخ پر) بہت انوار نظر آتے تھے۔ ذکر میں مشغول تھے۔ دنیا سے 1040ھ (1630) میں رخصت ہوئے۔ میں بھی ان سے آشنا تھا۔ بہت ہی قیمتی باتیں کرتے تھے اور مجھ پر بڑا لطف وکرم فرماتے تھے۔

شیخ رفیع الدین

شیخ رفیع الدین بن شیخ قطب عالم بن شیخ عبدالعزیز چشتی قدس اللہ اسرارہم نے خواجہ بیرنگ کی صحبت میں رہ کر بڑی اعلیٰ نسبتوں کی تحصیل کی تھی۔ وسیع معرفت اور حال قوی ان کو نصیب ہوا تھا۔ علم ظاہری میں تو وہ اپنے والد کے شاگرد ہیں، مگر علم باطنی میں ان سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے رسائل تصوف کو خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ سے پڑھا تھا اور خوب استفادہ کیا تھا۔ میرے شیخ کا بیان ہے کہ وہ اقوال صوفیہ سے کلی مناسبت رکھتے ہیں۔ یہ بھی میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ میں نے مقدمہ ''شرح لمعات'' مولانا جامی کو ان سے سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔ ایک بار جبکہ میری جوانی کا دور تھا میں نے ان سے عرض کیا کہ مجھے علم تصوف کا شوق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ فلاں شیخ کی خدمت میں ان کے شہر حاضر ہوں کہ وہ اس علم میں کامل مہارت رکھتے ہیں، ان سے استفادہ کروں۔ انھوں نے فرمایا ''میں ان شیخ کو اچھی طرح جانتا ہوں، آگے تمھاری مرضی، تم خود بہتر سمجھتے ہو۔'' میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ وہ باوجود اس بات کے کہ ان کا کتنی پشتوں سے شیوخ، شیوخ زادوں اور سجادہ نشینوں میں شمار ہے۔ طریقہ نقشبندیہ پر بایں طور عمل پیرا ہیں کہ گمان بھی نہیں

ہوتا کہ وہ کوئی اور سلسلہ بھی رکھتے ہیں۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا کہ وہ اس فقیر پر بہت مہربان ہیں اور بہت سی بشارتیں ان کی زبان مبارک سے میرے بارے میں ایسی نکلی ہیں جن کے اظہار کی (بوجہ غیرت) مجھے قدرت نہیں۔ بس حق سبحانہ خواجہ بیرنگ کے صدقے میں اور ان کے اصحاب کے طفیل اس گرفتار بلا کو اس کی مراد دلی تک پہنچائے۔ آمین

میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ ابتدائی زمانہ میں خواجہ بیرنگ سنبھل تشریف لائے تھے۔ راستے میں جب ان کی ملاقات گڑھ مکتیسر میں شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری سے ہوئی تو چاہا کہ ان سے بیعت ہو جائیں۔ اس دوران مجلس میں سے ایک صاحب بولے کہ فلاں نماز نہیں پڑھتا۔ شیخ نے فرمایا ''نماز پڑھنا تو عورتوں اور بوڑھوں کا کام ہے۔'' بس اتنی بات سن کر بیعت سے رُک گئے۔ یہ واقعہ سنا کر میرے شیخ خواجہ خرد نے فرمایا کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ چاہتے تھے کہ سید محمد قاسم جلال تبریزی سے بیعت کریں دیکھا کہ ان کے اقربا میں سے بہت سے درویش ان کے طریقہ (شرع) کے خلاف بے تحاشہ نامشروع کاموں کا ارتکاب کررہے ہیں۔ جیسا کہ کتاب ''رشحات'' میں ہے کہ خواجہ احرار نے فرمایا کہ سید قاسم فرماتے ہیں کہ مجھ سے شیخ زادہ ترکستانی نے ایک بار فرمایا آج جیسے میرے اپنے میرا کا قباب (پردہ) بن گئے ہیں، ایک دن وہ ہوگا جب تیری اولاد تیرا قباب (پردہ) بن جائے گی۔ آخر کار خواجہ احرار نے ''اِتقوا مواضع التهم'' (تہمت کے موقعوں سے بچو) کو خیال کرکے وہ بیعت موقوف کردی۔ شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری کے جذبے کی خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ نے بہت تعریف فرمائی ہے اور بہت سراہا ہے کہ شیخ جیسا میں نے ہندوستان میں کوئی نہیں دیکھا ہے۔ گڑھ مکتیسر سے سنبھل آکر اہل سنبھل کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا جس کا مختصر تذکرہ انشاءاللہ سید محمد سرسوی کے ذکر میں آئے گا۔ میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ دوسری مرتبہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ شیخ رفیع الدین کی شادی (نکاح) کی تقریب میں اعظم پور (باشہ) سنبھل پہنچے ہیں وہاں ایک شیخ تھے جو عالم تھے، انھوں نے آپ کی آمد کی خبر سن کر اپنے تلامذہ سے کہا کہ اس وقت اس شہر میں فصوصیوں کی ایک جماعت آئی ہوئی ہے ہرگز ان کے پاس نہ پھٹکنا جب یہ بات خواجہ بیرنگ کو معلوم ہوئی تو ہنس پڑے۔ کبھی کبھی شیخ رفیع الدین سے بطور مزاح فرمایا کرتے تھے کہ فلانے وہ مُلّا کیا کہتے تھے کہ فصوصیوں کی جماعت آئی ہوئی ہے۔ اُن

کے پاس مت جائیو۔" شیخ رفیع الدین جواب دیتے" جی حضرت۔ یہ سن کر آپ پر کیفیت انبساط طاری ہو جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ پچھلے زمانے میں اعظم پور (باسٹہ)[1] میں شیخ عبدالغفور نام کے ایک عالم باعمل گزرے ہیں ان کا انتقال 985ھ (1577) میں ہوا ہے۔ وہ شیخ عبدالعزیز چشتی (دہلوی) کے معاصر ہیں۔

شیخ عبدالغفور و اصل حق آنکہ بودہ است قبلۂ آمال
مرغ روحش خورد نسیم وصال کامِ دل یافت گشت فارغ بال
ذاکرے سال فوتِ وصلش گفت کہ شدہ محرم حریم وصال[2]

982ھ

شیخ عبدالعزیز چشتی دہلویؒ کا رسالہ "عینیہ" اور توحید و جودی کی حمایت میں ان کے

---

1 اعظم پور باسٹہ ضلع بجنور میں ایک مشہور قصبہ ہے جہاں اکبر بادشاہ کے زمانہ میں شیخ ابوالمناف کی ریاست تھی۔ شیخ ابوالمناف جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے دربار میں منصب دار تھے اور اعظم پور میں ان کی ریاست تھی بعد میں وہ امروہہ تشریف لائے اور محلہ گھیر مناف آباد کیا آج بھی یہ محلہ انھیں کے نام سے گھیر مناف کہلاتا ہے۔ آپ نے 1046ھ/1632 میں وفات پائی اور احاطۂ شاہ گھاسی میں آپ کا مزار مبارک ہے آپ شیخ عبدالمجید علوی کے مرید وخلیفہ تھے۔ آپ کے برادرزادے نورالدین ملا نوری نے آپ کی وفات پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ لکھا۔

ابوالمناف امیر و نصیر دولت و دین ز شاہِ وقت بدریافت منصب بالا
بزرگوار جہان بود عم مخدوم بخیر رفت ز دنیا بہ رتبہ والا
نوشت بندۂ نوری برگِ او زیبا ابوالمناف در آمد بجنت اعلیٰ

20

1046=1026+20ھ

راقم الحروف یعنی مصباح احمد صدیقی ان ہی کی اولاد میں ہے۔ آپ کی اولاد امروہہ، دہلی، بریلی، سہارنپور اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں آباد ہے۔

2 شیخ عبدالغفور واصل حق، جو کہ امیدوں کی آماجگاہ تھے ان کی روح کا پرندہ وصال کی خوشگوار ہوائیں کھا رہا ہے۔ وہ اپنی مراد دلی کو پہنچ گئے ہیں اور ہر فکر سے فارغ البال ہیں۔ ایک ذاکر نے ان کا سال وفات "شدہ محرم حریم وصال" کہا ہے۔

دوسرے اقوال اُن تک پہنچے۔ انھوں نے وہ رسالہ (عینیہ) پڑھا جب یہ جملے اُن کی نظر سے گزرے۔ ''اے دلبند ارجمند اس مقام پر پہنچ کر بے خوف ہو جا.........اندھوں کی طرح راہ میں نہ رہ جانا۔ ہم نے اِسے اچھی طرح جان لیا ہے اور خوب اس کی تحقیق کر لی ہے۔ انتہیٰ کلامہٗ۔ یہ پڑھ کر انھوں نے شیخ عبدالعزیزؒ کو خط لکھا اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ رسالہ ''عینیہ'' کے جواب میں ایک رسالہ بنام ''غیریہ'' لکھا تھا مگر یہ خبر صحت کو نہیں پہنچی (واللہ اعلم) مگر وہ خط یہ ہے ''حضرت رحیم وکریم آن جناب قدوۃ الطریقت کو اپنے حریم خاص ذات وصفات کے اعلیٰ مقامات پر ہر روز ترقی بخشے اور عبور عطا فرمائے۔ بے تصور اسما وصفات کے مشاہدات کی منازل پر حضوری عنایت کرے۔ اہل تصوف کے مقدمات کی ترتیب کے بیان میں آپ کا سرفراز نامہ ملا۔ ضعف وکمزوری کے باعث پورا نہ دیکھ سکا۔ اے جانِ جاناں، خداوند عزیز وحکیم ہمارے حقائق مکنونہ سے خوب واقف ہے۔ جنھوں نے ''انا الحق (کہا) ما قدروا اللہ حق قدرہٖ ''(انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسی قدر نہ جانی جیسی کہ اس کا حق ہے) اللہ تعالیٰ کو تو ہمارے اعیان ثابتہ کی حقیقت ازلی کا علم ہے اسی لیے اس نے ہماری کم مائگی کو واضح فرما دیا کہ (اللہ اللہ ہے، بندہ بندہ ہے، گو وہ کیسا ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو) (غالبًا) یہی وجہ ہے کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اظہار بندگی کا امر فرمایا۔ ''قل انما انا بشرٌ مثلکم یوحیٰ الیَّ ''[1] یعنی ہمارے وجود کی حقیقت کو اپنے گمان سے ہرگز اپنے جیسا وجود نہ سمجھ لینا اور اس قارورات کے توبرے (یعنی وجود انسانی) کو منابر قدس کے برابر مت رکھیو (ہمہ اوست مت کہیو) ''وکل الناس فی ذات اللہ جاھل ''[2] جمیع خلق۔ ہر ایک اپنی عقل معزول کی عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے بزبانِ حال کہتا ہے۔

سبحان خالقے کہ صفاتش زکبریا	بر خاکِ عجز می فگند عقل انبیا
گر صد ہزار قرن ہمہ خلق کائنات	فکرت کنند در صفت عزتِ خدا
آخر بعجز معرفت آیند کای الہ	دانستہ شد کہ ہیچ ندانستہ ایم ما[3]

1 میں بھی تمھاری طرح انسان ہوں۔ (فرق یہ ہے کہ) مجھ پر وحی آتی ہے۔

2 ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی ذات کی حقیقت سے بے خبر ہے۔

3 ہمارا خالق سبحانہٗ جس کی صفتِ کبریائی کے سامنے انبیا کی عقلیں بھی عاجزی کی خاک پر سجدہ ریز ہیں۔ صد ہزار قرن تک بھی کائنات کی تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفت کبریائی میں فکر کرے آخر کار عاجز ہو کر یہی کہے گی کہ اے اللہ ہم خوب جان گئے کہ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔

اے جانِ محققین! اے روحِ مشتاقاں! (شیخ عبدالعزیز چشتی) جب ہم غریب العقل اس نعمت کبریٰ اور سعادت عظمیٰ کی دریافت سے عاجز ہو گئے اور "لا یعلم الا ھو" کے دریائے حیرت میں ڈوب گئے تو "فان لم یجدھا وابلٌ فطلٌ" کے بموجب اُس حضرت قدس کے جویاں ہوئے بس یہی بہتر ہے کہ ہم قرآن اور اس رحیم رسول کی احادیث کے حکم ظاہر پر اپنا دست بیعت بڑھائیں اور "اتقوا اللہ، اور یحذرکم اللہ نفسہٗ" کے دامانِ عقیدت کو تھامے رہیں اور بارگاہ "الفقر فخری" کا دم بھرتے رہیں۔ قدوۂ محققان حضرت ذوالنون مصریؒ کے قول "یا بنیّ اذا صح حالک مع اللہ لا یشغلک عنہ شاغل ولا یشتغل بما یقول الخلق عنک ولن یغنوا عنک من اللہ شیئاً و اذا صح حالک مع اللہ ارشدک الطریقۃ الیہ و وفقک بسنۃ النبی علیہ السلام و ظاھرک العلم و ایّاک ان تداعی فیما لیس لک من العلم ھلک عامۃ المریدین لا دعائی الباطنیۃ"[1]

یقین کر کہ صحیح تعلق "مع اللہ" کی علامت "فرو رفتن درو ے براہ ذکر است" (ذکر کی راہ سے اس میں ڈوب جانا ہے) اور اس کا طریق اس راہ کے سالکین کو معلوم ہے۔ "فرو رفتن درو ے براہ ذکر" یہ ہے کہ گرمیٔ ذکر، ذاکر کے قلب کی گہرائی میں پہنچ جائے اور اس نے جو دیکھا، جو سنا ہے یا وہ جو کچھ جانتا ہے یا اس کے خیال میں آتا ہے اور وہ سب کچھ جس کی اسے تحقیق ہوئی ہے سب کو یکسر پھونک ڈالے۔ اس کا احساس نایافت اور حیرت بڑھتی ہی چلی جائے۔ وہ اپنے اور تمام مخلوق کے علم کو "حیّ قیوم" کے علوم کے دریا میں غرق کر دے۔ "ان فنافی اللہ اور باقی باللہ" لوگوں کی زبان پر کبھی غلبات شوق اور شدت محبت میں اگر "اناالحق" اور سبحانی ما اعظم شانی آ بھی جاتا ہے تو وہ یاد آتے ہی اس کی معذرت بھی کرتے ہیں۔ اور اقرار کرتے ہیں کہ "حق، حق ہے، بندہ بندہ ہے۔" اگرچہ اس معذرت کے بعد ان کی گرفت تو نہیں مگر زبان پر ایسے کلمات لانا بے شک خطا اور

---

1 اے لڑکے! جب تیرا تعلق مع اللہ درست ہو جائے گا تو کوئی بھی شغل تجھ کو اس سے غافل نہ کر پائے گا پھر نہ تجھے اس کی پرواہ ہوگی کہ خلق خدا تجھے کیا کہتی ہے۔ مخلوق اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تیرے کچھ بھی کام نہیں آ سکتی۔ اور جب تیرا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سے صحیح ہو جائے گا تو وہ تجھے خود تک وصول کے راستے کی ہدایت کرے گا اور تجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی توفیق دیگا اور علم باطن) تجھ پر ظاہر کر دے گا۔ اپنے آپ کو اس چیز کے دعوے سے بچا جس کی تجھے معلومات نہیں۔ اکثر مریدوں کی ہلاکت باطنی علوم کے دعوؤں سے ہی ہوئی ہے۔

گستاخی ہے مگر اس لیے معاف ہے کہ نیستی کے غلبے سے ہے نہ کہ بغرض دعویٰ۔ (اسی لیے ایک بار) صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا "ما الایمان یا رسول اللہ منی"[1] "الارادت ترک الارادہ" یہ حال ہر مرید صادق کو پیش آتا ہے۔ "فمن کان یر جوا لقاء ربہ فلیعمل علماً صالحاً ولا یشرک بعبادت ربہ احدا"[2] کی تحقیق اس منزل فنا فی اللہ پر پہنچے بغیر میسر نہیں ہوتی اور "قل جاء الحق و زھق الباطل"[3] کے مشاہدے کا نور یعنی شریعت نقیہ زکیہ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین، مریدین، معتقدین اور مخلصین کے باطن پر بعد فنا ہی نور افگن ہوتا ہے۔ توحید کی الفت اور تجرید کی محبت بھی تب ہی حاصل ہوتی ہے۔ خدائے رب العزت کی قسم، بندے کو اس چیز کی شرح سے جو شریعت میں بطور اختصار اور بھید کے واقع ہوئی ہے بڑی شرم آتی ہے کہ اس قسم کے اسرار اور مخفیات کو برسر عام ظاہر کرے۔ بموجب حکم رابطہ اخلاص اور ضابطہ اختصاص رحمت رحمت اللعالمین بندہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کو بسبب ان کے قول "من رانی فی المنام فقد رای الحق" وحشت وغربت میں اپنا دستگیر پاتا ہے۔ "اللھم صلی علی محمد بعددِ اسماء الحسنیٰ" دیگر یہ کہ آن روح مشتاقان نے رسالہ "عینیہ" میں لکھا ہے کہ "اے ارجمند دلبند این جا دلاور شو، و در دل خود فرو رو۔ و بے وحشت و بے خوف "انا الحق" بگو وسر و پا در وحدت انداز و بمقصو درس و وہم چو کوران در راہ نمانی"[4] (اس کا جواب (یہ ہے کہ چونکہ میں بہت پہلے سے اس خاندان عظام یعنی صوفیا اولیا سلسلہ چشتیہ کا معتقد ہوں مگر مجھے آپ کے یہ جملے اچھے نہیں لگے کہ جس چیز کو حق تعالیٰ نے پوشیدہ رکھا اس کی

---

1 یا رسول اللہ! میرا ایمان بھی میرے بس کی بات نہیں اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے قائم ہے۔" ارادت ترک ارادہ کا نام ہے۔

2 جسے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تمنا ہے اسے چاہیے کہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

3 آپ کہہ دیں حق آ گیا اور باطل چلا گیا۔

4 اے فرزند! بلند اقبال مقام توحید پر پہنچ کر بہادر بن جا، اپنے دل میں اُتر جا اور بے خوف وخطر "انا الحق" کہہ۔ سراپا وحدت میں ڈوب جا، مقصد پالے۔ اندھوں کی طرح راستے میں نہ رہ جا۔

صراحت وتوضیح کرنا ٹھیک نہیں۔ خاص کر ایسے زمانے میں جبکہ ہم قرن قرب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دور آپڑے ہیں اور ہزاروں فتنوں اور بدعتوں میں گھر چکے ہیں۔ آپ کے ان چند بے شرائط و قیود جملوں کا نافہم لوگ غلط مطلب اخذ کریں گے اور خود کو گمراہ کر کے برباد ہو جائیں گے۔ عنقریب اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو اس سلسلے میں محققین کی شرائط کے ساتھ جو تحقیقات ہیں وہ تحریر کروں گا۔ اس وقت خود میں اس سے زیادہ لکھنے کی طاقت و ہمت نہیں پاتا۔ اس لیے اب اس ذکر کے دفتر نہیں کھولتا جو کب کے بند ہو چکے۔" والسلام علی من اتبع الھدیٰ"

میرے شیخ کو شیخ رفیع الدین سے خاص محبت تھی اور اکثر اچھی ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دن میرے شیخ نے ان سے دریافت کیا کہ شیخا! آپ نے خواجہ بیرنگ کے بڑے بڑے اصحاب کو خوب دیکھا ہے۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی نسبت کیا آپ کے کسی مسترشد میں ہو بہو واقع ہوئی ہے؟ انھوں نے فرمایا۔ میں نے آپ کے سبھی اصحاب کو دیکھا ہے۔ بڑے بڑے مشائخ اور اولیا نامدار کو دیکھا ہے اور ان کی صحبت بھی اٹھائی ہے۔ لیکن وہ نسبت (خاص) جو آپ رکھتے تھے (بعینہ) ان میں سے کسی ایک میں بھی نہیں پائی۔ ہاں اس نسبت کو آج میں تم میں پاتا ہوں۔ ایک دن، میں اور میرے شیخ ان کے پاس تشریف رکھتے تھے اور وہ مراقب تھے۔ جب مراقبے سے سر اٹھایا تو فرمایا۔ جو نسبت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت میں حاصل ہوتی تھی الحمدللہ فی الحال تمھاری صحبت میں متحقق ہے۔ میں بارہا اپنے شیخ کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ عجیب و غریب صحبت آپس میں گزرتی تھی۔ شیخ رفیع الدینؒ میرے والد صاحب کے شیخ ہیں۔ میرے والد نے ذکر باطن کا پہلا سبق ان ہی سے لیا ہے اور جمعیت حضور و آگاہی تک پہنچے ہیں۔ میرے والد فرماتے تھے کہ میں نے ان کے والد صاحب کی بھی صحبت اُٹھائی ہے اور بہت سے مشائخ کو دیکھا ہے مگر جو چیز چاہیے تھی ان ہی سے ملی۔" کبھی میں اور میرے والد ان کی خدمت میں یکجا حاضر ہوتے تھے اور ان کی بے پایاں عنایات اور مہربانیاں پاتے تھے۔ ان کی وفات بقرعید کے دن 1029ھ (1620) کو ہوئی اور ان کی نعش کو برہان پور سے دہلی لایا گیا اس وقت ان کے چند بھائی اور بیٹے جو یگانۂ اخلاق اور وقت کے نیک لوگوں میں سے ہیں (دہلی میں سکونت رکھتے ہیں) ان میں سے شیخ علاء الدین جو ان کے بھائی ہیں

بڑے عالی اخلاق اور صفات حسنہ سے متصف ہیں۔ میرے شیخ کے مخلص اور محسنین میں سے رہے ہیں۔ ایک رات کو میرے شیخ، شیخ عبدالعزیز چشتیؒ کے عرس میں مجھے لے کر پہنچے۔ مطربان نے امیر خسرو کا دوہا شروع کیا۔ شیخ علاء الدین اسے سن کر گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ بہت دیر تک اسی حال میں رہے لوگ سمجھے دنیا سے چلے گئے۔ ابھی چند سال ہوئے ہیں کہ بحکم تقدیر الٰہی وہ بنگال چلے گئے ہیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی ہے۔ مجھ پر ان کا بڑا لطف و کرم تھا۔ شیخ رفیع الدین کے صاحبزادے شیخ عبدالحیؒ اقوال صوفیہ سے آشنا تھے۔ میں نے اور انھوں نے عمر عزیز کا کافی وقت ساتھ گزارا ہے۔ ان کی وفات 1060ھ (1650) میں ہوئی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ لطف اللہ جو غریب و نادار بزرگ تھے انھوں نے بہت سے سفر آزادانہ کیے ہیں۔ میرے شیخ کے مخلص اور نیازمندوں میں سے تھے۔ جواں سالگی میں 1050ھ/1640 میں وفات پائی۔

شیخ محمد زاہد

وہ ہروی الاصل ہیں۔ ان کے والد محمد صالح نے ہندوستان آ کر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ بڑے صاحب اخلاق گزرے ہیں۔ مشہور ہے کہ سب سے پہلے شیخ محمد زاہد ہی خواجہ بیرنگ کی صحبت میں پہنچے تھے۔ آپ ان پر بے حد عنایتیں اور لطف فرماتے تھے۔ (اسی لیے) بہت تھوڑے وقت میں مواہب عالیہ سے بہرہ مند ہو گئے تھے۔ صاحب ذوق و حال و استقامت تھے۔ طریقت و معاملت میں پختہ تھے۔ ہمت عالی رکھتے تھے۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ ان کا قول ہے کہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی روحانیت سے بھی لطف ہائے عظیم ظاہر ہوئے۔ اور جو جو حالات و کیفیات انھیں پیش آئیں وہ بھی ذکر فرمائیں۔ میرے شیخ کا ہی قول ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ خواجہ بیرنگ فرمایا کرتے تھے کہ جو فنائے ذاتی سے مشرف ہوا پاک و پاکیزہ ہو گیا۔ اس سے کوئی گناہ اور کوئی تقصیر ہرگز ظاہر نہیں ہوتی۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ بزرگوں کے آثار اور ان کی سی برکات ان میں بہت تھیں۔ طبع موزوں پائی تھی۔ نسبت کی حقیقت سے آگاہ تھے۔ ان کے بہت سے اشعار خواجہ بیرنگ کو بہت پسند تھے۔ ان کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی ہے۔ جب بھی میں ان کو دیکھتا ادب و نیازمندی سے پیش آتا تھا کہ ان کی نسبت بڑی قیمتی تھی۔ ان کی صحبت میں مجھے جمعیت حاصل ہوتی تھی اور مجھے

''رشحات'' کی حکایت یاد آتی تھی کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ بعضے اکابر رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا ہے بعد نمازِ عصر جو ساعت ہوتی ہے۔ اعمال کے محاسبہ کا بہترین وقت ہے۔ محاسبہ یہ ہے کہ رات اور دن کے کاموں کا حساب لگائے کہ کتنا وقت طاعت میں صرف ہوا اور کتنا معصیت میں۔ جو طاعت میں گزرا اس پر شکر بجالاے اور جو معصیت میں گزرا اس پر استغفار کرے۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ بہترین عمل یہ ہے کہ خود کو کسی اہل اللہ کی صحبت میں پہنچائے تاکہ دنیا کی حقیقت، حق و ناحق اس پر کھل جائے اور حق سبحانہ کی معیت حاصل ہو جائے۔ اہل تحقیق نے کہا ہے کہ بہترین عمل یہ ہے کہ زیادہ وقت اللہ کی یاد میں گزارے اور جو وقت یاد الٰہی کے بغیر گزرے اس پر رنج و افسوس کرے اور اللہ کی طرف مائل ہو۔

شیخ جعفر محمد

آپ خواجہ بیرنگ قدس سرہ کے صحبت یافتہ، ان کے مقبول نظر اور خواص میں سے تھے۔ اُن کی اعلیٰ (توجہات) اور الطاف کے لائق تھے۔ طریق سلوک میں بہت پختہ تھے۔ آپ شیخ یوسف قتال کی اولاد میں ہیں۔ وہ ایک صاحب آیات و مقامات بزرگ ہوئے ہیں۔ جن کا انتقال 29/ذی قعدہ 933ھ (1527) میں کو ہوا ہے۔ اور شیخ ہاشم ان کے ماموں بھی شیخ یوسف قتال کی ہی نسل میں سے ہیں وہ بھی صاحب طریقت بزرگ تھے۔ بڑے صاحب اعمال و احوال صافیہ۔ میں نے شروع میں اُن کو اپنے شیخ کے ہمراہ ایک مرتبہ دیکھا ہے اور ان کے الطاف اور عنایات خود پر محسوس کی ہیں۔ ان کا سال وفات 1051ھ (1641) ہے۔ میرے شیخ کا ان کی نسبت فرمانا ہے کہ وہ بہت بابرکت بزرگ تھے۔ نیکی اور پاکی کے آثار ان کی وضع سے ظاہر ہوتے تھے۔ دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کش رہتے تھے۔ میرے شیخ ہی نے کہا ہے کہ شیخ جعفر نے فرمایا کہ ایک دن خواجہ بیرنگ نے مجھ سے فرمایا کہ میں اپنے ماموں سے پوچھوں کہ آج صبح کے وقت کیا پیش آیا تھا۔ جب میں نے اپنے ماموں سے دریافت کیا تو فرمایا۔ ایک عجیب حال حاصل ہوا ہے کہ ویسا پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا۔ اس عنایت خاص پر میں بہت رویا اور خوش بھی ہوا کیونکہ اس وقت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ نے اپنے اس مقام سے جہاں وہ فائز تھے مجھ پر خاص توجہ فرمائی تھی۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا کہ

خواجہ بیرنگ نے اپنی حیات دنیوی کے زمانے میں بعض طالبان الٰہی کی تلقین ذکر کا کام شیخ جعفر کے سپرد فرما دیا تھا اور ان کی توجہ ان حضرات میں کامل طور پر سرایت کرتی تھی۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ کی وفات کے بعد جب شیخ جعفر نے بعض طالبین کو توجہ دی تو دولت فقر انھیں نصیب ہوئی۔ کیا خوب مشرب رکھتے تھے۔ ان کی ذات سے نیک صفات کا اظہار ہوتا تھا ان کی وفات 1050ھ (1641) میں ہوئی۔ میں ان سے خوب آشنا تھا جب بھی ملاقات کا اتفاق ہوتا وہ بہت ہی پر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے شیخ خواجہ خرد سے اپنی صحبت کی بے تکلفانہ باتیں مجھے سنایا کرتے تھے جس سے میں خوب محظوظ ہوتا تھا۔ روایت ہے کہ ایک دن اُن پر حال و وجد طاری تھا۔ جب لوگوں نے کہا کہ آپ کا تعلق تو سلسلہ نقشبندیہ سے ہے اور اس طریقے میں سماع نہیں ہے۔ آپ کو پھر یہ کیسے پہنچا۔ انھوں نے از راہِ لطف کہا ''میری شادی خاندان چشتیہ میں ہوئی ہے مجھے یہ سماع وہاں سے ملا ہے۔''

شیخ محمد ہاشم سنبھلی

وہ خواجہ بیرنگ کے منسلکین اور ہم صحبت لوگوں میں ہیں۔ (نیکی) کے آثار و برکات ان سے ظاہر تھے۔ بڑے (عالی ظرف) صاحب مروت و اخلاق تھے۔ ان کی غربت، انکساری اور خاکساری ان کے اخلاق (ظاہری) سے بھی بلند تھی۔ میرے شیخ کی روایت ہے کہ وہ بچپن میں ہی خواجہ بیرنگ کی صحبت میں پہنچ گئے تھے۔ خواجہ صاحب کی نسبت نے آپ کے اندر اثر کیا اور آپ صاحب ذوق اور عظیم احوال کے حامل بن گئے۔ خواجہ بیرنگ کے بعد آخری عمر تک خواجہ ابرار سے پیوستہ رہے۔ کیا ہی خوب نسبت رکھتے تھے۔ میرے شیخ ہی کی روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے خواجہ بیرنگ کو برہان پور میں خواب میں دیکھا کہ آپ ایک شیر کی شکل میں ہیں اور مجھے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں میں بھی بے اختیار کھنچا چلا جا رہا ہوں۔ میرے شیخ ہی سے مروی ہے کہ میں نے ایک بار خواجہ بیرنگ کو بصورت فیل دیکھا، شیخ کے اصحاب کبار بھی ہمراہ ہیں۔ میرے شیخ ہی کی روایت ہے کہ شیخ عبدالحق نے فرمایا ہے کہ خواجہ بیرنگ نے حضرت غوث اعظم کو فیل سفید کی شکل

میں خواب میں دیکھا تھا۔ میرے شیخ ہی کا قول ہے کہ شیخ محمد ہاشم سے روایت ہے کہ ایک دن خواجہ بیرنگ جامع مسجد فیروزی میں مراقب تھے۔ اسی دوران فرمانے لگے کہ تحقیق کرو یہاں کہیں سے بدبو آ رہی ہے شاید کسی نے عمل دعوت پڑھا ہے جب میں نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ مسجد کے تہہ خانے میں ایک مسافر درویش نے دو ایک دن گزارے تھے، جو حضرت کے مریدین میں سے کسی کے ساتھ آیا تھا اور دوسرے دن خود بخود چلا گیا تھا۔ (شیخ ہاشم) شیخ مرتضیٰ کے بھانجے ہیں۔ اور 1051ھ (1641) میں اپنے مکان کی چھت سے گر کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ میں جب بھی شروع میں ان سے ملتا تھا وہ ہم وطنی کی رعایت سے مجھ سے بہت اظہار محبت فرماتے تھے۔ بعد میں جب بھی مجھے میرے شیخ کے ساتھ دیکھتے اس محبت دیرینہ کی وجہ سے زیادہ لطف فرمایا کرتے۔

شیخ ابا بکر سنبھلی

آپ خواجہ بیرنگ کے اصحاب میں سے ہیں۔ بڑے صاحب جذب و کیفیات و احوال ہیں۔ میرے شیخ کی روایت ہے کہ انھوں نے ابتدائے سلوک میں چند سال شیخ ابن بدر چشتیؒ جو کہ شیخ علاء الدین چشتیؒ کے خلیفہ ہیں، کی صحبت میں رہ کر بڑی ریاضتیں کیں ہیں۔ اس کے بعد حضرت خواجہ بیرنگ سے وابستہ ہو گئے۔ جذب کے آثار اُن سے ظاہر ہوتے تھے اور ان کی زبان میں تاثیر تھی۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی اُن کے حال پر بڑی مہربانی تھی۔ میرے شیخ ہی سے روایت ہے کہ ایک بار شیخ تاج الدین نے ان کے طور دیوانگی کی وجہ سے سنبھل والوں کے طعنوں سے بددل ہو کر خواجہ بیرنگ کو ان کی شکایت لکھی۔ خواجہ بیرنگ نے اس کے جواب میں یہ رقعہ لکھا۔

> ''تمھارے دماغ کی خشک (بے فائدہ) باتوں کو جو تم نے شیخ ابا بکر کے سلسلے میں لکھی ہیں، ہم نے پڑھا۔ ایسی شکایت آمیز باتیں مقام شفقت اور مقام کارشناسی کے مناسب نہیں۔ اولیا کبار ہی (افراط و تفریط سے) محفوظ ہوتے ہیں۔ وہ طالب بے چارہ نامراد (یعنی جو ابھی مرید ہے مُراد نہیں ہے) جو ابھی چند دن ہوئے سلوک طریقۂ تصفیہ پر گامزن ہوا ہے، کیسے محفوظ و معصوم رہ سکتا ہے کہ اس سے کچھ بھی خلاف توقع ظہور میں نہ

آئے۔ پھر وہ جو حقیقت میں منحرف العقل اور دیوانہ ہو گیا ہو اس سے
صفات پر استقامت کی امید نہ لگانی چاہیے اگر چہ وہ مرتبہ ولایت کو پہنچ چکا
ہو اللہ ہی جانتا ہے کہ اس وقت کیا کم عقلی کی باتیں اس کی عقل میں سمائی
ہوں گی۔ دیوانوں کی تو دنیا ہی الگ ہے۔ اس نسبت کا خیال کر کے کہ
تکالیف شرعیہ کے مکلف صرف اہل عقل ہیں (ان سے صرف نظر کرنی
چاہیے) بالجملہ ساری مخلوق کے ساتھ ان کے موافق مرتبہ معاملہ کرنا
چاہیے اور ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر مجبور سمجھنا چاہیے اور ہمیشہ فاعل حقیقی
پر نظر کو جمائے رکھنا چاہیے بلکہ وجود الٰہی کی معیت کو دیکھتے ہوئے شناخت
کا ادب تو یہ ہے کہ نفوس مختلفہ کو جن میں بعض امارہ ہیں بعض مطمئنہ اور
بعض دونوں کے درمیان میں یعنی لوامہ ہیں، سب سے اگر چہ صاحب
عقل وفہم نہ بھی ہوں حسب شفقت ومروت معاملہ روا رکھنا چاہیے۔
اگر چہ صرف اصحاب نفوس مطمئنہ ہی نفوس اذکیاء کہے جانے کے مستحق ہیں
مگر اصحاب نفوس امارہ کو بھی از روئے حقیقت معذور سمجھنا چاہیے بلکہ نظر
لطف سے ان کے حال زار پر توجہ کرنی چاہیے۔ ہر کام میں دستِ جمیل
مطلق کی کارفرمائی کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ اہل سنبھل کے طعنوں کا بھی انکار
نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کو بھی بنظر رحمت وکرم دیکھنا چاہیے کہ ابھی وہ
استقامت عقل سے باہر ہیں اور حقوق نفوس کو بھولے ہوئے ہیں۔ اگر کسی
معذور سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو صرف اسی گناہ کا بطلان کیوں نہیں کیا
جاتا بلکہ اس کے سارے کاموں پر گناہوں کا حکم کیوں لگایا جاتا ہے۔
الحمد للہ والمنۃ کہ ملامت تو اولیاء اللہ کا مقدر ہے۔ میں خود ایسے معاملات
میں ایک اور طریقہ برتتا ہوں۔ جب بھی کسی ملامت کے بارے میں
سنتا ہوں اپنے آپ میں جب غور کرتا ہوں تو اس بات کو جس پر میری
ملامت کی گئی ہے، اپنے اندر پاتا ہوں اور اس اشارے کو غیبی نصیحت سمجھتا

ہوں۔ چنانچہ اس معاملے پر بھی خود کو فتنہ و بلا میں مبتلا سمجھ کر میں نے
حضرت کریم کی درگاہ میں التجا کی کہ (اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور
فتنوں اور بلاؤں سے نجات بخشے) آپ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے تضرع و
زاری کریں۔ اچھا بتلایئے سنبھل والوں کی ملامت سے کیا نقصان ہو
جائے گا کیا عبادت قبول نہ کی جائے گی یا صفائی توجہ برطرف ہو جائے
گی۔ یا کارخانہ خداوندی میں کوئی ضرر واقع ہو جائے گا۔

مصرعہ ''معشوق ترا، و بر عالم خاک'' انتہیٰ کلامہ

یہ بھی میرے شیخ ہی سے روایت ہے کہ ایک رات شیخ ابا بکر چاند کو دیکھے جا رہے تھے خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ نے فرمایا۔ کیا (دیکھتے) ہیں یہ تجلیات صفاتی میں سے ایک تجلی ہے۔ میرے والد کی ان سے گہری دوستی تھی۔ ہم وطنی اور روزگار کے تعلق سے دونوں حضرات ایک زمانے تک کٹرہ شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری میں یکجا رہے ہیں۔ میرے والد فرماتے تھے کہ ایک بار وہ میرے مکان پر بیمار ہو گئے۔ خواجہ بیرنگ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے اور ایک گھڑی بیٹھے اس طرح مجھے گھر بیٹھے خواجہ صاحب کا دیدار ہو گیا۔ انھوں نے ان کا حال دریافت کیا اور میرے اوپر لطف و کرم کی نگاہ ڈالی۔ ان کی اس آمد غیر متوقع سے مجھے نعمت غیر مترقبہ حاصل ہوگئی۔ میرے والد ہمیشہ اس نعمت کا شکر بجالاتے تھے کیونکہ وہ اس نعمت کا سبب شیخ ابا بکر کو سمجھتے تھے تو ان کا بھی ہمیشہ شکر یہ ادا کرتے ان کا حق اپنے اوپر ثابت کرتے تھے۔ میں بچپن سے ہی ان کو جانتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ اپنے ابتدائے حال کی بعض عجیب و غریب حکایتیں سنایا کرتے اور مجھے بھی بعض باتوں کی بشارتیں دیا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ تیرے چار بیٹے ہوں گے آخر کار ایسا ہی ظہور میں آیا جیسا انھوں نے فرمایا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ ''میں نے شیخ ابن قدس سرہٗ کی صحبت میں بہت ریاضتیں اور مجاہدے کیے ہیں لیکن خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت میں اپنے مقصد کو ذرا سی دیر میں پالیا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ میری عمر سو سے متجاوز ہو چکی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے مشائخ کبار اور مجاذیب بامعنی دیکھے ہیں لیکن کوئی خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ جیسا عارف اور محقق کامل نہیں دیکھا۔ اب اس زمانے میں خواجہ خرد جیسا کوئی نظر نہیں آتا۔ انھیں سے منقول ہے

کہ ایک بار میں خواجہ بیرنگ سے سفارشی رقعہ لے کر برہان پور میں بیرم خان خانان سے ملاقات کی غرض سے گیا۔ دیکھا کہ خان مذکور ہاتھی پر سوار شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں ایک پشتے پر کھڑا ہو گیا اور خواجہ صاحب کا خط انھیں دیا۔ پڑھ کر بولے تو دیوانہ ہے؟ میں نے ان کی جانب توجہ نہ کی ایسا نہ ہو کہ میری حالت دیکھ کر انھیں کراہیت ہو۔ مگر خان خانہ نے پھر کہا ''تو دیوانہ کہاں ہے؟ (از خود دیوانہ بنتا ہے)، آ، میرے پاس بیٹھ'' میں نے کہا میرا لباس اور سامان پھٹا پرانا، میلا کچیلا اور بدبودار ہے۔ خان خانہ نے کہا ''تیرے سامان کی بدبو میرے نزدیک خوشبو سے بڑھ کر ہے۔'' میں نے کہا ''ادب و تعظیم کے تکلف کی حاجت نہیں۔ (انھوں نے کہا) میرا ہاتھ پکڑ۔ آخر میں ہاتھی پر اُن کے برابر بیٹھ گیا۔ خان کو میں نے نہایت عالی ہمت، حد درجہ صاحب کرم اور فاضلین زمان میں سے پایا۔ خان نے مجھ سے کہا۔ میں تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا۔'' میں نے کہا ''نا، میں بس تھوڑی دیر کے لیے جب تک ہاتھی پر ہوں آپ کے ساتھ ہوں۔ جب میں نیچے اترا میں نے کہا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔'' ایک گھڑی تک خوب صحبت رہی۔ اس کے بعد ایک گھوڑا، تین سو روپے کی تھیلی، ایک کتاب ''مجموعۂ خانی'' مجھے دی اور میں روانہ ہوا۔ میں نے اکبرآباد تک سارا مال خرچ کر دیا علاوہ بیس روپے کے۔ میں ایک دن شہر میں گیا اور ایک بڑے قحبہ خانے کے سامنے جا کر بے خود شخص کی مانند کھڑا ہو گیا۔ کچھ نوجوانوں نے کہا ایک نیا عاشق اور نیا خریدار اور آ پہنچا۔'' میں نے کہا۔ ہاں، میں عاشق ہوں۔ ایک لحہ بات کی اور وہ بیس روپے اس قحبہ کو دے دیے اور اپنا راستہ لیا۔ انتہیٰ کلامہٗ۔ شیخ ابوبکر نے وہ کتاب اور وہ تھیلی میرے والد کو دے دی تھی۔ میں نے بھی وہ دونوں چیزیں دیکھی تھیں۔ اُن کے انتقال کے بعد میرے والد نے وہ دونوں چیزیں ان کے صاحبزادے شیخ محمد کو جو کہ بڑے شائستہ نوجوان ہیں اور اس کار درویشی کے لائق ہیں، دے دی تھیں۔ ایک دن میں اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر تھا کھانا سامنے تھا خواجہ ابرار تشریف لائے اور سب کے بیچ اس طرح بیٹھ گئے کہ ان کا چہرہ سب کے سامنے رہے اور کھانے میں مشغول ہوئے اور اُن سے کہا ''کھا''۔ انھوں نے جواب دیا۔ کیا کھاؤں آپ تو میرے حال کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ میں خواجہ بیرنگ کا خادم خاص ہوں۔ خواجہ ابرار نے کہا ''پہلے کھانا کھالو پھر دردِ دل کہنا۔ انھوں نے ایک لقمہ کھایا اور چلائے اے شیخ میں چاہتا ہوں کہ نہ کھاؤں مگر کم بخت حرص

پیچھا نہیں چھوڑتی'' یہ کہہ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے شکم کو پیٹنے لگے۔ خواجہ ابرار بولے۔ کیا پاگل ہوا ہے؟ بس کر۔ بس۔ جب رُکے تو رونا شروع کیا۔ خواجہ ابرار نے مسکرا کر فرمایا۔ اے دیوانے! تو نے اس قدر اپنا شکم پیٹا ہے کہ بھوکا ہوگیا ہوگا۔ لہٰذا اب کھالے۔ خواجہ ابرار کی اس بات پر میرے شیخ اور دوسرے حاضرین مجلس ہنس پڑے۔ روایت ہے کہ وہ اختیار خاں حسن پوری کے یہاں جایا کرتے تھے اور خان سے ایسی ایسی فرمائش کرتے جوان کے بس کی نہ ہوتیں مگر خان ان کے سب ناز برداشت کرتے اور ایسی نیاز مندی اور مروّت سے پیش آتے کہ اس سے زیادہ کا کسی فرد بشر سے تصور بھی ممکن نہیں۔ خان میں سخاوت اور بردباری (کی صفات) اس قدر تھیں کہ اس زمانے میں نہ دیکھیں نہ سنیں۔ اسی لیے ہزاروں بے سہارا مایوس لوگوں کو وہ اپنے پاس رکھتے اور بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اُن کی دل جوئی اور خبر گیری فرماتے تھے۔ وہ میرے شیخ کے بڑے نیاز مند تھے۔ میرے شیخ فرماتے تھے کہ میں نے اُن کو اُن کے مرض آخیر میں دیکھا کہ نہایت زار و نزار ہیں۔ پشت پر زخم ہے اور سر پھٹا ہوا ہے۔ شیخ ابوبکر ان کے پاس آئے۔ بس ایک بار سر اٹھا کر دیکھا اور ماتھے پر بنا کوئی شکن لائے خوشی خوشی جان جان آفریں کے سپرد کی 1050ھ (1640) میں ایک بار کا ذکر ہے کہ میں ایک مقام پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب صلحا کی صورت میں آئے اور پاس آکر بیٹھ گئے میں نے معلوم کیا۔ اسم شریف؟ بولے۔ اختیار۔ میں نے کہا ''اچھا، اختیار خاں ہیں۔ بولے۔ ''جی ہاں'' پھر میرے شیخ کی باتیں کرنے لگے۔ سن کر میرا بڑا دل خوش ہوا۔ وہ بادشاہ صاحب قران ثانی کے نامدار امرا میں سے گزرے ہیں۔ جس زمانے میں میرا قیام دہلی میں تھا، شیخ ابا بکر (سنبھل سے) وہاں پہنچے اور کیا خوب مجالس گرم ہوتی تھیں۔ ایک دن میں نے اُن کو ایک جوان دکھایا جو ایک عورت کے عشق میں مبتلا تھا۔ جیسے ہی وہ جوان اس عورت کے ہمراہ ان کے سامنے سے گزرا انھوں نے اس سے کہا۔ ''اے جوان! اپنی محبوبہ کو ایک لمحے کے لیے روک لے تاکہ میں اس کا نظارہ کروں۔ عورت اس کی حکم برادر تھی۔ ایک اشارے پر ٹھہر گئی اور بڑے ناز و انداز سے کھڑی ہوگئی۔ شیخ ابا بکر فوراً وجد میں آگئے (پھر سنبھلے اپنے چہرے اور سینے کو پیٹنے لگے اور اپنی داڑھی ہاتھ میں پکڑ کر بولے۔ تف ہے ایسی داڑھی پر کہ یہ عمر اور یہ نفسانیت۔ پھر ایک روپیہ نکالا اور اس نوجوان کو بخش دیا۔ اُن کی وفات بھی 1050ھ (1640) کے ہی دوران ہوئی ہے اور

قبر خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے آستانے والے باغ میں ہے۔

شیخ محمد طاہر

میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ وہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے صحبت یافتہ تھے۔ کمال صلاح وسعادت سے آراستہ۔ مدتوں کسب کتابت سے روزی بہم پہنچاتے رہے۔ میری ان سے شناسائی تھی۔ حد درجہ غربت اور خاکساری رکھتے تھے۔ مجھ پر لطف وعنایت کی نظر رکھتے تھے۔ وہ 1050ھ (1640) میں دنیا سے سدھارے اور خواجہ بیرنگ کے باغ میں دفن ہوئے۔

شیخ موسیٰ سرہندی

وہ بڑے صاحب احوال واذواق مجاذیب میں سے تھے۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ وہ شریعت پر استقامت اور صفتِ شورش عشق کے کیا خوب جامع تھے۔ خواجہ ابرار کی صحبت کے وسیلے سے خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت سے پیوستہ ہوئے اور بہت قلیل مدت میں عجیب وغریب کیفیات ان کو حاصل ہوگئیں۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی وفات کے بعد جب تک زندہ رہے خواجہ ابرار کے ہی سایہ میں رہے، خواجہ ابرار ان کی اعلیٰ نسبت کی بہت رعایت فرماتے تھے۔ کیسی کیسی ریاضتیں انھوں نے کی تھیں۔ اور وہ عشق الٰہی میں دیوانگی کے باوجود کتنی ہی عبادات ظاہری اور دینی امور میں لگے رہتے تھے۔ میں نے ان کے اوایل حال میں انہیں اپنے شیخ کی صحبت میں 1030ھ (1620) میں دیکھا تھا۔ عجیب حال اور عجیب شگفتگی رکھتے تھے۔

شیخ عثمان جلندھری

وہ بڑے صاحب اخلاق اور نیک معاملہ بزرگ تھے۔ میرے شیخ سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے کم وبیش تین ماہ تک خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت اٹھائی ہے۔ صاحب ذوق ووجد و حال تھے۔ بڑے رقیق القلب اور صاحب چشم گریاں تھے۔ میرے شیخ سے ہی روایت ہے کہ ''میں نے انھیں دیکھا ہے اور لوگوں سے سنا ہے کہ ان کی صحبت میں طالبان الٰہی کی ایک جماعت

رہتی تھی اور ان کی نسبت و کیفیت سے استفادہ کرتی تھی۔'' میں نے بھی انھیں شیخ فرید بخاری کی مسجد کے حجرے میں جیسا کہ میں نے اپنے شیخ سے سنا تھا۔ دیکھا کہ بہت سے مریدین ان کی صحبت سے استفادۂ نسبت میں مشغول ہیں۔ بڑی اچھی صحبت رہی چنانکہ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ کہیں رابطۂ ارادت کر لے اور شغلِ باطنی میں لگ جا۔ کیونکہ مجھے اپنے شیخ کی جانب سے اخفائے نسبت کا حکم تھا میں نے کہا ''امیدوار ہوں'' انھوں نے کہا کہ میری ارادت کی قید میں آ جا اور نعمت فراواں (بزرگان سلسلہ) حاصل کر لے۔ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ کچھ نہیں بولا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے دیکھتے وہی بات بڑی تاکید سے دہراتے مگر میں ٹال جاتا۔ ایک دن مجھے ایک گوشے میں لے جا کر فرمانے لگے۔ ''مجھے تجھ سے کوئی طمع اور توقع نہیں ہے محض اس وجہ سے کہ تیری وضع مجھے اچھی لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے میری معرفت بھی کوئی خیر و خوبی تجھے پہنچ جائے'' میں نے جواب میں عرض کیا۔ انشاء اللہ۔ اپنی قیام گاہ پہنچ کر فکر میں پڑ گیا کہ میں تو عارف باللہ خواجہ خرد کا مرید ہوں اور آں عزیز اس بات پر زور دے رہے ہیں۔ کیا کرنا چاہیے۔ ''کلیات خواجہ'' (بیرنگ) میرے پاس تھی اس بارے میں (میں نے فال کھولی) کہ ان عزیز کے ساتھ کیا سلوک کروں (کہ ان کا دل نہ دُکھے) تو یہ شعر نکلا۔

من ازان شہر کلانم، نہ ازاں دیہہ کہ توئی   باہمہ خلق جہاں دار و بدارے دارم[1]

(یہ شعر دیکھتے ہی) میرے دل سے سارا دغدغہ جاتا رہا۔ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ آپ کیا فرما رہے تھے۔ ایک بار پھر کہیے۔ وہ تو خود ہی اس کے مشتاق تھے۔ مجھے خلوت میں لے جا کر توجہ دی۔ میں نے اپنی نسبت کو مضبوطی سے تھاما کیونکہ میں نے بارہا دیکھا تھا کہ لوگ اُن کی توجہ سے بے ہوش ہو کر گر جاتے تھے لیکن مجھ میں کوئی تغیر نہ ہوا تو انھوں نے لفظ اللہ کو کئی بار (بآوازِ) بلند کہا مگر جب مجھ میں کچھ بھی اثر ظاہر نہ ہوا تو وہ اٹھنے لگے اور (ان کی اس توجہ فرمائی کے لیے میں نے بھی) بارک اللہ کہا (اور باہر آ گیا) اُن کا سال وفات 1050ھ (1640) ہے۔ ان کی قبر ان کے قصبے سرہند میں ہی ہے۔ ''رشحات'' میں ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ سے منقول ہے

---

1 میں بڑے شہر کا باسی ہوں نہ کہ دیہات کا۔ سارا جہاں اور مخلوقِ جہاں تیرے لیے۔ میرے واسطے تو بس ایک در کافی ہے۔

کہ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ اس بڑی سڑک کے درمیان جس پر میں چل رہا ہوں سامنے ایک بزرگ کھڑے ہیں انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے۔"قال النبی صلی اللہ (علیہ) السماع لاھل اللہ"[1]

آ تجھے اس دوسری راہ مختصر سے جس سے میں منزل مقصود کو پہنچا ہوں لے چلوں مگر میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اس بڑی سڑک کے بجائے کسی دوسری راہ چلوں، اچانک میں نے دیکھا کہ حضرت قاسم اسی شاہراہ عظیم پر ہاتھی پر سوار ظاہر ہوئے اور بولے کہ یہ شاہراہ شہر کو جارہی ہے آتا کہ تجھے شہر لے جاؤں اس کے بعد مجھے ہاتھی پر اپنے پیچھے سوار کر لیا اور اسی بڑی سڑک پر آگے بڑھ گئے۔بعض شارحین نے کہا ہے کہ"رشحات" کی اسی عبارت کی طرف حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے اس شعر معارف شعار کا اشارہ ہے کہ

من ازان شہر کلانم نہ ازان دیہ کہ توی　　　باہمہ خلق جہان دار و بدارے دارم

شیخ محمد سعید بن شیخ احمد سرہندی

وہ علوم ظاہری و باطنی کے عالم ہیں۔ان کے فضائل و کمالات اس سے برتر ہیں کہ بیان میں لائے جائیں۔نسبت باطنی کو اپنے والد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے درست کرتے ہیں۔ہمیشہ طریق مستقیم پر عبادات اور طاعات میں مشغول رہتے ہیں۔صاحب مشرب عالی ہیں۔ان کے افعال و احوال سے صدق و راستی واضح اور ظاہر ہے۔مشائخ اور اولیا کبار کے اخلاق عالیہ سے متصف ہیں۔جود و کرم کے دریا ہیں۔ہر خرد و کلاں سے لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔میرے شیخ خواجہ خرد کو سلسلہ قادریہ میں اُن سے اجازت بیعت ہے جیسا کہ یہ شجرہ عالیہ خاتمہ میں آئے گا۔وہ سال 1067ھ (1657) میں اپنے بھائی خواجہ محمد معصوم جن کا ذکر متصل آرہا ہے اور اہل صلاح کے ایک جم غفیر کے ہمراہ حج کے ارادے سے نکلے اور دہلی پہنچے۔دہلی میں میرے شیخ کی صحبت میں بڑی اچھی صحبتیں رہیں پھر حرمین محترمین پہنچے اور 1069 (1659) میں جمعیت صوری و معنوی کے ساتھ واپس آئے۔میرے شیخ ان کی بہت تعریف کرتے ہیں اور (ان کو)

1　نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سماع اہل اللہ کے لیے (حلال) ہے۔

بزرگانِ وقت میں شمار کرتے ہیں۔ واہ، واہ کیا خوب استقامت اور کتنا اچھا اور کشادہ مشرب اور کیسی خوبیِ معاملت ہے جو انھیں حاصل ہے۔ جب میں لاہور کی آمد و رفت میں ان کے دیدار کے لیے سرہند پہنچتا ہوں وہ اس قدر لطف و مہربانی میرے حال پر فرماتے ہیں کہ میں اس کے شکریہ سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔ ایک دن اوائل سلوک میں، میں نے اُن کی زبان سے سنا کہ فرما رہے تھے۔ ''اس راہ میں صدق و راستی بہت ہی ضروری ہے۔'' ان کی بات میرے حق میں بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ جب 1062ھ (1652) میں میرے شیخ لاہور آئے میں بھی سنبھل سے براہ سہارن پور لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ اتفاقاً جس دن سرہند پہنچا ہوں اس رات کو شیخ احمد سرہندی کے عرس کی تاریخ تھی یعنی 28 رصفر جمعہ کی رات کو۔ میں اُن سے ملا بہت ہی لطف کے ساتھ گویا ہوئے بڑے خوش بخت ہو کہ اس مبارک رات میں پہنچے۔ وہاں کی رسم یہ دیکھی کہ رات تمام حفاظ کو ایک مجلس میں بٹھا کر قرآن مجید کی خاص خاص سورتیں مثل یٰسین و کہف وغیرہ پڑھتے ہیں پھر مجلس برخاست ہو جاتی ہے۔ اور اہل مجلس کو یہی سعادت جمعہ کی رات میں بھی حاصل ہوتی ہے۔ دوسری جگہوں کی طرح مولود خوانی وغیرہ کی کوئی رسم یہاں نہیں کی جاتی۔ چونکہ شیخ احمد قدس سرہٗ مولود خوانی کو منع فرمایا کرتے تھے مخدوم زادگان بھی اپنے والد محترم کی موافقت میں اس پر عمل پیرا ہیں۔ آخیر رات میں، میں اس مجلس سے اُٹھا اور خانقاہ کے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ شیخ فاضل درویش سرہندی بھی وہاں آکر بیٹھ گئے اور اپنے فارسی اور ہندی کے اشعار پڑھنے لگے اتنی بلند آواز اور شوق کے ساتھ گا گا کر پڑھ رہے تھے کہ مجھے بہت زیادہ حظ و سرور حاصل ہوا اور میں نے بھی درمیان میں فارسی اور ہندی کے بعض اپنے شعران کی موافقت میں پڑھے۔ گرفتارم در پیش جگر چہ یاراست 1 نمازِ فجر تک یہ صحبت گرم رہی۔ نماز کے بعد شیخ محمد سعید نے مجھ سے کہا جمعہ پڑھ کر سو جانا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس روز کھانے کے بعد (میں نے) شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کے دوستوں، یاران سلسلہ، مریدوں، مخدوم زادوں، پسران اور مریدانِ شیخ آدم بنوری اور دوسرے عزیزان شہر کے ساتھ خوش دلی اور جمعیت تام کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی تھی۔ اس ملاقات کے بعد میں نے شیخ فاضل کو اپنے شیخ کے پاس دہلی میں دیکھا جب وہ شیخ محمد سعید کے ہمراہ حج کی نیت سے سفر حجاز کے دوران دہلی پہنچے تھے۔

1 میں محبت میں گرفتار ہوں، دل سے مجبور ہوں۔

لیکن ایک مانع کے پیش آنے کی وجہ سے نہ جاسکے تھے۔ میرے شیخ کا کہنا ہے کہ وہ ایک صاحب محبت درویش ہے۔ اسرار یہ کے اتمام کے تین سال بعد شیخ محمد سعید دہلی آئے اور بیمار ہو گئے اور سرہند واپس نہ جاسکے اور سرائے سنبھالک میں 25/ جمادی الاول کو جمعہ کے دن 1071ھ (1661) میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن کی نعش کو سرہند لے جاکر ان کے والد صاحب کے گنبد میں دفن کر دیا گیا۔ ان کی تاریخ وفات میں نے یوں کہی ''وائے شیخ سعید'' (1071ھ)

شیخ محمد معصوم[1]

وہ شیخ سعید کے بھائی ہیں۔ وہ بھی اپنے والد سے ہی اپنی نسبت کو درست کرتے ہیں۔ علوم ظاہری و باطنی میں بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ صاحب نسبت عالی اور عالی کیفیات والے ہیں۔ ان کی صحبت میں بڑی قوی تاثیر ہے۔ ان کے ہزاروں صاحب نسبت و کیفیت مرید ہیں۔ اپنے بھائی کی ہی مانند صاحب تقوی و ورع اور نیک معاملت ہیں۔ ہمیشہ عبادت و طاعت سے اپنے وقت کو معمور رکھتے ہیں۔ ان کے شاگرد جو اطراف و اکناف میں رہتے ہیں ان کے علوم و معارف اور احوال و کیفیات سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی تعداد حد و شمار سے بھی زیادہ ہے اور روز افزوں ہے۔ روایت ہے کہ جب وہ بچے تھے۔ ایک دن ان کے والد حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان سے پوچھا کہ دنیا میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے یا مردوں کی؟ جواب دیا۔ ''عورتیں زیادہ ہیں۔'' دریافت فرمایا۔ کیسے؟ جواب دیا۔ ''اللہ تعالٰی نے ایک مرد کے لیے چار عورتیں تجویز کی ہیں۔'' میر مفاخر حسین بن میر عماد جو کہ شیخ محمد معصوم کے مریدوں میں سے ہیں، فرماتے ہیں۔ ایک بار میرے

---

1 پیدائش 11/ شوال 1007ھ/ مئی 1599۔ وفات 9/ ربیع الاوّل 1079ھ/ اگست 1668۔ ناصر علی سرہندی نے مندرجہ ذیل مادۂ تاریخ وفات لکھی

چراغ خاندانِ نقشبنداں فروغ دینِ احمد خواجہ معصوم
بسوئے گلشن عقبیٰ قدم زد ازیں ویرانہ آباد کہن بوم
ز دل بُر سیدم از سالِ وفاتش ندا آمد ز عالم رفت معصوم

تاریخ محمدی میں آپ کی تاریخ وفات ''رفتہ ز جہاں امام معصوم'' لکھی ہے۔

بھائی شرف الدین حسین کے دل میں مکتوبات شیخ احمد قدس سرۂ کی بعض مشکل باتوں سے تردد اور اعتراضات پیدا ہو گئے تھے، جو کسی طرح حل نہ ہوتے تھے۔ ایک دن اچانک شیخ محمد معصوم نے اُن سے وہ خط طلب کیا اور اسی موضع اشکال کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ ان کے دل کا زنگ جاتا رہا۔ میر مفاخر حسین ہی کہتے ہیں کہ سید محمد علی مرید شیخ محمد معصوم اپنے شیخ کی ریش کے بال اپنی دستار میں بطور تبرک رکھتے تھے۔ ایک بار جب وہ بیت الخلا جاتے وقت دستار سے ان بالوں کو نکال کر دوسری جگہ رکھنا بھول گئے تھے۔ بیت الخلا کے راستے میں ناگاہ دستار خود بخود گر پڑی تب انھوں نے وہ بال دوسری جگہ رکھ دیے۔ میر مفاخر حسین ہی فرماتے ہیں کہ ایک بار جلندھر میں شیخ محمد معصوم کا ایک مرید ایک دختر پر عاشق ہو گیا۔ خطبہ نکاح پڑھ کر ایجاب وقبول کے بعد اپنے نکاح میں لے آیا۔ اس کے بعد فتنے کے خوف سے گھبرا کر اپنے شیخ کے پاس سرہند آیا اور حقیقت حال عرض کی۔ شیخ نے کہا۔ تو جتنی جلدی جلندھر پہنچ جائے گا تیرا کام اتنا ہی آسان ہو جائے۔ وہ فوراً جلندھر پہنچا اور لڑکی والوں نے لڑکی کی تلاش کیے بغیر، بلا مزاحمت لڑکی کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ میں بارہا بغرض دیدار ان کی خدمت میں پہنچا ہوں اور ان کے بے پناہ الطاف وعنایات پائے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ[1]

وہ (بھی) شیخ محمد سعید کے بھائی ہیں۔ عالم، فاضل اور اہل طریق ہیں۔ ہمیشہ اوراد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں اور معاملت نیک میں منہمک۔ شیخ محمد سعید سے اپنی نسبت درست کی ہے۔ خدمت علوم متداولہ دینیہ میں لگے ہوئے ہیں۔ بلند ہمت ہیں۔ میرے شیخ کے بڑے معتقد ہیں۔ میرے شیخ لاہور کی آمد و رفت میں ان کے مکان پر ٹھہرتے ہیں۔ خوب مجلس رہتی ہے۔ جو لطف و کرم اُن کا میرے شامل حال ہے وہ احاطہ تقریر و بیان سے باہر ہے۔ ان کے بڑے بھائی شیخ محمد صادق[2] کے متعلق سنا ہے کہ بڑے صاحب سکر و حال قوی ہوئے ہیں۔ جذبہ خاص سے متصف۔ اپنے والد محترم شیخ احمد سرہندی سے چند سال قبل انتقال کر گئے۔ باپ بیٹے دونوں کی قبر یکجا ہے۔

---

1 پیدائش 1024ھ/1614 وفات 7/ جمادی الآخر 1099ھ/1686، مزار مبارک سرہند میں ہے۔

2 شیخ محمد صادق کی پیدائش 1000ھ اور وفات 9/ ربیع الاول 1025ھ/1615 کو ہوئی۔

انھوں نے خواجہ (بیرنگ) کی صحبت بابرکت پائی تھی جیسا کہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے اُن مکتوبات سے جو شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) کو انھوں نے لکھے ہیں، ظاہر ہے۔ جب اوائل حال میں بچپن میں انھیں جذبہ پہنچا خواجہ بیرنگؒ نے یہ لکھا۔

''قرۃ العین محمد صادق کا خوشہ چینِ ظاہر و باطن بن جانا جیسا کہ اس کے احوال سے ظاہر ہے۔ واجب الشکر ہے۔ ابھی اپنی اُسی نسبت حضوریٔ دائم پر قائم ہے۔ غیبت اور استغراق سے کوئی اندیشہ نہیں ہے، ان شاء اللہ العزیز رفتہ رفتہ سکر سے صحو کی طرف آ جائے گا۔ برادران عزیز میاں شیخ احمد اور محمد صادق نیک دعائیں قبول فرمائیں۔ جو خط مشارٌ الیہ کے احوال کی شرح میں آپ نے لکھا ہے، مل گیا۔ الحمد للہ والمنۃ کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو خود سے غافل نہیں رہنے دیتا۔ خیال تھا کہ ہر مقدے کا جدا جدا جواب بالتفصیل لکھوں حقیقت کار بالمشافہ ذکر کی جائے گی۔ فی الحال (عزیزم محمد صادق کو) غیبت و استغراق سے شفاء تام حاصل نہیں ہے۔ اس لیے توجہ دینی ترک کر دی ہے۔ البتہ مجمل یہ ہے کہ محمد صادق کا حال بغایت اصلی ہے۔''

محمد صالح بن شیخ ابراہیم سندھی

آپ لاہور میں سکونت رکھتے ہیں۔ علوم ظاہر و باطن کے عالم ہیں۔ تصوف کے دقائق وصوفیہ کی اصطلاحات کے ساتھ خوب جانتے اور استعمال کرتے ہیں۔ میرے شیخ کے صحبت داروں میں سے ہیں۔ احوال عظیمہ اور دقائع غریبہ سے مالا مال ہیں۔ جو لطف و کرم وہ مجھ پر رکھتے ہیں وہ احاطۂ تقریر و بیان سے باہر ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں بچپن میں اپنے والد محترم کا منظور نظر رہا ہوں۔ والد صاحب نے استحضار کے وقت تین چیزوں کی وصیت فرمائی تھی۔

1 علوم دین حاصل کرنا بلا کسی دنیاوی مقصد کے۔

2 اس پر عمل کرنا بغیر ریا کو شامل کیے۔

3 ملوک وسلاطین کے گھر نہ جانا بغیر ان کی تحقیر اور اپنی بڑائی کو مقصود بنائے۔ شیخ محمد صالح فرماتے ہیں کہ میرے والد صاحب نے اس وقت یہ بھی فرمایا کہ میں نے بہت سی چیزیں اللہ تعالیٰ سے تیرے لیے مانگی ہیں اور سب دعائیں مقبول ہوگئی ہیں۔ پدر محترم کی دعاؤں کی برکت سے بعضے کام تو ظہور پذیر ہوچکے ہیں اور بعض کا مجھے انتظار ہے۔ میں 10 سال کی عمر میں ''قواعد ضیائیہ'' کو پوری استعداد کے ساتھ پڑھتا تھا۔ جب والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا بہ مقتضائے کم عمری 8 سال میں نے تکمیل خواہشات دنیا میں صرف کر دیے۔ اس کے بعد والد صاحب کی دعاؤں کے صدقے۔ تکمیل اسباب حصول روزی کی طرف توجہ ہوئی اور میں نے دولت کمانے میں خیال کو لگا دیا اور خود کو جواہرات محمدیہ یعنی علوم دینیہ کے حصول سے منحرف کر کے اپنے حال و وقت پر دست تاسّف ملتے ہوئے تجارت کے علوم کی تحصیل میں سرگرم ہوگیا۔ اسی دوران کلام اللہ کے تیسوں پارے حفظ بھی کر لیے۔ مال و متاع دنیوی کی دھن میں بغیر کسی واسطے کے ہی علوم غریبہ دنیاوی مثل صرف ونحو ومنطق کے کسب میں لگ گیا۔ خاندان کے ان علوم سے بے مناسبتی کی وجہ سے عزیزوں نے از روئے شفقت کہا کہ پہلے علوم الٰہیہ حاصل کریں پھر ان علوم وفنون کو پڑھنا۔ مجھے اُن کی یہ بات اچھی نہ لگی میں نے دست دعا دراز کر کے بہ تفرع تمام اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔ خدایا جیسے تو نے چیزوں کو بے توسط آلات پیدا فرمایا ہے اس کمینے کو بھی بے توسط اسباب افاضۂ علوم فرما۔ حق تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی اور میں نے کتاب شرح وقایہ کھول کر پڑھنی شروع کی۔ ایک ورق پڑھا جس میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو میری سمجھ میں نہ آیا ہو۔ اس کے بعد میں نے اسے شیخ رزق اللہ مفتی کے سامنے پڑھا۔ شیخ رزق اللہ بڑے صاحب صلاح وتقویٰ بزرگ ہیں وہ اس بات سے بڑے متعجب ہوئے اکثر علوم دینیہ کو میں نے انھیں سے سند کیا ہے اور کچھ اور علوم حکمی کو دوسرے افاضل کے سامنے پڑھ کر سند لی ہے مگر کسی کتاب کے مطلب میں اُن کا محتاج نہ ہوا بلکہ جب بھی ان کی طرف سے کوئی رُکاوٹ محسوس ہوتی میں خود ہی تشریح کر دیتا وہ بے حد تعریف کرتے۔ کیونکہ میں علوم رسمیہ کی تحصیل کو کوئی بڑا کام نہ سمجھتا تھا۔ اسی لیے مطلب عظیم یعنی معرفت حق تعالیٰ کی غرض سے میں اکثر اوقات فقرائے شہر کی صحبت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ وہ حضرات مہربانی فرماتے اور میرے حق میں دعائے خیر کرتے بعض حضرات میری طلب پر کچھ ارشاد بھی فرما

دیا کرتے۔ میں پوری رغبت کے ساتھ بجالاتا مگر جو چیز کہ دل چاہتا تھا ہاتھ نہ آتی۔ بنابریں اپنی استعداد کا قصور سمجھ کر میں مایوس ہوگیا اور یہ ارادہ کیا کہ علوم غریبہ منطق فلسفہ وغیرہ کی خوب تحصیل کروں اور رسوخ تام حاصل کر کے باقی عمر کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسی میں گزار دوں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ میر ہاشم ان علوم میں دستگاہ تام رکھتے ہیں۔ وہ برہان پور میں تھے۔ میں برہان پور روانہ ہوا جب دہلی پہنچا بعض آشناؤں نے جو دہلی میں تھے کہا کہ چند روز اس شہر میں گزار کہ یہ متبرک شہر ہے۔ میں ٹھہر گیا۔ اکثر لوگوں نے خواجہ خرد کا پتہ دیا کہ اس وقت دہلی میں وہ ملجا خاص دعام اور مستند عرفا عظام میں سے ہیں۔ ایک دنیا کو جہالت کے گڑھوں سے نکال کر انھوں نے علم و معرفت کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ ایک عالم کو ہستی مجازی کی ظلمت سے آزاد کر کے نور حق سے آشنا کر دیا ہے۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، جیسا سنا تھا اس سے بھی صد چند پایا۔

سہارا چہ مجال کہ تعریف آفتاب کند[1]

جب میں ان سے ملاقات کے شرف سے مشرف ہوا انھوں نے شاہانہ لطف و مہربانی سے نوازا میں نے چاہا کہ اظہار طلب کروں مگر ان کی ہیبت مجھ پر کچھ ایسی مستولی ہوئی کہ میں کچھ نہ بول سکا۔ انھوں نے شیخ اللہ بخش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ حق، اقرب اشیا ہے۔ کوئی چیز حق سے زیادہ نزدیک نہیں لیکن لوگ جہالت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس سے دور ڈالے ہوئے ہیں۔ حق تمام چیزوں میں ساری ہے کوئی شخص جس چیز کی طرف بھی توجہ تام کرے گا حق کو پالے گا۔ ہندو ہر معاملے میں اپنی ساری توجہ کو سنگ معین پر لگا دیتا ہے حتیٰ کہ کیفیت بےخودی اس پتھر کی معرفت ہی اس پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ قلب کی جانب، جو کہ حقیقت جامع الٰہی ہے توجہ کرنے کو کہ اسے رابطہ کہتے ہیں، سب سے بہتر ہے۔ توجۂ تام کے بعد جس وقت کہ بیخودی طاری ہو جاتی ہے اُس متوجہ کو فنا کرتی ہے جب میں نے یہ کلمات سنے ان کی صورت (معنوی) کے رابطے میں مشغول ہوگیا۔ تیسرے دن کیفیت معہودہ ظاہر ہوئی اس طور پر کہ زورِ طبیعت کلی طور پر اپنے کام سے معزول ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے اُن سے بیعت کی۔ عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے اور آج اُن کی دعا و توجہ کے طفیل نہ وقت ہے، نہ حال ہے، نہ حاضر ہے، نہ غائب ہے، نہ ٹوٹتا ہے، نہ جڑتا ہے۔ یہ سب تجلی ذاتی دائمی کا اثر ہے۔

---

1 سہا، ننھے ستارے کی کیا مجال ہے کہ وہ آفتاب کی تعریف کرے۔

سید قطب الدین

وہ میرے شیخ کے یاران خاص میں سے ہیں۔ صاحب احوال عظیمہ ہیں اور صاحب معنی غریبہ۔
غیراللہ سے کیا خوب آزادگی اور وارستگی رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اوائل میں سید حاجی
محمد امروہوی سے بیعت کی، اُن کی صحبت اختیار کی اور شغل تحصیلِ پاس انفاس کیا اس کے بعد چھ ماہ
تک طریقہ قادریہ میں ذکر جہر کیا اور توحید کا مراقبہ کیا۔ اس کے بعد کبھی کبھی مجھے (غیراللہ سے)
غیبت ظاہر ہونے لگی۔ اس سے میں وہم میں پڑ گیا (اور سید صاحبؒ سے ذکر کیا۔ جب سید حاجی محمد
امروہوی نے یہ سنا تو فرمایا کہ فنا یہی ہے۔ تمامی سلوک یہی ہے کہ تیرے علم سے خطرۂ غیر برطرف
ہو جائے۔ اور فنائے فنا یہ ہے کہ فنا کا شعور بھی فنا ہو جائے۔ اس کے بعد مجھے صحبتِ خواجہ خرد کی تمنا دل
میں پیدا ہوئی۔ میں ان کی خدمت میں دہلی حاضر ہوا۔ میں نے پہلے پہل اُن کو نہ پہچانا کہ وہ بے
تعینی اور آزادیٔ تام میں مشغوف تھے۔ جب میں نے اُن کی گفتگو سنی اُن کا شیفتہ ہو گیا اور تب سمجھا
کہ وہ ہیں۔ مجھ پر بہت لطف و کرم فرمایا کر گویا ہوئے۔ "روزانہ میرے پاس آیا کر۔" دوسرے دن
جب میں اُن کی صحبت میں حاضر ہوا۔ ان کے اثر صحبت نے مجھے گھیر لیا اور جذبۂ قوی طاری ہو گیا۔
اس روز فرمایا کہ سید صاحب سے جو مراقبۂ توحید کی تعلیم تجھے ہے تو جانتا ہی ہے۔ اس وقت میں بھی
کچھ چیزیں بتلاتا ہوں، ہر روز میرے پاس آتے رہنا۔ میں ان کی اس گفتگو سے سمجھ گیا کہ یہ حقیقت
ان پر کشف سے ظاہر ہوئی ہے۔ کیونکہ سید صاحب سے اپنی صحبت کا میں نے بالکل ذکر نہ کیا تھا اور
یہ کہ مجھے ان کی صحبت میں کلی دل جمعی اور سکون تام حاصل نہ ہوا تھا۔ اسی اثنا میں سید صاحب کا خط
میرے پاس پہنچا لکھا تھا کہ خواجہ خرد کے احوال سے واقف ہو کر مجھے لکھنا۔ میں نے جواب میں لکھا۔
"میری کیا مجال ہے کہ خواجہ کے احوال لکھ سکوں صرف اتنا کہتا ہوں کہ خواجہ عارف باللہ اور عاشق
صادق ہیں۔ اس کے بعد سید امروہوی نے بڑے غیض و غضب میں بھر کر مجھے لکھا میں نے تجھے
خواجۂ خرد کے صرف حالات دریافت کرنے کی غرض سے دہلی بھیجا تھا کہ واقف ہو کر مجھے لکھنا تو خود
وہاں جا کر ایسا لپٹ گیا کہ مجھے یکسر بھلا دیا۔ تیری مثال تو ایسی ہوئی اگر کسی اصیل عورت سے زنا واقع
ہو جائے اور لوگ ملامت کریں تو وہ جواب میں یوں کہے۔ "یہ شخص تو میرا یار ہے، میرا شوہر تو اور

ہے۔''اسی قسم کی بہت سی باتیں لکھیں میں نے اس کاغذ کو پارہ پارہ کر دیا اور کنوئیں میں ڈال دیا۔ اسی زمانے میں میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ مداری نام مجذوب مجھ سے کہہ رہا ہے کہ سید حاجی محمد آ رہے ہیں۔ دیکھا کہ سید کثیر مجمع کے ساتھ لباس سیاہ میں حوض نانک پر جو کہ سری کے علاقے میں ہے ٹھہرے ہیں۔ اسی دوران یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ خواجہ خرد ایک ٹہنی ہاتھ میں لیے ہوئے اسی حوض پر کھڑے ہیں اور مجھ سے فرمار ہے ہیں کہ میں ابھی اس کو مارتا ہوں یہ بات بہت مرتبہ کہی اس خواب کو چند دن گزرے تھے کہ سید ایک بہت مہلک مرض میں 1062 (1652) میں دنیا سے رخصت ہوئے یہ روایت ہے کہ ایک رات سید قطب الدین کے دوستوں میں سے محمد صادق نام شخص پر حالت قبض شدید طاری تھی مراد آباد میں آخر شب میں کیا دیکھتے کہ سید قطب الدین سامنے کھڑے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں۔ مصرعہ

آں جا کہ توی محال محض است دوی[1]

اور یہ کہہ رہے ہیں ''ہمارے پاس نہیں آتا'' اُن کو غلبۂ شوق ملاقات ہوا اور سید قطب الدین سے ملنے کے لیے رواں دواں چل کر سری کی شاہراہ پر اُن سے ملاقات کی کہ اس روز سید اپنے گھر سے باہر بھی نہ نکلے تھے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ اس قسم کے واقعات اور حالات میرے شیخ کے دوستوں کو بہت پیش آتے ہیں۔ چنانچہ سنبھل میں میرے شیخ سے بیعت ہونے والا ایک فقیر شخص تھا۔ سید حسن کے مرید شیخ فیروز سنبھلی فرماتے ہیں کہ ایک رات مقصود کی نایافت پر میں افسوس کناں درگاہ رب العزت میں التجا پیش کر کے سو گیا خواب میں دیکھا کہ ہر طرف سے انوار ظاہر ہو رہے ہیں اور بارگاہ محمد ہزار لطافت وخوبی کے ساتھ برپا ہے۔ اسی وقت وہ فقیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آ کر اپنا نام لے کر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ فیروز مجھ سے رجوع کر تیرا کام درست ہو جائے گا۔ میں نے اس فقیر سے رجوع کیا اور اسم ذات کی تلقین حاصل کی۔ روز بروز انوار مجھ پر ظاہر ہونے شروع ہو گئے حتیٰ کہ سکون حقیقی اور جمعیت تام مجھے حاصل ہو گئی اور میں صاحب احوال و وقائع عجیبہ وغریبہ ہو گیا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک وقت مجھے حدیث ''**عن عرف نفسه فقد عرف ربه**'' میں اشکال واقع ہوا۔ میں مدتوں تلاش میں رہا۔ ہر بزرگ کے پاس جا کر استفسار کیا

---

1 جہاں تو ہے وہاں دوئی محال ہے۔

سید قطب الدین

وہ میرے شیخ کے یاران خاص میں سے ہیں۔ صاحب احوال عظیمہ ہیں اور صاحب معنی غریبہ۔
غیراللہ سے کیا خوب آزادگی اور وارستگی رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اوائل میں سید حاجی
محمد امروہوی سے بیعت کی، اُن کی صحبت اختیار کی اور شغل تحصیلِ پاس انفاس کیا اس کے بعد چھ ماہ
تک طریقہ قادریہ میں ذکر جہر کیا اور توحید کا مراقبہ کیا۔ اس کے بعد کبھی کبھی مجھے (غیر اللہ سے)
غیبت ظاہر ہونے لگی۔ اس سے میں وہم میں پڑ گیا (اور سید صاحبؒ سے ذکر کیا۔ جب سید حاجی محمد
امروہوی نے یہ سنا تو فرمایا کہ فنا یہی ہے۔ تمامی سلوک یہی ہے کہ تیرے علم سے خطرۂ غیر برطرف
ہو جائے۔ اور فنائے فنا یہ ہے کہ فنا کا شعور بھی فنا ہو جائے۔ اس کے بعد مجھے صحبتِ خواجہ خرد کی تمنا دل
میں پیدا ہوئی۔ میں ان کی خدمت میں دہلی حاضر ہوا۔ میں نے پہلے پہل اُن کو نہ پہچانا کہ وہ بے
تعینی اور آزادیٔ تام میں مشغوف تھے۔ جب میں نے اُن کی گفتگو سنی اُن کا شیفتہ ہو گیا اور تب سمجھا
کہ وہ ہیں۔ مجھ پر بہت لطف و کرم فرمایا کر گویا ہوئے۔ ''روزانہ میرے پاس آیا کر۔'' دوسرے دن
جب میں اُن کی صحبت میں حاضر ہوا۔ ان کے اثر صحبت نے مجھے گھیر لیا اور جذبۂ قوی طاری ہو گیا۔
اس روز فرمایا کہ سید صاحب سے جو مراقبۂ توحید کی تعلیم تجھے ہے تو جانتا ہی ہے۔ اس وقت میں بھی
کچھ چیزیں بتلاتا ہوں، ہر روز میرے پاس آتے رہنا۔ میں ان کی اس گفتگو سے سمجھ گیا کہ یہ حقیقت
ان پر کشف سے ظاہر ہوئی ہے۔ کیونکہ سید صاحب سے اپنی صحبت کا میں نے بالکل ذکر نہ کیا تھا اور
یہ کہ مجھے ان کی صحبت میں کلی دل جمعی اور سکون تام حاصل نہ ہوا تھا۔ اسی اثنا میں سید صاحب کا خط
میرے پاس پہنچا لکھا تھا کہ خواجہ خرد کے احوال سے واقف ہو کر مجھے لکھنا۔ میں نے جواب میں لکھا۔
''میری کیا مجال ہے کہ خواجہ کے احوال لکھ سکوں صرف اتنا کہتا ہوں کہ خواجہ عارف باللہ اور عاشق
صادق ہیں۔ اس کے بعد سید امروہوی نے بڑے غیض و غضب میں بھر کر مجھے لکھا میں نے تجھے
خواجہ خرد کے صرف حالات دریافت کرنے کی غرض سے دہلی بھیجا تھا کہ واقف ہو کر مجھے لکھنا تو خود
وہاں جا کر ایسا لپٹ گیا کہ مجھے یکسر بھلا دیا۔ تیری مثال تو ایسی ہوئی اگر کسی اصیل عورت سے زنا واقع
ہو جائے اور لوگ ملامت کریں تو وہ جواب میں یوں کہے۔ ''یہ شخص تو میرا یار ہے، میرا شوہر تو اور

ہے۔'' اسی قسم کی بہت سی باتیں لکھیں میں نے اس کاغذ کو پارہ پارہ کر دیا اور کنوئیں میں ڈال دیا۔ اسی زمانے میں میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ مداری نام مجذوب مجھ سے کہہ رہا ہے کہ سید حاجی محمد آ رہے ہیں۔ دیکھا کہ سید کثیر مجمع کے ساتھ لباس سیاہ میں حوض نانک پر جو کہ سرکی کے علاقے میں ہے ٹھہرے ہیں۔ اسی دوران یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ خواجہ خرد ایک ٹہنی ہاتھ میں لیے ہوئے اسی حوض پر کھڑے ہیں اور مجھ سے فرمار ہے ہیں کہ میں ابھی اس کو مارتا ہوں یہ بات بہت مرتبہ کہی اس خواب کو چند دن گزرے تھے کہ سید ایک بہت مہلک مرض میں 1062 (1652) میں دنیا سے رخصت ہوئے یہ روایت ہے کہ ایک رات سید قطب الدین کے دوستوں میں سے محمد صادق نام شخص پر حالت قبض شدید طاری تھی مراد آباد میں آخر شب میں کیا دیکھتے کہ سید قطب الدین سامنے کھڑے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں۔ مصرعہ

آں جا کہ توی محال محض است دوی[1]

اور یہ کہہ رہے ہیں ''ہمارے پاس نہیں آتا'' اُن کو غلبۂ شوق ملاقات ہوا اور سید قطب الدین سے ملنے کے لیے رواں دواں چل کر سرکی کی شاہراہ پر اُن سے ملاقات کی کہ اس روز سید اپنے گھر سے باہر بھی نہ نکلے تھے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ اس قسم کے واقعات اور حالات میرے شیخ کے دوستوں کو بہت پیش آتے ہیں۔ چنانچہ سنبھل میں میرے شیخ سے بیعت ہونے والا ایک فقیر شخص تھا۔ سید حسن کے مرید شیخ فیروز سنبھلی فرماتے ہیں کہ ایک رات مقصود کی نایافت پر میں افسوس کناں درگاہ رب العزت میں التجا پیش کر کے سو گیا خواب میں دیکھا کہ ہر طرف سے انوار ظاہر ہو رہے ہیں اور بارگاہ محمد ہزار لطافت و خوبی کے ساتھ برپا ہے۔ اسی وقت وہ فقیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آ کر اپنا نام لے کر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ فیروز مجھ سے رجوع کر تیرا کام درست ہو جائے گا۔ میں نے اس فقیر سے رجوع کیا اور اسم ذات کی تلقین حاصل کی۔ روز بروز انوار مجھ پر ظاہر ہونے شروع ہو گئے حتیٰ کہ سکون حقیقی اور جمعیت تام مجھے حاصل ہو گئی اور میں صاحب احوال و وقائع عجیبہ و غریبہ ہو گیا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک وقت مجھے حدیث ''**عن عرف نفسه فقد عرف ربه**'' میں اشکال واقع ہوا۔ میں مدتوں تلاش میں رہا۔ ہر بزرگ کے پاس جا کر استفسار کیا

---

1 جہاں تو ہے وہاں دوئی محال ہے۔

کرتا وہ جو کچھ فرماتے اس سے مجھے اطمینان نہ ہوتا۔ ایک دن میں حجرے میں تنہا بیٹھا ہوا حضرت رب العزت کی بارگاہ میں التجا کر رہا تھا کہ یہ مشکل حل ہو جائے۔ اسی اثنا میں میں نے اپنے باطن میں نور الٰہی کا مشاہدہ کیا جو میرے دل کو گھیرے ہوئے ہے اس سے میری تمام ہستی مخفی و منتشر ہو گئی۔ ظہور نور محمدی کے اس واقعہ میں مجھے اپنی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ظاہر ہونے لگی اور فرمایا کہ معنیٰ ''عن عرف نفسه فقد عرف ربه'' یہی ہیں۔ وہ ہی فرماتے ہیں میں اوائل حال میں مدتوں مشغولی باطن میں کوشاں رہتا تھا اور نقشبندیہ کی نسبت میں جیسا اپنے شیخ سے دریافت کیا تھا متوجہ رہتا تھا لیکن کبھی کبھی دل میں آتا تھا کہ آیا یہی نسبت خاصۂ حضرات نقشبند ہے یا اس سے علاوہ بھی کچھ اور شے ہے۔ اسی فکر میں ایک دن میں جامع مسجد سنبھل میں مراقب تھا۔ میں نے واقعہ میں دیکھا کہ دو نورانی مرد ظاہر ہوئے اور فرمانے لگے یہی نسبت ہے۔ اس کے بعد آرام اور دلجمعی حاصل ہو گئی۔ سید قطب الدین فرماتے تھے کہ میرے والد سید عبد اللہ۔

شاہ جمال عاشق[1] خلیفہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے فرزندان مادری میں سے تھے۔ قدس اللہ اسرارہم۔ ''ثمرات القدس'' کی روایت ہے کہ شاہ جمال نے ملامتیہ کی روش پر زندگی گزاری ہے۔ وہ سلطان علاء الدین کے لشکر میں لشکری تھے۔ جب سلطان قلعہ چتوڑ کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا محاصرہ لمبا ہو گیا۔ ایک رات کو دعا کر کے سو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ یوں فرما رہے ہیں۔ ''اس قلعے کی فتح میرے فرزندوں میں سے ایک کی دعا سے وابستہ ہے جس کا نام (سید) جمال الدین ہے۔ سلطان نے عرض کیا کہ اس نام کے لوگ تو بہت سے ہیں میں ان کو کیسے پہچانوں گا فرمایا کل ایک پاس رات گزرنے کے بعد بڑی سخت ہوا چلے گی چنانچہ سب خیمے اکھڑ جائیں گے علاوہ ان کے خیمے کے۔ اور کسی خیمے میں بھی چراغ جلتا باقی نہ رہے گا مگر ان کے خیمے کا۔ سلطان نے تیز ہوا کے موقع پر انھیں اسی علامت سے شناخت کر لیا اور جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ان سے عرض کیا۔ انھوں نے فرمایا ہمارے حال کا اخفا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی تک درست ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی انکشاف فرما دیا، ہم بھی اسی سے خوش ہیں۔ پھر بادشاہ کا ہاتھ پکڑا اور بولے۔ ہتھیار سنبھال لیں

1 سید جمال عاشق قاضی نظام الدین قریشی امروہوی کے خسر تھے۔ (بحوالہ تذکرۃ الکرام ص 234)

اور جنگی گھوڑے پر سوار ہوں۔ سلطان نے وہی کیا وہ آگے بڑھے دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ ابھی دعا سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ قلعے نے ہر طرف سے دھسنا شروع کر دیا۔ پھر وہاں سے ایسے غائب ہوئے کہ مدتوں تک اُن کا کہیں پتہ نشان نہ ملا۔ آخر میں شہر سردہ میں ظاہر ہوئے ایک دن ایک قوال کوئی غزل پڑھ رہا تھا۔ انھیں شدید غلبہ وجد ہوا اور رقص کناں دریا کے پانی پر چل کر پار اُتر گئے۔ جب افاقہ ہوا، کشتی میں بیٹھ کر واپس اُسی جگہ آئے۔ بعدۂ قصبہ سرسی میں آ کر رہنے لگے۔ اور جب تک زندہ رہے وہیں رہے۔ 697ھ (1298) میں وفات ہوئی۔ ''سیدی جمال عاشق باللہ بود'' ان کی تاریخ وفات ہے اور قبر بھی اسی قصبہ سرسی میں بنی۔

''یزاء و یتبرک'' سید قطب الدین نے فرمایا کہ میرے والد اول شیخ احمد کے طریقہ شطاریہ میں مرید تھے اس کے بعد شیخ تاج الدین کے مرید شیخ عبدالرحمٰن سے سلسلہ نقشبندیہ میں منسلک ہو گئے تھے۔ بڑے پُر ذوق اور اہل حال تھے۔ تہجد میں اس قسم کے اشعار خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے

اے ز وصلت عارف مطلق شدم　　عارفی رفتہ تمامی حق شدم[2]

جب ان کے دل پر محبت و شوق کا غلبہ ہوتا تو کہا کرتے۔ ''افسوس تیس سال علم ظاہری میں صرف ہو گئے۔'' اوائل میں ایک روز شیخ احمد نے خوش ہو کر ان سے کہا ''ہم سے کچھ چاہ'' کیونکہ ان کے بہت سے فرزند بچپن میں ہی گزر گئے تھے۔ اپنی اہلیہ کے مشورے سے عرض کیا کہ ''پسر مقبول چاہتا ہوں۔'' فرمایا۔ ''ہوگا'' اس کے بعد میں پیدا ہوا۔ جب میں پانچ سال کا ہو گیا ایک دن میں نے (دیکھا اور) کہا۔ ''میری خالہ مر گئی ہیں۔'' دوسرے دن افغان پور سے خبر آئی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی پانچ سال کی عمر میں ایک دن میں نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ میرے دادا کا وصال ہو گیا اور انھیں آسمان پر لے گئے ہیں۔ تین دن کے بعد اس خبر کی بھی تصدیق ہو گئی کہ میرے دادا نے وطن سے 43 میل دور راہ سفر میں جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ایک جگہ سے دو کوزہ شہد خریدا اور چاہتے تھے کہ گھر

1　یہی واقعہ جوں کا توں حضرت خواجہ نظام الدین شہید رن تھمبوری ابن حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ سے بھی منسوب ہے اور اسی سبب سے انھیں ''شہید رن تھمبور'' کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

2　اے اللہ میں تیری قربت کے سبب عارف مطلق ہو گیا۔ آخر عارف بھی ختم ہو گیا مکمل حق ہی ہو گیا۔

بھیجیں تا کہ میری والدہ جو امید سے تھیں[1]، استعمال کریں۔ ایک دن وہ سارا شہد حاضرین کو تقسیم کر دیا۔ میرے والد کے مرید شیخ عبداللہ نے دریافت کیا۔ جس غرض سے خریدا تھا روانہ کیوں نہ کیا۔ بولے وہ ضرورت اور وہ بی بی دونوں رخصت ہو گئے۔ اسی مدت میں میری ان والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ جب میں چھ سال کا تھا میرے والد نے میری والدہ صاحبہ سے کہا کہ اس لڑکے کی اچھی طرح پرورش اور نگہداشت رکھنا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ اسی حال میں فرمانے لگے۔ ''ہم حاضر ہوتے ہیں، ابھی آتے ہیں۔'' اسی سال 1040ھ (1631) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ شیخ فیروز سے مجھے بڑا اتحاد قلبی ہے اور خوب صحبتیں رہتی ہیں اکثر اوقات باہم اپنے شیخ کی خدمت میں آتے جاتے ہیں اور دیگر مقامات پر بھی باہم ملاقات اور اچھی صحبت رہتی۔

محمد صادق فرید آبادی

وہ سنبھل کے ہی ہیں۔ ان کی والدہ سید زادی تھیں۔ اُن کے والد شیخ محمد بادل کو شیخ فرید بخاریؒ نے کسی وقت فرید آباد میں آباد کر دیا تھا۔ اور وہاں کی آبادی اور عمارات پر حاکم بنا دیا تھا۔ ان کے دادا شیخ محمود جلال نے شیخ بہاء الدین مجذوب بامعنی کی صحبت اُٹھائی تھی۔ ایک دن اُن مجذوب نے کہا ''شیخ محمود جلال بادل خدمت می کند (شیخ محمود جلال دل سے خدمت کرتے ہیں)۔ اس کے بعد ہی ان لقب کا بادل پڑ گیا۔ ان کی ساری اولاد نیکوان وقت گزری ہے۔ محمد صادق میرے شیخ کے مریدوں میں سے تھے اور میرے چچیرے بھائی تھے۔ چند دن میں ہی احوال عظیم پیدا کر لیے اور اس راہ کے بہت سے عجائبات انھوں نے دیکھ لیے تھے۔ ایک دن ایک مرید نے ان کے اور دوسرے مریدوں کے احوال کے بارے میں میرے شیخ سے استفسار کیا۔ میرے شیخ نے جواباً فرمایا کہ وہ اس راہ میں تازی گھوڑے کی طرح تیز رو ہے اور دوسرے اسپ ترکی کی طرح سج سنور کر وقار سے چلتے ہیں۔ میرے شیخ ان کی بہت تعریف کرتے تھے اور فرمایا کرتے ہیں کہ انھوں نے بہت تھوڑی مدت میں ایسے احوال غریبہ خود میں پیدا کر لیے تھے جو دوسروں کو سالوں سال بھی پیش نہیں آتے۔ وہ صاحب دعا و توجہ بزرگوں میں سے تھے۔ نہایت با اخلاق، صاحب مروت، صاحب وقار اور اہل فتوت تھے۔ ایک بار وہ مجھے اور میرے شیخ کو دہلی

---

1 غالباً یہ ان کی سوتیلی ماں تھیں، انھیں بھی وہ والدہ ہی کہتے ہوں گے (واللہ اعلم)

سے فرید آباد کی سیر کے لیے لے گئے اور کئی دن تک خوب ضیافت، خدمت شائستہ بجالائے اور اپنی اہلیہ کے لیے تلقین ذکر کی درخواست کی۔ میرے شیخ نے فرمایا۔ گھر کے اندر (اہلیہ کو سامنے بٹھا کر) خود متوجہ ہوں میں باہر سے توجہ کرتا ہوں۔ جب ایسا ہوا ان کی اہلیہ کو بے خودی طاری ہوگئی اور واقعے میں دیکھتی ہیں کہ ایک بزرگ سفید ریش، نورانی حاضر ہیں اور اُن سے کہہ رہے ہیں کہ بی بی تیری عاقبت بخیر ہوگی اور تو بہت صالحہ اور مخیّرہ ہے۔ ایک دن محمد صادق میرے شیخ کے پاس آئے یہاں انھیں بہت تیز بخار چڑھ آیا۔ رخصت لے کر واپس فرید آباد چلے گئے۔ چند دن تک بیماری میں رہ کر، اچھی اچھی نصیحتیں کرتے کرتے 1061ھ (1651) میں چل بسے۔ میں نے یہ قطعہ تاریخ وفات کہا۔

دردا بسا جوان بزمین خاک گشتہ است	کز خاک شان شدہ بجہان بیشمار خشت
مجموعہ مروّت و حلم و وفا وجود	رفت از جہان چون صادق بادِل نکو سرشت
در ماتمش شدہ جگر و سینہ ہا کباب	لیکن چہ سود زانکہ چنین بود سر نبشت
کردم ز دلِ سوال چو از سالِ فوتِ او	دل در جواب گفت بگوشد گل بہشت[1]

ان کے دو بڑے بھائی محمد صالح اور محمد فاضل نام کے تھے۔ محمد صالح اپنے زمانے کے نیک، شریف، صاحب ہمت وفتوت اور اخلاق ومروت کی تصویر تھے۔ انھوں نے بہت سے مشائخ کو دیکھا اور صحبت اٹھائی تھی۔ شیخ کمال متوکل کے بھائی شیخ محمد عادل کی دختر ان کے گھر میں سے تھیں۔ آپس میں اُن کی نسبتیں ہیں۔ میرے شیخ کے بڑے نیاز مند تھے اور صاحب اخلاص۔ کبھی کبھی اُن کی صحبت میں تشریف لاتے تھے۔ ایک بار شیخ کے ساتھ اکبرآباد (آگرہ) بھی گئے تھے اور شیخ کا دل جیت لیا تھا میرے شیخ ان کو نیکوکار کہا کرتے تھے۔ اُن کی تاریخ وفات 18/ ربیع الاوّل 1075ھ (1665) ہے۔ میں نے ان کی تاریخ وفات کہی

---

1 افسوس ایک ایسا نوجوان زیر زمین چلا گیا ہے کہ جس کی (وجود) خاک سے بیشمار تعمیرات جہان وجود میں آگئیں تھیں۔ جب صادق صاحب دل، نکوسرشت دنیا سے رخصت ہوئے تو گویا علم، وفا، مروت اور جود کا مجموعہ ہی چلا گیا۔ ان کے ماتم میں جگر اور سینے کباب ہوگئے ہیں لیکن اس ماتم سے کیا فائدہ جو (قسمت میں) لکھا تھا ہوگیا۔ جب میں نے دل سے اُن کی تاریخ وفات معلوم کی تو دل نے جواب میں کہا ''شد گل بہشت'' 1061ھ (1651)

قطعہ

شیخ صالح محمد بادِل اہل جود و یگانہ و یک رو
چون برفت از جہان عزیزان را در جہاں گشت ماتمش ہر سو
سال فوتش چون از خرد جستم بخردم گفت ''شیخ صالح کو''[1]

1065ھ

شیخ محمد صالح نے ایک بار فرمایا کہ شیخ فرید بخاری کی وفات کے بعد میں مضطرب ہوگیا کہ اُن کے سایۂ دولت میں جمعیت تمام سے رہتا تھا۔ اسی حال میں شیخ بہاء الدین بودلہ کو خواب میں دیکھا کہ مجھے دو رغیف (روٹیاں) مع حلوای تر دے کر فرمایا'' لے کھا، اور اپنی جگہ مستقیم رہ۔'' اسی وقت سے میں نے کسی کی نوکری نہیں کی اور جمعیت و آرام کے ساتھ فرید آباد میں بیٹھا ہوا ہوں۔ محمد فاضل اعجوبۂ روزگار تھے۔ اپنے دور کے نوجوانوں میں خوش صحبت، خوش کلام۔ فارسی اور ہندی میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔ میں ہندی زبان اور اس کی اصناف میں اُن کا شاگرد ہوں وہ بڑے صاحب فنون عجیبہ و غریبہ تھے۔ ایک دن دیبائے فرنگی کے نقوش کو ایک کاغذ پر اتار لائے اور پھر اس سے وہ ہی نقش بعد میں ایک پارچے پر اتار دیا۔ میں نے ان کا بنا ہوا وہ کپڑا دیکھا تھا اس کی بناوٹ اور نگارش سے عقل حیران ہوتی تھی۔ ستار کو اپنے ہاتھ سے بناتے اور خود بجاتے تھے۔ ہندی اشعار کیا خوب تر اور سبک تر کہتے تھے۔ چنانچہ اس فن کے اہل ان کے شیفتہ و فریفتہ تھے۔ ہمت بلند رکھتے تھے۔ بہت سے غربا اور مساکین اُن کے ذریعہ پلتے تھے۔ میں نے بر سر بازار نخاس لاہور ''ملا ماہم'' نام کے ایک مجذوب کو جو کہ صاحب فنون عجیبہ و غریبہ تھا، دیکھا ہے۔ ایک دن میرے شیخ مجھے اور دیگر دوستوں کو اس کے پاس لے گئے تا کہ اس کے عجیب کاموں کو دیکھیں۔ پہلے اس نے ایک بیاض نکالی کہ ریشم کے کاغذ پر بہت سے شعر لکھے ہوئے تھے۔ اس بیاض کے صنائع و بدائع میں یہ بات تھی کہ ہر صفحے پر شعروں کو اس طرح لکھا تھا کہ وہ کہیں پھول نظر آتے تھے، کہیں سرو کے درخت، کہیں تھالی کے نقوش کی طرح۔ اور بھی اسی

---

1 جب شیخ محمد صالح بادِل جو کہ اہل جود، یگانہ روزگار اور مخلص تھے دنیا سے گئے تو دوستان خدا کے لیے تمام جہان ماتم کدہ بن گیا۔ جب ان کے فوت کی تاریخ پر میں نے غور کیا تو یہ سمجھ میں آئی ''شیخ صالح کو'' 1065ھ (شیخ صالح کہاں گئے)

طرح کے نقش ونگار تھے۔اس کاغذ کا دو(تہائی) حصہ لکھاہوااور ایک حصہ سفید چھوڑا ہوا تھا۔عجب بات یہ تھی کہ وہ کہتا تھا کہ اس 2/3 حصے میں ایک لاکھ بیس ہزار شعر درج ہیں حالانکہ اس کتاب کی ایسی بڑی ضخامت بھی نہ تھی۔اس کے بعد ایک قلم دان نکالا کہ قلم تراش، قینچی اور دوسرے آلات بھی اس نے خود بنائے تھے۔اس قلمدان کے غلاف کو اس نے سنگ عقیق سے اس ہنر کے ساتھ ایسا ملا کر بنایا تھا کہ اس کے 62 ٹکڑے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک نظر آتے تھے۔شیخ محمد فاضل نے تفنگ بھی بنائی تھی۔ان کے پاس مختلف اقسام کے ڈھیروں تیر وکمان تھے۔تیر کو قواعد مقررۂ فن تیراندازی کے ساتھ چلاتے تھے۔تیراندازوں کا کہنا ہے اس فن میں اگر چند چیزیں ایک ساتھ مل جائیں تو کامل تیرانداز کہلائے گا یعنی تیراندازی۔زودِاندازی، باریک اندازی، برق اندازی، غرق اندازی، دوراندازی، پست اندازی اور جمع اندازی۔ واقعی وہ اُن سب میں خوب ماہر تھے۔ القصہ اُن کے کاموں سے انسانوں کی عقلیں حیران تھیں۔ایک دن اُن محمد فاضل کی ایک باقی نام نوجوان سے کہا سنی ہوگئی۔باقی نے ان کے سینے پر ایک زخم کاری لگایا اور وہ (اچانک)1027ھ(1618)میں دنیا سے کوچ کر گئے۔

میں نے اُن کی استفہامی تاریخ ایما سیاق واقعات کی روشنی میں یہ کہی ہے

چون فاضل را باقی زخمے بجگر در زد صہبائے شہادت خورد از دست اجل ساقی
ز ایماء سیاق و ہم از شیوہ استفہام ہاتف بدلم گفتہ کو فاضل ما باقی

فاضل کی شہادت کے بعد باقی کو اس جگہ سے نکال دیا گیا جہاں وہ سکونت پذیر تھا۔باقی کو سکتے کی بیماری ہوگئی اور اس کی جان پر بن آئی۔جلنے کے دو داغ اس کے سرین اور پیروں کی پشت پر لگے ہوئے ظاہر ہوئے۔ میں نے بھی وہ داغ دیکھے تھے اور باقی سے اُن کی کیفیت معلوم کی تھی۔اس نے کہا تھا۔فرشتے مجھے لے گئے اور کہا کہ باقی ابھی تیرے (دنیا میں رہنے کے) چند روز باقی ہیں۔مجھے چھوڑ دیا لیکن یہ داغ لگا دیے۔اس واقعے کے چند روز بعد وہ باقی بھی گزر گیا۔

اگر دشمن نسازد با توائے دوست تو ی باید کہ با دشمن بسازی
و گر نہ چند روزے صبر فرما نہ او ماند نہ توی فخر رازی [1]

---

1 اے دوست! اگر دشمن تجھ سے بگاڑ کر رکھے تو تو اس سے بنا کر رکھ ورنہ چند روز صبر کر نہ تو رہے گا نہ وہ۔

قطعہ

شیخ صالح محمد بادِل اہل جود و یگانہ و یک رو
چون برفت از جہان عزیزان را در جہاں گشت ماتمش ہر سو
سال فوتش چون از خرد جستم عرزدم گفت ''شیخ صالح کو''[1]

1065ھ

شیخ محمد صالح نے ایک بار فرمایا کہ شیخ فرید بخاری کی وفات کے بعد میں مضطرب ہو گیا کہ اُن کے سایۂ دولت میں جمعیت تمام سے رہتا تھا۔ اسی حال میں شیخ بہاء الدین بودلہ کو خواب میں دیکھا کہ مجھے دو رغیف (روٹیاں) مع حلوای تر دے کر فرمایا'' لے کھا، اور اپنی جگہ مستقیم رہ۔'' اسی وقت سے میں نے کسی کی نوکری نہیں کی اور جمعیت و آرام کے ساتھ فرید آباد میں بیٹھا ہوا ہوں۔ محمد فاضل اعجوبۂ روزگار تھے۔ اپنے دور کے نوجوانوں میں خوش صحبت، خوش کلام۔ فارسی اور ہندی میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔ میں ہندی زبان اور اس کی اصناف میں اُن کا شاگرد ہوں وہ بڑے صاحب فنون عجیبہ وغریبہ تھے۔ ایک دن دیبائے فرنگی کے نقوش کو ایک کاغذ پر اتار لائے اور پھر اس سے وہ ہی نقش بعد میں ایک پارچے پر اتار دیا۔ میں نے ان کا بنا ہوا وہ کپڑا دیکھا تھا اس کی بناوٹ اور نگارش سے عقل حیران ہوتی تھی۔ ستار کو اپنے ہاتھ سے بناتے اور خود بجاتے تھے۔ ہندی اشعار کیا خوب تر اور سبک تر کہتے تھے۔ چنانچہ اس فن کے اہل ان کے شیفتہ و فریفتہ تھے۔ ہمت بلند رکھتے تھے۔ بہت سے غربا اور مساکین اُن کے ذریعہ پلتے تھے۔ میں نے بر سر بازار نخاس لاہور ''ملا ماہم'' نام کے ایک مجذوب کو جو کہ صاحب فنون عجیبہ و غریبہ تھا، دیکھا ہے۔ ایک دن میرے شیخ مجھے اور دیگر دوستوں کو اس کے پاس لے گئے تا کہ اس کے عجیب کاموں کو دیکھیں۔ پہلے اس نے ایک بیاض نکالی کہ ریشم کے کاغذ پر، بہت سے شعر لکھے ہوئے تھے۔ اس بیاض کے صنائع و بدائع میں یہ بات تھی کہ ہر صفحے پر شعروں کو اس طرح لکھا تھا کہ وہ کہیں پھول نظر آتے تھے، کہیں سرو کے درخت، کہیں تھالی کے نقوش کی طرح۔ اور بھی اسی

---

1 جب شیخ محمد صالح بادِل جو کہ اہل جود، یگانہ روزگار اور مخلص تھے دنیا سے گئے تو دوستان خدا کے لیے تمام جہان ماتم کدہ بن گیا۔ جب ان کے فوت کی تاریخ پر میں نے غور کیا تو یہ سمجھ میں آئی ''شیخ صالح کو'' 1065ھ (شیخ صالح کہاں گئے)

طرح کے نقش ونگار تھے۔ اس کاغذ کا دو (تہائی) حصہ لکھا ہوا اور ایک حصہ سفید چھوڑا ہوا تھا۔ عجب بات یہ تھی کہ وہ کہتا تھا کہ اس 2/3 حصے میں ایک لاکھ بیس ہزار شعر درج ہیں حالانکہ اس کتاب کی ایسی بڑی ضخامت بھی نہ تھی۔ اس کے بعد ایک قلم دان نکالا کہ قلم تراش، قینچی اور دوسرے آلات بھی اس نے خود بنائے تھے۔ اس قلمدان کے غلاف کو اس نے سنگ عقیق سے اس ہنر کے ساتھ ایسا ملا کر بنایا تھا کہ اس کے 62 ٹکڑے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک نظر آتے تھے۔ شیخ محمد فاضل نے تفنگ بھی بنائی تھی۔ ان کے پاس مختلف اقسام کے ڈھیروں تیر وکمان تھے۔ تیر کو قواعد مقررۂ فن تیراندازی کے ساتھ چلاتے تھے۔ تیراندازوں کا کہنا ہے اس فن میں اگر چند چیزیں ایک ساتھ مل جائیں تو کامل تیرانداز کہلائے گا یعنی تیراندازی۔ زود اندازی، باریک اندازی، برق اندازی، غرق اندازی، دور اندازی، پست اندازی اور جمع اندازی۔ واقعی وہ اُن سب میں خوب ماہر تھے۔ القصہ اُن کے کاموں سے انسانوں کی عقلیں حیران تھیں۔ ایک دن اُن محمد فاضل کی ایک باقی نام نوجوان سے کہا سنی ہوگئی۔ باقی نے ان کے سینے پر ایک زخم کاری لگایا اور وہ (اچانک) 1027ھ (1618) میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ میں نے اُن کی استفہامی تاریخ ایما سیاق واقعات کی روشنی میں یہ کہی ہے

چون فاضل را باقی زخمے بجگر در زد صہبائے شہادت خورد از دست اجل ساقی
ز ایماء سیاق و ہم از شیوہ استفہام ہاتف بدلم گفتہ کو فاضل ما باقی

فاضل کی شہادت کے بعد باقی کو اس جگہ سے نکال دیا گیا جہاں وہ سکونت پذیر تھا۔ باقی کو سکتے کی بیماری ہوگئی اور اس کی جان پر بن آئی۔ جلنے کے دو داغ اس کے سرین اور پیروں کی پشت پر لگے ہوئے ظاہر ہوئے۔ میں نے بھی وہ داغ دیکھے تھے اور باقی سے اُن کی کیفیت معلوم کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ فرشتے مجھے لے گئے اور کہا کہ باقی ابھی تیرے (دنیا میں رہنے کے) چند روز باقی ہیں۔ مجھے چھوڑ دیا لیکن یہ داغ لگا دیے۔ اس واقعے کے چند روز بعد وہ باقی بھی گزر گیا۔

اگر دشمن نسازد با توائے دوست تو می باید کہ با دشمن بسازی
دگر نہ چند روزے صبر فرما نہ او ماند نہ توی فخر رازی [1]

---

1 اے دوست! اگر دشمن تجھ سے بگاڑ کر رکھے تو تو اس سے بنا کر رکھ ورنہ چند روز صبر کر نہ تو رہے گا نہ وہ۔

حافظ صادق کشمیری

وہ میرے شیخ کے یارانِ طریقت میں سے ہیں۔ میرے شیخ نے اوّل ان کو حضرات خواجہ نقشبند کا بتایا ہوا یہ ختم تمام کرنے کا حکم دیا۔ کہ روزانہ "اللہ اللہ اللہ محمد الرسول اللہ" ہزار بار پڑھیں اور رات کو بھی ہزار بار شبانہ اللہ، اللہ اللہ محمد الرسول اللہ پڑھیں۔ میرے شیخ کو یہ ورد خواجہ حسام الدین سے اور ان کو حضرت شیخ صالح جہری سے اور ان کو خواجہ عبدالصبورؒ سے ملا ہے۔ کلام مجید کے حافظ ہیں۔ بڑی دلکش آواز ہے اور پڑھنے میں قواعد تجوید کا لحاظ کرتے ہیں۔ ایک دن ان کی پُر کیف قرأت سن کر میرے شیخ کا دل اُن سے بہت خوش ہوا اور انھیں مقبول خاطر فرمالیا۔ انھوں نے فجر کی پہلی رکعت میں سورۂ کہف کا آخری رکوع پڑھا تھا اور دوسری میں سورۂ حشر کا آخری رکوع۔ نماز کے بعد میرے شیخ پر گریہ طاری ہو گیا اور بہت روئے۔ یہ گریہ ایک غیر معمولی گریہ تھا۔ حافظ صادق کشمیری کے علاوہ ایک حافظ مہر علی تھے وہ بھی میرے شیخ کے یارانِ طریقت میں سے تھے۔ بہت اچھا قرآن پڑھتے تھے۔ نامراد اور غریب تھے اور غریبی ہی کی حالت میں 1060ھ (1650) میں دنیا سے سفر کیا۔ سنبھل میں شیخ بھکاری نام کے ایک حافظ تھے نہایت دلکش، روح بخش اور خوش آئند آواز کے ساتھ قرأت قرآن کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کسی دوسرے شہر میں ایک عامل جن کو مسخر کرنے کے لیے وظیفہ تسخیر پڑھا کرتا تھا۔ ایک بار اس جن کے پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ جب آیا پوچھا۔ جلدی کیوں نہ پہنچا۔ جواب دیا۔ حافظ بھکاری سنبھل میں اپنی دلکش و دلفریب آواز میں قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر وہاں ٹھہر گیا تھا۔ یہ سن کر وہ عامل سنبھل آیا، ان کی تلاوت سنی اور بہت محظوظ ہوا۔ حافظ بھکاری کا ایک بیٹا تھا۔ شیخ عماد نام کا وہ بھی بہت خوش آواز تھا جب دنیا سے گیا "با حافظ" (992ھ/ 1584) اس کی تاریخ وفات کہی گئی۔ آج حافظ صادق کشمیری وارستہ، آزاد اور صاحب معنی لوگوں میں گنے جاتے ہیں۔ میرے شیخ کے رسائل توحید کو خود میرے شیخ کو سنایا ہے۔ بلند اور روشن آواز کے حامل ہیں۔ حصول دین کے لیے سفر کرتے ہیں، فقرا اور مشائخ سے صحبت رکھتے ہیں لیکن غایت درجہ گمنامی پسند مزاج کی وجہ سے کسی جگہ بھی کسی سے اپنی نسبت روحانی کا ذرا سا نشان بھی نہیں بتاتے۔ باوجودِ کثرت اہل و عیال اور کم معیشتی، کوئی اندیشہ فکر معاش ان کی ہمت مردانہ کا دامن گیر نہیں ہوتا۔

ہر حال میں راضی خوشی رہتے ہیں۔ ایک دن دہلی میں کسی نے اُن کے سر پر کچھ مار دیا۔ انھوں نے صبر اختیار کیا بلکہ راضی بہ رضائے الٰہی رہے۔ لوگوں نے چاہا کہ اس ظالم کو سزا دیں مگر انھوں نے نہ مانا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے

بدی را بدی سہل باشد جزا　　اگر مردی احسن الی من اساء [1]

شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے بوستان میں اسی معنیٰ میں یہ حکایت بھی بیان کی ہے۔

یکے بر بطے در بغل داشت مست　　بشب بر سر پارسائے شکست
چون روز آمد آن نیک مرد سلیم　　بر سنگدل برد یک مشت سیم
کہ دو شینہ مغرور بودی و مست　　ترا بربط و مر مرا سر شکست
مرا بہ شد آن درد و برخاست بیم　　ترا بہ نخواہد شد الّا بسیم
ازین دوستانِ خدا بر سر اند　　کہ از خلق بسیار بر سر خورند [2]

نقل ہے کہ کسی بے ادب نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے رخسار پر ایک طمانچہ مار دیا۔ امام نے اپنے شاگردوں سے کہا۔ ''میں اس حال کی اطلاع حاکم کو کر کے سزا دلوا سکتا ہوں لیکن میں شکایت نہ کروں گا۔ اور یہ بھی کر سکتا ہوں کہ انصاف وحق کے آگاہوں کی طرح درد دل کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر کے اس سے انتقام لے لوں مگر میں یہ بھی نہ کروں گا۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کل قیامت کے دن اگر میں عذاب سے چھوٹ گیا بغیر اس کے ہرگز جنت میں قدم نہ رکھوں گا۔'' حافظ محمد صادق کا مجھ پر بڑا لطف وکرم ہے۔ ان کی جو عنایات میرے شامل حال ہیں میں نہ تو اُن کو بیان ہی کر سکتا ہوں اور نا ہی کما حقہ شکر بجا لا سکتا ہوں۔

---

1 بروں کو ان کی برائی کی سزا دینا آسان ہے۔ اگر تو واقعی مردانِ راہ خدا میں سے ہے تو جو تیرے ساتھ برائی کرے تو اس سے بھلائی کر۔

2 ایک رات کسی نے مستی شراب میں اپنی بغل کا بربط ایک پارسا کے سر پر مار کر توڑ ڈالا جب دن نکلا وہ بھولا نیک دل آدمی اس سنگ دل کے پاس ایک مٹھی چاندی لے کر حاضر ہوا اور بولا کل رات تیرے سر میں سودا تھا اور تو مست تھا۔ تو نے بے خودی میں اپنا بربط توڑ دیا اور میرا سر زخمی کر دیا۔ میرا درد ورنج تو جاتا رہا۔ مگر تیرا بربط بغیر مال خرچ کیے درست نہ ہوگا۔ اس لیے یہ چاندی لایا ہوں۔ دوستان خدا انھیں صفات کی وجہ سے عالی مرتبہ ہیں کہ مخلوق کی ایذائیں سہتے رہتے ہیں۔

شیخ محبّ نبی

میرے شیخ کے صحبت داروں میں سے ہیں۔علوم ظاہر و باطن کے عالم ہیں۔شیخ کے رسائل توحید کو شیخ کے آگے پڑھا ہے۔نہایت متواضع منکسر المزاج اور شکستہ خاطر ہیں۔کیا خوب طریقہ اخفا حال رکھتے ہیں۔بہت کم لوگ ان کے حال کی اطلاع رکھتے ہیں۔بڑے عالی ہمت ہیں۔فن طالب علمی ان کے حال باطنی کا حجاب بن گیا ہے۔حسن صورت پر مائل ہیں۔میں ان سے خوب واقف ہوں وہ بھی میرے ساتھ لطف اور دوستی کا برتاؤ رکھتے ہیں۔ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس راہ میں میں نے پندرہ دن کلوخ (ڈھیلے) کھائے ہیں۔انھیں جیسے ایک شخص کو میں جانتا ہوں صوفی داؤد کشمیری مرید خواجہ محمود، وہ بھی ہمیشہ حسن و جمال میں مبتلا اور (قلبی طور پر) آزاد و مجرد ہیں۔اس سب کے باوجود شریعت کے آداب میں سے کوئی ادب اُن سے نہیں چھوٹ سکتا۔میرے شیخ کے بیٹے خواجہ سلام اللہ کی صحبت میں رہتے ہیں۔اس حالتِ درویشی، تنگدستی اور حسن مجازی میں گرفتاری کے ہوتے کسی کے محتاج اور ملتجی نہیں ہیں اور کسی سے کچھ طلب نہیں رکھتے بلکہ جو چیز بھی دست غیب سے انھیں پہنچتی ہے۔اہل حسن، فقرا اور درویشوں پر صرف کر دیتے ہیں۔اُن کا یہ بھی قول ہے کہ میں نے ایک بار راہ محبت میں لگاتار 12 ردن رات کچھ نہیں کھایا۔ایسے ہی میرے اقربا میں سید عبدالعزیز ہوئے ہیں۔شیخ مرتضٰی سنبھلی کے صحبت یافتہ تھے اور میرے شیخ کے آشناؤں میں سے تھے۔شریعت، طریقت اور معرفت میں مستقیم الحال۔ان کا یعنی محبّ نبی کا کہنا ہے''جب احکام شریعت میں افعال طریقت آ ملتے ہیں۔شریعت فراموش ہو جاتی ہے۔جب احوال حقیقت پیش آتے ہیں، افعال طریقت رخصت ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ جب دودھ کو جمالیا جاتا ہے اسے دہی کہتے ہیں جب اس سے گھی نکال لیا جاتا ہے گھی کہتے ہیں دہی نہیں کہتے۔میں اُن سے کہتا کہ صوفیہ محققین کا مقررہ اصول ہے کہ جب شریعت، طریقت اور حقیقت اجتمائی صورت پیدا کر لیتی ہے''معرفت'' کہلاتی ہے۔ان تینوں امور ثلثہ شریفہ کا جمع کرنا مردم اقویا کا کام ہے۔بس

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن[1] بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق

خواجہ ابرار کبھی کبھی خواجہ حافظ شیرازی کا یہ شعر بڑے ذوق کے ساتھ پڑھا کرتے تھے

نہ ہر کہ سر بترا شد قلندری داند[2] ہزار نکتۂ باریک تر زمو این جا است

سید محبا نبی اپنے اسی عقیدے پر راسخ تھے اور اسی طریقہ پر قائم۔ شیخ مرتضٰی سے محبت رکھتے تھے۔ غالبًا آخر عمر میں اس عقیدے سے برگشتہ ہوگئے تھے۔ یکم صفر 1059ھ (1649) میں انتقال ہوا۔ جو حال اُن پر طاری تھا میں نے بھی گرمی کے موسم میں اسی حال میں ساٹھ دن رات بغیر پانی پیئے کاٹے ہیں۔

خواجہ عبدالرحیم ماوراءالنہری

بڑے بزرگ، صاحب کرامات وآیات تھے۔ بڑے شاہانہ انداز میں علاقۂ توران میں اُن کی نشوو نما ہوئی۔ ایک دنیا نے ان سے فیوض وبرکات حاصل کیں۔ بہت سے کامل مرید رکھتے ہیں۔ اس دیار کے لوگ ان سے بہت سی کرامتیں بیان کرتے ہیں۔ کتنے مردہ دلوں کو انھوں نے نور حضورو آگاہی سے زندہ فرمایا ہے۔ صوفیۂ محققین کے نزدیک یہ بات مقرر شدہ ہے کہ مردہ دلوں کو زندہ کرنا ایسا ہے جیسے صد سالہ مردے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ کردیا ہو

تو بیک دشنام کارِ صد مسیحا کردۂ گر مسیحا مردۂ را زندہ می کرد از دعا

میرے شیخ کہتے تھے کہ وہ کسی زمانے میں ایران گئے تھے۔ ان کی برکت سے اس دیار کے بہت سے سعادت مند حضرات نے مقام حضورو آگاہی حاصل کیا۔ ان کی غایت بزرگی اور علوشان کا یہ عالم تھا کہ شاہ عباس (صفوی) ان کی رکاب پکڑ کر پیادہ چلتے تھے۔ بادشاہ صاحب قران ثانی شاہ جہاں کے جلوس کے سال جو کہ 1037ھ (1627) ہے ہندستان تشریف لائے تھے، بادشاہ نے ان کے

---

1 ایک ہاتھ میں شریعت کا جام ہے اور دوسرے ہاتھ میں عشق کا ہتھوڑا ہے۔ شیشے اور ہتھوڑے دونوں سے کھیلنا ہر ہوسناک کے بس کا نہیں۔

2 اس راہ میں بال سے بھی باریک ہزاروں نکتے ہیں، یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ جس نے سر منڈا لیا وہ راہِ قلندری کو بھی جانتا ہے۔

استقبال کے لیے اعیان مملکت کو آگے بھیجا تھا اور خود بھی بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آئے اور ایک لاکھ روپیہ ان کی مہمانی پر صرف کیا اور باہم صحبتیں بھی خوب رہیں۔ ایک روز میں نے انھیں دیکھا بڑے عزت و وقار کے ساتھ بادشاہ کے تخت کے نزدیک جلوہ فرما ہیں، بادشاہ نے مہابت خان کے ہاتھ سے پان کے چند بیڑے ان کی خدمت میں پیش کیے انھوں نے لے کر کھا لیے۔ اسی سال وہ حج کے ارادے سے اکبرآباد (آگرہ) سے چلے اور راستے میں دنیا سے بھی چلے گئے۔

خواجہ محمد محسن سمرقندی

وہ خواجہ عبیداللہ احرار قدس سرۂ کے چچا کے بیٹے خواجہ مسعود کی اولاد میں سے ہیں اور قریہ النکر میں سکونت پذیر ہیں۔ آج وہ لاہور، بھیرہ اور خوشاب کے علاقے کے مشہور صاحب نسبت و کیفیت بزرگ ہیں۔ شرافت و لطافت کا نور ان کے طلعت زیبا سے ظاہر و ہویدا ہے۔ (میں جب لشکری تھا تو) ایک سال اور چارہ ماہ ان کے قریے کے جوار میں رہا ہوں۔ قصبہ جاکو میں جب بھی میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا بے حد لطف و عنایت فرماتے تھے۔ دستار اور تبرک وغیرہ بھی عطا فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اُن سے دریافت کیا کہ خواجم! آپ کی جائے پیدائش اور پرورش تو سمرقند اور بخارا ہے اور ہندستان آئے ہوئے برسوں ہو گئے۔ کیا بات ہے کہ دہلی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں آپ نے سکونت اختیار نہ کی۔ فرمانے لگے کہ جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں، میں ہندستان آیا تھا۔ بادشاہ کے وزیر نے مجھ سے ضمانت لی کہ میں اپنے وطن واپس نہ جاؤں گا اور اس قریہ کو مع کھیتی کی زمین کے میری ملک میں دے دیا ہے۔ اور آج بجائے جہاں گیر کے شاہ جہاں بادشاہ ہیں مگر وزیر وہی ہے اب بھی بغیر وزیر کے حکم کے بادشاہ کے ملک سے اپنے وطن واپس جانا ممکن نہیں ہے کیونکہ میں وزیر سے عہد کر چکا ہوں کہ واپس نہ جاؤں گا۔ مجھے یہ پریشانی جدامجد سے نسلاً بعد نسلاً پہنچی ہے جیسا کہ خواجہ شہاب الدین سنامی خواجہ احرار کے جدامجد نے وفات کے وقت اپنی زبان سے بطور پیشن گوئی فرمایا تھا۔ کتاب ''رشحات'' میرے پاس تھی، یہ حکایت جو انھیں یاد تھی میں نے کتاب میں سے سنائی۔ سن کر وہ بہت روئے۔ وہ حکایت یہ ہے کہ خواجہ شہاب الدین سنامیؒ کے دو فرزند تھے خواجہ محمد اور خواجہ محمود۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب ہوا اپنے

بڑے بیٹے سے فرمایا کہ اپنے لڑکوں کو میرے پاس لے آ، تا کہ میں اُن کو وداع کروں۔ خواجہ محمد کے دو صاحبزادے تھے خواجہ اسحاق اور خواجہ مسعود۔ وہ دونوں کو لے کر حاضر ہوئے۔ خواجہ شہاب الدین نے دونوں کو نوازا اور فرمایا۔ محمد تیرے بیٹے بہت پریشانی اور سرگردانی اٹھائیں گے خاص کر مسعود اور خواجہ اسحاق کی اولاد بھی اسی طرح سرگرداں رہے گی۔ اور بھی کچھ ناپسندیدہ (چیزیں) خواجہ محمد کے بارے میں فرمائیں۔ اس کے بعد خواجہ احرار قدس سرۂ کے والد صاحب خواجہ محمود سے جو کہ خواجہ محمد کے برادر خرد تھے فرمایا کہ تو بھی اپنے فرزند کو لے کر آ۔ حضرت خواجہ احرار اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ آپ کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر لائے جب خواجہ شہاب الدین کی نظر آپ پر پڑی تڑپ کر بولے مجھے بٹھاؤ۔ اُن کو بٹھایا گیا۔ انھوں نے آپ کو گود میں لیا اور آپ کے تمام اعضا پر اپنا روئے مبارک ملتے جاتے تھے روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ میں جس فرزند کا طلب گار تھا وہ یہی ہے۔ افسوس کہ اس کے ظہور کے ایام میں میں نہ ہوں گا۔ بہت نزدیک ہے وہ وقت جب اس کی شہرت عالم گیر ہوگی یہ فرزند شریعت محمدی کی ترویج وتجدید کرے گا اور طریقت کو رونق بخشے گا۔ اس زمانے کے سلاطین اس کے حکم پر (سر جھکائیں گے) اور اس کے امر و نہی کو دل و جان سے قبول کریں گے اور جو جو کارہائے نمایاں اس سے وجود پذیر ہوں گے ایسے پہلے مشائخ کبار سے بھی ظہور میں نہ آئے ہوں گے۔ اور جو کچھ حضرت خواجہ احرار پر ابتدا سے انتہا تک گزرنے والا تھا بطور اجمال ایک ایک کو انھوں نے بیان فرمایا۔ اور پھر ایک بار اپنے چہرے کو آپ کے تمام اعضا سے مل کر خواجہ محمود کے حوالے کیا اور انھیں وصیت فرمائی کہ میرے اس فرزند دلبند کا بہت دھیان رکھنا اور تربیت کا جیسا کہ حق ہے اس کی اچھی طرح تربیت کرنا۔ اس کے بعد خواجہ محمد سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تیرے دل میں یہ وسوسہ نہ آئے کہ باپ نے میرے بیٹوں کو اتنا نہ نوازا جتنا کہ محمود کے بیٹے کو نوازا۔ تقدیر میں کیا کلام۔ تیرے بیٹوں کو ایسا ہی بنایا ہے اور محمود کے بیٹے کو اسی طرح کا۔ ''ذالک تقدیر العزیز العلیم'' میں کیا کروں؟ خواجہ محمد محسن کے بیٹے کو میں نے دیکھا تھا اور حیرت میں پڑ گیا تھا کہ اس کے رہن سہن سے اس گاؤں کے لوگ پریشان اور رنجیدہ تھے۔ اور اس کے سارے کام کاج ان لوگوں کی مرضی کے خلاف تھے۔ اس وقت مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ حاجی محمود خیرآبادی جو کہ آزاد منش اور بامعنی شخص ہیں اور انھوں نے مکّے میں شیخ

تاج الدین کی صحبت میں رہ کر آپس میں کتاب ''فصوص الحکم'' کا بغرض تصحیح مقابلہ کیا ہے۔ یہ میرے شیخ کے آشناؤں اور نیازمندوں میں سے ہیں۔ انھوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا جو انھوں نے خیرآباد میں ایک سیاح سے سنا تھا۔ وہ سیاح کہتا تھا کہ ایک دن دوران سفر میرا گزر ایک کوہستان سے ہوا کہ وہاں کے سارے باشندے بے عمل کافروں کی طرح رہتے ہیں۔ میں نے اس ملک کے رئیس کو دیکھا کہ ایک نہایت خوش رو نورانی طلعت نوجوان ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس علاقے کے لوگوں کا دین و مذہب کیا ہے۔ اس نے جواب دیا یہاں کوئی معین دین و مذہب نہیں ہے۔ ہاں ہمارا راجہ ایک کتاب کی پرستش کرتا ہے وہ بھی صرف کھانا کھانے کے وقت اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں۔ اس کتاب کو اس نے ایک برہمن کے حوالے کر رکھا ہے کہ کھانے کے مقررہ وقت پر اس کے سامنے حاضر کرے۔ میں نے اس برہمن سے جان پہچان پیدا کی اور پھر ایک دن اس کتاب کے دیکھنے کی آرزو کی۔ وہ مجھے تنہائی میں لے گیا اور وہ کتاب دکھائی۔ دیکھا تو وہ قرآن مجید ہے جو خط ولایت میں لکھا ہوا ہے اور اس کے ایک طرف یہ لکھا ہوا

''منکہ میر سید محمد م از دست تفرقہائے روزگار آوارہ شدہ در ماہ فلاں وسال
فلاں بدیں کوہستان آمدہ ام''[1]

میں نے وہاں کے دوسرے باشندوں سے پتہ لگایا کہ یہ رئیس اس سید محمد کا پوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سید محمد نے اس سرزمین کے راجہ کی پناہ اختیار کر لی رفتہ رفتہ بہت قربت وعزت حاصل کر لی۔ راجہ کا کوئی وارث نہ تھا راجہ کے بعد سید نے اس کی جگہ لے لی، شادی کی۔ اس کے اولاد ہوئی اور دنیا سے گزر گیا۔ اس کے بعد کوئی مسلمان اس زمین کی طرف نہیں گیا کہ سید محمد کے بیٹوں کو احکام دین اسلام سکھاتا۔ پس کام یہاں تک بگڑا کہ میر سید محمد کی تمام اولاد جاہل رہ گئی۔ جیسا کہ تجربہ کار بزرگوں نے فرمایا ہے۔

جائے در شہر گیر کا نجا بہ سگ شہر از غزال صحرا بہ[2]

---

1 میں جو کہ میر سید محمد ہوں، تفرقہائے روزگار سے پریشان ہو کر فلاں سال فلاں مہینے کو اس کوہستان میں آ گیا ہوں۔

2 شہر میں رہ کہ وہ اچھی جگہ ہے۔ شہر کا کتا بھی صحرا کے ہرن سے اچھا ہے۔

خواجہ عبدالمنعم

وہ میر عبداللہ احراری کے بیٹے ہیں۔ بڑے عالی ہمت، نیک معاملت، پسندیدہ اخلاق بزرگ ہوئے ہیں۔ بادشاہ صاحب قران ثانی شاہ جہاں نے سلیم پور کے چند گاؤں ان کی وجہ کفاف کے لیے انھیں دے دیے تھے۔ انھوں نے اس قصبہ سلیم پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ چھوٹا بڑا جو بھی ان کے پاس آتا بے حد لطف و مہربانی فرماتے۔ اُن کی صحبت میں بڑی تاثیر تھی۔ جو طالب حق بھی ان کی صحبت میں بیٹھتا، بے خودی اور غیبت کی نسبت سے شرف یاب ہوتا۔ ہندی اشعار کا شوق تھا۔ اچھی آواز والے ان کے پاس رہتے تھے۔ میں نے انھیں دیکھا تھا، وجیہ اور نورانی صورت تھے۔ میرے شیخ سے میرے بارے میں خوب تحقیق کی اور دیکھ بھال کی۔ ان کی وفات 1050ھ (1660) میں اور قبر وہیں قصبہ سلیم پور میں ان کے باغ میں ہے۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ میر عبداللہ (احراری) بزرگان وقت میں سے تھے اور قطب الاخیار حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ اور خواجہ بیرنگ کے حقیقی جانشین تھے۔ اوائل میں، میں نے ان کی صحبت اختیار کی ہے۔ ان کا کچھ تذکرہ شیخ قطب عالم کے ذکر کے ضمن میں آئے گا۔ میر عبداللہ کی وفات 1026ھ (1617) میں ہوئی ہے۔ میرے شیخ فرماتے تھے کہ ایک بار جہانگیر بادشاہ نے میر عبداللہ کو دہلی اور آگرے کی حکوت کا صدر بنا دیا۔ وہ اپنے ذاتی کرم و فتوت سے وہاں کے اہالی اور موالی کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کو کارفرما رکھتے تھے۔ شیخ نور نام کے ایک صاحب کا انتقال ہو گیا جو زمین اُن کی ملک میں تھی اس کے بارے میں ان کے متعلقین نے چاہا کہ اُن کے بعد بھی ہماری ملکیت رہے تو اپنے ملنے والوں میں ایک شخص الہداد کو اس بات پر آمادہ کیا کہ خود کو شیخ نور بتا کر تصحیح کرا لے۔ اور چند دن تک اس کو شیخ نور کہہ کر پکارنا شروع کیا تا کہ وقت پر غلطی نہ کھا جاے۔ ایک دن وہ میر عبداللہ کے پاس پہنچا۔ جو ان کے ماتحت (حکام) تھے پہلے انھوں نے ان کی جائیداد کی برقراری کی تصحیح کی (یعنی دستخط کر دیے) جب ان کی باری آئی میر عبداللہ نے پوچھا ''شیخ نور کون ہے'' حاضرین نے شیخ الہداد کی طرف اشارہ کیا، وہ اُٹھے اور میر عبداللہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میر عبداللہ نے دریافت کیا تمھارا کیا نام ہے؟ انھوں نے کہا شیخ الہداد۔ میر مسکرا کر بولے کبھی ایک شخص کے دو نام

بھی ہوتے ہیں اور برقراری پر دستخط کر دیے۔

فرداست وعدہ جنت و امروز شد نصیب　　آرے خلاف وعدہ کریمان چنین کنند[1]

شیخ الہداد اور میر عبداللہ کی یہ حکایت اس واقعہ سے ملتی جلتی ہے جب ایک بار شیخ عبدالحق (محدث دہلوی) نے سید بہوہ[2] بخاری کو خط میں یہ شعر لکھا

منتظرم روز و شب بر سرِ راہ امید　　تا کہ کسے گویدم خیز کہ جانان رسید[3]

سید نے اس خط کو معروف علی دفتری کے سپرد کر دیا اور کہا کہ اس شعر کو یاد رکھ کہ اچھا لگتا ہے۔ ایک دن امرا اور فضلا کا مجمع ان کے مکان پر آیا۔ بڑی اچھی محفل تھی۔ شیخ عبدالحق دہلوی کی بزرگی شان کی بات چل نکلی۔ سید بہوہ بخاری نے فرمایا کہ شیخ نے ابھی حال میں مجھے ایک بہت اچھا شعر لکھ کر روانہ کیا ہے۔ معروف علی کو بلایا۔ اتفاقاً اس وقت وہ ایک بقال سے حویلی کے حساب میں مشغول تھا۔ بقال کہہ رہا تھا کہ تیرے 17 تنکے باقی ہیں اور وہ کہہ رہا تھا کہ اٹھارہ اور آدھا تنکہ۔ اسی اثنا میں ایک آدمی پہنچا اور اس کو اس مجمع امرا و فضلا میں لے گیا سید نے کہا کہ معروف علی وہ شعر جو شیخ عبدالحق نے لکھا ہے، پڑھنا۔ وہ بولا ''ساڑھے اٹھارے تنکے'' سید اور حاضرین حیرت میں پڑ گئے لیکن فوراً میر عبداللہ نے فرمایا۔ تعجب کی کوئی بات نہیں بیچارہ نامراد حویلی کے حساب میں لگا ہوگا اس کا دل اُسی میں منہمک تھا جب کہا گیا شعر پڑھ تو بول اٹھا ساڑھے اٹھارہ تنکے۔ یہ سن کر مجمع ہنس پڑا۔ میں اس زمانے میں مغلان رعنا کے ملک میں مہابت[4] خاں کی سرکردگی کے لیے آئے ہوئے

1　اگرچہ جنت کا وعدہ کل کا ہے مگر آج ہی جنت کا مزہ نصیب ہے۔ ہاں کریم لوگ وقت سے پہلے ہی ایسے وعدہ وفا کر دیا کرتے ہیں۔

2　سید بھوہ بخاری مخاطب بہ ''دین دار خاں'' مرتضیٰ خاں شیخ فرید کے بھتیجے اور جہاں گیری و شاہ جہانی عہد کے امرا میں سے تھے۔

3　میں روز و شب محبوب کی آمد کے انتظار میں سرِ راہ بیٹھا ہوا ہوں کہ کوئی مجھ سے کہے کہ اُٹھ تیرا محبوب پہنچ گیا ہے۔

4　مہابت خاں، خان خانان سید سالار غیور بیگ اندجانی کے بیٹے۔ جہاں گیری دربار کے بڑے امرا میں سے تھے۔ 63 سال کی عمر میں اگست 1634 کو برہان پور میں وفات ہوئی۔ (بحوالہ تاریخ محمدی)

لشکر میں سید بھوہ کے ساتھ تھا۔ ایک دن سید بھوہ شکار میں مصاحبان سے کہہ رہے تھے۔ چند مہینے ہو گئے ہم لوگ کوہ و بیابان میں سرگرداں پھر رہے ہیں۔ لیکن اس مہم کا کوئی انجام کار نظر نہیں آتا کیا رائے ہے۔ اس بارے میں کہ میں رعنا کو لکھوں کہ وہ خود اس مہم کی فکر کرے تاکہ اس سرگردانی سے ہمیں خلاصی مل جائے۔ میں حاضر تھا میں نے بطور مزاح کہا آپ صرف یہ بیت رعنا کو لکھیں تو کافی ہے۔ [1]

صبا بلطف بگو آن غزالِ رعنا را	که سر بکوه و بیابان تو دادۂ مارا

یہ سن کر سید بھوہ اور حاضران مجلس بہت خوش ہوئے اور سید بھوہ نے مجھ پر پہلے سے بھی زیادہ مہربانی کرنی شروع کر دی۔ اس کے بعد ایک دن بغرض شکار صحرا میں گئے۔ وہاں دو بچے دودھ پیتے تندرست و توانا ملے۔ سید کو رحم آیا اور شکار کا ارادہ چھوڑ دیا۔ دونوں بچوں کو اٹھایا اور پالکی میں سوار کر لیا اور بہت ہی تیز رفتار سے چلے تاکہ منزل پر پہنچ کر کسی دودھ پلانے والی کے حوالے کریں۔ ناگاہ راستے میں ایک عورت کو دیکھا کہ لنگڑاتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ دریافت کیا، کیا بات ہے؟ بولی میرے بچوں نے دودھ نہیں پیا ہے میرے پستان میں اتنا دودھ بھر گیا ہے کہ چلنا دوبھر ہو رہا ہے۔ سید نے عورت کو بھی پالکی میں بٹھا لیا حتیٰ کہ دونوں بچے اس کے دودھ سے شکم سیر ہو گئے۔ لوگوں کو رقم دے کر بھیجا اور بچوں کی ماں کو مغلوں کی قید سے رہا کرایا۔ وہ بولی میرے دو بارہ سالہ اور چودہ سالہ بیٹے بھی مغلوں کی قید میں ہیں ان کو بھی رہا کرائیے۔ سید نے ان دونوں کو بھی ایک کثیر رقم کے بدلے چھڑا لیا۔ وہ اُن پانچوں ماں بیٹوں کو لشکر کے ہمراہ رکھتے تھے بعد میں (جب فرصت ملی) اُن کو اُن کے وطن بھجوا دیا یہ واقعہ 1036ھ (1626) کا ہے۔ ''فوائد الفواد'' کی روایت ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ مولانا علاء الدین بداؤنی [2] کے اہل خانہ نے بدایوں کے نزدیک گاؤں سے ایک بوڑھی کنیز خریدی تھی۔ ایک دن وہ کنیز رو رہی تھی۔ مولانا نے دریافت کیا ''تو کیوں رو رہی ہے؟'' بولی ''میرا ایک بیٹا ہے میں اس سے جدا ہو گئی

---

1 اے صبا اس غزال رعنا سے لطف کے ساتھ عرض کر دے کہ تو نے ہی ہمیں کوہ و بیابان میں سرگرداں کر رکھا ہے۔

2 مولانا علاء الدین بدایونی حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کے اساتذہ میں سے تھے۔ آپ نے 940ھ/1534 میں وفات ہوئی۔

ہوں۔'' مولانا نے فرمایا اگر میں تجھے حوض پر چھوڑ دوں جو شہر سے ایک کوس ہے وہاں سے تجھے اپنے گھر کا راستہ معلوم ہے؟ بولی۔'' جانتی ہوں'' مولانا نے علی الصبح اس کو حوض کے کنارے چھوڑ دیا۔ شیخ نظام الدین قدس سرہٗ جب یہاں تک پہنچے آنکھ میں آنسو بھر لائے اور فرمایا۔ علمائے ظاہر اگر چہ اس بات کو درست نہ کہیں (کہ بغیر مالک کی اجازت کے اسے بھگا دیا) مگر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کیسا اعلیٰ کام کیا حضرت شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ نے ہی فرمایا۔ جس وقت کہ مولانا علاء الدین بچے تھے بداؤں کی کسی گلی میں جا رہے تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزی قدس سرہ گھر کی دہلیز پر بیٹھے تھے جب ان کی نظر مولانا پر پڑی بلایا اور جو جامہ خود زیب تن کیے ہوئے تھے مولانا کو پہنا دیا۔ ان کے یہ سب اوصاف واخلاق اسی کی برکات تھیں۔''

سید بھوہ شاہ عالم گجراتی قدس سرہٗ کے پوتے سید محمد کے مرید تھے۔ مخیّر اور فقرا کے نیاز مند بزرگ تھے۔ باوجود حاکم دہلی ہونے کے مشائخ اور درویشوں کی زیارت کو حاضر خدمت ہوتے تھے۔ بزرگوں کے عرسوں کے گرویدہ تھے۔ مجالس عالی برپا کرتے جن میں کلام معرفت الٰہی بھی پیش ہوتا تھا۔ ایک دن اپنے جلودار کے یہاں جو اپنے پیر کا عرس کر رہا تھا۔ تشریف لے گئے میں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ انھوں نے ایک رجسٹر بنا رکھا تھا جس میں یکم محرم سے آخر ذی الحجہ تک اعراس بزرگاں کی تاریخیں درج تھیں اور ہر صبح وہی معروف علی ان سے عرض کرتا تھا کہ آج فلاں فلاں کی تاریخ وفات ہے۔ وہ کھانا تیار کراتے اور فقرا اور درویشوں کی ضیافت کرتے اور بعد فراغ طعام اُن کی ارواح کے لیے فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب کرتے تھے۔ ان کے تفصیلی حالات نسخہ'' تذکرۃ الابرار'' میں جو کہ کسی فاضل عالم کی تالیف ہے درج ہیں۔ اُن کی وفات کے بعد جو کہ 1040ھ (1631) میں ہوئی ایک بزرگ نے اُن کو خواب میں دیکھا بڑا حسین روشن صورت خوش وخرم اور صاحب مرتبہ۔ اُن سے معلوم کیا وہ کیا عمل ہے جس سے اس مرتبے کو آپ پہنچے؟ فرمایا۔ درود شریف کی برکت سے کہ ہر شب تین سو مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھا کرتا تھا اور ہر شب جمعہ کو ہزار بار وہ باوجود مشغولی حکومت دہلی اور خدمت سلطانی کے حافظ کلام مجید بھی ہو گئے تھے۔

خواجہ جامی دہلوی

وہ احمد جام قدس سرہ کی اولاد میں سے ہیں۔ جوانان زمانہ اور عالی ہمت ہیں۔ بظاہر شیخ اور بباطن قلندر ہیں۔ آپ بڑے صاحب مشرب، ظریف الطبع اور صاحب وجاہت ہیں۔ بادشاہ صاحب قران ثانی ان کو اپنے پایۂ تخت کے نزدیک بٹھاتے ہیں اور ان کے طلعت زیبا کے دیدار سے مسرور ہوتے ہیں۔ وہ بے تکلفانہ زندگی گذارتے ہیں اور بے تعلقانہ جیتے ہیں یہ شعر ان پر صادق آتا ہے

تکلف گر نباشد خوش توان زیست　　　تعلق گر نباشد خوش توان مُرد [1]

ہر روز اغنیائے زمانہ سے فتوحات کو بے تکلفانہ قبول کرتے اور حاضرین پر خرچ فرما دیتے۔ جس دن ان کو کچھ فتوح نہیں ہوتا لباس و پیراہن کو گروی رکھ کر نیا دن نئی روزی پر عمل پیرا ہوتے۔ اس دن کا خرچ چلاتے۔ کل کی پرواہ نہیں رکھتے تھے۔ رات کو کوئی بھی چیز کھانے کی اپنے پاس بچی نہیں رکھتے۔ ان کا مشرب اہل دل کی دلربائی تھا۔ ان کی طلب دنیا ''ترکوا الدنیا لدنیا'' کے بر خلاف طلبوا الدنیا للآخرۃ تھی

خوردہ کہ چیزے بر آید زدست　　　بہ از صائم الدہر دنیا پرست [2]

میں نے ان کو 1043ھ (1634) میں سنبھل میں دیکھا تھا۔ کیا ہی معشوقانہ صورت اور قدر شاہانہ رکھتے تھے۔ کیا خوب عارفانہ و عاشقانہ کلام کہتے تھے۔ مجھ پر بڑا لطف فرمایا کرتے۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ وہ کہاں چلے گئے۔

خواجہ ابوالخیر کشمیری

بڑے بزرگوں میں ہیں۔ طریق معاملت و تقویٰ پر خوب گامزن اور راہ محبت میں مستقیم الحال اور

1　اگر تکلف نہ ہو تو زندگی چین و سکون سے گزر سکتی ہے اور اگر کسی سے قلبی تعلق نہ ہو تو آرام سے مرا جا سکتا ہے۔

2　شکر سیر، جو کہ اپنی محنت سے کوئی چیز کماتا ہے۔ دنیا پرست، صائم الدہر سے بہتر ہے۔

بلند ہمت ہیں۔ مکے میں شیخ تاج الدین سنبھلی کے صحبت داروں میں رہے۔ نسبت کو اپنے والد خواجہ احمد سے درست کرتے ہیں۔ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے شیخ مولانا خواجگی امکنگی کی بیٹی، خواجہ احمد کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ اس طرح خواجہ ابوالخیر حضرت مولانا امکنگی کے نواسے ہیں۔ خواجہ احمد کا گجرات کے علاقے میں زیارت و حج سے واپسی پر 1008ھ (1600) میں انتقال ہوگیا تو وہ اپنے والد کی نعش کو مکہ لے گئے اور معلّیٰ کے دروازے پر دفن کر دیا۔ ان کا قول ہے کہ حضرت مولانا امکنگی نے میرے والد صاحب خواجہ احمد سے فرمایا تھا کہ پچاس سال کی عمر میں تجھے سعادت نصیب ہوگی۔ پچاس سال کی عمر میں ہی میرے والد صاحب کو زیارت حرمین شریفین میسر ہوئی ہے۔ میرے شیخ کا فرمان ہے کہ مولانا امکنگی ہمیشہ عزیمت پر عمل پیرا رہے اور ہمیشہ رخصت و بدعت سے بچتے رہے۔ انتہائے اخلاص اور صدق حقیقت میں کوشاں رہے، ہمیشہ اپنے حالی کو لوگوں سے چھپاتے رہے۔ آپ اپنی نسبت کو اپنے والد محترم مولانا درویش محمد سے درست کرتے ہیں وہ اپنے ماموں مولانا محمد زاہد سے وہ خواجہ ناصر الدین سے وہ عبید اللہ احرار سے وہ مولانا یعقوب چرخی سے وہ خواجہ بہاءالدین نقشبند سے وہ امیر سید کلال سے وہ خواجہ بابا سماسی سے وہ خواجہ علی رامیتنی سے وہ خواجہ محمود زنجیر فغنوی سے وہ خواجہ عارف ریوکری سے وہ خواجہ عبدالخالق غجدوانی سے وہ خواجہ ابو یوسف ہمدانی سے وہ خواجہ علی فارمدی سے وہ شیخ ابوالقاسم سے وہ شیخ ابوالحسن خرقانی سے وہ خواجہ بایزید بسطامی سے وہ امام جعفر صادق سے وہ قاسم بن محمد بن ابی بکر سے وہ سلمان فارسی سے وہ حضرت ابوبکر صدیق سے وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ میرے شیخ فرماتے تھے کہ ماوراءالنہر کے والی پیر محمد خاں نے سمرقند کے والی باقی خاں پر لشکر کشی کی۔ باقی خاں نے خواجہ امکنگی سے پناہ چاہی۔ آپ نے پیر محمد خاں کے پاس جا کر صلح کی پیش کش کی۔ مگر اس نے غایت تکبر سے قبول نہ کیا، آپ غصے میں بھرے باقی خاں کے پاس واپس آکر بولے اپنے لشکر کی قلت سے مت ڈرا اور یہ آیہ کریمہ پڑھی "وَكَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ"[1] دعا و توجہ کی اور یقین تام سے فرمایا۔ جا فتح تیری ہی ہوگی۔ اُن کا دل قوی ہوگیا اور تین چار ہزار کے قلیل لشکر سے پیر محمد خاں کے چالیس پچاس ہزار کے لشکر پر حملہ آور ہو گئے اور پہلی ہی چڑھائی میں فتح یاب ہو

1 کتنی ہی تھوڑی جماعتیں اللہ کے حکم سے کثیر جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں۔

گئے ۔حضرت مولانا خواجگی امکنگی کی عمر 90 سال ہوئی اور ان کی وفات 1008ھ (1600) میں
ہے۔ بادشاہ صاحب قران ثانی شاہ جہاں نے خواجہ ابوالخیر کو غایت دین داری کی وجہ سے آگرے
کا عہدۂ قضا سپرد کر دیا تھا۔ وہ سالہا اس خدمت کو راستی اور درستی کے ساتھ انجام دیتے رہے اور
ایک عالم کو انصاف دلایا آخر میں نوکری ترک کر کے اپنے گوشۂ فقر وقناعت میں بیٹھ گئے۔ پائے
ہمت کو دامانِ قناعت میں سمیٹے ہوئے۔ وہ کبھی کبھی میرے شیخ کے پاس آتے تھے اور خوب صحبت
رہتی۔ میں نے انھیں دیکھا ہے کہ اُن کے چہرہ نورانی کے ساتھ ان کی صفائی باطن بھی خوب ظاہر و
ہویدا تھی۔ ایک دن میرے شیخ نے مجھے اُن کے پاس ایک کام کے سلسلے میں (دعا و توجہ کی غرض
سے) بھیجا۔ انھوں نے اس قدر مروت اور حسن سلوک کو روا رکھا اور مجھے مرہون منت کیا۔ مجھے
یقین ہو گیا کہ پہلے اکابر اولیائے سلف اسی نہج کے رہے ہوں گے۔ اُن کے اور سلف کے درمیان
اگر کوئی تفاوت ہے تو بس از راہ تقدم و تاخر ہے۔

خواجہ فولاد

وہ بخاری الاصل ہیں۔ نسبت عالی اور استغراق تمام رکھتے ہیں۔ (محلّہ) بخاریان لاہور کی مسجد شیخ
فرید بخاری میں، میں نے اُن کو دیکھا ہے کہ کتنے اہل کار درویشی و محبت الٰہی کی طلب میں ان کی
صحبت کی آرزو رکھتے مگر وہ کسی کی طرف ملتفت نہیں ہوتے اور نا ہی کسی کام کی جانب توجہ کرتے ہیں
انھوں نے خود کو سارے مقاصد اور مطالب سے مستغنی کر رکھا ہے۔ اُن پر یاس و حسرت کی کیفیت
طاری ہے۔ میرے شیخ کا کہنا ہے[1]

بجز دریائے نومیدی ندارد گوہر وصلش　　تو خواہی در بیابان گرد خواہی در چمن بنشیں

میں جب بھی انھیں تنہا پاتا وہ اس راہ محبت کی باتیں کرتے اور اپنے شیخ کے حقائق و معارف بیان
فرمایا کرتے۔ کبھی کبھی مجھ پر توجہ بھی ڈالتے اور علوم باطنی کے عجیب و غریب احوال و حقائق بیان
فرماتے۔ میرے شیخ کی بے دیکھے بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ بڑی اچھی صحبت کے بعد اچانک

1　ناامیدی کے دریا کے سوا کوئی اس کے وصل کا گوہر نہیں رکھتا اب چاہے تو بیابان میں تلاش کرتا پھر چاہے
محبوب کے انتظار میں چمن میں بیٹھ جا۔

اُٹھ کر چل دیتے۔ ان حالات و معاملات کو بادی النظر سے دیکھنے پر صوفیہ محققین کا یہ سخن میرے دل میں آتا تھا۔

اے سرو بتو شادم، قدت بہ، کہ آری اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری[1]

وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنے احوال باطن کی باتیں اِشاروں کنایوں میں بتایا کرتے اور اپنے شیخ کی بھی بہت سی بلند پایہ حکایات سنایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ مجھے راہِ باطن کی ایک مشکل درپیش ہے، آپ توجہ فرمائیں تاکہ حل ہو جائے۔ فرمانے لگے آج کی رات میں بھی متوجہ الی اللہ رہوں گا تو بھی متوجہ رہنا۔ اس رات میں مجھے دو چیزیں ظاہر ہوئیں کہ اُن کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا میں نے بڑی حسرت اٹھائی کہ آہ ایسی صحبت کی میں نے قدر نہ جانی، سچ ہے "النعمة اذا فقدت عرفت[2]"

شاہ میر لاہوری

وہ بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ صاحب جذبۂ قوی و احوال عظیم تھے۔ ظاہر میں عوام کی طرح اور باطن سے متحقق تھے۔ پہلے ہی قدم پر طالبین کو تجرید و تفرید کی جانب رہنمائی فرماتے تھے۔ لوگوں سے بہت کم ملتے۔ جب کوئی ان کے پاس ملاقات و دیدار کا طالب حاضر خدمت ہوتا ذرا سی دیر نہ بیٹھ پاتا کہ دعا دے کر فوراً اس کو رخصت کر دیتے۔ اُن کے دامن تربیت سے وابستہ رہ کر بہت سے صاحب معنی اور مستقیم الحال درویش اور مجذوب بنے ہیں۔ اُن میں سے بعض صاحب کرامت بھی گزرے ہیں۔ جہاں گیر بادشاہ ان کی دید و ملاقات سے بہت مسرور ہوا اور ان کی روش کو بہت پسند کیا۔ بادشاہ صاحب قِر ان ثانی شاہ جہاں بھی ان سے ملنے تشریف لے گئے۔ بہت محظوظ ہوئے اور معتقد ہو کر اٹھے۔ کہتے ہیں کہ اوّلِ حال میں حسن صوری کی طرف میلان خاطر رکھتے تھے اور ایک ہندو پسر کی صورت دیکھا کرتے تھے۔ (یہ

---

1 اے سرو میں تجھ سے خوش ہوں بتا تو سہی تو نے یہ قد کس سے لیا ہے۔ اے پھول میں تجھ سے خوش ہوں تیری یہ بو کس کی بو ہے۔

2 جب نعمت چھن جاتی ہے تب اس کی قدر سمجھ میں آتی ہے۔

حضرات حسن مجازی میں دیدار حسن یار حقیقی کرتے ہیں بلا شائبہ نفسانیت) ایک دن شیخ حسین دہدہ کے یاروں میں سے عبدالعزیز نام شخص سے کہنے لگے کیا تم اس ہندو لڑکے کو میرے پاس تک لا سکتے ہو۔ انھوں نے عرض کیا۔ شاہا! لوگ آپ کے وسیلے سے خدا تک پہنچتے ہیں آپ جیسے کے لیے ایسے کام کی طرف متوجہ ہونا کب مناسب ہے۔ شاہ میر لاہوریؒ نے جواب دیا۔ جس طرح لوگ میرے وسیلے سے اللہ تک پہنچتے ہیں میں بھی اس کے وسیلے سے اللہ تک پہنچتا ہوں۔ اس لڑکے کو ان کی تاثیر صحبت سے شرف قبول اسلام کی دولت مل گئی اور وہ صاحب احوال عظیم بن گیا۔ اس کی صحبت میں بھی بڑی قوی تاثیر تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک دن لاہور میں شیخ عبدالحق (دہلوی) سے کسی نے سوال کیا کہ حدیث ''سور المومن شفاءٌ'' کی حقیقت کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ (اکثر) جب مومن کا جھوٹا کسی بیمار کو کھلاتے ہیں وہ شفایاب نہیں ہوتا۔ شیخ نے عذر کیا کہ میں کتب حدیث دیکھ کر بتلاؤں گا۔ شاہ میر لاہوری حاضر تھے، کہنے لگے میرے دل میں اس کی ایک وجہ آئی ہے ''مومن کو کسی مومن کا جھوٹا کھانے سے اپنے مرض (خصوصاً مرض باطنی کبر وریا) سے خلاصی نصیب ہو جاتی ہے۔ اس معنی کو شیخ نے پسند کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک عالم اپنا سودا سر پر رکھے جا رہے تھے۔ (وہ عالم) انھیں دیکھ کر شرمائے اور بولے (میں یہ کام نہیں کرتا ہوں) شیخ میں صرف سنت پر عمل کی نیت سے ایک بار یہ عمل کر رہا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنا سامان ایک بار سر پر رکھ کر بازار سے گھر لائے تھے۔ انھوں نے کہا یہ تو ان کی (ﷺ) مستقل عادت شریفہ تھی تو یہ کام نہ کر، کہ تو نے دانشمندی اور فضیلت کے غرور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کو حقیر خیال کیا اور یہ بات ادب کے خلاف ہے۔ میں ایک بار ان کے پاس حاضر ہوا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں لشکری تھا لیکن طلب فقرا و اولیاء حق ہر وقت دامنگیر رہتی تھی۔ انھوں نے میرا نام و پتا پوچھا دعا دی اور رخصت کر دیا میں اُن کے اس عمل سے حیرت و تعجب میں پڑ گیا کیونکہ مجھے ان کے اس طریقے کا علم نہ تھا میں افسوس کناں واپسی کے لیے کھڑا ہو گیا کہ میری وضع لشکریانہ نے انھیں بے التفاتی پر مجبور کیا ہے۔ اسی اثنا میں ان کے خادم نے مجھے ان کی اس عادت سے آگاہ فرمایا (اور ایک واقعہ سنایا کہ) ''ایک بار میں ان کے ساتھ تھا وہ خود بادشاہ سے ملنے تشریف لے گئے تھے مگر ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ اس کی بعض باتیں وہاں پہنچ کر انھیں بظاہر خلاف دین نظر آئیں اور آپ بغیر ملاقات

واپس چلے آئے تھے۔'' ان کی وفات 1043ھ (1634) میں ہوئی اور قبر جنوبی لاہور کے ایک طرف ہے۔ ان کے صحبت یافتہ ملک احمد کشمیری فرماتے ہیں کہ میرے نانا سید سرخ بڑا قوی جذبہ رکھتے تھے۔ آخری وقت میں اپنی بیٹی کو بلایا اور ہاتھ پکڑ کر فرمایا جو کچھ میں رکھتا تھا تجھے دے دیا اسی وقت سے ان پر ایک حالت اور کیفیت طاری ہوگئی۔ چنانچہ بر فیلی ہوا میں اپنے باغیچے کے حوض میں اکثر وقت گزارا کرتی تھیں۔ آخر ان دختر کے بطن سے میری پیدائش ہوئی مگر وہ میری پرورش اور دیکھ بھال سے بالکل غافل رہیں۔ دوسروں نے میری پرورش کی۔ جب میں بارہ سالہ ہوگیا ایک دن مجھ کو لباس فاخرہ پہنا کر ان کے سامنے لے گئے تا کہ انھیں میری محبت آئے۔ انھوں نے فرمایا ''اے نوجوان اللہ سے شرم کر اپنی جوانی اور خودی کی کیا نمائش کرتا ہے۔ خدا طلبی میں لگ۔'' اسی وقت سے مجھ پر حالت جذب طاری ہوگئی کہ گورستان وصحرا میں گشت لگایا کرتا۔ پینتالیس روز ہوگئے کسی نے میرے حال کی خبر نہ لی آخر میری دادی کا دل سلگ اٹھا اور میری والدہ سے کہا۔ اتنی نامہربانی اور تغافل کس لیے روا رکھا ہے۔ اسے تلاش کر اور کسی صاحب معنی فقیر کے حوالے کر دے تا کہ وہ تربیت کرے۔ مجھے تلاش کیا اور کہا۔ ''جا شاہ! میر کے پاس لاہور چلا جا اور ان کی خدمت کو لازم پکڑ لے۔'' میں شاہ میر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے قبول فرما کر مجھے ایک مجذوب کے حوالے کر دیا۔ کچھ وقت اُن کے پاس رہا۔ ان مجذوب نے مجھے ایک اور مجذوب کے پاس جو لاہور کے پاس ہی رہتے تھے، بھیج دیا۔ میں نے ان کی خدمت بھی اپنے اوپر لازم کر لی۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے ولایتی خربوزہ طلب کیا۔ ان کے پاس پانچ روپے تھے۔ مجھے دیے میں لے کر بازار سے ایک خربوزہ جو اتفاقاً داغی تھا خرید کے لے آیا۔ جب میں نے چاہا کہ پہلے داغی کو کاٹ کر الگ کر دوں انھوں نے غصے میں کہا کہاں ہے داغ اور مجھ سے چھین لیا دیکھا تو داغ کا نشان بھی نہ تھا۔ ایک رات وقت سحر مجھ سے کہا۔ جا دہی بڑا لے آ۔ میں حیران کہ اس وقت کوئی بازار کھلا نہ ہوگا کہاں جاؤں وہ کھڑے ہوئے اور غصے میں مجھے پتھر مارا کہ بھاگ جا۔ میں چلنے لگا قریب ہی ایک دروازہ ظاہر ہوا میں اس میں چلا گیا دیکھا کہ ایک شخص پیڑ کے نیچے ''دہی بڑا'' بیچ رہا ہے۔ مجھ سے بولا اگر تیرا دل چاہے لے لے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس نہ روپیہ ہے نہ برتن۔ طباخ نے نہایت لطف و مہربانی سے کہا۔ تو فلاں مجذوب کے پاس رہتا ہے جتنا چاہے لے لے میں نے تھوڑا سا (دہی بڑا) ایک

برتن میں لے لیا اور چل دیا جب پیچھے مڑکر دیکھا نہ طباخ تھا نہ درخت۔ میں نے ان مجذوب کی صحبت میں بہت کشائش حاصل کی۔ میں نے سید زاہد بن سید ابراہیم بھکر سے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک دن ایک غریب کوکناری[1] ایک مجذوب کے پاس گیا۔ اپنی درماندگی کی داستان سنائی۔ وہ مہربان ہو گئے اور اس کی انگلیوں کے ناخن پر سیاہی گرم کر کے کچھ لکھا اور کہا کہ جا جو چاہے کھا، جو چاہے پی تجھے اب کوئی نہ دیکھے گا۔ لیکن بادشاہ کے گھر مت جانا۔ پہلے اس نے خشخاش ملی اور کھا گیا۔ بنئے نے اسے نہ دیکھا اسی طرح اچھا کھانا کھانے اور فاخرہ لباس پہننے لگا حتیٰ کہ خوب فربہ ہو گیا۔ ایک دن بادشاہ کے گھر گیا دیکھا کہ بادشاہ اپنی محبوبہ کے ساتھ خلوت میں شطرنج کھیل رہا ہے۔ اسی دوران گرم آش کے دو پیالے خدام لے کر آئے دونوں نے کھانا شروع کیا۔ اس نے بھی ہاتھ سے کھانا شروع کیا۔ گرم آش سے وہ لکھائی اس کے ناخن سے چھوٹ گئی۔ بادشاہ نے اس کو پکڑ لیا اور بولا۔ تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ایک مجذوب نے ایسا ایسا کیا ہے۔ اُن مجذوب کو بھی وہیں طلب کیا اور کہا۔ ایسا تماشا مجھے بھی دکھلایئے۔ مجذوب نے کہا۔ شطرنج کے فلاں مہرے کی طرف نظر جمایئے۔ جیسے ہی اس نے نگاہ کی خود کو صحرا میں پایا کہ چودہ سالہ بن بیاہی لڑکی بن گیا ہے۔ حیران و درماندہ رہ گیا۔ اس درمیان ایک جوان گھوڑے پر سوار وہاں پہنچا۔ اس کو اپنے پیچھے بٹھا کر گھر لے گیا اور نکاح میں لے آیا اور اس سے آٹھ فرزند پیدا ہوئے۔ ایک دن بیٹھا اپنے سلطنت کے ماجرے کو یاد کر کے کچھ سوچ رہا تھا۔ اسی اثنا میں اس مجذوب نے کہا آنکھ کھولئے۔ جیسے ہی آنکھ کھولی دیکھا کہ وہ مجذوب محبوبہ اور کوکناری سب بیٹھے ہیں۔ حیران ہوا اور عقیدت میں ان مجذوب کے پیروں پر گر گیا اور سلطنت کو چھوڑ کر راہ درویشی اختیار کر لی۔ واللہ اعلم۔

ملا خواجہ لاہوری

وہ بھی شاہ میر کے یاروں میں سے ہیں۔ مجاذیب وقت میں سے تھے۔ بڑے صاحب معنی اور فقر و درویشی میں بہت خوب۔ بہت کم لوگ ان تک پہنچ پائے۔ ان کی زبان میں ایک تاثیر تھی۔ جذبے کو سلوک سے بہم رکھتے تھے۔ ان کا یہ عمل ہی غالباً ان کے تلبس و کتمان حال کا پردہ بن گیا ہوگا۔

---

1 خشخاش کے ڈوڈے استعمال کرنے والا، بھنگ کھانے والا

میرے شیخ کے بڑے مخلص نیازمند، مدارات برتنے والوں میں سے تھے اور خدمات شائستہ بجالاتے تھے۔ میرے شیخ کا کہنا ہے کہ ایک دن میں ان کے پاس پہنچا۔ فقر و درویشی کا ذکر چلا انھوں نے جوش وخروش کے ساتھ بولنا شروع کردیا کہ کثرت میں سب جنگ ہی جنگ ہے۔ جھگڑا ہی جھگڑا ہے اور حسد و رشک ہے۔ اسی اثنا میں لڑنے والوں کی طرح ہاتھ پھینک پھینک کر کہنے لگے وحدت میں آرام ہی آرام ہے صلح اور جمعیت ہے۔ میرے شیخ فرماتے تھے کہ مجھے ان کی یہ مستانہ، محققانہ ادا بڑی اچھی لگی کہ بہت قیمتی تھی

چونکہ بیرنگی اسیر رنگ شد موسی با موسی در جنگ شد

چون بیک رنگی رسی کان داشتی موسی و فرعون دارند آشتی

ایک دن اسی حکایت کو میں نے ملا خواجہ لاہوری کے یاران سلسلہ محمد نعیم کو جو ایک درویش وارستہ اور آزاد مزاج شخص ہیں۔ لکھ کر بھیجی۔ انھوں نے بتایا کہ ہاں ملا خواجہ لاہوری بھی کبھی کبھی ایسے موقعوں پر مثنوی مولوی روم کے یہی دو شعر بڑے ذوق کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ تیرا اس وقت یہ لکھ کر بھیجنا اتفاقات حسنہ سے ہے۔ محمد صالح لاہوری جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک دن میں ملا خواجہ لاہوری کی خدمت میں تھا کہ دو مسافر آئے اور انھیں سلام کیا۔ ان کو خلق سے از بس وحشت اور نفرت تھی۔ ''دور''، ''دور'' کہنا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے دنیا کی خاک چھانی ہے ایک بات کے حل کے لیے۔ امید یہ تھی کہ اس کا حل آپ سے مل جائے گا، آپ بھی ایسا سلوک فرما رہے ہیں۔ اسی وقت نرمی سے پاس بلایا اور کہا ''کیا کہتے ہو'' انھوں نے کہا۔ اللہ تک پہنچنے کا راستہ جو خود بہت زیادہ پوشیدہ ہے، کیا ہے؟ فرمایا۔ اس کا جواب میں ایک مثال سے دیتا ہوں وہ مثال یہ ہے کہ ایک شخص سونا، چاندی یا اس جیسی کوئی اور چیز کسی جگہ چھپا دیتا ہے کہ اپنے گھر والوں کو بھی اس کا بھید نہیں دیتا۔ اتفاقاً چور اس تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کو یہ قدرت صرف بیداریٔ شب کی وجہ سے ہاتھ لگتی ہے اس طرح اگر سالک راہ محبت اگر بیداریٔ شب پر مداومت رکھے اس کا دست بھی ادراکِ حق سبحانہ وتعالیٰ تک جن کی ذات اخفی الاخفی ہے پہنچ جائے گا۔ (انشاء اللہ)۔ وہ دونوں مسافر یہ جواب سن کر بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے چلے گئے۔ میں نے مدتوں ملا خواجہ لاہوری کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ اس سے بہتر کوئی بات میں نے کبھی نہیں سنی، حق بات یہ

ہے کہ یہ بات انھوں نے بہت ہی زیبا فرمائی۔

ہر گنج سعادت کہ خداداد بحافظ　　از یمن دعاے شب و وردِ سحری بود[1]

ان کے پڑوسی سید عبداللہ کا قول ہے کہ میں لڑکپن میں خط نسخ تعلیق کی مشق کرتا تھا ایک دن اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا۔ دعا و توجہ فرمایئے کہ اس فن میں اتنا ماہر ہو جاؤں کہ بادشاہِ وقت کے دربار میں تقرر ہو جاے۔ مجھے دیکھا اور ایک ڈراونے شیر کی شکل میں مجھ پر ظاہر ہوئے۔ میں ڈر گیا اور لرزنے لگا۔ انھوں نے غضبناک ہوکر کہا "اچھا قرب بادشاہ چاہتا ہے" میں نے کہا۔ میں اس کام سے باز آیا، اور بہت پشیمان ہوں۔" انھیں کا قول ہے کہ شاہ میر کے عرس کی شب ہوا کی زیادتی سے چراغ بجھ گئے۔ کسی نے کہا ایسے شاہِ درویشاں کی درگاہ اور ادنی تصرف بھی نہیں۔ یہ سن کر ملا خواجہ لاہوری گویا ہوے۔ شاہ کے غلاموں کو بھی (یہ بات) میسر ہے شاہ کی تو بات ہی الگ ہے۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ چراغ خود بخود جل اٹھے اور پھر روشنی پھیل گئی۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک دن ملا خواجہ نے کھانا تیار کیا اور حاضرین پر تقسیم کر دیا اور خود نہ کھایا۔ اس کے بعد ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑا جو اس بات میں بحث کرتے تھے کہ دوستانِ خدا خود کیسے مر جاتے ہیں اور کہا تم لوگ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے دوست کیسے مرتے ہیں۔ دیکھو ایسے مرتے ہیں۔ "اللہ" کہا اور شعبان کے مہینے میں 1067ھ (جون 1657) میں رخصت ہوئے۔ اُن کی قبر ان کے شیخ شاہ میر لاہوری کے جوار میں ہے۔ ایک دن میں نے (ان کی زندگی میں) ان کو خواب میں دیکھا میری خوب خاطر مدارات کی اور نصیحت فرمائی۔ اُسی دوران رستم خان دکھنی کہ میں ان کے ہمراہ بحیثیت لشکری تھا مہم قندھار کے فتح یابی کے سلسلے میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوے اور درخواست کی۔ وہ فوراً بول اُٹھے۔ جا تیرے دشمن مارے گئے، ہم نے انھیں مار دیا۔" ہم قندھار تک نہ پہنچے ہوں گے کہ والیِ ایران شاہ صفی کی خبر وفات آ گئی یہ واقعہ سال 1051ھ (1641) کا ہے۔

1　حافظ کو خدا تعالیٰ نے سعادت کا جو بھی خزانہ بخشا وہ دعاے شب اور ورد سحر کا مرہون منت ہے۔

شیخ بلاول قادری

آپ اپنے وقت کے بڑے مشائخ میں سے ہیں۔ صاحب احوال عظیم، معاملت (حقوق العباد) میں مستقیم۔ نورانی شکل، متقی اور باشکوہ۔ ریاضت شاقہ کیے ہوئے۔ ہر سال صحرا میں ایک معین جگہ جاتے اور ایک چلہ کرتے اور پھر لاہور میں اپنی قیام گاہ لوٹ آتے ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ اخلاق ومحبت سے پیش آتے۔ جو بھی ان سے ملاقات کرتا اس کو دو روٹیاں مع حلوہ دیتے تھے۔ ان کے بہت سے مرید صاحب احوال وکیفیات تھے۔ اُن کے خلفا ان کی بہت سی کرامتیں بیان کرتے ہیں۔ ایک بار بادشاہ صاحب قِران ثانی انھیں دیکھنے کے لیے گئے اور دعا کی درخواست کی۔ انھوں نے انصاف کرنے کی ترغیب دی اور یہ حدیث پڑھی:

''العدل ساعةٍ خیر من عبادت الثقلین[1]''

شاہ رابہ بود از طاعت صد سالہ وزہد　　　قدر یک ساعت عمرے کہ درو داد کند[2]

یہ سلاطین تیموریہ کے فقرا کے ساتھ اخلاص ومحبت کی ہی بات تھی کہ حضرت امیر سید کلال قدس سرہٗ نے امرا تیموریہ کو اپنی توجہ خاص سے مراتب سلطنت عنایت فرمائے۔ جیسا کہ ان (سلاطین) کے ملفوظات میں لکھا ہوا ملتا ہے کہ ایک دن حضرت امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھ کر بخارا شہر سے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ فتح آباد اور کلاباد کے درمیان میں ایک سبزہ زار میں دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور معرفت کی مجلس برپا ہے اور وہ لوگ مقامات درویشان کی باتیں کر رہے ہیں۔ اولیاء کرام کی ولایتوں اور کرامتوں کا بیان ہو رہا ہے۔ اس جماعت میں امیر تیمور بھی حاضر تھے۔ جب امیر کلال علیہ رحمۃ اپنی جماعت کے ہمراہ ان کے قریب سے گزرے جیسے ہی امیر تیمور کی نظر اس جماعت پر پڑی تو لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون بزرگ ہیں اور یہ کس سلسلے کے درویشوں کی جماعت ہے۔ اہل مجلس میں سے کسی نے کہا کہ انھیں حضرت امیر کلال کہتے ہیں (اور

1　ایک گھڑی کا عدل جن وانس کی عبادت سے بہتر ہے۔

2　بادشاہ کے لیے وہ گھڑی بھر عمر جس میں وہ انصاف کرے صد سالہ زہد اور (نفلی) عبادت کی زندگی سے بہت ہے۔

یہ اُن کے یارانِ طریقہ کی جماعت ہے) جب امیر تیمور نے یہ سنا فوراً بادِ صرصر کی طرح دوڑے اور حضرت امیر کلال کے پاس آ کر نہایت نیاز مندی کا مظاہرہ کیا اور یوں عرض کیا کہ اے بزرگوار! اے ہادیِ راہِ یقین، مجھے آپ کے کرم سے یہ توقع ہے کہ مجھے کسی ایسی خدمت کا حکم فرمائیں جو اس جماعت درویشاں کی تسکین خاطر کا سبب ہو جائے۔ یہ سن کر حضرت امیر کلال نے فرمایا درویشوں کی اکثر حالت اپنے احوال کا اخفا ہے ادھر میرا از خود کسی سے کچھ کہنے کا جب تک کہ بزرگانِ سلسلہ کی ارواحِ طیبات سے اشارہ نہ ہو، طریقہ نہیں ہے، کیونکہ میرے جد بزرگوار بھی اپنے آپ ہرگز کچھ نہیں فرماتے تھے۔ لیکن تم منتظرِ حکم عزیزانِ سلسلہ رہو کہ مجھے تمھارے کام میں ایک روشنی عظیم نظر آ رہی ہے اور تمھیں ضرور کوئی خدمت خلق سپرد ہونے والی ہے۔ جب حضرت امیر کلال اپنے گھر پہنچے اور اپنے گوشۂ خلوت میں داخل ہوئے۔ حضرات مشائخ قدس اللہ ارواحہم کی روحانیت سے امیر تیمور کے بارے میں دریافت کیا اور کچھ دیر بعد باہر آئے اور عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد اور اپنے شناساؤں میں سے ایک کو جس کا نام شیخ منصور تھا، طلب کیا اور فرمایا۔ جلدی جاؤ اور امیر تیمور سے کہنا کہ ذرا بھی توقف نہ برتیں فوراً خوارزم کی طرف چلدیں اور جلد سے جلد مہم خوارزم کی طرف متوجہ ہوں اور کچھ خیال میں نہ لائیں، اگر بیٹھے ہوں تو کھڑے ہو جائیں اور اگر کھڑے ہوئے ہوں تو نہ بیٹھیں کہ مشائخ کی ارواحِ طیبات نے ایسا ہی اشارہ فرمایا ہے۔ اور تمام ملک کو تمھارے اور تمھارے فرزندوں کے لیے دے دیا ہے۔ جب خوارزم تمھارے قبضہ میں آ جائے تو سمرقند کی طرف توجہ کرنا۔ جب شیخ منصور امیر تیمور کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ امیر تیمور حضرت امیر کلال کے جواب کے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں۔ جب شیخ منصور نے یہ ماجرا سارا کا سارا اُن سے کہا امیر تیمور دوڑ پڑے۔ ہر چند تلاش کیا کسی کو نہیں ملے نہ ہی کسی نے اُن کا پتہ نشان دیا (بعد میں لشکر نے انھیں خوازم میں پایا) یہی وجہ تھی کہ خداوند تبارک اللہ تعالیٰ نے خوارزم کی حکومت اُن کو عطا فرمائی جب وہ خوارزم سے کامیاب و کامران واپس لوٹے، سمرقند پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ ان کا کارِ حکمرانی روز بروز، ساعت بہ ساعت بڑھتا ہی چلا گیا۔ امیر تیمور نے سمرقند سے ایک قاصد کو حضرت امیر کلال کے پاس بخارا روانہ کیا کہ اگر حضرت امیر لطف و مہربانی فرما کر سمرقند

تشریف لے آئیں اس ملک کے تمام لوگ ان کے قدوم میمنت لزوم سے شرف یاب ہوں گے
اور اگر یہ حکم فرمائیں کہ میں خدمت عالی میں حاضری سے شرف اندوز ہوں تو حاضر ہوں مگر یہ
تشویش ہے کہ درویشوں کی جماعت میری حاضری سے تفرقہ میں پڑ جائے گی کہ کلام پاک میں
ہے"انّ الملوک اذا دخلوا قریۃً افسدوھا[1] "میری حاضری کے سبب لوگوں کو تکلیف
پہنچے گی۔ آگے جو حکم ہو بہ سروچشم قبول ہے آپ حاکم ہیں جو آپ فرمائیں گے میں ویسا ہی کروں
گا جب قاصد نے یہ خبر حضرت امیر کلال کو پہنچائی حضرت امیر نے معذوری دکھاتے ہوئے یہ
فرمایا" ہم یہاں تمھارے لیے دعا میں مشغول ہیں اور ہمارا طریقہ نہیں ہے کہ کسی جگہ جائیں۔"
اور اپنے ایک فرزند کو جن کا نام میر عمر تھا عذر خواہی کے طور پر بادشاہ کی خدمت میں سمرقند روانہ
فرمایا اور فرمایا کہ امیر تیمور سے کہنا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اہل اللہ کے دلوں میں آپ کے
لیے جگہ ہو، ہر حال میں تقویٰ اور عدل کو اپنا شعار بنالیں۔ دوسری نصیحت (اپنے فرزند کے
لیے) یہ کی کہ اگر تیمور بادشاہ تمھیں آسائش زندگی کے سامان دینوی دنیا چاہیں، قبول نہ کرنا اگر
قبول کرلو تو لوٹ کر ہمارے پاس مت آنا۔ کوئی بھی چیز قبول کر کے اپنے جد بزرگ وار کے
خلاف عمل کرنے والوں میں مانے جاؤ گے۔ درویشوں کو تو دائمی طور پر مومنین کے لیے مشغول
دعا رہنا چاہیے اگر وہ دنیا کی جانب میل کرتے ہیں تو ان کی دعا حجاب غفلت سے نہیں نکلتی۔
جب حضرت امیر کلال امیر عمر کو یہ نصیحت فرما چکے تو ان کو رخصت کر دیا۔ جب وہ امیر تیمور کے
پاس پہنچے، چند دن تک امیر تیمور نے اُن کو ٹھہرائے رکھا اس کے بعد بوقت رخصت ان کے
سامنے پیش کش کی کہ اس گاؤں کو جس میں آپ رہتے ہیں بطور ذریعہ معاش قبول فرمائیں۔
قبول نہ کیا۔ اس پر امیر تیمور نے عرض کیا کہ لباس اور دوسری چیزیں بھیجتا ہوں جو آنحضرت کے
لیے مناسب ہیں تا کہ ان کی درگاہ میں مجھے تقرب حاصل ہو۔ جب امیر تیمور نے یہ گفتگو کی تو
امیر عمر نے فرمایا حضرت والا نے مجھے یہ یہ نصیحت کہلانے کے لیے بھیجا ہے۔ اگر آپ چاہتے
ہیں کہ آپ کے لیے اہل اللہ کے دل میں جگہ بن جائے تو آپ عدل وانصاف، تقویٰ وطہارت
کو اپنا شعار بنالیں حق تعالیٰ کے قرب کا سبب (حقیقی) یہی تقوی وطہارت اور عدل وانصاف

---

1 بیشک بادشاہ جب کسی قریہ میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے درہم برہم کر دیتے ہیں۔

ہے۔اسی میں تمام دلوں کی مقبولیت ہے۔قطعہ

وین قدر ندارد کہ بر و دست زنند   با وجود و عدمش غم بیہودہ خورند
نظر آنہا کہ نکردند برین مشتے خاک   الحق انصاف توان داد کہ صاحب نظراند [1]

آیت ''ما زاغ البصر وما طغیٰ'' اسی معنی کی تائید وتقویت میں وارد ہے۔حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں بھی آیا ہے کہ میری امت کے فقرا اُس جہاں کے آدھے دن کی مقدار کے برابر اس کے اغنیا سے پہلے جنت میں جائیں گے کہ اُس جہان کے آدھے دن کی مقدار 2500 سال ہے۔پس درویش کو چاہیے کہ اس معنی میں خوب غور کرے اور دنیا اور اہل دنیا سے دھوکہ نہ کھائے کہ دنیا اور اہل دنیا کی محبت حق تعالیٰ سے دوری کا سبب ہوتی ہے۔انتہیٰ

ایک تاجر شیخ بلاول کے مرید تھے جو بہت دیانت وراستی کے ساتھ خرید وفروخت کرتے تھے، انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک بار میں دریائے راوی سے کشتی کے ذریعے شکر کی بوریاں ملتان لا رہا تھا۔پانی کی طغیانی کی زمانہ تھا۔کشتی دریا میں غرق ہوگئی اور ریت میں دب گئی۔جب پانی اُتر گیا اور سیلابی زمین خشک ہوگئی۔میں کبھی کبھی دریا کے کنارے جاتا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا اور پھر گھر واپس آجاتا۔لوگوں کو یہ گمان ہونے لگا کہ مال کے تلف ہونے سے مجھے جنون ہوگیا ہے حالانکہ ایسی بات نہیں تھی میں اپنے دوستوں سے کہتا کہ میری خرید وفروخت شرعی طور پر ہوتی ہے ایسے مال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تلف نہیں ہوتا اسی وجہ سے میں آتا جاتا ہوں۔اتفاقاً ایک دن بچے دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے کنویں کھود کر پانی نکال رہے تھے۔ایک کنویں سے ایک مضبوط رسی ظاہر ہوئی اور کھودتے کھودتے اس کشتی تک جو ریت میں دب گئی تھی، پہنچ گئے۔جب یہ خبر مجھے ملی بہت سے مزدوروں کو اپنے ساتھ لے کر آیا اور کشتی کو صحیح سالم ریت سے نکال لیا۔بوریاں بھی بغیر بھیگے سلامت نکل آئیں۔جب وزن کیا ہر من میں پاؤ بھر کم وزن نکلا۔انھوں نے بتایا کہ لاہور میں یہ رسم بد (بری رسم) جاری ہے کہ خریدنے والا ہر من پر ایک پاؤ زیادہ لیتا تھا۔بیچنے والا بھی اپنی مرضی سے زیادہ دیتا تھا۔الحمدللہ کہ مجھے اس معاملے سے یقین کامل ہوگیا اور میں نے اس بری رسم

---

1 یہ دنیا اس قابل نہیں کہ اسے ہاتھ لگائیں۔اس کے ہونے نہ ہونے کا بیکار غم اُٹھائیں جو لوگ اس مشت خاک پر نظر نہیں ڈالتے ،حق وانصاف یہ ہے کہ وہی صاحب نظر یعنی اہل دانش ہیں۔

سے توبہ کرلی۔ انتہیٰ۔ شیخ بلاول سے میں نے دو بار ملاقات کی ہے۔ انھوں نے میری خوب پوچھ گچھ کی اور دونوں دفعہ اپنے جس لطف و احسان سے مجھے نوازا کما حقہ اس کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اُن کی وفات 29/شعبان 1046ھ (25/جنوری 1637) کو ہوئی اور ان کی قبر شہر لاہور کے شرقی کنارے پر ہے۔ میں نے ان کے وصال پر ان کی تاریخ وفات کہی۔ قطعہ

چون شاہ بلاول یگانہ بودہ بجہان جنید دوران
بگذشت ازین سرائے فانی در بست و نہم ز شہر شعبان
از رفتنِ اُو بگفت ہاتف رفتست بتن نرفتہ از جان
تاریخ وفات او خرد گفت یا شاہ بلاول خداداں[1]

1046ھ

سید نظیر محمد

آپ اللہ کے مقبول اور کامل فقرا میں سے ہیں۔ صاحب آیات و کرامات، اور راہ ولایت میں مستقیم الحال ہیں۔ گوشہ گیر اور دنیا سے مستغنی ہیں۔ دنیا اور اہل دنیا کے آگے کبھی سرخم نہیں کرتے اور لوگوں سے میل جول نہیں رکھتے تھے۔ ہر شخص کی اُن تک رسائی نہ تھی۔ اُن کی جائے پیدائش اور نشو و نما قصبہ قصور ہے جو لاہور کے مضافات میں ہے۔ آخر عمر میں مکھی کے علاقے میں جو دہلی سے متصل ہے سکونت اختیار کرلی تھی اور ساری عمر گوشہ تنہائی اور گمنامی میں گزار دی۔ میں نے لاہور میں لوگوں کو کہتے سنا کہ بخارا محلّہ میں ایک ہندو رہتا ہے جو کوئی اس کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے دل میں ایک خواہش ہے بتاؤ وہ کیا ہے؟ اور کب پوری ہوگی۔ وہ اس کی دلی بات کو صاف صاف بیان کر دیتا ہے اور اس کے ظہور کا وقت بھی بتلا دیتا ہے۔ میں دو شخصوں کے ساتھ اس کے

---

1 جب شاہ بلاول یگانہ روزگار، جنید دوراں نے اس جہانِ فانی سے 29/شعبان کو کوچ کیا۔ اُن کے جانے پر ایک ہاتف (غیبی) نے ندا دی "صرف ان کا جسم رخصت ہوا ہے، نہ کہ اُن کی جان فنا ہوئی ہے۔" اُن کی تاریخ وفات یہ ذہن میں آئی۔ شاہ بلاول خداداں (1046ھ)

پاس گیا۔ واقعی ویسا ہی پایا جیسا کہ لوگ کہتے تھے۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک نے دریافت کیا کہ مجھے میرے آقا نے دو گھوڑے خریدنے لاہور بھیجا ہے، کیا خبر ہے۔ بولا۔ ضرور خریدے گا تو چاہے تو میں گھوڑوں کا رنگ اور قیمت بھی بتلا دوں۔ اور دوسرے کو جو ہندو تھا، کہا۔ اس پر تین سو روپے جرمانہ ہوگا۔ شام کے وقت میں تنہا پہنچا اور اپنے دل کا مطلب کہے بغیر میں نے پوچھا۔ تو وہ بولا ''ابھی تجھے حجرہ نشینی میسر نہیں ہے اور میرا دلی مطلب یہی تھا کہ نوکری چھوڑ دوں اور گوشۂ توکل اختیار کروں۔ مجھ سے اس نے یہ بھی کہا۔ فی الحال تو اُس طرف جا اور مکھی جنگل کی طرف اشارہ کیا میں نے اس سے یہ بھی دریافت کیا کہ تجھے یہ حال کہاں سے حاصل ہوا ہے کہ دلی مقصد و مطلب کو بغیر کسی کے بتائے، پالیتا ہے بولا ایک فقیر کامل کی صحبت سے ماضی حال اور مستقبل کے احوال بعینہٖ ہی معلوم کر لیتا ہوں یہ سب میرے دل میں اُبھرتے ہیں اتفاقاً جو کچھ اُن دونوں کے بارے میں اس نے کہا تھا ظہور پذیر ہو گیا اور میں مکھی جنگل پہنچ گیا۔ میں وہاں جا کر وہاں کے فقرا کے احوال معلوم کرنے لگا۔ وہاں کے باشندوں نے سید نظیر محمد کا پتہ بتایا اور بولے کہ وہ کسی کی جانب متوجہ نہیں ہوتے خاص کر جو لشکری ہو اس سے تو بالکل ہی نہیں ملتے۔ کچھ وقت پہلے محترم خان یعنی مرتضیٰ خاں جو فرید آباد اور اطراف کے حاکم تھے اُن کے دروازے پر جا کر بیٹھ گئے انھوں نے اندر سے دروازے کو مضبوطی سے بند کیا اور گھر کی دیوار کود کر صحرا کو نکل گئے۔ خان موصوف مایوس ہو کر اُٹھ آئے۔ میں ایک دن شوق ملاقات میں اُن کے دروازے پر پہنچا اور ان کے خادم سے کہا (جناب) سید سے میرا سلام کہو۔ اس نے منع کیا، میں نے پھر کہا کہ جس وقت مناسب ہو کہنا۔ دوسرے دن میں پھر گیا اور خادم سے ماجرا پوچھا۔ بولا۔ میں نے جیسے ہی تمھارا سلام کہا خفا ہوئے اور فرمایا۔ مجھے لشکریوں سے کیا لینا ہے۔ کیوں پریشان کرتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ایک نیاز نامہ اس راہ ولایت و سلوک کے حقائق اور دقائق سے پُر لکھ کر خادم کے سپرد کیا کہ ان کے سامنے پیش کر دیں۔ جب میں تیسری بار گیا تو خادم نے کہا۔ سید نے تیرا خط پڑھا اور فرمایا کہ جس وقت وہ لشکری آئے مجھے خبر کرنا۔ خادم نے جا کر میری حاضری کی خبر دی۔ سید ایک ہاتھ میں بوریا اور دوسرے میں ایک کتاب لیے ہوئے باہر آئے۔ میں آداب بجا لایا اور خاموش بیٹھ گیا۔ انھوں نے بڑی مہربانی اور لطف کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ میرا طریقہ جیسا کہ تو نے دیکھا یہ اس لیے ہے کہ میں ہزارہا مخلوقات

میں خود کو ہی خدا نارسیدہ پاتا ہوں۔ اسی لیے جبراً نیکوں کو اپنی بری صحبت سے دور رکھتا ہوں۔ لیکن جس وقت سے تیرا خط پڑھا ہے میرا دل کہتا ہے کہ اس لشکری کی صحبت اٹھانی چاہیے۔ اب وعدہ کر کہ ہر ہفتے میرے پاس آیا کرے گا۔ جمعہ اور پیر کا دن مقرر ہوا۔ میں آدھ کوس کی مسافت طے کر کے طے شدہ دنوں میں اُن کی صحت میں جایا کرتا تھا۔ میں نے ان کو بڑا بزرگ صاحب مقامات و احوال اور نیک معالمت پایا اور راہ طریقت میں صادق اور مستقیم الحال دیکھا۔ دوران صحبت احوال مشائخ پر مشتمل کتب ''رشحات'' اور خواجہ بیرنگ قدس سرہ کی کلیات جو ہمیشہ میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں کا مطالعہ درمیان میں رہتا تھا۔ ان کے پاس بھی سلوک کے بہت سے رسائل تھے۔ عجیب وغریب صحبت میسر ہوئی۔ چنانچہ ایک دن میں اُن کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا وہ کھانا جو واقعی حلال خالص کہلانے کا مستحق ہے وہ جوان کا ہے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔ تمام وجوہ سے حلال کھانا میسر ہو جانا بہت دشوار ہے جیسا کہ ''رشحات'' میں ہے کہ ایک دن خضر علیہ السلام خواجہ عبدالخالق غجدوانی قدس سرہٗ کے پاس آئے۔ خواجہ جَو کی دو روٹیاں لے کر باہر نکلے اور خواجہ خضر سے فرمایا۔ تناول فرمائیے کہ لقمہ حلال ہے۔ خواجہ خضر نے کہا ایسا ہی ہے لیکن اس کا گوندھنے والا بے طہارت تھا مجھے اس کا کھانا روا نہیں ہے۔ (سید نظیر محمد) اپنے جد محترم شاہ نور سے جو کہ مجذوب سالک تھے اپنی نسبت باطنی کو درست فرماتے تھے، اور ان کی بہت عجیب وغریب حکایتیں بیان فرماتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ ایک دن شاہ نور ایک امام کے پیچھے ظہر کی نماز ادا کر رہے تھے دو رکعت کے بعد نماز چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد حاضرین نے پوچھا، شاہا! آپ نے یہ کیا کیا؟ بولے کیا کروں پہلے میں امام کے ساتھ عراق گیا انھوں نے وہاں گھوڑے خریدے اور وطن واپس آئے، میں بھی ساتھ ساتھ آیا جب امام صاحب نے یہ چاہا کہ گھوڑوں کو ہندوستان لے جائیں اور فروخت کریں میں تھک گیا تھا ان کے ساتھ نہ جا سکا، لاچار بیٹھ گیا۔ امام صاحب بڑے شرمندہ ہوئے اور حاضرین حضرت نور کے معتقد ہو گئے۔ وہ (سید نظیر محمد) دیکھے بغیر ہی میرے شیخ کے شیفتہ ہو گئے تھے اور میرے شیخ کی صحبت حاصل نہ ہونے پر بڑی حسرت و افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ ایک دن میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ اُن سے عرض کیا ''میرا حال صرف حیرانی ہے اور میں سراپا گناہوں سے پُر ہوں۔ توجہ فرمائیے تاکہ گناہوں سے خلاص ہو جاؤں انھوں نے بڑے پیار سے فرمایا۔ ''تو تو

ایسا ہے کہ تجھ جیسے سے گناہ نہ ہو۔' اسی ضمن میں بہت سی بشارتیں دیں جن کا اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں۔ ایک زمانے بعد مجھے سفر درپیش ہوا میں اجازت کے لیے ان کے پاس گیا۔ انھوں نے بغیر کہے ہی میرا مافی الضمیر سمجھ لیا۔ خود بھی بہت روئے اور مجھے بھی رُلایا اور کہنے لگے۔ ساری عمر میں کسی کی محبت میں مبتلا نہیں ہوا مگر تو نے مجھے اسیر کر لیا ہے۔ تقدیر میں یہی لکھا تھا اور یہ بھی فرمایا کہ اس قریے کے لوگ ہمیشہ اس حاکم کی، کہ تو جس کے ہمراہ ہے تبدیلی کے لیے مجھ سے دعا کے لیے کہتے تھے میں بھی اُن کی موافقت میں ہاں کہہ دیا کرتا تھا مگر میرا دل تیری نسبت کی وجہ سے دعا سے یکسو تھا، لیکن تقدیر نے اچانک تیرِ فراق میرے دل پر چلایا کیا چارۂ کار ہے۔ پھر فرمایا۔ جاؤ میں نے تمھیں اللہ کے سپرد کیا۔ میں وطن پہنچا۔ جب پھر لاہور آیا میں نے سید کے بارے میں معلومات کی پتا چلا کہ بہ عافیت ہیں۔ اس کے بعد خبر ملی کہ اُن کا تو 1041ھ یا 42(32-1631) میں انتقال ہو گیا۔

شیخ عبدالحق دہلوی

مجموعہ فضائل و کمالات اور منبع آثار و برکات تھے۔ آپ نے تمام علوم عقلی اور نقلی کا شروع جوانی سے آخر عمر تک درس دیا۔ 995ھ (1587) میں سفر حجاز کیا۔ حرمین شریفین کے طواف کے بعد محدثانِ عالی اسناد سے کتب احادیث کی تصحیح کی۔ آپ نے بعض خوابوں میں سردار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے استماع حدیث کیا اور حصول علوم دینیہ کی بشارت سے سرفراز ہوئے۔ شیخ علی متقی کے خلیفہ شیخ عبدالوہاب کی صحبت پائی اور خلافت سے نوازے گئے۔ طریقہ قادریہ اور شاذلیہ میں شیخ کے مجاز ہوئے۔ اپنے شیخ کی اجازت سے دہلی تشریف لائے۔ جب خواجہ بیرنگ قدس سرہ 1008ھ میں دہلی تشریف لائے۔ مستعدان و خداپرستان دائرہ قطیب کے گرد جمع ہو گئے۔ انھیں بھی خواجہ بیرنگ سے اخلاص و محبت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت غوث اعظم کے روحانی اشارے سے طریقہ نقشبندیہ اختیار کیا اور اجازت ارشاد پائی۔ انھوں نے حاصل شدہ نسبت نقشبندیہ کی ایک تمثیل دی ہے کہ دوسری نسبتوں کے علاوہ مجھے خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ سے ایک نسبت پہنچی ہے جو دوسری نسبتوں کے مقابلے میں روح اور جسم کی مثال رکھتی ہے۔ خواجہ بیرنگ ان کے حال پر کمال لطف و احسان فرماتے تھے۔ خواجہ بیرنگ کی وفات کے بعد اپنے گوشہ خلوت میں بیٹھ کر ارشاد

طالبان اور افادہ مستعدان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُن کے مریدین اور تلامذہ علوم ظاہری و باطنی میں کامیاب ہو کر کمال کو پہنچے۔ ان کا قول ہے کہ اس طریقے کے جو حقائق و دقائق خواجہ بیرنگ سے ظاہر ہوتے تھے، سمجھ میں نہ آتے تھے۔ انھوں نے فرمایا ہے تمام مراتب معنوی اور صوری جملہ ''عبدہ ورسولہ'' میں درج ہیں۔ عبدیت خاصہ خاص آپ (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات شریف کے لیے مخصوص ہے کہ بندہ خاص چند شخص نہیں ہو سکتے۔ خدا خود ایک ہے اس کا بندۂ خاص بھی ایک ہے اور سب (لوگ) اس کے طفیلی ہیں۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ عمل کی روح سنت پر عمل ہے خلاف سنت عمل بے جان قالب کے مانند ہے اور عبادت کی حقیقت حکم ماننا اور سنت کی موافقت ہے۔ اپنے وقت پر سنت کی نیت سے قیلولہ کرنا اس وقت ذکر اور نماز سے افضل ہے۔ حالانکہ اس میں اس حظِ نفس بھی ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ اجر بقدر حکم برداری ہوتا ہے نہ کہ بقدر مشقت۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ ایمان و معرفت جو کہ قلبی اعمال ہیں، بدنی اعمال ذکر و تلاوت پر جو کہ قالب کے اعمال ہیں ثواب میں کس قدر فضیلت رکھتے ہیں۔ حالانکہ قالب کے اعمال میں سختی اور مشقت زیادہ ہے۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ دوام زیادتی عمل میں اس اعتبار سے شمار ہے کہ ایک ہی عمل کو دوام کے ساتھ کرنے سے اس میں آسانی اور کیفیت میں ترقی ہو جاتی ہے۔ جس کا عمل زیادتی کی جانب رخ کیے ہوئے ہو وہ وعید ''من استوىٰ يوماه فهو مغبون''[1] سے باہر ہے۔ مغبون وہ ہوتا ہے جو دو دنوں میں اگلے ایک دن بھی کوئی نیک عمل زیادہ نہ کرے اور جو شخص دوام کے ساتھ کل گذشتہ کا عمل آج بھی نہ کرے اُسے تو محروم کہتے ہیں۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے۔ بندے کو چاہیے کہ اپنے پروردگار پر تخییر و تحکم کی جرأت نہ کرے کہ یا اللہ ایسا کر ایسا نہ کر وقتی صلاحیت اور احوال عارضی پر مغرور اور خوش نہ ہووے کیونکہ انسان تو (حقیقت میں) جاہل مطلق ہے کبھی بھلائی کو اپنے حق میں برائی سمجھ کر اس سے کراہیت رکھتا ہے اور کبھی برائی کو محبوب جانتا ہے۔ سیدی شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے تھے کہ اگر اختیار ہی کرنا چاہتا ہے اس بات کو اختیار کر کہ کچھ اختیار نہ کرے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اختیار یعنی تقدیر سے مت بھاگ۔ اور اگر تقدیر سے گریز ہی کرنا ہے تو وہ گریز بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہی طرف کو ہے۔ ''و ربک يختار و يخلق

---

1 جس کے دونوں دن کے عمل ایک سے ہوں وہ خسارہ والا ہے۔

مـــایشـــاء[1] '' یہ بھی ان ہی کا قول ہے کہ انبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم دو چیزوں کی دعوت دیتے ہیں۔ایک صانع جل وعلا کی ذات پر اس کی ان صفات کے ساتھ جس کا اس نے خود بیان کیا ہے یا اپنی تعریف کی ہے، اعتقاد اور اس کی یاد ہے اس طرح کہ ماسویٰ سے بالکل (قلبی طور پر) نسیان میسر ہو جائے۔ دوسری چیز طاعت وعبادت اور ان خدمات خلق کا بجالانا ہے جن کا اس نے حکم فرمایا ہے۔ذات وصفات کی حقیقت وکیفیت کی بحثوں میں پڑے بغیر حکم بجالانا ہے۔اصل کام تو وہ ذکر الٰہی ہے جس سے ذوق وشوق ومحبت خداوندی اُبھرے۔(لایعنی) بحث ومباحثہ چون وچرا تو دل میں قساوت پیدا کرتے ہیں۔ذات وصفات خداوندی میں اوقات کی بربادی اور زبانی قیل و قال کا طریقہ فلاسفہ کے طریقے سے میل کھاتا ہے جو حقائق اشیا میں صرف باتیں بناتے ہیں (حقیقت تک رسائی کی انھیں ہوا تک نہیں لگی) انتھی کلامہ۔

اوائل راہ سلوک میں میرے شیخ نے اُن سے علوم ظاہری میں استفادہ کیا ہے۔ وہ میرے شیخ کی نسبت فرماتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے اُن کو بچپن میں ہی قبول فرمالیا ہے۔اُن کی عربی فارسی میں بہت سی عالی قدر تصنیفات ہیں جو علم حدیث اور تاریخ ہند میں ہیں۔ اُن کی تمام چھوٹی بڑی تصانیف سو تک پہنچتی ہیں اُن میں زیادہ تر اُن کے واردات الٰہیہ کے تذکرے ہیں اور فیوضات لامتناہی کے مجموعے ہیں۔ان کی فارسی کی ''شرح مشکوٰۃ'' تو دنیا جہاں والوں پر ایک وسیع رحمت ہے۔ میں بارہا ان کا دیدار کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوا ہوں اور ان کے لطف وعنایات سے بہرہ ور ہوا ہوں۔اُن کی وفات کا سن ماہ ربیع الاول 1052ھ (9/ رجون 1642[2]) ہے اور قبر حوض شمسی کے اوپر ہے۔انھوں نے کئی پسر چھوڑے جو سب عالم وفاضل اور صاحبان اخلاق عالی ہیں۔اُن کے بڑے بیٹے شیخ نورالحق کا ذکر علاحدہ آئے گا۔ان کے فرزندان میں سے شیخ علی محمد نے حضرت غوث اعظم کے احوال پر لکھی ہوئی کتاب کے آخر میں ایک تکملہ لکھا ہے۔اس کے آخر میں اپنے والد محترم کے مجمل احوال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں تحریر کیا ہے'' قبلہ گاہی شیخ عبدالحق کے جو

---

1 تیرا رب جو چاہتا ہے اختیار کرتا ہے اور جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے۔

2 آپ کی صحیح تاریخ ولادت 958ھ/ 1551 ہے ''شیخ اولیا'' مادہ تاریخ ولادت ہے اور وفات 21/ ربیع الاوّل 1052ھ/ 9/ رجون 1642 ہے مادہ تاریخ وفات ''فخر العالم'' ہے۔

کچھ احوال فضائل، اور کرامات جو کہ سفر مکہ مکرمہ سے پہلے اور مکہ مکرمہ کے بعد کے ہیں یعنی تا حال کہ (آج) 1053ھ ہے لکھے جا چکے۔ بعض احوال کی خبر بعضے مجاذیب سے مجھے ملی ہے اور بعض ان کے تلامذہ اور مریدین سے دریافت و تحقیق کے بعد جمع کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد اصحاب صلاح وسعادت کو ظاہر ہوگا کہ حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اپنے بعض مخصوص بندوں کو خاص احوال و اطوار سے نواز کر فضل و کرامت کے کس منصب اعلیٰ سے سرفراز فرماتے ہیں۔''ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء''

مولانا عبدالحکیم

وہ اپنے زمانہ کے بڑے علما میں سے ہیں۔ احوال عظیمہ کے مالک، بڑے صاحب استقامت و معاملت اور رقیق القلب تھے۔ رونے والی آنکھیں رکھتے تھے۔ نسبت باطنی کو اپنے شیخ شمس الدین سے درست کیا تھا، علوم ظاہری و باطنی میں یگانہ وقت تھے۔ ان کے فضائل و کمالات ہندستان اور ماوراء النہر کے علاقوں میں اتنے مشہور ہیں کہ ان کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ وہ اس راہ سلوک و معرفت کی بڑی قیمتی باتیں کرتے تھے۔ اور جو کچھ کہتے تھے از روئے حال کہتے تھے نہ کہ از روئے علم۔ میرے شیخ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان سے حقائق و دقائق کا نہایت باریکی کے ساتھ بیان فرماتے تھے۔ اگر وہ باتیں تحریر میں آجاتیں بہت عالی اور عمدہ مجموعہ ہو جاتا اور اس قوم عارفین کا دستورالعمل بن جاتا۔ وہ میرے شیخ کو قدوۂ محققین کہہ کر خطاب فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ میں نے ان اہل تحقیق و معرفت کو بہت دیکھا ہے چاہیں وہ ایران و توران کے ہوں یا ہندوستان کے اور اُن کی صحبت اُٹھائی ہے لیکن خواجہ خرد کے علوم غریبہ کے اندر جو صرافت و حذاقت دیکھی کہیں نہیں پائی۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ اگر خواجہ خرد مستقل درس و تدریس، افاضہ علوم و فضائل میں لگے رہتے اور درویشی کی طرف اس قدر متوجہ نہ ہوتے تو تھوڑے وقت میں ہی علما ہندوستان ایران و توران کے کارخانہ مولویت کو درہم برہم کر دیتے۔ شیخ قاسم سہارن پوری جن کا ذکر آگے آئے گا فرماتے ہیں۔ اگر خواجہ خرد مسند شیخی کی طرف توجہ فرماتے تو اس زمانے کے شیوخ کی مشیخت کے کاروبار کی رونق چلی جاتی۔'' ایک دن اوائل حال میں کابل کے علما فحول میں سے ایک صاحب جن کا نام خواجہ فضل اللہ تھا

میرے شیخ کے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ خواجہ خرد سے ملاقات کی غرض سے میں نے اپنے اَجمال و اثقال (سواریاں اور سامان) تو آگے روانہ کر دیے اور خود یہاں حاضر ہوا ہوں انھیں خبر کر دیں۔ خبر سنتے ہی میرے شیخ آئے اور ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے چند علمی اشکال جو دقائقِ غامضہ پر مبنی تھے اور علما کابل اور لاہور سے اُن کی تسلی خاطر نہ ہوئی تھی، پیش کیے۔ میرے شیخ نے بے تکلف اور بغیر کسی غور و فکر کے ہر ایک کا شافی اور وافی جواب فرما دیا۔ وہ حیران رہ گئے اس کے بعد علوم تصوف کے حقائق کے کچھ مطالب سامنے لائے ان کا بھی جیسا کہ ہونا چاہیے اور برملا جواب دیا۔ اُن کا بہت دل خوش ہوا اور پہلے سے بھی کئی گناہ زیادہ حیرت زدہ رہ گئے اور اسی عالم حیرت میں گویا ہوئے۔ 'اے خواجم، مولانا عبدالرحمٰن جامی کے تبحر علم، تعمق فکر، جودت طبع اور فہم و فراست کے بارے میں کانوں سے سنا کرتا تھا آج اپنی آنکھ سے دیکھ لیا اور فرمانے لگے۔ خواجم آپ نے مجھے قید کر لیا۔ میں نے دل سے عہد کر لیا ہے کہ جو مہم درپیش ہے اس سے فارغ ہو کر واپس آ کر بس میرا ہاتھ ہوگا اور آپ کا دامن۔'' یہ کہہ کر وہ (خواجہ فضل اللہ) رخصت ہو گئے۔ ''رشحات'' میں ہے کہ ایک دن مولانا علی قوشچی ترکوں کی رسم و ہیئت میں کمر میں ایک عجیب قسم کا پٹکا باندھے ہرات میں مولانا جامیؒ کی مجلس میں آئے اور شاعری میں فن ہیئت کے چند نہایت مشکل دقائق سے سوال کیا۔ آپ نے بالفور ہر ایک کا شافی جواب فرمایا حتیٰ کہ مولانا قوشچی ان کی جلالت علم کے معتقد ہو گئے اور جیسا سنا تھا انھیں اس کی تحقیق ہو گئی۔ حضرت مولانا جامیؒ نے بطور خوش طبعی فرمایا مولانا آپ کے پٹکے میں اس سے بہتر کیا کوئی چیز نہ تھی؟ مولانا علی نے اس کے بعد اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ اس واقعے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ قدسی نفس انسان آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ میرے شیخ کا بیان ہے کہ ایک ایرانی ملا بہت سے علوم کا دعویٰ لے کر بادشاہ صاحب قران ثانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا۔ میں نے ہندوستان میں کوئی بھی ایسا عالم نہیں دیکھا جو میرے سوالات کے جواب دے سکتا۔ بادشاہ کو اس بات سے غصہ آیا اور مولانا عبدالحکیم کو سیالکوٹ سے طلب کیا اور فرمایا کہ ایک ایرانی عالم آیا ہے جو علوم غامضہ کی دقیق باتیں کرتا ہے وہ اپنے سر میں بڑا غرور رکھتا ہے۔ انھوں نے بادشاہ کے سامنے اس سے ''ایّاک نعبد و ایّاک نستعین'' آیۂ کریمہ کی ترکیب اور اس کے دقیق معنی کے حل کرنے کا سوال کیا۔ ایرانی جتنے بھی دلائل قوی سے بات کرتا تھا وہ اعتراضات (علمی سے) رد کر دیتے

تھے۔آخر کار بارگاہ صاحب قران ثانی کے علما میں یہ قرار پایا کہ دو دن کی مہلت دینی چاہیے تا کہ ایرانی عالم مطلب کو صاف کر کے جواب دے دے۔وہ بولے میں دو سال کی مہلت دیتا ہوں کہ ایرانی اپنے ملک جا کر وہاں کے علما سے تحقیق کر کے واپس آ کر جواب دے دے۔(حضرت مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) کی اس بات سے بادشاہ خوش ہو گیا۔آخر جب ایرانی جواب سے عاجز ہو گیا تو انھوں نے اصول تمیز حق و باطل کو پہلے پیش کر کے بادشاہ کے سامنے اپنے اعتراضات کے ایسے واضح اور لطیف جواب دیے کہ بادشاہ خوش ہو گیا اور ان کو عزیز رکھنے لگا۔بعض حاسدوں نے اُن پر یہ تہمت لگا رکھی تھی کہ انھوں نے اپنے گھر کے تہ خانے میں بہت سا خزانہ جمع کر رکھا ہے۔بادشاہ نے اس تہمت سے بھی اُن کو بری کر دیا۔وہ مالدار آدمی تھے۔طلبا کا مجمع ان کی خانقاہ کے اندر جمعیت کے ساتھ رہتا تھا اور علوم وفضائل دینیہ یقینیہ کو حاصل کرتا تھا۔ان کے بہت سے تلامذہ بڑے مشہور عالم ہوئے۔وہ باوجود افادۂ مستعداں اور درس متداولہ کی مشغولی کے اس راہ ولایت کے درد سے بھی خوب آشنا اور دلدادہ تھے۔میرے شیخ نے فرمایا ایک دن میں ان کے ہمراہ خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے مزار پر حاضر ہوا۔ہم دونوں خواجہ معین الدین (چشتی) قدس سرہٗ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے گانے والوں سے حسین شاعر کے اشعار پڑھنے کی جو بھی انھیں یاد ہوں خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے ایک نقش پڑھنا شروع کیا۔وہ کلام سن کر رونے لگے یہاں تک کہ اُن کا گلا رُندھ گیا۔ کیونکہ کلام نہایت با قیمت تھا، جو صاحب دل پر اثر کرتا تھا۔اس نے حاضرین میں بھی اثر کیا پھر تو مجلس کا جو حال ہوا وہ ہوا۔میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ انھوں نے کہا ہے کہ ایک بار میں اور میرے والد محترم جب میں 12 سال کا تھا ایک جگہ پہنچے دیکھا کہ فقرا کا ایک مجمع سر سے پیر تک ننگا اور عریاں بدن چلا جا رہا ہے اور ان کا مقتدا بڑی شان کے ساتھ ان کے آگے آگے چل رہا ہے۔میرے والد نے مجھ سے کہا کہ ان سے معلوم تو کرو کہ اس حال میں ان کا کہاں کا عزم سفر ہے۔انھوں نے جواب دیا۔ہم اس ذات کی تلاش میں ہیں جس کا تو طلب گار ہے۔یہ جواب سن کر میرے والد اپنی جگہ پر بیٹھ گئے رونے لگے اور اپنے آپ سے کہنے لگے۔اگر ان سے اللہ تعالیٰ پوچھے کہ اس (شکستہ) حال میں کیوں ہو؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ یہی جواب دیں گے کہ ہم آپ کی راہ محبت میں ساری وابستگیوں سے باہر نکل آئے ہیں۔نہ ہمارے پاس کچھ، نہ ہم آپ کے سوا کسی سے کوئی تعلق رکھتے

ہیں۔'' ''نفحات الانس'' میں روایت ہے کہ ایک بار خیر چہ پتھر کے پل پر کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے۔ خداوند جو چاندی کا طالب ہے اسے چاندی دے دے اور جو سونا چاہتا ہے اس کو سونا عنایت کر دے اور جو غلمان، سرائے اور زمین کا متمنی ہے بخش دے خیر چہ کے لیے تو بس تو کافی ہے۔ شیخ الاسلام (عبداللہ انصاری) قدس سرہٗ نے یہ سن کر فرمایا۔ اس کردی کا یہ حال و قال، ہمارے لیے غیرت کا موقع ہے۔ لیکن حق سبحانہ کا بندوں کو اپنی (محبت کی) طرف کھینچ لینا بے سبب و علت فضل خاص ہوتا ہے۔ بلالؓ کو باوجود اس کے کہ وہ ایک حبشی غلام تھے قبول فرمالیا ابوجہل عتبہ اور شیبہ کو جو سرداران مکہ تھے مردود کر دیا۔ حضرت بلالؓ نے ایسا کیا عمل کیا تھا کہ سبب مقبولیت ہوتا اور انھوں نے ایسا کیا بُرا کیا تھا جو ان کے مردود ہونے کی علت ہو گیا۔ ہر کوئی اپنی قسمت ازلی سے بندھا ہوا ہے اور کسی کو تقدیر ازلی میں چون و چرا کا کوئی حق نہیں۔ ''اوست سلطان آنچہ خواہد آن کند'' شیخ عبدالرحیم بہاری جو کہ عالم و فاضل و نیاز مند فقرا ہیں اور حضرت مولانا عبدالحکیم کے مخلص تلامذہ میں ہیں، فرماتے ہیں کہ میرے والد شیخ عبدالرشید، شاہ نعمت اللہ کے بڑے شناساؤں میں سے تھے مجھے بچپن میں شاہ نعمت اللہ کی خدمت میں لے جایا گیا وہ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ میں ایک زمانہ تک شاہ نعمت اللہ کی خدمت میں رہا۔ وہ صاحب ولایت اور صاحب کشف تھے۔ ایک دن وہ گنگا ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے کہہ رہے تھے۔ گنگا کیا تو ہماری مہمانی نہ کرے گی؟ اسی اثنا میں ایک بڑی مچھلی نے پانی سے سر باہر نکالا۔ اس کو پکڑ لیا، کباب بنائے اور سب نے کھائے۔ اس وقت انھوں نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا

چون نہنگ عشق من سر بر کشد از بحر شوق ماہیان ماہی وشان آیند پیشم بستہ طوق[1]

خاتم ملک سلیمان است علم جملہ عالم صورت و جان است علم[2]

اس کے بعد میرے سر میں تعلیم کا سودا ہو گیا اور میں طالب علم بن گیا اور عالم جوانی میں مولانا عبدالحکیم کی خدمت میں سیالکوٹ پہنچا اور نو سال اور چند مہینے تعلیم حاصل کی اور اس طریق معرفت

---

1 جب میرے عشق کا نہنگ، شوق کے سمندر سے سر ابھارتا ہے تو میرے آگے تڑپتی ہوئی مچھلیاں حسینوں کی طرح گلے میں طوق (گرفتاری) پہنے آ موجود ہوتی ہیں۔

2 علم، ملک سلیمان کی مہر (انگوٹھی) ہے۔ سارا عالم صورت ہے اور علم جان ہے۔

وحقیقت کے علم کا بھی استفادہ کیا۔اپنے حال پر ان کے بے پایاں الطاف وعنایات کو خوب دیکھا۔
انھیں کا فرمانا ہے کہ۔مولانا عبدالحکیم فرماتے تھے کہ بادشاہ اپنے دروازوں پر دربان رکھتے ہیں
ہمارا خدائے بے چوں دربان سے پاک ہے۔لیکن انسان کو وصول حق کی راہ میں زن وفرزندان
اور دوسرے دنیوی علائق کے موانع درپیش ہیں۔جو کہ خود کو (قلبی طور پر) ان علائق سے آزاد
کرے گا وہ بادشاہ حقیقی سے واصل ہو جائے گا۔

انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ حضرت مولانا عبدالحکیم (سیالکوٹی نے) فرمایا وصول حق کے لیے ہمارے
پاس دو راستے ہیں۔ایک عبادیہ (عبادیہ راہ سلوک) دیگر شطاریہ (راہ عشق ومحبت)۔عبادیہ یہ ہے
کہ نماز، روزہ، قیام لیل اور سارے فرائض سنن (نوافل) کو ادا کرے۔حلال کھائے اور سچ
بولے۔شطاریہ (کسی) اہل دل کا دل جیتنا ہے۔ان کا ہی قول ہے کہ ایک دن علاقے کے اہالی اور
موالی مولانا عبدالحکیم کے پاس درخواست لے کر آئے کہ اس سال سوکھا پڑ گیا ہے اس معاملے
میں دعا وتوجہ فرمائیں کہ رحمت عامہ کا نزول ہو۔(بارش ہو جائے) انھوں نے کہا۔میں عاجز ومجرم
کس منہ سے اور کس عمل سے یہ دعا چاہوں لیکن اس رات تم سب اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاروں
اور یاد خدا کرو میں بھی ایسا کروں گا اور وہ تمام رات اسی کام میں مشغول رہے۔دن کا نکلنا تھا،
بادلوں اور بارش کا آنا تھا۔

ان کا ہی فرمان ہے کہ ایک بار میں نے دریا کا سفر کیا تھا۔پانی کے اثر سے پیر سوج گئے تھے اور بے
پناہ تکلیف ہونے لگی تھی۔مولانا نے طبیب بھیجے ہر چند علاج کیا کارگر نہ ہوا۔آخر ایک رات میں
نے دل میں کہا یہ درد بے توجہ مولانا ٹھیک ہونے والا نہیں۔اسی صبح کو مولانا سرخ رنگ کی ایک
دوائی ہاتھ میں لیے تشریف لائے اور فرمانے لگے میں یہ دوا لے کر آیا ہوں، مطمئن رہو، جب میں
نے اُسے استعمال کیا ایک پہر نہ گزرا تھا کہ درد برطرف ہو گیا اور میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔شیخ
اسماعیل دہلوی کی جمع کردہ کتاب ''ملفوظ خواجہ بیرنگ'' میں ہے کہ اگر خواجہ بیرنگ چاہتے تھے کہ
تصرف کریں یا اظہار خرق عادت کریں اپنی ذات کی طرف اس کی نسبت نہیں کرتے تھے بلکہ
اسباب کی رعایت فرماتے تھے۔اسباب کا پردہ ڈال کر اس مہم کے لیے دعا وتوجہ اور تصرف کو
بروئے کار لاتے تھے۔کبھی دوا استعمال کرتے ہی اور کبھی استعمال سے پہلے ہی صحت ہو جاتی تھی۔

ایک بچہ قلعہ فیروز آباد سے جس کی بلندی نو گز سے بھی زیادہ تھی دریا کی جانب گر پڑا اس کی ناک اور کانوں سے خون بہہ رہا تھا سانس بھی مشکل سے آرہا تھا۔ اس کی والدہ اسے آپ کے پاس لے کر آئی۔ اس کے حال پر شفقت کو بروکار لاتے ہوئے کچھ دیر تک باطنی طور پر متوجہ حق تعالیٰ ہوئے اور اپنے ہاتھ میں ایک کتاب لے کر فرمانے لگے کہ اس کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وہ زندہ رہے گا۔ وہ بچہ آج بھی زندہ ہے حالانکہ اس کی حالت دیکھ کر کوئی عاقل اس کی زندگی کی امید نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے مولانا عبدالحکیم کو لاہور میں بہت بار دیکھا ہے یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ وہ صوبۂ پنجاب کے مفتی اعظم تھے۔ میرا دل اُن سے ملاقات کر کے نہایت محظوظ و مسرور ہوتا تھا۔ اس کے بعد میں نے انھیں دہلی میں اپنے شیخ کے ہمراہ بھی دیکھا ہے۔ ایک دن انھوں نے مشائخ طریقت کے ملفوظات کو اس انداز سے بیان کیا کہ میرے شیخ کا دل باغ باغ ہو گیا میں خود بھی خوب خوش ہوا۔ اُن کی وفات کا سال 1067ھ (1657) ہے اور ان کی قبر سیالکوٹ میں ہے۔

مولانا شاکر محمد

وہ علوم ظاہری کے عالم تھے۔ عمل طاعت و معاملت میں بڑے راسخ تھے۔ نیک اخلاق تھے۔ اپنے والد شیخ وجیہہ الدین سے نسبت کو درست کرتے تھے۔ شیخ عبدالعزیز چشتی کے پوتوں میں سے ہیں اور شیخ عبدالحق دہلویؒ کے شاگرد رشید ہیں۔ روایت ہے کہ انھوں نے کتاب مطول کا بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک (از اوّل تا آخر) چالیس بار درس دیا۔ شیخ عبدالعزیز کبار مشائخ چشت میں سے ہیں۔ بڑے صاحب احوال و مقامات و کرامات، صاحت وجد و سماع تھے۔ ان کی ولادت کا سال 898ھ (1693) ہے۔ جائے ولادت جونپور ہے۔ وہ ڈیڑھ سال کے تھے جب اپنے والد شیخ کمال الحق کے ساتھ دہلی تشریف لائے تھے۔ وہ اپنے زمانے میں یادگار مشائخ تھے۔ محتاجوں اور غریبوں کی حاجت روائی میں کمال سعی فرماتے تھے۔ اس شان عالی کے باوجود ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے سلسلے میں حکام، امرا اور اغنیا کے دروازوں پر جاتے اور اہل احتیاج کے کام نکالتے۔ کہتے ہیں کہ وہ تاتار خان حاکم دہلی کے پاس محتاجوں کی کار برآری کی سفارش کے لیے اتنی بار گئے کہ آخر کار وہ تنگ آ گیا اور بولا۔ اے شیخ مجھے اس قدر پریشان نہ کیا کریں۔ اگر آپ کو

کوئی ضرورت ہوتو رقعہ لکھ دیا کریں۔ کہنے لگے بس اس محتاج کا کام کردیں اس کے بعد عہد کرتا ہوں کہ پھر تکلیف نہ دوں گا۔ جب وہاں سے فارغ ہوکر چل پڑے گھر کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ ایک بوڑھی عورت بڑی منت وسماجت کے ساتھ کہنے لگی خدا کے واسطے حاکم وقت کے پاس جایئے اور کہیے کہ ایک لشکری نے مجھ سے ایک بیل تین روپے میں خریدا تھا۔ دو روپے دیے اور ایک روپیہ دیے بغیر بیل لے کر چلا گیا۔ وہ (اس بڑھیا کو لے کر) تاتارخاں کے دروازہ پر پہنچ کر دھوپ میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہوا نہایت گرم تھی۔ خدمت گاروں نے انھیں پھر دیکھا تو حیرت زدہ اور متعجب ہوئے اور حقارت کے ساتھ خان موصوف سے جا کر کہا ''وہ بوڑھا ابھی ابھی نہ آنے کا عہد کر کے گیا تھا پھر آ گیا ہے اور دھوپ میں بیٹھا ہے۔'' تاتارخاں بے اختیار چھپر کے مکان سے باہر دوڑے اور ان کی خدمت میں آ کر عرض کیا۔ ہاں کیا بات ہے فرمایئے؟ بولے ایک لشکری کے پاس اس بڑھیا کا ایک روپیہ باقی ہے، دلوایئے۔ خان نے بوڑھی کو خوش کر دیا اور نہایت شوق اور اعتقاد سے شیخ کے قدموں پر گر پڑے اور انھیں ''خس خانے'' میں لائے اور مرید ہوئے وہ مسجد، خانقاہ اور حجرہ جو ان کی قبر کے سامنے ہے انھیں کا تعمیر کرایا ہوا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن ایک حاجت مند نے اُن سے کہا کہ میری حاجت برآری کے لیے دریا کے اس پار جا کر عامل سے میری جانب سے یہ عرض کر دیں وہ بے تامل اُٹھے اور چل دیے۔ رمضان کا آخری دن تھا۔ ان کے فرزندوں نے جو کہ ہر ایک بجائے خود شیخ اور بزرگ تھے، بہت خوشامد کی کہ کل نمازِ عید ادا کر کے چلے جایئے مگر وہ نہ ٹھہرے اور بذریعہ کشتی دریا پار کر کے رات سونی (پت) قصبے میں گزاری وہاں اگلے دن نمازِ عید ادا کر کے محتاج کا کام اس عامل (کارندے) سے کرا کر لے آئے۔

اُن کے ایسے اور بھی بہت سے واقعات لوگ نقل کرتے ہیں۔ اُن کی وفات کا سال 975ھ (1567) ہے اور ''ذرّۂ ناچیز'' تاریخ وفات ہے۔ روایت ہے کہ وقت رحلت بھی اُن پر ذوق وحال کا غلبہ تھا اور ان کا انتقال بھی اس آیت پر ہوا۔ ''فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون'' قدس اللہ سرہ العزیز۔[1]

ایک دن بادشاہ صاحب قران ثانی نے مولانا شاکر سے سوال کیا کہ آپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں

1 آپ کا مزار مہندیان (دہلی) میں کی مسجد کے قریب ہے۔

پھر بھی رمضان المبارک کے سارے روزے رکھتے ہیں؟ کہنے لگے۔ جب تک دم میں دم ہے انشاء اللہ روزہ نہ چھوڑوں گا۔ آخیر (عمر میں) ایسا اتفاق ہوا کہ وسط ماہ شعبان میں سخت بیمار پڑ گئے۔ اس بیماری کی حالت میں کہتے رہتے افسوس میرے حال پر اگر میں حالت بیماری میں رمضان گزاروں اور روزہ نہ رکھوں۔ اسی حالت میں شعبان کی کسی آخری تاریخ کو 1063ھ (15رفروری1653) میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ میں نے اُن کی تاریخ وصال کہی۔ قطعہ

شیخ شاکر محمد آنکہ بعلم گوی از فاضلان عہد ربود

چون سفر کرد از جہان خراب ساخت معمور قصر جنت زود

سال تاریخ آن عزیز زمان گفت ہاتف کہ ''شیخ فانی بود''[1]

''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ ابوعبداللہ خفیف[2] کی روایت ہے کہ ابوبکر اسکاف[3] نے لگا تار 30 سال روزہ رکھا جب نزاع کا وقت قریب آیا روئی کا پھاہیہ تر کر کے اُن کے منہ کے سامنے لے گئے انھوں نے اس کو چھین کر پھینک دیا اور روزے کی حالت میں ہی دنیا سے چلے گئے۔ میرے شیخ کا ملفوظ ہے کہ گذشتہ زمانے میں جب ایک عالی مرتبہ بزرگ کا وقت نزاع آیا تو رمضان المبارک تھا۔ روئی کا ایک ٹکڑا تر کر کے اُن کے ہونٹوں پر رکھ دیا انھوں نے اسے پھینک دیا اور حالت روزہ ہی میں انتقال فرمایا۔ میرے شیخ نے اپنی جوانی میں مولانا شاکر سے ''تفسیر بیضاوی'' ایک چھپر کے نیچے بیٹھ کر پڑھی ہے۔ اس زمانے میں کبھی میں بھی اپنے شیخ کے ہمراہ ہوتا تھا اور اس منظر کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اشکال عبارت کبھی مولانا شاکر حل کرتے تو کبھی میرے شیخ۔ ایک دن دوران گفتگو یہ عبارت موضوع (بحث) تھی۔ ''مااحسن الاصدع علی خدودِ الامرد الملاح'' (خوبصورت امرد کے رخساروں پر پڑیں زلفیں پیچاں کتنی حسین لگتی ہیں) وہ اٹھنے لگے اور کتاب

---

1 شیخ شاکر محمد جو کہ علم میں فاضلانِ زمانہ سے سبقت لے گئے تھے۔ جب انھوں نے اس جہاں خراب سے سفر آخرت اختیار کیا تو فوراً قصر جنت کو معمور کر دیا۔ اس عزیز زمانہ کا سن تاریخ وصال ہاتف نے ''شیخ فانی بود'' کہا۔

2 شیخ ابوعبداللہ خفیف۔ آپ کا اسم گرامی خفیف بن اسفکشار نصی ہے۔ شیراز کے بڑے صوفیہ کرام میں سے تھے۔ آپ کی وفات 331ھ/942ء میں ہوئی۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کا بیان ہے کہ وہ شافعی مسلک تھے۔

3 ''نفحات الانس'' میں آپ کا نام 'ابوبکر الاسکاف'' تحریر ہے۔

لغت ''صراح'' میں لفظ اضدرع کے معنی دیکھنے چاہے۔ میرے شیخ نے بلا تامل کہا۔ اضدرع، ضدرع کی جمع ہے بمعنی گیسو یعنی زلف پیچاں بر رخسار ہائے امرد ملیح۔ سن کر وہ برجستہ بولے ''احسنت، خوب دریافت کیا'' میرے شیخ نے کہا۔ میں کیوں نہ دریافت کروں گا کہ ان چیزوں سے مجھے اکثر واسطہ پڑتا ہے۔ میں نے بھی اپنے شیخ کی جامعیت علم وعشق دیکھ کر یہ مشہور شعر پڑھا [1]

لب لعل و خط سبز و رُخ زیبا داری آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

میرے شیخ کا کہنا ہے کہ میں نے ابتدا حال میں کسی بھی استاد سے بہت کم (صرف ونحو) پڑھا ہے اور اس کے بعد کی کچھ ہی ادبیات بعض فضلا سے پڑھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کا بھی حق استادی میرے ذمے ثابت نہیں ہے مجھے جو کچھ ملا ہے عالم غیب سے ملا ہے۔ ''رشحات'' میں ہے ''مولانا جامی کے مطالعے کی کیفیت، مباحثے کی قوت، ہم سبقوں پر غلبہ مشہور عام ہے۔ ان کی چھٹیوں کا زمانہ بڑی فراغ دلی اور آسودگی حال میں گزرتا تھا۔ آپ کے سارے اوقات دوسری فکروں میں صرف ہوتے لیکن جس وقت درس کے لیے حاضر ہوتے سب پر غالب آجاتے تھے۔ مولانا معین بسوتی فرماتے تھے کہ مولانا جامی جب مولانا خواجہ علی کی مجلس درس میں ہوتے دوران درس متعدد طلبا جو بھی شبہے یا اشکال ظاہر کرتے مولانا فی البدیہ سب کو حل فرما دیتے تھے۔ آپ کو اپنے وسعتِ مطالعہ کی بدولت درس کی مجلس میں ہی دو تین شبہے وارد ہو جاتے تھے اور خود بخود حل بھی ہوتے رہتے تھے۔ یعنی اشکال پیدا ہوتے رہتے تھے اور خود ہی بغیر کسی سے پوچھے حل بھی ہو جاتے تھے۔ آپ صرف بعض رسمی علوم کی تحصیل کی غرض سے جو سماعت کرنے پر منحصر ہیں اس دور کے فضلا کے درس میں گئے ہیں ورنہ تو آپ کو نفس الامر (حقیقت) میں کسی سے تلمذ کی احتیاج نہیں تھی بلکہ استادوں پر آپ ہی غالب رہتے تھے۔ ایک دن آپ کے اساتذہ اور معلمان کا تذکرہ تھا۔ آپ نے فرمایا میں نے کسی بھی استاد سے اس طرح سبق نہیں لیا ہے کہ انھیں مجھ پر سبقت اور غلبہ رہا ہو بلکہ میں ہی غالب رہا ہوں۔ کبھی کبھی صرف سرسری طور پر کسی سے سبق لیا ہے۔ کسی کا بھی حق استادی مجھے پر ثابت نہیں ہے۔ میں حقیقت میں اپنے والد محترم کا شکرگزار ہوں کہ میں اپنے والد کا شاگرد ہوں۔ زبان (عربی اور فارسی) ان ہی سے سیکھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صرف

---

1 یہ لب لعل سرخ رُخسار اور خوبصورت چمکدار چہرہ جو کہ دنیا کے تمام حسین الگ الگ رکھتے ہیں تو تنہا رکھتا ہے۔

ونحو اپنے والد سے پڑھی ہے۔ اس کے بعد علوم عقلی اور نقلی میں آپ کو کسی کی چنداں احتیاج نہیں ہوئی۔ انتہی کلامہ

شیخ عبداللہ بہتہ

ابتدا میں انھوں نے سیاحت بہت کی اور بہت سے مشائخ کبار سے ملاقات کی ہے اور ان کی صحبت کی برکات سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ صحبت بزرگاں کے آثار، برکات اور انوارات بوجہ اتم ان سے ظاہر ہوتے تھے۔ عالی درجے کی صفتِ سخاوت سے متصف تھے۔ وہ عوام وخواص دونوں کے مرجع تھے۔ جو بھی اُن کے پاس آتا عام طور پر ہر ایک کو ایک فلس عطا فرماتے، بعض کو اس سے زیادہ دیتے اور جو بھی موقع پر ہوتا کھلاتے تھے۔ مرید سے محبت بہت کرتے تھے اور محبت میں مرید کو بدھو کہہ کر مخاطب فرماتے۔ سالوں سلسلۂ قادریہ کی مشیخت کا ڈنکا بجایا، اسی سلسلے میں غوث اعظم کے نام کی برکت سے شہرت عظیم پائی۔ روایت ہے کہ وہ چشتی الاصل ہیں جوانی میں ہی ہندستان آگئے تھے اور مسجد فتح پوری میں مقیم ہو گئے تھے پھر حجاز مقدس کا سفر کیا۔ حرمین شریفین کی حاضری کے بعد پھر ہندستان تشریف لائے اور اپنے شیخ کے اشارے سے اجمیر میں خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کے روضے کے نزدیک چلہ کھینچا پھر وہاں سے روح مبارک خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ کے اشارے سے دہلی آکر خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے روضے کے نزدیک بھی ایک چلہ کھینچا یہاں سے خواجہ قطب الدین کے اشارے سے ہندستان کے ایک قریے بہتہ میں پہنچ کر سکونت پذیر ہو گئے اور آخر عمر تک اسی بستی میں رہے۔ میرے والد نے ایک بار فرمایا کہ انھوں نے اس قریے میں پہنچ کر ارادہ کیا کہ حضرت غوث اعظم کا عرس کریں مگر ان کو غربت نے گھیر رکھا تھا۔ چند قوالوں کو بلایا اور گھاس کے فرش پر لا بٹھایا۔ میری سکونت وہاں سے کئی فرسخ پر تھی۔ میں نے اس عرس کو سنا میں کافی مقدار میں غلہ اور ایک بڑی صف بطور نذرانہ لے گیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مجھ پر بڑی شفقت و مہربانی فرمائی۔ اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں دہلی اور اس کے مضافات کے خرد وکلاں امیر وغریب اُن کے پاس آنے لگے اور اکناف واطراف ہندستان سے خلق خدا کا ان کی جانب رجوع بڑھ گیا۔ ایک دن شاہ جہاں بادشاہ صاحب قِران ثانی زمانۂ

شہزادگی میں اُن کے پاس آئے انھوں نے شاہزادے کوایک شمشیر عنایت کی۔اسی وقت سے ان کا کام ردنق پذیر ہوگیا۔روایت ہے کہ جہانگیر بادشاہ نے کسی کی شکایت پر انھیں غضبناکی کے ساتھ طلب کیا۔جب انھوں نے بادشاہ کو دیکھا کچھ پڑھ کرتالی بجائی بادشاہ نے پوچھا یہ کیا کیا؟ جواب دیا کہ میں نے بلاؤں کے دفع کے لیے پڑھا ہے۔بادشاہ کا دل نرم ہوگیا اور بڑے لطف کے ساتھ پیش آیا اور رخصت کیا۔یہ ان کی کرامت تھی جو بادشاہ غیور کے روبرو ان درویش سے ظاہر ہوئی۔
میرے شیخ فرماتے تھے کہ خواجہ ابرار نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں اس دن بادشاہ کے سامنے حاضر تھا جس دن کہ شیخ (موصوف) کو لایا گیا۔وہ سلامتیِ دل کے ساتھ معزز لوٹے۔یہ ان کے تصرف باطنی کا کام تھا۔میرے شیخ نے ان کو بہت دیکھا ہے اور وہ میرے شیخ سے بڑے اخلاص ومحبت سے پیش آتے تھے۔میرے شیخ کا ان کے بارے میں یہ بھی فرمانا ہے کہ درگاہ الٰہی میں ان کے مقبول ہونے کی دلیل اور برہان چند چیزیں ہیں ایک یہ کہ وہ کمال قناعت اور توکل سے متصف تھے کہ ابتدائے حال سے آخر عمر تک کبھی مخلوق کے دروازے پر نہ گئے اور کبھی بھی کسی بھی صورت میں کسی کے محتاج اور ملتجی نہ ہوئے۔دوسرے یہ کہ سید عبدالعزیز چشتی جو کہ خود بڑے بزرگ عالم اور عامل تھے،غوث اعظم کی روح مبارک کے اشارے سے ان سے مرید ہوئے۔آج ان کے بھائی سید عبدالحکیم جواں مرد عالم وفاضل ہیں اپنے وطن میں مخلوق[1] سے بے نیازی کی زندگی گزارتے ہیں۔ ہندستان بھر کے ہر چھوٹے بڑے کے مرجع ہیں اور اکثر لوگ ان کے احسان مند ہیں۔
''رشحات'' میں ہے کہ ایک دن ابتدائے حال سلوک میں مولانا شیخ حسین،مولانا داؤد اور مولانا معین نے جو کہ اصحاب المشارکین فی البحث گزرے ہیں اتفاق کر کے لطیفہ خوانی کی محفل سجائی اس وقت کے امیر کو دعوت دے کر دروازہ پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ملاقات کے بعد جب تینوں حضرات واپس آئے آپ (یعنی شیخ حسین) نے فرمایا۔میری اور آپ لوگوں کی موافقت اور اتفاق بس یہیں تک ہے اس کے بعد اس قسم کی محفل آرائی مجھ سے ممکن نہیں اس کے بعد ہرگز کسی اہل جاہ وثروت کے دروازہ پر کبھی نہیں گئے اور نہ ہی کبھی تنگی رزق سے پریشان ہوئے ہمیشہ گوشۂ قناعت اور فقر وفاقہ میں پائے ہمت کو دامن صبر میں سمیٹے رہے۔یہاں تک شیخ نظام کے کلام کا مضمون اُن

1 یہاں کامل متقی پرہیزگار صوفی مراد ہے۔

کے حق میں ظہور پذیر ہو گیا۔

چون بعہد جوانی از فرِ تو بدر کس نرفتہ از درِ تو
ہمہ را بر درم فرستادی من نمی خواستم تو می دادی[1]

میں بہت ہی چھوٹا تھا جب میرے والد مجھے شیخ عبداللہ کی خدمت میں لے گئے اور میرے لیے اُن سے دعا کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے مجھ پر بہت ہی لطف و مہربانی اور عنایت فرمائی۔ اس کے بعد میں ہمیشہ ان کی خدمت میں جاتا اور ان کے کرم و احسان کا حقدار بنتا۔ اُن کی وفات 10 رربیع الاوّل 1037ھ (29 رنومبر 1627) کو ہوئی اور ان کی قبر اسی علاقہ میں ہے۔ و یُزار و یُتبرک بہٖ۔

شیخ پیر میرٹھی

آپ احوال عظیم کے حامل، صاحب وجد و سماع تھے۔ طریقہ شطاریہ کا سلوک طے کیا تھا۔ بہت سے مشائخ کبار کی صحبت اٹھائی تھی اور فیضیاب ہوئے تھے۔ وسیع و لطیف مشرب رکھتے تھے۔ کبھی کبھی جہانگیر بادشاہ کے لشکر میں شامل رہتے۔ بادشاہ بھی ان کو معزز اور مکرم رکھتے تھے۔ بزرگوں کے اعراس میں سماع کی مجالس برپا کرتے تھے اور سرود خوش کن کا انتظام ہوتا تھا وہ ہندی زبان میں شاعری کرتے تھے اور بہت اچھا کہتے تھے ایسا کہ جو اہل دل کے دلوں میں تاثیر پیدا کرتا۔ آپ محتاجوں حاجت مندوں اور مستحقین کے لیے بھرپور کوشش کرتے اور اپنے خوان احسان سے بھی سے عطا فرماتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک سو بیس من آٹا یکبارگی میں ملا کر پکوایا اور فقرا اور غربا میں تقسیم کر دیا۔ ایک فقیر نے تھوڑا سا اس میں سے مجھے بھی کھلایا تھا۔ جوانی میں میں نے انھیں دیکھا ہے اور ان کی پابوسی سے بھی شرف یاب ہوا ہوں اور آداب نیاز مندی بجالایا ہوں۔ انھوں نے جو بھی اچھی دعا مانگی اس میں میرا حصہ رکھا۔ اُن کی وفات 9 ررمضان المبارک 1040ھ (9 راپریل 1631) میں ہوئی اور ان کی قبر ان کے شہر میں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایام جوانی میں وہ عشق مجازی میں گرفتار تھے اور آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک بار ایک گانے والی کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ اس کے

---

1. چونکہ جوانی کے زمانے سے ہی میں تیری مہربانی سے تیرے در سے کسی کے در پر نہیں گیا بلکہ تو نے سب کو میرے در پر بھیج دیا۔ میں کبھی تجھ سے نہیں مانگتا بلکہ تو مجھے خود بے مانگے عطا کرتا ہے۔

سازوں کومزدوروں کی طرح اس کے ساتھ ساتھ سر پر لے کر چلتے تھے۔ایک رات ایک دنیادار
نے اس گانے والی کو رقص کے لیے طلب کیا وہ ساز سر پر اُٹھائے اس کے ہمراہ گئے۔اتفاق کی
بات کہ وہ دنیادار ان کا مرید تھا۔اس نے پہچان لیا، اپنی مسند سے دوڑا اور اُن کے پیروں میں گر
پڑا اور مسند پر بٹھانے کے لیے نہایت الحاح اور عاجزی دکھائی لیکن انھوں نے نہ مانا۔یہ بھی مشہور
ہے کہ ایک بار وہ اسی عالم آزادگی میں ایک شہر میں داخل ہوئے اور ایک جگہ بیٹھ گئے رات کو بازار
میں ایک دکان پر سو رہے، اتفاق کی بات چوروں کا ایک گروہ اسی جگہ چوری کا مال تقسیم کر رہا تھا۔
کوتوال شہر کو پتہ لگا تو یہاں آیا لیکن اُن چوروں میں سے کوئی ہاتھ نہ لگا مگر اُن کو اس دکان پر پایا۔
پکڑا اور ہاتھ پیر باندھ کر حاکم شہر کو خبر پہنچائی کہ اُن چوروں میں سے ایک کو گرفتار کر لیا ہے۔حاکم
نے اُن کے مارے جانے کا حکم دے دیا۔صبح اُن کو اذیت خانہ لے جایا گیا تا کہ تختہ دار پر
چڑھائیں۔وہ ہنستے جاتے تھے۔کوتوال کو تعجب ہوا اور یہ بات حاکم شہر کو پہنچائی کہ یہ حال ہے۔
حاکم نے کہا اس کو میرے پاس لاؤ جب روبرو ہوئے ہو دیکھا کہ یہ تو شیخ پیر (میرٹھی) ہیں۔اچھل گیا
اور ان کے قدموں میں گر گیا اور بہت عذر خواہی کی اور کہا کہ کوتوال کو دار پر کھینچو کہ ایسی ناسمجھی کے
کام کرتا ہے۔انھوں نے کہا اس معاملے میں کوتوال کا کوئی گناہ نہیں۔میں چاہتا تھا کہ تجھے
دیکھوں، حق سبحانہ نے کوتوال کو لگا دیا تا کہ اس کے سبب سے تجھے دیکھ لوں۔اسے معاف کر۔اور
اس نے معاف کر دیا۔(میں نے سنا ہے کہ) ایک دن سید تاج الدین، سید علی قوام الدین کے پوتے
میرے شیخ سے کہہ رہے تھے کہ ایک بار میں شیخ پیر میرٹھی کے ساتھ شاہی لشکر گاہ سے گزر رہا تھا۔ان
کے قریب کسی نے ایک (موٹی) لکڑی سے بیل کو مارا انھوں نے ایک دردناک آہ بھری جب رات
آئی میں نے ان کے بدن کی مالش کرنی شروع کی دیکھا کہ اُن کے پہلو میں سوجن ہے۔میں نے
دریافت کیا۔اے شیخ یہ کیا ہے؟ بولے۔کچھ نہیں میں نے کہا۔"حَسبنا اللہ و نعم الوکیل" فوراً
بولے جو لکڑی اس نے بیل کے ماری تھی یہ اس کا اثر ہے۔"اخبار الاخیار" میں ہے کہ میر سید علی[1]

[1] میر سید علی جون پوری، سوانہ کے سادات میں سے تھے۔طلب حق میں جون پور تشریف لائے اور شیخ
بہاء الدین جون پوری کے مرید ہوئے۔آپ کی ولادت 827ھ/1424 کو اور وفات 905ھ/1499
کو ہوئی جون پور میں مزار ہے۔

ارباب کمال میں تھے صاحب سکر و وجد و حال تھے۔ انھوں نے چالیس سال تک خادم کو نہ کوئی حکم دیا اور نہ ہی کسی خدمت کو کہا۔ ایک رات سوئے ہوئے تھے۔ پیاس لگی۔ جو شخص سونے کی جگہ ہر رات پینے کا پانی رکھا کرتا تھا اس رات بھول گیا اور پانی نہ رکھا۔ انھوں نے اس جانب ہاتھ بڑھایا جہاں پانی رکھا رہتا تھا پانی نہ ملا تو پھر سو گئے۔ پیاس نے غلبہ کیا پھر پانی تلاش کیا نہ ملا۔ پیاس انتہا کو پہنچ گئی اور ہلاکت جان کا نمبر آ گیا مگر کسی سے پانی طلب نہ کیا۔ اللہ کے ساتھ کسی سے کچھ کام نہ لینے کا جو عہد کر رکھا تھا اسے نہ توڑا اور پیاسے جان دینا گوارا کیا۔ بولے کہ اے موت آ کہ تیرا وقت ہے اور پھر اضطرار میں پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا کوزے کو پانی سے بھرا پایا۔ پانی پیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ میر سید علی فرماتے ہیں کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں (ویسے تو) علی اپنے دروازہ پر (محبت الٰہی کے) ڈھول پیٹتا ہے مگر خلق خدا کے حال کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر ڈھول ہے تو وہ بھی آپ ہی کا ہے اور اگر دروازہ ہے تو وہ بھی آپ ہی (کی برکت) سے ہے علی بیچارہ بیچ میں کون ہوتا ہے۔ (اس عرضداشت پر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خلق خدا کے لیے دعا کر کہ تیری دعا اُن کے حق میں مستجاب ہے۔" سید قوام الدین کی قبر علی پور چند این بستی سے ایک فرسنگ پورب کی جانب ہے۔ اور میر سید علی کی وفات کا سال 955ھ (1548) ہے اور ان کی قبر جون پور میں ہے۔

(ویتبرک بہ) ایک امیر شخص جو کہ شیخ پیر کا ہم شہر تھا چاہتا تھا کہ کھدائی کرا کر پانی کی ندی شہر میرٹھ سے گزارے۔ کیونکہ اس کے گزرنے سے شہر کی عمارات وغیرہ کو نقصان پہنچنے کا بہت خطرہ تھا (جب ان کے سامنے یہ ذکر آیا تو برجستہ) اسی فکر میں ان کی زبان سے دو لفظ نکلے، ندی، ندی۔ اس امیر شخص سے میں واقف ہوں ایک لاکھ اور چند ہزار روپے اسی کام میں صرف کیے اور بار بار کوشش کی لیکن وہ ندی جاری نہیں ہوئی۔ اور خشک رہی۔ اس سلسلے میں یہاں یہ بات مشہور ہے کہ یہ شیخ پیر کے تصرف باطنی کا اثر تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن انھوں نے چاہا کہ ایک بزرگ کا عرس کریں لیکن کوئی کھانے کا سامان اور اس کی ضروریات ان کے پاس نہ تھیں۔ اُٹھے اور خدام سے کہا کہ دیگ کو دیگدان پر رکھیں اور پانی سے بھر دیں اور منہ ڈھک دیں۔ اور اس کے نیچے آگ جلانی شروع کریں۔ ایسا ہی کیا۔ ایک مقررہ وقت کے بعد مختلف قسم کا کھانا پک کر تیار ہو گیا۔ چنانچہ تمام

شرکا مجلس نے بانٹ لیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن ایک قصاب زادہ گائے کو لیے جاتا تھا۔ انھوں نے پوچھا کہاں جانا ہے اور اس گائے کو کہاں لے جائے گا بولا کاٹنے لیے کہ بالکل دودھ نہیں دیتی۔ انھوں نے کہا مت کاٹ کہ دودھ دے گی۔ اسی دن سے کافی دودھ اس گائے کا ہونے لگا اور مدتوں تک دیتی رہی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص رات کے وقت ان کی خدمت میں آیا۔ اور تنہائی میں التجا کرنے لگا کہ مجھے کرامت سکھا دیجیے اور ایسی ترکیب بتائیے کہ میری شیخی رونق پذیر ہو جائے اور میرا شہرہ ہو جائے۔ انھوں نے اس شخص سے کہا کہ جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کر۔ اس نے کہا جی منظور ہے، فرمائیے۔ فرمایا کہ اپنے کسی مرید کو کسی ایسے شہر میں جو تجھ سے چند فرسخ کے فاصلے پر ہو بٹھا دے اور (اس کو) سکھا دے کہ عید کے دن جب لوگ عیدگاہ سے گھر لوٹ رہے ہوں تو چھپ کر اپنے گھر آگ لگا دینا اور سب کے ساتھ مل کر بجھانے میں لگ جانا۔ اور تو خود جہاں کہ تو ہو اسی وقت پانی کے کوزے زمین پر بہانے شروع کر دینا اور مجذوبانہ شور مچانا کہ ٹھنڈی ہو ٹھنڈی ہو۔ جب حاضرین پوچھیں کہ یہ کیا ہے تو کہنا کہ فلاں مرید کے گھر فلاں شہر میں آگ لگ گئی ہے۔ مجھے کشف سے معلوم ہو گیا میں یہیں سے ٹھنڈی کر رہا ہوں حتیٰ کہ جب وہاں کے لوگ یہاں آئیں اور یہاں کے وہاں جائیں تو تیری بات کو سچ دیکھ کر کرامت سمجھیں گے اور تو مشہور ہو جائے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور ایسا ہی ہو گیا۔ میری ایسے کئی ریاکار مشائخ سے شناسائی ہے جنھوں نے خود کو کرامتی مشہور کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کی حکایت ہے کہ ایک دن ایک امیر شخص نے اُن کو دیکھا کہ اپنے چھوٹے سے گھوڑے پر سوار جا رہے ہیں مہربانی کی اور ایک عراقی بلند گھوڑا اُن کو دیا اور کہا آپ بزرگ و شیخ ہیں آپ کا گھوڑا ایسا ہونا چاہیے۔ دوبارہ جب اس امیر نے دیکھا کہ شیخ اپنے اسی چھوٹے گھوڑے پر سوار ہیں بولا۔ اے شیخ بڑے گھوڑے پر کیوں سواری نہیں کرتے؟ انھوں نے اپنی کمزوری اور ڈر چھپایا اور گویا ہوئے "میں اسی گھوڑے پر سوار ہوتا تھا لیکن ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ اس چھوٹے گھوڑے نے رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درگاہ میں مجھ پر استغاثہ کر رکھا ہے کہ شیخ مجھ پر سواری نہیں کرتے۔ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ کبھی کبھی چھوٹے گھوڑے پر سوار ہوا کر۔ اسی دن سے میں اس پر بھی سوار ہوتا ہوں۔" یہ بات سن کر وہ امیر ان کا معتقد ہو گیا اور اُن کی یہ کرامت مشہور ہو گئی۔ ایک اور شیخ تھے عمر دراز۔ انھوں نے ایک دن

عوام اور مریدوں کے مجمعے میں اپنے کپڑوں سے دھول جھاڑنی شروع کی۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ بولے فلاں امیر جو میرا مخلص ہے اس نے فلاں جگہ جو چند فرسخ آگے ہے اپنے ایک دشمن پر چڑھائی کی اور مجھ سے مدد طلب کی۔ میں گیا اور فتح دلائی۔ یہ گرد میرے لباس پر اس کے لشکر کی آئی ہے۔ ایک درویش شیخ چوکھا نام کے بستیوں میں گشت لگایا کرتے تھے اور غیب کی باتیں بتاتے پھرتے تھے۔ خود کو کرامتی مشہور کر رکھا تھا روز بروز فتوح اور نذرانے بٹورتے۔ بہت سے دانا بینا لوگ بھی اُن کے پاس آتے تھے۔ میں نے جوانی کے زمانے میں اُن کو دیکھا اور ان کا معتقد ہو گیا تھا کہ انھوں نے کرامت نما چند چیزیں دکھائیں۔ ایک یہ کہ سرخ رنگ اپنی منجھلی انگلی سے میری ہتھیلی پر ٹپکایا اور کہا۔ اپنے چہرے پر مل۔ میں نے مل لیا، خدمت بجالایا اور اچھا خاصہ نذرانہ مجھ سے لیا اور اسی طرح اس نے جا بجا کیا اس وقت اس کی عمر تقریباً اسّی سال تھی۔ یہ بات چھپی نہ رہے کہ یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بعض درویشوں نے کسی حکمت اور مصلحت سے اپنے حال کو چھپانے کے لیے ایسی چیزیں اختیار کر رکھی تھیں، انھوں نے بھی ایسا ہی کیا ہو۔ واللہ اعلم۔ جیسا کہ کہیں لکھا دیکھا ہے کہ اکثر ایسا بھی واقع ہوتا ہے کہ اولیائے حق سبحانہ اپنے حال کا اخفا اپنی بے سروسامانی کے پردے میں کیا کرتے ہیں۔ جھوجھو کی حکایت اپنے موقع پر انشاء اللہ دوسری جگہ لکھی جائے گی۔ ایک دن ایک مجذوب میرے شیخ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ہزیان گوئی شروع کر دی اس طرح کہ تمام حاضرین تنگ آ گئے علاوہ میرے شیخ کے، کہ وہ بشاشت تمام کے ساتھ اس کی طرف متوجہ رہے۔ جب وہ چلا گیا اور میرے اور ان کے سوا تمام حاضرین بھی چلے گئے تو میرے شیخ نے فرمایا ''کچھ دیکھا تم نے، یہ مرد ابدال میں سے تھا۔'' اس بات سے میں حیران رہ گیا۔ میں نے شیخ جھولن نام کا ایک جوان دیکھا ہے، اوپر جس مشغولی کا ذکر ہوا اس سے الگ نئی ہی طرز رکھتا ہے، اس کا مجمل قصہ یہ ہے کہ بچپن میں وہ میرے شیخ کے پاس آیا کرتا تھا۔ جوانی میں ایک مجذوب کے پاس پہنچا اور مستقل ان کی صحبت میں رہنے لگا۔ ان مجذوب کا حال اس پر آ گیا، مدتوں ایک جگہ کھڑا کھڑا اِدھر اُدھر ہلتا رہتا تھا۔ اس وجہ سے اس کا لقب ''جھولن'' پڑ گیا تھا۔ اب ایک زمانہ ہو گیا کہ اس کا تصرف دیوانوں پر اثر کرتا ہے، وہ ان کے جسم پر تقریباً سو گرہیں جنون سے اصلاح کے لیے بطور بند لگاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس سے رجوع کرتے ہیں اور خوب فتوحات پیش کرتے ہیں (نذرانے

لاتے ہیں) وہ کبھی کبھی میرے شیخ کے پاس آیا کرتا ہے اور اپنی شیریں اداؤں سے ان کا دل خوش کرتا ہے۔ ایک دن دیوانوں کے ایک گروہ کو رسی میں باندھ کر اپنے ساتھ لایا اور کہا ان میں سے ایک حافظ ہے اور ایک مولود خواں اور کہا کہ ان میں سے بعض تو روزانہ سو سو گرہ سے چھ چھ، سات سات تک پہنچ گئے ہیں اور ٹھیک ہونے کے بالکل نزدیک ہیں۔ حافظ سے کہا تو اس نے چند آیات پڑھ کر سنائیں، اس نے میرے شیخ کو یہ بھی بتایا کہ ہزار کے قریب دیوانے میرے ہاتھ سے ٹھیک ہو چکے ہیں۔ اپنے اور بھی تصرفات گنائے، اس وقت میرے دل میں آیا کہ جنون اور مالیخولیا کے علاج کے بارے میں دعا، تعویذ، اعمال، اوراد، ادویات اور معجونیں کتابوں میں آئی ہیں لیکن یہ گرہ لگانے کا فن بالکل تازہ علاج ہے اور سب پر غالب ہے۔ اس وقت مجھے ایک مشہور حکایت یاد آئی کہ ایک موحد عالم نے وجود باری تعالیٰ کے اثبات میں بہت سے ثقہ دلائل جمع کر رکھے تھے، کہتے ہیں کہ پانچ سو تک پہنچ گئے تھے، اس نے ایک دن کدال لیے ایک مزدور کو دیکھا اور پوچھا اگر کوئی کہے کہ خدا دو ہیں تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تیرے پاس کوئی دلیل ہے؟ وہ بولا میں خدا کو ایک جانتا ہوں مجھے کسی دلیل کی ضرورت نہیں لیکن اگر تو یہ بات دوبارہ زبان پر لایا تو اس کدال کو ایسا تیرے سر پر ماروں گا کہ دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ عالم اس کی اس بات سے خوش ہو گیا اور بیل دار کی اس بات کو بھی ان دلائل میں شامل کر لیا۔ کچھ نہ کہا اور اپنی راہ لی۔ ایک تازہ حکایت اور یاد آئی۔ روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی شاہجہاں بادشاہ صاحب قران ثانی کے سامنے گئے تا کہ اپنے وظیفے کے اجرا کے لیے درخواست کریں۔ ایک بوڑھا عالم، فاضل دوسرا ایک کم پڑھا لکھا جوان۔ بادشاہ نے اس بوڑھے سے معلوم کیا کہ شریعت میں داڑھی کی کتنی مقدار ہے؟ انھوں نے ہلکی آواز میں کتب فقہی کے موافق تقریر کرنی شروع کی جو بادشاہ کو سنائی نہیں پڑ رہی تھی۔ بادشاہ کو اچھا نہ لگا اور غصے میں بولے کیا کہتے ہو؟ اسی درمیان وہ جوان سامنے آیا اور بآواز بلند دلیرانہ گویا ہوا۔ اے بادشاہ، ''صاحب ہدایہ'' کہتے ہیں۔ ''یجوز علی المرء قطعه'' (مرد پر اس کے قطع کا حکم جائز ہے) اس نے صورت قطع کو اپنی داڑھی کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ہاتھ سے اچھی طرح سے اشارہ کر کے دکھایا۔ (کہ یک مشت سے زائد کا کاٹنا جائز ہے) بادشاہ کا دل اس ادا سے بہت خوش ہوا۔ اور جوان کا 5 روپے یومیہ اور بزرگ صاحب کا ایک روپیہ ماہانہ جاری کرنے کا حکم فرمایا۔ شیخ سعدیؒ

نے کہا ہے

گہ بود کز حکیم روشن رائے　　بر نیاید درست تدبیرے
گاہ باشد کہ کودکے نادان　　بغلط بر ہدف زند تیرے[1]

شیخ قطب عالم

آپ شیخ عبدالعزیز چشتیؒ کے فرزند اور شیخ چائلدہ سنگی کے مرید ہیں اور شیخ چائلدہ شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی کے مرید ہیں۔ علم و عمل سے خوب بہرہ یاب تھے۔ اہل طریقت اور صاحب احوال عظیم و استقامت تھے۔ جب شیخ چائلدہ کی وفات کا وقت قریب آیا جو کہ سنہ 998ھ (1590) ہے۔ تو شیخ قطب عالم کو جو ابھی لشکری ہی تھے، دہلی سے بلا کر خرقہ خلافت، عصا اور دوسرے لوازم مشیخت ان کو دے کر فرمایا "یہ آپ کے والد کی امانت آپ کے سپرد ہے۔" انھوں نے نوکری ترک کی اور اپنے والد کی قبر کے سرہانے بیٹھ گئے اور درس و افادۂ روحانی میں مشغول ہو گئے۔ خواجہ بیرنگ ابتدا حال میں جب دہلی تشریف لائے آپ نے کچھ وقت ان کی صحبت میں گزارا۔ جیسا کہ آپ نے دیگر تمام مشائخ کی صحبت کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔ اس (کتاب) میں خواجہ بیرنگ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ "گناہوں سے توبہ کی ابتداء خواجگی و سیدی خواجہ املنگی قدس سرہٗ کے خلیفہ مولانا لطف اللہ کے ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن رجوع اور ترک (توبہ) کا ڈر دل کے دامن گیر رہتا تھا۔ ظاہراً اگرچہ التماس فاتحہ آپ سے کر لی تھی لیکن جب استقامت کی توفیق میسر نہ ہوئی دوبارہ شیخ افتخار جو کہ سمرقند میں تشریف فرما تھے اور خانوادۂ خواجہ احمد بسری کے اکابر میں سے تھے) کی خدمت میں دوبارہ توبہ کی آپؒ نے میری بیعت قبول نہیں کی اور فرمانے لگے کہ ابھی تم نوجوان (چھوٹے) ہو۔ لیکن میری عقیدت کی پختگی کو دیکھ کر آخر کار فاتحہ پڑھی (دعا کی) اور فرمایا اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے۔ اس دلی خدشے کے بمو جب وہ عزم توبہ قائم نہ رہا اور عجیب خرابی ظہور پذیر ہوئی لیکن اب بغیر فقیر کی کوشش اور اختیار کے اتفاقاً بندگی حضرت امیر عبداللہ بلخی مدظلہ

1　کبھی ایسا بھی ہوتا ہے حکیم روشن رائے کی تدبیر غلط ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نادان بچہ اتفاق سے تیر نشانے پر لگا دیتا ہے۔

لاتے ہیں) وہ کبھی کبھی میرے شیخ کے پاس آیا کرتا ہے اور اپنی شیریں اداؤں سے ان کا دل خوش کرتا ہے۔ ایک دن دیوانوں کے ایک گروہ کو رسّی میں باندھ کر اپنے ساتھ لایا اور کہا ان میں سے ایک حافظ ہے اور ایک مولود خواں اور کہا کہ ان میں سے بعض تو روزانہ سو سو گرہ سے چھ چھ، سات سات تک پہنچ گئے ہیں اور ٹھیک ہونے کے بالکل نزدیک ہیں۔ حافظ سے کہا تو اس نے چند آیات پڑھ کر سنائیں، اس نے میرے شیخ کو یہ بھی بتایا کہ ہزار کے قریب دیوانے میرے ہاتھ سے ٹھیک ہو چکے ہیں۔ اپنے اور بھی تصرفات گنائے، اس وقت میرے دل میں آیا کہ جنون اور مالیخولیا کے علاج کے بارے میں دعا، تعویذ، اعمال، اوراد، ادویات اور معجونیں کتابوں میں آئی ہیں لیکن یہ گرہ لگانے کا فن بالکل تازہ علاج ہے اور سب پر غالب ہے۔ اس وقت مجھے ایک مشہور حکایت یاد آئی کہ ایک موحد عالم نے وجود باری تعالیٰ کے اثبات میں بہت سے ثقہ دلائل جمع کر رکھے تھے، کہتے ہیں کہ پانچ سو تک پہنچ گئے تھے، اس نے ایک دن کدال لیے ایک مزدور کو دیکھا اور پوچھا اگر کوئی کہے کہ خدا دو ہیں تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تیرے پاس کوئی دلیل ہے؟ وہ بولا میں خدا کو ایک جانتا ہوں مجھے کسی دلیل کی ضرورت نہیں لیکن اگر تو یہ بات دوبارہ زبان پر لایا تو اس کدال کو ایسا تیرے سر پر ماروں گا کہ دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ عالم اس کی اس بات سے خوش ہو گیا اور بیل دار کی اس بات کو بھی ان دلائل میں شامل کر لیا۔ کچھ نہ کہا اور اپنی راہ لی۔ ایک تازہ حکایت اور یاد آئی۔ روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی شاہجہاں بادشاہ صاحب قران ثانی کے سامنے گئے تاکہ اپنے وظیفے کے اجرا کے لیے درخواست کریں۔ ایک بوڑھا عالم، فاضل دوسرا ایک کم پڑھا لکھا جوان۔ بادشاہ نے اس بوڑھے سے معلوم کیا کہ شریعت میں واڑھی کی کتنی مقدار ہے؟ انھوں نے ہلکی آواز میں کتب فقہی کے موافق تقریر کرنی شروع کی جو بادشاہ کو سنائی نہیں پڑ رہی تھی۔ بادشاہ کو اچھا نہ لگا اور غصے میں بولے کیا کہتے ہو؟ اسی درمیان وہ جوان سامنے آیا اور بآواز بلند دلیرانہ گویا ہوا۔ اے بادشاہ، ''صاحب ہدایہ'' کہتے ہیں۔ ''یجوز علی المرء قطعه'' (مرد پر اس کے قطع کا حکم جائز ہے) اس نے صورت قطع کو اپنی واڑھی کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ہاتھ سے اچھی طرح سے اشارہ کر کے دکھایا۔ (کہ یک مشت سے زائد کا کاٹنا جائز ہے) بادشاہ کا دل اس ادا سے بہت خوش ہوا۔ اور جوان کا 5 روپے یومیہ اور بزرگ صاحب کا ایک روپیہ ماہانہ جاری کرنے کا حکم فرمایا۔ شیخ سعدیؒ

نے کہا ہے

گہ بود کز حکیم روشن رائے　　　بر نیاید درست تدبیرے
گاہ باشد کہ کودکے نادان　　　بغلط بر ہدف زند تیرے[1]

شیخ قطب عالم

آپ شیخ عبدالعزیز چشتیؒ کے فرزند اور شیخ چائلدہ سنگی کے مرید ہیں اور شیخ چائلدہ شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی کے مرید ہیں۔ علم وعمل سے خوب بہرہ یاب تھے۔ اہل طریقت اور صاحب احوال عظیم واستقامت تھے۔ جب شیخ چائلدہ کی وفات کا وقت قریب آیا جو کہ سنہ 998ھ (1590) ہے۔ تو شیخ قطب عالم کو جو ابھی لشکری ہی تھے، دہلی سے بلا کر خرقہ خلافت، عصا اور دوسرے لوازم مشیخت ان کو دے کر فرمایا ''یہ آپ کے والد کی امانت آپ کے سپرد ہے۔'' انھوں نے نوکری ترک کی اور اپنے والد کی قبر کے سرہانے بیٹھ گئے اور درس وافادۂ روحانی میں مشغول ہو گئے۔ خواجہ بیرنگ ابتدا حال میں جب دہلی تشریف لائے آپ نے کچھ وقت ان کی صحبت میں گزارا۔ جیسا کہ آپ نے دیگر تمام مشائخ کی صحبت کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔ اس (کتاب) میں خواجہ بیرنگ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ''گناہوں سے توبہ کی ابتداء خواجگی وسیدی خواجہ املنکی قدس سرہٗ کے خلیفہ مولانا لطف اللہ کے ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن رجوع اور ترک (توبہ) کا ڈرول کے دامن گیر رہتا تھا۔ ظاہراً اگرچہ التماس فاتحہ آپ سے کرلی تھی لیکن جب استقامت کی توفیق میسر نہ ہوئی دوبارہ شیخ افتخار جو کہ سمرقند میں تشریف فرما تھے اور خانوادۂ خواجہ احمد بسری کے اکابر میں سے تھے) کی خدمت میں دوبارہ توبہ کی آپؒ نے میری بیعت قبول نہیں کی اور فرمانے لگے کہ ابھی تم نوجوان (چھوٹے) ہو۔ لیکن میری عقیدت کی پختگی کو دیکھ کر آخرکار فاتحہ پڑھی (دعا کی) اور فرمایا اللہ تعالٰی استقامت عطا فرمائے۔ اس دلی خدشے کے بموجب وہ عزم توبہ قائم نہ رہا اور عجیب خرابی ظہور پذیر ہوئی لیکن اب بغیر فقیر کی کوشش اور اختیار کے اتفاقاً بندگی حضرت امیر عبداللہ بلخی مدظلہ

1　کبھی ایسا بھی ہوتا ہے حکیم روشن رائے کی تدبیر غلط ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نادان بچہ اتفاق سے تیر نشانے پر لگا دیتا ہے۔

العالی کی خدمت میں مصافحہ کرتے ہی وہ نعمت غیر مترقبہ ظہور پذیر ہوگئی امید اللہ تعالیٰ کی ذات عالی سے یہ ہے کہ اس عطیہ کی برکات یوم قیامت تک شامل حال بندہ رہیں گی۔ القصہ کچھ زمانہ نعمت یادداشت کی نگہ داشت میں مختلف اکابر کی صحبتوں میں گزرے۔ لیکن پھر اسم مضل کی تاثیر نے اس بندہ کو توڑ دیا اور وہ عہد توبہ شکستہ ہوگیا لیکن آخر کار حضرت صمدیت کی ہدایت کے طفیل خواب میں حضرت خواجہ بہاءالحق والدین کی خدمت میں صورت توبہ نصیب ہوگئی اور اہل اللہ کے طریقہ محبت کی طرف دل کا میلان بھی میسر ہوگیا۔ لیکن تلاشِ حقیقت میں ''الغریق یتعلق بکل خسک'' کہ ڈوبتا ہر تنکے کی طرف سہارے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ میرے ایک مخدوم نے رائے دی کہ وہی ذکر فائدہ مند ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے (سلسلہ وار) پہنچا ہو۔ پیاس اتنی شدید تھی کہ اُسی عزیز سے ذکر اور مراقبے کا طریقہ حاصل کیا اور دو سال کی مدت تک اسی عزیز کے سلسلے کے اوراد و وظائف اور طریقہ ذکر و مراقبے پر مداومت رکھی اور یہ سن رکھا تھا کہ جب تک سالک راہ محبت الٰہی میں چالیس سال تک لا الہ کے میدان کو پار نہ کرلے الا اللہ کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ میری سادہ مزاجی نے ایسا کر رکھا تھا کہ میں اسی ورد اور ذکر کو غنیمت سمجھتا تھا اور عبادت کی اسی صورت پر قناعت پذیر تھا۔ حالانکہ اسی زمانہ میں غیبی اشارے، دوسرے طریقہ ہائے سلوک بھی ظاہر ہوتے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی پہلے طریقے پر ثابت قدمی کے باوجود نادانستہ طور پر دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا تھا اور زمین دل میں بزرگوں کے کرم سے ''وفیھا ما تشتھی الانفس[1]'' کا تخم جمع رہتا تھا انشاءاللہ دست کرم اکابرین، محبت و مودت الٰہی کے اس تخم ''مالا عین رأت ومالا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بَشَرٍ[2]'' کو سیراب کرتا رہے گا۔ آخر میں، کشمیر پہنچا اور باباوالی قدس سرہٗ العالی کی صحبت بابرکت نصیب ہوئی اور ان کی توجہات کی برکات سے بہرہ مند ہوا۔ ''الحمد للہ والمنۃ'' کہ وہ متجلی نظریں اثر لائیں اور مقبول بارگاہ الٰہی ہوگئیں جب حضرت شیخ باباوالی قدس سرہٗ العالی اس سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے پیوست ہوگئے پھر تو طالبین کی استعدادیں ان کے آستانۂ عالیہ کے نفحات ربانیہ کے دریچوں سے اقبال مند ہوگئیں۔ حضرت کے دارالقرار انتقال کے بعد، حضرات خواجگان

---

1 وہ چیز (یعنی دیدار الٰہی) جسے تیرا دل چاہتا ہے جنت میں ہے۔

2 جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی کے دل پر اس کا خیال گذرا۔

نقشبندیہ کی نسبت معہودہ جلوہ گر ہوگئی اوران کی ارواح طیبات نے بشارتیں دینی اور تلقین ذکر کرنی شروع کی۔ان حضرات کی توجہات کے طفیل اس نسبت نے قوت حاصل کر لی، دائرہ عینیت نے کشادگی اختیار کر لی اور راہ روشن ہوگئی اور جمعیت ہاتھ لگ گئی۔ یہاں تک کہ ارواح طیبات اکابرین سلسلہ کی عنایت دعاوتوجہ سے مخدومی حقائق پناہی، ارشاد دستگاہی مولانا خواجہ امکنگی[1] کی خدمت میں پہنچا ہوا۔انھوں نے خودخواہش اور رغبت کے ساتھ بیعت ومصافحے کے لیے ہاتھ ہاتھ میں لیا اوراسی وقت طریقہ خواجگان حاصل ہوگیا اور حضرت کی صحبت کے طفیل خواجہ نقشبند اور ان کے خلفا کی ارواح طیبات کی توجہات سے بہرہ ور ہوگیا اوراسی سلسلہ عالیہ کے افتادگان اور نیازمندان میں داخل ہو گیا۔'' اللھم احینی مسکیناً و امتنی مسکیناً و احشرنی فی زمرۃ المساکین. والسلام علی من تبع الھدیٰ'' انتہیٰ۔میرے والد قطب عالم کے بڑے صحبت یافتہ لوگوں میں سے تھے اوران کی نظر عنایت کے مورد تھے۔میرے والد (سید لعل) نے فرمایا کہ'' جب تک میں نماز تراویح میں نہ پہنچتا تب تک وہ امام تراویح کو تکبیر نہ کہنے دیتے تھے اس بات سے بہت سے لوگ جو گرم ہوا میں نماز کھڑی ہونے کے انتظار میں بیٹھے رہتے مجھ پر رشک کرتے تھے۔'' میں کوئی چھ یا سات سال کا ہونگا کہ میرے والد نے مجھے ان کے قدموں میں لا ڈالا تھا۔بڑے نورانی صورت تھے۔انھیں دیکھ کر مشائخ کبار سلف یاد آتے تھے۔پچیس سال سے زیادہ ہوگئے ان کا رُخ روشن آج بھی ویسے ہی میری نظر میں ہے۔ان کی وفات کا سال 1023ھ (1614) ہے اوران کی قبران کے والد کی قبر کے نزدیک ہے۔

خواجہ محمد صدیق کشمیری

وہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے مرید ہیں۔خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے دیکھنے والوں اور صحبت داروں میں سے ہیں۔بڑے نورانی چہرے والے صاحب احوال نیک بزرگ تھے۔اپنے قبیلے کے سب خردوکلاں کو لے کر انھوں نے حجاز کا سفر کیا اور حرمین محترمین کی زیارت سے شرف یاف ہوئے۔

---

1 حضرت مولانا امکنگی ابن حضرت خواجہ درویش محمد قدس سرہٗ کی پیدائش 918ھ/1513 کو اور وفات 1008ھ/1600 کو ہوئی۔

وہاں کے مشائخ سے ملاقات کی اور باجمعیت صوری ومعنوی لوٹ کر آئے۔ روایت ہے کہ ایک بار مکہ میں انھیں کہیں سے کچھ فتوح نہ پہنچی وہ متعلقین کے لیے بڑے فکرمند اور پریشان خاطر ہوئے دو دن فاقے سے گزرے۔ تیسری رات کسی نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ باہر نکلے اور دستک دہندہ سے دریافت کیا۔ کیا بات ہے؟ وہ بولا۔ خدا کے لیے میرے ساتھ چلیے۔ انھوں نے ناآشنائی کی وجہ سے معذرت کی کیونکہ وہاں کے بعض لوگ اُن سے عداوت رکھتے تھے۔ اس نے پھر ضد کی کہ آپ کو ضرور چلنا ہے۔ آخر چل دیے۔ شہر سے باہر جا کر دیکھا کہ ایک جگہ چند عزیز ان بیٹھے ہوئے ہیں اور سونے سے بھری دو تھیلیاں اُن کے سامنے رکھی ہوئی ہیں ان سے کہا کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا نذرانہ ہے، لے لیں، آپ سونے کی وہ تھیلیاں نہ اُٹھا پائے۔ ان میں سے ایک صاحب ان کے ہمراہ ہوئے اور مع ان تھیلیوں کے آپ کو گھر پہنچا گئے مگر کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کون لوگ تھے؟ میں کبھی کبھی انھیں اپنے شیخ کے ہمراہ دیکھتا تھا اور ان کے حسین چہرہ کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان کی وفات 1051ھ (1642) میں ہوئی اور قبر خواجہ بیرنگ کے آستانے میں بنی۔ انھوں نے دو بیٹے چھوڑے ایک خواجہ عطاء اللہ کہ ان کا مستقل ذکر علاحدہ آئے گا دوسرے خواجہ محمد فاروق جو کہ سلطان وقت کے معزز لوگوں میں اور بڑے خوش کلام شاعر تھے۔ ابتدائے صحبت میں ایک دن انھوں نے یہ مصرعہ میرے شیخ کے روبرو پڑھا۔

''خدا را با محمد بود میلے''

میرے شیخ نے بے تامل دوسرا مصرعہ

''بدانسانیکہ مجنون را بلیلے [1] ''

انھوں نے کہا کہ ہاں یہی ہے دوسرا مصرعہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ میرے شیخ نے فرمایا یہ شعر پہلے سے میں نے کبھی نہیں سنا ہے یہ تو ابھی میں نے خود ہی کہا ہے۔ خواجہ محمد صدیق کشمیری کے صاحبزادے خواجہ محمد فاروق کے چند شعر پیش ہیں:

ہیچ چیز آزادہ را زنجیر نتواند شدن ۔۔۔ بوے گل را خار دامن گیر نتواند شدن [2]

---

1 خدا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی ہی محبت ہے جیسی مجنوں کو لیلیٰ سے تھی۔

2 آزادوں یعنی مستوں کو کوئی چیز بھی قید نہیں کر سکتی یعنی ان کا دل غیر اللہ کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا جیسے کانٹے خوشبو کا دامن نہیں پکڑ سکتے۔

بہر ردیش مصرع ثانی بر سد آفتاب　　مطلع حسن ترا آئینہ موزون می کند

من آن صیدم کہ باشد آشیان درچنگل بازش

ازآن چنگل بدان چنگل بود معراج پر وازش[1]

قطرہ بگریست کہ از بحر جدائیم ہمہ　　بحر بر قطرہ بخندید کہ مائیم ہمہ

تاجدائیم ز ہم صورت ہم می نگریم　　بہر دیدار ہم از خویش جدائیم ہمہ[2]

ہر کہ از خویش برون جست بسے دور اُفتاد　　گرد خود گرد چون پرکار کہ مرکز این جاست[3]

خواجہ عبدالرزاق

وہ اویسی نسبت رکھتے تھے۔اُن کی تربیت خواجہ احرار قدس سرہٗ کی روحانیت سے ہوئی ہے۔خواجہ بادشاہ کی اولاد میں سے ہیں۔بادشاہ صاحب قِران ثانی کے لشکری ہونے کے باوجود صاحب اخلاق عظیمہ اور اوصاف حمیدہ سے متصف تھے۔بادشاہ نے بہت چاہا کہ کہیں ایک جگہ (بغرض عبادت وافادۂ عوام) بیٹھ جائیں اور دربار بادشاہ سے وظیفہ لیتے رہیں۔مگرانھوں نے قبول نہ کیا بلکہ آیۂ کریمہ ''رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله'' کے موافق قباپوشی میں ''دل بیار دست بکار'' کے موافق زندگی کرتے تھے اور آیۂ کریمہ ''ادعوا ربّكُمْ تضرعاً و خفيه'' کے مطابق جیسا کہ نقشبندیہ حضرات کا طریقہ ستر واخفا ہے،کوبروئے کار لاتے تھے

از درون شو آشنا و از برون بیگانہ وش　　این چنین زیبا روش کم می بود اندر جہان[4]

1　میں ایسا شکار ہوں جو اپنا آشیانہ باز کے چنگل میں رکھتا ہے۔اسی طرح اس چنگل سے اس چنگل تک قید ہوکر پہنچنا ہی میری پرواز کی معراج ہے۔

2　قطرہ رویا کہ میں بحر سے جدا ہو گیا ہوں۔یہ سن کر سمندر قطرہ پر ہنسا،ہمارے سامنے تو کیا ہے،سب کچھ ہم ہی ہیں واقعی جب تک ہم جدا ہیں صورتوں کو بھی دیکھتے ہیں لیکن حقیقتاً اس کے دیدار کی غرض سے ہم اپنے آپ سے بھی بالکل جدا ہیں۔

3　جو اپنے آپ نے سے بیزار ہو گیا بہت دور جا پڑا اپنی حقیقت کے گردا گرد پرکار کی مانند گھوم کہ یہی مرکز اصلی ہے۔

4　باطن سے آشنا رہو اور ظاہری طور پر بیگانہ وار زندگی گزارو۔دنیا میں یہ حسین انداز زندگی کم ہی پایا جاتا ہے۔

''رشحات'' میں ہے کہ خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ میں نے مکہ مبارکہ زاد اللہ تعالیٰ شرفاً وکرامۃً میں نے دو شخص دیکھے ایک نہایت بلند ہمت دوسرا نہایت پست ہمت۔ پست ہمت ایک شخص تھا جو لوگوں سے ایسے باعزت گھر میں ایسی شرافت والی جگہ اور ایسے وقت عزیز میں بجائے حق سبحانہ سے مانگنے کے مخلوق خدا سے بھیک مانگ رہا تھا۔ بلند ہمت ایک دوسرا شخص ایک نوجوان تھا کہ پچاس ہزار دینار سے کچھ کم وبیش کی خرید وفروخت کرتا رہا مگر اس دوران ایک لمحے کو بھی اس کا دل (اللہ سے) غافل نہ ہوا۔ اس نوجوان سے حیا کے مارے میرا جگر خون ہوگیا۔ انتہیٰ

ایک دن ایک غالی صوفی خواجہ عبدالرزاق سے یہ بحث کررہا تھا کہ کافر بھی عارف باللہ ہوسکتا ہے اور وہ انکار کررہے تھے کہ کافر ہرگز عارف نہیں ہوسکتا۔ جب تک کسی شخص کے پاس شریعت اور طریقت کے دونوں پر نہ ہوں وہ فضائے معرفت میں پرواز سے قاصر ہے اور نہ ہی اسے معرفت حقیقی حاصل ہوسکتی ہے۔ کچھ لوگ اس غالی صوفی کی طرفداری کررہے تھے اور ایک مجمع اُن کی تائید کررہا تھا۔ اس بحث کا کسی نے میرے شیخ کی محفل میں ذکر کیا (میں بھی حاضر خدمت تھا)۔ میں نے اپنے شیخ سے عرض کیا اس وقت اس کی مثال میں مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے اگر حکم فرمائیں تو کہوں۔ انھوں نے کہا کہو۔ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک دن خواجہ بایزید بسطامیؒ پر ایک حال عظیم طاری تھا اور حالت سکر میں تھے۔ انبساط قلبی کے اثر سے اُن کا جسم بڑھنا شروع ہوگیا۔ حتیٰ کہ تمام گھر اُن سے پُر ہوگیا اور ایک ساعت بعد ہی گھٹنے لگا اور جیسے تھے اس سے بھی زیادہ نحیف ونزار ہوگئے۔ ایک خادم نے جس نے یہ تمام ماجرا دیکھا تھا عرض کیا۔ ''اے شیخ جو کچھ ابھی آپ کی حالت ہوئی اس میں کیا راز ہے۔ فرمانے لگے میں نے ابھی (کشفاً) دیکھا کہ قطب وقت کا انتقال ہوگیا ہے۔ تو معاً مجھے یہ وسوسہ آیا کہ اب اس کام کے لائق میں ہی ہوں۔ میں نشاط میں بڑھنے لگا جیسا کہ تو نے خود ملاحظہ کیا۔ اسی اثنا میں ایک ستر سالہ کافر کو لایا گیا، اسے مسلمان کیا اور مقام قطبیت اس کے نام کردیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شان بے نیازی دیکھ کر نحیف ونزار تر ہوگیا ہوں اور اس بات سے ڈر رہا ہوں کہ کہیں اس کا کفر مجھے نہ دے دیں۔ میں نے اپنے شیخ سے عرض کیا'' کیا تعجب ہے کہ کسی کافر کو معرفت سے شرف یاب کرنا چاہیں تو ایک آن میں اسے مسلمان کریں اور معرفت عطا فرمادیں حالانکہ ابھی تک اس کا ظاہری لباس اور طریقہ بودوباش کفر میں ملوث ہو۔ میرے شیخ نے کہا۔ بہت خوب، بڑی اچھی بات سامنے

لائے۔ خواجہ عبدالرزاق میرے شیخ کے مخلص اور دوستوں میں سے تھے اور آپس میں خوب میل ملاپ اور صحبتیں رہتی تھیں جو شخص بھی اُن سے ملتا تھا اپنے اخلاق عالی سے اسے خوش کر دیتے تھے۔ اُن کے یاران طریقت میں سے محمد مراد کا قول ہے کہ ایک دن وہ کشمیر میں خواجہ خاوند محمود کی مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد خواجہ خاوند کے بیٹے کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ میں اور دوسرے بہت سے احباب بھی ہم مجلس تھے۔ اہل مجلس نے پہلے آیات قرآنی، اس کے بعد ''مثنوی معنوی''، ''حدیقۃ الحقائق'' اور مشائخ کے ملفوظات پڑھ کر سنائے کہ مجلس میں (محبت و معرفت الٰہی کی) گرمی پیدا ہو جائے کچھ اثر نہ ہوا تو انھوں نے اسی اثنا میں

شدیم پیر ز عصیان و چشم آن داریم   کہ جرم ما بجوانان پارسا بخشند [1]

یہ شعر کچھ اس انداز میں پڑھا کہ سنتے ہی اہل مجلس پر حال طاری ہو گیا۔ رقت و گریہ جاری ہو گیا اور ساری رات یہی حال قائم رہا۔ میں بار ہا ان کی ملاقات کے لیے گیا ہوں۔ ایک دن پا پیادہ کئی فرسخ ان کے ہم سفر رہا ہوں۔ دورانِ سفر انھوں نے ایسا اخلاق دکھایا اور ایسی خاطر داری کی کہ راستے کی ساری تھکن انشراح میں بدل گئی بڑی پر لطف باتیں دوران سفر رہیں۔ اُسی میں ہندی گویوں کی بھی بات آئی انھوں نے کہا کہ (سپہ سالار) سید فیروز اچھا گانے والوں کو میرے پاس لے کر آتے تھے اور بڑے انبساط میں وقت گزرتا تھا۔ سید صاحب اُن گانوں کے بڑے اچھے معنی بیان کیا کرتے تھے۔ (ایک بار میں نے اس کی تحقیق سید فیروز سے کی تو انھوں نے کہا، ہاں ایسا ہی ہوتا تھا) ایک بار میں ایک گوئیے کو اُن کی خدمت میں لے گیا۔ اس نے شیر محمد کا ہندی کلام پڑھنا شروع کیا

جہار بروتہ آنکھیں جھیہ دیکھیں اور   آگ لاگوا نہ ہیر بن جو وے دوجہ نہور [2]

یہ کلام سن کر وہ بولے اس گوئیے کا حال اس کلام سے بالکل موافقت نہیں کرتا پتا نہیں کس کی توجہ سے وہ یہ پُر معانی کلام سنا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بار ایک صاحب کرامت ولی کسی سرائے کے مالک کے گھر رات کو آئے اور صبح اُٹھے اور چلے گئے۔ صاحب خانہ کو

---

1   گناہ کرتے کرتے ہم بوڑھے ہو گئے مگر ان کے کرم سے یہ امید ہے کہ ہمارے جرموں کو اولیاء اللہ کے صدقہ میں بخش دیں گے۔

2   یہ آنکھیں اندھی ہو جائیں اگر تجھ بن غیر کو دیکھیں اور اس دل کو آگ جلا دے سارے ہیر جو کسی دوجے کو چاہے۔

کچھ آگاہی اُن کے حال سے نہ ہوئی کہ کون شخصیت تھے۔ (میری یہ مثال سن کر) وہ خوش ہو کر بولے "واہ واہ کیا بات کہی" (حضرت) شیر محمدؒ نے پارسی میں یہی بات اس طرح کہی ہے

خاک در چشمے کہ جز رویت بغیرے وا کند　　　آتش افتد در دلے کو غیر عشقت جا کند [1]

میں نے ان شیر محمدؒ کی بہت زیارت کی ہے۔ شیخ نصیرالدین اکبرآبادی کے مرید تھے۔ سماع کا بڑا صحیح ذوق رکھتے تھے۔ ہندی شعر کہتے بھی خوب تھے اور گاتے بھی خوب تھے۔ اُن کا کلام مشہور ہے اور مجالس سماع میں پڑھا جاتا ہے۔ پوربی علاقہ میں 1060ھ (1650) میں انتقال ہوا۔ خواجہ عبدالرزاق کی وفات 1050ھ (1641) میں ہے اور قبر خواجہ بادشاہ کی قبر کے نزدیک ہے۔ ان کے پسر خواجہ مسعود بڑے اچھے آدمی تھے۔ مجذوبانہ باتیں کرتے تھے جو بہت کم کسی کی سمجھ میں آتی تھیں۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ خواجہ خضر میرے پاس آتے ہیں اور صحبت اچھی گزرتی ہے یہی بات وہ بزرگان سلف کی ارواح کے بارے میں بھی کہتے تھے۔ وہ میرے شیخ کی نسبت کہا کرتے تھے کہ اگر مولانا جامی اس زمانے میں ہوتے تو علوم معرفت و توحید کا استفادہ اُن سے کیا کرتے۔ اُن کی میرے حال پر بڑی مہربانی رہی۔ اُن کی وفات کا سال 1060ھ (1650) ہے اور قبر ان کے والد کی قبر کے پاس ہے۔

محمد شریف خاں

بڑے پُر شکوہ، روشن طلعت، صاحب وجد و حال بزرگ تھے۔ چشم گریاں سینہ بریاں، رقیق القلب اور صاحب ذوق سلیم بھی۔ کلام پُر ذوق سے خوب لطف اندوز ہوتے اور حال طاری ہو جاتا۔ شیخ محمد فضل اللہ اور شیخ عیسیٰ سندھی کے صحبت یافتہ اور اُن سے اجازت یافتہ تھے۔ میر محمد مومن جو کہ مشائخ کبار اور کاملانِ وقت میں سے تھے نے ولایت (ماوراء النہر) سے اُن کو خلافت نامہ بھیجا، اس کے بعد راہ کی جو تھوڑی بہت بستگی رہ گئی تھی وہ بھی کشادہ ہوگئی۔ ابتدائے حال میں وہ ایک لشکری تھے۔ سپہ سالار معصوم خاں کابلی کے معزز اور مقرب لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس زمانے

1　وہ آنکھ خاک آلودہ ہو جو تیرے سوا کسی کا چہرہ دیکھے۔ اس دل میں آگ لگ جائے جس میں تیرے سوا کسی کا عشق بسا ہو۔

میں بڑی بڑی جنگوں میں شریک ہوکر نمایاں کارنامے بہادری بلکہ تہور کے انھوں نے دکھائے۔ آخر کار نوکری ترک کر کے گوشۂ گمنامی میں بیٹھ رہے۔ آخر عمر تک خواجہ ابرار کی صحبت میں رہے۔ کیا خوب استقامت رکھتے تھے۔ شیخ دوست محمد جو کہ میرے شیخ کے مخلص و صادق دوست تھے اور چھپ کر فقرا کو صدقہ کرتے تھے۔ اور نہایت صاحب فہم تھے۔ ان کا سال وفات 1050ھ (1640) ہے، وہ ان کی مجلس نکاح میں آئے ہوئے تھے میں بھی اپنے شیخ کے ہمراہ تھا۔ میرے شیخ محمد شریف خاں سے مل کر بیٹھے تھے کہ خواجہ ابرار بھی تشریف فرما ہوگئے تینوں بزرگ یکجای ہوگئے تو یہ مجلس بڑی پُر رونق ہوگئی اور صحبت یاراں اس سے بھی خوب تر۔ میں جوان تھا اور یہ میری اپنے شیخ کے ساتھ اوائل صحبت کا زمانہ تھا۔ اس اجتماع بزرگاں نے میرا دل موہ لیا اور میں بے اختیار کہہ اُٹھا

دیدار این سہ مرد مرا یاد حق نمود آرے باجتماع ہزر راست معرفت [1]

اس موقع پر مجھے اپنی ہی غزل کا ایک شعر یاد پڑتا ہے جسے میں نے کسے کے تتبع میں کہا تھا استاد شاعر کا مطلع یہ ہے

کہنہ شد خرقہ و تسبیح و مصلا ہر سہ بایدم میکدہ و ساقی و صہبا ہر سہ [2]

اور میرا شعر یہ ہے کہ

تا بدیدیم رخ و سبزہ و لعلِ لب تو یوسف و خضر و مسیحا شدہ یکجا ہر سہ [3]

شریف محمد خاں کی وفات کا سال 1030ھ (1621) ہے ان کی قبر مرتضٰی علی کی قدم گاہ کے نزدیک ہے۔ آج اُن کے ایک فرزند محمد ابوالنصر جو اچھے انسان اور خوش گو شاعر ہیں اور سلاطین کے یہاں معزز و مکرم ہیں۔ یہ غزل اور رباعی ان ہی کی ہے

---

1 ان تینوں بزرگوں کے دیدار سے مجھے اللہ یاد آگیا۔ ہاں ہاں معرفت (بزرگوں کے) اجتماع دلی کے ساتھ ساتھ ہے۔

2 یہ خرقہ، تسبیح اور مصلا تینوں پرانے ہو چکے ہیں اب مجھے در میکدہ، ساقی اور شراب چاہیے۔

3 جب میں نے تیرا چہرہ، سبزۂ رخسار اور سرخ لب دیکھے ایسا محسوس ہوا ہے گویا یوسف علیہ السلام خضر علیہ السلام اور عیسٰی علیہ السلام ہر سہ کا اجتماع ہوگیا ہے۔

گلعزارم تا گذارے کردۂ کاشانہ ام | بوے گل می آید از دودِ چراغ خانہ ام
شمع و گل را چون برخسارِ تو باشد نسبتے | در گلستان بلبلم، در انجمن پروانہ ام
ساغر چشم مدامت از شراب اشک تر | ہیچ گہہ در دور تو خالی نشد پیمانہ ام
ہر طرف آرد ہجوم اند وہ جان غافلم | سنگ طفلان ہر کجا بارد سر دیوانہ ام
بختِ من از دیدنِ من چشم می پوشد مگر | از براے بختِ خواب آلودہ خود افسانہ ام
شمع رویش ہر کجا پر تو فگن گردد بفور | مستعد سوختن ہمچون پرِ پروانہ ام [1]

رباعی

آنم کہ قضایم ہمگی گشتہ چو رُو | خورشیدم نور می دہد از ہمہ سو
من آئینۂ سکندر و جامِ جم | پوشیدہ نہان نیست زمن یکسرِ مو [2]

ابوالفیض جو کہ شریف خاںؒ کے پوتے ہیں۔ نہایت غریب اور نیک نہاد ہیں ان کا کہنا ہے کہ جس وقت خان نے نوکری نہ چھوڑی تھی ایک دن اسی دوران شیخ عیسیٰ کی مسجد میں آئے۔ اتفاق کی بات شیخ عیسیٰ کے ایک مرید شیخ برہان پر حالت قبض طاری تھی خان صاحب کو دیکھ کر انھیں لشکری سمجھ کر وہ ستون مسجد کے پیچھے جا چھپے۔ خاں نے ان کو دیکھا اور اُن کے پاس پہنچے اور بولے۔ اگر کسی پر حالت قبض طاری ہو تو اسے سلام ترک نہ کرنا چاہیے۔ اسی وقت ان کی کمر پر ہاتھ پھیرا فوراً ان کی حالت قبض رفع ہوگئی اور اس کے بجائے حالت بسط پیدا ہوگئی۔ جب وہ شیخ عیسیٰ کے پاس

1 اے میرے محبوب جب سے تو میرے کاشانے سے ہو کر گزرا ہے تبھی سے میرے گھر کے چراغ کے دھوئے سے بھی خوشبو آرہی ہے کیونکہ تیری نسبت بطور مثال شمع اور گل سے کرتے ہیں اس لیے میں گلستان میں تو بلبل بن کر چہکتا ہوں اور انجمن میں پروانے کی مانند جلتا رہتا ہوں۔ میرے آنکھوں کا ساغر ہمیشہ شراب اشک سے تر رہتا ہے۔ اے میرے محبوب تیرے دور میں میرا پیانہ کبھی خالی ہی نہیں ہوتا۔ ہر طرف غموں کے ہجوم آرہے مگر میری جان کو خبر بھی نہیں جہاں جہاں بچوں کے پتھر برستے ہیں وہیں میں دیوانے کا سر بن جاتا ہوں۔ میرا نصیب مجھے دیکھنے سے آنکھ بند کیے ہوئے ہے۔ میں اپنے بخت خواب آلودہ کے لیے افسانہ بن کر رہ گیا ہوں۔ جہاں بھی تیرے چہرے کی شمع پرتو فگن ہوتی ہے وہیں میں فوراً پر پروانہ کی طرح جلنے کو مستعد رہتا ہوں۔

2 میں وہ ہوں کہ نوشتہ تقدیر میرے روبرو رہتا ہے۔ مجھ پر سورج ہر سمت سے نور برستا رہتا ہے۔ میں سکندر کا آئینہ اور جم کا جام ہوں۔ مجھ سے بال کا ایک سرا بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

پہنچے تو شیخ نے کہا۔ کہو جی شیخ برہان، محمد شریف خاں نے تمھارا قبض کس طرح برطرف کیا؟ دیکھیے لشکریوں کے لباس میں بھی ایسے صاحب دل ہوتے ہیں ان کا ہی یہ بھی بیان ہے کہ وہی شیخ برہان آج اہل کمال میں سے ہیں۔ (حضرت شاہ کمال محمد سنبھلی فرماتے ہیں کہ) جب میں پہلی بار اُن کے در پر حاضر ہوا تو میں نے دل میں سوچا کہ اُن سے اس جنگ کے انجام کے بارے میں جو در پیش ہے عرض کروں کہ فتح ہو اور یہ کہ مجھے وسعت و کشادگی رزق حاصل ہو جائے (اس کے لیے دعا کر دیجیے) وہ گھر سے نکلتے ہی مجھ سے بولے کہ اس مہم کی فتح چاہتا ہے اور رزق میں کشادگی۔

شیخ محمد یوسف

ابن شیخ عبدالوہاب بخاری[1] ۔ آپ مخدوم جہانیان سید جلال الدین بخاری کی اولاد میں ہیں۔ بڑے عالی فطرت اور بلند ہمت تھے۔ معاملات میں بڑے نیک، روشن اخلاق و اطوار کے مالک۔ اُن کی خاندانی شرافت و نجابت ہندستان میں اتنی مشہور ہے کہ اس کو دہرانے کی احتیاج نہیں۔ وہ اپنے والد صاحب کے صاحب سجادہ ہیں۔ وہ فضائل و کمالات و مقامات کے جامع، اکابر علما اور امرا کے مرجع تھے۔ لوگ ذکر کرتے ہیں کہ بچپن میں ہی غایت بلند ہمتی کی وجہ سے انھیں غیراللہ سے ایک عجیب استغنائی قلبی اور نادر بے تعلقی حاصل تھی۔ چنانچہ مکلّف زریں قبا کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں ڈال دیتے اور اپنے سامنے خاکستر کر دیتے۔ اسی طرح بالا خانے سے چینی کے قیمتی برتنوں کو گھر کے صحن میں پھینک دیتے اور ان کے ٹوٹنے کی آواز سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار خانخانان بیرم خاں نے ایک قیمتی آئینہ جو سو سے زائد روپے میں تیار ہوا تھا (اپنے خادم کے ہاتھ) ان کی خدمت میں ارسال کیا، وہ تہہ خانے میں بیٹھے ہوئے تھے جب وہ خدمتگار ان کے پاس لے کر پہنچا۔ اچانک کسی وجہ سے اس کا پیر لڑکھڑایا آئینہ ہاتھ سے گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ خدمت گار گھبرا گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے ایک آہ کھینچی اور

1 حاجی سید عبدالوہاب از اولاد سید جلال بخاری کسی تقریب میں ہندوستان تشریف لائے تھے سلطان سکندر لودی ان کا معتقد ہو گیا تھا۔ 932ھ/1525 میں وفات پائی۔ ''شیخ حاجی'' آپ کی تاریخ وفات ہے۔ پرانی دہلی میں مزار ہے۔ بحوالہ ذکر جمیع اولیاء دہلی۔

آسمان کی طرف منہ کر کے گویا ہوئے ''اللہ تعالیٰ اس جوان کی شکستہ دلی کے طفیل یوسف پر رحم فرما''
اور خدمتگار کو لطف ومہربانی سے خوش کر دیا اور خانخاناں کو لکھا کہ آئینہ سلامتی سے پہنچ گیا۔ بڑی خوشی
ہوئی۔ جب یہ ماجرا خان خاناں تک پہنچا۔ آفریں کہی اور ان کے معتقد ہو گئے۔ نقل ہے کہ ایک
دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ ایک غلام گرم حریرہ لے کر آتا تھا اس کا پیر
لڑکھڑایا اور گرم حریرہ ان کے کپڑے پر آ گرا۔ غلام کانپنے لگا۔ آپ نے بغرض تادیب نہ کہ بغرض
تعذیب اُسے گھورا۔ اس نے فوراً کہا ''الکاظمین الغیظ'' (غصہ پی جانے والے)۔ آپ نے
فرمایا۔ میں نے غصہ پی لیا۔ پھر اس نے پڑھا ''العافین عن الناس'' (لوگوں کو معاف کرنے
والے) آپ نے کہا۔ میں نے تجھے معاف کیا۔ پھر اس نے آیۃ کا آخری حصہ پڑھا ''ان اللہ
یحب المحسنین'' (بیشک اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کو پیار کرتے ہیں) آپ نے کہا۔ جا
میں نے تجھے آزاد کر دیا۔
میں نے شیخ محمد یوسف کے جمال کامل کا بہت دیدار کیا ہے اور ان کی شان لطف وعنایت سے بارہا
محظوظ ہوا ہوں۔ ان کی وفات 1020ھ (1612) میں ہوئی اور قبر شیخ عبداللہ قریشی جو کہ شیخ
بہاء الدین زکریا ملتانی قدس اسرارہم کی اولاد میں ہیں۔ ان کی قبر سرائے بخاریان میں ہے۔ اس
روضۂ پُر انوار میں آسودہ بزرگوں میں سے اکثر کی خدمت میں، میں بارہا آیا گیا ہوں۔

شیخ عبدالوہاب

آپ شیخ محمد یوسف بن شیخ عبدالوہاب بخاری کے فرزند ہیں۔ اپنے والد کے سجادہ نشین ہیں۔ علوم
ظاہر و باطن کے عالم ہیں صاحب اخلاق ومروت۔ اُن کے بہت سے مستعد تلامذہ اُن کی صحبت
سے مستفید ہیں اس طرح وہ علوم دینیہ کے افادے کا مستقل شغف رکھتے ہیں۔ 1060ھ
(1050) میں مجمع کثیر کے ساتھ حجاز کا سفر کیا اور حرمین محترمین کی زیارت کے شرف سے مشرف
ہوئے اور صوری ومعنوی جمعیت وعاقبت کے ساتھ اپنے وطن دہلی واپس پہنچے۔ میں ان کے بچپن
سے اُن کو دیکھتا آیا ہوں۔ آثار و برکات اور انوار وآیات اُن سے ظاہر ہیں۔ میں بچپن سے برسوں
محلہ بخاریان میں رہا ہوں جبکہ میرے والد شیخ فرید بخاری کے ہمراہ تھے۔ میرے والد کہتے تھے کہ

میں نے شیخ عبدالوہاب کے دادا شیخ عبدالوہاب بخاری[1] کو دیکھا ہے۔ بڑے سخی اور کریم النفس تھے۔ اُن کی سخاوت کا شہرہ بیرون ملک تک پہنچا۔ اس دیار کے قلندر لوگ اُن کے پاس آ کر تنگ کرتے تھے۔ اُن کے صبر وضبط کا امتحان کرنے کے لیے ایسی باتوں کی فرمائش کرتے جو ان کے بس کی نہ ہوتیں۔ وہ باوجود حاکم دہلی اور بڑی شان والے ہونے کے یہ سب برداشت کرتے اور ہر ایک کی فرمائش پوری کرتے۔ اُن کی وفات کا سال 1018ھ (1610) ہے۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ اُن کی حکومت کے زمانے میں ملاحوں نے ایک دن آ کر کہا کہ دریائے جون کے کنارے گنبد خواجہ خضر کے نزدیک ایک کشتی ٹوٹی ہوئی دبی پڑی ہے اور صندوق کی ایک لکڑی ظاہر ہوئی ہے۔ انھوں نے کچھ لوگوں کو حکم دیا تا کہ اسے نکال لائیں۔ وہ ایک تابوت تھا جو زمین سے دو گز ابھرا ہوا تھا اور دو گز سے کچھ کم زمین میں دبا ہوا تھا۔ جب اسے کھولا گیا تو دیکھا کہ اس کے اندر ایک مردہ ہے جس کا کفن سب بوسیدہ اور مٹی ہو گیا ہے مگر مردے کے تمام اعضا درست ہیں لیکن کشتی چورا چورا ہو کر خاک بن کر بکھر چکی ہے۔ انھوں نے شہر کے تمام اعیان واکابر کو ہمراہ لے کر اس کو قدم گاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں دفن کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے حاضرین سے کہا کہ حالانکہ اس واقعے کو بہت زمانہ گزر چکا ہے لیکن تعجب ہے جسم سلامت ہے (ضرور یہ کوئی بزرگ ہستی ہیں) بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سب حضرات اس مردے کا حال جاننے کے بارے میں متوجہ الٰہی ہوں اور دیکھیں کہ عالم غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ جب رات ہوئی شیخ بہاء الدین غوری نے جو بڑے صالح اور بزرگ اولیاء اللہ میں سے تھے راقم حروف (شاہ محمد کمال سنبھلیؒ) نے اُن کو دیکھا تھا۔ اس مردے کو خواب میں دیکھا اور اس کا احوال پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں سلطان علاء الدین کے عہد میں بادشاہ کے لشکر کا لشکری تھا۔ میرے سارے اعمال وافعال شریعت وطریقت کے موافق انجام پاتے تھے۔ میں کسی بھی جاندار کو تکلیف نہ دیتا تھا حتیٰ کہ اپنے نوکروں تک کو بھی ایسا کام کرنے کو نہیں کہتا تھا جو ان پر بار خاطر ہو۔ میری سلامتی جسم کی یہ حالت کم آزاری کی وجہ سے ہے۔ یہ سن کر شیخ بہاء الدین غوری نے دریافت کیا مگر تمھارے پیر کی انگلیاں کیوں گل گئیں؟ جواب دیا کہ مجھے احتلام ہو گیا تھا۔ غسل نہیں کر پایا تھا کہ اتفاقاً بادشاہ جن کے میں ہمراہ

---

1 یہاں دادا اور پوتے کا نام ایک ہے۔

سفر تھا سوار ہوئے میں بھی بغیر غسل کے ان کے ہمراہ ہوگیا۔ ان کے گلنے کی یہ وجہ ہے۔ میرے والد فرماتے تھے کہ اس قدم گاہ کا قصہ ایک عزیز سے ایسا سنا ہے کہ ایک بار سارے کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ طلب کیا اور کہا کہ وہاں کی زمین جو دلدل اور کیچڑ ہے اسے پختہ کردیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم مبارک اسی مٹی میں رکھا وہ ساری زمین پتھر بن گئی اور دونوں قدموں کے نشان اس پتھر میں باقی رہ گئے۔ دائیں قدم کا نشان عرب میں رکھ چھوڑا ہے اور بائیں کو سید جلال الدین مخدوم جہانیان دہلی لے آئے۔ سلطان فیروز خلجی چند میل اس کے استقبال کے لیے نکلے اور سر پر رکھ کر اپنے گھر لائے جس جگہ سے انھوں نے اسے سر پر اُٹھایا ہے وہاں آبادی بس گئی ہے جس کا نام موند ہے۔ آج کل یہ گاؤں ان ہی بخاریوں کی ملکیت ہے۔ سلطان فیروز نے ایک موقع پر اپنے بیٹے فتح خاں سے کہا جو مراد تیرے دل میں ہو مجھ سے مانگ لے۔ سلطان فیروز نے سوچا اس کی مراد بادشاہی ہوگی۔ وہ بیٹا بولا ''نشان قدم مبارک'' کو میری قبر پر نصب کردیں۔ بادشاہ حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ اس نے اپنے لیے یہی سوچ رکھا تھا۔ بادشاہ بولا۔ ہم میں سے جو بھی پہلے مرے گا اسی کی قبر پر نصب ہوجائے گا۔ یہ سن کر فتح خاں اُٹھے اور فقرا و مجاذیب سے اپنے انتقال کی دعائیں کرانے لگے۔ آخر کسی کی دعا کارگر ہوگئی اور وہ دنیا سے چل بسے۔ سلطان نے اس وعدہ کے بموجب ان کی قبر پر نصب کرادیا۔ اب وہی جگہ زیارت عالمیان بنی ہوئی ہے

بر زمینے کہ نشانِ کف پائے تو بود   سالہا سجدۂ صاحب نظران خواہد بود [1]

'اخبار الاخیار' میں لکھا ہے صاحب ''تاریخ فیروزی'' لکھتا ہے کہ مخدوم جہانیان سلطان فیروز کے عہد میں کئی بار اُچہ کے علاقے سے ہو کر دہلی تشریف لائے اور بادشاہ نے عقیدت و اخلاص کا جیسا کہ چاہیے مظاہرہ کیا۔ پوشیدہ نہ رہے کہ مخدوم جہانیان جہاں گشت 785ھ (1383) میں دنیا سے سدھارے اور سلطان فیروز خلجی نے 779ھ (1387) میں وفات پائی ''فوت فیروز'' تاریخ وفات ہے۔ دونوں حضرات کی باہمی ملاقات بھی مقرر ہے لہٰذا غالب یہ ہے قدم گاہ کا یہ قصہ اس سنہ سے پہلے ہی وقوع پذیر ہوگا۔ واللہ اعلم بحقیقۃِ الحال

1 جس زمین پر آپ کا نشانِ کف پا ہوگا وہ سالہا سال کے لیے صاحب نظروں کی سجدہ گاہ ہوگی۔

شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی

شیخ تاج الدین کے مرید ہیں۔ ظاہری و باطنی صفائی میں درجہ کمال حاصل تھا۔ معاملات طریقت میں یگانہ تھے۔ ہمیشہ سلسلہ نقشبندیہ کے شغل میں لگے رہتے تھے۔ بزرگی کے آثار اور برکتیں ان سے بہت ظاہر ہوتی تھیں۔ عزیمت پر عمل کرتے اور رخصت (اجازت والی چیز) و بدعات سے احتراز برتتے تھے۔ تقریباً بیس سال پائے ہمت کو دامان قناعت میں لپیٹے رہے کسی دنیادار یا غیر دنیادار کے گھر (حاجت لے کر) نہ گئے۔ نہ کسی کے گھر سے کھانا مانگ کر کھایا۔ وہ فقرا، درویشان، اکابر و اصاغر سب کے مرجع تھے۔ حکام اور اغنیا ان کی ملاقات کے خواہش مند رہتے تھے۔ بڑے اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ شروع میں جو شیخ تاج الدین نے ایک ہونہار نوجوان کے بارے میں خواجہ بیرنگ کو لکھا تھا اور آپ نے اس کو ہمراہ لانے کے لیے کہا تھا اس سے مراد آپ ہی ہیں۔ شروع شروع میں کسی شخص کی طرف داری میں شیخ تاج اُن سے انقباض اور غبار خاطر رکھتے تھے۔ آخر کار وہ نفرت ختم ہوگئی اور شیخ تاج الدین نے مکہ مکرمہ سے اپنی خوشنودی کہلوا بھیجی۔ اُن کا بیان ہے میں شیخ تاج الدین کے ابتدائی دور میں، میں خواجہ بیرنگ کی صحبت میں پہنچا اور ان کی عنایات سے بہرہ مند ہوا کچھ زمانے خواجہ ابرار کا ہم حجرہ رہا۔ مجھے خواجہ بیرنگ کی صورت کے رابطے کی لگ گئی خواجہ ابرار جب میری اس حالت سے واقف ہوئے تو کہا کہ تجھے بجائے خواجہ بیرنگ کے اپنے شیخ کی صورت کو نظر میں رکھنا چاہیے اسی دوران خواجہ بیرنگ نے مجھے بلا کر فرمایا کہ جب میری صورت کسی کے دل میں بیٹھ جاتی ہے تو پھر واپس نہیں ہوتی۔ یہ بھی انھیں کا قول ہے کہ ایک دن میں خواجہ بیرنگ کے ساتھ بیٹھا ہوا گوشت تناول کر رہا تھا۔ گوشت نہایت کچا تھا۔ میں نے سوچا کیا خوب ہو اگر یہ گوشت آپ کی نظر توجہ سے نرم ہو جائے۔ یہ خیال کرتے ہی تمام گوشت روئی کے گالے کی طرح نرم پایا۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ ایک دن ایک تاجر نے غرور و نخوت سے لبریز ہو کر بے ادبی کے ایسے جملے کہے جن کو زبان پر لانا بھی نہ چاہیے۔ اس کی یہ بدکلامی سن کر شیخ تاج الدین کو غصہ آ گیا اور وہ دل برداشتہ ہو کر اٹھے اور آپ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ سمجھ گئے اور معلوم کیا کیا بات ہوئی؟ شیخ تاج الدین نے اس تاجر کی بے ادبی کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا۔

یہ میرے شناسا ہیں اور اس کو اپنے قریب بلایا۔ جب اس کی نظر آپ کے جمال (روئے) مبارک پر پڑی تو بے اختیار سجدے میں گر گیا پھر اٹھ کر بہ نیاز تمام بادب بیٹھ گیا اور علاوہ عاجزی اور خاکساری کے کچھ نہ کر سکا جب وہ چلا گیا تو آپ نے مسکرا کر شیخ تاج الدین سے فرمایا کہیے شیخ تاج الدین میں نے اس متکبر سے کس طرح تمھارا بدلہ لیا۔ اُن کا ہی بیان ہے کہ شیخ تاج الدین ہمیشہ جب بھی خدمت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ میں حاضر ہوتے خود کو تمام نسبتوں اور کیفیتوں سے خالی کر لیتے اور صرف آپ کے دیدار اور صحبت کی غرض سے خدمت خواجہ میں آتے تھے۔ ان ہی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ایک بار مجھے ضروریات زندگانی سے مجبور ہو کر آقا صفی جو میرے آشناؤں میں سے تھا، کے ساتھ رہنا پڑا۔ جب میں دہلی پہنچا خواجہ ابرار نے جو گزرا تھا اس کے بارے میں معلوم کیا۔ میں نے جو بات تھی صاف بتا دی۔ انھوں نے (بس اتنا) فرمایا۔ فلانے جہاں تک ہو سکے ایسے لوگوں سے خود کو دور رکھو۔ اُن کی یہ نصیحت آئندہ بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ ان ہی کا کہنا ہے کہ ایک دن وطن جانے کی اجازت لینے کی غرض سے میں خواجہ بیرنگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ چارپائی پر استراحت فرما رہے تھے۔ آپ کی یہ عادت تھی کہ کسی کو اپنے پیروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔ مگر مجھے بالکل منع نہیں کیا اور میری دلی تمنا پوری ہوگئی۔ اس طرح میں خوش خوش اپنے وطن کو روانہ ہوا۔ خواجہ بیرنگ کا نام مبارک ان کی گفتگو میں ہمیشہ وردِ زبان رہتا اور صدق محبت و ادب کے ساتھ انھیں یاد کرتے تھے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اس بات کا پکہ یقین ہے کہ جس نے بھی خواجہ بیرنگ کو ایک بار بھی صدق نظر سے دیکھا ہے اس کی نجات ہو جائے گی۔

"نفحات الانس" میں تحریر ہے کہ محمود سبکتگین بایزید بسطامی قدس سرہٗ کی قبر پر پہنچے۔ وہاں ایک مجاور درویش دیکھا تو اس سے معلوم کیا کہ تمھارے یہ پیر جن کی قبر ہے کیا فرماتے تھے۔ اس مجاور نے کہا کہتے تھے کہ جس نے مجھے دیکھا ہے اس کو آتش دوزخ نہ جلائے گی۔ یہ سن کر (سلطان) محمود سبکتگین نے کہا۔ یہ کوئی بات نہیں۔ ابوجہل نے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو (بار بار) دیکھا مگر اسے آگ میں جلایا جائے گا۔ اس درویش نے کہا اے امیر اس نے ابوطالب کے بھتیجے کو دیکھا تھا نہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ورنہ اس کو نہ جلایا جاتا۔ شیخ عبدالرحمٰن نے خواجہ بیرنگ کی مدح میں شعر کہے ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے

آن خواجۂ ما کہ نور پاکست یا رب ز کدام آب و خاکست [1]

آپ کی تاریخ وفات میں انھوں نے ایک قطعہ کہا تھا۔ یہ مصرعہ تاریخ وفات ہے

"بند رابکست ثانی نقشبند"

شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی میرے شیخ کے بڑے مخلص تھے۔ ہمیشہ محبت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے اور کہا کرتے کہ خواجہ بیرنگ اور ان کی آواز ایک جیسی ہے۔ سنبھل میں جامع مسجد میں جمعہ کے دن اور عیدین کے موقع پر کبھی کبھی ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ ہر جگہ خواجہ بیرنگ کا ذکر چھیڑ دیتے۔ انھوں نے میرے شیخ کے رسائل تصوف کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا تھا ان کی آپس میں خوب صحبتیں رہیں تھیں۔ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے اور کہا کرتے کہ اس شہر میں تجھ سے بڑھ کر میرا کوئی شناسا نہیں ہے۔ ایک بار میں اپنے شیخ سے رخصت ہوکر سنبھل آیا یہ اُن کے انتقال کا سال تھا۔ میں جمعے کی نماز کے لیے جب مسجد جامع پہنچا دیکھا کہ وہ نماز میں نہیں ہیں کہ بہت ضعیف ہوگئے تھے۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا دیکھا کہ وہ (بعد میں آکر) میرے پیچھے بیٹھے ہیں۔ میں نے معلوم کیا "اے شیخ کیا حال ہے؟" بولے مجھے اتنا ضعف تھا کہ نماز میں شامل نہ ہوسکا لیکن تیری محبت میں بڑی محنت کر کے پہنچا ہوں بس تجھے دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔" معلوم ہوا کہ انھوں نے نماز کے سلسلے میں رخصت کی نیت کی اور محبت میں عزیمت پر عمل کیا۔ "نفحات الانس" میں بیان کیا ہے کہ عبیداللہ احرار اپنے بیس مریدوں کے ساتھ حج کے لیے جا رہے تھے۔ جب ایک قریہ میں جو کہ مکّے سے صرف اٹھارہ میل تھا، پہنچے تو اپنے مریدین سے کہنے لگے اے دوستو! "استودعتکم اللہ" اب میں تمھیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔" مریدین بولے اے استاد جبکہ مکّہ اور آپ کے درمیان صرف تھوڑا سا فاصلہ رہا ہے کہاں جا رہے ہیں؟ تو فرمانے لگے "میں تو تمھاری مشایعت کی نیت سے یہاں تک پہنچا ہوں میرا دل تمھاری ہمراہی میں خوش تھا اب میں واپس جا رہا ہوں گھر جا کر حج کی نیت کروں گا اور تم سے آملوں گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ اس وقت موسم حج میں پانچ مہینے باقی تھے۔ میں شیخ عبدالرحمٰن کی آخری بیماری میں عیادت کے لیے گیا۔ دیکھتے ہی وہ انتہائی ضعف کے باوجود دوسروں کی مدد سے چارپائی سے نیچے اُتر پڑے اور گویا ہوئے تم جیسا اگر آئے تو مجھے

---

1 ہمارے خواجہ بیرنگ جو گویا نور پاک ہیں یا اللہ کون سی مٹی اور پانی سے بنے ہیں۔

واجب ہے کہ میں نیچے اُتروں، یہ بھی فرمایا جو قدم بھی تو رکھے میرے سر آنکھوں پر ہے۔ اس وقت اُن کے اعضا میں کوئی حس و حرکت نہیں رہی تھی علاوہ آنکھ اور زبان کے۔ اس وقت خواجہ بیرنگ کو اور میرے شیخ کو یاد کرتے تھے۔ ان کے ذکر سے وہ خوش وقت ہو گئے۔ دوران گفتگو افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے کہ فلانے حُبّ جاہ قبر اور کفن کے سلسلے میں بھی سر سے نہیں جاتی کہ قبر ایسی ہو کفن ایسا ہو۔ اور بھی دوسری باتیں ہوئیں جو آخرت میں کام آتی ہیں۔ آخر میں نے اُن سے دعا کی درخواست کی۔ انھوں نے فاتحہ پڑھی اور دعا کی خود روئے مجھے بھی رُلایا اور فرمایا ''تجھے ہم نے خدائے کریم کے سپرد کیا۔'' رمضان کے مہینے میں جبکہ وہ آخری مرض میں مبتلا تھے باوجود ایسی ضعیفی کے جس کا ابھی ذکر گزرا اور ان کی عمر بھی 80 سال سے بڑھ گئی تھی انھوں نے نہ کوئی روزہ چھوڑا اور نہ کوئی نماز ہی ترک کی، نہ شریعت مطہرہ کے اعمال میں سے کوئی عمل چھوڑا۔ ''ذالک فضل اللہ یعطیہ من یشاء'' (یہ اللہ کا فضل جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے) انھوں نے سفر آخرت سے چند روز قبل خواب میں دیکھا کہ اُن کے شیخ شیخ تاج الدین اُن کے دروازے پر آئے ہیں وہ استقبال کے لیے باہر نکلے تو دیکھا کہ شیخ ایک عمارت مصفیٰ کی جانب جو ایک لہلہاتا چمنستان ہے اشارہ کر رہے ہیں اور بڑی بشاشت و لطف کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ یہ جگہ تیرے لیے ہے۔ ان کے بھائی شیخ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ جس رات کہ وہ چلے جائیں گے اوّل شب میں مجھ سے اور اپنے بیٹوں سے کہا۔ ''تم کو سپرد خدا کیا۔'' پھر ان پر استغراق کی حالت طاری ہوگئی سب سمجھے کہ گئے لیکن وقت سحر کلمہ پڑھا اور رخصت ہوئے۔ جمعرات کے دن 7 رشوال 1067ھ (8 راگست 1657) کو۔ میں نے ان کی تاریخ وفات پر قطعہ کہا

شیخ اہل طریقت و کامل — عبدرحمٰن کہ داشت قدر بلند
پنجشنبہ و ہفتم از شوال — بجنان رفت زین سرائے نژند
ہمگی عمر با محبت حق — ماندہ خورسند رفتہ خود خورسند
سال تاریخش از خرد جستم — بخردم گفت ''شیخ بے مانند''[1]

---

1 اہل طریقت اور کامل وقت عبدالرحمٰن جو بڑے بلند مرتبہ شیخ تھے بروز جمعرات 7 رشوال کو اس سرائے فانی سے جنت سدھارے۔ عمر بھر وہ محبت حق میں خوش و خرم جیے اور خوش و خرم ہی دنیا سے گئے۔ جب میں نے ان کی تاریخ وفات کا سال سوچا تو میری عقل بولی ''شیخ بے مانند''

سید محمد سرسوی کے اُن کا ذکر آگے آئے گا کہتے ہیں کہ ان کے انتقال کے وقت میں نے سرسی میں خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہہ رہے ہیں آ مجھ سے مل لے۔ جب میں روانہ ہوکر سنبھل پہنچا، دیکھا کہ وہ جا چکے ہیں۔ جس دن انھیں دفن کیا گیا بڑی طراوت و لطافت کے ساتھ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اپنے شیخ سے ملاقات پر جب میں نے اس کا تذکرہ ان سے کیا تو فرمایا کہ ترشح باراں قبولیت کی علامت ہے۔ ان کے دفن کے بعد شیخ حسین سنبھلی نے کہ اِن کا ذکر بھی آگے آئے گا، اُن کو خواب میں دیکھا کہ اسی طرح کے چمن اور عمارت میں جیسی کہ انھوں نے خواب میں دیکھی تھی۔ فاخرہ لباس میں دراز لیٹے ہوئے پان کھا رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا اے شیخ کیا حال ہے؟ جواب دیا۔ میں خوش ہوں اور مزے میں ہوں۔ انھوں نے عرض کیا۔ کیا مجھے پہچانتے ہیں جواب دیا تو شیخ حسین ہے، شیخ حسین نے خواب میں ہی یہ سمجھ لیا کہ یہ دنیا سے آخرت میں چلے گئے تو چاہا کہ اس عالم کے احوال معلوم کریں لیکن گھر والوں نے انھیں نماز کے لیے جگا دیا۔ شیخ عبدالرحیم نے فرمایا کہ ایک دن وہ اپنے باغ کے کنوئیں پر بیٹھے تھے کہ اچانک پانی نے بڑی تیزی سے جوش مارا اور کنوئیں کی من تک آ گیا مگر پھر جتنی تیزی سے اوپر آیا اتنی ہی تیزی سے نیچے بیٹھ گیا۔ آج کل ان کے پسر شیخ محمد علی اُن کی جگہ ہیں۔ ''نیک، تالئ قرآن اور یک سو۔'' میرے شیخ کے صحبت یافتوں میں ہیں میرے شیخ ان کو خواجہ محمد علی کہتے ہیں۔ سید ہاشم سنبھلی بھی شیخ عبدالرحمٰن کے شاگردوں میں سے ایک غریب اور صالح شخص ہیں۔ میرے جاننے والے ہیں۔ ان کے انتقال کی تاریخ شیخ حسین محمد کے ذکر میں آ گئی ہے۔ ان کے والد سید علی اکبر نیکان وقت میں سے تھے میں نے انھیں دیکھا تھا۔ 1046ھ (1367) میں انتقال ہوا۔ شیخ عبدالرحمٰن کے دوستوں میں سے ایک شیخ عبدالمومن سنبھلی ہیں جو مرد فہمیدہ و سنجیدہ اور اس کار درویشی کے اہل ہیں، وہ امرا کے مقرب بھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں زمانہ شباب سے اُن کی صحبت میں رہا ہوں۔ اس کے بعد ان کا مرید ہوا اور ان کے الطاف و عنایات سے بہرہ ور ہوا، بہت سے احوال غریبہ اور اسرار عجیبہ میں نے اُن کے مشاہدہ کیے ہیں اگر ان کی تفصیل کروں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ایک دن میں اُن کے پاس پہنچا وہ گھر کے اندر تھے میں نے اتفاق سے وہ کاغذ جو ان کے قلمدان کے نیچے رکھا تھا نکال کر پڑھا تو وہ شیخ تاج الدین کو جو ان کے شیخ ہیں لکھے ہوئے خط کا مسودہ تھا۔ مضمون یہ تھا کہ حق سبحانہ

تعالیٰ نے شیخ کی توجہ سے سلوک طریقت کے اکثر مقامات عطا فرما دیے اور ہر ایک پر عبور حاصل ہو گیا مگر کسی مریض کی ضمانت لینا جیسا کہ خواجہائے بزرگواران سلسلہ نقشبندیہ ہے ابھی تک صورت پذیر نہیں ہوا...... انتہیٰ۔ میں نے وہ مسودہ اسی جگہ رکھ دیا اور سمجھ لیا کہ وہ اس بات کے مستحق ہو گئے ہیں کہ مرتبہ ضمانت مریض ان کو مل جائے۔ یہ اہل اللہ کا ایک حال ہے جو کہ اس راہ کے ان اہل حضرات کو جو سیر الی اللہ کی منازل طے کر چکے ہوں اور مقام سیر فی اللہ تک پہنچ گئے ہوں حاصل ہوتا ہے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ کسی بیمار کی ضمانت لینا جیسا کہ طریقہ نقشبندیہ میں مقرر ہے اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ بعض اولیاء کامل اس بیمار کے سرہانے جواُن سے رابطہ اخلاص ومحبت رکھتا ہو بیٹھتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس کی بیماری کو منجملہ اپنے جسم کے بعض اجزا میں سے سمجھتے ہیں اور خود پر لے لیتے ہیں اور وہ مرید اس بیماری سے نجات پا کر حیات تازہ سے مشرف ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار ادام اللہ تعالیٰ بقاہم فرماتے تھے کہ حضرت مولانا نظام الدین کا بیان ہے کہ سمرقند کے اکابر میں سے ایک صاحب جن کو مجھ سے بہت ہی اخلاص، محبت اور ارادت کا تعلق تھا بیمار ہو گئے اور موت سے جا ملے۔ ان کے بیٹوں اور متعلقین نے بے حد نیازمندی دکھائی میں نے توجہ الی اللہ کی اور دیکھا ان کی بقا اور حیات کا کوئی امکان نہیں مگر میں نے اپنی ضمانت میں لے لیا اور انھیں صحت ہوگئی۔ کچھ زمانے بعد مجھ پر ایک تہمت لگائی گئی جو میری اہانت اور بدنامی کا باعث بن گئی وہ اس سلسلے میں کوشش کر سکتے تھے اور اس تہمت کو دفع کر سکتے تھے مگر انھوں نے خویشتن داری سے کام لیا اور کوئی کوشش نہ کی۔ اس سے میری طبیعت ان سے مکدر ہوگئی اور میں نے انھیں اپنی ضمانت سے خارج کر دیا۔ اسی وقت وہ کھڑے سے گر گئے اور مر گئے۔ صاحب ''رشحات'' یہ واقعہ ''نفحات الانس'' سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ سمرقند کے اکابر میں سے وہ بزرگ جنھوں نے حضرت مولانا کے سلسلے میں خویشتن داری سے کام لیا سمرقند کے شیخ الاسلام خواجہ عصام الدین تھے۔ حضرت مولانا کی جو اہانت ہوئی اور تہمت لگی وہ ان کے ایک بیٹے کی وجہ سے لگی جو لوگوں کے لیے وظائف عزیمت پڑھا کرتا اور جنوں کی تسخیر کا کام کرتا تھا۔ اس سلسلے میں بادشاہ کی معظمات اہل حرم میں آنا جانا تھا۔ کچھ خود غرضوں نے یہ اڑائی کہ اس کے فلاں اہل حرم سے روابط محبت و آشنائی ہے اور اس پر حرام کاری کی تہمت لگائی۔ ایسی ہی کچھ باتیں

مرزا الغ بیگ کے کانوں تک پہنچائیں اور مولانا کے یہ صاحبزادے فرار ہو گئے۔ اس تہمت اور شکایت کا اثر مولانا نظام الدین تک پہنچا (کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو بھگا دیا)۔ مرزا الغ بیگ کو غصہ آیا غضبناک ہو کر حضرت مولانا کو طلب کیا۔ قاصد ان کو سر برہنہ گھوڑے پر اپنے پیچھے سوار کر کے مرزا الغ بیگ کے پاس لے گئے۔ آپ باغ کے میدان میں ایک جگہ جا کر بیٹھ گئے اور سر مراقبے میں جھکا لیا۔ مرزا الغ بیگ آپ کے آگے سے گزرے لیکن آپ نے سر نہ اُٹھایا۔ اس کے بعد مرزا نے آپ کو کسی سے بلوایا اور عتاب آمیز گفتگو کی۔ حضرت مولانا نظام الدین نے فرمایا "ان سب باتوں کا جواب ایک کلمہ ہے جو میں کہتا ہوں "مجھے پتہ نہیں" اگر یقین کریں ٹھیک، ورنہ جو آپ کے دل میں آئے حکم دیجیے۔ مرزا اس بات سے متاثر ہو کر فوراً کھڑے ہو گئے اور کہا انھیں چھوڑ دو۔ آپ فرماتے تھے کہ اس بے ادبی کے بعد مرزا الغ بیگ کو بہت پریشانی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسی دوران ایک دن ان کے بیٹے عبداللطیف نے انھیں مار ڈالا۔

خواجہ نظیر

وہ خواجہ نذیر کے نام سے مشہور ہیں۔ سلوک طریقت اور معاملت میں خوب تھے۔ انھیں سلسلہ نقشبندیہ اور کبرویہ میں اجازت حاصل تھی۔ ان کے تمام اصحاب سلسلہ اسی کام میں مشغول ہیں۔ ان کی صحبت میں ایک خاص تاثیر تھی۔ چہرے پر ایک نور تھا میں نے انھیں شہر اجین میں 1036ھ (1627) میں دیکھا تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں بھی اسی طریقہ نقشبندیہ کے نیاز مندوں میں سے ہوں اور شیخ احمد سرہندی میرے شیخ کے شیخ ہیں۔ تو مجھ سے شیخ احمد سرہندی کی کچھ شکایت کرنے لگے کہ شیخ کو نہ چاہیے تھا کہ شطحیات کو ایسے برملا ظاہر کرتے اس سے بادشاہ وقت اور مشائخ زمانہ شورش میں آگئے اور انھیں قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ اگر کوئی ذرا سا بھی انصاف رکھتا ہوگا ہرگز شیخ کو برا نہ کہے گا کیونکہ انھوں نے اپنے بعض مکاشفات کو اپنے شیخ خواجہ بیرنگ کو لکھا تھا (اور خواجہ بیرنگ نے ان کی توثیق کر دی تھی)۔ جملہ حاسدین اور اصحاب غرض نے ان کی تحریر اور اس کا غلط مطلب بادشاہ کو پہنچایا اور بادشاہ نے انھیں قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا لیکن وہاں انھوں نے جمعیت تام سے رہ کر قرآن پاک حفظ کیا۔ قید خانے میں جتنے مسلمان تھے

اکثر آپؒ کے مرید ہو گئے اور شغل باطن سے مستفید ہو گئے۔ انھوں نے جو خطوط اپنے مریدوں کو لکھے ہیں ان میں اس کا ذکر کیا ہے۔ آخر کار جب بادشاہ (جہانگیر) کو پتہ چلا کہ وہ مکاشفین میں سے ہیں اور یہ تکلیف انھیں ناحق پہنچی ہے قلعہ گوالیار سے بلا کر معذرت کی اور عزت کے ساتھ انھیں ان کے وطن رخصت فرمایا۔ اس سارے معاملے میں ایک خدائی راز تھا جسے اللہ تبارک وتعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ہاں ہاں علما ظاہر کا انکار جو وہ اولیاء اللہ اور صوفیہ کی نسبت رکھتے ہیں اس کا کوئی علاج نہیں جیسا کہ ایک بزرگ نے کہا ہے۔ شعر

قِیلَ اَنَّ اللہ ذو وَلَدٍ	قِیلَ انَّ الرسول قد کھنا
کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے	کہا گیا کہ رسول اللہ کاہن ہیں
ما نَجا اللہ والرسول معاً	من اللسانِ الھویٰ فکیف اَنا
اللہ اور رسول دونوں نہیں بچے	تو میں اہل ہوا کی زبان سے کیسے بچ سکتا ہوں

یہ شعر سن کر میں نے دیکھا کہ خواجہ نظیر غضب ناک ہو گئے اور مجھ سے کہا کوئی ایک مکاشفہ بیان کرو۔ میں اس مکتوب گرامی کی نقل جو انھوں نے خواجہ بیرنگ کو لکھا تھا ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب میں نے اسے پڑھا وہ ساکت ہو گئے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

چونکہ حضرت کی جانب سے حکم تھا اس لیے حکم برداری کے طور پر میں نے بعض مکاشفات کے بیان کی جرأت اور گستاخی کی ہے۔

''من ہمان احمد پارینہ کہ ہستم ہستم''[1]

عرض یہ ہے کہ اس مقام کے ملاحظے کے دوران دوبارہ دوسرے مقامات بھی جو ایک دوسرے کے اوپر تھے ظاہر ہوئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی درگاہ میں نیازمندی اور شکستگی سے متوجہ ہونے کے بعد جب پہلے مقام ذوالنورین کے اوپر پھر دوسرے مقام پر پہنچا تو پتہ چلا کہ یہ مقام مقام حضرت فاروقؓ ہے۔ دوسرے خلفا کو بھی اس مقام سے عبور واقع ہوا ہے۔ اس کے اوپر حضرت صدیق اکبر (ﷺ) کا مقام ہے۔ اس مقام پر بھی پہنچنا نصیب ہوا۔ اپنے مشائخ میں سے، حضرت خواجہ نقشبند کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا۔ اور خلفا کو بھی اس مقام سے عبور واقع ہوا ہے۔ فرق صرف

---

1 ورنہ میں تو وہی پرانا احمد ہوں جو پہلے تھا۔ یعنی احمد ابن عبدالاحد سرہندی بس۔

گزرنے اور قیام کا ہے۔ چلنے اور ٹھہرنے کا ہے۔ اس کے اوپر کوئی اور مقام سمجھ میں نہیں آتا مگر حضرت رسالت خاتمیت علیہ من الصلوٰۃ اتمہا و من التحیات اکملہا کا مقام۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام کے محاذ میں ایک نہایت روشن دوسرا مقام ہے کہ اس جیسا میں نے کبھی نہیں دیکھا اس طرح جیسے کہ چبوترے کو زمین سے بلند بناتے ہیں نظر آیا پتہ چلا کہ وہ مقام مقام محبوبیت ہے۔ وہ محل بڑا رنگین اور نقش و نگار والا تھا۔ میں نے خود کو اس مقام کے عکس سے منقش اور رنگین دیکھا اس محل کی روشنی محاذات میں پھیلی ہوئی تھی خواجہ بزرگ تو مقام صدیق میں قیام رکھتے ہیں لیکن میں نے اپنے آپ کو جیسا کہ عرض کیا اس مقام محبوبیت کے عکس سے رنگین پایا۔ (انتہی۔ کلام شیخ احمد سرہندی)

میں اسی سال اجین سے اکبر آباد آ گیا۔ وہاں میں نے ایک عزیز کو دیکھا جن کا نام حافظ محمود تھا وہ بھی شیخ احمد کے مذکورہ مکتوب پر خواجہ نظیر کی مانند اعتراضات کی گفتگو میں لگا رہتا تھا۔ علما اور فضلا کی جماعت میں اس بحث کو طول دیتا تھا۔ میرے اس سے بھی وہی سوال و جواب ہوئے جو خواجہ نظیر سے ہوئے تھے۔ اہل مجلس نے از روئے انصاف میری بات قبول کر لی اس نے بھی اپنے حوصلے کے مطابق مان لیا

ترا چنان کہ توی ہر نظر کجا بیند   بقدر دانش خود ہر کسے کند ادراک [1]

اس کے بعد میں قسمت سے اجمیر چلا گیا۔ چند دن میں نے حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی قدس سرہٗ کے روضۂ مقدسہ پر گزارے اور سعادت اندوز ہوا۔ وہاں میں نے دو شخص دیکھے شیخ فضیل اور شیخ مہتا۔ شیخ فضیل، ان کا ہر کام زہد و ورع سے آراستہ تھا اور مخلوق سے حسن سلوک برتتے تھے لیکن توحید کی بو سے کورے تھے۔ ایک دن میں نے نیاز مندی کے ساتھ ان سے حصول محبتِ حق کے لیے دعا کی درخواست کی کیونکہ ان دنوں عشق کا بڑا شوق و سودا میرے دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا (کہ کسی فنافی اللہ، باقی باللہ کی صحبت نصیب ہو) انھوں نے برہمی سے یہ مصرعہ پڑھ دیا

''فکر معقول بفرمائی گل بے خار کجاست'' [2]

---

1 تجھے جیسا کہ تو ہے ہر نظر کہاں دیکھ سکتی ہے۔ ہر شخص اپنی عقل کے بقدر ادراک کرتا ہے۔

2 خود ہی غور کر کہ بے خار گل کہاں ہے یعنی ظاہر شریعت پر عمل ہی گل بے خار ہے جو مجھے میسر ہے میری ہی صحبت اختیار کر۔

میں نے دیکھا کہ ان کی ساری گفتگو بس ظاہری شریعت اور اخلاق ظاہری پر تھی۔ اس کے بعد میں
نے شیخ مہتا سے ایک دن معلوم کیا۔ وہ فنا جیسی جو کہ معاملات ظاہری کے موافق اور مقید بہ شریعت (
ظاہری) ہو، کیا ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا۔ مرتبۂ فنا کے ہوتے معاملات ظاہرۂ شریعت کی کوئی
ضرورت نہیں اصل کار، کار باطن ہے بس۔ میں نے اپنے دل میں سوچا اگر ان دونوں شخصوں کے
عقیدے ظاہر و باطن کو ملا دیا جائے تو بس یہ عین کمال ہوگا۔ میرے شیخ نے کہا ہے۔ نہ تو نری خبر یعنی
ظاہری شریعت درکار ہے اور نہ نری توحید یعنی عقیدہ توحیدی چاہیے جیسا کہ امام جعفر صادق نے
اشارہ فرمایا ہے۔ کہتے ہیں کہ آج کل کے موحدین جو قید شرعی سے آزادانہ زندگی گزارتے ہیں ان
میں سے ایک صاحب اجمیر پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے پوچھا کیاں یہاں کوئی ایسا فقیر ہے جو
عبادات اور طاعات ظاہری سے کوئی سروکار نہ رکھتا ہو؟ لوگوں نے شیخ مہتا کا پتہ بتایا۔ ان کے پاس
پہنچا اور صحبت میں بیٹھا اور معتقد ہو گیا اور اُن کو کاملین میں گردانا اور اپنے دوستوں سے کہا کہ ہمارے
اعتقاد میں کامل وہ شخص ہے جس سے اعمال ظاہر اور افعال صوری کبھی ظاہر نہ ہوں۔ میرے شیخ نے
جب یہ بات سنی اس بات کی موافقت پر ایک رنگین مثال لائے۔ وہ یہ ہے کہ ایک بھولے آدمی نے
عقل مند لوگوں سے سنا کہ جب بھی کوئی چور کسی کے گھر میں گھستا ہے اپنا کام اتنی آہستہ روی سے کرتا
ہے کہ اس کی کوئی حرکت اور حس گھر والے کے کان تک نہیں آ پہنچتی۔ اتفاقاً وہ سادہ دل آدمی ایک
رات کو جاگ گیا تو یہ بات اس کو یاد آ گئی ہر طرف کان لگائے مگر چور کا کوئی نشان نہ پایا۔ تلوار نکالی اور
شور مچانا اور دوڑنا شروع کر دیا۔ ہمسائے جمع ہو گئے اور پوچھا کہ کیا ہوا؟ بولا میں نے معتبر لوگوں سے
سنا ہے کہ جب کوئی چور کسی کے گھر میں آ گھستا ہے تو اتنی آہستگی سے اپنا کام کرتا ہے کہ اس کا کچھ بھی
پتہ نہیں چلتا۔ جب میں جاگا چاروں طرف کان لگائے مگر چور کا کوئی نشان میں نے نہیں پایا تو میں
نے سمجھ لیا کہ چور آیا ہوا ہے۔ یہ بات تھی جو میں نے شور مچایا ہے۔ میرے شیخ ہی کا فرمان ہے اللہ کی
پناہ کہ توحید منافی اعمال ظاہرہ ہو۔ باطن ہمیشہ وحدت میں مشغول ہو اور ظاہر ہمیشہ شریعت سے
آراستہ۔ میرے شیخ ہی نے فرمایا ہے کہ باطن گرفتار غیب الغیب ہوگا کہ وہاں اسما و صفات کا کوئی اثر
نہیں وہاں تعین اور ظہور کا کوئی نشان نہیں ملے گا مگر ظاہر اسما و صفات کے مشاہدے اور تعین میں حظ
اٹھائے گا۔ سب کچھ اسی کو جاننا چاہیے اور سب کے سوا اس کو دیکھنا چاہیے۔ سب کچھ وہی ہے اور

سب سے منزہ ہے۔ جمیع صفات وتعینات کے ساتھ ظاہر بھی وہی ہے۔ مگر سب سے منزہ بھی ہے بلکہ تمام تعبیروں سے آزاد ہے چاہیں وہ اعتبار تنزیہی ہو یا اعتبار تشبیہی۔ چاہے اعتبار اطلاقی ہو یا اعتبار تقید۔ یہ حقیقت کلیہ صوفیہ کی اصطلاح میں احدیت اور لاتعینی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ سالکان طریقہ نقشبندیہ کے نظریے اور افکار کا یہ مرتبہ (پیمانہ) ہے۔

خواجہ جمال الدین حسین

آپ خواجہ حسام الدین احمد کے بڑے بیٹے ہیں۔ اپنی نسبت عالی کو اپنے والد سے درست کرتے ہیں۔ نور فراست ولطافت ان کے چہرے سے روشن وظاہر ہے۔ عالی ہمت اور نیک اخلاق ہیں۔ معاملات میں بڑے مستقیم اور طریقت میں بڑے راسخ۔ میرے شیخ سے رابطہ اخلاص اور محبت تام رکھتے ہیں۔ میرے شیخ کی جانب سے انھیں اجازت ارشاد طریقہ نقشبندیہ بھی حاصل ہے۔ میرے شیخ نے رسالہ ''نور وحدت'' کو جو کہ علم توحید میں ان کی خاص تصنیفات میں سے ہے خود لکھ کر ان کو عطا فرمایا ہے۔ میرے شیخ اس رسالے میں لکھتے ہیں کہ ''عالم میں جو کچھ بھی ظاہر ہوا ذات میں پوشیدہ تھا۔ جو ذات میں پوشیدہ تھا پہلے اس نے بہ صورت علم ظہور کیا پھر تعینات میں جلوہ فرمایا۔ ذات نے اس کا رنگ اور اس نے ذات کا رنگ لے لیا۔ ذات تعینات کے رنگ میں رنگ گئی کہ تعین یعنی شے میں غیر ذات شے کچھ نہ بچا۔ پس اس ذات نے خود ہی اپنے ساتھ معاملہ کیا عاشقی شیوہ بنایا بندگی اور خدائی کا رشتہ درمیان میں لائی اور کارخانہ ازلی وابدی برپا کیا۔'' خواجہ جمال الدین حسین کے جو جو الطاف وکرم مجھ پر ہوئے ہیں وہ کہنے اور لکھنے سے بڑھ کر ہیں۔

خواجہ سراج الدین محمد

یہ بھی خواجہ حسام الدین احمد کے پسر ہیں۔ شیخ اللہ داد اور بی بی دولہ کے نواسے ہیں۔ خواجہ ابرار نے ان کی ظاہری وباطنی دونوں تربیتیں کی ہیں۔ وہ علوم ظاہر وباطن میں میرے شیخ کے بڑے شاگردوں میں سے ہیں۔ میرے شیخ کے داماد ہیں۔ عالی فطرت اور بلند ہمت ہیں۔ آج ماوراء النہر اور بدخشاں کے بہت سے غریب لوگ ان کے ظلِ عنایت سے بہرہ مند اور فیض یاب ہیں۔ وہ فقرا اور مساکین

کی خدمت دل و جان سے بجالاتے ہیں۔ کتنے ہی دوستوں اور آشناؤں کے کام صاحب قران ثانی کی درگاہ میں ان کے وسیلے سے نکلتے ہیں۔ وہ بادشاہ کے معزز و مقرب ہیں۔ میرے لیے ان کے دل میں جو جگہ ہے اسے میرا دل ہی جانتا ہے۔ ترک نوکری کی سعادت کے وقت بڑا پُر لطف خط مجھے لکھا تھا جو عرب کے ایک استاد شاعر کی ایک رباعی پر مشتمل تھا۔

الجوھر فقرٌ و سوی الفقر عرض　　الفقر شفاءٌ و سوی الفقر مرض
العالم کلہ خداعٌ و غرورٌ　　والفقر من العالم سرٌّ و غرض[1]

شیخ نورالحق[2]

وہ شیخ عبدالحق دہلوی کے خلف الصدق ہیں۔ علوم ظاہری اور علوم باطنی کے عالم ہیں۔ ان کے فضائل و کمالات حوصلۂ تحریر و بیان سے باہر ہیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے، علوم دینیہ تفاسیر اور احادیث کا فیض متعدد طلبا کو پہنچایا۔ ان کے بہت سے تلامذہ مقام بلند تک پہنچے ہیں۔ تصنیفات عالیہ اور تالیفات جلیلہ و لطیفہ ان کے قلم سے نکلیں جس میں شرح صحیح بخاری، حاشیۂ میر زاہد پر حاشیہ وغیرہ۔ شرح صحیح بخاری بڑی دقیق و متین واقع ہوئی ہے۔ ان مذکورہ تصنیفات کے علاوہ بہت سے فصیح و سلیس شعر ان کے ملتے ہیں۔ ان کے یہ چند شعر ہیں

آب از نگاہت مُل شود آتش بہ بویت گل شود
گُل در کفت بلبل شود بے شک چہ رعنا دلبرے[3]

1　فقر جوہر ہے اور فقر کے علاوہ سب چھلکا ہے۔ فقر شفا ہے اور سوائے فقر مرض ہے۔ سارا جہاں دھوکا ہے اور غرور ہے۔ دنیا بنانے سے غرض اور راز الٰہی فقط فقر ہی ہے۔

2　آپ کی ولادت 983ھ/1575 کو اور وفات 9 رشوال 1073ھ/ 7 رمئی 1663 میں ہوئی۔ مزار مبارک اپنے والد کے متصل ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ بخاری شریف کی شرح بعنوان ''تیسری القاری'' چھ جلدوں میں آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ اپنے والد گرامی مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

3　پانی تیری نظر سے شراب بن جاتا ہے، آگ تیری بو سے پھول بن جاتی ہے۔ پھول تیرے ہاتھ میں بلبل ہو جاتا ہے بے شک تو کیا ہی لاجواب محبوب ہے۔

زبس کہ نشاءِ معنی ز علم ما پیداست نشان صبح سعادت ز شامِ ما پیداست
زما جدا مشو اے طالب مدارج قدس سراغ سدرہ نشیناں ز بامِ ما پیداست
امداد کن کہ طے شود این راہ و گر نہ ما یک گام رفتہ ایم و بصد جانشستہ ایم
از آتشِ من جانِ نصیحت گرِ من سوخت چوں خس کہ باصلاح چراغ آید سوزد
شب پرہ اگر روے تو بیند بخواب بروز دہد در بغل آفتاب [1]

رباعی

از شیوہ ہمدمان این دہر خلاف گویم رمزے اگر نگیری بگذاف
چون شیشہ ساختند پیوستہ بہم دلہا ہمہ پر غبار و روہا ہمہ صاف [2]

مجھے اس وقت یہ رباعی بہت پسند آئی تھی تو میں نے بھی اس کے تتبع میں ایک رباعی کہی جو یہ ہے:

از شیوہ عاشقان معشوق اوصاف گویم رمزے بشنو بگوش انصاف
در آتش شوق کیمیا بوتہ و شند روہا ہمہ پُر غبار و دلہا ہمہ صاف [3]

---

1 کتنے جہانِ معنی ہمارے علم سے ظاہر ہیں اور (کتنے) صبح سعادت کے نشان ہماری شام سے ظاہر ہیں۔ اے طالب مدارج قدس ہم سے جدا نہ رہ، سدرہ نشینوں کے نشانِ قدم ہماری چھت سے نظر آتے ہیں۔ اے اللہ مدد کیجیے تا کہ یہ راہ طے ہو جائے ورنہ ہم ایک قدم چلیں گے اور سو جگہ بیٹھیں گے۔ میری آتش شوق سے نصیحت گر کی جان میں بھی آگ لگ گئی وہ بھی شوق الٰہی سے جل اٹھی جیسے کہ جس تنکے سے چراغ کی بتی ٹھیک کرتے ہیں جل جاتا ہے۔ اگر چمگادڑ خواب میں تیرا چہرہ دیکھ لے تو بجائے آنکھ بند کرنے کے دن میں آفتاب کو گود میں لے لے۔

2 اس الٹے زمانے کے ہمدموں کے شیوہ ہم نشینی کو میں اشارتاً کہتا ہوں اگر تو میری بات جھوٹ نہ جانے۔ یہ شیشے کی مانند آپس میں بظاہر صاف ستھرے ملے جلے ہیں دلوں میں غبار بھرے ہیں اور چہرے بالکل صاف ہیں۔

3 میں عاشقانِ معشوق اوصاف کے طریقے کو بطور رمز کہتا ہوں گوش انصاف سے سنیے۔ کیمیا (سعادت) کے شوق میں بوتے (سنار کی کٹھالی) کے مانند ہو گئے ہیں بظاہر بالکل خراب وخستہ اور حقیقت میں بالکل صاف شفاف۔

مولانا حسن کشمیری

آپ میرے شیخ کے رشتے داروں میں ہیں۔ وہ علوم ظاہری، علوم باطنی اور عاشقان الٰہی کے علوم معرفت و توحید کے عالم تھے۔ صوفیوں میں بڑے فضیلت مآب تھے۔ شیخ چاپلدہ سنگی کے مرید ہیں۔ خواجہ پیرنگ قدس سرہٗ کے صحبت داروں میں ہیں۔ طریقت میں سخت وسیع المشرب تھے۔ فقرا اور اغنیا سب میں نشست رکھتے۔ خوش صحبت، شریں کلام تھے۔ ان کے بہت سے اشعار عارفانہ ہیں میرے شیخ کو ان کے شعر بہت پسند ہیں۔ یہ ان کی شاعری ہے

رباعی

ہر ذرّہ کہ در جہان بعنوانے ہست　　بر خوبیٔ آن، نوشتہ بُرہانے ہست
زنہار بچشم کج نہ بینی زنہار　　کین سلسلہ را سلسلہ جنبانے ہست[1]

شعر

آن باغ فضیلتم کہ خارم سمن است　　وان پُر ہنرم کہ ننگ وعارم سخن است
خودرا بشناس ورنہ این چاردہ علم　　دانی معلوم ور ندانی معلوم[2]

علم حقائق میں وہ بڑے ہی خوش بیان تھے۔ "اتفاقاتِ حسنہ" ان کی تالیفات میں سے بہت ہی دلچسپ اور شیریں واقع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا ہر فقرہ معانی کا ایک دفتر ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ اس نے سچ کہا جس نے کہا "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ[3]"۔ نفس کی شناخت کی ایک علامت جو کہ فلاح (ابدی) اور معرفت حق کی ابتدا ہے یہ ہے کہ ہر شخص بلکہ ہر چیز کو اپنے سے اچھا سمجھے، کسی برے اور بدنما پر بھی اعتراض کی انگلی نہ اُٹھائے۔ "بدیدۂ عارف ایں کار بد وزیبا چہ؟"

1　جہان میں جو ذرّہ بھی ہے اس ذات کی خوبی پر ایک لکھی ہوئی دلیل ہے۔ کبھی بھی کسی کو چشم حقارت سے نہ دیکھنا۔ مخلوقات کے اس سلسلے کی سلسلہ جنبان وہی ذات علیم وحکیم ہے۔

2　میں فضیلت کا وہ باغ ہوں کہ میرا کانٹا پھول ہے اور میں وہ پُر ہنر ہوں کہ میرا ننگ وعار میری شہرت ونام آوری ہے۔ اپنے آپ کو پہچان ورنہ یہ چالیس سالہ علم تو جانے یا نہ جانے اس کی حقیقت معلوم ہے۔

3　جس نے خود کو پہچان لیا تو حقیقت میں اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی۔

(عارف کی نظر میں برا بھلا یکساں ہے۔ یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ میں نے ایک کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ تری ذات عالم صغیر ہے جو کچھ عالم کبیر یعنی دنیا میں ہے تجھ میں بھی ہے۔ پس ہر وہ برائی جو تیری بھینگی آنکھ دیکھتی ہے تجھ میں بھی ہوگی مگر تو اس کے دیکھنے سے اندھا ہے۔

ہر چہ در فرعون بود اندر تو ہست　　لیک اژدھات محبوس چہ ہست
سوے من منگر بخواری سست ست　　تا بگویم انچہ در رگہاے تست [1]

اگر تیری نظر باوجود اس معرفت کے پھر بھی کسی بد پر جاتی ہے تو بدی کا کوئی نہ کوئی جزو تجھ میں بھی ہے۔ میں نے بقدر تیری سمجھ کے بات کی ہے اور تو مجھے احمق سمجھ رہا ہے کچھ تو انصاف کر۔ بجائے خوش ہونے کے تو مجھ سے ناخوش ہو رہا ہے بلکہ حماقت سے رنجیدہ بھی ہے۔ کُل کو بہ نظر عیب دیکھنا اور جز کو اس عیب سے بالکل پاک جاننا یہ بات حق سے دور حماقت میں تحت الثریٰ سے بھی نیچی اور نہایت بے انصافی کی ہے

ہر چہ می گویم بقدر فہم تست　　مردم اندر حسرت فہم درست [2]

اور اگر مجھ سے ہی پوچھتا ہے تو میں خود آشنا ہو کر خود کو کچھ نہیں سمجھتا ہوں سب کچھ اُسی کو سمجھتا ہوں حقیقت میں اور مقبولوں کے گروہ کے مقولے "من عرف نفسه فقد عرف ربه" کے دو پلّے ترازو کے سے پاتا ہوں جو کسی عقلمند کے ہاتھ میں ہوں۔ ہر ایک سے خود کو تولتا ہے یعنی جس نے خود کو پہچان لیا اور اس نے اللہ کو پہچان لیا۔ جس نے اللہ کو پہچان لیا اسے اپنی ذات کی بھی معرفت ہو جائے گی۔ اس مقام پر پہنچ کر اسے "ماخلقت الجن والانس اِلا ليعبدون" کی معرفت ہوتی ہے کہ کیا ہے؟ اور یہ بھی جان جاتا ہے کہ "فاما من ثقلت موازينه فهو فى عيشة الراضيةً واما من خفت موازينه فامهٔ هاويه [3] " میں کس طرف اشارہ ہے۔ پس جس

1　جو کچھ فرعون میں تھا تیرے اندر بھی ہے لیکن تیرے نفس کا اژدھا جسم کے کوئیں میں قید ہے۔ مجھے حقارت کے ساتھ ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھ تاکہ میں تیرا اندرونی کھوٹ بیان کر دوں۔

2　میں جو کچھ بیان کرتا ہوں تیری عقل کے بقدر کہتا ہوں۔ میں فہم درست کی حسرت میں مرا جا رہا ہوں کہ کوئی صاحب فہم ملے تو اس سے دل کھول کر بیان معارف وحقائق کرو۔

3　تو جس کی تول بھاری ہوگئی تو وہ پسندیدہ عیش میں ہے اور جس کی تول ہلکی رہ گئی تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

سعادت مند کی خود شناسی کا پلہ بھاری ہوگا اس کا خدا شناسی کا پلہ بھی بھاری ہوگا۔ اور وہ دنیا میں بھی بہشت دانائی میں زندگی گزارے گا اور جس کی خود شناسی کا پلہ ہلکا رہے گا اس کا معرفت خداوندی کا پلہ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ کیونکہ دانائی کی جنت اور نادانی کی دوزخ بھی ''من کان فی هٰذِہٖ اعمٰی فھو فی الآخرۃ اعمٰی واضل سبیلاً[1]'' کے حکم میں ہے کیونکہ بہشت و دوزخ مومن و کافر کے لیے دائمی ہے۔ ظاہر ہے کہ جسے تو ناداں تر سمجھ رہا ہے، اس کو بھی کان آنکھ کا تو علم ہے اگر اتنا جانتا ہو کہ جو کچھ اس میں خوبی ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے اگر چہ وہ صفات کو جانے یا نہ۔ اسے دانا کہیں گے اور وہ بہشت دانائی میں ہے اور دوزخ نابینائی اتنا (بھی) نہ جانتا ہے۔ پس کوئی بھی فرد ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' سے باہر نہیں نکلتا۔ اسی لیے ''وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون'' صادق المضمون ٹھہرتا ہے۔ صدق کی شناخت کی علامت یہ ہے کہ جس قدر دانائی بڑھتی ہے اپنے جاہل ہونے کی معرفت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اگر اے مخاطب تو میری بات پر یقین نہیں کر سکتا تو حضرت داؤد علیہ السلام سے سن کہ ان کی کتاب زبور میں تحریر ہے کہ ''جب کسی عقلمند کی دانائی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں وہ بچوں سے بھی نادان تر ہو جاتا ہے۔''

بانگ دو کردم اگر در دہ کس است[2] انتہیٰ کلامہ

میں نے ان سے بار بار ملاقات کی ہے اور ان کی لطافت کلام، ان کے الطاف و انعام سے بہرہ ور ہوا ہوں۔

ایک دن میں خواجہ کلاں شیخ عبید اللہ کے فرزند خواجہ کرامت اللہ کی (رسم) بسم اللہ کی مجلس میں حاضر تھا۔ بہت سے مشائخ اور علما جمع تھے اور اس فرزند عزیز کو دعائے ''رحمٰن'' کا ایک ایک کلمہ کہلوانا شروع کیا۔ شیخ الہداد نے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' خواجہ ابرار نے ''الرحمن'' شیخ عبدالحق نے ''علم القرآن'' اور خواجہ کلاں نے ''رب یسر'' خواجہ خرد نے ''ولا تعسر'' مولانا حسن نے ''رب زدنی'' اور شیخ عبدالحق نے ''علما'' پڑھا۔ مولانا حسن نے اُن سے خوش طبعی کے طور پر

---

1 جو اس دنیا میں دانش حقیقی سے اندھا ہے وہ آخرت میں اندھا اُٹھایا جائے گا۔

2 میں نے آواز لگا دی ہے اگر بستی میں سننے والا ہے، سنے گا۔

فرمایا۔ اے شیخ علم آپ کے حصے میں اور سمجھ ہمارے حصے آئی۔ اہل مجلس اس لطیفے سے خوش وقت ہو گئے اور "بسم اللہ" کی یہ مجلس خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوئی۔ مولانا کی وفات 1051ھ (1641) میں ہے۔ ملک یار پراں کے روضے کے جوار میں اپنی تجویز کردہ جگہ دفن ہوئے۔ شیخ عبدالحق نے ان کی تعزیت میں خواجہ محمد صادق کو جو کہ میرے شیخ کے ماموں ہیں کہ وہ ان کے ماموں لگتے ہیں، خط لکھا جس میں خاص کر یہ شعر لکھا

گر نہ قضا بود کہ باہم رویم   می رسد آن وقت کہ ماہم رویم[1]

شیخ عبدالحق نے "اخبار الاخیار" میں لکھا ہے کہ شیخ نورالدین ملک یار پراں[2] بڑے پایے کے بزرگ تھے۔ اپنے شہر سے دہلی آ کر آباد ہو گئے۔ آپ سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے کے مشائخ میں ہیں۔ شیخ نظام الدین اولیاء ان کے روضہ کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ ظاہر یہ ہے کہ ان کا زمانہ حیات بھی پایا ہوگا مگر ان کی ایک دوسرے سے ملاقات معلوم نہیں۔ جس وقت کہ شیخ ملک یار پراں دہلی آئے جہاں اب وہ دفن ہیں، رہنے لگے۔ شیخ ابوبکر طوسی[3] اس دور میں ایک قلندر تھے۔ ان سے نزاع کرنے لگے انھوں نے کہا مجھے میرے پیر نے بھیجا ہے۔ انھوں نے حکم نامہ طلب کیا۔ دہلی اور اس جگہ سے بڑی دراز مسافت تھی۔ ذرا سی دیر میں جو بظاہر ممکن نہ تھا اجازت نامہ لے کر آ گئے۔ اسی دن سے انھیں ملک یار پراں کہنے لگے۔ واللہ اعلم۔ انتہی

محمد حافظ خیالی

وہ بھی میرے شیخ کے اقربا میں ہیں۔ خواجہ بیرنگ کے دیکھنے والوں اور صحبت داروں میں سے تھے

---

1. تقدیر میں نہ تھا ہم ساتھ ساتھ چلیں عنقریب وہ وقت آتا ہے کہ ہم بھی چل پڑیں گے۔
2. اپنے مرشد کی اجازت سے شہر لار متصل بخارا سے دہلی تشریف لائے اور ابوبکر طوسی کی خانقاہ کے سامنے سکونت اختیار کی۔ شیخ دانیال کے مرید و خلیفہ تھے۔ شیخ کامل اور بڑے عارف تھے۔ 18ر جمادی الثانی 680ھ/ 1281 میں بعہد غیاث الدین بلبن وفات پائی۔
3. شیخ ابوبکر طوسی کامل اولیاء کرام، صوفی مذہب اور قلندر مشرب تھے، 22ر رجب 700ھ/12ر اپریل 1301ھ میں وفات پائی۔ دہلی میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

اور اپنے وقت کے فصحا اور فضلا میں سے تھے۔ بعض علوم غریبہ کے عالم تھے۔ استغنائے ذاتی سے متصف کبھی دنیائے دوں کے لیے اہل دنیا کے پاس نہ گئے۔ ہر حال میں اپنے گوشۂ استغنا میں سب سے الگ رہتے تھے۔ فکر روزی ان کی ہمت بلند کے دامن گیر نہ ہوتی تھی۔ میرے شیخ ان کی عالی ہمت، نیک طور طریق زندگی، فضائل و کمالات کا ذکر فرماتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں اب اس زمانے میں ان جیسا کوئی نہیں۔ ایک وقت میرے شیخ اپنے یاروں کے ساتھ کتاب ''نفحات الانس'' کی عبارت کا مقابلہ کر رہے تھے میں بھی فائدہ حاصل کرنے والوں میں شامل تھا۔ آپ نے بعض جگہوں پر کتاب پر حاشیہ بھی لکھا ایک دن وہ بھی حاضر تھے ایک موقع پر انھوں نے بالکل درست دخل دیا۔ میرے شیخ نے اس حاشے میں ان کا نام بھی داخل کر دیا ہے وہ مقام یہ ہے۔''
سیل الجنید ایکون العطاء من غیر عملٍ فقال کل العمل من عطاء ہ ''حضرت جنید سے پوچھا گیا۔'' کیا بغیر عمل کے بھی اجر و عطا ہے؟'' جواب دیا ''توفیق عمل بھی تو عطا ہی ہے'' اس جواب میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس عمل پر اجر ملتا ہے اس کی توفیق ایک عطائے خداوندی ہے جس پر عمل مرتب ہوتا ہے۔ (عامل تو صرف آلہ کار ہے)۔ جیسا کہ مولانا حافظ خیالی سلمہ سے استفادہ کیا گیا۔ انتہیٰ

بادشاہ صاحب قران ثانی شاہ جہاں کے دربار کے بعض مقربین نے چاہا کہ وہ ہمارے ساتھ ہو کر خوان احسان سلطان سے فائدہ مند ہوں۔ انھوں نے انکار کر دیا اور اپنی تمام زندگی حالت بے سرو سامانی میں جیسی کہ گزری خوشی خوشی گزار دی۔ ان کا بڑا فصیح ولطیف کلام ہے۔ یہ دو شعر ان کے کلام میں سے پیش ہیں:

عمر عزیز ما ہمہ در تیرگی گذشت ـــــ در شب نبشتہ اند مگر سر نبشتِ ما [1]
بعشوہ کشتی و بازم بغمزہ جاندادی ـــ گر از خدای نترسم ترا خدا گویم [2]

میں ہر سال اپنے وطن سنبھل سے آ کر اپنے شیخ کی خدمت میں (دہلی) حاضر ہوتا تھا۔ وہ (حافظ خیالی) میری ایسی خبر گیری اور خیال رکھتے تھے جیسا کہ خیال رکھنے کا حق ہے اور اس قدر دلبری

1 ہماری تمام عمر عزیز اندھیرے میں گزر گئی۔ شاید ہماری تقدیر انھوں نے رات میں لکھی ہے۔
2 پہلے تو عشوے سے تو نے مارڈالا پھر غمزے سے زندہ کر دیا۔ اگر میں خدا سے نہ ڈروں تو تجھے خدا کہہ دوں۔

دکھاتے تھے کہ میں ہمیشہ ان کا ممنون کرم ہوں۔ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد میں نے (بطور تاریخ) کہا "آہ آہ محمد حافظ خیالی بے مثل"

شیخ سلیم دہلوی

وہ بخاری الاصل ہیں۔ حاجی عبدالوہاب کے پوتوں میں سے ہیں۔ صالح اور عالی ہمت تھے۔ معاملت میں بہت اچھے تھے۔ میرے شیخ کے دوستوں میں سے تھے۔ میرے شیخ ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اُن کی وفات 1050ھ (1621) میں ہوئی۔ میں نے انھیں بہت دیکھا ہے۔ بزرگان سلف کی یاد دلاتے تھے۔ مجھ پر مہربانی فرماتے۔ آج ان کے صحبت داروں میں سے شیخ فتح اللہ ہیں جو صاحب صلاح وسلامتی واستقامت ہیں۔ میرے شیخ کا ملفوظ ہے کہ ایک بار شیخ سلیم کے والد نے خواجہ بیرنگ سے پوچھا کہ اگر کسی مجلس میں کوئی سید ہے جو بے عمل ہے اور ایک باعمل اور نیک ہے مگر سید نہیں ہے تو ان دونوں میں سے کس کو اس مجلس میں بالاتر بٹھائیں۔ خواجہ بیرنگ نے فرمایا وہ کیسا صالح ہوگا جو سید سے بالاتر بیٹھنا گوارا کرے، اور خود کو اس سے بزرگ تر رکھے۔ سید یہ سن کر خوش ہو گئے۔ میر عبدالاوّل کے (مجموعۂ رسائل) میں لکھا ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا کہ بزرگان دین میں سے ایک صاحب کسی سیدزادے سے احکام شریعت پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے اعتراض رکھتے۔ انھوں نے حضرت فاطمہ (ؓ) کو خواب میں دیکھا اور سلام کیا مگر آپ نے اپنا چہرہ پھیر لیا، سلام کا جواب نہ دیا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ مجھ سے کیا بےادبی ہوئی کہ آپ میرے سلام کا جواب نہیں دے رہی ہیں۔ اس سے آپ کی خفگی ظاہر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کیوں فلاں شخص کو ایذا پہنچاتا ہے۔ اُن بزرگ نے عرض کیا کہ وہ احکام شریفہ بجا نہیں لاتا۔ حضرت فاطمہ (ؓ) نے کہا کہ تجھے معلوم نہیں کہ وہ میری اولاد میں ہے۔ حضرت خواجہ احرار فرماتے ہیں کہ اس بات سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ساقط کرنا مقصود نہیں بلکہ احترام سادات مقصود ہے ان کی عظمت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت ہونے کی نسبت کالحاظ کرتے ہوئے۔ انتہیٰ۔ "رشحات" میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ ایک دن سادات کی توقیر و تعظیم کے تعلق سے فرمارہے تھے کہ اگر کسی بستی میں سادات رہتے ہوں تو میں اس بستی میں رہنا پسند نہ کروں۔ کیونکہ ان حضرات کی بزرگی اور

شرافت بہت بلند ہے اور مجھ سے حق تعظیم ادا نہ ہو سکے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک دن امام اعظم رضی اللہ عنہ دوران درس کھڑے ہوے کسی کو اس کی وجہ نہ پتا چلی تو آخر ان کے ایک شاگرد نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ علوی سادات کا ایک بچہ جو درس میں شامل ہے جیسے ہی میری نظر اس پر پڑتی ہے میں اس کی تعظیم میں اُٹھتا ہوں۔ انتہیٰ۔ روایت ہے کہ شیخ شہباز بھاگلپوری جو ایک صاحب علم، عامل، صاحب کرامات و مقامات گزرے ہیں۔ سادات بارہہ کا ایک فرد بھاگلپور میں حاکم وقت تھا وہ بعض ارباب حسد کی شکایت کرنے پر شیخ سے لپٹ گیا ان کو پکڑ کر کھینچا اور گریبان سے لٹکا لیا شیخ نے اس حال میں اپنے مریدوں سے جو سب اہل کار صاحب توجہ تھے یہ بات بڑی تاکید سے کہی کہ کوئی سید کو تکلیف پہنچانے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی دعا توجہ سے کام لے کیونکہ کل کو مجھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ اسی حال میں دیر تک انھوں نے بہت تکلیف اُٹھائی۔
آخر جب سید کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایک ہندو حاکم آیا کچھ دن بعد وہ بھی نادانی میں صاحب غرض حاسدوں کے کہنے سے شیخ سے ناشائستہ باتیں کرنے لگا، شیخ نے جب یہ سنا تو مسکرائے اور گویا ہوئے کہ یہ حاکم سید کی تقلید میں میرے ساتھ اس طرح جو پیش آ رہا ہے اسے معلوم نہیں کہ وہ بات ہی اور تھی۔ اسی اثنائے گفتگو مریدان شیخ میں سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ اے شیخ اس کے لیے میں تنہا کافی ہوں۔ اس رات میں اس کو مسل کر رکھ دوں گا۔ جب رات ہوئی قسمت کا کرنا رات کو کمرے کی چھت گر گئی اور اس کو خاک برابر کر دیا۔
شیخ دوست محمد امروہوی جو حافظ قاری اور بااخلاق شخص ہیں انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے شیخ شہباز کو دیکھا ہے بڑے بزرگ تھے۔ ان کے مریدوں میں سے ایک صاحب سید مصطفیٰ تھے جو وقت سماع غلبۂ حال میں سجدے میں گر پڑتے اور خون کے قطرے ان کے منہ سے نکلنے لگتے تھے۔ میری شیخ سلیم کے ایک مجذوب مرید سے ملاقات ہوئی ایک دن میں نے اس سے دریافت کیا کہ شیخ کے یہاں تمھیں کون سی خدمت سپرد تھی۔ انھوں نے کہا جب شیخ مکہ مکرمہ میں نماز کے لیے پنج وقت حاضر ہوتے تھے تو میں ان کے جوتوں کی نگہبانی کیا کرتا تھا۔ شیخ سلیم کے دو صاحبزادے اور ایک داماد تھے۔ تینوں قابل نوجوان تھے۔ کوئی شخص ان کے پاس خبر لے کر پہنچا کہ تینوں اکبرآباد میں جنگ میں کام آئے۔ یہ سن کر کوئی تغیر اُن میں پیدا نہ ہوا بس یہ معلوم کیا ان کی نعشیں کہاں ہیں۔ جواب ملا۔ یہاں

پہنچنے ہی والی ہیں۔ بولے یہاں کیوں لا رہے ہیں جاؤ قبرستان میں لے جا کر دفن کرو لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے صرف ایک آہ کھینچی مگر آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ بہایا اور ماتم نہیں کیا بلکہ خاندان والوں کو بھی ماتم کو منع فرمایا۔ رات کو بس اتنا کہا کہ میرا دماغ برہم ہو رہا ہے شور بامنگایا اور موافق عادتِ قدیم پی لیا۔ نقل ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ استغراق کی وجہ سے دفن کے بعد اس کی والدہ کے رونے سے انھیں پتہ چلا کہ کیا معاملہ ہے۔

میرے ایک دوست میرے شیخ کے مرید شیخ معظم نام جو لشکری ہیں صاحب صدق و راستی، راہ شریعت پر گامزن بڑے فہیم اور ظریف ہیں ان کا ایک بیٹا عادل بڑا قابل نو جوان تھا وہ بھی میرے شیخ ہی سے بیعت تھا۔ اس کا 1066ھ (1656) میں انتقال ہو گیا اس دن میں بھی اپنے شیخ کے ساتھ (اس موقع پر) حاضر تھا۔ نہ انھوں نے آہ کی نہ آنکھ تر کی۔ بیٹے کی تجہیز و تکفین ایسے کی کہ غم کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا اور خواجہ بیرنگ کے آستانے میں دفن کر دیا۔ ایک بار شیخ معظم نے ایک مصرع کہا اور مجھ سے کہا رباعی پوری کرو۔ میں نے کر دی۔ وہ یہ ہے

در مکتب عشق قدس دانای نیست — تعلیم توی و خواندن مای نیست

از پردهٔ علم بگذر و عین شناس — کانجا وجودِ غیر گنجای نیست [1]

شیخ جلال الدین کسکی

وہ بابرکت و پُر انوار بزرگ تھے۔ کاملان سلف کے سے طور طریق رکھتے تھے۔ صاحب ذوق تھے۔ نسبت کو اپنے والد شیخ محمد سے درست کرتے تھے شیخ جاپلدہ سنگی کے خلیفہ اور داماد تھے اور شیخ عبدالعزیز کے پوتوں میں سے ہیں۔ میرے شیخ کے دوستوں اور مخلصین میں سے ہیں اور ان سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ مہابت خاں جو کہ دہلی کے حاکم رہے ہیں وہ بڑے شجاع صاحب شوکت، تہور و جلادت اور قوی القلب، با ہیبت اور دبدبے والے تھے۔ ان کا یہ قدیم شعر جمع خود اس بات کی تصدیق و موافقت کرتا ہے۔

---

1 عشق الٰہی کے مکتب میں دانائی نہیں پڑھائی جاتی۔ یہاں، میں، تو کی یعنی غرور و غیریت کی تعلیم نہیں دی جاتی علم کے پردوں سے گزر کر حقیقت کو پہچان، کہ حقیقت میں دوئی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مہابت من اگر بانگ بر زمانہ زند قطار ہفتہ ایّام بگسلند مُہار [1]

ابتدائی عمر میں مہابت خاں خواجہ بیرنگ کے آشنا اور ہم صحبت رہے ہیں۔ اپنے آخری وقت میں ایک بزرگ سے افسوس کے ساتھ کہہ رہے تھے میں خواجہ بیرنگ کا ہم صحبت رہا ہوں۔ آپ ولی کامل بن گئے مگر میں کچھ بھی نہ بنا۔ اُن بزرگ نے فرمایا ''تم دنیا کی راہ میں کمال کو پہنچے ہو اور خواجہ بیرنگ راہ خدا میں۔ اسی طرح خان شیخ جلال الدین کے بھی معتقد اور نیاز مند رہے ہیں کہ مستقل ان کے دیدار سے برکت حاصل کرتے تھے۔ ایک ہاتھی بھی ان کی نذر کیا تھا۔ یہ ان کے مخلوق خدا میں مقبولیت کا درجہ ہے۔ میرے والد ابتدا میں کٹرہ شیخ فرید پور کی عمارت کے نگراں تھے۔ دونوں حضرات آپس میں محبت و اخلاص تام رکھتے تھے اور ان سے ملاقات کی غرض سے اس سرائے میں جو ان کے مکان کے قریب تھی ایک چھوٹا دروازہ لگا رکھا تھا۔ اور چاہتے تھے کہ وطن (سنبھل) میں بھی اسی طرح پڑوسی بن کر رہیں مگر یہ ارادہ سرانجام نہ پایا۔ میں نے بچپن سے ان کا دیدار کیا ہے اور ان کے لطف و احسان سے بہرہ مند ہوا ہوں۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں پہنچا، بڑے خوش تھے۔ اس راہ سلوک و معرفت خداوندی کی دلکش وصیتیں کرنے لگے۔ اہل مجلس میں سے ہر شخص محظوظ ہو رہا تھا میں نے بھی خوب حظ اٹھایا۔ آخر میں انھوں نے یہ شعر پڑھا اور اس کے بہت خوب معنی بیان کیے۔ مؤثر تعبیر بیان کے ساتھ

ہزار بار بشویم دہن ز مشک د گلاب ہنوز نام تو گفتن کمالِ بے ادبیست [2]

ان کی وفات 1050ھ (1621) میں ہوئی۔ اور ان کی قبر شیخ عبدالعزیز کے روضے کے نزدیک ہے۔

شیخ بہاءالدین برناوہ

صاحب ذوق و وجد و حال بزرگ تھے۔ اپنے والد سے نسبت درست کرتے تھے اور اپنے والد کے سجادہ نشین بھی تھے۔ ان کے ہندی اشعار دلوں کو ذوق بخشتے ہیں۔ ان کے خیال صوفیہ کے موافق ہوتے ہیں اور عجیب تاثیر رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایک ساز بھی بنایا ہے اس کا نام بھی خیال رکھا

1 میری ہیبت اگر زمانے پر ڈانٹ لگا دے تو ہفتے کے ساتوں دنوں کی قطار مہار توڑ کر بھاگ پڑے

2 ہزار بار بھی مشک و گلاب سے اپنا دہن دھولوں۔ پھر بھی تیرا نام لینا بے ادبی کی انتہا ہے۔

ہے۔ اس سے ایک غمگین آواز اور شریں نغمہ نکلتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے خیال نام کے ساز پر اپنے خیال کہتے ہیں اور ہمیشہ اسی (محبوبِ حقیقی) کے خیال میں رہتے ہیں

خیال تست در خاطر کہ جانرازندہ می دارد　　دگر نہ در زمان میرم من تنہا زِ تنہائی [1]

میرے شیخ "نور وحدت" میں فرماتے ہیں کہ درویشی صحیح خیال کا نام ہے۔ کیونکہ غیر کے خیال کے سوا کوئی پردہ نہیں۔ پردے کا اٹھانا بھی خیال سے ہی کرنا چاہیے۔ دن رات خیال وحدت میں رہنا چاہیے۔ میں نے ایک موقع پر اس دقیقے پر مشتمل ہندی میں ایک شعر کہا ہے

جو توہ لاگے پریم دکھ کرا پاؤنہ لاگ　　جیوں لو ہو کون سوہی اک جری کوں آگ [2]

نقل ہے کہ افلاطون نے کہا ہے "الارض کـــرة والانســان والا فـلاک قـواسٌ والـحـوادث سـهـامٌ والرامی هو الله فاین المفر [3] "جب یہ بات حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے سنی تو فرمایا "الی اللہ" اللہ ہی کی طرف۔

ابتدا میں ایک بار میں نے شیخ بہاء الدین کو راہ میں دیکھا ان کے ساتھ چند قدم چلا ان کی نورانی صورت سے دل خوش ہوا، لیکن مجھے ان کی ہیبت نے کلام کے لائق نہ چھوڑا۔ اس زمانے میں، میں کم عمر تھا اور وہ بوڑھے تھے۔ ان کی وفات کا سال 1034ھ (1625) ہے۔ جب میرے شیخ نے ان کے انتقال کو سنا فوراً یہ مصرعہ تاریخ کہا "آہ شیخ بہاء الدین آہ" اور میں نے اس پر یہ قطعہ کہا

شد ز دنیا چون بہاء الدین شیخ　　بود کو واقف ز اسرار الٰہہ

شیخ من گفت ز سال فوتش آہ شیخ بہاء الدین آہ [4]

1　"یہ تیرا دھیان ہی تو ہے جو میرے دل میں رہ کر جانِ حزیں کو زندہ رکھتا ہے ورنہ تو میں تنہا رہ کر تنہائی سے ایک پل میں مرجاؤں۔"

2　جب تجھے آزارِ محبت ہو جائے گا تو کسی غیر سے کوئی لگاؤ نہ رہے گا۔ ایک کے خیال میں سارے خیالوں میں آگ لگ جائے گی۔

3　زمین تو نشانہ ہے، انسان اور افلاک کمان ہیں حوادث تیر ہیں اور کمان سے تیر پھینکنے والی ذات اللہ کی ہے تو انسان کہاں بھاگ کر جا سکتا ہے۔

4　جب شیخ بہاء الدین دنیا سے چلے گئے جو بلا شبہ اسرار الٰہی کے واقف تھے میرے شیخ نے ان کے جانے کی تاریخ کہی کہ "آہ شیخ بہاء الدین آہ"۔

میر ابراہیم اکبرآبادی[1]

وہ میر محمد نعمان[2] کے خلف الصدق ہیں۔ صاحب صدق و راستی اور نیک سلوک۔ 1067ھ میں مخدوم زادہ ہائے سرہند کے ہمراہ شرف زیارت حرمین محترمین سے مشرف ہوئے۔ جمعیت ظاہری و باطنی کے ساتھ اپنے وطن اکبرآباد لوٹ کر آئے۔ میرے شیخ سے نہایت درجہ رابطۂ دوستی و اخلاص رکھتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کو اپنے شیخ کی صحبت میں دیکھا۔ نور باطن ان کے چہرے سے ظاہر ہے۔ میر محمد نعمان شیخ احمد سرہندی کے مرید ہیں۔ خواجہ بیرنگ کے دیکھنے والوں اور صحبت داروں میں سے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ وہ صاحب نسبت عالیہ اور اخلاق عظیمہ کے مالک تھے۔ بزرگی کے آثار و برکات ان سے ظاہر تھے۔ ان کی صحبت میں بڑی تاثیر تھی۔ بے تکلفانہ خوش خوش زندگی گزارتے۔ کوئی امتیازی شان نہ دکھاتے۔ میرے شیخ کے بڑے نیازمندوں میں تھے۔ ان کے بہت سے مرتبہ والے مریدین اور مقربین (الٰہی) ہیں۔ ان کی وفات 1050ھ (1641) میں ہوئی اور ان کی قبر اکبرآباد میں ہے۔ کہتے ہیں کہ میر ہاشم جوان کے مرید اور داماد تھے بڑے صاحب ذوق و وجد اور صاحب نسبت تھے۔ پُر ذوق شعر کہتے تھے۔ ان کی یہ غزل مشہور ہے:

گر از خلق پنہان کنم درد خود را　　چہ درمان کنم چہرۂ زرد خود را[3]

1　اپنے زمانہ کے اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ بادشاہ عالم گیر کی طرف سے حرمین شریفین میں نذر لے کر گئے اور لوٹتے وقت یمن کے درمیان 1071ھ/ 1661 میں وفات پائی۔

2　میر محمد نعمان ابن شمس الدین یحیٰ معروف بہ میر بزرگ آپ کی ولادت 977ھ/ 1570 کو سمرقند میں ہوئی۔ مرشد کی تلاش میں ہندستان آئے اور خواجہ محمد باقی باللہ نقشبندی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی۔ خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی خدمت میں رہے اور خلافت پائی۔ آپ کی وفات 1058ھ/ 1648 میں ہوئی۔ صاحب تاریخ محمدی نے آپ کی تاریخ وفات 18 / صفر 1059ھ لکھی اور دو مادۂ تاریخ بھی لکھے جو یہ ہیں: ''فوت امیر نعمانی عالی'' اور ''فوت امیر نعمان سامی'' ان مادوں سے 1058 عدد برآمد ہوتے ہیں۔ تو ظاہر ہے اس جگہ 8 / کی جگہ 9 / سہو کتابت ہے۔

3　اگر میں مخلوق سے اپنا درد چھپا بھی لوں تو اپنے اس زرد چہرہ کا کیا علاج کروں۔

خوش آندم کہ چون سرو در جلوہ بینم — سہی قامت ناز پرورد خود را
زہستی چنان در غبارم کہ خواہم — بر آرم ازین خاکدان گرد خود را
چنین زار از درد چندین بنالم — کہ آگہ کنم ماہ شب گرد خود را
مکن ہاشمی نالہ از درد چندین — بہ بیچارگی چارہ کن درد خود را [1]

مولانا عوض وجیہ بلخی

عالم و فاضل اور صاحب دانش و بینش بزرگ ہیں۔ ان کے درس میں بڑے بڑے اہل علم دینی علوم کا استفادہ کرتے ہیں وہ اور دوسرے فضلا ملک توران سے آ کر 1050ھ (1641) میں بادشاہ صاحب قران ثانی کے حضور میں رہنے لگے تھے مگر وہ بادشاہ سے قرب و مرتبے میں سب سے آگے نکل گئے۔ ان کی زبان سے جو کلمۃ الحق نکلتا ہے ان کے دین اور دنیا کے لیے باعث شرف و افتخار و اعزاز ہے۔ آج ایران توران کے بہت سے مستعد و طالب علم ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ایک دن وہ میرے شیخ کے پاس آئے، ایسی نیازمندی اور اخلاص کا مظاہرہ کیا جیسی کہ چاہیے۔ میں اور سارے حاضرین حیران رہ گئے۔ جب علم کا غرور بادشاہی قربت سے مل جائے تو پھر اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ فقرا ارباب اللہ کے آگے سر نیاز جھکائیں۔ اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آئی وہ یہ ہے کہ: ''نفحات الانس'' میں شیخ نجم الدین کبریٰ قدس سرہٗ کے ذکر میں لکھا ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خواب میں ابوالجناب کی کنیت بخشی۔ ان کو شیخ ولی تراش بھی کہتے ہیں۔ بزرگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کی نظر مبارک جس کسی پر پڑ جاتی تھی مرتبۂ ولایت کو پہنچ جاتا۔ ایک دن ان کی نظر ایک کتے پر پڑ گئی اسی وقت اس پر حال طاری ہو گیا۔ متحیر و بیخود ہو گیا۔ قریب پچاس ساٹھ کتے ہر وقت اس کے گرداگرد حلقہ کیے رہتے نہ بولتے نہ کچھ کھاتے باادب کھڑے رہتے

---

1 میں تو تبھی خوش ہوں گا جب اپنے ناز پروردہ سہی قامت کو بتوں کی طرح جلوہ گر دیکھ لوں۔ مجھے اپنی زندگی سے ایسا غبار خاطر ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس خاکدان ہستی سے اپنی گرد جھاڑ لوں۔ میں اپنے درد سے زار زار اتنے نالے کروں گا کہ اپنے راتوں کو گردش کرنے والے چاند یعنی محبوب کو آگاہ کر دوں۔ اے ہاشمی درد سے ایسے مت رو بلکہ اپنے درد کا علاج بے چارگی سے کر لے یعنی سپرد خدا کر دے۔

تھے۔ آخر کار کچھ دنوں میں وہ مر گیا۔ شیخ نے فرمایا کہ اس کو دفن کر دو اس کو دفن کر دیا اور بعد میں دوسروں نے اس کی قبر پر عمارت کھڑی کر دی۔ ایک دن شیخ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک باز نے ایک مولے کو دبوچ رکھا تھا۔ اچانک شیخ کی نظر اس مولے پر پڑ گئی۔ مولہ پلٹا اور باز کو پکڑ کر شیخ کے سامنے لا ڈالا۔ خود فرماتے ہیں کہ ابتدائے حال میں میں طلب راہ حق میں بہت سفر کیا کرتا مگر کہیں بھی عقیدت و ارادت حاصل نہ ہوتی تھی (غرور دانشمندی میں کسی کے آگے سر نہ جھکاتا تھا جب میں ملک خوارزستان پہنچا در زیول میں داخل ہوا تو وہاں بیمار پڑ گیا کسی نے مجھ کو جگہ نہ دی کہ وہاں ٹھہروں۔ عاجز و پریشان خاطر ہو گیا تو میں نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ اس شہر میں کیا کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے کہ کسی بیمار پردیسی کو جگہ دے دے، تاکہ میں اس جگہ چند دن آرام کر لوں۔ اس شخص نے کہا یہاں ایک خانقاہ ہے اور ایک شیخ رہتے ہیں وہاں کے باشندے شاید تیری خدمت کریں میں نے معلوم کیا کہ ان کا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا شیخ اسماعیل قصری، میں وہاں گیا مجھے سرائے کے درمیان درویشوں کے صفہ پر ایک چبوترے پر جگہ دی گئی اور میں وہاں رہنے لگا مگر میری بیماری دراز ہو گئی۔ بیماری سے مجھے اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی ان کے سماع کی آواز سے کیونکہ میں سماع کا حد درجہ منکر تھا مگر دوسری جگہ منتقل ہونے کی طاقت بھی مجھ میں نہیں تھی۔ ایک رات لوگ سماع کر رہے تھے شیخ اسماعیل سماع کی گرمی سے میرے سرہانے آئے اور گویا ہوئے کیا تو کھڑا ہونا چاہتا ہے میں نے کہا۔ ہاں۔ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنے پہلو میں کھینچا اور محفل سماع میں لے آئے اور بہت دیر تک مجھے گھماتے رہے پھر مجھے ایک دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے خیال کیا کہ فی الحال گر جاؤں گا لیکن جب مجھے افاقہ ہوا تو خود کو تندرست پایا کہ کوئی بیماری اپنے اندر نہ پاتا تھا مجھے عقیدت ہو گئی[1]) دوسرے دن جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے دستِ عقیدت تھاما اور سلوک طے کرنے لگا اور مدتوں وہاں رہا جب مجھے احوال باطنی کی خبر لگ گئی تو میرے دل میں یہ وسوسہ آیا کہ اب تو علم باطن سے بھی باخبر ہو گیا اور تیرا علم ظاہر شیخ کے علم سے زیادہ ہے۔ صبح سویرے شیخ نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ اٹھ اب تو یہاں سے چلا

1 قوسین کے اندر کی عبارت۔ از "غرور دانشمند تا عقیدت حاصل" ہو گئی تک اصل نسخہ اسراریہ میں نہیں ہے اس عبارت کو اصل فارسی نسخہ "نفحات الانس" سے نقل کیا گیا ہے۔

جا تجھے شیخ عمار کے پاس جانا چاہیے۔ میں سمجھ گیا کہ شیخ، میرے اس خیال پر مطلع ہو گئے۔ مگر میں کچھ نہ بولا اور شیخ عمار کی خدمت میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی مدتوں سلوک طے کیا وہاں بھی مجھے یہی وسوسہ پیدا ہوا تو اگلی صبح ہی شیخ عمار نے فرمایا کہ نجم الدین اُٹھ اور روز بھان کی خدمت میں مصر جا، کہ تیری اس خودی کو وہ ایک دھپ میں تیرے سر سے نکال دیں گے۔ میں اٹھا اور مصر چلا جب میں ان کی خانقاہ میں داخل ہوا شیخ وہاں نہیں تھے اور ان کے تمام مریدین مراقبہ میں بیٹھے ہوئے تھے کسی نے میری طرف دھیان نہ دیا۔ وہاں ایک اور شخص تھا اس سے میں نے پوچھا کہ شیخ کہاں ہیں؟ بولا۔ شیخ باہر بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ میں باہر نکلا اور شیخ روز بھان کو دیکھا کہ بہت تھوڑے سے پانی سے وضو کر رہے ہیں۔ میرے دل میں آیا کہ شیخ کو یہ بھی پتا نہیں کہ اتنے تھوڑے پانی سے وضو جائز نہیں ہے یہ کیا شیخ ہوں گے؟ شیخ خانقاہ میں آئے میں بھی اندر آ گیا۔ پھر شیخ نماز تحیۃ الوضو میں مشغول ہو گئے میں کھڑا ہوا تھا کہ جیسے ہی شیخ سلام پھیریں میں سلام کروں اسی طرح کھڑے کھڑے میں خود سے غائب ہو گیا۔ (بے خودی طاری ہو گئی) دیکھتا ہوں کہ قیامت قائم ہو گئی ہے اور دوزخ دکھائی دینے لگی ہے لوگوں کو فرشتے پکڑ پکڑ کر دوزخ میں ڈال رہے ہیں۔ اسی رہ گزر پر ایک جانب پشتہ ہے اور ایک شخص اس پشتے پر بیٹھے ہیں جو بھی یہ کہتا ہے کہ مجھے ان سے تعلق ہے وہ دوزخ سے بچ جاتا ہے۔ (اور دوسروں کو آگ میں ڈال رہے ہیں) ناگاہ مجھے پکڑا اور کھینچنے لگے جب دوزخ کے نزدیک پہنچا تو میں نے کہا مجھے ان سے تعلق ہے فوراً مجھے چھوڑ دیا۔ میں پشتے پر چڑھ گیا تو دیکھا کہ شیخ روز بھان روبرو ہیں میں آگے بڑھا اور ان کے قدموں میں گر پڑا انھوں نے ایک دھپ میری گردن پر زور سے مارا کہ میں زمین پر گر پڑا۔ اتنے میں میری غیبت (بے خودی) جاتی رہی شیخ نے سلام پھیر دیا تھا میں آگے بڑھا اور ان کے پیروں میں گر گیا۔ شیخ نے اسی وقت ایسا ہی دھپ میری گردن پر مارا اور وہی جملہ کہا (جس کا خطرہ بوقت وضو میرے دل میں آیا تھا)۔ مجھ سے باطن کا وہ مرض جاتا رہا اس کے بعد مجھے حکم دیا کہ جا۔ واپس شیخ عمار کی خدمت میں حاضر ہو جب میں چلنے لگا تو ایک خط شیخ عمار کو لکھا ''ہر چند مس داری بفرست تا زر خالص ی گردانم و باز برتو بفرستم [1]۔''

---

1 جتنا بھی تانبہ ہو بھیجیے تا کہ میں خالص سونا بنا کر آپ کو لوٹا دوں۔

شیخ بدیع الدین سہارن پوری

وہ صاحب نسبت ہیں۔طریقت میں صاحب کیفیت اور مستقیم الحال ہیں۔میرے شیخ نے فرمایا کہ ابتدا میں وہ طلب علم میں حضرت شیخ احمد سرہندی کے پاس سرہند پہنچے۔مدتوں استفادہ کیا۔اسی اثنا میں طلب حق پیدا ہوئی اور حضرت شیخ احمد سرہندی سے طریقہ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے اور بڑے اچھے احوال بہم پہنچائے اور پھر دوسروں کی اصلاح کی اجازتِ ارشاد لے کر وطن واپس آکر استقامت کے ساتھ وہیں رہے۔کہتے ہیں کہ ایک بار وہ مکّے کے ارادے سے دہلی پہنچے ایک امیر سے اتفاق ملاقات ہوئی اس امیر نے زادسفر کا وعدہ کیا۔اس کے بعد اس امیر سے ان کی کسی بات پر کہاسنی ہوگئی انھوں نے حج کا ارادہ ملتوی کیا اور خود کو اس کی صحبت سے چھڑا کر پھر گھر لوٹ آئے۔ یہاں تک کہ 1040ھ[1] (1631) میں دنیا سے ہی چلے گئے ان کی قبر شہر سہارن پور کے اندر ہے۔ میں نے ایک بار انھیں ان کی خانقاہ میں دیکھا ہے اور ملاقات کی ہے۔انھوں نے اپنے لطف و احسان سے مجھے خوش کر دیا تھا۔

شیخ آدم بنّوری

یہ بھی حضرت شیخ احمد سرہندی کے مرید ہیں۔کیفیات واحوال عظیمہ کے مالک ہیں۔ بیان حقائق درویشی میں ان کی زبان بڑی بلند ہے۔ان کے معارف کی بعض اصطلاحات اتنی دقیق ہیں کہ ہر شخص کی سمجھ وہاں تک نہیں پہنچتی۔اس سلسلہ کی ان کی بہت سی حکایتیں ہیں جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ان کی معرفت وتوحید کے سلسلے میں میرے شیخ سے گفتگو اور خط و کتابت رہی ہے۔میرے شیخ نے اس بارے میں غامض ودقیق باتیں انھیں لکھی تھیں۔ان سب تحریرات کو میں نے دیکھا بھی ہے اور اس کا مطلب بھی تحقیق کیا ہے۔کہتے ہیں کہ وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے لوگ کن کن عیوب کی میری طرف نسبت کرتے ہیں سچ بتاؤ۔جو کچھ ان کے مریدین بتاتے۔

---

1 تاریخ محمدی'' از میرزا محمد بن رستم حارثی بدخشی اور ''مہر جہاں تاب'' از مولانا حکیم سید فخر الدین حسنی رائے بریلوی میں آپ کی تاریخ وفات 1042ھ درج ہے۔(واللہ اعلم)

آپ ان عیبوں سے پرہیز کرتے۔ میں نے انھیں اپنے شیخ کی خدمت میں ایک بار دیکھا کہ اپنے 30 مریدوں کے ہمراہ آئے ہوئے ہیں اور چند دن تک محافلِ صحبت گرم رہیں۔ ان کے تمام مرید صاحب کیفیت گزرے ہیں۔ 1050ھ (1641) میں سفرِ حجاز کے لیے روانہ ہوئے اور حرمین محترمین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ عرب کے بہت سے حضرات نے طریقۂ نقشبندیہ میں ان سے تلقین حاصل کی ہے۔ اسی سال مدینہ منورہ میں دنیا سے رخصت ہوئے ان کی قبر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس ہے۔ روایت ہے کہ ایک دنیادار نے ہنور میں ان کی مسجد کے نزدیک ایک کنواں کھودا تھا وہ پورا ہونے ہی والا تھا کہ وہ اپنے گھر سے جلدی جلدی چل کر اس کنوئیں پر آئے اور ان تمام مزدوروں سے جو کھدائی کر رہے تھے بآوازِ بلند کہا فوراً باہر نکل آؤ۔ اتفاق دیکھیے جیسے ہی وہ باہر نکلے ویسے ہی کنواں بیٹھ گیا۔

شیخ وجیہ الدین

شیخ وجیہ الدین بن شیخ نصیر الدین اکبرآبادی اپنے والد محترم کے مرید اور سجادہ نشین تھے۔ عالم و فاضل صاحب ذوق و وجد و سماع تھے۔ طریقۂ فقر و توکل میں قدم ثابت رکھتے تھے۔ ان کی جائے پیدائش و پرورش اکبرآباد کا محلہ دولت آباد ہے۔ سنا ہے کہ ان کے والد محترم بہت بڑے بزرگ تھے۔ احوال عظیمہ اور اطوار سنیہ کے مالک۔ صاحب ذوق و سماع ان کے بہت سے مریدین تھے۔ ان کی صحبت میں بڑی قوی تاثیر تھی۔ ان کا نورانی چہرہ دلوں کو فرحت بخشتا تھا۔ ایک دن ان کے مرید شیر محمد نے جن کا ذکر خواجہ عبدالرزاق کے بیان میں گزرا، ان کی تعریف میں شیخ عبدالحق دہلوی سے کہا کہ میں نے بہت سے درویشوں اور مشائخ کو دیکھا ہے لیکن ان جیسی دل فریب آنکھیں کسی کی نہیں دیکھیں۔ کہتے ہیں کہ جس وقت شیخ وجیہ الدین بہت بوڑھے ہو گئے اور ان کی بصارت میں خلل آ گیا بادشاہ کے امرا میں سے ایک شخص ان کے پاس آیا۔ دیکھا کہ ان کی مسجد بہت ٹوٹی پھوٹی تھی تو عرض کیا کہ آپ مسجد کو درست کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے اس امیر سے مزاحاً کہا کہ ہندی کی مثال میرے حال کے موافق پڑتی ہے۔ ''اندھا ملاں پھوٹی میست'' (یعنی مسجد)۔ ایک دن انھوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا کہ اس کے سر کے بال بڑھ گئے ہیں کہا اے

بیٹے! اپنا سر کیوں نہیں منڈواتا کہ سر کو موڈہ کہتے ہیں۔ ایک عزیز نے نقل کیا ہے کہ ایک بار ہم تین شخص ان کی خدمت میں گئے۔ دو شخص باہر رہ گئے میں اندر چلا گیا۔ رخصت کے وقت انھوں نے مجھے پان کے تین بیڑے دیے تا کہ تینوں کو ایک ایک مل جائے۔ میں نے آپ کو تین بار دیکھا ہے۔ ایک بار اُن کے والد کے عرس کے موقع پر کہ وہ سماع میں اس قدر گرم ہو گئے تھے کہ ان کی حالت کی تاثیر تمام حاضرین میں سرایت کر رہی تھی اور دو مرتبہ ان کی خانقاہ میں دیکھا ان کے ہر دیدار سے بڑا دل خوش ہوا۔ اسراریہ کے مکمل ہونے کے بعد سنا گیا کہ وہ 1072ھ (1662) میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

شیخ عثمان بنگالی

بڑے بزرگ تھے۔ صاحب آیات و کرامات و احوال و مقامات۔ اکابر صوفیہ میں ان کا شمار ہے۔ مشائخ وقت کے پشت پناہ ہیں۔ ان کی صحبت میں بڑی قوی تاثیر تھی۔ بنگال کے شہر ڈھاکے میں ان کی پیدائش اور نشو و نما ہوئی۔ ان کے صاحب نسبت و کیفیت مریدوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ ایک دن انھیں زیارت مکہ کی خواہش پیدا ہوئی۔ وطن سے چل دیے۔ راہ میں شیخ عبدالمومن کنبوہ سنبھلی جو کہ کوہ کمایوں کے دامن (یعنی کشمیر میں) رستم خاں دکھنی کے لشکری تھے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ اُن دنوں کوہستان کے دارالحرب کے کفار سے مقابلہ تھا تو شیخ عبدالمومن کنبوہ سنبھلی نے جو ان کے شناساؤں میں سے تھے، ان سے التجا کی کہ چند دن یہاں ٹھہر جایئے کیونکہ موقع جہاد و غزا ہے تا کہ مسلمان آپ کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے کافران حربی پر فتح اور نصرت حاصل کریں۔ انھوں نے (از راہ خاکساری) جواب دیا کہ میں اپنے کافر خانگی نفسِ امّارہ پر ہی جہاد میں فتح مند نہ ہو سکا تو میرے ٹھہرنے سے دارالحرب کے کافروں پر جو کہ بیگانے ہیں کس طرح فتح ہو جائے گی۔ وہ وہاں دس بارہ روز ٹھہرے رہے پھر اپنے ارادہ کے مطابق سفر اختیار کیا۔ میں نے اسی جگہ ان کی خدمت کی۔ پہلی صحبت میں ہی مجھے لگا کہ کتب تاریخ معتبرہ میں جن مشائخ کبار اور اصحاب کمال کے احوال پڑھنے میں آتے ہیں یہ اسی جماعت میں سے ہیں۔ بالکل بے تکلف، بے ادّعائے کمال با کمال، اولیاء سلف کی یاد دلانے والے جو لطف و کرم انھوں نے

میرے حال پر کیا میں اس کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ شیخ عبدالمومن کہتے ہیں کہ میں نے بنگال میں ان کے خارق عادت کام (کرامتیں) دیکھے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک وقت پر بکرم پور نام کا گاؤں جو ہندوؤں کے تصرف میں تھا ان کے مشورے سے وہاں کے مسلمانوں نے اس کا نام محی الدین پور رکھ دیا۔ اس کے بعد ہندوؤں کے خاص خاص لوگ وہاں کے حاکم قاسم خاں جو کہ جوادِ زماں، مخیّر آفاق اور صاحب سخن شخص تھے، کے پاس پہنچے ان کو نذرانہ پیش کیا (مسلمانوں کی) شکایت کی اور گاؤں واپسی کی درخواست کی۔ انھوں نے اس گاؤں کو پھر ان کے تصرف میں دے دیا۔ اس واقعے سے انھیں غصہ آ گیا۔ دل تنگ ہوئے اسی وقت قاسم خاں کو بڑا تکلیف دہ مرض لگ گیا وہ سمجھ گئے کہ مجھ پر یہ مصیبت ان کے غبار خاطر سے پیش آئی ہے۔ مجھے بلایا اور کہا کہ ان کے پاس جاؤ اور میری طرف سے کہنا کہ اگر مجھ سے کوئی تقصیر ہوئی تو از راہ کرم معاف فرمائیں اور ان سے یہ بھی معلوم کرنا کہ مجھے اس تکلیف سے خلاصی ملے گی یا نہیں۔ یہ دریافت کرنے سے خاں کا مطلب یہ تھا کہ اگر میرا وقت ہی آ گیا ہے تو اپنا بقیہ خزانہ اہل اللہ پر وقف کر جاؤں کیونکہ میں ان کے مزاج کا خوب شناسا ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ میں تنہا جانے سے معذور ہوں۔ یہ سن کر انھوں نے ایک دوسرے شخص کو میرے ساتھ بھیجا۔ ہم گئے اور غلطی کی معافی کا مطالبہ رکھا۔ وہ بہت ہی رنجیدہ اور تنگ دل تھے جواب میں بس اتنا کہا۔ اس علاقے میں بہت سے فقرا اور درویش ہیں ان سے رجوع کریں میں یہ کام کیا جانوں؟ اگر خاں اس بیماری میں رخصت ہو جائیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہم مایوس اٹھے اور خاں تھوڑے عرصے میں ہی دنیا سے چلے گئے۔ شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی کے بھائی شیخ عبدالرحیم سنبھلی نے فرمایا کہ میں نے انھیں (شیخ عثمان کو) ان کے شہر میں کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ بڑے نامور بزرگ تھے۔ اس راہ کے بہت سے اہل کار ان کی صحبت میں کمال کو پہنچے ہیں۔ ان کا طریقہ سلسلۂ چشتیہ میں طریقۂ ہدایت و ارشاد ہے۔ وہ مجھے بڑی محبت سے بلاتے اور اپنے دسترخوان پر بٹھاتے اور راہ ولایت کی بڑے اونچے درجے کی باتیں کیا کرتے۔ ان کی صحبت میں کھلی تاثیر تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ اسی سفر مکہ میں اکبرآباد سے اس طرف چلے تھے کہ 1040ھ (1631) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ایک روایت میں 1050ھ (1640) ہے۔ لیکن اوّل درست تر ہے۔

شیخ عثمان بنگالی سنبھلی

ایک شیخ عثمان بنگالی پہلے زمانہ میں سنبھل میں ہوئے ہیں صاحب علم وعمل واہل کمال۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں ہی ان کے والد کا جو دربھنگہ کے قاضی تھے انتقال ہوگیا اور عہدۂ قضا پر ان کے چچا کا تقرر ہوگیا۔ وہ اپنے بعض اقربا کے کہنے میں آکر اس جگہ کے حاکم کے پاس پہنچے۔ سامان کتب خانہ جو کہ اُن کے والد کا تھا اور ان کے چچا برت رہے تھے طلب کیا تو حاکم نے قاضی صاحب سے کہا کہ ان کے والد کی جو میراث ہے واپس کر دیجیے۔ قاضی نے اپنے بھتیجے سے کہا تم نے یہ بات پہلے مجھ سے ہی کیوں نہ کہی میں فوراً دے دیتا اور سارا سامان پیش کر دیا۔ وہ بہت شرمندہ ہوئے اور کچھ نہ لیا اور اُسی وقت طلب علم میں گھر سے نکل پڑے اور سنبھل پہنچے اور شیخ حاتم سنبھلی سے استفادہ علوم کیا۔ ایک مدت کے بعد یہاں سے رخصت ہو کر شیخ وجیہ الدین کی خدمت میں گجرات گئے اور پہلے سے زیادہ علم حاصل کیا وہاں سے پھر سنبھل پہنچے اور وہاں کی علمی صحبتوں اور حصول علم کا ذکر شیخ حاتم [1] سے کرنے لگے۔

جو تازہ دقائق علمی گجرات میں انھوں نے بہم پہنچائے تھے پیش کیے، شیخ حاتم نے ایسے ہی علوم کا جیسے انھوں نے گجرات میں حاصل کیے تھے بڑے دقائق اور صراحت کے ساتھ بیان فرمایا کہ وہ کھل اٹھے اور بولے۔ افسوس اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں گجرات کیوں جاتا۔'' اس کے بعد راہ محبت خدا کی طلب اُن کے دل میں پیدا ہوئی اور خود کو درویشوں کی صحبت میں پہنچا دیا۔ اور بہت تھوڑی سی مدت میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے اور صاحب لفظ [2] ہوگئے۔ جو کچھ ان کی زبان پر آتا ہو جاتا۔ جب شیخ حاتم کا وقت آخری آیا تو ان کو بلایا اور کہا ''تیرے ذمے ہمارا بھی کوئی حق ہے یا نہیں؟ کہا۔ بے شمار، تو شیخ حاتم نے فرمایا میرے بعد میرا اکلوتا بیٹا عبدالحکیم جو کہ ناز پروردہ ہے اگر

1 ہندوستان کے اکابر علما کرام میں سے تھے۔ تقریباً ستر سال تک درس وتدریس اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ 968ھ/1560 میں وفات پائی۔ شیخ عبداللہ تلبنی سنبھلی کے مرید وخلیفہ تھے۔ عربی زبان و ادب اور علم کلام میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

2 صاحب لفظ: اولیاء اللہ میں وہ ہیں کہ جو ان کی زبان سے نکل گیا۔ پورا ہوگیا۔

تمھارے بارے میں کوئی گستاخی کرے یا بے ادبی کرے تو اس کے حق میں بددعا نہ کرنا۔ جواب دیا ''جی بہتر'' شیخ حاتم کے انتقال کے بعد جب شیخ عبدالحکیم کوئی بے ادبی کرتے تو وہ کہا کرتے ''صاحبزادے بس کرو۔ کیا کروں تمہارے والد کا حق مانع ہے ورنہ جو ہوتا ہوتا۔'' روایت ہے کہ ایک دن دو طالب علم کسی بات میں بحث کر رہے تھے آخر کار ایک نے کہا ''میرے دلائل شیخ عثمان کے قول کے موافق ہیں اس نے کہا کہ شیخ عثمان کوئی قطب نہیں ہیں کہ ان کی بات یقیناً تحقیق شدہ ہو۔ جب یہ ماجرا شیخ عثمان کو پتا لگا دل برداشتہ ہوے اور فرمایا۔ ''وہ تو جواں مرگ ہے۔'' اسی دن اسے قے آئی اور مر گیا۔ شیخ عثمان کی وفات 980ھ (1573) میں ہوئی اور ان کی قبر سنبھل میں ہے[1]۔ یہ ان کا قطعہ تاریخ وفات ہے۔

قطعہ

شیخ عثماں کہ بود مخزنِ علم ہمچو گنجینۂ بویرانہ
عالمے عاملے چو او نگذشت نکتہ دانے درین کتب خانہ
خواستم سال فوتش از مردان ہمہ گفتند ''رفت مردانہ''[2]

980ھ

شیخ طٰہٰ

شیخ طٰہٰ بن شیخ کمال دہلوی طریق توکل میں اپنے والد سے بھی آگے نکل گئے تھے اور علم و عمل میں بھی والد سے بہتر تھے۔ جو کچھ ملتا ''یومٌ جدیدٌ و رزقٌ جدیدٌ'' (نیا دن نئی روزی) پر عمل پیرا تھے۔ اپنے گھر والوں کا حصہ باہری درویشوں کے برابر رکھتے تھے۔ صاحب وجد و سماع و ذوق و حال تھے۔ خواجہ ابرار ان کے بارے میں فرماتے۔ درویشوں کے قول (اَلْفَقْرُ فَخرِیْ) کی آج کے دور میں

1 سرائے کبیر کے متصل جانب غرب میں ایک دلکش مقام پر ہے۔

2 شیخ عثمان ایسے مخزن علم تھے جیسے ویرانے میں خزانہ دبا ہوتا ہے۔ اس دنیا کے کتب خانے میں کوئی ان جیسا نکتہ داں عالم عامل اور نیک نہ گزرا ہوگا۔ جب میں نے مردان غیب سے ان کا سن وفات دریافت کیا تو سب بول پڑے ''رفت مردانہ'' مردانہ (وار) چلے گئے۔

انھوں نے نگرانی کر رکھی ہے۔ سماع کے وقت ان کے چہرے کے آگے مرید آئینہ رکھتے وہ اس میں نظریں گڑھا کر نغمہ سرائی کرتے۔ جذب سے ان کی داڑھی کا ایک ایک بال الگ الگ کھڑا ہو جاتا حاضرین مجلس (یہ دیکھ کر) حیرت زدہ رہ جاتے۔ اپنے والد کے مرید تھے اور وہ شیخ نظام نارنولی چشتی [1] کے۔ آپ کسی بھی امیر شخص کی تعظیم کو نہ اُٹھتے۔ کچھ جابر امرا نے اس کا تجربہ بھی کیا تھا۔ علاوہ سلسلہ چشتیہ کے سلسلہ مداریہ میں بھی بیعت کیا کرتے تھے۔

''اخبارالاخیار'' میں ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ مدار مقام صمدیت میں جو کہ سالکوں کا ایک مقام ہے، تھے۔ بارہ سال تک کھانا نہیں کھایا اور جو لباس ایک بار پہن لیا دوبارہ اس کے دھونے کی احتیاج نہ پڑی۔ اکثر اوقات برقع اوڑھے رہتے تھے۔ اگر اتفاقاً کسی کی نظر ان کے جمال باکمال پر پڑ جاتی بے اختیار سجدے میں گر پڑتا۔ ان کا سلسلہ بہت عمر ہونے کے سبب سے پانچ یا چھ واسطوں سے حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ بعضے مداری حضرات بے واسطہ (روحانی طور پر) انھیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منتسب کرتے ہیں بعضے اور بھی باتیں کرتے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور دائرہ شریعت و طریقت سے خارج ہیں۔ واللہ اعلم۔ انتہیٰ۔ ان کے خلفا میں سے ایک صاحب نے ان کی ولادت کی تاریخ پر حسب ذیل قطعہ کہا ہے

آمدہ خوش شاہ ثقلین آمدہ رہنمائے قرۃ العین آمدہ
چون طلب کردم ز دل تاریخ سال گفت ہاتف شاہ کونین آمدہ [2]

شاہ مدار کی تاریخ وصال ''ساکن بہشت'' [3] بتائی جاتی ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ شاہ مدار کو شیخ طیفور شامی سے، ان کو معین الدین سے ان کو شیخ عبداللہ علم وار سے اور ان کو حضرت ابوبکر صدیق ''ثانی الاثنین اذھما فی الغار'' سے عقیدت وارات ہے۔ واللہ اعلم۔

---

1 حضرت شیخ نظام الدین نارنولی بڑے مشائخ اور علماء کرام میں سے تھے اور حضرت شیخ خانو گوالیاری کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کی وفات 997ھ/1579 میں ہوئی۔ (تذکرۃ الکرام ص165 از محمود احمد عباسی)

2 مبارک ہو شاہ ثقلین آگئے۔ رہنمائے قرۃ العین آگئے۔ جب میں نے دل سے ان کی تاریخ ولادت طلب کی۔ ہاتف نے کہا ''شاہ کونین آمدہ'' (687ھ)

3 ساکن بہشت سے 838ھ سن برآمد ہوتا ہے جو 1435 کے مطابق ہے۔

ایک بار عبدالواحد درویش شیخ طہٰ کی خانقاہ میں بیمار پڑ گئے اور انھوں نے ان کی تیمارداری اپنے ذمہ کر لی۔ جب انتقال ہوگیا تو والد کی قبر اور مسجد کے درمیان انھیں دفن کردیا۔ عبدالواحد قلندر شخص تھے بڑے بے باک درشت گو نہایت فہیم اور باہوش۔ ایک دن انھوں نے میرے شیخ سے پوچھا کہ جب عبد درمیان سے نکل جائے اور واحد رہ جائے۔ پس واحد کسے حکم دے؟ اور بندگی کون کرے؟ میرے شیخ نے کہا وہی واحد مرتبہ وحدت میں معبود ہے اور وہی واحد مرتبہ کثرت میں عابد ہے۔ تو وہ اپنی عبادت خود ہی کرتا ہے اس کا کوئی غیر موجود نہیں ہے۔ وہ بولے "خوب فرمایا آپ نے۔ میرے خواجہ عارف تو آپ ہی ہیں۔" میرے شیخ فرماتے ہیں کہ اسی بیماری کے زمانے میں، میں ایک دن عبدالواحد کے پاس گیا خونی پیچش کے مرض میں مبتلا تھے میں نے دریافت کیا کیا حال ہے؟ بولے۔ خوا جم عجیب لذت میں ہوں گویا کہ میرے اندر چھریاں چل رہی ہیں۔ ایک دن میں نے عبدالواحد کو دیکھا کہ ایک عزیز کی قبر پر سر برہنہ بیٹھے ہیں اور موچھیں بڑھی ہوئی ہیں جیسے کہ کوئی بھیانک شیر اور ایک شراب کا پیالہ ہاتھ میں ہے اور پی رہے ہیں اور اس طرح کے بعض اشعار پڑھ رہے ہیں

اسرارِ خدا لایق ہر بے سر و پانیست   ہر بے سر و پا لایق اسرارِ خدانیست [2]

آن عزیز کے اقربا میں کسی کو ان کے روبرو ہونے کی بھی تاب نہیں تھی چہ جائیکہ بات چیت کریں۔ شیخ علاء الدین سنبھلی جو کہ شیخ طہٰ کے بیٹے شیخ قائم کے صحبت داروں میں ہیں، فرماتے ہیں کہ "میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ اگر میں قرضے سے سبکدوش ہوجاؤں تو دل جمعی کے ساتھ درویشوں کی صحبت و خدمت میں گذاروں۔ اسی سوچ میں ایک رات شیخ طہٰ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ اے شیخ میرے حال پر لطف فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے تو تو جانتا ہی ہے لیکن یہ درویش جو کہ سر سے پیر تک ننگا کھڑا ہے دیکھ یعنی عبدالواحد کو یہ ہر رات ایک چیز ہزار میل سے لے کر آتا ہے۔ اس کے بعد مجھ سے کہا کبوتر کی یہ بیٹ جو پڑی ہوئی ہے اٹھا لے۔ میں نے اپنا دامن اس سے بھر لیا جب دن نکلا حسن اتفاق کہ اس قدر نقد مجھے پہنچا کہ تمام قرضے سے سبکدوش ہوگیا۔ اور تفرقے سے چھوٹ گیا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ میں چند رات دن سے درود پڑھ رہا تھا تا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھ لوں کہ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ جس

1   اللہ تعالیٰ کے راز ہر بے سر و پا کے لائق نہیں ہوتے نہ ہر بے سر و پا اسرار خدا کے لائق ہے۔

مقام پر میں ہوں وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور وضو کر رہے ہیں۔ میں نے
سر ادب زمین پر رکھا اور وضو کا پانی پینے لگا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وضو پورا
کر کے مسکرائے اور دست مبارک میری پشت پر پھیرا اور فرمایا ''اپنا دل پریشان مت رکھ'' اس
کے بعد مجھے مکمل جمع خاطری میسر ہوگئی۔ میں شیخ طہٰ سے بہت ملا ہوں اور ان کے لطف و کرم
بہت دیکھے ہیں۔ ایک دوبار اپنے شیخ کے ہمراہ بھی ان کی خدمت میں پہنچا ہوں۔ وہ بات
کرتے کرتے سر مراقبے میں لے جاتے پھر اٹھاتے اور کوئی حکایت بیان فرماتے۔ ان کے
والد محترم کی وفات 1025ھ (1617) میں اور ان کی وفات 1051ھ (1641) میں ہوئی۔
کہتے ہیں کہ ایک رات کو انھوں نے غسل کیا پاک کپڑے پہنے، خوشبو لگائی۔ اپنی بیوی کو بھی غسل
کرا کر رنگین پوشاک زیب تن کرائی اور دونوں ہم آغوش ہو کر سو گئے۔ صبح دیکھا کہ وہ دنیا سے
چلے گئے ہیں۔ ایک دن ان کا ہمسایہ محمد نام اپنی عادت کے مطابق دف و دائرہ لے کر رقص
کناں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کے مرقد کی زیارت کے لیے جاتا تھا۔ راستے
میں ملاقات ہوگئی تو ان سے دریافت کیا۔ اے شیخ سراکھی کا نام کیا ہے۔ وہ یہ بات سن کر وجد
میں آگئے اور مست ہو گئے۔ اسی مضمون میں ہندی کا یہ شعر ہے۔

چین، عقل، سکون، شرم، سب جائے   تاب قرار، سونا رہے عشق جو بُری بلائے

صاحب ''نزہۃ الارواح'' کہتے ہیں کہ معرفت کے لیے عقل، آلہ ہے اور عشق، سراسر حال
ہے۔ وہاں تدریجاً اینٹ (پتھر) گارے پانی میں رکھتے ہیں۔ اور یہاں تجرید کا پانی اینٹ
کے اوپر ڈالتے ہیں۔ عقل بلا بو کا رنگ ہے۔ عشق بو ہے بلا رنگ، عقل بے نمک کا پتھر ہے
عشق نمک ہے بلا پتھر کا۔ عقل ہوا میں اڑتا ہوا پرند ہے۔ عشق مرغ کے اندر کی ہوا ہے۔ پرند
ہوا کا نظارہ ہے۔ ہوا پرند کی جان ہے۔ مثنوی

چون عشق آمد ہلا اے عقل بگریز   نہ مردے آتشی اے پنبہ پرہیز
روان شد بادتند اے پشہ ہشدار   عقابے می رسد اے صعوہ زنہار [1]

---

1 جب عشق آگیا تو اے عقل تو چلی جا۔ تو آگ کا پرندہ نہیں اے روئی تو بچ کے رہ۔ آندھی چلنے لگی اے مچھر ہوش سنبھال۔ باز پہنچنے والا ہے اے ممولے ہوشیار ہو جا۔

میرے عزیز عشق کی باتیں کہنا اور بات ہے اور عشق کرنا اور شے ہے۔ جو عشق کی باتیں کرتا ہے، غرور میں آتا ہے، جو عشق رکھتا ہے غرورِ ''من وتو'' سے نکل آتا ہے۔ جو کوئی کہتا ہے وہ کچھ نہیں جانتا اور جو کوئی جانتا ہے وہ کچھ نہیں کہتا۔ کلامِ عشق کو سخن گو کے منہ کی شکر سمجھ اور عشق والے کے دل کی۔

حرف عشق از سر زبان دو راست   شرح این آئین ز بیان دوراست
مدعی کہ رسد بوادیٔ عشق   طالب نام ازیں جہان دور است
اے بحرص وہوا کمر بستہ   این حکایت ازین کسان دوراست [1]

شیخ عبدالمجید علوی امروہہ

صاحب ذوق و وجد، یگانہ زہد و ورع ہیں۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں وہ طلب علم میں نارنول پہنچے وہاں شیخ نظام الدین نارنولیؒ سے بیعت ہوگئے۔ شیخ نظام الدین خواجہ خانو گوالیاری[2] کے مرید ہیں۔ خواجہ خانو گوالیاری چالیس سال تک مسند ارشاد و ہدایت پر برقرار رہے اور 997ھ (1579) میں دنیا سے چلے گئے۔ خواجہ خانو خواجہ حسین ناگوری کے مرید ہیں۔ انھوں نے شیخ حسین سرمست جو کہ چندیری میں تھے، کے فرزند شیخ اسماعیل سے خرقۂ خلافت پہنا تھا۔ آخر کار شیخ عبدالمجید اپنے شیخ کے اشارے سے امروہہ آئے اور سید شرف الدین کے روضے پر آکر چلّے میں بیٹھ گئے۔ کئی چلّے کیے اور بڑی بڑی مشقت آمیز ریاضتیں بجالائے۔ پھر اس کے بعد روضہ مذکورہ کے جوار میں ہی اقامت پذیر ہوگئے اور گھر بسا لیا (یعنی شادی کرلی) ان کو بہت کم وقت میں مقبولیت مل گئی جمعیت خاطر اور کیفیت عظمیٰ حاصل ہوگئی اور بہت سے مریدان صاحبِ احوال و واقعات ہوگئے۔ انھوں نے اپنے انتقال سے دو ماہ پہلے اپنے تمام دوستوں اور مریدوں کو اطراف و جوانب میں خط بھیجے کہ میرا وقت آخر ہے، آجاؤ۔ ان کے تمام مریدین و خلفا اور یارانِ سلسلہ بروقت پہنچ گئے اور

---

1 عشق کی بات زبان کی نوک سے دور ہے۔ اس قانون کی شرح بیان سے دور ہے۔ مدعی عشق کب وادیٔ عشق کو پا سکتا ہے۔ نام کا طالب اس جہانِ عشق سے دور ہے۔ اے حرص و ہوا پر کمر کسے ہوئے یہ حکایت ایسے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔

2 شیخ خانو گوالیاری خواجہ حسین ناگوری (متوفی 901ھ مطابق 1496) کے مرید و خلیفہ تھے۔

وہ شب میں 11 ربیع الآخر 1045ھ (2 دسمبر 1636) کو دنیا سے سدھارے اور وہیں مدفون ہوئے۔ میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ میں ایّام جوانی میں سید فتح محمد امروہوی کی محبت میں کہ وہ ایک مقبول الٰہی نوجوان تھے امروہہ پہنچا۔ شیخ عبدالمجید سے بھی ملاقات کی اور پوچھا کہ اے شیخ اس راہ کی انتہا کہاں تک ہے؟ انھوں نے کہا ''عالم ملکوت اور مشاہدۂ ارواح انبیاء تک۔'' میں نے کہا اس سے زیادہ بھی ہونا چاہیے۔'' انھوں نے کہا ''اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔'' میں نے کہا ''اے شیخ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ امام غزالی کا ایک درویش مرید خواجہ یوسف ہمدانی کی خدمت میں آیا۔ خواجہ نے امام غزالی کے احوال دریافت کیے۔ کہا کہ ایک دن رمضان المبارک میں افطار کے وقت مراقب تھے۔ کھانا دسترخوان پر لگ چکا تھا اور حاضرین منتظر بیٹھے تھے۔ امام نے جب سر اوپر اٹھایا تو فرمایا کہ دوستو تم کھانا تناول کرو کہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے مجھے پیٹ بھر کر کھلا دیا ہے۔ خواجہ یوسف ہمدانی نے فرمایا کہ ''تلک خیالاتٌ تُرَبَّ بِهَا اَطْفَالُ الطریقه'' (یہ تصور کی کرشمہ سازی ہے جس سے طریقے کے مبتدیوں کی تربیت کی جاتی ہے۔) یہ اس واقعے کے قریب قریب ہے کہ خواجہ بیرنگ ابتدائے حالِ طلب میں سید علی کی خدمت میں بڑھانہ پہنچے۔ سید علی شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی جو کہ مشائخ کبار میں سے تھے، کے خلیفہ تھے۔ شیخ عبدالرزاق کی تاریخ وفات 949ھ (1543) ہے اور سید علی کا انتقال 1002ھ (1594) میں ہوا ہے۔ حضرت خواجہ بیرنگ سے سید علی نے مراقبۂ توحید کرنے کے لیے فرمایا۔ اِن دنوں حضرت خواجہ بیرنگ اس مقام سے آگے قدم بڑھا چکے تھے۔ عرض کیا کچھ اور فرمائیے۔ سید علی نے فرمایا کہ اس سے آگے کیا چیز ہوگی؟ آپ خاموش ہوگئے کچھ جواب ادباً نہ دیا۔ ایک نوجوان سید ولی محمد امروہوی جو کہ شیخ عبدالمجید کے مرید سید عبدالحکیم کے صحبت داروں میں ہیں، فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالمجید آخرالامر یہ جو عالم ملکوت اور عالم ارواح کا ذکر آیا، اس سے آگے نکل گئے تھے اور وحدت کی باتیں کرنے لگے تھے۔ میرے شیخ اپنے رسالے ''نور وحدت'' میں رقم طراز ہیں۔ ''اگر کوئی سالوں سال عبادات، طاعات اور اذکار میں مشغول رہے اور وحدت سے غافل ہو، وہ وصل سے محروم ہے۔ اگرچہ اسے کیسے ہی احوال و کیفیات پیش آئیں اور انوار و واقعات جلوہ گر ہوں۔ وہ حال کہ جسے تو وصل سمجھ رہا ہے اس کا نتیجہ اگر علم وحدت

نہ ہوتو وہ حقیقت میں وصل نہیں ہے (صورت وصل ہے) تجھ پر یہ جو کچھ ظاہر ہوا ہے مراتب ظہور کا کوئی مرتبہ ہے مقصود حقیقی ظاہریت اور عینیت سے آزاد ہے مگر ہر ایک میں ظاہر اور عین بھی وہی ہے۔ جب تک کوئی چیز نظر آ رہی ہے چاہے کسی بھی صورت میں ہو اس ذات پاک کی غیر ہے۔ وہ منزل مقصود نہیں ہے (بلکہ راہِ منزل ہے) انتہیٰ۔

شیخ رکن الدین سندیلوی

شیخ عبداللہ خیر آبادی کے مرید ہیں۔ صاحب صلاح وتقویٰ ہیں۔ مستقیم المعاملت۔ تیس سال سے بھی زیادہ جامع مسجد فیروزی دہلی میں اقامت پذیر رہے۔ کبھی کسی کے گھر نہ جاتے، کبھی دنیا کے کام کے لیے گھر سے نہ نکلتے، ہر دم کلام مجید کی تلاوت میں مشغول رہتے یا اس کی کتابت کرتے رہتے جب پورا لکھ لیتے تو کسی نیک باصلاح شخص کو ہدیہ دے دیتے۔ میں اُن کو اسی مسجد میں جبکہ وہ پنج گانہ جماعت کے لیے تشریف لاتے تھے دیکھا کرتا تھا۔ نماز ادا کرنے کے بعد پھر اپنے اُسی کونے میں چلے جاتے اور بقیہ نماز وہیں ادا کرتے ان کا ہمیشہ کا یہی معمول تھا۔ وفات 1060ھ (1650) میں ہوئی اور خواجہ بیرنگ کے چبوترے کے درمیان ان کی قبر بنائی گئی۔

شیخ محمد امین الدین لاہوری

آپ شیخ عیسیٰ سندھی کے مرید، اہل تمکین واستقامت تھے۔ آپ کی صحبت میں جمعیت قلب اور سکون تام حاصل ہوتا تھا۔ جس وقت میں اپنے شیخ کے ساتھ لاہور میں تھا وہ میرے شیخ کے دیدار کے لیے بڑے اخلاص ومحبت کے ساتھ تشریف لاتے تھے۔ کبھی میرے شیخ بھی ان کے پاس جاتے اور کیا ہی خوب چین وسکون کی صحبتیں اور خلوتیں رہتی تھیں۔ ان کے شیخ، شیخ عیسیٰ سلسلہ شطاریہ سے تھے برہان پور کے مشائخ کبار میں تھے اور اسی شہر میں شیخ محمد فضل اللہ قادری عالم ربانی کے معاصر تھے لیکن اختلاف مشارب کے سبب ملاقات میسر نہ ہوسکی۔ جب شیخ کا وقت حاضریٔ آخر آیا، حاضرین نے دریافت کیا اے شیخ آپ کی نماز جنازہ کون پڑھائے؟ تو شیخ محمد فضل اللہ قادری نے فرمایا ''شیخ عیسیٰ'' اور انتقال فرما گئے۔ شیخ عیسیٰ کا سنہ وفات 1031ھ (1622)

اور شیخ محمد امین الدین کا سنہ 1060ھ (1650) ہے۔ محمد صالح لاہوری کہ جن کا ذکر گزر چکا، نے فرمایا کہ: میرے رشتہ داروں میں ایک شخص دنیوی لالچ کے لیے مجھ سے دشمنی رکھتا تھا حالانکہ مجھے دنیا کی کوئی پروا نہ تھی۔ اس شخص نے مجھے ایذا پہنچانے کے لیے دعائے سیفی پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ مجھ پر اثر ہونے لگا۔ شیخ محمد امین الدین کو جب اس معاملے کی خبر لگی مجھے چاروں قل بتائے کہ پانچوں نمازوں کے بعد پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرو۔ میں نے وہی کیا اور وہ اثر جاتا رہا۔ خواجہ محمد امین میرے (سید محمد کمال) حال پر بے حد لطف و عنایت مبذول فرماتے تھے۔ اپنے ہندوی اشعار سنا کر مجھے خوش کرتے۔ امین ہی تخلص کرتے تھے

مکتا جل نے ہویا پہن جل کہے لگائی — موتی بنی چھیدی سمند نہ پیوجائی
پیمی جانی پریم رس اور نیوچھے کوئی — مورگہ لاگ نجانتی ہم سادہ کھاہوئی
پیمی رین نریلی ہست چیت لے سند لالی — بے رادن کی بارہی بہور ہوئی جن جائی
لکری سکل سریر کر کر مصری سنگ لائی — سنگ کے گن کار مصری بے تول بکائی
پیمی گھٹ گھٹ ہر لیے ہر مورت پہچان — جہاں جیسا پرکھت بہیاتہاں بینا کرجان

میرے بھی ہندی کلام خصوصاً پیم کتھا چوپائی سے بہت ہی محظوظ اور خوش ہوتے تھے

پہلی کہوں ایک کر نارا — جاکے ہم رجیو سنہارا
پرنہم احداب منہی جا نو — لپت المینہ بھید بکھا نو
بہیں پرکت ہوئی آپ دیکھا یو — آپ نے بسارک خیا یو
نی انوپ او پاؤ دکھائی — چھپے بھید سو سب پر کنائی
انت کار کے مانس ہو یو — سوریہ کشور روپ سرویو
مانس تج کے کیں جو چالو — پیم رنگ ہوئی پا ون آیو
ایش ایک ہوئی گیو سومانس — دو جو کوئی نہ تمسہ مانس
واہی پاہی آپ نہ رہا یو — آپ پاوت وا ہی پایو
یہ سب حیرت پیم کو کہتیو — اپنے روپ آپ میں بہیو
ہمت کر اپنے پیم سنہ یہ ست آبائی — آئی اکیلی آپ سنہ کانہوں بھیس بنائی

سمجھ تو جو کمال درین دو جو نالہتہ کو — تیری وہم کہیاں دو جو ہو جو پائے
جاکت متواری پہچانے متواری ناتہہ — نیناں لاگے بے ست بل ستہ کس لگانہ
ہی بہوم نہ انکری ریجک بیل انگ — آنسو سخت بہرہ بری چھانکے سبھ انگ
رہر روے مکھ چھنی چھید کرے اور کور — ای سب پیم سنگار ہیہ پیم پیر کچھ اور
نا من موت نین تونا آنکھیں نا کان — بے انہ منہ کچھ نسبت ہے سومن ہیر کہات
بدہنا کے گت حکمت سمجھ سکت نکوئی — سبھی کو سوجا کیو جو کچھ ہوئے سوہوئے

شیخ وزیر محمد خاندیسی

وہ بھی شیخ عیسیٰ کے مرید، صاحب معنی اور مستقیم الحال تھے۔ اپنے مشرب کی وسعت کے طفیل معمولات عبادت وتلاوت کو جذبہ عشق ومحبت الٰہی کے ساتھ ملائے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ جوانی کے زمانے میں بے قید شرع شریف اور قلاشانہ جیتے اور مستانہ وار گھومتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی لوگ جب انھیں اور ان کے دوسرے ہم مشرب دوستوں کو صبح کے وقت شیخ عیسیٰ کی مسجد میں پاتے تو انھیں اور ان کے ساتھیوں کو باندھ کر شیخ عیسیٰ کی خدمت میں لے جاتے۔ کیونکہ وہ ایسی مسجد تھی جس میں رات کو علاوہ نگہبان کے کوئی نہیں رہتا تھا اور تالا لگا رہتا تھا۔ شیخ ان کو ایک گوشے میں لے جاتے اور چند روپے یا پیسے دے کر چھوڑ دیتے تھے۔ شیخ کی یہ مدارات دیکھ کر وہ اس عمل سے باز آئے تو بہ کی اور شیخ نے ان کو مرید بھی کرلیا۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ ایک بار ایک عالی نسب سید زادہ کہ اس کا مقام ظاہر مخالف شرع تھا خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی خدمت میں آیا۔ بعض حاضرین اسے طعنے دینے لگے کہ ایسے والا مرتبہ خاندان کا ہوتے ہوئے تیری وضع قطع خلاف شرع کیوں ہے! خواجہ بیرنگ نے فرمایا۔ سید بہت اچھے آدمی ہیں ان کے باطن میں نیکیاں ہی نیکیاں بھری ہیں اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور بہت ہی خاطر، مدارات کی۔ وہ آپ کے حسن اخلاق سے اپنی اُس خلاف شرع روش سے جس کی انہیں ایک مدت سے عادت پڑ گئی تھی پھر گئے اور توبہ کی۔'' اسی واقعے کے بعد شیخ وزیر محمد نے اپنے شیخ کے فرمان سے شادی کی اور اولاد والے بن گئے۔ کیونکہ مزاج میں حد درجہ آزادگی تھی۔ اس تعلق زن وفرزند سے تنگ دل ہوکر اللہ تعالیٰ سے

درخواست کی کہ مجھے مجرد بنا دیجیے۔ چند دنوں میں وہ بیوی اور فرزند سب مر گئے اور آپ نے تعلقاتِ دنیوی سے پاک ہوکر راہ عشق و معرفت الٰہی میں قدم رکھا۔ باوجود مشغولیِ عبادت و تلاوت کلام اللہ حسن صوری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ فارسی اور ہندی شعروں کو بڑی اچھی بحروں میں باندھتے تھے اور پڑھتے اور بھی اچھا تھے۔ انھوں نے صلاح ظاہر کو عشق باطن سے ملا رکھا تھا۔ خواجہ حافظ شیرازی کا یہ شعر ان کے موافق حال لگتا ہے

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغان گوید	کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا[1]

وہ صاحب جمال گانے والیوں کے گھروں میں رات کو دن سے ملا دیتے تھے اور طعنہ کشوں کے طعنوں سے فارغ تھے۔ ایک رات وہ ایک گانے والی کے گھر میں تھے کہ چوروں کے ایک گروہ نے اس گھر پر دھاوا بول دیا۔ سیکڑوں تلواریں ان کے ماریں وہ خوشی خوشی کھاتے رہے لیکن ان کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا۔ کوئی تکلیف انھیں نہیں پہنچی صبح کو حسب معمول صحیح سلامت اٹھے یہ ان کی کرامت تھی۔ ایک بار انھوں نے ایک نعت کو بحر باختر میں کہا اور دلکش گلے کے ساتھ گایا۔ تمام شاہی گویے اور شہزادے وہاں حاضر تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان جیسا کوئی نہ پڑھ سکا۔ سارے کے سارے اپنے عجز کے معترف تھے۔ وہ شعر یہ ہے

محمد عربی کا آبروئے ہر دوسرا ست	کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او ست[2]

میرے شیخ ان سے خوش تھے اور انھیں نیک مردوں میں گنتے تھے کہ وہ ان کے ہم مشرب تھے۔ ان کو مجھ سے ایک ایسا والہانہ ربط پنہاں ہے جسے میں جانتا ہوں اور میرا دل جانتا ہے۔ ہم نے مدتوں آپس میں بڑی بڑی گرم مجلسیں اور صحبتیں برپا کی ہیں کہ ان کی تفصیل لمبی ہو جائے گی۔ کہتے ہیں کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہیں جذبۂ الٰہی نے آلیا جو کچھ ان کے پاس تھا سب سے بری ہو گئے بلکہ سترِ شرعی کا بھی ہوش نہ رہا۔ اس عالم کا انھیں کچھ شعور ہی نہ رہا۔ صرف اتنا شعور تو تھا

---

1 اگر تجھ سے پیر مغاں کہے تو سجادہ کو شراب میں ڈبودے کیونکہ سالک راہ و رسم (تصوف) سے بے خبر نہیں ہوتا۔ یہاں شراب سے شراب معرفت مراد ہے اور پیر مغاں سے مرشد برحق۔

2 (حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ دونوں جہاں کی آبرو ہیں۔ جو ان کے در کی خاک نہ بنا اس کے سر پر خاک پڑے۔

کہ عالم بے خودی میں محافل میں چلے جاتے اور یکسو بیٹھ جاتے اور جو کپڑا پہنے ہوتے جسم سے اتارتے اور اس کو صاحب جمال رقاصہ کو بخش دیتے تھے۔ آخر کار آج جہاں ان کی قبر ہے اس زمین پر جا کر بیٹھ گئے اور سنہ 1050ھ (1641) میں گزر گئے۔ قبر برہان پور میں ہے۔ حضرت شیخ عیسیٰ کے مریدین میں سے ایک صاحب نسبت و کیفیت مالک ذوق و وجد شخص سید ولی تھے انھوں نے جذبے کو طریقۂ سلوک میں مدغم کر رکھا تھا۔ [1]

ان پر بے تعینی اور آزادی کا غلبہ تھا۔ زبان میں کھلی تاثیر تھی۔ ایک زمانے میں جبکہ میں مرادآباد میں لشکری تھا وہ لطف و عنایت فرما کر میرے گھر تشریف لائے اور اپنے اور اپنے شیخ کے احوال میں عجیب و غریب حکایتیں سناتے۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وہ اپنے دوستوں سے میرے بارے میں کہا کرتے تھے کہ مجھے اس لشکری سے ربط باطنی ہے بہت سی بشارتیں دیتے تھے جن سے میں خوشی محسوس کرتا ہوں اور ان کے پورے ہونے کی امید اللہ تعالیٰ سے لگائے ہوئے ہوں۔ ان کی وفات 1050ھ (1641) میں ہوئی اور قبر قصبہ بتّور میں ہے۔ میں نے شیخ عیسیٰ کے اور کئی صاحب معاملت مریدوں کو دیکھا ہے ان میں سے ایک شیخ فرید تھے۔ اُن کے ایک اہل صلاح و سلامتی نوجوان مرید سید حاتم کہتے ہیں کہ ایک رات کو مجلس مولود میں ایک درویش کو وجد آ گیا، شیخ فرید کو بھی وجد نے آلیا۔ ان پر حالت گریہ طاری ہوگئی جس نے حاضرین پر ایسا اثر کیا کہ کوئی بھی بغیر گریہ و سماع کے نہ رہا۔ بڑے اچھے شخص ہیں وہی کہتے ہیں کہ جب میں رستم خاں دکھنی کے ساتھ لشکری تھا انھوں نے مجھے بہت دور دراز علاقے میں ایک مہم کے لیے متعین کر دیا۔ مجھے وہاں جانے میں کراہیت تھی کہ وہ کام میرے بس کا نہ تھا۔ اسی دوران میں نے شیخ فرید کی جانب توجہ باطنی کی کہ مجھے اس کام سے خلاصی مل جائے۔ اسی حال میں تھا کہ خان نے مجھ سے کہا کہ آپ وہاں نہ جائیں اور میری جگہ دوسرے شخص کو بھیج دیا۔ وہی فرماتے ہیں کہ جس وقت میں رستم خاں دکھنی کے ہمراہ لشکری تھا خاں نے مجھ سے ایک مطلب کے لیے استخارہ کرنے کو کہا۔ جب میں نے

---

1 گویا یہ حال تھا

مجذوب سا ہم نے تو دیکھا نہیں دیوانہ دیوانے کا دیوانہ فرزانے کا فرزانہ

(مجذوبؔ)

استخارہ کیا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ گھوڑے پر سوار کہیں جانے کے لیے تیار ہیں دوران خواب ہی خان نے مجھ سے کہا کہ میرا مطلب کہ حکومت سنبھل ہے، عرض کر، میں دوڑ کر قریب گیا اور عرض مطلب کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں دست مبارک دعا کے لیے اُٹھا دیے۔ دعا سے فارغ ہو کر جب دست مبارک روئے انور پر پھیرے تو میں نے بھی ان کے اتباع میں اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ میرے دونوں ہاتھ واقعۃً چہرے پر تھے۔ بہت دنوں سے خان کی حکومت سنبھل پر بحالی کی جو درخواست موقوف پڑی تھی اسی روز بادشاہ صاحب قران ثانی شاہ جہاں نے اپنے آپ انھیں بلا کر سنبھل کے لیے رخصت کیا اور وہ اپنی حکومت پر دوبارہ سے بحال ہو گئے۔

شیخ شاہ محمد جامی

آپ شیخ جلال تھانیسری[1] کے مرید ہیں۔ اہل زہد و تقویٰ و ورع تھے۔ معمولات میں نہایت بلند پایہ رکھتے تھے۔ ہمیشہ تلاوت کلام مجید میں قیام فرماتے۔ شروع میں ہر روز پندرہ پارے پڑھتے تھے ادھیڑ عمر میں روزانہ ایک ختم قرآن کا قیام کی حالت میں معمول رہا۔ آخر میں جب دنیا سے رخصتی کے قریب ہوئے تو پھر پندرہ پارے پر ہی قانع ہو گئے تھے۔ دفات کے روز 27 پارے پڑھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے اور صوم دہر رکھتے تھے۔ ایام تشریق اور مہینے کے شروع میں بیمار رہا کرتے تھے۔ کوئی بھی بیماری ہو سب میں شہد یا شربت شہد استعمال فرماتے تھے۔ شہد کے علاوہ کسی اور چیز سے علاج نہ کرتے۔ اور فرماتے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی حضرت رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخار ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ شہد استعمال کرو۔ دوسرے دن پھر آئے اور عرض کیا

---

1 شیخ جلال تھانیسری حضرت شیخ عبدالقدوس کے مرید و خلیفہ اور بڑے عالم و فاضل و درویش تھے۔ 989ھ/ 1851 میں وفات پائی۔ ''تحقیق اراض الہند'' آپ کی تصنیف ہے۔ (بحوالہ تذکرہ علما ہند) دوسری دو تصانیف ''ارشاد الطالبین'' ''ارشاد الطائف'' ہیں۔ آپ کا مزار مبارک تھانیسر میں مقبرۂ شیخ چلی کے متصل ہے۔ محترم طارق فاروقی موجودہ سجادہ نشین ہیں۔ 23، 24، 25/ ذی الحجہ کو عرس ہوتا ہے۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے شہد کھایا بخار اور بڑھ گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا شہد کھاؤ۔ تیسرے دن بخار اور بھی تیز ہو گیا مگر آپ نے پھر وہی شہد کا حکم فرمایا۔ آخر وہ بخار کلی طور پر چلا گیا۔ اس حدیث کو بیان کر کے حضرت شاہ محمد جامیؒ نے فرمایا کہ مجھے اس آیۃ کریمہ ''فیہ شفاء للناس '' جو شہد کے بارے میں اتری ہے میں یقین کامل ہے۔ وہ حلال کمائی سے زندگی گزارتے تھے کسی کا نذرانہ یا ہدیہ قبول نہ فرماتے۔ جس کا کام کرتے اس سے اپنے کام کے موافق اُجرت حاصل کرتے اور اس سے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروری روزی چلاتے تھے۔ کبھی اناج کھانا ترک کر دیتے اور صرف پکے ہوئے کدو (لوکی) سے افطار فرماتے۔ شریعت کے معاملے میں حسابؔ سے زیادہ سخت اور درشت تھے اور طریقت میں (حساب سے زیادہ) نرم اور درست۔ قلب کی صفائی اور تصفیے میں یگانہ تھے کہ اگر شبے کا ایک لقمہ بھی حلق میں چلا جاتا تو بیمار ہو جاتے تھے۔ ایک دن میرے والد نے جو اُن کے نہایت مخلص چاہنے والے اور خواجہ تاش تھے ان سے کہا اے شیخا! کیا رائے ہے کہ ہم دونوں بوقت افطار میرے یہاں ساتھ مل کر کھانا کھائیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ بشرطیکہ احتیاط کے ساتھ پکایا گیا ہو۔ والد نے کہا ''جی بہتر'' اور باورچی کو خوب تاکید کر دی کہ بہت احتیاط برتے۔ جب کھانا حاضر کیا گیا وہ، میں اور میرے والد تھے۔ جب انھوں نے لقمہ حلق میں اتارا کہا۔ آہ آہ میرے پیٹ میں درد ہو گیا۔ خوب تحقیق کریں کہ یہ کھانا مشکوک ہے۔ اس کھانے کی تیاری کے ایک ایک جز کو شمار کیا حتیٰ کہ پانی اور آگ کا بھی نمبر آیا کہ کوئی جز مشکوک تو نہ تھا۔ باورچی نے بہت دھیان دے کر سوچ کر کہا کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا نیم جلا (جو تندور کے پاس پڑا تھا) میں نے لکڑیوں کے ساتھ جلا لیا ہے۔ وہ بولے اسی لکڑی سے درد اٹھا انھیں تین دن بخار آیا پھر اچھے ہو گئے۔ ایک دن میں نے انھیں جاڑوں کے موسم میں دیکھا کہ آگ جلائے ہوئے تاپ رہے ہیں۔ ناگاہ ایک سوکھا پتہ ہوا نے اُڑا کر آتش دان میں لا ڈالا۔ انھوں نے فوراً آگ سے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور ٹھنڈ میں ایک کونے میں الگ جا کر بیٹھ گئے کیونکہ وہ پتہ دوسرے شخص کے پیڑ کا تھا۔ ایک دن وہ ایک مجمعے کے ساتھ نیا چاند دیکھنے کے لیے ایک زیر تعمیر عمارت کے اوپر چڑھ گئے۔ کسی کے ہاتھ سے ایک اینٹ اُکھڑ کر نیچے گر گئی (اور ٹوٹ گئی) انھوں نے اس سے کہا کہ جا اپنے پاس سے ایک اینٹ لے کر آ اور اس عمارت میں لگا تا کہ تیرا چاند دیکھنا حلال ہو جائے۔ اس نے ایسا ہی

کیا۔ میرے والد فرماتے تھے کہ جب میں سرائے کٹرہ شیخ فرید بخاری کا منتظم تھا وہ بھی وہیں تھے۔
ایک دن سرائے کی لکڑی کا ایک تختہ جو ایک طاق میں رکھا تھا میں نے قرآن پاک اس کے اوپر رکھ دیا، اسی وقت میرے دامن کا ایک کنارہ اس تختے میں الجھ کر پھٹ گیا۔ جب میں ان کے پاس گیا۔ انھوں نے دیکھا تو فرمایا جس کام کے کرنے سے تیرا دامن پھٹا ہے آئندہ اس کام کے کرنے سے توبہ کر۔ جب 1011ھ میں سنبھل میں میری پیدائش ہوئی میرے والد کو خبر پہنچی تو ان سے کہا۔ اس لڑکے کا کیا نام رکھتے ہیں؟ بولے محمد۔ حالانکہ سنبھل میں میرا نام کمال رکھ دیا تھا۔ میرے والد مجھے دونوں نام ملا کر بلاتے تھے "کمال محمد"۔ ایک وقت وہ سید مسلم بھکری کے ساتھ جو کہ شیخ فرید بخاری کے بھانجے اور معزز سلطانیاں تھے اور بنگال چلے گئے تھے اور وہیں ماہ ربیع الاول 1020ھ (1611) میں انتقال فرما گئے تھے کیونکہ وہ ان کے تعلق داروں میں تھے اور دنیاوی کاموں میں ان کے کام آتے تھے۔ اس لیے بعد میں ان کی نعش کو شیخ محمد جامی (دہلوی) دہلی لے آئے تھے، جس باغیچے میں سید بیٹھتے تھے ایک لیمو کا درخت تھا کہ رات کو ہزار سے بھی زیادہ کنجشکوں کی نشیمن گاہ بنتا تھا۔ ایک شام سید مسلم بھکری کنجشکوں کی کثرت آواز سے غصے میں آ گئے اور خادموں سے کہا کہ اگلی شام کو تمام درخت پر جال لگا دینا ہم سب کنجشکوں کو پکڑ کر ذبح کر کے کھائیں گے۔ وہ (شیخ محمد جامی) یہ سن کر بہت پریشان خاطر ہوئے کہ انھوں نے مدتوں کنجشکوں کے لیے دانہ پانی اس پیڑ کے پاس رکھا تھا اور ان کے زیادہ آنے سے خوش ہوتے تھے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے ساری رات نیند نہ آئی اور غمگین پڑا رہا۔ اتفاق دیکھیے کہ اگلی شام ایک کنجشک بھی اس پیڑ پر آ کر نہ بیٹھی۔ یہ قصہ سن کر میں میرے والد اور تمام مجمع متعجب ہوا۔ میرے شیخ نے ایک بار فرمایا کہ ایک دن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کوچے سے گزر رہے تھے۔ رسی میں بندھی ہوئی ایک ہرنی نے فریاد کی کہ اے رسول اللہ مجھے کھول دیجیے کہ میں اپنے بچے کو دودھ پلا کر واپس آ جاؤں گی آنحضرت نے فرمایا وعدہ کر کہ لوٹ آئے گی کہا "جی حضرت" آپ نے اس کو رہا کر دیا اور خود اس کے آنے کے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ جب وہ آ گئی تو اپنا گلا آپ کے آگے کر دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر باندھ دی۔ اتنے میں وہ صحابی جنھوں نے اسے شکار کیا تھا آ گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسے مجھے دے دو" ان صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ میرے تمام اہل وعیال سب کچھ آپ کا ہے یہ ہرنی کیا چیز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے اسے آزاد کر دیا اور فرمایا جا۔ وہ آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوئی تعریف میں رطب اللسان ناچتی ہوئی صحرا میں چلی گئی۔ ابتدا میں مجھے شیخ جامی سے یک گونہ غبار خاطر تھا کیونکہ وہ میرے شیخ سے معترض رہتے تھے۔ ایک دن میں نے اپنے والد سے عرض کیا کہ ان سے کہہ دیں کہ زاہدوں اور عابدوں کا طریقہ اَور ہے، عاشقوں اور عارفوں کا کاروبار اور ہے۔ میرے شیخ دوسری قسم سے ہیں وہ سب کو یکساں نہ کریں:

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد　　خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد [1]

میں نے انھیں قبول کر لیا ہے اس سے زیادہ اب وہ مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں۔ شیخ محمد جامی (دہلوی) کی تاریخ وفات 18 رصفر 1057ھ (1647) ہے اور قبر قدم گاہ کے برابر میں ہے۔ اب شیخ عبدالقادر ان کے بیٹے ان کے نقش قدم پر ہیں۔ وہ بھی صالح، نیک سیرت اور قاریٔ قرآن ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد نے اپنی آخری بیماری میں جمعے کے دن بے وقت اذان کہہ دی۔ سننے والے حیرت میں پڑ گئے۔ افطار کے وقت (کیونکہ تمام سال روزے سے رہتے تھے) کھیر پکوائی اور ہمارے ساتھ تناول فرمائی اور کہنے لگے ''تمھیں خدائے کریم کے سپرد کیا۔ رات کے وقت ان کے پہلو میں درد اٹھا۔ میں نے ہاتھ پر تیل لے کر ملنا شروع کیا تو فرمانے لگے'' میں نے تمام عمر (علاوہ شہد کے کسی چیز سے) بیماری کا علاج نہیں کرایا ہے، اب کیوں کروں اور منع کر دیا۔ اسی میں تپ و لرزہ نے انھیں آگھیرا۔ میں نے دوسرا گرم کپڑا اوڑھا دیا تو اس کو بھی ہٹوا دیا اور صرف ایک چادر میں وہ رات بسر کی۔ دوسری رات قبلہ رو بیٹھ کر ذکر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ جب ہم ان کا جنازہ قبرستان لے کر پہنچے دو تین قبریں کھودیں ہر جگہ پتھر نکلے حاضرین متحیر ہوئے کہ کیا اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اسی وقت ایک شخص آئے اور کہا ایک دن شیخ یہاں آ کر خود اپنی قبر کھود کر مٹی سے بھر کر چلے گئے تھے تا کہ لوگ انتظار نہ کریں فوراً اسی قبر میں دفن کر دیا۔ اسی دوران ایک بزرگ نے واقعہ میں دیکھا کہ شیخ آئے اور کہہ رہے ہیں صدقے کے لیے جو کچھ لائے ہیں فلاں شخص سے کہو کہ بانٹ دے اور ایک شخص کا نام لیا کہ وہ فقرا میں تقسیم کریں۔ اتفاق کی بات کہ میں نے بغیر اس واقعہ کی اطلاع سے پہلے ہی اس شخص سے کہا تھا کہ تم تقسیم کر دو۔

1　نہ ہر عورت عورت ہے اور نہ ہر مرد مرد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پانچوں انگلیاں یکساں نہیں بنائیں۔

شیخ شاہ محمد آچینی

صالح مادرزاد، متورع، متوکل اور دیگر صفات کاملہ اور دین داری سے متصف تھے۔ رزق حلال کے سلسلے میں وہ اتنے محتاط تھے کہ جہاں ذرا وہم وشبہ ہوتا کھانا نہ کھاتے اور کسی مشتبہ چیز کو استعمال نہ کرتے تھے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ جب بھی انھیں نہانے کی حاجت پڑ جاتی لباس بستر اور چار پائی کو دریا پر لیجا کر خوب دھوتے تھے۔ سادہ مزاج تھے۔ (دوران ساعت) اگر کسی کتاب میں کوئی آیت رحمت یا کہیں رحمت حق کا ذکر آ جاتا تو بڑی بشاشت اور نشاط کے عالم میں بلند آواز سے کہہ اُٹھتے "چھٹی، چھٹی۔" یعنی نجات ہوگئی۔ سادگی میں وہ حدیث "اکثرُ اھل الجنۃ ابلہ" (اکثر اہل جنت بھولے بھالے لوگ ہوں گے) کے مصداق تھے۔ ان کی عمر ساٹھ یا ستر سال کی ہوگئی ہوگی لیکن ابھی تک انھیں زن وشوہر کے عمل صحبت کا علم نہ تھا۔ اگر کبھی کپڑا خریدنے یا جوتا لینے (یا ٹھیک کرانے) کے لیے جاتے انھیں پتہ نہ چلتا کہ سامان کا مالک قیمت سے زیادہ کہہ رہا ہے جو کچھ وہ کہتا دے دیتے بلکہ اوپر سے یہ اور کہتے تم خوش تو ہو۔ اگر سامان والا فوراً کہہ دیتا کہ "ہاں" تو ٹھیک، ورنہ جتنا وہ بڑھاتا جاتا وہی دیتے جاتے۔ وہ دس تک کی رقم ٹھیک سے نہ گن سکتے تھے۔ اس میں بھی غلطی کر دیتے تھے۔ اگر کوئی لوگوں کی چوری یا خیانت کا ذکر کرتا نہ مانتے کسی پر بھی گناہ کی بدگمانی نہ کرتے تھے۔ یا تو وہ لوگوں کو بدی سے متصف جانتے ہی نہ تھے یا دانستہ نظر انداز کرتے تھے۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ شیخ ابن عربی نے اپنی کسی تصنیف میں لکھا ہے کہ بارہ قسم کے قطب دنیا میں ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک قطب وہ ہوتا ہے کہ بجائے کشف کے اگر کسی کا گناہ سر کی آنکھ سے بھی دیکھ لے تو اس سے کہتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیوں کیا اور وہ جواب میں کہہ دے کہ میں نے یہ گناہ نہیں کیا تو وہ قطب کہتا ہے کہ تو سچ کہتا ہے میری آنکھ نے غلط دیکھ لیا۔ اس کے اندر یہ صفت اُس صفت الٰہی کی اتباع میں ہے کہ حق تعالیٰ روز قیامت ایک گناہگار سے کہے گا کہ تو نے یہ گناہ کیوں کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے یہ گناہ نہیں کیا۔ حق سبحانہ جل شانہ اپنے کمال کرم سے اس سے فرمائیں گے اچھا اگر تو نے گناہ نہیں کیا ہے تو جا داخل جنت ہو جا اور وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ (انتہیٰ) جب میرے شیخ یہ روایت بیان کر چکے میری زبان پُر ذوق پر یہ شعر آ گیا

باش خوش چو ز حق بگفت نبیؑ سبقت رحمتی علیٰ غضبی [1]

اگر یہ حدیث قدسی ہے صحیح ہے اور اگر حدیث رسول ہے تب بھی راست آتی ہے۔ میرے شیخ نے ان کو دیکھا تھا انھیں وہ اچھے لگتے تھے اور انھیں ایک نیک مرد (بامعنی بزرگ) شمار کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی میرے والد کے پاس آتے اور مدتوں رہ کر جاتے کہا۔ کرتے کہ مجھے تین جگہوں کی تحقیق ہے کہ وہاں لقمہ حلال ملتا ہے۔ ایک تیری اور دو جگہ اور ہیں۔ لیکن ان دو جگہوں پر کم جاتے تھے یہاں بہت آتے۔ متبرک زمانوں جیسے ماہ رمضان یا ایام عاشورہ وغیرہ کو یہیں گزارتے تھے، وہ پنج وقتہ نماز پڑھتے ہوئے تعداد رکعات کو غلط کر دیتے تھے۔ دوسروں سے پوچھا کرتے میں نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔ یہ حالت یا تو بھول کی وجہ سے تھی یا غلبۂ استغراق تھا۔ واللہ اعلم۔ میرے والد ان کے ساتھ ایک بار سنبھل گئے تھے مگر انھوں نے سواری کا جانور قبول نہ کیا۔ پاپیادہ چلے۔ ایک دن راستہ میں ان کو میں نے گھوڑے پر سوار کرادیا کہ میں چند قدم آپ کے ہم رکاب چلنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھے بھول کر گھوڑے کو تیز ہانک دیا۔ مجھ میں آدھے کوس پیدل بھاگنے کی قوت تھی بھاگتا رہا اس کے بعد میں تھک کر حیران بیٹھ گیا۔ آخر میں نے ایک سوار کو دوڑایا۔ وہ ایک فرسخ کے قریب گئے ہوں گے انھیں روکا اور کہا کہ فلاں اب پیدل نہیں چل سکتا۔ انھوں نے بقسم کہا میں بھول گیا تھا اور گھوڑا واپس بھیجا۔ میں بچہ ہی تھا جب وہ مجھے نیکی اور سلامت روی کی ترغیب دیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں بشارتیں بھی دیتے تھے۔ ایک دن میں ان کے ساتھ تھا وہ دریا کی طرف جارہے تھے اپنے کھیت میں ایک ہرے پودے پر انکا پیر پڑنے سے مسلا گیا۔ وہ وہیں پُر ملال بیٹھ گئے۔ اس کو سیدھا کیا اور چند ڈھیلے اس کے اردگرد چن دیے اور مجھ سے معلوم کیا کہ بحال ہو جائے گا؟ میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں'' تب آگے قدم بڑھایا۔

یقیناً وہ اللہ کے دوستوں میں سے تھے۔ بہت کم لوگوں کو ان کے احوال باطن سے آگاہی تھی ان کی سادگی ان کے حال کی پردہ پوش بن گئی تھی۔ جب کوئی ان کے بھولے پن کے کاموں پر ہنستا تھا یا تو انھیں پتا ہی نہیں چلتا تھا یا پھر اغماض سے کام لیتے تھے۔ ان کا قیام دہلی میں پھلواری والی مسجد میں

---

1 خوش ہو جا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے یہ حدیث بیان کی ہے۔ سبقت رحمتی علیٰ غضبی (میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی)۔

رہتا تھا۔اس محلے کے باشندے بھی ان کی بھولی بھالی باتوں سے انہیں ایسا ہی سمجھتے تھے۔انھیں نہ کسی سے باطنی تعلق خاطر تھا نہ کسی سے کوئی غرض رکھتے تھے بظاہر سب سے آشنائی رکھتے اور خوش و خرم رہتے تھے۔سال وفات 1020ھ (1611) ہے اور قبر قدم گاہ کے پڑوس میں جنوب رویہ حوض کے کنارے ہے۔میں نے شیخ چلی نام کے ایک بزرگ کو دیکھا تھا بڑے پابند معمولات اور صاحب استقامت تھے مگر کیا سادگی اور بھولا پن رکھتے تھے۔میرے شیخ فرماتے ہیں کہ وہ بھی دوستانِ خدا میں سے تھے۔یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ بہت سے دوستان خدا لباس سادگی میں درگاہ رب العزت کے مقرب ہیں۔چنانچہ شیخ طہٰ سرہندی ایک صالح اور غریب شخص ہیں وہ ایک دن میرے شیخ سے بیان کر رہے تھے کہ شہر لاہور میں ایک درویش گزرے ہیں وہ صاحب احوال عظیمہ اور دوستان خدا میں سے تھے۔ایک دن ان کی بیوی نے ان کے ہاتھ میں دو فلس دے کر کہا ایک فلس کا تیل اور ایک فلس کا صابون بازار سے لے آئیں۔وہ آدھی راہ سے لوٹ آئے اور بیوی سے بولے کون سے فلس کا تیل اور کون سے کا صابون خریدوں؟ ایک اور بزرگ میرے شیخ سے سنا رہے تھے کہ ایک دن ایک نیک مرد راست باز درست کار اور لائق کار عشق الٰہی ایک خادم کے ساتھ جا رہے تھے۔راستے میں نماز کا وقت ہو گیا دیکھا کہ ایک چبوترہ ہے بہت صاف شفاف چاہا کہ اس کے مالک سے پانی لے کر وضو کر کے نماز ادا کرلوں۔خادم نے کہا اے شیخ کیا کر رہے ہیں یہ قحبہ خانہ ہے اور یہ قحبہ ہے۔وہ بولے کیوں کسی پر بغیر علم کے تہمت رکھتا ہے کہیں تو خود ایسا نہ ہو جائے۔اس رنڈی نے جب اس نیک مرد کی یہ سادگی دیکھی تو بطور دل لگی بولی۔اے شیخ آپ ہی انصاف فرمائیں کہ آپ کا خادم مجھ پر ناحق تہمت لگا رہا ہے۔انھوں نے کہا ہاں بہن تم ٹھیک کہہ رہی ہو، خادم جھوٹ بولتا ہے۔سلام کیا اور آگے چل دیے۔مولانا محمد حافظ خیالی نے کہ جن کا ذکر گزرا فرمایا کہ میاں جمال خاں[1] مفتی دہلی جو کہ علمار بانیین میں سے تھے اور ان کے سات لڑکے حافظ عالم اور فاضل تھے۔ایک دن طلبا کو درس دینے میں منہمک تھے اسی اثنا میں ان کے

---

1 مفتی جمال خاں دہلوی ابن شیخ نصیر الدین میاں لاڈن کے بھائی تھے۔علوم عقلیہ ونقلیہ بالخصوص فقہ و کلام عرب وعلم تفسیر میں بے نظیر تھے۔"شرح عضدی" "شرح مفتاح" اور "شرح انوار فقہ" آپ کی تصانیف ہیں۔984ھ/1576 میں وفات پائی۔(بحوالہ تذکرہ علمائے ہند)

قریے کا مہتمم ملکی وہاں پہنچا اور جا کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے دریافت کیا کیوں آیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ کپاس تیار ہے کسی کو بھیجئے تاکہ آپ کا حصہ لے آئے تو انھوں نے پوچھا بھُس سے دانہ نکال لیا۔ یا باقی ہے؟ اس سے پہلے جب ان کے کھیتی کرنے والے کسان نے غلے کے بارے میں پوچھا تھا تو انھوں نے کہا تھا کپاس کا ہے ہے (کپاس کہاں ہے)

شیخ شاہ محمد ڈھکوی

شیخ تاج الدین سنبھلی کے مرید ہیں۔ معاملت میں راسخ اور استقامت میں واثق تھے۔ صاحب اخلاق عظیمہ اور نرم اطوار تھے۔ میرے شیخ کے بڑے مخلص، خاص معتقد اور نیازمندوں میں سے تھے۔ میرے شیخ انھیں مردان راہ عشق و معرفت میں گنتے ہیں اور کما حقہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ کنگھر قوم میں سے ہیں۔ اپنے پیارے وطن کو شیخ کی محبت میں ترک کر کے آئے اور قصبہ ڈھکے میں جو کہ سنبھل سے تین فرسنگ کی راہ پر ہے، اقامت اختیار کی۔ سنبھل کے کتنے لوگ جب ان سے اپنے کسی کام یا مہم کے لیے رجوع کرتے تو وہ متوجہ ہوتے اور دعا کرتے اور وہ کام اور مہم بہت جلد انجام پا جاتی۔ میں دہلی کی آمد و رفت میں جب اپنے شیخ کے پاس جاتا تھا راستے میں ان سے ملاقات کرتا، بڑی اچھی صحبت رہتی تھی۔ جب بھی وہ سنبھل تشریف لاتے میرے گھر پر بے تکلف آتے پھر گزرتا جو بھی گزرتا۔ ان کی توجہ باطنی میرے شامل حال رہتی تھی۔ ان پر انبساط طاری رہتا تھا۔ فارغ البالی کے ساتھ زندگی گزارتے۔ اپنے مشرب کی وسعت سے حسن صوری سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ اپنی جوانی کے عشق کی بہت ہی دلچسپ حکایتیں سناتے تھے۔ وہ جوانوں میں جوان اور بوڑھوں کے ساتھ بوڑھے تھے۔ ایک دن وہ نوجوان عشاق کے درمیان دہلی میں ایک حجرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب جمال نوجوان بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے چونکہ موسم میں تیرگی تھی وہ باوجود کبرسنی اس کا جمال دیکھنے کے لیے متوجہ ہوئے جیب سے ایک ڈبہ نکالا اس میں سے ایک چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگایا اور ان صاحب حسن کے چہرے کا نظارہ کیا۔ حاضرین یہ دیکھ کر ہنس پڑے اور وہ جوان بھی ہنس پڑا۔ مشہور و معروف شاعر کا یہ شعر ان کے موافق حال آیا۔

عینک نہاد پیر فلک ز آفتاب و ماہ   تا بر خط عذار جواناں کند نگاہ [1]

انھیں خاص مقبولیت حاصل تھی کہ عوام وخواص ان کو جان ودل سے چاہتے تھے۔ یہ ان کی اللہ تعالیٰ سبحانہ کی درگاہ میں مقبولیت کی علامت ہے۔

خوشی و خرمی و کامرانی   کسے دارد کہ خواہانش تو باشی [2]

شیخ احمد سنامی

وہ صاحب تقویٰ وصلاح سیاح تھے۔ معاملت میں ثابت قدم اور طریقہ درویشی میں مستقیم الحال۔ غیر شادی شدہ تھے۔ دنیاداروں کی صحبت سے نفرت کرتے تھے۔ بہت کم کسی سے انس والفت رکھتے تھے۔ اگر کسی سے ملاقات کی نوبت آہی جاتی تو بہت جلد علاحدہ ہوجاتے تھے۔ فقرا کے خادم تھے۔ مجرد زندگی کرتے۔ حالت تفرید ان کی خاصیت تھی۔ شاہ میر لاہوری کے مرید ہیں۔ حاجی عبداللہ سیاح کی صحبت بھی اٹھائی۔ آخر میں حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت سے بہرہ ور ہوئے اور کمال کو پہنچے۔ میرے شیخ سے صدق اخلاص سے پیش آتے تھے اور خاص محبت کرتے تھے۔ وہ آزادانہ تنہا سفر کرتے، شہروں میں قلندرانہ چکر کاٹتے۔ حسن صورت کی جانب مائل تھے۔ جہاں بھی کسی صاحب جمال کے بارے میں سنتے، وہیں پہنچتے۔ کافی لمبی عمر پائی۔ ایک بار میں نے انھیں دیکھا کہ ایک صاحب جمال شخص کے دیدار کے لیے ایک دن میں 18 میل پیدل گئے اور دوسرے دن واپس آئے۔ میری اس دن ان سے شناسائی ہوئی ساری رات ہم نے یکجا بتائی۔ علی الصباح اسی اثر بے تعینی کے سبب کہیں اور چلے گئے اس کے بعد مجھ پر جوگزری گزری۔ کہتے ہیں کہ شیخ رزق اللہ [3]

1 بوڑھے آسمان نے چاند سورج کی عینک لگالی تاکہ نوجوانوں کے رخساروں کے خط پر نگاہ ڈالے۔

2 صرف اسی کے لیے خوشی، خرمی اور کامیابی ہے کہ جس کا چاہنے والا تو ہو۔

3 حضرت شیخ رزق اللہ دہلوی ابن شیخ سعد اللہ (متوفی 22 ربیع الاوّل 928ھ/22 فروری 1522) عالم و فاضل اور مورخ ومصنف تھے۔ ''تاریخ مشتاقی'' آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ آپ نے 989ھ/7 مئی 1581 کو وفات پائی۔ آپ کے برادرزادے حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ''مشتاق قھم'' تاریخ وفات کہی۔ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے

مخدومی عارف زمان مشتاقی   وے گفت بوقت نقل مشتاق قھم
ھٗی چو تاریخ وفاتش نگریست   نوک قلمش ہمان سخن کرد رقم

(اخبار الاخیار)

صاحب تاریخ مشتاقی[1] نے رسالہ پیابن[2] ہندی میں اس وقت لکھا جب ان کی عمر 90 سال کی ہوگئی تھی۔ تاریخ وفات ان کی 989ھ (1581) ہے۔ ایک دن وہ بچے کی پیدائش کے وقت کام آنے والے سامان کو خریدنے کے لیے بازار گئے کہ ان کی بیوی کے ولادت ہونے والی تھی اور وقتِ ولادت بہت نزدیک تھا۔ عطار کی دوکان پر پہنچے ہی تھے کہ ایک صاحب جمال گجراتی پر جو کہ گجرات جارہا تھا اُن کی نظر پڑ گئی اس پر شیفتہ ہوگئے اور اپنا بازار کا کام بھول گئے اور اس کے پیچھے لگ لیے اسی بڑھاپے میں پیدل گجرات پہنچ گئے۔ کچھ دنوں بعد ان کے دوست احباب ان کا سراغ لگا کر گجرات پہنچے اور انہیں بڑی مشکل سے واپس دہلی لائے۔

ہر کجا عشق سر بر افرازد   پیر صد سالہ را جواں سازد[3]

شیخ رزق اللہ کا فارسی میں تخلص مشتاقی اور ہندی میں راجن ہے۔ ان کی چوپائی پیابن" سے یہ چند اشعار ہیں

اب ہوں بات پیم کی کہوں   کب لو من میں راکھی رہوں[4]
جیسے دودھ جلے زبا ہے   تیسے پیم کئے ادھکائے[5]
جن من اگن پیم کی لاگی   تن من اگن نہ کاہو لاگی[6]
اور اگن پھونکے سلگائی   پیم اگن بن پھونک سوائی[7]

---

1 "تاریخ مشتاقی" گرامی مرتبت عالی جناب پروفیسر شاہ عبدالسلام افسر بکار خاص رضا لائبریری نے ایڈٹ کر کے رضا لائبریری رام پور سے شائع کی ہے۔

2 شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے آپ کے ہندی مجموعہ کلام کے نام "پیابن" اور "جوت نرنجن" لکھے ہیں۔

3 جہاں بھی عشق سر ابھارتا ہے۔ سو سال کے بوڑھے کو بھی جوان بنا دیتا ہے۔

4 اب میں پریم کی بات کرتی ہوں کب تک دل میں چھپائے رہوں۔

5 جیسے دودھ کا جلا تڑپتا ہے۔ ویسے ہی محبت کر کے سلگتا ہے۔

6 جن کے دل میں عشق و محبت کی آگ لگ جاتی ہے ان کے دل کی ہر خواہش کی آگ سرد پڑ جاتی ہے۔

7 دوسری آگیں تو پھونک مارنے سے سلگتی ہیں مگر پریم کی اگنی بنا پھونکوں کے اور زیادہ سلگتی ہے۔

دوہرا

جرا ایک جو اوپجی پریم اگن جن دیھ   گیان دھیان سکھ چین سمجھ سبھ جلاے دیہہ [1]

جوہی کھیل موہے پیم کھلاوے   سوہی کھیل موہے کھیلا بھاوے [2]

اینہی کھیل جگ ماں جو جانے   اونہی جگ ماں ہوی ستانے [3]

بہتے کھیل کھیل میں دیکھے   اِک نہ بھایو پیم کے لیکھے [4]

پیم کھیل جونہی کوئی کھیلی   اپن سیس پاؤں ہر دیہی [5]

پیم بپت پرے بچلائی   پیم کھیل تو کھیلا چاہی [6]

دوہرا

پیم کھیل جو کھیلی دوئی جگ لاوے داو   ایہی جان کے پیم جوا ہر کوئی کھیل نہ پاد [7]

یہ چند شعر اپنی کتاب پیم اپاون سے پیش کرتا ہوں:

چوپائی

ابہوں کہوں پیم کی باتاں   دھیان دِے ای سنہی پی ناتاں [8]

پیم ہوئی تو بُدھ گن پاوے   پیم ہوئی وِدھی گن آوے [9]

---

1. جن کے جسم میں ذرا بھی ایک جو آتش عشق لگ جاتی ہے سکھ چین اور علم و ذکر سب کو جلا ڈالتی ہے۔
2. جو بھی کھیل میرا پیا مجھے کھلاتا ہے وہی کھیل میرے دل کو بھاتا ہے۔
3. اس دنیا میں جو محبت کا کھیل کھیلنا جانتے ہیں اُس دنیا میں اسی کی عزت ہوتی ہے۔
4. میں نے بہت قسم کے کھیل کھیل کر دیکھ لیے مگر محبت کے کھیل جیسا کوئی پسند نہ آیا۔
5. جیسے ہی کوئی محبت کا کھیل کھیلنا شروع کرتا ہے۔ اپنا سر اور پاؤں دونوں پہلے دہلے میں ہی ہار جاتا ہے یعنی فنا ہو جاتا ہے۔
6. راہ محبت میں جب کوئی مصیبت تجھ پر آ کر پڑتی ہے تو تو گھبرا جاتا ہے۔ راہ وفا سے پھرنے لگتا ہے اور محبت کا کھیل بھی کھیلنا چاہتا ہے۔
7. جو محبت کا کھیل کھیلتا ہے دونوں جہاں داؤ پر لگا دیتا ہے۔ یہی سوچ کر ہر کس و ناکس عشق کی بازی نہیں کھیلتا۔
8. اب میں ذکر محبت چھیڑتا ہوں تجھے محبوب کی قسم دھیان سے سننا۔
9. اگر محبت ہو گئی تو تو اہل علم و صفت بن جائے گا۔ اگر محبت حقیقی نصیب ہو گئی تو صفات الٰہی کے رنگ تجھ میں آ جائیں گے۔

پیم ہوئی تو ہوئی مہنتا پاوے بھید آدی و انتا [1]
پیم ہوئی منور ہوئی تو جائی او پرکٹ ہوئی [2]
بنا پیم ہوت سب کورا پیم ہوئی تو ودھی سب ہورا [3]
پیر مہنت ہوئی جو کوئے بنا پیم کچھ سدھ نہ ہوئے [4]
مورکھ کیا سمجھے ایں باتاں سمجھے پیمی پیم کی باتاں [5]
پیم لاگ سنسار و مایا پیم لاگ سبہ روپ دکھایا [6]
موہیں روپ آپ ہیں ساجے انت پیم کے باجے باجے [7]

دوہرا

تینہی کھنڈن بیچ ماں ڈھونڈھ پھرے جو کوے   پچھن ودِھی کوی پائیو بنا پیم نہ ہوئے [8]
جو کرور گن ہوت ہیں ایک پیم چیت ناہیں   کہت کمال بن پیم ودھاتا کتے پاویں توہیں [9]
ایہ کمال ناہیں بولت باتاں   آپ کہت ہیں پیم کی گاتا [10]

---

1 جب محبت ہو جائے گی تو تو عارف بن جائے گا راز اوّل و آخر سے واقف ہو جائے گا۔
2 محبت وعشق الٰہی اس کے جلوؤں سے منور کر دیں گے۔ جب تو نہ رہے گا تو وہ ظاہر ہو جائے گا۔
3 بنا محبت کے سب علم وعمل مانند کوڑے کے ہیں۔ اور اگر محبت ہوگئی تو ان سب کے ذریعہ اللہ اس کا سب کچھ بن جائے گا۔
4 چاہے کوئی پیر کہلاوے یا عالم ہو جائے۔ بغیر محبت کے رشد وہدایت نہیں ملتی۔
5 محبت سے ناواقف عشق کی باتوں کو کیا سمجھے گا محبت کی باتیں تو محبت والے ہی سمجھتے ہیں۔
6 محبت اور دل لگی ہی تو دنیا کی دولتیں ہیں۔ محبت ہی کے تو یہ سب روپ (کرشمے) نظر آتے ہیں۔
7 اب وہی خود میرا بناؤ سنگار کر رہے ہیں۔ محبت حقیقی کی جیت کے باجے بجنے ہی لگے۔
8 چاہیں کوئی تینوں برصغیر میں ڈھونڈھتا پھرے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کو بغیر عشق ومحبت کے نہیں پہچان سکتا۔
9 اگر کسی میں لاکھ خوبیاں ہیں مگر صرف ایک محبت بھرا دل اس کے پاس نہیں تو کمال کہتے ہیں کہ یارب بغیر تیری محبت کے وہ تجھے کیسے پائیں۔
10 اے کمال یہ جو کچھ تو بول رہا ہے۔ یہ انہیں کی توفیق سے ہے۔ وہ خود ہی بیان محبت فرما رہے ہیں۔

کوۓ کون کہاں کو کوۓ جہاں ایک تہاں کب دوۓ [1]
آپ ہوئی تو پاوے آپا چھی آپن اپھوں کرجاپا [2]
اپنو دھیان آپ میں لاوے دھیان لائے پنھ آپہیں پاوے [3]
آپ ہی آدی آپ ہی انتا آپ ایک ہے آپ انخا [4]
آپے جو ہیں آپے سو ہیں جو من آوے سوہی وہ ہیں [5]

دہرا

جیں تیں آپے آپ ہی ناہیں اورن جات آپے آپ سمان ہیں آپے آپ چہات [6]
آپے سمجھ کمال پیتم ناہیں آپا سن ہے کمال وصال اگن من تو اللہ ہی بس [7]

حضرت شیخ احمد سنامی کے اقربا میں سے ایک شخص شیخ معروف فاضل تھے وہ فرماتے تھے کہ سنام میں ایک صاحب تھے وہ شیخ احمدؒ سے کہنے لگے کہ میں نے کسی فقیر میں کرامت نہیں دیکھی۔ وہ اس بات سے آشفتہ ہوکر بولے فقرا کو حقارت کے ساتھ یاد مت کر بتا تو کیا کرامت دیکھنی چاہتا ہے۔ کہنے لگا ''بیٹوں کی تمنا میرے دل میں ہے۔'' انھوں نے کہا ''جا اس شرط پر تیرا مقصود حاصل ہو جائے گا کہ تو فلاں بیوہ کو چالیس روپے دے دے تا کہ وہ اپنی دو بیٹیوں کی شادی کر دے۔ان صاحب نے ویسا ہی کیا۔ان کے دولڑکے پیدا ہوئے اور آج تک دونوں زندہ ہیں۔عمر بھر میں ان

1 کوئی دوسرا اس کے سوا کون ہوتا ہے اور سوائے اس کے کس کا وجود ہے۔جہاں وہ تنہا ہو وہاں دوسرا کب ہو سکتا ہے۔

2 وہ ذات خود بخود موجود ہے اپنی عبادت وہ خود ہی کرتا ہے۔

3 وہ اپنا ذکر خود کرتا ہے۔خود ہی ذاکر خود ہی مذکور ہے۔خود ہی ذکر کرتا ہے خود ہی ماجور ہوتا ہے۔

4 وہ ذات آپ ہی ابتدا ہے اور آپ ہی انتہا ہے۔وہی وحدت ہے وہی کثرت ہے۔

5 یہ،وہ سب آپ خود ہی ہیں۔دل میں جو بھی آئے وہ بھی آپ خود ہی ہوتے ہیں۔

6 جہاں تہاں آپ ہی کا وجود ہے اور کسی کی ذات نہیں ہوتی۔آپ اپنی مثال خود ہیں،اپنے آپ کو آپ خود ہی چاہتے ہیں۔

7 اے کمال تو خود کو حقیقت میں محبوب کی ذات ہی سمجھ اپنا ہونا کچھ نہ ہونا ہے۔اگر وصال آتش دل کا ہی نام ہے پھر تو بس اللہ ہی محافظ ہے۔

سے وہی ایک کرامت ظاہر ہوئی اس کے علاوہ نہیں۔ ''رشحات'' میں ہے کہ حضرت خواجہ محمد پارسا قدس سرہٗ اپنے تصرفات کو ہمیشہ کسی نہ کسی سبب میں پوشیدہ رکھتے تھے اور سرِّ حقیقت کے اخفا میں جہاں تک ہوسکتا کوشش فرماتے تھے لیکن ایک دوبار ضرورت سے تھوڑا سا اظہار کیا۔ ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جب امیر تیمور کے فرزند جہانگیر کا پسر مرزا خلیل سمرقند میں بادشاہ تھا اور مرزا شاہ رُخ خراساں میں۔ حضرت خواجہ کبھی کبھی مسلمانوں کی پریشانیوں کی کفایت کی غرض سے مرزا شاہ رخ کو رقعہ لکھا کرتے تھے۔ مرزا خلیل کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ آخر اہل حسد کی شکایت پر حد درجہ متاثر و متنفر ہوگیا چنانچہ کسی کو آپ کے پاس بخارا بھیج کر کہلوایا کہ مہربانی فرما کر آپ سمرقند چھوڑ کر جنگل کی جانب چلے جائیں شاید وہاں بہت سے لوگ آپ کے قدموں کی برکت سے داخل اسلام ہوجائیں۔ حضرت خواجہ نے فرمایا ''خوش رہو۔'' پہلے ہم بزرگوں کے مزارات پر حاضری دیں گے اس کے بعد جانب جنگل نکل جائیں گے۔ اور فوراً سوار ہوگئے سارے خدام بھی آپ کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔ پہلے حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہٗ کے مزار پر پہنچے۔ جب مزار سے باہر نکل کر آئے نہایت ہیبت اور غضب آپ کے چہرے مبارک سے ظاہر ہورہا تھا پھر وہاں سے ایک غار کی جانب چلے گئے بہت دیر تک امیر کلال علیہ رحمہ کی قبر پر بیٹھے رہے۔ جب ان کے مزار سے باہر نکلے گھوڑے کے کوڑا مارا اور غار کے پشتے کے اوپر کو ہانک دیا اور خراساں کی جانب رُخ کرکے (مرزا شاہ رخ پر توجہ کرتے ہوئے) یہ شعر پڑھا

همه را زیر و زبر کن نه زیر ماند نه زبر　　تا بدانند که امروز دریں میداں کیست[1]

پھر وہاں سے بخارا تشریف لائے۔ اسی وقت مرزا شاہ رخ کا رقعہ مرزا خلیل کے بارے میں اس مضمون کے ساتھ پہنچا کہ ہم ابھی سمرقند پہنچنے والے ہیں چاہیے کہ میدان جنگ مقرر کردیں۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ اس مضمون کو جامع مسجد میں برسر منبر پڑھیں اس کے بعد مرزا خلیل کے پاس سمرقند بھیج دیں۔ مرزا شاہ رُخ مع لشکر اس رقعہ کے پیچھے ہی پہنچ گئے اور مرزا خلیل کو قتل کردیا۔ (انتہیٰ) ایک دن ان شیخ احمد ستای کو بادشاہ صاحب قران ثانی نے اپنے حضور میں طلب کیا۔ ان کے دوست انہیں پرتکلف لباس پہنا کے لے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کیا یہ لباس آپ کی ہی ملک

1　سب کو زیروزبر کردے نہ زیر رہے نہ زبر۔ تاکہ لوگ جان جائیں کہ آج اس میدان میں کون اترا ہے۔

ہے۔ بولے نہ میرے دوستوں کی ہے۔'' (یہ جواب سن کر) بادشاہ خوش ہو گیا اور بہت سارو پیہ ان کی نذر کیا۔ کہا ''نہ، نہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' جب بادشاہ نے بہت زیادہ اصرار کیا تو ایک روپیہ لے لیا۔ بادشاہ ان کی اس صفت استغنا سے باغ باغ ہو گیا اور مکمل اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ انھوں نے نکلتے وقت وہ روپیہ بھی دربان کو دے دیا۔ اور کہا کہ مجھے بس یہی ایک روپیہ بادشاہ نے مرحمت کیا تھا پھر اپنے دوستوں سے (جو شاہانہ ہدایا کی آس لگائے بیٹھے تھے) کہا کہ میں بذات خود بادشاہ ظل اللہ کی درگاہ میں گیا تھا مگر کیا کروں میری بزرگی نے کوئی کرشمہ نہ دکھایا۔ ایک بار انھوں نے ایک معمولی منکا میرے شیخ کو ہدیہ دیا اسی دوران شاہزادے نے بھی ایک زرّین مکلّف منکا میرے شیخ کی نذر گذرانا یہ سونے کا مکلّف منکا میرے شیخ نے مجھے عطا کر دیا۔ ایک دن میرے دل میں آیا کہ کیا خوب ہو شیخ اس منکے کو مجھ سے لے کر کسی دوسرے کو بخش دیں اور مجھے ان کا دیا ہوا معمولی منکا عنایت فرمادیں۔ کیونکہ وہ ایک فقیر کا دیا ہوا ہے اور یہ ایک غنی کا۔ میرے شیخ میرے دل کی بات سے آگاہ ہو گئے اور اسے مجھے عطا فرمادیا، وہ آج بھی میرے پاس ہے اور اُس دوسرے کو مجھ سے لے کر سید قریش کو دے دیا۔ سید قریش میرے شیخ کے مرید اور مقبول شیخ اور سید حامد شہید کے بھائی ہیں۔ نہایت عقلمند اور سنجیدہ شخص ہیں۔ جب انہیں رستم خاں دکھنی کی طرف سے علی گڑھ کی حکومت سپرد ہوئی میرے شیخ نے اپنا فوطہ انہیں عنایت کیا کہ علم کے اوپر باندھ دیں انھوں نے ایسا ہی کیا اور کفار دارالحرب پر چڑھائی کر دی اس فوطے کی برکت سے فتح عظیم حاصل کی اور اس علاقے کے باغیوں کو جو دیہات میں رہتے تھے سخت سزائیں دیں۔ آخر کار سید قریش اسراریہ کی تکمیل کے بعد قصبہ ایرج میں 15 ربیع الاوّل 1072ھ (1662) میں کو دنیا سے اٹھ گئے۔ چالیس روز کے بعد ان کی نعش کے تابوت کو وہاں سے سنبھل لاکر سید حامد شہید کے پہلو میں دفن کیا۔ شیخ احمد سنامی نے 70 برس کی عمر تک جامع مسجد فیروزی میں قیام کیا پھر وہاں سے مسجد عبدالنبی میں جہاں شیخ صالح رہتے تھے چلے گئے اور وہیں ساکن ہو گئے اور وہیں 1060ھ (1650) میں دنیا سے رحلت کی۔ ان کی قبر قدم گاہ حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کے قریب ہے۔[1]

---

1 یہ جگہ قدم گاہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور عوام ہے۔ جو خود تحقیق طلب ہے۔ یہاں سہواً حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔

شیخ صالح ملتانی

اپنے والدمحترم شیخ ظاہر کے صحبت یافتہ ہیں۔شیخ بہاءالدین زکریا کی اولاد میں ہیں۔وارستہ،آزاد مزاج اور صاحب معنی فقیر تھے۔تجرید کے قدموں پر زندگانی کرتے تھے۔اخفائے حال میں ان کا ایک خاص طریقہ تھا۔تمام اہل ظاہر حضرات انھیں اچھا سمجھتے تھے وہ ان کے ساتھ صلح صفائی کو بروئے کار لاتے بلکہ خاطر و مدارات کو اختیار کیے ہوئے تھے۔صوفیہ کی لایعنی باتوں کو نظر میں نہ لاتے تھے۔مشائخ زمانہ کی روش کے برعکس ہمیشہ عبادات میں ظاہری مشغولی سے فارغ تھے۔ اُدھر علمائے ظاہر سے کہا کرتے کہ صرف علم ظاہر کے عالموں تم خالی کدو کے تو برے سے زیادہ نہیں ہو علم توحید و معرفت تو تمھارے فقیروں یعنی صوفیہ کو نصیب ہے۔کچھ لوگ اُنھیں الحاد و زندقے سے منسوب کرتے تھے کہ ان کہی بہت کہتے تھے ان کا طعن ان کے اصل عقائد میں نہیں بلکہ ان کی عبادتوں پر تھا جب وہ ایسی باتیں کرتے تھے جو کم سمجھ میں آتی تھیں تو اہل سلوک انھیں قبول نہیں کرتے تھے اسی لیے وہ لوگ ان کا انکار کرنے لگتے تھے۔ایک بار جب شیخ صالح سندھی جو کہ درویش آدمی تھے کا وقت احتضار تھا۔شیخ الہ داد، میرے شیخ، وہ اور دوسرے صوفیا میں سے بھی اور بہت سے حضرات ان کے پاس حاضر تھے۔ایک صاحب نے شیخ سندھی سے کہا۔اللہ کو یاد کیجیے۔ انھوں نے غصّے کے ساتھ کہا اس ہڈیوں کے ڈھانچے کی تمام عمر مشقتوں میں کٹی ہے اب تو اسے چھوڑ دو کہ آرام سے چلا جائے۔وہ شاذ و نادر ہی زیارت قبور کے لیے جاتے تھے اگر کبھی چلے بھی گئے تو دوستوں سے کہا کرتے "مردہ شیر سے زندہ بلی اچھی" اسی مضمون کو صاحب "رشحات" نے بھی باندھا ہے قطعہ

تا کے بزیارت مقابر عمرت گذرانی اے فسردہ
یک گربۂ زندہ نزدِ عارف بہتر از ہزار شیر مردہ [1]

حضرت خواجہ محمد پارسا کی "جمع" میں ہے کہ حضرت خواجہ بزرگ قدس اللہ روحہ فرماتے تھے

---

1 اے افسردہ دل تو کب تک مقبروں کی زیارت میں عمر گزارے گا۔عارف حق کے نزد ایک زندہ بلی ہزار مردہ شیروں سے بہتر ہے۔

تو تا کے گور مرداں را پرستی　　روزے کارِ مردان کن و رستی [1]

میرے شیخ ان کو اہل ملامت اہل اللہ حضرات میں سمجھتے اور فقر کا مُنبہٗ جانتے اور بہت ہی دوست رکھتے تھے۔ان کی کرامتیں بیان فرماتے اگر چہ وہ اس طرف توجہ بھی نہیں دیتے تھے۔انھیں دیکھنے کے لیے جایا کرتے وہ بھی کبھی کبھی میرے شیخ کے پاس تشریف لاتے شوق میں بھرے ہوئے۔عجیب وغریب صحبتیں آپس میں رہتی تھیں۔ایک دن میرے شیخ نے اُن سے دریافت کیا کہ اس طریق میں آپ کے شیخ کون ہیں؟ اور آپ کو انھوں نے کیا تعلیم دی ہے؟ جواب دیا۔ظاہر نام کے ایک فقیر تھے میں ان کی صحبت میں رہتا تھا جب مجھ سے کچھ کرامتوں کا اظہار ہونا شروع ہوا تو وہ خفا ہو کر بولے'' آئندہ شیخ بننے کی مت سوچنا'' اور مجھے دھتکار دیا۔اس کے بعد جب ان کے استحضار کا وقت ہوا میں حاضر خدمت ہوا اور دریافت کیا اس بارے میں یعنی جانشینی کے بارے میں کیا حکم ہے فرمادیں بولے بابا صالح اس وقت ایک چیز کا انتظار ہے۔'' آخری گفتگو ان کی بس یہی ہے۔'' میرے شیخ کو ایام جوانی میں ایک صاحب جمال نوجوان سے ربط دلی ہو گیا تھا وہ لشکری نوجوان کہیں سفر پر چلا گیا۔میرے شیخ اس کی جدائی سے بے چین ہو کر قلق واضطراب کے عالم میں اُن کی خدمت میں پہنچے اپنا حال سنا کر عرض کیا توجہ فرمائیں کہ وہ جوان واپس آجائے۔انھوں نے فوراً دامن جھاڑ لیا کہ میں اس کام کا نہیں ہوں یہ تو زاہدوں اور عابدوں کا کام ہے۔میرے شیخ نے زور دے کر کہا جب تک کہ میری مراد حاصل نہیں ہو جاتی ہرگز آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔جب اِنکار سے عاجز آگئے تو کہا۔جب اس کا گھوڑا لنگڑا ہو جائے گا تو خود واپس آجائے گا۔دوسرے دن خبر آئی کہ وہ جوان لوٹ کر گھر آ گیا کیونکہ اس کا گھوڑا لنگڑا ہو گیا تھا۔اُن جوان کا ''شیخ شہاب'' نام تھا اور شہابن کے نام سے مشہور تھے اور شیخ عبدالعزیز کے پوتوں میں سے تھے۔جب وہ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۸ء) میں پانی میں غرق ہو گئے تو میں نے ان کی تاریخ وفات کہی

افسوس کان شہاب بعہد شباب رفت　　گل دیرتر رسید ولیکن شتاب رفت

تاریخ فوتِ او چو پرسیدم از خرد　　برداشت آہ وگفت ''شہابن بآب رفت'' [2]

ھ1037=1043- 6

1　تو کب تک مُردوں کی قبروں کو پوجے گا۔صرف ایک دن ہی مردوں والا کام کر اور سمجھ تیری نجات ہو گئی۔

2　افسوس کہ وہ شہاب جوانی میں دنیا سے چلا گیا۔اگر چہ یہ پھول بہت دیر سے کھلا تھا مگر جلدی چلا گیا۔جب میں نے انتقال کی تاریخ پوچھی تو خرد نے ایک آہ کی اور بولی ''شہابن بآب رفت'' (شہابن پانی میں ڈوب گئے)

میرے شیخ نے فرمایا کہ میں شیخ صالح ملتانی کی بیماریٔ آخر میں اُن سے ملا۔ اس موقع پر جیسا کہ حال ہونا چاہیے انھیں ویسا ہی پایا۔ ان کے بعض دوستوں نے ان سے دریافت کیا کہ اگر آپ کا انتقال ہو جائے تو کہاں دفن کریں وہ خفا ہو گئے اور فرمایا ابھی تم لوگوں سے یہ رسم نہ گئی (کہ فلاں کے قدموں میں دفن کرو) جب میں مر جاؤں تو ویرانے میں مجھے ڈال دینا تا کہ گیدڑ اور کتے کھائیں یا دجلہ میں ڈال دینا کہ مچھلیاں اپنی خوراک بنالیں۔ اس بات سے راقم الحروف کے دل میں آیا روح لطیف کی جسم کثیف سے انصباغ کی کیفیت انھیں مکشوف ہوگئی تب ہی تو ایسا جملہ کہا۔'' نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا۔ زبان سر میں ذکر بن گئی اور ذکر سر میں مذکور ہو گیا۔ دل سر میں مہر بن گئی اور محبت سر میں نور اور جان سر میں عین ہوتی ہے اور عین بیان سے وراء الوراء ہے۔ حصہ حق حق کو پہنچا، اور حصہ آدم آدم کو (یعنی روح رب روح سے جا ملی اور جسم خاک میں جا ملا) آب و خاک فنا ہو گئے تو دوئی جاتی رہی'' رجع الحق الی اصحابه (مقامه) و بقیة المسکین فی التراب'' انتہیٰ

وہ مسجد عبدالنبی میں رہتے تھے جب ان کی عمر 88 سال ہوگئی تو ایک دن بیمار پڑے تو ان کے یاران طریق اس معاملہ سے متفکر اور متالم ہوئے انھوں نے فرمایا۔ غم نہ کرو ابھی میری عمر کے دس سال باقی ہیں جب 98 برس کے ہو گئے اسی مسجد میں دنیا سے چلے گئے۔ سنہ وفات 1052ھ (1642) اور قبر قدم گاہ کے نزدیک سرراہ ہے۔ ان کی قبر کے کنارے مسجد بنالی ہے۔ نماز جنازہ میں فقرا اور صلحا کا ایک بڑا مجمع شریک ہوا۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ شیخ ابن عربیؒ نے ''فتوحات'' میں یہ لکھا ہے کہ حشر ونشر کے بعد ایک لمبی مدت گزارنے پر دوزخ اور جو کچھ اس میں ہے سب کو بہشت میں لے آئیں گے۔ جملہ گنہگار بہشت میں چلے جائیں گے عذاب کو کلی طور پر اٹھالیا جائے گا۔ یہ سن کر میرے دل میں آیا کلام مجید میں کئی جگہ خلود نار کے بارے میں نصوص قطعی وارد ہوئی ہیں پھر کیوں شیخ اکبر نے ایسی (غیر محققانہ) بات کہی۔

آخر شیخ صالح کے انتقال کے بعد ایک رات میں نے انھیں خواب میں دیکھا اور اس شے کو ان سے دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا'' یہاں کوئی دوزخ نہیں ہے یہاں سب کو بہشت ہے'' اور میں خواب میں ہی اس بات پر ان سے لڑ رہا ہوں۔ میرے شیخ کا ہی فرمان ہے کہ شیخ

الہ داد نے مجھ سے ذکر کیا کہ شیخ صالح قبر میں سے بھی تصرف کرتے ہیں۔ ایک روز بادشاہ
صاحب قِران ثانی نے میرے شیخ سے دریافت کیا کہ آپ شیخ صالح کو جانتے ہیں میرے شیخ
نے جواب دیا۔ ہاں جانتا ہوں، بادشاہ بولے ''کبھی ان سے ملاقات بھی کی ہے'' جواب
دیا۔ کبھی میں ان کے پاس جاتا تھا کبھی وہ میرے پاس تشریف لاتے تھے۔ معلوم کیا۔ ''وہ
کیسے آدمی تھے؟ کہا۔ ''وہ ایک وارستہ آزاد مزاج اور مجرد فقیر تھے۔'' میرے شیخ کا بیان ہے
کہ سید محمود امروہوی[1] جو کہ شیخ تاج الدین سنبھلی کے مرید و داماد تھے اور علوم صوفیہ سے بہرہ
ور تھے۔ اور شیخ صالح سے خاص محبت رکھنے والے وہ (امروہہ میں) بیمار پڑ گئے۔ دوران
بیماری انھیں بہت یاد کرتے کاش وہ اس وقت یہاں ہوتے۔ وہ انھیں دنوں دہلی سے امروہہ
پہنچے اور سید صاحب سے خلوت میں ملے۔ کسی کو علم نہ ہو سکا کہ کیا صحبت گزری۔ سید صاحب
اسی بیماری میں 1023ھ (1622) میں دنیا سے چل دیے۔ روایت ہے سید صاحب نے اس
بیماری میں ترش لیمو کی آرزو کی کسی کو باغیچے میں بھیجا کہ تلاش کر کے لائے اس نے بہت تلاش
کیا اور لوٹ کر کہا کہ نہیں ملا کیونکہ لیمو کا موسم مدت ہوئی گزر چکا تھا۔ سید صاحب نے کہا پھر جا
اور اس درخت سے میری جانب سے کہنا کہ لیمو دے۔ اب جو پہنچا لیمو مل گیا اور لے آیا۔ کہتے
ہیں کہ شیخ عبدالباقی نے جو کہ شیخ تاج الدین کے یاروں میں سے ہیں اور مکے میں اقامت
پذیر تھے لکھا ہے کہ میں اور سید محمود امروہوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر یکجا رہے
ہیں۔ انھوں نے اسی سلسلے میں لکھا ہے کہ سید صاحب کا بیان ہے کہ ایک رات میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے منورہ پر متوجہ تھا۔ روضۂ مقدسہ سے تین بار یہ آواز میرے گوشِ
دل میں پہنچی ''قَبِلْتُکَ یَا وَلَدِیْ'' (اے فرزند میں نے تجھے قبول کرلیا) سید صاحب
میرے شیخ سے اخلاص و محبت تام رکھتے تھے اور میرے شیخ بھی ان کی بہت تعریف کرتے
تھے۔ آپس میں عربی اور فارسی میں خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ میں نے اکثر تحریریں دیکھی
ہیں۔ ایک بار میرے شیخ کو یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

---

1 سید محمود ابن مولانا سید محمد اشرف دانشمند۔ جامع علوم وفنون اور مقتدائے وقت تھے۔ آپ کے دو فرزند سید عصمت اللہ و حاجی محمد بڑے صاحب کمال تھے۔

گفتگو آئین درویشی نبود ورنہ با تو ماجرا ہا داشتم [1]

ان کی اس بات پر مجھے وجد آ گیا۔ اگر چہ میں نے انھیں نہیں دیکھا ہے لیکن اپنے شیخ سے ان کی حکایتیں سنی ہیں۔ ان کے والد محترم اور خود ان کے دو بیٹوں کو دیکھا ہے۔ ان کے والد سید اشرف [2] عالم فقیہ اور بزرگ تھے۔ مجھ پر بہت ہی لطف و عنایت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک بچے کو ان کے سامنے لائے اس کے پیر میں تھوڑی کجی تھی عرض کیا کہ اس کے پیر کے لیے دعا فرمائیں کہ ٹھیک ہو جائے۔ انھوں نے اس کا پیر پکڑا اور گویا ہوئے ''بچے پیر سیدھا رکھ'' یہ کہنا تھا اور پیر کا درست ہونا تھا۔ سب بڑے معتقد ہوئے۔ روایت ہے کہ احتضار کے وقت حاضرین نے کہا سید صاحب آپ کی ذات بابرکت اور آپ کا وجود (آج کے دور میں) غنیمت ہے۔

انھوں نے کہا ''ہاں پہلے تو خود اپنا ہی انجام بخیر ہونا دشوار ہے۔'' ان کی یہ سادہ سی بات کس قدر راست اور درست ہے۔ سید محمود کے بڑے لڑکے کا ذکر شیخ جلال سنبھلی کے احوال میں آئے گا۔ البتہ ان کے چھوٹے بیٹے سید حاجی محمد صاحب ذوق و سماع تھے۔ سید عبدالحکیم کی صحبت اٹھائے ہوئے اپنے بھائی سید عبدالعزیز کے مرید ہیں۔ میرے شیخ نے سید عبدالحکیم کو دیکھا ہے فرماتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے نیک لوگوں میں سے تھے۔ میں نے سید حاجی محمد کو بہت دیکھا ہے۔ میرے آشناؤں میں لگتے تھے۔ بڑے بامروت اور صاحب فتوت لوگوں میں ان کا شمار تھا۔ ایک بار بھرے ہوئے زخم کا نشان ان کے سینے پر دکھائی دیا مریدوں نے پوچھا کہ یہ کیسا نشان ہے؟ بولے خواب میں اہل غیب نے میرا سینہ چیرا اور دل نکال کر صاف کر کے پھر اسی جگہ رکھ دیا۔ یہ اس کا نشان ہے۔ وہ دنیا سے 1062ھ (1652) میں چلے گئے۔ شروع میں جب میں لشکری تھا شیخ صالح سے ملاقات کی اگر چہ ابھی تک ان سے آشنا نہ ہوا تھا کہ انھوں نے مجھ سے فرمایا۔ اب تیرے والد کو چاہیے کہ تجھے چھوڑ دیں اور آزاد کر دیں تا کہ تو خود کو خودی سے چھڑا لے اور اللہ تعالیٰ کے دیدار

---

1 بحث و مباحثہ درویشوں کا طریقہ نہیں ہے ورنہ میں تجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اصل نسخۂ فارسی میں پہلا مصرعہ اس طرح لکھا ہے ''می ترسم بگذشت بگویم تخی'' یعنی مجھے ڈر ہے کہ جو کچھ گزرا وہ تجھ پر گراں نہ گزرے۔

2 سید محمد اشرف دانشمند ابن سید سعید خاں متوفی 1068ھ/1658۔ بڑے عالم و فاضل اور درویش صفت شخص تھے مزار مبارک محلہ دانشمندان امروہہ میں مسجد کے اندر ہے۔

مبارک کی دولت سے خوش دل ہو جائے۔ جب مجھے سعادتِ نیک نصیب ہوگئی تو ان کی یہ نیک فالی کی بات میں نے اپنے شیخ کو سنائی تو وہ خوش ہو کر بولے ''ہاں ہاں تو نے دیکھا کہ ایک درویش کے بول کیسے کارگر ہوئے۔'' اس کے بعد بارہا میں نے ان کا دیدار کیا ہے کبھی اپنے شیخ کے ہمراہ اور کبھی تنہا۔ جب میں اپنے شیخ کے ساتھ ہوتا تھا تو میں ان کی جانب نظر نہیں کرتا تھا کیونکہ میرے شیخ کا معاملہ ان کے ساتھ ایسا تھا جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے اور میرا ایسا جیسا کہ میں نے ابھی کہا۔ ایک بار شیخ مصطفیٰ جن کا ذکر آگے آئے گا اور میں، اپنے شیخ کی چاہت میں فرید آباد سے دہلی پہنچے پتا چلا کہ میرے شیخ، فضل اللہ کے باغ میں گلوں کی سیر کو گئے تھے۔ رات ہوگئی تھی اس لیے وہیں رات گزارنا طے پایا۔ ہم دونوں شیخ صالح کی خدمت میں پہنچے اور ان کی عجیب و غریب گفتگو سے لطف اندوز ہوئے۔ حضرت یوسف پیغمبر علیہ السلام کے حسن کا کچھ ذکر چھڑا وہ بولے ہر زمانے میں ہزاروں یوسف دنیا میں آتے ہیں۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ ایک دن شیخ ابوسعید اور شیخ ابوالقاسم قدس اللہ سرہٗ ''طوس'' میں یکجا ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بہت سے درویش سامنے کھڑے تھے۔ ایک درویش کے دل میں آیا کہ نجانے ان دونوں بزرگوں کا کیا مرتبہ ہے۔ شیخ ابوسعید نے ان درویش کی جانب رخ کیا اور فرمایا ''جو یہ چاہے کہ دو بادشاہوں کو ایک جگہ ایک ساتھ ایک تخت پر بیٹھا دیکھے اس سے کہہ دو کہ دیکھ لے۔ اس درویش نے جب سنا دونوں بزرگوں پر نظر ڈالی۔ حق تعالیٰ نے اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھا دیے تا کہ شیخ کی بات کی سچائی اس کے دل پر ظاہر ہو جائے اور ان کی بزرگی کو ملاحظہ کرے۔ پھر اس کے دل میں آیا کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک آج کرۂ زمین پر ان دو شیخوں سے زیادہ بزرگوار تر کوئی نہیں۔ شیخ ابوسعید نے اس کی طرف نظر اُٹھائی اور فرمایا۔ ایک چھوٹا سا ملک تھا کہ ہر روز ابوسعید اور ابوالقاسم جیسے ستّر ہزار وہاں نہ پہنچتے ہوں۔ ایک دن شیخ مودود نام کے ایک وارستہ فقیر نے جو شیخ صالح کے صحبت یافتوں میں سے تھا مجھے سنایا کہ ایک شخص نے ان کے سامنے یہ شعر پڑھا

پس از سی سال ایں معنیٰ محقق شد بخاقانی کہ یک دم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی [1]

1 تیس سال کے مجاہدے کے بعد خاقانی کو اس معنیٰ کی تحقیق ہوئی کہ ایک سانس کے لیے اللہ کے ساتھ ہونا حضرت سلیمان کی حکومت سے بڑھ کر ہے۔

شیخ صالح نے دوسرا مصرعہ یوں پڑھا۔ ''کہ یکدم خود خدا بودن بہ از ملک سلیمانی۔''
میں نے شیخ مودود سے کہا۔ اوّل سلوک ہے دوم فنا اور سوم مقام بقا۔ لیکن ہر تین واحد بھی ہیں۔ جیسا کہ میرے شیخ نے اپنے رسالے ''رموز التوحید'' میں لکھا ہے'' لا الـہ الا ھـو : لا الـہ الا انت سبحانک. انی انا اللہ لا الہ الا انا'' باقی کیا بچا۔

اُن کے محبت داروں میں ایک غریب نامراد اور آزاد مزاج شخص شیخ مراد ہیں جو ان کے قدم بقدم اور جانشین حقیقی ہیں۔ خیراتی نام کے ایک اور بزرگ تھے جو راسخ العقیدہ تھے اور میرے شیخ کے مرید شیخ معظم کے پاس رہا کرتے تھے۔ حالانکہ شیخ معظم پابند شرع اور فقیہ آدمی تھے مگر وہ ان کے برعکس تھے 1064ھ (1654) میں گزر گئے اور خواجہ بیرنگ کے آستانے والے باغ میں دفن ہوئے۔ ان کے ہندی کے بہت سے شعر بہت اچھے تھے۔ اُن کے دوستوں میں سے ایک حاجی توکل تھے، تعلقات دنیوی سے وارستہ وسکون یافتہ، آزاد و باہوش۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ حاجی توکل صاحب نے فرمایا کہ ایک بار ایام جوانی میں مغل مجھے قید کر کے ولایت (ماوراالنہر) لے گئے اور غلام بنالیا آخر جب وہاں سے چھوٹا تو حج کو گیا پھر واپس گھر آیا۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ حاجی صاحب فرماتے تھے ایک بار دہلی میں مجھے سفر کا شوق پیدا ہوا اور میں فرید آباد پہنچا۔ رات کو خواب میں خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کو دیکھا کہ تیر دکمان ہاتھ میں لیے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اگر تو دہلی سے باہر نکلا تو میں تجھے اس تیر سے مار ڈالوں گا۔ میں نے عرض کیا اچھا آپ اسی لیے تیر و کمان لگائے ہیں۔ صبح کو دیکھا تو میری رانوں میں اتنے زخم ہوگئے تھے کہ میں چلنے سے تھک گیا اور وہاں سے بذریعہ سواری دہلی واپس آ گیا۔ میرے شیخ نے یہ بھی (اسی سلسلے میں) فرمایا کہ حاجی صاحب کی عمر 90 سے آگے نکل گئی تھی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ دنیا میں کسی کا محتاج نہ ہوں۔ الحق ان کی آخری بیماری میں بھی میں نے انھیں ایسا پایا کہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ ان کا انتقال شیخ صالح سے چند سال بعد ہوا ان کی قبر بھی آپسی (میں مزاج کے) اتحاد اور یگانگی کے طفیل شیخ صالح کے پہلو میں بنی۔ میں نے حاجی صاحب کا بہت دیدار کیا ہے۔ عجیب سکون و آرام ملتا تھا۔ انھیں ایک دکاندار کے لڑکے پیرا نام سے جو کابلی دروازہ کے متصل رہتا تھا ربط باطنی ہوگیا تھا۔ اس پیرانہ سالی کے باوجود وہاں بیٹھا کرتے تھے

پیرانہ سرم عشق جوانے بسر افتاد و آں راز کہ در دل بنہفتم بدر افتاد[1]

شیخ فتح اللہ سنبھلی

آپ پڑھے لکھے تھے بڑے صاحب ذوق ووجد وسماع واحوال عظیمہ۔ آپ کی عمر بارہ سال تھی کہ ایک رات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چبوترہ پر چھپر کے سائباں کے نیچے کھڑے ہوئے ہیں بہت سے صحابہ کرام اور مشائخ وقت بھی دائیں بائیں اور رو برو باادب کھڑے ہوئے ہیں اور شیخ کبیر کلہ رواں کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ آئے تو آنحضرتؐ نے مجھ سے فرمایا فتح اللہ یہ تیرے شیخ ہیں۔ اسی خواب کی حالت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستوں کی زبان سے یہ حدیث ان کے کانوں میں پہنچ رہی تھی "من رأنی فقد راء الحق" جس نے مجھے دیکھا تو گویا اس نے حق کا دیدار کر لیا۔ انھوں نے بیدار ہو کر اپنے والد سے عرض کیا کہ مجھے سنبھل کے تمام مشائخ کا دیدار کرائیے۔ اس زمانے میں شیخ علی، شیخ محمد عاشق اور شیخ کبیر کلہ رواں وغیرہ اکابرین میں تھے۔ اِن سب کے حالات کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔ ان کے والد شیخ جیا اِن کو جن بزرگ کے پاس بھی لے جاتے وہ دیکھتے ہی دوسری جگہ کا اشارہ فرما دیتے یہاں تک کہ آخر میں شیخ کبیر کلہ رواں کے پاس پہنچے، پہنچانا اور شیخ کے پیروں میں گر گئے۔ شیخ نے فرمایا۔ فتح اللہ ہم تیرے اشتیاق میں تھے۔ خرقۂ کلاہ اور مشیخت کے دوسرے لوازم ان کے واسطے پہلے سے تیار رکھے ہوئے تھے ان کے حوالے کیے اور تربیت شروع کر دی بہت تھوڑی مدت میں ہی اس قوم صوفیہ کے علوم ان کے دل پر منکشف ہو گئے۔ وہ صوفیہ کی اصطلاح میں بات کرتے تو علما اور مشائخ سن کر حیرت زدہ رہ جاتے۔ باوجود 100 سال عمر ہونے کے اُن کا چہرہ بڑا نورانی تھا ایک بال بھی ابھی تک ریش مبارک کا سفید نہ ہوا تھا۔ لوگوں نے یہ بات بادشاہ جہانگیر کے کانوں تک پہنچا دی۔ بادشاہ نے ان کو طلب کیا اور جب دیکھا تو بڑا خوش ہوا اور کہا اے شیخ صوفیوں کی کوئی بات سنائیں، انھوں نے کہا

---

1 میں بوڑھا ہوں مگر ایک جوان کا عشق دماغ پر چھایا ہوا ہے جو راز کہ میں نے دل میں چھپایا وہ آشکارہ ہو گیا۔

آن بادشاہ اعظم در بستہ بود محکم　　پوشیدہ دلق آدم ناگاہ بردر آمد [1]

بادشاہ نے کہا کہ یہ شعر کس کی شان میں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب کے لیے زبان کھولتے سید احمد قادری اور شیخ پیر میرٹھی نے جو کہ مقربان بادشاہ تھے کہا کہ "ظل الٰہی کی شان میں ہے" بادشاہ نے کہا "نہیں۔ جو بات ہے وہ یہ خود کہیں۔" انھوں نے ظہور وحدت در کثرت پر حاوی اس حدیث "کنت کنزاً مخفیاً فا حببت ان اعرف فخلقت خلقی لاُعرف" (میں چھپا خزانہ تھا تو میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق پیدا کی تا کہ وہ مجھے پہچانے) کے ایسے حقائق غامضہ بیان کیے کہ بادشاہ اور دوسرے حاضرین مجلس نشاط میں آ گئے بادشاہ نے کہا۔ اُن کی تعریف کرنی چاہیے پھر بادشاہ نے انھیں نہایت لطف و مہربانی سے اپنے پاس بلایا، نقد انعام، زمین وغیرہ پہلے سے بڑھا کر دینے کا حکم فرمایا۔ اور باعزت رخصت کیا۔ میرے والد ان کی صحبت میں بہت زیادہ رہے ہیں۔ ان کی اس راہ کی بہت اونچی اونچی باتیں اور خوارق عادات بیان کرتے تھے۔ میں چھوٹا تھا تب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ وہ میرے پڑوسی تھے۔ مجھ پر بڑے لطف و کرم کا معاملہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک دن مجھ سے کہا۔ آج تم نے کیا سبق پڑھا ہے۔ پڑھو۔ میں نے گلستاں کے یہ دو شعر پڑھے

دلقت بچہ کار آید و تسبیح و مرقع　　خود راز عمل ہاے نکوہیدہ بری دار

حاجت بکلاہ برکی داشتنت نیست　　درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار [2]

انھوں نے اس قطعہ کے اتنے غیر متعارف معنی ولائل و دقائق کے ساتھ بیان کیے کہ انھیں سن کر سارے حاضرین مست ہو کر ذوقیہ نعرے لگانے لگے۔ ان کے حال کی تاثیر نے سب کو آ پکڑا۔ انھیں دنوں انھوں نے مجھے مشہور شاعر کا یہ شعر سنایا اور معنیٰ سمجھائے۔

سر برہنہ من نیم دارم کلاہِ چار ترک　　ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ ترکِ خویش و ترکِ ترک [3]

---

1 اُس بادشاہ حقیقی نے اپنا دروازہ محکم بند کر رکھا تھا کہ ناگاہ لباس آدم میں گھر کے دروازہ پر آ گیا۔

2 لوازم شیخی گدڑی تسبیح اور مرقع ٹوپی تیرے کیا کام آئیں گے بس خود کو ناپسندیدہ کاموں سے دور رکھ تجھے برکی ٹوپی رکھنے کی ضرورت نہیں تاتاری ٹوپی اوڑھ اور درویش صفت ہو جا۔

3 میں ننگے سر نہیں ہوں بلکہ چار قسم کی ٹوپی اوڑھے ہوئے ہوں۔ یعنی دنیا چھوڑ دی، آخرت کی فکر چھوڑ دی، خود کو بھلا دیا اور یہ مغرورانہ سوچ چھوڑ دی کہ میں نے سب کچھ چھوڑ دیا

اِس شعر کو لکھتے ہوئے مجھے سید کا یہ شعر اسی کے مناسب حال یاد آیا

بنہ بترک دو عالم کلاہ فقر بسر کزین دو ترک نمی گردد این کلاہ، تمام[1]

میرے والد فرماتے تھے کہ ایک شاعر نے سنبھل میں ایک شعر کہا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ اگر میرا معشوق اپنا نقاب الٹ دے تو سارے معشوقانِ دہلی شرم سے اپنا منہ چھپالیں۔ جب اس شعر کو شیخ فتح اللہ نے سنا تو خفا ہو کر فرمایا ''معشوقانِ دہلی تو خواجہ قطب الدین اور شیخ نظام الدین ہیں تعجب ہے کہ وہ شاعر دیوانہ کیوں نہ ہوا۔'' میرے والد فرماتے تھے کہ میں اس وقت حاضر خدمت تھا کہ اُسی وقت کسی نے خبر دی کہ وہ شاعر دیوانہ ہو گیا ہے اور اس کو پکڑے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ شیخ عبدالمومن کہتے ہیں کہ ایک بار شیخ فتح اللہ اور میں یکجا ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو وہ نمازِ تہجد میں تھے کہ ایک کالا سانپ ان کے سامنے پہنچ کر اپنا پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ جب انھوں نے نماز کا سلام پھیرا تو اس سے یوں گویا ہوئے۔ اگر ایسا ہی حکم ہے تو اپنا کام کر دیر کس بات کی ہے؟ سانپ نے یہ سنتے ہی اپنا سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ موسیٰ نام کے ایک خیاط ان کے پڑوسی تھے دیانت سے کام کرتے تھے۔ ایک دن ان کے لباس کا پارچہ کاٹا اور گھر لے گئے مگر ایک وصلہ بھول سے چھوڑ گئے۔ انھوں نے خوش طبعی کی غرض سے چھپالیا۔ موسیٰ نے آ کر ڈھونڈا نہ ملا تو موسیٰ گھبرائے انھوں نے دریافت کیا کیا ہوا؟ موسیٰ نے حقیقتِ حال بیان کی۔ انھوں نے (مسکرا کر) وہ وصلہ اور انعام میں ایک روپیہ عطا فرمایا۔ جب موسیٰ خیاط دنیا سے چلے گئے تو ایک صالح درویش نے انھیں خواب میں دیکھا کہ ان سے کہہ رہے ہیں کہ اس عالم میں حساب کر کے سترہ گز کپڑا تمام عمر کا میرے ذمے دوسروں کا نکلا ہے اس میں کپڑے کے ریزے اور تار بھی شامل کر لیے ہیں تو میرے بیٹے عیسیٰ سے کہنا کہ 17 گز کپڑا خرید کر رومال بنا کر فقرا میں تقسیم کر دے۔ عیسیٰ نے ویسا ہی کیا۔ میں اُن دنوں بچہ تھا اب سنتا ہوں کہ یہ واقعہ گزرا تھا۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے شیخ فتح اللہ کے پدر شیخ جیا کو بھی دیکھا ہے۔ با استقامت بزرگ تھے۔ اور میں نے بچپن میں نماز روزہ انھیں سے سیکھا تھا۔ ایک بار انھیں بہانے سے

---

1 دونوں عالم ترک کر کے ابھی فقر کی کلاہ سر پر نہ رکھ کہ ان دونوں کو چھوڑنے کے باوجود تیرا فقر نامکمل ہے۔ ابھی ترکِ خودی باقی ہے، ترکِ ترک باقی ہے۔

اکبرآباد میں ایک امیر کی سرائے میں لے گئے جب اندر داخل ہوئے تو مجبور کیا کہ تعویذ لکھ کر دیں کہ ہمارا آقا اپنی فلاں حرم سے محبت کرنے لگے۔ انھیں فکر ہوئی کہ کیسے خود کو اس جگہ سے رہائی دلائیں۔ یہ بات ہندی میں لکھ کر لپیٹ کر دے دی کہ اس کے گلے میں باندھ دیں۔ "جو میاں حرم سوں پیار نہ کرے تو ملّا جیا بچارہ کیا کرے" اور خود باہر آ گئے تعویذ باندھتے ہی وہ امیر اس بیوی کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ جب دوسری بیویوں نے یہ ماجرا سنا تو شور و غوغا مچا دیا اور امیر کو یہ کہہ کر مجبور کیا کہ اس ملّا نے جادو کر دیا ہے اس لیے اسے گرفتار کرنا چاہیے۔ آخر انھوں نے فقرا کے حلقے میں سے شیخ جیا کو پکڑ لیا اور امیر کے سامنے حاضر کیا ان پر سختی کی کہ ظاہر کریں کہ انھوں نے سحر کیا ہے۔ جواب میں انھوں نے کہا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے تمھاری اس بیوی کے گلے کے کاغذ میں لکھا ہوا ہے۔ جب تعویذ لائے اور کھول کر پڑھا تو حیران رہ گئے اور ان سے معذرت کی۔ قیمتی نذران کو پیش کی مگر انھوں نے قبول نہیں کی اور باہر نکل آئے۔ یہ معاملہ اس جیسا ہے کہ کہتے ہیں کہ ایک بار سلطانِ طریقت شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس سرہٗ سفر میں تھے اور بہت تیز بارش میں ایک گاؤں میں پہنچے۔ کسی نے ٹھہرنے کی جگہ نہ دی۔ اتفاق کہ شہر کے رئیس کی عورت کو دردزہ ہو رہا تھا شیخ کو بھی معلوم ہوا۔ فرمایا اگر ہمیں پناہ کے لیے جگہ دی جائے میں ایک چیز لکھ کر دوں گا جس سے دردزہ سے نجات ہو جائے گی۔ رئیس نے جگہ دے دی شیخ نے یہ بے معنی جملہ لکھ کر دے دیا "مارا جا خر مارا جازن رئیس خواہ راخواہ۔ بس اس کاغذ کا گلے میں باندھنا تھا اور لڑکے کا پیدا ہونا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ آج بھی اس کام کے لیے کارگر ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام امراض کے لیے لکھ کر دیتے ہیں مجھے بھی اس کی اجازت ہے۔ ایک دوہا مخدوم جہانیان جہاں گشت کی طرف منسوب ہے کہ بیمار کے گلے میں باندھ دینا چاہیے

جو کچھ کرے وہ کرے اور نسا نکے کوئی   جو کوئی کہے کہ مجھ کیا کہد و دبلا ہوئی

(انتقال کے وقت) شیخ جیا کی عمر 100 برس تک پہنچ گئی تھی اور شیخ فتح اللہ بھی (اپنے انتقال کے وقت) 114 سال کے ہو گئے تھے کہ ایک دن امروہہ گئے وہاں انھیں معلوم ہوا کہ مجھے اب دنیا سے جانا ہے۔ وہیں سے اپنی تجہیز و تکفین کر کے گھر واپس آئے اور بیمار پڑ گئے جب احتضار کا وقت پہنچا مولانا عیسیٰ جن کا ذکر آگے آئے گا، کہنے لگے "اے شیخ اللہ کو یاد کیجیے" آنکھ کھولی اور بولے

''اچھا ملا تو مجھے غافل سمجھ رہا ہے دیکھ میں غافل نہیں ہوں اور اس راہ (محبت الٰہی) کی خوب باتیں کیں اور ماہ ذی الحجہ 1020ھ (فروری 1612) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ باپ بیٹے کی قبریں ایک جگہ مسجد کے سامنے ہیں۔ شیخ فتح اللہ کی وفات کے بعد ایک بزرگ نے انھیں خواب میں دیکھا کہ مشائخ کا بہت بڑا مجمع نماز کی صف پر امام کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ اسی دوران وہ باشان قوی پہنچے اور امامت کی۔ ان کے بیٹے شیخ احمد اور شیخ محمد بھی نیکوں میں گزرے ہیں ان کی قبریں بھی اپنے والد کی قبر کے پائیں میں ہیں۔

شیخ حبیب اللہ وارستہ

شیخ اللہ دیا کی اولاد میں ہیں جو کہ مشائخ کبار میں سے تھے۔ وہ شیخ علم الدین کے وہ خواجہ حیدر کے وہ شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرۂ کے مرید تھے۔ شیخ اللہ دیا کی وفات 23 محرم الحرام 799ھ کو ہوئی ہے۔ شیخ حبیب اللہ صاحب ذوق وسماع تھے۔ طریقت میں راسخ اور معاملات میں مستقیم۔ ان کے سماع میں قوی تاثیر تھی۔ سماع کے وقت آیات قرآنیہ، احادیث واقوال بزرگان اور اشعار ذوقی اتنی آہستہ پڑھتے کہ نزدیک والے آسانی سے نہ سن پاتے۔ میں بھی عرس کی بعض راتوں میں ان کے ساتھ رہا ہوں ایک بار سماع کے وقت یہ آیۃ پڑھی ''وفی انفسکم افلا تبصرون'' (کیا تم اپنی ذاتوں میں غور نہیں کرتے) اور ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تو اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔) پڑھی اور یہ آیت بھی پڑھی '' اللہ جمیلٌ و یحب الجمال '' (بیشک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے) ایک رات وہ دوران سماع گشت کر رہے تھے۔ میرے شیخ اپنی عادت کے بموجب مجلس سے الگ ایک گوشے میں کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے وہ اسی جگہ پہنچے اور میرے شیخ کا ہاتھ پکڑ کر گردش کے ساتھ گھمانا شروع کیا۔ میرے شیخ نے ان سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور مجھ سے فرمایا کہ ان کا حال مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ مجھے مگر ناچنا اچھا نہیں لگا اسی لیے میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا دوسری رات بھی میں اپنے شیخ کے ساتھ تھا کہ انھوں نے سماع میں چکر کاٹنا شروع کر دیا اور بطور سابق میرے شیخ کا ہاتھ ہاتھ میں جکڑ کر گھمانا شروع کیا۔ اس مرتبہ میرے شیخ نے کچھ دیر کے لیے خود کو ان کے حوالے کر دیا۔'' ان ہی جیسے

ہو گئے اور مجھ سے کہا۔ مجھ پر ان کا حال بہت اثر کر رہا ہے۔ یہ نہایت ذوق بخش اور اصلی ہے۔ اول مرتبہ شیخ عبدالعزیز چشتی قدس سرہٗ کے عرس کے موقع پر ششم جمادی الآخر کی رات میں ان سے ملاقات ہوئی۔ دوسری مرتبہ خواجہ معین الدین کے عرس میں ششم رجب کی رات کو خواجہ قطب الدین قدس اللہ اسرارہم کے مزار پر ہوئی تھی۔ پوشیدہ نہ رہے کہ میرے شیخ نے اول بار جو اپنے آپ کو سماع سے کھینچا تو وہ اپنے طریقہ نقشبندیہ کے حفظ و رعایت کی بات تھی کیونکہ اس طریقہ علیہ کی نسبت مقامِ سماع سے درجہا بلند و بالا ہے۔ دوسری بار اپنے مشرب عارفانہ کی وسعت سے جیسا کہ وہ رکھتے ہیں کہ ہر رنگ سے حظ وافر رکھتے اور صفاتِ الٰہی کی صفت سے رنگین، محقق اور منبسط ہوتے ہیں۔ اپنی اس نسبت عالیہ سے نیچے اتر کر محظوظ اور منشرح ہوئے۔ اس طرح خواجہ بزرگ خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس اللہ سرہٗ کے قول کی حقیقت ظاہر ہو گئی جو کہ آپ نے سماع کے باب میں فرمائی ہے "نہ ایں کار می کنم نہ انکار می کنم" انتہی۔ "رشحات" میں ہے کہ خواجہ مسافر خوارزمی کہا کرتے تھے کہ میں حضرت خواجہ بہاء الدین قدس سرہٗ کی خدمت میں بہت زیادہ رہا ہوں اور آپ کی خدمت کی ہے، مجھے سماع کی جانب بہت میلان تھا ہم تمام یاران شیخ نے ایک دن طے کیا کہ قوال، اور دف اور رباب جمع کریں اور حضرت خواجہ کی مجلس میں ہی سماع میں مشغول ہوں کہ دیکھیں کیا فرماتے ہیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا گانے بجانے والے بلا لیے۔ حضرت خواجہ بھی اس مجلس میں بیٹھے رہے اور کچھ نہ بولے اور آخر میں فرمایا "نہ ایں کار می کنم نہ انکار کی کنم"[1] انتہی۔

مولانا عبدالغفور لاری نے جو کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے مخلصین میں سے تھے (قدس سرہم) نے تکملۂ حاشیہ "نفحات الانس" میں لکھا ہے کہ مولانا جامی نے چند مرتبہ سماع کیا ہے۔ دونوں جانب جسم کو حرکت دے کر ایسا غلو کیا اور اتنی دیر لگائی کہ گانے بجانے والے عاجز آ گئے مگر آپ اس حال سے باز نہ آئے۔ فقیر اس بات سے متعجب تھا کہ ایک دن آپ نے خود ہی فرمایا کہ مجھ پر ایک ایسی حالت اور کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ اس کا دفع بغیر سماع کے میسر نہ تھا۔ انتہی

ایک رات کو خواجہ ابرار، شیخ الھداد، شیخ رفیع الدین، شیخ محمد ہاشم اور شیخ ابا بکر کہ ان سب کا ذکر آ چکا ہے سب کے سب وجد و سماع میں آ گئے تھے۔ شیخ ابا بکر کے تو مسجد کے پتھروں سے ٹکرا کر اکثر

1 نہ میں یہ کام کرتا ہوں اور نہ اس سے انکار کرتا ہوں۔

اعضا مجروح ہو گئے تھے۔ اس حال اور اس کیفیت نے در و دیوار تک پر اثر کیا تھا۔ اس رات کا آخر حصہ اسی ذوق و شوق میں گزرا، میں بھی اس شب، عرسِ خواجہ بیرنگ میں حاضر تھا۔ اس وقت میری عمر 18-17 سال ہو گی مولود خواں نے یہ غزل پڑھی تھی۔

غزل

چیست می دانی صلائے چنگ و عود	انت حسبی انت کافی یا ودود
نیست در افسردگان ذوق سماع	ورنہ عالم را گرفت است این سرود
آہ ازین مطرب کہ از یک نغمہ اش	آمدہ در رقص ذرّاتِ وجود
درلباس حسن لیلی جلوہ کرد	صبر و آرام از دلِ مجنون ربود
پیش روے خود چو عذرا پردہ بست	دَرد و غم صد بر رُخِ وامق کشود
در حقیقت خود بخود می باخت عشق	وامق و عذرا بجز نامے نبود
ہست بے صورت جناب قدس ذات	لیک در ہر صورتے خود را نمود
عکس ساقی دید جامی زان فتاد	چون صراحی پیش جام اندر سجود [1]

نقل ہے کہ ایک دن شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ ایک کوچے سے گزرے تو دیکھا کہ بہت سے بچے سماع کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ آپ سواری سے اُترے اور باادب کھڑے ہو گئے۔'' میں نے جوانی کے دنوں میں سنبھل میں مانکی نام کے ایک مفلوک مفلوج گونگے بوڑھے کو دیکھا ہے۔ میرے والد فرماتے تھے کہ اس کی شہزادہ دانیال کی مجلس میں راہ و رسم تھی۔ نقالی اور ہزل گوئی میں

1 تجھے کچھ پتا ہے چنگ و عود نے کیا کہا۔'' انت حسبی انت کافی یا ودود (اے ودود، تو ہی میرا کارساز ہے تو ہی تنہا میرے لیے کافی ہے) افسردہ دلوں کو سماع کا ذوق نہیں حالانکہ سارے عالم کو اس سماع نے قید کر رکھا ہے۔ آہ اس مطرب کا کیا کہنا جس کے ایک نغمے سے وجود کے ذرّات رقص میں آ گئے ہیں۔ حسن لیلیٰ کے لباس میں جلوہ فرما ہوا اور مجنون کے دل کا صبر و قرار لے گیا۔ جب عذرا نے اپنے رخ پر نقاب ڈالی۔ وامق کے چہرے پر سیکڑوں درد و غم بکھر گئے'' حقیقت میں وہ ذات خود ہی عاشق خود ہی معشوق تھی۔ وامق اور عذرا بجز نام کچھ نہ تھے۔ ذات اقدس اگر چہ صورت سے منزہ ہے لیکن ہر صورت میں خود کو ظاہر بھی کیا ہے۔ جامی نے جب جام میں ساقی کا عکس دیکھا تو جیسے صراحی کے آگے جام گر پڑتا ہے ساقی کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔''

ممتاز تھا۔ ایک دن شہزادے نے اس سے کہا کہ صوفیوں کے سماع کا بہروپ بھر۔ اسی محفل میں گانے والے کچھ گا رہے تھے، اس نے (صوفیوں کی نقل اتارتے ہوئے) ایک نعرہ مارا اور گر گیا۔ مگر وہ فی الفور مفلوج اور گونگا ہو گیا۔ روایت ہے کہ ایک دن ایک مست فقیر نے بھنے ہوئے چنے کے چند دانے ان شیخ حبیب کو دیے کہ لے کھا۔ رمضان کا مہینہ تھا مگر انھوں نے بے تامل کھا لیے لیکن وقت افطار تک اور کچھ نہ کھایا، نہ پیا۔ مریدوں نے دریافت کیا ''اے شیخ یہ کیا تھا جو آپ نے کیا؟'' فرمایا ''میں نے صرف اس نیت سے کھالیا کہ اس درویش کا دل خوش ہو، میں ساٹھ روزے بطور کفارہ رکھ لوں گا۔ پھر انھوں نے وہ ساٹھ روزے رکھے بھی۔ وہ میرے والد کے بڑے دوست تھے، جب میں نے انھیں اوّل مرتبہ دیکھا تھا اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ بڑے وجیہ تھے اور دلکش بھی۔ مجھ پر بہت لطف و مہربانی فرماتے تھے۔ جب میں نے انھیں پہچان لیا تو بہت زیادہ ان کے دیدار سے محظوظ ہونے لگا۔ ان کی وفات 1040ھ (1631) میں ہوئی۔ میں ان کے بیٹے شیخ نور سے بھی آشنا ہوں۔ نیک سیرت اور احوال میں اپنے پدر کے قدموں پر چلنے والے۔ میرے شیخ کے نیاز مند اور صادق الاخلاص تھے۔ باوجود فربہ بدن ہونے کے لمبی لمبی نماز بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اس راہ کا درد اور محبت ان میں صاف دکھائی دیتی تھی۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ حضرت شبلی سے لوگوں نے کہا کہ ہم تمھیں ہٹا کٹا دیکھتے ہیں مگر وہ محبت تو جس کے تم دعوے کرتے ہو، لاغری کا تقاضہ کرتی ہے۔ انھوں نے فرمایا ''احب قلبی و ما دری بدنی و لو دری بدنی ما اقام فی السمن''[1] شیخ نور کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی ہے۔ دونوں باپ بیٹے کی قبریں اسی قصبے میں ہیں۔

شیخ عبدالوہاب لونی

شیخ عبدالعزیز چشتی کے مرید ہیں۔ صاحب وجد و سماع و حال تھے۔ طریقت میں بھی خوب تھے۔ سماع سے اس قدر شغف تھا کہ اگر کہیں سے نغمے کی آواز آجاتی بے قابو ہو جاتے۔ وہ ذوقیات کا ایسی لطافت اور صرافت کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے کہ سننے والوں پر اثر پڑتا۔ میرے شیخ انھیں صادقین میں شمار کرتے ہیں انھیں بھی میرے شیخ سے اعتقاد و اخلاص راسخ تھا۔ جب وہ 84 سال

1 میرا قلب محبت کرتا ہے مگر میرے بدن کو اس کی خبر نہیں۔ اگر میرا بدن بھی محبت کو جانتا تو کبھی موٹا نہ ہوتا۔

کے تھے اور میں نوجوان تھا اس وقت ان کے سامنے ''دیوان حافظ'' پڑھا کرتا تھا۔ وہ فرمایا کرتے کہ میں بچپن سے ہی خواجہ شیراز کا معتقد ہوں۔ جب بھی ان کے کسی شعر کے معنی جسے میں حل کرنا چاہتا تھا حل نہ ہوتے رات کو خواجہ کی روحانیت سے طالب مدد ہوتا خواب کے اندر ہی سب کچھ حل ہو جاتا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں، میں بادشاہ کے مقربین میں شامل تھا۔ ایک دن دوران سفر مرض تپ محرق (وہ تپ جس میں بہت گرمی اور جلن ہوتی ہے) میں مبتلا ہو گیا۔ دوسرے دن کوچ تھا۔ دوستوں نے میرا علاج قند اور گلاب کے شربت سے کرنا تجویز کیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ ''دیوان حافظ'' میں جو نکل آئے گا میں وہ کروں گا جب اسے کھولا تو یہ شعر نکل کر آیا

تنت بناز طبیبان نیاز مند مباد　　وجود نازکت آزردۂ گزند مباد

شفا ز گفتہ شکر فشان حافظ جوی　　کہ حاجتت بعلاج گلاب و قند مباد[1]

یہ پڑھ کر میں نے علاج کا ارادہ ترک کر دیا ''دیوان حافظ'' کو بغل میں لیا اور سو گیا مجھے بہت پسینہ آیا اور ٹھیک ہو گیا۔ انتہیٰ۔ ایک دن وہ کھانا تناول کر رہے تھے اور میں ان کے پاس ہی تھا کہ ناگاہ کسی گانے والے نے کچھ پڑھا۔ انھیں سخت وجد آیا اور بے ہوش ہو گئے جب ہوش میں آئے تو میں نے دریافت کیا اے شیخ یہ کیفیتِ وجد و حال آپ کو کہاں سے پہنچی ہے اور کس کی صحبت میں حاصل ہوئی ہے؟ کہنے لگے جب میں بادشاہی مقربین میں تھا تو میرا راج گڑھ جانا ہوا۔ مجھے پتا لگا کہ یہاں شیخ فتح اللہ نام کے ایک صاحب احوال و کرامات بزرگ رہتے ہیں۔ بوقتِ سماع جب کوئی دردمند اپنے مطلب کو دل میں لا کر ان کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کا جواب وہ (ایسے) اشارے اور ایما سے دیتے ہیں کہ اس کو اطمینان خاطر ہو جاتا ہے۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا دیکھا کہ سماع میں ہیں میں نے دل میں خیال کیا کہ وہ میرے معاملے میں نظر کریں اور غیر اللہ سے جو بے جا تعلق خاطر ہے مجھے اس سے خلاصی ہو جائے۔ میں مجلس کے ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ مطلب دل میں حاضر کیا۔ معاً وہ گشت لگاتے ہوئے میرے پاس آئے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور آہستہ سے میرے کان میں کہا کہ ''ہاں اے نوجوان! عاشق کو چھ ماہ تو اس سے

1　خدا کرے تیرا جسم طبیبوں کے ناز کا نیاز مند نہ بنے، تیرا نازک وجود، کسی مصیبت سے آزردہ نہ ہو۔ حافظ کے شکر بکھیرنے والے کلام سے شفا حاصل کر، تا کہ تجھے گلاب، قند کے علاج کی ضرورت نہ رہے۔

شناسائی کو چاہئیں ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک لمحے کی نظر سے کام بن جائے اور تعلق محبت غیر جاتی رہے ۔ پھر ایک نظر ایسی مجھ پر ڈالی کہ مجھے مجھ سے چھین لے گئے ۔ کافی دیر تک میں گرا پڑا رہا ۔ آج 60 سال سے زیادہ ہوگئے کہ وہ ذوق اور وہ حال میرے شامل حال ہے ۔

شیخ فتح اللہ کی وفات کا سال 1030 ھ (1621) ہے اور قبر راج گڑھ میں ہے ۔ شیخ عبدالوہاب کا انتقال بھی 1030 ھ (1621) میں ہی ہوا مگر وہ دفن لونی میں ہیں ۔ ان کا ملفوظ ہے کہ شیخ فتح اللہ اکابر صوفیہ میں سے تھے ۔ وسیع لطیف مشرب والے، پیوستہ، مشغول و مستغرقِ سماع رہتے ۔ جب تک گھر میں رہتے کنیزوں کے گانے سے شغف رکھتے ۔ جب چاہتے کہ باہر جائیں تو کنیزیں گاتی ہوئیں گھر سے باہر پہنچا دیتیں اور وہاں سے دوسرے گانے والے انھیں اسی وقت ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ۔ ان کا مشغلۂ شب و روز سرود و سماع تھا ۔ ہمیشہ حالت بسط میں رہتے تھے ۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ شیخ فتح اللہ کو اپنی کنیز سے محبت تھی ۔ ایک بار اپنے شیخ زادے سے ملاقات کے لیے دوسرے شہر گئے اور ان کے کہنے سے سر منڈوالیا ۔ ان کی بیوی نے موقع پا کر اس کنیز کا سر مونڈ دیا ۔ جب وہ گھر واپس آئے کسی سے دریافت کیا کہ وہ کنیز کہاں ہے؟ جواب دیا کہ خاتون خانہ نے اس کا سر تراش دیا ہے ۔ اب وہ شرم کے مارے گھر میں چھپی ہوئی ہے یہ بات سن کر فوراً اندر پہنچے اور اس کنیز کے روبرو ہو کر کہا کہ میرا سر میرے مالک نے مونڈ دیا اور تیرا تیری مالکہ نے اب ہم دونوں یک رنگ ہوگئے اور فارغ البال

سر تراشیدہ فارغ البال است

شعر

ہر کہ او ہمرنگ یار خویش نیست   عشق او جز رنگ بوی بیش نیست [1]

یعنی وہ عاشق صادق نہیں بلکہ عارضی حسن ظاہر کا عاشق ہے

انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ شیخ نے بارہا فرمایا کہ میرے بیٹے فاضل علوم ہوگئے اور معزز درگاہ بادشاہ بھی بن گئے افسوس میں نے کسی مالدار کو نہیں سنا کہ کسی کا عاشق ہوا ہو اور گلی کوچے میں خراب و رسوا چکر لگائے ہوں ۔ میرے شیخ کا فرمانا ہے کہ ایک موقع پر شیخ فتح اللہ کی لاہور کے بازار میں شیخ حسین سے جو کہ خود ایک با معنیٰ مجذوب تھے ملاقات ہوگئی ۔ شیخ حسین نے دریافت کیا "فتح اللہ

---

1   جو کوئی اپنے محبوب کا ہم رنگ نہیں ہوا اس کا عشق رنگ و بو سے آگے نہیں گیا ۔

کے تھے اور میں نو جوان تھا اس وقت ان کے سامنے ''دیوان حافظ'' پڑھا کرتا تھا۔ وہ فرمایا کرتے کہ میں بچپن سے ہی خواجہ شیراز کا معتقد ہوں۔ جب بھی ان کے کسی شعر کے معنی جسے میں حل کرنا چاہتا تھا حل نہ ہوتے رات کو خواجہ کی روحانیت سے طالب مدد ہوتا خواب کے اندر ہی سب کچھ حل ہو جاتا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں، میں بادشاہ کے مقربین میں شامل تھا۔ ایک دن دوران سفر مرض تپ محرق (جوتی جس میں بہت گرمی اور جلن ہوتی ہے) میں مبتلا ہو گیا۔ دوسرے دن کوچ تھا۔ دوستوں نے میرا علاج قند اور گلاب کے شربت سے کرنا تجویز کیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ ''دیوان حافظ'' میں جو نکل آئے گا میں وہ کروں گا جب اسے کھولا تو یہ شعر نکل کر آیا

تنت بناز طبیبان نیاز مند مباد   وجود نازکت آزردۂ گزند مباد
شفا ز گفتہ شکّر فشانِ حافظ جوی   کہ حاجتت بعلاج گلاب و قند مباد [1]

یہ پڑھ کر میں نے علاج کا ارادہ ترک کر دیا ''دیوان حافظ'' کو بغل میں لیا اور سو گیا مجھے بہت پسینہ آیا اور ٹھیک ہو گیا۔ انتہیٰ۔ ایک دن وہ کھانا تناول کر رہے تھے اور میں ان کے پاس ہی تھا کہ ناگاہ کسی گانے والے نے کچھ پڑھا۔ انھیں سخت وجد آیا اور بے ہوش ہو گئے جب ہوش میں آئے تو میں نے دریافت کیا اے شیخ یہ کیفیتِ وجد و حال آپ کو کہاں سے پہنچی ہے اور کس کی صحبت میں حاصل ہوئی ہے؟ کہنے لگے جب میں بادشاہی مقربین میں تھا تو میرا راج گڑھ جانا ہوا۔ مجھے پتا لگا کہ یہاں شیخ فتح اللہ نام کے ایک صاحب احوال و کرامات بزرگ رہتے ہیں۔ بوقتِ سماع جب کوئی دردمند اپنے مطلب کو دل میں لا کر ان کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کا جواب وہ (ایسے) اشارے اور ایما سے دیتے ہیں کہ اس کو اطمینان خاطر ہو جاتا ہے۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا دیکھا کہ سماع میں ہیں میں نے دل میں خیال کیا کہ وہ میرے معاملے میں نظر کریں اور غیر اللہ سے جو بے جا تعلق خاطر ہے مجھے اس سے خلاصی ہو جائے۔ میں مجلس کے ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ مطلب دل میں حاضر کیا۔ معاً وہ گشت لگاتے ہوئے میرے پاس آئے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور آہستہ سے میرے کان میں کہا کہ ''ہاں اے نو جوان! عاشق کو چھ ماہ تو اس سے

---

1   خدا کرے تیرا جسم طبیبوں کے ناز کا نیاز مند نہ بنے، تیرا نازک وجود، کسی مصیبت سے آزردہ نہ ہو۔ حافظ کے شکّر بکھیرنے والے کلام سے شفا حاصل کر، تا کہ تجھے گلاب، قند کے علاج کی ضرورت نہ رہے۔

شناسائی کو چاہئیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک لمحے کی نظر سے کام بن جائے اور تعلق محبت غیر جاتی رہے۔ پھر ایک نظر ایسی مجھ پر ڈالی کہ مجھے مجھ سے چھین لے گئے۔ کافی دیر تک میں گرا پڑا رہا۔ آج 60 سال سے زیادہ ہوگئے کہ وہ ذوق اور وہ حال میرے شامل حال ہے۔

شیخ فتح اللہ کی وفات کا سال 1030ھ (1621) ہے اور قبر راج گڑھ میں ہے۔ شیخ عبدالوہاب کا انتقال بھی 1030ھ (1621) میں ہی ہوا مگر وہ دفن لونی میں ہیں۔ ان کا ملفوظ ہے کہ شیخ فتح اللہ اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ وسیع لطیف مشرب والے، پیوستہ، مشغول و مستغرقِ سماع رہتے۔ جب تک گھر میں رہتے کنیزوں کے گانے سے شغف رکھتے۔ جب چاہتے کہ باہر جائیں تو کنیزیں گاتی ہوئیں گھر سے باہر پہنچا دیتیں اور وہاں سے دوسرے گانے والے انھیں اسی وقت ہاتھوں ہاتھ لے لیتے۔ ان کا مشغلۂ شب و روز سرود و سماع تھا۔ ہمیشہ حالت بسط میں رہتے تھے۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ شیخ فتح اللہ کو اپنی کنیز سے محبت تھی۔ ایک بار اپنے شیخ زادے سے ملاقات کے لیے دوسرے شہر گئے اور ان کے کہنے سے سر منڈوالیا۔ ان کی بیوی نے موقع پا کر اس کنیز کا سر مونڈ دیا۔ جب وہ گھر واپس آئے کسی سے دریافت کیا کہ وہ کنیز کہاں ہے؟ جواب دیا کہ خاتون خانہ نے اس کا سر تراش دیا ہے۔ اب وہ شرم کے مارے گھر میں چھپی ہوئی ہے یہ بات سن کر فوراً اندر پہنچے اور اس کنیز کے روبرو ہوکر کہا کہ میرا سر میرے مالک نے مونڈ دیا اور تیرا تیری مالکہ نے اب ہم دونوں یک رنگ ہوگئے اور فارغ البال

سر تراشیدہ فارغ البال است

شعر

ہر کہ او ہمرنگ یار خویش نیست عشق او جز رنگ بوی بیش نیست[1]

یعنی وہ عاشق صادق نہیں بلکہ عارضی حسن ظاہر کا عاشق ہے

انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ شیخ نے بارہا فرمایا کہ میرے بیٹے فاضل علوم ہوگئے اور معزز درگاہ بادشاہ بھی بن گئے افسوس میں نے کسی مالدار کو نہیں سنا کہ کسی کا عاشق ہوا ہو اور گلی کوچے میں خراب و رسوا چکر لگائے ہوں۔ میرے شیخ کا فرمانا ہے کہ ایک موقع پر شیخ فتح اللہ کی لاہور کے بازار میں شیخ حسین سے جو کہ خود ایک بامعنیٰ مجذوب تھے ملاقات ہوگئی۔ شیخ حسین نے دریافت کیا "فتح اللہ

---

1 جو کوئی اپنے محبوب کا ہم رنگ نہیں ہوا اس کا عشق رنگ و بو سے آگے نہیں گیا۔

رقاص تو ہی ہے" بولے" جی ہاں" کہا اچھا تھوڑا رقص کر، تا کہ میں تماشا کروں انھوں نے مطربوں کو جو کہ ہمراہ تھے اشارہ کیا جب وہ ترنگ میں آ گئے تو خود سماع میں آ گئے (یعنی رقص کرنے لگے) اسی اثناء میں شیخ حسین کو بھی ذوق ہوا۔ دونوں رقصاں اور مستی سے لبریز تھے۔ بڑی پُر رونق مجلس بازار میں ہی ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ ایک بار مخدوم الملک سے شیخ حسین کو ملاقات کا اتفاق ہوا۔ مخدوم الملک اہل شریعت تھے چاہا کہ ان سے مسائل دینی پوچھیں تا کہ لاجواب ہونے پر انھیں تنبیہ کریں۔ پوچھا "مسلمانی کے ارکان کیا ہیں؟ انھوں نے جواب دیا" ایک" مخدوم الملک نے کہا" چار کہاں گئے" وہ بولے" دو، حج و زکوٰۃ تو تو کھا گیا۔ اور دو، روزہ و نماز میں کھا گیا" بس ایک کلمہ بچا اسے تو بھی پڑھتا ہے میں بھی پڑھتا ہوں۔" پھر مخدوم الملک اپنی راہ چلے گئے اور وہ اپنی راہ چل دیے۔ میں نے مادھو آزاد (از قید شرع) کو جو کہ شیخ حسین کا مقبول اور معشوق تھا بسنت کے موقع پر عرس کے زمانے میں جو کہ خوشی کا اجتماع تھا ان کی قبر پر دیکھا ہے۔ عجب آرام و سکون قلب رکھتا تھا۔

ایک بار اور بھی میں اس سے ملا، میری خوب خیر و عافیت پوچھی۔ شیخ عبدالوہاب کہتے تھے کہ ایک بار میں نے اپنے چچا سے جو کہ اہل دنیا تھے اور بادشاہوں کے مقربین حضرات کے معزز تھے کہا کہ مجھے تان سین[1] کا گانا سننے کی تمنا ہے۔ وہ مجھے تان سین کے پاس لے گئے اور اظہار مطلب کیا۔ اس نے کہا آج رات میں نے شیخ سعدی کے شعر کے موافق ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ نرمی اور مدارات کے باب میں ایک دھرپد باندھی ہے۔ یہ کہہ کر گانے لگا ایسی دلکش اور روح بخش آواز میں کہ میں نے ایسی آواز عمر بھر نہ سنی تھی۔ وہ دھرپد یہ ہے

شیسہ جان جان جب میں دیکھی دے سارنگ پان
بالائیں کے سکھی سہیلی سنی منی پہچان
موہن روپ موہنی داری کرت ناہین کچھ کان
تا ن سین پربھو درست انندین ہوت درس سکھ ہان

---

1 ترلوچن داس ابن مکرند پانڈے ذات کے برہمن تھے۔ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری کی دعا سے 938ھ/1532 میں پیدا ہوئے فن موسیقی میں کمال رکھتے تھے۔ 998ھ/26 اپریل 1589 میں انتقال کیا۔ اور حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری کے پائین مزار دفن ہوئے۔ (بحوالہ تزک جہانگیری)۔

وہ شعر یہ ہے

ازان گہ کہ یارم کسے خویش خواند   دگر با کسے آشنائی نماند [1]

میں ذوق اور غلبۂ سماع سے لبریز تھا بے اختیار گانے لگا۔ سب سے پہلے میں نے یہ شعر پڑھا

بحقش کہ تا حق جمالم نمود   دگر ہر چہ دیدم خیالم نمود [2]

اہل مجلس بہت خوش ہوئے اور تان سین اور بھی زیادہ خوش ہوا میری دل جوئی کی اور خوب تعریف کی۔ اسی دوران ایک خشک مُلّا اندر داخل ہوا اور بیٹھ گیا۔ تان سین نے معلوم کیا کہ آپ کہاں سے آئے؟ اور کیا نام رکھتے ہیں؟ کہا میں فلاں جگہ کا ہوں اور عبدالغفور میرا نام ہے حرف ''ع'' کے مخرج کو قرأت شدید کے ساتھ ادا کیا اور حرف ''ف'' کو واؤ کے ساتھ منہ بھر کر۔ تان سین بولا۔ بہت خوب بھائی اگر کوئی تیرے نام کو بجھی ہوئی آگ پر کہہ دے تو آگ جل اُٹھے۔ اس لطیفے سے سارے اہل مجلس قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اور لطف اندوز ہوئے۔ روایت ہے کہ ایک دن اکبر بادشاہ نے حاضرین سے دریافت کیا کہ ہندو جو پوجا کے وقت گھنٹی بجاتے ہیں یہ کیا ہے؟ کسی نے جواب نہ دیا۔ تان سین نے کہا۔ اس کا جواب میرے دل میں یہ آیا ہے۔

کس ندانست کہ منزل گہ معشوق کجا است   این قدر ہست کہ بس بانگ جرس می آید [3]

بادشاہ اور حاضرین اس بات سے خوش ہوگئے اور اس کی فہم پر آفریں کی۔

شیخ سراج الدین لونی

آپ شیخ قطب عالم بن شیخ عبدالعزیز چشتی کے مرید ہیں اور شیخ شرف الدین خاموش کے پوتے ہیں۔ آپ صاحب وجد و سماع، فقر اور طریق توکل میں مستقیم الحال گذرے ہیں۔ سماع کے اوقات

---

1 جب سے دوست نے مجھے اپنا کہہ کر پکارا ہے تب سے میری کسی سے آشنائی نہ رہی۔

2 اللہ کی قسم جب سے حق تعالیٰ نے مجھے (اپنا) جمال دکھایا ہے اس کے سوا جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہم و خیال لگتا ہے۔

3 یہ شعر حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ معشوق کی منزل کہاں ہے بس اتنا معلوم ہے کہ گھنٹے کی آواز آ رہی ہے۔

میں سخت چیخیں مارتے اور بہت زیادہ روتے تھے۔ بے نغمہ وسرود بھی اگر کوئی ذوقی اشعار پڑھتا آپ نعرے لگاتے اور گر پڑتے اور وجد میں آجاتے۔ ہمیشہ شیخ عبدالعزیز کے رسالے ''عزیزیہ'' میں لکھے ہوئے اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ میرے شیخ ان کو اپنے دور کے نیک اور سچے لوگوں میں کہتے اور دوست اور مخلص سمجھتے تھے۔ ان کی میرے والد سے بہت دوستی تھی اور ہمیشہ متبرک دن مثل ایام رمضان، عاشورہ اور عرفے کو میرے والد کے ساتھ گزارتے۔ میں انھیں بچپن سے جانتا ہوں۔ میں نو سالہ تھا جب انھوں نے مجھے نماز، اس کے احکام کے ساتھ سکھائی ان کی علمی و عملی صلاحیت سے مجھے وافر حصہ ملا۔ میں نے ان سے ''نزہت الارواح'' اور غنیۃ (غنیۃ الطالبین) وغیرہ کے چند سبق پڑھے ہیں۔ جس وقت میں نزہتہ کے اسباق ان سے پڑھ رہا تھا وہ بڑی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ حقائق و معارف کی باتوں پر نعرہ مارتے اور بے ہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔ ایک دن یہ بیت زیر تذکرہ تھی

عجب حال این باس را است بنگر بصحرا وزد، گر ز خانہ برآور [1]

(سنتے ہی) وہ مکان بلند سے اس طرح زمین پر گرے کہ میں سمجھا کہ جان نکل گئی مگر وہ خود بخود اُٹھے اور پھر وجد و سماع میں آگئے۔ ایک بار وہ سنبھل میں شیخ عبدالرحمٰن کے پاس آئے۔ گانے والوں نے گانا شروع کیا وہ سماع میں آگئے۔ اور دیر تک روتے رہے۔ دوران وجد ہی ان کی دستار کھل کر زمین پر گر گئی۔ دو روپے جو کہ انھیں فتوح ہوئی تھی دستار سے نکل کر زمین پر گرے۔ شیخ نے ان کو اٹھالیا اور اپنے پاس رکھ لیا جب انھیں افاقہ ہوا تو شیخ نے یہ مشہور مصرعہ بطور ظرافت پڑھا۔

غم مخور شیخا کہ من برداشتم [2]

کیونکہ جب انھیں پتا چلا تھا کہ دستار گم ہو گئی تو رونا شروع کر دیا تھا۔ میری ایک بوڑھی غصیلی دایہ تھی جس نے بچپن سے مجھے پالا تھا۔ اس کی مجھ سے محبت کی وجہ سے میرے قبیلے کا ہر فرد ہمیشہ اس سے محبت کرتا تھا اور ہر ایک اس کی ہر کڑوی کسیلی بھی برداشت کرتا تھا۔ ایک دن میرے والد نے شیخ سراج سے کہا۔ شیخ اس دایہ کو مرید کر لیں اور اس کو نصیحت فرمائیں کہ خود سے غصہ نکال دے۔ اور جو

---

1 دیکھو تو اس خوشبو کا عجب حال ہے کہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو صحرا میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

2 اے شیخ غم نہ کر میں نے اٹھالیا تھا۔

بھی تجھ سے درشتی کرے اسے برداشت کر' بولے ''اچھا'' پھر دایہ کو مرید ہونے کی ترغیب دی۔ مرید کرنے کے بعد جب شیخ سراج نے شجرہ اور دامنی اس کے سپرد کیے تو مذکورہ بالا وصیت بھی کی۔ اس نے شجرہ اور دامنی کو ہاتھ میں اُٹھا کر کہا کہ اے شیخ یہ شجرہ دامنی واپس لے لیں۔ مجھ میں اتنی برداشت نہیں ہے کہ لوگوں کی درشتی برداشت کروں اور غصہ نہ آئے حاضرین ہنس پڑے، شیخ تو اتنے ہنسے کہ حد ہوگئی۔ ایک دن راہ میں جہاں ایک چور کی لاش دار پر لٹک رہی تھی کھڑے ہوئے چور کے پاؤں چومے اور کہا۔ تیری ہمت اور جوانمردی پر رحمت ہو کہ جس راہ میں قدم رکھا اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ غلبۂ طلب کے بارے میں خواجہ حافظ شیرازی یہ اشارہ فرماتے ہیں کہ

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید　　　یا تن رَسَد بجاناں یا جان زتن بر آید[1]

اُن کے دادا شیخ شرف الدین کو خاموش اس لیے کہتے ہیں کہ وہ شیخ عبدالعزیز چشتی کے مرید تھے۔ اگرچہ صاحب احوال نیک تھے لیکن بولنے میں غلو کرتے تھے اور بحث کیا کرتے تھے۔ ایک دن شیخ عبدالعزیز نے اُن سے کہا۔ شرف الدین خاموش۔ اس کے بعد آخر عمر تک کہ سالوں جئے علاوہ نماز جہر اور تلاوت قرآن پاک کوئی بات نہ کرتے تھے۔ میرے والد فرماتے تھے کہ قصبہ گڑھ مکتیسر میں ایک مجذوب تھے بات بالکل نہ کرتے تھے۔ ہندستانی زبان میں انھیں موتی کہتے تھے۔ ان کا وطن اصلی ماوراء النہر تھا۔ وہ جہاں بھی رہتے اپنی مرضی سے ہاتھ بھی نہ ہلاتے اگر لوگ کچھ دے دیتے لے لیتے۔ جب لوگ کھلاتے کھا لیتے بچے کبھی انھیں گرم ریت میں دبا دیتے۔ جب تک نہ نکالا جاتا اپنے آپ نہ نکلتے۔ ایک بار بچوں نے انھیں لے جا کر ایک کانٹے دار درخت میں اُن کے سر کے بال الجھا دیے۔ تین دن رات وہاں کھڑے رہے اس کے بعد لوگوں نے انھیں چھڑایا۔ ایک دن ایک ظالم حاکم نے انھیں ڈانٹا اور پیٹا کہ بول۔ نہ بولے۔ اس کے بعد ایک سکہ آگ میں گرم کر کے ان کی ران پر رکھ دیا وہ ران جلا کر ان کی ہڈی تک پہنچ گیا۔ کچھ نہ بولے نہ ہی ماتھے پر کوئی شکن لائے۔ وہ ظالم انھیں دنوں بال بچوں سمیت بہت سی بلاؤں میں مبتلا ہو گیا اور پھر مر گیا۔ جب بھی کوئی ان مجذوب کے سامنے آتا اس کے چہرے پر ان کے جمال باطنی کا عکس پڑ کر

1　جب تک میرا کام نہ بن جائے میں دست طلب کوتاہ نہ کروں گا۔ یا تو میں محبوب تک پہنچ جاؤں یا جسم سے جان ہی نکل جائے۔

رنگ نشاط آجاتا تھا۔ جو کام انھوں نے باختیار خود کیا وہ یہ ہے کہ ناگاہ دریائے گنگا میں گھسے، ڈوبے اور چل بسے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ میرے شیخ کا کہنا ہے ایک دن میں نے ایک مجذوب مستہلک کو دیکھا کہ بالکل اپنے اختیار سے گزر گئے تھے۔ ان کے خادم انھیں پکڑ کر لاتے اور جہاں بٹھاتے بیٹھ جاتے۔ میں نے ان کے ابتدائے حال کے بارے میں دریافت کیا تو ان کے خدام بولے۔ ایک بار ایک صاحب دل مجذوب متھرا آئے۔ یہ اور ایک دوسرا شخص ان کی خدمت میں لگ گئے اور مدتوں ان کی اطاعت میں لگے رہے۔ ایک رات وہ منبسط الحال تھے۔ کہا تم دونوں کے دل میں جو بھی خواہش ہو مجھ سے کہو۔ اس آدمی نے کہا مجھے دنیا کی آرزو ہے۔ انھوں نے ہاتھ کی مٹھی باندھ کر پھر کھولی اور کہا "دے دی" اور ایسا ہی ہوگیا۔ انھوں نے کہا مجھے اللہ مل جائے وہ خلوت میں لے جا کر ان پر متوجہ ہوئے۔ یہاں تک کہ یہ حالت جو آپ دیکھتے ہیں پیش آئی۔ آج چودہ سال ہوگئے جب کھلاتے ہیں کھاتے ہیں جب لے جاتے ہیں جاتے ہیں جب سلاتے ہیں سوتے ہیں۔ بچپن میں میرے والد مجھے ایک صاحب حال درویش کے پاس لے گئے۔ انھیں شیخ چپ کہتے تھے۔ وہ بھی خاموش رہا کرتے۔ ضروری گفتگو کو بھی بہت آہستہ کرتے تھے اور بہت نرمی کے ساتھ۔ وہ خوش پوش چند صاحب زکوٰۃ امیر لوگوں کے پاس بڑے آرام اور جمعیت تام کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے دل میں سوچا اولیا سابقین ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ انھوں نے اک نظر لطف و کرم مجھ پر ڈالی۔ لوگ ان کی بہت سی کرامتیں بیان کرتے ہیں۔ جب شیخ سراج الدین کا انتقال کا وقت نزدیک ہوا تو ایک دن اپنے بڑے بیٹے شیخ قیام الدین سے کہنا شروع کیا کہ اب میری زندگی کے 15 دن سے زیادہ باقی نہیں رہے تو کسی بھی حال کہیں مت جانا کہ تیرا درمیانہ بھائی قطب الدین بھی حاضر نہیں ہے۔ چھوٹا بھائی رفیع الدین ابھی بہت چھوٹا ہے۔ آخر اسی مدت کے اندر ایک رات ان کا وقت رخصت نزدیک آگیا۔ وضو کیا، تہجد پڑھی، سورۂ یٰسین پڑھی اور چل دیے۔ 22/صفر 1055ھ (18/اپریل 1645) کو۔ میں سراج الدین نام کے تین لوگوں کو اور جانتا ہوں۔ ان میں سے دو شخص تو صاحب معنی وارستہ اور آزاد مزاج تھے۔ دونوں پوربی علاقے کے تھے۔ ایک کا تو 1060ھ (1650) میں انتقال ہو چکا۔ دوسرے صاحب کی خواجہ بادشاہ کے باغ کے کنارے بیٹھک بنی ہوئی ہے۔ سید ہیں۔ عالی ہمت، صاحب اخلاق

عظیمہ واستقامت۔ تیسرے سراج الدین گجراتی ہیں صاحب علم وعمل اور نیک معاملہ ہیں۔ اور شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں ہیں۔ ان تینوں کا میں نے بارہا دیدار کیا ہے (یعنی ملاقات کی ہے) میرے شیخ کے مخلص اور نیاز مندوں میں سے ہیں۔ مجھ پر نظر لطف وعنایت رکھتے ہیں۔

شیخ مہر علی نیشاپوری

وہ بہت بزرگ ہیں۔ دوران سماع ان کو وجد و حال اور مستی کی کیفیت پیش آتی اور بہت دیر تک طاری رہتی۔ وہ مالدار آدمی تھے۔ جب اپنے وطن مالوف سے ہندوستان کے سفر کا عزم کیا تو راستے میں شکار کرتے ہوئے آ رہے تھے کہ ایک دن وہ شکار میں تھے۔ ڈاکو ان کا تمام سامان لوٹ کر لے گئے۔ 1050ھ میں تمام جھنجھٹوں سے آزاد مراد آباد آئے اور کئی سال وہاں قیام کیا۔ کیا ہی ولولہ اور شورش عشق الٰہی سر میں رکھتے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ ایک دن نغمے کی آواز سے وجد میں آ گئے۔ مستی بڑھی اور دریا میں گر پڑے اور میلوں پانی میں غوطے کھاتے بہتے رہے۔ تین دن کے بعد لوگوں نے آپ کو صحرا میں دیکھا کہ مستانہ وار گھوم رہے ہیں۔ چار پائی پر باندھ کر لائے۔ تین دن بے خبر اور مست و بے خود رہے

اے خوشا حالت آن مست کہ درپاے حریف   سر و دستار نداند کہ کدام اندازد [1]

جب انھیں افاقہ ہوتا۔ قضا نمازوں کو ادا کیا کرتے اور شریعت کا کوئی بھی دقیقہ نہ چھوڑتے تھے۔ نقل ہے کہ خواجہ بایزید بسطامی قدس سرہٗ پر حالت سکر و مستی غالب رہتی تھی جیسا کہ کشفِ صوفیہ میں مذکور ہے مگر جیسے ہی ہوش میں آتے دریافت فرماتے کہ کتنی نمازیں قضا ہوئیں سب کو ادا فرماتے۔ ایک مرتبہ یہی مہر علی جامع مسجد مراد آباد کے ایک کونے میں چلے میں بیٹھ گئے۔ اپنے ہمراہ پانی کے دو کوزے رکھ لیے وہ بھی اس لیے کہ مستی میں مجروح شدہ اعضا کو دھولیں کہ ان سے خون نکل آتا تھا اور اس کوزے کو مٹی سے بند کر لیا اور کوئی روشن دان بھی نہ چھوڑا۔ وہ وہاں بغیر کوئی نغمہ سنے وجد کرتے پھر جو ہوتا ہوتا

---

1 اس مست کی کیا ہی خوب مستی کی حالت ہے جس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ محبوب کے قدموں میں سر ڈالوں کہ دستار۔

مگس پیش شوریدہ سر پر نزد　　کہ او چون مگس دست بر سر نزد [1]

مستی کی حالت میں ہی عیدالفطر کے دن باہر نکلے عیدگاہ گئے دوگانہ ادا کیا اور واپس لوٹے (اور پھر چلّے میں چلے گئے) میں نے شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے عرس میں ایک درویش کو دیکھا کہ کئی گنی قدآدم بلندی سے مسجد کے پتھر کے فرش پر (حالت مستی میں) گر گیا لوگ سمجھے کہ مر گیا لیکن وہ خود فوراً اٹھا اور وجد کرنے لگا۔ میں نے شیخ مہر علی سے مرادآباد میں بہت مرتبہ ملاقات کی ہے۔ ان کے پاس ایک عراقی گھوڑا تھا۔ کوئی شخص اس کا دانہ پانی کرتا تھا۔ انھیں کوئی خیر خبر اس کی نہ رہتی۔ ایک دن میں نے ان کی فارغ البالی اور گھوڑے کی نگہداشت کی کیفیت رستم خاں دکنی سے جا کر کہی کہ میں ان کی فوج میں لشکری تھا۔ خان نے ان کے گھوڑے اور خدمت گار کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ مجھے بہت دوست رکھتے تھے۔ اپنے عجیب و غریب احوال کی باتیں سناتے۔ بعد میں مجھے علم نہیں کہ وہ مرادآباد سے کہاں چلے گئے۔

سید غلام محمد نانوتہ

آپ صاحب ذوق و وجد تھے۔ آپ کا سماع بھی نہایت موزوں اور دلکش تھا۔ چند قوالوں کو مع ساز کے اپنے پاس رکھتے تھے ایک رباب، ایک دفاف، تیسرا چھوٹا نقارہ کمر میں باندھے اور چوتھا سارنگی نواز۔ کبھی صرف مذکورہ سازوں کی آواز پر ہی سماع کرتے تھے اور کبھی گانے جیسے کہ دھمال کے شعر ہوں۔ جیسے کہ امیر خسرو کی کسی غزل کے اشعار

سانگر لہور نگر متوانی کھتائی　　ہیوں نو تری اتھان کجر د ہر جائی
بابل بجن چلت نہمہ ٹونت بہی کن دور　　کجاوہ کونان پتھود کی پی سہ نہور
دے دیکھ بالم دے گئے ندی کنار کنار　　آپن پار نرکھی ہم چھاوے در وار
کانت کنبل کورا موروں تو نروار　　تو نل بالم بس گئے ہیں کیوں نگری پکار
بن بالمون کے سنسرا تو سر برو بچاک　　تور پھول مور جوتیا ایکو کاج نلاگ

1　کسی شوریدہ سر کے سامنے کبھی ایسا نہ ہوا کہ شہد کی مکھی نے پر پھڑپھڑائے ہوں اور اس نے اسی کی طرح مستی میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر نہ پیٹا ہو۔

ہری پوت کی ہروانوہ تورون چمکائے　　نین مور ہیرا روندہر موری کہاں سمائے
ہری مان تم بتری کنک بیدن توہ　　پہو مانس پچھیریں بہو وا بیل اور ہوہ
جوری پھلی تو سارس اور پکھیرد کالے　　چکنہ تو پیکر مرن تو اب کے نہائے
اوپر پھولی اُرّہر تر پھولی کیار　　تہہ موری ہیرا رچھے موری وے تر وار
گوری بیٹھی پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس　　چل کھسرو گھر آپنے سانجھ پری سبہ دیس

ایک دن میں نانوتہ پہنچا سنا کہ مجلس برپا ہے۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ سید غلام محمد وجد میں ہیں اور ان کے سماع کی تاثیر اور گریہ کے غلبے سے سارے اہل مجلس جو قریب سو کے ہوں گے رو رہے تھے۔ ان سو میں سے ایک میں بھی تھا اور ان کے بھائی سید صابر علی کہ ادیب اور فضلائے وقت میں سے تھے ان کو گود میں تھامے ہوئے نعرے لگا رہے تھے دونوں ایسے رو رہے تھے کہ ان کے گلے میں سانس رک جاتا تھا۔ اس دن کی یہ صحبت بڑی قیمتی گذری۔ آخر سید غلام محمد ایک دن شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرۂ کے روضے پر بابا فرید الدین گنج شکر کے عرس میں 1030ھ (1620) میں سرگرم سماع تھے کہ ہچکیاں بھریں اور لمحے بھر میں دنیا سے چلے گئے۔ امیر خسرو دہلوی کے اس شعر پر علی احمد ابن شیخ حسین نخشبی دہلوی کی سماع کے اندر دنیا سے چلے جانے کی حکایت مشہور ہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن بہت سے مسلمان خواجہ قطب الدین کے عرس میں جارہے تھے اور سارے ہنود کالکا مندر کی طرف جارہے تھے۔ شیخ نظام الدین نے دونوں قوم کے لوگوں کو دیکھ کر فی البدیہہ فرمایا (اور از سرِ ذوق ٹوپی کو سر پر گھما رہے تھے)

''ہر قوم راست راہے، دینے وقبلہ گاہے''[1]

میر خسرو حاضر تھے۔ اس غلبۂ شوق و محبت میں سرشار جو انھیں اپنے پیر سے تھی یہ دوسرا مصرعہ پڑھا

''من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے''[2]

ملا علی احمد کی تاریخ وفات میں مولانا حسن کشمیری نے کہا ہے۔

اے حسن یاد کن ز پنجۂ مرگ　　زانکہ پنجاہ شمر دہ ام سالت

1　ہر قوم کی جدا راہ، اور ہر ایک کا دین اور قبلہ ہے۔
2　میں نے ٹیڑھی ٹوپی والے کی سمت کو اپنا قبلہ مان لیا ہے۔

فکر آن کن کہ زود از زود — این جمیع می رسد ز ہم سالت

این ببین آن ہمہ کجا رفتند — پدر و مادر و عم و خالت

بہ یقین دان کہ دشمنان تواند — زن و فرزند وخانہ و مالت

نادر عصر خود علی احمد — کہ نظیرے نداشت در حالت

رفت در حالت سماع نازان — ہیچ دیگر نگشت احوالت

سال تاریخ از عرب جستم — قال لی مات هو فی الحالت [1]

''نفحات الانس'' میں لکھا ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ ذوالنون مصری، شبلی، خراز دینوری، اور دراج سب کے سب نے سماع میں انتقال کیا ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ان میں سے تین شخص تو تین دن جئے پھر چلے گئے۔

ان کے علاوہ اور بھی لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے سماع میں جان دے دی۔ بڑے بڑے مشائخ اور مریدوں نے حالت سماع میں جان دی ہے گو وہ سماع قرآن ہو یا سماع غیر قرآن۔ زرارہ بن اُبی قاضی بصرہ محراب مسجد میں کھڑے قرآن پڑھ رہے تھے کہ کسی نے پڑھا ''فاذا نقر فی الناقور'' (جب ناقور پھونکا جائے گا) انھوں نے ایک نعرہ مارا، گرے اور مر گئے۔ شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے فرمایا۔ سماع جو دیدار الٰہی میں مددگار ہو یہ ہے کہ جس کی ذات وصفات کا ذکر کان میں پڑتا ہے آنکھ بھی اسی کے ساتھ ہو جاتی ہے ایسے میں طاقت و ہوش کی کہاں گنجائش ہے۔ صاحبِ ''کشف المحجوب'' کہتے ہیں کہ میں نے ایک درویش دیکھا جو آذر بائیجان کے پہاڑوں میں جار ہا تھا اور یہ اشعار پڑھ رہا تھا۔

---

1 اے حسن پنجۂ مرگ کو یاد کر کیوں کہ تیری عمر پچاس برس میں نے شمار کی ہے۔ اس کی فکر کر کیونکہ جلد ہی جلد تیرے ہم عمر چلے جا رہے ہیں۔ یہ غور کر کہ تیرے ماں باپ چچا ماموں کہاں چلے گئے۔ یقین جان لے کہ تیری بیوی بچے گھر دولت سب تیرے دشمن ہیں۔ سید علی احمد جو کہ اپنے زمانے میں نادرالوقت تھے اور حالتِ ذوق و وجد میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ حالت سماع میں خوشی خوشی دنیا سے رخصت ہوئے ان کا حال بالکل دگرگوں نہ ہوا۔ جب میں نے عربی میں ان کی تاریخ وفات تلاش کی تو ''قال لی مات هو فی الحالت'' (وہ مجھ پر مر مٹا اس حال میں کہ وہ حالت وجد میں تھا) کہی۔

واللہِ مَا طَلَعَتِ الشَّمسُ و وَلَا غربَت	آلا و انت فی قلبی و وسواسی
ولا جَلَسْتُ الاَقوام اُحدثُ هم	الا و انت جلیسی بین جلّاسی
ولا یتنفست محزوناً ولا فرحاً	الا و ذکرک مقرو ناً بانفاسی
ولا هممت بشرب الماء من عطش	الا رایت خیالاً منک فی الکاسی[1]

سید اخلاص فرید آبادی

آپ سید شریف بخاری کے پوتے بخاری الاصل سید ہیں۔ اور سید غلام محمد کے اقربا میں سے ہیں۔ ۱۳ سال کی عمر میں ہندستان آئے اور دہلی میں پلے بڑھے۔ نہایت نرم دل، چشم گریاں بزرگ تھے۔ آپ بہت سے مشائخ سے ملے اور صحبت اُٹھائی۔ میرے شیخ کے آشناؤں میں سے تھے۔ میرے شیخ اُن کو نیکوں میں سے فرماتے ہیں۔ آخر فرید آباد دہلی میں سکونت اختیار کی۔ ان کے بعض رشتے دار دہلی میں رہتے تھے۔ ان کی عمر تقریباً سو سال کی ہوگئی تھی جب 1050ھ (1640) میں دنیا سے گئے۔ قبر فرید آباد میں ہے۔ میں نے ان کی بہت صحبت اُٹھائی ہے اور ان کی شوق آمیز اور دردانگیز باتوں سے محظوظ ہوا ہوں۔ جیسا کہ محمد صادق کے ذکر میں گذرا، جس وقت محمد فاضل مرزا باقی کے چچیرے بھائی کا انتقال ہوگیا تو ان کی جدائی سے دل میں ایسا اندوہ پیدا ہوا کہ سخت قبض کی حالت طاری ہوگئی۔ ایک دن میں نہایت پریشان خاطر تھا تو میر سید اخلاص نے میرے سامنے ایک حکایت سنائی جس سے غم کچھ غلط ہوا اور ایک قسم کا صبر حاصل ہوگیا۔ وہ حکایت یہ ہے کہ دو شخص سلطان سکندر ذوالقرنین کے سامنے اپنا ایک جھگڑا لے گئے اور فیصلہ چاہا۔ ایک کہتا تھا کہ تقدیر بدل جاتی ہے۔ دوسرا کہتا تھا کہ جو تقدیر میں ہے ہرگز نہیں ٹلتا۔ سلطان نے کہا کل تمھارے جواب دیں گے۔ یہ کہا اور چھت کے اوپر چلا گیا۔ تنہا سوچنے لگا کہ اس بات کا کیا جواب ہو۔ اسی اثنا میں

1 خدا کی قسم سورج نہیں نکلتا اور نہ چھپتا ہے، مگر تو اور تیرا خیال میرے دل میں ہوتا ہے۔ میں لوگوں میں نہیں بیٹھتا اور نہ ہی گفتگو کرتا ہوں، مگر آپ ہی سارے اہل مجلس میں میرے جلیس ہوتے ہیں۔ میں غم اور خوشی میں کوئی سانس نہیں لیتا، مگر آپ کا ذکر میری سانسوں کے قرین ہوتا ہے۔ میں کبھی پیاس سے پانی پینے کا ارادہ نہیں کرتا، مگر تیرے تصور کو پیالے میں دیکھتا ہوں۔

ایک بہت بڑا رنگین جانور اس چھت کی دیوار پر جس پر وہ بیٹھے تھے آ کر بیٹھ گیا۔ سلطان کو اچھا لگا
اٹھے اور جانور کے دونوں پیر پکڑ لیے اور اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ جانور ان سے قوی تر تھا فوراً اُڑ گیا۔
سلطان اس کے پیر بھی نہ چھوڑ سکے اور اسی کے ساتھ اڑ گئے۔ چلتے چلتے دریا کے درمیان میں ایک
جزیرے میں آ کر اترے۔ پرندے نے سلطان کو وہاں چھوڑا اور اڑ گیا۔ دیکھا کہ ایک بہت محکم نیا بنا
ہوا قلعہ ہے اس کا ایک چھوٹا سا دروازہ ہے لوہے کا جو اندر سے بند ہے، تالا پڑا ہوا ہے۔ پہلے سلطان
نے چند آوازیں دیں کہ کوئی اندر سے کھول دے جب دروازہ نہ کھلا پتھر سے اسے کوٹنا شروع کر دیا تو
ایک بوڑھے کی آواز آئی تو کون ہے؟ سلطان نے سوچا اگر میں سچ کہتا ہوں یقین نہیں کرے گا اور
دروازہ نہ کھولے گا۔ کہا کہ میں تاجر ہوں اور میری کشتی تباہ ہوگئی ہے۔ سب مال و متاع، عیال و
اطفال غرق ہوگئے۔ بس میں تنہا زندہ بچا ہوں۔ خدا کے لیے دروازہ کھول دیں۔ بوڑھے نے کھولا،
اندر لے لیا اور پھر بند کر دیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ ایک نوجوان محسن و جمال اس جگہ بیٹھا ہے اور ایک
بوڑھی دایا اس کے پاس ہے۔ وہ بوڑھا اس کا استاد تھا۔ وہ ایک خربوزہ لے کر آیا۔ تینوں نے کھانا
شروع کیا اور دایا سے کہا کہ کھانا تیار کر لے۔ معلم پھر اٹھ کر گیا تا کہ اور زیادہ میٹھا خربوزہ لے کر
آئے۔ اس دوران سلطان نے چھری کی نوک سے اٹھا کر خربوزہ کی قاشیں اس نوجوان کو کھلانی
شروع کیں ناگاہ اچانک نوجوان کو چھینک آئی اور چھری اس کے منہ میں داخل ہوگئی وہ فوراً ڈھیر ہوگیا
سلطان خوف سے بھاگا۔ جب معلم واپس آیا اور یہ حال دیکھا تو سلطان کے پیچھے دوڑا اور بولا اے
شخص خدا کے لیے ٹھہر جا اور اس نوجوان کے مرنے کی حقیقت بیان کر۔ سلطان نے جو کہ سچی بات
تھی کہہ دی۔ معلم نے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے آیئے اور غم نہ کیجیے۔ سلطان نے پوچھا کہ یہ قلعہ کیسا
ہے بتایئے؟ معلم نے کہا کہ فلاں بادشاہ جو اس جزیرے میں سکونت پذیر ہے اس کے بڑی تمناؤں
کے بعد یہ لڑکا پیدا ہوا۔ منجمون نے کہا یہ لڑکا فلاں سال میں سلطان سکندر کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔
چند سال ہوئے یہ قلعہ دریا کے درمیان بنایا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کی خوراک پوشاک ایک سال
سے زیادہ کے لیے کشتیوں میں بھر کر لائی گئی اور یہاں جمع کی۔ مجھ معلم اور اس دایا کو اس کے ساتھ
رکھ چھوڑا ہے۔ آخر وہی ہوا جو تقدیر میں تھا۔ سلطان اس قلعۂ دریا سے نکل کر پھر دریا کے کنارے پہنچا
دیکھا کہ وہی جانور بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تدبیر الٰہی کو سمجھ گئے اور اس جانور کے دونوں پیر کس کر پکڑ لیے۔

وہ اُڑا اور پھر اسی چھت کی دیوار پر پہنچا دیا۔ سلطان کو ان دونوں آدمیوں کا جواب اچھی طرح حل ہوگیا تھا۔ دوسرے دن اُن دونوں شخصوں سے کہا کہ جو تقدیر میں ہے نہیں بدلتا۔ ''نفحات الانس'' میں لکھتے ہیں کہ شیخ فخرالدین عراقی نے اپنی وفات کے دن اپنے بیٹے کبیرالدین اور اپنے اصحاب کو بلا کر نصیحتیں فرمائیں وداع کیا اور یہ رباعی پڑھی

در سابقہ چون قرار عالم دادند — مانا کہ نہ بر مراد دلم دادند
زان قاعدۂ و قرار کان روز افتاد — نے بیش بکس وعدہ و نہ کم دادند [1]

میں بچہ تھا جب میں یہ دیکھتا تھا کہ شیخ بدرالدین لونی جو صاحب درد و معنی شخص تھے ہندی کا یہ شعر پڑھتے اور روتے تھے

چوپائی

اب کیا ہوئیں ہمارے روئیں — کھیت نپاے بن بیج بوئیں [2]

ایک دن میں، میرا اخلاص کے ساتھ فرید آباد سے دہلی آرہا تھا۔ وہ راستے بھر اپنی جوانی کے اپنے اور دوسروں کے عشق کے قصے سناتے رہے۔ منجملہ ان کے ایک بہت پیاری حکایت بیان کی کہ ''پوربی شہروں میں سے ایک شہر کے بت خانے میں ایک ترک جوان ایک ہندو عورت کے جمال کا شیفتہ ہوگیا اور اس کے پیچھے لگ گیا۔ عورت تنگ دل ہوگئی اور بولی ''ترک باوڑ وبھیو ہے'' اس کی یہ بات جوان کے دل میں گھر کر گئی پاگل ہوگیا۔ اسے یہ بھی ڈر نہ رہا کہ یہ عورت کون ہے اور میں کہاں ہوں۔ کپڑے پھاڑے خاک بدن پر ملی اور بت خانے کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ اس سے کوئی کچھ بھی پوچھتا وہ بس یہی کہتا ''ترک باوڑ وبھیو ہے'' اس جملے کے علاوہ اس کا دل ہر بات سے پاک صاف ہوگیا۔ اس عورت کو بھی جذبۂ عشق نے نحیف و نزار کر دیا۔ اپنے گھر کی ایک کوٹھری میں اپنے عاشق کے عشق میں ڈوبی رہتی کہ پھر ایک سال بعد اسی نوروز کو (میلے میں) رسمِ قدیم کے مطابق ہندو مرد اور عورتیں مندر میں آنے لگیں۔ عورت کے صبر کا پیالہ بھر چکا تھا۔ اس

1 سب سے پہلے جب عالم کو بنایا تو اگر چہ ہماری مرضی کے موافق کاروبارِ عالم نہیں رکھا مگر روزِ ازل میں جس سے جیسا وعدہ کیا گیا تھا اس سے نہ کم دیا نہ زیادہ۔

2 اب ہمارے رونے سے کیا ہوگا۔ بغیر بیج بوئے کھیتی نہیں اُگتی۔

جوان کی محبت میں مستانہ اور دیوانہ وار گھر سے نکلی۔ جب آنکھیں دوچار ہوئیں دونوں نے چند نعرے لگائے، آہیں بھریں، ہم آغوش ہوئے اور ایک لمحے میں جان دے دی۔ لوگ جمع ہو کر آئے اور چاہا کہ لاش کو جلائیں اس شہر کے حاکم نے جو کہ مسلمان تھا جلانے نہ دیا اور دونوں کو دو برابر قبروں میں دفن کر دیا۔ آدھی رات کو تمام ہندوؤں نے چھپ کر عورت کی قبر آ کھودی تا کہ چھپ کر جلا دیں۔ اسے قبر میں نہ پایا۔ بڑی حیرت میں پڑ گئے۔ ایک نے کہا مسلمان کی قبر بھی کھودو۔ جب کھودی تو دیکھا کہ دونوں ہم آغوش سوئے ہوئے ہیں اور بھی حیرت زدہ ہوئے اور اسی جگہ مٹی بھر کر چھوڑ دیا۔ مجھے تین اور دلچسپ حکایتیں یاد آئیں۔ ایک تو عشق کے باب سے ہے، دوسری اور قسم کی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ ایک بزرگ شیخ خضر دہلوی نے جو کہ صالح اور غریب شخص ہیں فرمایا کہ میں نے لاہور کے بازار میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت نحیف و نزار، زرد رنگ، درد بھرے لہجے میں کہے جا رہا ہے۔ "اے خدا دکھا دے، اے خدا دکھا دے۔" میں نے پوچھا تیرا کیا حال ہے؟ بولا۔ کچھ نہیں۔ جب میں نے دوبارہ پوچھا تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے لگ گیا جب اس نے دیکھا کہ میں ٹلنے والا نہیں تو بولا۔ کیا چاہتا ہے۔ میں نے کہا اپنے احوال بیان کر۔ بولا۔ مجھے چھوڑ دے، کچھ مت پوچھ کہ تو میرا یقین نہیں کرے گا۔ میں نے کہا۔ "حسبنا اللہ" تو کہہ تو۔ پھر وہ مجھے ایک کونے میں لے گیا اور بیٹھ گیا تو وہ یوں گویا ہوا سنیے میں ایک تاجر کا بیٹا ہوں۔ فلاں سال اور فلاں بندرگاہ سے کشتی میں اپنے تمام قبیلے کو بٹھا کر بہت مال و اسباب لے کر چلا چاہتا تھا کہ فلاں مقام پر پہنچوں اور خرید و فروخت کروں ناگاہ کشتی ٹوٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ میں تنہا ایک تختے کو تھامے ہوئے چند دن رات میں ایک جزیرے میں جا پڑا۔ طاقت جواب دے گئی تھی۔ گرتا پڑتا آگے بڑھا۔ گھاس اور پیڑوں کے پتوں سے پیٹ بھرتا رہا۔ ایک باغ نظر آیا جو رنگ برنگ کے میووں سے بھرا تھا۔ جو میرے ہاتھ آئے میں نے کھائے اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک صاف ستھرا چمکدار محل ہے میں اس میں داخل ہو گیا۔ دیکھا کہ ایک چودھویں کے چاند جیسی چودہ سالہ لڑکی زرد چہرہ اور کمزور بدن، تخت پر بیٹھی ہے۔ جب مجھے دیکھا ایک آہ کھینچی اور بولی اے جوان تو کہاں سے آیا ہے اور اپنے آپ کو کیوں برباد کر رہا ہے میں نے معلوم کیا کیا بات ہے؟ بولی۔ اس باغ اور محل کا مالک ایک طاقتور دیو ہے کہ ہزاروں کشتی والوں کو مار کر دریا میں ڈال

چکا ہے۔ مدت ہوئی کہ ایک تباہ شدہ کشتی سے مجھے پکڑ لایا اور میرے تمام قبیلے کو مار دیا اور مجھے اس جگہ تنہا چھوڑ، میرے لیے، خود روزانہ کسی جگہ جاتا ہے اور کھانے پینے کی نفیس چیزیں لاتا ہے اور میرے سامنے لا رکھتا ہے میں جان کے ڈر سے اس سے نباہ کرتی ہوں۔ اس نے مجھ سے عشق صرف کلام اور دیکھنے تک محدود رکھا ہے میری جان پر بنی ہے مگر کیا چارۂ کار ہے۔ وہ ابھی حال میں تجھے مارے گا اگر کچھ کر سکتا ہو تو کر۔ میں نے کہا میرا سارا قبیلہ اس دریا میں غرق ہو گیا ہے۔ بس میں ہی بچا ہوں۔ میں اس سے مقابلہ اور جنگ کروں گا اگر میں نے اس کو مار ڈالا تو مقصد حاصل ہے ہی اور اگر اس نے مجھے مار ڈالا تو کیا حیرت کی بات ہے۔ یہ وقت غنیمت سمجھتا ہوں کہ تجھ جیسی پری زاد کے دیدار سے اپنا دیدۂ و دل روشن کروں۔ اسی اثنا میں وہ دیو آ پہنچا۔ میں نے ہتھیار سنبھالے کہ اس محل میں کھانے پینے کی تمام چیزیں، پھل لباس اور اسلحہ وغیرہ مہیا تھا۔ میں باہر آیا اسم اعظم جو اپنے استاد (پیر) سے سیکھا تھا پڑھا اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی کہ وہ دیو باہیبت و مہابت میرے قریب آ پہنچا میں پیش دستی کر کے اس سے لپٹ گیا کبھی وہ اوپر کبھی میں اوپر یہاں تک کہ میں نے اسے ایک تدبیر سے مار ڈالا جلا دیا اور اس کی راکھ ہوا میں اُڑا دی اور میں اس پری پیکر کے پاس آ بیٹھا۔ نکاح پڑھا اور کشمکش کے اندیشے سے چھوٹ گیا اور فراغ دل سے اس کے عشق میں لگ گیا اور سلطان وقت کی مانند ہو گیا

بفراغ دل زمانے نظرے بہ خوبروئے　　بہ از آنکہ چتر شاہی ہمہ عمر ہائے ہوئے[1]

مجھے چھ ماہ تک پتا ہی نہیں چلا کہ چھ مہینے کیسے گزر گئے۔ میں نے اس کی مدد سے لکڑی اور تختے جمع کیے۔ مضبوط رسیوں سے ایک بیڑا بنایا اور دریا کے کنارے مضبوط کھونٹا گاڑ کر باندھ دیا۔ پھر چھ مہینے اور آرام سے گزارنے کے بعد ہم دونوں وہاں آئے کہ دونوں اس بیڑے پر سوار ہو کر دریا میں چلتے رہیں ہو سکتا ہے ہمیں کہیں آبادی نظر آ جائے اور وہاں جا بسیں۔ کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرا سامانِ ضرورت اس پر لاد لیا۔ میں پہلے بیڑے پر چڑھا کہ بیٹھنے کی جگہ بنا لوں وہ کنارے پر منتظر کھڑی تھی۔ تقدیرِ الٰہی ناگاہ ایک موج سخت اس بیڑے سے جسے میں نے دریا میں ڈال رکھا تھا آ کر ٹکرائی۔ اسے اتنا بھی موقع نہیں ملا کہ بیڑے کی رسی ٹوٹنے سے پہلے سوار ہو جاتی۔ میں اس

1　دلی یکسوئی کے ساتھ ذرا سی دیر کے لیے کسی خوبرو کا نظارہ شاہی تاج و تخت اور تمام عمر کی ہائے ہو سے بہتر ہے

سے بھی زیادہ حیران اور گھبرا گیا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ عقل نے کام ہی نہ
کیا کہ میں بیڑے سے دریا میں کود جاؤں۔ بیڑا بہت تیزی سے دریا میں بہنے لگا۔ اس کی تصویر
کے رفتہ رفتہ دھندھلے ہوتے نقوش دیکھتے دیکھتے حیران و پریشان میں آخر گر پڑا پھر مجھے پتا نہ چلا
کہ میرا کیا ہوا اور اس پر کیا گزری۔ یہ کیا ہو گیا۔ کچھ دن بعد میں کنارے لگا۔ سر پر خاک ڈالتا تھا۔
کئی بار کشتی میں بیٹھ کر جا بجا بندرگاہوں پر آیا گیا لیکن اس جگہ کا کوئی نشان نہ ملا۔ آہ آہ اسے کیا پیش
آیا ہوگا۔ شیخ خضر کہتے ہیں کہ جب اس نے بات یہاں تک پہنچائی اس کا سانس رکنے لگا گلا رندھ
گیا اور "اے اللہ دکھا دے، اے اللہ دیکھا دے" کہتا ہوا اٹھا اور ایک سمت کو چلا گیا۔ اور میں روتا
روتا تھک گیا۔ جب شیخ خضر نے بات پوری کی تمام حاضرین اور میرا روتے روتے برا حال ہو گیا۔
دوسری حکایت یہ ہے کہ۔ 1037ھ (1627) میں، میں نے شیخ مصطفیٰ نام کے ایک شخص کو دیکھا
جو بہت لطیف اور نورانی صورت تھا۔ اس کو جہاں گیر بادشاہ کے سامنے لے گئے کہ وہ عورت سے
مرد بنا ہے۔ وہ قصہ یہ تھا کہ وہ عورت پوربی علاقے کے ایک دیہات میں رہتی تھی۔ ایک بار وہ سحر
کے وقت غسل کرنے کے لیے اس ندی پر آئی جو کہ گاؤں سے نیچے بہتی تھی۔ ناگاہ ایک آدمی لباس
فاخرہ پہنے ندی کے کنارے پہنچا اور پوچھا کہ تو کون ہے؟ عورت نے جواب دیا۔ آدمی۔ ایسا
جواب اس نے اس لیے دیا تا کہ وہ مرد اسے کچھ نہ کہے۔ وہ مرد خضر علیہ السلام تھے انھوں نے دعا
دی۔ تو مرد ہی بن جائے۔ وہ فوراً مرد بن گئی اور حیرت میں پڑ گئی آخر گھر آئی اور اس کا قصہ مشہور
ہو گیا۔ ایک عورت سے نکاح کیا اور اولاد حاصل کی۔ وہ کہتا تھا کہ اس مردانگی کی حالت سے وہ پہلی
حالت زیادہ سکون بخش تھی۔ تیسری حکایت یہ ہے جو کہ میں نے سید پیر محمد سرسوی جو کہ ایک راست
گو اور عقلمند شخص ہیں اور سید قطب الدین سے جن کا ذکر گزر چکا اور دوسرے معتبر لوگوں سے جو کہ کوہ
کمایوں کے دامن (کشمیر) میں آمد و رفت رکھتے ہیں، سنی ہے۔ کہ جنگل کے کسی قریبی علاقے
میں کئی سال کے بعد ایک عورت غصے میں بھری ہوئی آتی ہے اور فوراً صورت بدل کر شیرنی بن جاتی
ہے پھر جنگل میں چلی جاتی ہے۔ بچوں اور شوہر جسے بھی پاتی ہے مار ڈالتی ہے۔ مگر نہ تو اپنے دیور کو
مارتی ہے اور نہ ہی اپنے بھائی کو۔ اس کے عورت سے شیر بننے کی صورت میں سر کے بال اور ایک
اور چیز ویسے ہی رہتی ہے۔ اس کو وہاں کی زبان میں رونگی کہتے ہیں۔ جب کافی مدت گزر چکتی ہے

اس کا غصہ اتر جاتا ہے۔ وہی دونوں شخص (اس کا) بھائی اور دیور ایک اور پٹّا لے کر آتے ہیں اور بڑے منہ کے برتن میں شراب بھر کر رکھ دیتے ہیں اور بکری کا ایک بچہ لے کر شیرنی کی گپھا میں چھوڑ دیتے ہیں اور خود نزدیک ہی ایک درخت پر چڑھ جاتے ہیں کہ وہ آتی ہے اور شراب پی کر بزّہ کو مار کر مست ہو کر سو جاتی ہے پھر اس پتے کو اس کی ناک میں داخل کر دیتے ہیں جیسے ہی اس کی بو، اس (کے دماغ) کے حاسۂ شامہ میں پہنچتی ہے۔ آنکھ کھولتی ہے اور بے چینی کے ساتھ زمین میں لوٹتی ہے یہاں تک کہ اپنی اصلی صورت میں آجاتی ہے۔ وہ دونوں شخص وہ کپڑے جو ان کے پاس ہوتے ہیں اُسے پہنا دیتے ہیں گھر لے جاتے ہیں (اور کسی شخص سے اس کا نکاح کر دیتے ہیں) مشعور نام کے ایک شخص نے اس کی تبدیلیِ حالت اور کیفیت کے بارے میں اس سے معلوم کیا۔ تو بولی۔ فلاں بیل اور فلاں شخص کے گوشت کی لذّت نہیں بھولی جاتی (اور کئی سال بعد وہاں کے ایک خاص درخت کا پتہ مہیا کر کے اسے اچھی طرح چبا کر کھا جاتی ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے) واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ پوشیدہ نہ رہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس دنیا میں عجائب وغرائب پیدا فرمائے ہیں کہ انسانی عقلیں ان کے ادراک سے بھی عاجز ہیں۔ جیسا کہ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ موسیٰ شیخ، کا دن رات میں ستر ہزار قرآن ختم کرنے کا معمول تھا۔ شیخ عمادالدین محمد بن شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔ پہلے سے میں نے یہ بات سن رکھی تھی اور میرے دل میں اس واقعے سے کلی طور پر انکار تھا۔ کہ ایک بار میں نے شیخ موسیٰ کو طواف میں دیکھا اور ان کے پیچھے لگ گیا دیکھا کہ انھوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس کے بعد سورۂ فاتحہ سے کلام پاک کی تلاوت کرنی شروع کی اور طواف میں جیسا کہ معمول ہے درمیانی چال سے تلاوت کرتے ہوئے چلنے لگے۔ تلاوت بھی ایسی کہ ایک ایک لفظ میں سمجھ رہا تھا۔ جب ہم دونوں پہلے طواف میں حجر اسود کے قریب چار قدم کی مقدار کے برابر یا کچھ کم وبیش بڑھے ہوں گے انھوں نے ایک قرآن ختم کر لیا تھا اس طرح کہ میں ان کے تمام قرآن کی تلاوت کو شروع سے آخر تک حرف بہ حرف سن رہا تھا۔ انتہیٰ۔ میرے والد اور ان کے دوسرے دوست اصحاب نے بھی اس کی تصدیق کی جو کچھ انھوں نے فرمایا قبول کر لیا۔ بعد میں میں نے اس کی حقیقت والد سے دریافت کی تو فرمایا۔ یہ بسط زمان کی قبیل سے ہے۔ جو کہ بعض اولیاء اللہ کے لیے واقع ہوتا ہے، ''نفحات الانس'' میں یہ بھی

روایت ہے کہ صاحب "فتوحات" نے ذکر کیا ہے کہ ایک جوہری شخص نے اپنی حکایت بیان کی وہ کچھ خمیری آٹا لے کر اپنے گھر سے قرن کے لیے چلا تا کہ روٹی لگوا لائے۔ اس کو غسل کی حاجت تھی۔ جب دریائے نیل کے کنارے پہنچا۔ دریا میں گیا تا کہ غسل کرے اس کو غیبت لاحق ہوگئی۔ اور جیسے کہ کوئی خواب دیکھتا ہے دیکھنے لگا کہ وہ بغداد میں ہے۔ وہاں شادی کی اور چھ سال کی مدت اپنی بیوی کے ساتھ (سکون وچین سے) گزاری۔ اس کے اولاد ہوئی ہوش میں آگیا خود کو پانی میں دیکھا غسل کیا کپڑے پہنے اور قرن چلا گیا روٹی لے کر گھر آیا اور اپنی بیوی سے یہ واقعہ سنایا۔ جب (اس واقعے کو) کئی مہینے گزر گئے وہ عورت بغداد سے آئی اور اپنے بیٹوں کو بھی ہمراہ لائی اور جوہری کا گھر دریافت کیا۔

جب دونوں کی ملاقات ہوئی جوہری نے خاتون اور بچوں کو پہچان لیا۔ اس عورت سے لوگوں نے دریافت کیا تیری شادی کو کتنے سال ہوگئے ہیں بولی۔ چھ سال۔ انتہیٰ
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکایت مشہور ہے سوار ہوتے وقت ایک رکاب میں پیر رکھنے کے بعد دوسری رکاب میں پیر رکھنے کے (بیچ کے) عرصے میں ایک قرآن ختم کرلیا کرتے تھے۔

شیخ آدم سنبھلی

وہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ صاحب معنیٰ قوی النسبت، راسخ الطریقہ اور بہت سے مشائخ کبار کے صحبت یافتہ تھے بہت سے اہل کرامت مجذوبوں کو انھوں نے دیکھا تھا اور ان کی برکتیں حاصل کی تھیں۔ تجرید کے ساتھ بہت سے سفر کیے ہوئے تھے۔ ان کا وقت بہت مقبول اور اچھا تھا۔ بڑے نیک اخلاق تھے۔ میرے شیخ کے شناسا ہیں۔ شیخ انھیں اس راہ کا مرد گنتے ہیں اور ان کی بڑی عظمت فرماتے تھے۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ شیخ مرتضیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ کار درویشی کے لائق اور مستقیم الحال شخص ہیں۔ میں بھی ان سے بارہا ملا ہوں اور ان کے نیک احوال اور ان کی وضع سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ وہ سلسلہ مداریہ میں بیعت (مرید) ہیں۔ جن جن صاحب معنیٰ مجاذیب سے ان کی صحبت رہی ان کا تفصیل سے ذکر فرماتے تھے۔ ان میں سے دو کو سب سے بڑا سمجھتے تھے۔ شیخ فتح اللہ چوکھا اور شیخ ارزانی کو۔ فرماتے کہ مجھے ان دونوں سے وہ چیز پہنچی جو مرتے وقت تک ساتھ رہنی چاہیے۔ کہتے ہیں

کہ شیخ ارزانی نماز نہ پڑھتے تھے۔ کسی نے کہا۔تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ انھوں نے بطور ہنسی فرمایا۔ ہمارے آباء میں سے ایک صاحب نے نماز پڑھی تو ان کا مال تلف ہو گیا تھا۔اسی وقت سے میں نے نماز چھوڑ دی ہے۔میرے شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ ارزانی کو دیکھا ہے۔ صوفیہ کی عام روش سے بیگانہ زندگی گزارتے تھے۔کھانے کی چیز کھاتے نہ کرنے کے کام کرتے۔نہ کہنے کی باتیں کہتے جیسا کہ مجاذیب کا طریقہ ہے لیکن خوب باہوش تھے۔صاحب باطن اور اہل دل۔لوگ ان سے بہت سے تصرفات نقل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک درویش نوجوان حاجی پور کی ایک ہندو عورت پر عاشق ہو گیا۔اُس عورت (کے گاؤں) اور اس کے شہر کے درمیان میں ایک دریا حائل ہے۔وہ درویش ہر روز ندی کے اس پار سے اُس پار جا کر اپنے محبوب کا دیدار کر کے آتا۔آخر کار ہندوؤں کو جب پتا لگا تو عورت کو پردہ نشین کر دیا۔اور درویش کو ڈانٹ ڈپٹ کر اس کام سے منع کیا۔اس نے اپنے درد دل کو شیخ ارزانی سے کہا۔شیخ کو اس پر رحم آ گیا اور کہا کہ تھوڑی دیر انتظار کر اور خود حجرے میں داخل ہو گئے کچھ دیر کے بعد باہر آئے اس (جوان) سے کہا جا حجرے میں جا اور دیکھ کہ کیا ہے؟ جب اندر گیا اس عورت کو حجرے میں بیٹھا دیکھا۔ مراد دل اور فراغ خاطر کے ساتھ دونوں نے ایک دوسرے کا دیدار اور گفتگو کی۔ہندو عورت کے گم ہونے سے حیرت میں پڑ گئے۔جابجا تلاش کرتے کرتے اس کو شیخ ارزانی کے کمرے میں پایا۔اس کا شوہر اور لڑکا اسے گھر لے آئے۔شیخ ارزانی نے دوسرے روز بھی اس عورت کو اس درویش کے سامنے حجرے میں لا حاضر کیا۔آخر جب ہندو حضرات عاجز ہو گئے تو ان کا پیچھا چھوڑ دیا۔وہ عورت مسلمان ہو گئی اور ان کے نکاح میں آ گئی۔طالب مطلوب کو پہنچا شیخ ارزانی کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جو کوئی قرض دار اُن کے پاس آ کر کچھ طلب کرتا تو وہ اس سے دریافت کرتے کہ تجھ پر کتنا قرض ہے۔ جتنا کہتا سو دو سو روپے تک بھی کسی تاجر سے دلا دیتے ہیں اور جو فتوح ان کو پہنچتی اس سے تاجر کا قرض ادا کر دیتے ہیں۔یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی جب صحرا کو جاتے جو درویش اُن کے ہمراہ ہوتے اور ان سے کہتے کہ ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔وہ کسی سامنے کے ٹیلے یا گھاٹی کی طرف اشارہ کرتے کہ جو وہاں پاؤ لے آؤ۔جب وہاں پہنچتے، پکا ہوا کھانا دیگوں میں یا طبق میں پاتے لے آتے اور سیر شکم ہو کر کھاتے۔شیخ ارزانی پوربی علاقے میں 1000ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔کہتے ہیں کہ کسی نے شیخ آدم کی دودھ اور چاول کے ساتھ دعوت کی۔اگر چہ وہ بھوکے تھے مگر اس میں سے کچھ نہیں

کھایا۔اس نے کہا۔کیوں نہیں کھاتے ؟ کہا۔میرا دل نہیں کہتا کہ کھاؤں۔اس کے بعد پتا چلا کہ اس کے اندر نیچے ایک گندہ کیڑا تھا۔ایک دن میں،ان کے پاس گیا ایک نوجوان شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی کے احوال پر مشتمل کتاب ان کے سامنے پڑھ رہا تھا۔وہ اس کے اسرار کو بیان کرتے جاتے تھے۔میں اور دوسرے حاضرین سبھی حیران تھے کیونکہ وہ بالکل پڑھے لکھے نہ تھے۔"نفحات الانس" میں ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ میں نے (ابوالحسن) خرقانی کے بارے میں سنا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ الحمدللہ بھی صحیح تلفظ کے ساتھ ادا نہ کر سکتے تھے۔حالانکہ وہ سید الاولیاء اور غوث وقت تھے۔ایک بار میں ہندی رسالہ "پیم چرت" جو کہ تصوف کے مباحثۂ عقل و عشق پر مشتمل ہے شیخ آدم کے پاس لے گیا اور ان کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔انھوں نے ذوق کے ساتھ سننا شروع کیا اسی دوران وہ مراقب ہوگئے تو میں نے پڑھنا بند کردیا انھوں نے سر اوپر اٹھا کر کہا پڑھو میں ان معارف میں محو ہوگیا ہوں یہ ایک نیکی کی بات ہے جسے آخر تک سننا چاہیے اور پوری کتاب سنی۔یہ چند شعر اسی کے ہیں

کثرت وحدت ہوت ہے پنچھن وحدت ذات ۔۔۔ بند جو پڑی سمند میں سو سمند ہوئی جات [1]
احمد سدا پار ہے جو ذات کی نات ۔۔۔ تا میں لہریں پیم کی نس دن آوت جات

سورٹھہ

بر کت واحد الٰہ حکمت احمد روپ ۔۔۔ جیس سکندر شاہ اپنو آپ وکیل ہوت
پیم کنول چل سنگ جیون ڈولے بتون ہوئے ۔۔۔ بدہ کدیو کہ نیک جیون بکتی پتون پھانپند نہ
کہنہ لاگ دکھ سکھ کی سہائی ۔۔۔ جیون پانی اور آگ، جاڑن میں دوؤ تھائی

دوہرہ

مجنون لیلیٰ مل بہئے ایکے تن من پران ۔۔۔ الہی بدہ کو ہم ہی پیہے بات نہ جان
پیم پنتھ کے مل جل ہوئی سب کوئی ۔۔۔ کہیہ ملین جیون آرسی بنہی نرمل ہوئی
احمد سمندرا پار ہے تا منہ جگت ترنگ ۔۔۔ دوہ ترنگ تیاری ہیں سنو تو پیم کے رنگ
کبر جیو تن تہو ہم نے رند کسیلان سوت ۔۔۔ گر او رکس کی لت میں سمجھو کیا کچھ ہوت
پھلت رہی پیم کی زرد سرسون بدہ چاہ ۔۔۔ آگ لگتی جیھون آوے تیرے جھونکا

---

1 کثرت وحدت میں مل کر وحدت ہو جاتی ہے۔جو بوند سمندر میں گر جائے وہ بھی سمندر ہی بن جاتی ہے۔

وحدت منہ وہ ایک ہے کثرت منہ وہ سب آپے آپ جہاں تہاں نہ کوئی پت نہ باپ [1]

دوسری بار جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہ ایک ضروری کام سے جارہے تھے مجھے دیکھا تو کھڑے ہو گئے میں نے کہا آپ کو جو کام ہے اسے کر آیئے میں تب تک یہیں ہوں۔ بولے "اس سے بہتر بھی کوئی کام ہوگا اور میرے پاس بیٹھ گئے اور بہت لطف فرمایا، بشارتیں دیں۔ کبھی کبھی میں فقرا کی ضیافت کرتا کیونکہ وہ بہت دور رہتے تھے۔ انھیں تکلیف نہ دیتا لیکن دل سوچتا کاش وہ بھی ہوتے بس وہ فوراً ہی پہنچ جاتے۔ ایسی چیزیں ان سے کئی بار دیکھی گئیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے خواب میں کہا۔ دعوت کر۔ یہ ان کی حیات ہی کا واقعہ ہے۔ اس رات کی صبح کو ہی میرے بیٹے سید کاظم کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ حضرت شاہ عبدالقادر قدس سرۂ کی بشارت کے بموجب اس کا نام میں نے "عبدالقادر" رکھا (کیونکہ "سید کاظم" کی تاریخ ولادت "سید کاظم" ہے اور ان کے بیٹے کی تاریخ ولادت عبدالقادر ہے۔) اور یہ قطعہ کہا

آمدی پور مبارک در جہان تا جہاں آباد اے جانی بزی

چون بشارت داد شاہ محی دیں از طفیل قطب ربانی بزی

نام عبدالقادرت ہم شد ز غیب از قبول شاہ گیلانی بزی

سال تاریخ تولد ہا تف بگفت سید عبدالقادر ثانی بزی [2]

ایک بار وہ ۹۰ سال کی عمر میں باوجود بے حد کمزوری کے عید کی نماز کو عید گاہ پہنچے اور مجھ سے کہا کہ میں نوے سال کا ہو گیا ہوں مگر تیری خاطر اس حال میں جو تو دیکھ رہا ہے پہنچا ہوں۔ اس دن بھی انھوں نے مجھ پر بہت عنایتیں فرمائیں۔ وہ مجھے بہت دوست رکھتے تھے۔ وہ میرے معتقد تھے اور میں ان کا

---

1 وحدت میں بھی وہی ایک ہے اور کثرت میں بھی وہ ہی سب کچھ ہے۔ اسی کی ذات کا ہر شے میں ظہور ہے اپنے آپ نہ کوئی بیٹا ہے نہ کوئی باپ ہے۔

2 مبارک فرزند دنیا میں آیا۔ جب تک جہاں آباد رہے (اے میری جان کے ٹکڑے) تو بھی زندہ رہے۔ جبکہ حضرت محی الدین نے تیری بشارت دی ہے تو ان قطب ربانی کے طفیل میں جیے تیرا نام عبدالقادر بھی غیب سے رکھا گیا۔ تو شاہ گیلانی کا مقبول ہو کر زندہ رہے جب تیری پیدائش کی تاریخ ہاتف غیب سے معلوم کی تو اس نے کہا "سید عبدالقادر ثانی بزی"۔ سید عبدالقادر ثانی بزی کے اعداد سے 1068ھ برآمد ہوتا ہے۔

معتقد تھا۔ ماہ ربیع الآخر میں حضرت غوث اعظم قدس سرۂ کے عرس میں امروہہ گئے وہاں بیمار ہوگئے۔ اس وقت بہت سے بزرگان سید عبدالحکیم، شیخ فاضل امروہوی، شیخ عبداللہ گجراتی، اور شیخ کرم علی دانیال پوری جیسے ان کی خدمت میں حاضر تھے تاکہ اس راہ عشق و معرفت کی باتیں سنیں۔ فرمانے لگے۔ اچھا دوستو اب تمھیں چاہیے کہ مجھ سے تعلق قطع کرلو اور اللہ سبحانہ میں مشغول ہو جاؤ اور نامرادی اور شکستہ خاطری کی عادت ڈال لو۔ اسی دوران اس طرح کے اشعار پڑھنے شروع کیے۔

نامرادی را بجان بر بستہ ایم خدمت غم را میان بر بستہ ایم [1]

اُن دوستوں نے ہر چند چاہا کہ آپ کو امروہہ ٹھہرائے رہیں مگر وہ نہ مانے اور کہنے لگے عرس میں نے دیکھ لیا۔ اور سنبھل آگئے۔ بیماری اور بڑھ گئی۔ ان کے مقبول دوستوں میں سے شیخ اسحاق نام کے فرماتے ہیں کہ جس رات کو وہ جانے والے تھے میں حاضر خدمت تھا۔ دیکھا کہ وہ ذوق وحال میں یہ دو شعر پڑھ رہے ہیں

عشق سودا گر بنودے در میان کوے دلبر کس ندیدے در جہان
من ہمان دم کہ وضو ساختم ز چشمۂ عشق چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست [2]

اسی دوران ان کے ایک مرید نے کہنا شروع کیا کہ اس وقت میں شیخ سے وصیت کی درخواست کرتا ہوں۔ دوسرے نے کہا اس حال میں ایسی بات کرنی ادب کے خلاف ہے کیونکہ جو ملنا تھا ہمیں پہنچ گیا۔ شیخ نے آنکھ کھولی اور کہا دوستو خدا خدا خدا جو غیر کی جانب گیا ہلاک ہوگیا۔ دوسرے مریدین بھی جو حاضر تھے سب محظوظ و مسرور ہوگئے۔ سب پر بڑے اچھے احوال طاری ہوگئے اور وہ 21/ربیع الآخر 1067ھ (28/دسمبر 1657) کو با ذوق و شوق دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان کی نعش کو مریدوں نے حالت ذوق وشوق و مستی میں ان کے باغ میں لاکر دفن کر دیا۔ جب میں نے ان کے انتقال کی خبر اپنے شیخ کے پاس دہلی میں سنی تو یہ قطعۂ تاریخ کہا

---

1 ہم نے نامرادی کو اپنی جان سے پیوستہ کر رکھا ہے۔ غم کی خدمت کرنے کے لیے کمر کس لی ہے۔

2 اگر عشق کا سودا دنیا میں نہ ہوتا تو کوئی دنیا میں دلبر کے کوچے کا رُخ نہ کرتا۔ میں نے جیسے ہی چشمۂ عشق سے وضو کیا۔ جو کچھ دنیا میں ہے سب پر چار تکبیر پڑھ دی۔

قطعہ

وفاتِ شیخ آدم چون شنفتم ۔۔ دُر اشک از سر مژگان بسفتم
پس آنگہ سال تاریخ وصالش ۔۔ ولی اللہ شیخ آدم بگفتم [1]

اور (یہ قطعہ) اپنے شیخ کو سنایا۔ میرے شیخ خوش ہوئے اور فرمایا ''خوب کہی اور ان کے مناسب حال کہی'' اُن چاروں بزرگوں میں سے عبدالحکیم اور شیخ فاضل کے احوال اپنے اپنے مقام پر آ ئیں گے۔ البتہ شیخ عبداللہ گجراتی ایک فاضل اور اس لائن (تصوف) کے آدمی تھے۔ ایک بار ان کا ارادہ ہوا کہ سنبھل میں آ کر رہنے لگیں لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہوا ان ہی دنوں میری ان سے جان پہچان ہوئی۔ میرے ساتھ اخلاص اور دوستی برتتے تھے۔ ایک بار میں ان سے ملنے مرادآباد گیا کیونکہ ملا حاجی محمد جو کہ شیخ احمد سرہندیؒ کے مرید تھے اور ان کی بیٹی جوان کی اہلیہ تھیں انتقال فرما گئیں تھیں۔ ملا حاجی محمد ایک توفیق یافتہ، غریب، نیک معاملت شخص ہیں۔ میری ان سے بہت شناسائی ہے۔ ایک بار یہی شیخ عبداللہ گجراتی دہلی گئے واپسی میں کشتی میں سوار آرہے تھے۔ وہ طغیانی آب کے دن تھے۔ کشتی ٹوٹ گئی اور سوائے ایک شخص کے سارے کشتی سوار 1069ھ (1659) میں غرق ہو گئے۔ شیخ کرم علی دانیال پوری ایک پسندیدہ خلق، نیک معاملت اور صاحب سماع شخصیت ہیں۔ وہ شیخ اللہ بخش لاہوری کے مرید ہیں اور وہ شیخ نظام تھانیسری کے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر شیخ نظام الدین، شیخ اللہ بخش اور بہت سے درویش بلخ گئے ہوئے تھے۔ اس جگہ مشائخ وقت میں سے ایک صاحب کا انتقال ہو گیا ان کی یہ وصیت تھی کہ جو آدمی فلاں فلاں صفات کاملہ سے موصوف ہو وہ ہی میری نماز جنازہ پڑھائے۔ تو بہت سے مشائخ اور خلفا روزگار نے جمع ہو کر مشورے سے شیخ نظام تھانیسری کو چنا۔ شیخ اٹھے اور شیخ اللہ بخش لاہوری کو اشارہ کیا وہ جائے نماز پر آئے۔ اس بات سے سب حضرات نے کہنا شروع کیا کہ ہم نے شیخ نظام کو امامت کے لیے قبول کیا تھا اور انھوں نے اپنے مرید کو اس دشوار کام کے لیے تجویز کر دیا وجہ کیا ہے؟ شیخ نے فرمایا کہ وہ فضیلت کی چار وجھوں سے مجھ سے افضل ہیں۔ اول یہ کہ وہ سید ہیں میں نہیں ہوں۔ دوسری

1 جب میں نے شیخ آدم کی وفات کی خبر سنی مجھ پر گریہ طاری ہو گیا اس وقت میں نے ان کی تاریخ وصال ''ولی اللہ شیخ آدم'' کہی۔

یہ کہ میں عالم نہیں ہوں وہ عالم ہیں۔ تیسری یہ میں شادی شدہ ہوں وہ ابھی حصور ہیں۔ چوتھی یہ کہ وہ اپنے وطن میں گوشہ نشینی میں رہتے ہیں کہ کبھی بھی انھوں نے قدم باہر نہیں نکالا ہے اور میرا یہ حال نہیں ہے۔

میر محمد مراد بدخشی (سنبھلی)

آپ سید ہیں اور بدخشاں کے اکابرزادوں میں سے ہیں۔ خواجہ خاوند محمود کے سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید ہیں۔ صاحب معنی، وارستہ اور آزاد۔ اپنے تعلق مع اللہ کو خاکساری اور بے تعینی میں چھپائے رکھتے ہیں۔ انھوں نے اسی طرح حالت خمول وگمنامی میں ساری عمر گزار دی۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں ان کو جبکہ دبستان میں زیر تعلیم تھے جذبۂ الٰہی نے آلیا۔ کوچہ و بازار، صحرا و کہسار میں دیوانہ وار گھومنے لگے۔ ان کو پکڑا اور پیروں میں زنجیر ڈال دی گئی۔ یہ بھی ان کے لیے کارگر ثابت نہ ہوئی اور میر دیوانہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ جوانی کے دنوں میں ان کا مصلحتاً نکاح کرنا چاہا تو وہاں سے بھاگ کر ہندستان آگئے۔ ان کے بھانجے اکبر بادشاہ کے دربار میں تین ہزاری منصب رکھتے تھے۔ ان کو ایک بہانے سے ایک تقریب کے موقع پر بادشاہ کے سامنے لے گئے اور ان کی حقیقت عرض کی۔ بادشاہ نے کہا "میر دیوانہ کچھ زمانہ ہمارے ساتھ رہیے اور فراغت دل سے عیش کیجیے۔" انھوں نے کہا اے بادشاہ جو عیش وعشرت مجھے حاصل ہے وہ اس سے بہت بڑھا ہوا ہے

گر چہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم　　گر بآب چشمۂ جوشیدہ دامن ترکنم
من کہ دارم در گدائی گنج سلطانی بدست　　کہ طمع در گردش گردون دون پرور کنم [1]

وہاں سے بھی بھاگ آئے اور قلندرانہ لباس میں ملک دکن چلے گئے۔ آخر سیر کرتے ہوئے سنبھل آئے اور وہاں کے صحرا کو پسند کر لیا۔ سنبھل اور امروہہ کے درمیان ایک دل کش اور خوش منظر پشتہ ہے جو "مغل" کے نام سے مشہور ہے دو تین سال وہاں گزارے۔ اس کے بعد شہر سنبھل میں پہنچے

1　اے مخاطب اگر چہ میں فقر کی گرد میں اٹا ہوا ہوں مگر میری ہمت کے لیے شرم کی بات ہوگی اگر میں اپنے اشکوں کے امنڈتے چشمے سے دامن بھگوؤں جب میں اس گدائی میں سلطانی کی دولت سے مالا مال ہوں حقیر دنیا کو کب نظر میں لاتا ہوں۔

اوراس جگہ جو کہ بداؤں دروازے سے ملی ہوئی ہے شیخ فرید کے چلے (چلہ گاہ) کے نزدیک سکونت اختیار کی اور تیس سال سے زیادہ وہاں بسر کیے۔ ان کی عمر سو سال تک پہنچ گئی تھی۔ آخری عمر میں بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے علاوہ جان پاک کے کوئی چیز نہ رکھتے تھے۔ دن رات اسی جگہ مشغول رہتے تھے۔ ان کی سب سے شناسائی بھی تھی اور وہ سب سے ناآشنا بھی تھے۔ ان کا طریقہ باہمہ بودن (سب کے ساتھ مل کر رہنا) اور بے ہمہ بودن (قلبی طور پر سب سے جدا رہنا) تھا۔ آپ ظاہر میں بوجہ ادب شرع غیرت میں تھے اور باطنی طور پر بوجہ غیبت حیرت میں تھے۔ ان کا ظاہر (بہ رعایت شریعت) تفرقۂ خلق میں غوطہ زن تھا مگر باطن (حقیقت) جمع الجمع میں غرق تھا۔ یہ نسبت نقشبندیہ کے آثار میں سے ہے۔ جیسا کہ ''رشحات'' میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا کہ نقشبندیہ کی نسبت میں کھلے طور پر تفرقے کی صورت زیادہ نظر آتی ہے۔ راز اس کا یہ ہے کہ یہ نسبت محبوبی ہے۔ (جب تو محبوب کو برملا بلائے گا تو اس بات سے اسے غیرت آتی ہے) لہٰذا محبوب سے ملنا خلوت اور حجاب میں ہی ہوسکتا ہے۔ انتہیٰ[1]۔ میر محمد مراد بدخشی کا ایک طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص ان کے پاس کوئی چیز تحفتاً بھیجتا تو لے لیتے مگر اگر، دوبارہ بھیجنا چاہتا تو منع فرما دیتے تھے کہ نفس اسراف میں نہ پڑ جائے اور انتظار کا خطرہ نہ اُٹھا لے۔ اسی طرح بعض غنی لوگ چاہتے تھے کہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں، وہ قبول نہیں کرتے تھے۔ میں دہلی آتے جاتے ان سے ملاقات کرتا تو وہ میری خوب خاطر مدارات کرتے۔ الطاف وعنایات فرماتے۔ میرے شیخ کو بن دیکھے خلوص و محبت سے یاد فرمایا کرتے تھے اور اس راہِ ولایت کی باتیں سنایا کرتے پھر جو گزرتا، گزرتا۔ زبان اس کے بیان کے قاصر ہے۔ سحر کے وقت وہ قرآن مجید کو بلند آواز سے تلاوت کرتے۔ میں اپنے گھر سے تین تیر کی دوری سے بھی ان کی آواز سے لطف اٹھاتا تھا۔ آخر عمر میں کمر جھکائے ایک جگہ مراقب بیٹھے رہتے تھے۔ اپنے گرد و پیش کے رہنے والوں سے کہا کرتے ''نجانے میرا کیا انجام ہوگا'' اسی قسم کا ایک شعر ایک دن ایک شخص کے سامنے پڑھا

---

1 غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم — گوش را نیز حدیث تو شنیدم نہ دہم

ترجمہ: مجھے اپنی آنکھوں سے بھی غیرت آتی ہے۔ میں انھیں بھی تیرا چہرا نہیں دیکھنے دیتا اور نہ ہی کانوں کو تیری بات سننے دیتا ہوں۔

من بچندین آشنای مخورم خونِ جگر　　آشنا را حال رسوائی بر بیگانہ [1]

اس کے بعد اپنے مریدوں میں سے قلندر نام کو طلب کیا اور فرمایا۔ مجھے بٹھاؤ اور میرا بازو پکڑے رہو۔ جب بٹھایا تو حالت حضور و آگاہی میں غرق ہو کر سر سجدے میں رکھا اور چل دیے۔ یہ 8 ماہ جمادی الاولی 1065ھ (5/مارچ 1655) کی تاریخ تھی۔ قبر آپ کی آپ کے رہنے کی جگہ بنی۔ [2] میں نے آپ کا یہ قطعۂ تاریخ کہا

قطعہ

چون محمد مراد صاحبدل　　زبدۂ زمرۂ صفا کیشان

رفت و تاریخِ فوتش از سر صدق　　گفتہ شد ''مُرد میر درویشان'' [3]

1065ھ

شیخ جامی محمد نگینوی رح

وہ علوم ظاہری و باطنی میں شیخ شہباز بھاگلپوری کے شاگرد ہیں۔ صاحب احوال صافیہ اور روشن طور طریقے والے۔ اس طریقہ ولایت میں مستقیم ہیں۔ اپنے چند طلبا کے ساتھ بیٹھتے اور علوم دینی کا ایسے بیان کے ساتھ جیسا کہ چاہیے درس دیتے اور فقرا کے طور طریق کی باتیں کیا کرتے۔ اپنی باطنی مشغولی کو درس و تدریس کے پردے میں پنہاں رکھتے تھے، جیسا کہ تسلیم شدہ ہے کہ نسبت باطنی کو چھپانے کی طالب علمی کی صورت سے بہتر دوسری صورت نہیں ہے۔ ان کی وفات کا سال 1067ھ (1657) ہے اور قبر نگینے میں ہے۔ میں نے ان کو سنبھل کی جامع مسجد میں دیکھا ہے۔ اس راہ کی کافی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے میرے شیخ کو بلا دیکھے ہی بڑے اخلاص و محبت سے پوچھا، اپنے استاد و شیخ کے احوال، اپنے ابتدا کے حالات کی باتیں کیں۔ اس طرح بڑی پُر لطف مجلس گزری۔ وہ اپنے

1　میں اتنے قرب پر بھی خون جگر پی رہا ہوں، حال آشنا بیگانگی کی رسوائی اٹھانے والے کا سا ہو گیا ہے۔

2　آپ کا مزار بمقام چلہ شیخ فرید قدس سرہٗ سنبھل میں ہے۔

3　جب زبدۂ زمرۂ صفا کیشاں محمد مراد صاحب دل، دنیا سے رخصت ہوئے تو میں نے ان کی تاریخ وفات معلوم کی تو میرے دل کی گہرائیوں نے کہا ''مُرد میر درویشاں'' کہ درویشوں کا سردار چلا گیا۔

علم ودانش پر تواضع، نیازمندی اور شکستگی کی وضع کو غالب رکھتے تھے۔ان کی نسبت کیفیت احوال ان کی مولویت اور قرآئی پر فوقیت رکھتی تھی۔

گر نہ علم حال فوق قال بودے کے شدے   بندہ، اعیان بخارا خواجہ نساج را [1]

یہ ان کا اعلیٰ ظرف اور حوصلۂ بلند ووسیع ہی تھا کہ جتنے زیادہ کشف کے بند دروازے ان پر کھلتے وہ ان میں سے کچھ بھی ظاہر نہ کرتے۔کمال حالتِ جذب کے باوجود شریعت پر استقامت تام رکھتے تھے۔بزرگوں کا قول ہے

یا ربم ملک استقامت دہ   کاستقامت ز صد کرامت بہ [2]

بے شک یہ مشرب (صوفیہ نقشبندیہ) اتنا عالی تر اور صاف شفاف ہے کہ ذرا سی کیفیت مل جانے پر مرتبۂ بندگی سے سر اٹھا کر مستی اور انانیت کا دعویٰ نہیں کرتے اور نا ہی بے محابا شطحیات (بے ہودہ باتیں) ببانگ بلند بکتے پھرتے ہیں۔میرے شیخ کا بیان ہے کہ شاہ کمال کیتھلی جو کہ صاحب جذبہ و تصرف قوی بزرگ ہوئے ہیں اور ان کا نام سلسلہ قادریہ میں اس کتاب میں آئے گا ایک دن کسی جگہ پیشاب کرر ہے تھے۔اتفاق کی بات کہ وہ جگہ ایک مجذوب وقت کا مدفن تھی وہاں سے آواز آئی یہاں میں ہوں، یہاں میں ہوں۔آپ نے غضبناک لہجے میں فرمایا" ٹھہر ٹھہر اب بھی تجھ سے یہ خودی کی ہوں ہوں نہ نکلی۔"

"نفحات الانس" میں فرماتے ہیں کہ مولانا شمس الدین تبریزی سنہ 642ھ (1245) میں سفر کرتے ہوئے قونیہ پہنچے اور شکر ریزوں کے مکان میں جا اترے۔حضرت مولانا جلال الدین رومی [3] اس زمانے میں تدریس علوم میں مشغول تھے۔ایک دن آپ فضلا کی ایک جماعت کو لے کر مدرسے سے باہر نکلے اور شکر ریزوں کے مکان کے سامنے سے جا رہے تھے۔حضرت مولانا شمس الدین

---

1 اگر علم حال علم قال پر فوقیت نہ رکھتا تو بخارا کے بڑے بڑے علما شیخ خواجہ نساج کے غلام کب بنتے

2 اے میرے رب مجھے استقامت کی دولت عطا کر دے کہ استقامت سو کرامتوں سے بڑھ کر ہے۔

3 حضرت مولانا جلال الدین معروف بہ مولانا روم ابن سلطان العلماء بہاء الدین محمد بن حسین الخطیبی کی ولادت 604ھ/1228 میں اور وفات 672ھ/1274 کو قونیہ میں ہوئی۔آپ مشہور اکابر علما اور صوفی شاعر و ادیب تھے۔"مثنوی معنوی" آپ کی مشہور زمانہ تصنیف ہے۔

سامنے آئے اور مولانا کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر بولے" اے امام المسلمین! بایزید بسطامی زیادہ بزرگ ہیں یا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ اس سوال کی ہیبت سے گویا کہ ساتوں آسمان ایک ایک کر کے ٹوٹ کر زمین پر بکھر گئے۔ ایک آتش عظیم میرے دل سے نکل کر دماغ سے جا ٹکرائی۔ وہاں سے دیکھا کہ ایک دھواں نکلا پایۂ عرش تک جا پہنچا۔ اس کے بعد میں نے جواب دیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "**ما عرفناک حق معرفتک**" (ہم نے تجھے ایسا نہ پہچانا جیسا کہ تیرے پہچاننے کا حق تھا)۔ اور بایزید کہتے ہیں کہ "**سبحانی ما اعظم شانی و انا سلطان السلاطین**[1] " میں نے یہ بھی کہا بایزید کی پیاس ایک گھونٹ سے بجھ گئی اور کوزۂ ادراک کے بھر جانے کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ اس کا ظرف اتنا ہی تھا، وہ نور ان کے دل کے روشن دان کی بقدر تھا۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بے پناہ پیاس و تشنگی تھی اور آپ کا سینۂ مبارک "**الم نشرح لک صدرک**" (کیا ہم نے تمھارا سینہ نہیں کھول دیا) سے مشرح تھا۔ "**و ارض الله واسعة**" (اللہ کی زمین وسیع ہے) یعنی آپ کے دل کی زمین انوار الٰہی کے نزول کے لیے بڑی وسعت رکھتی تھی۔ لامحالہ آپ نے اظہار تشنگی فرمایا۔ ہر لحہ اللہ سے قربت کی زیادتی کی دعا کرتے تھے۔ مولانا شمس الدین نے یہ سن کر ایک نعرہ لگایا اور گر گئے۔ مولانا گھوڑے سے اترے شاگردوں سے کہا ان کو اٹھا کر مدرسے لے جاؤ۔ وہ لے گئے تو وہاں جا کر جب ہوش میں آئے تو دیکھا کہ مولانا ان کے سر مبارک کو زانو پر رکھے ہوئے ہیں۔ اٹھے مولانا کا ہاتھ پکڑا اور جنگل کی طرف چل دیے اور تین ماہ تک دن رات مسلسل صوم وصال میں (خلوت میں اپنے ساتھ) بٹھائے رکھا کہ بالکل باہر نہ نکلے۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ ان کی خلوت میں دخل انداز ہوتا۔ انتہیٰ

شیخ ابوالقاسم رَدَولوی

وہ علوم ظاہری و علوم باطنی اور توحید و معرفت کے عالم ہیں۔ طریقۂ تلبیس و اخفا میں یگانۂ روزگار ہیں۔ سالوں کتب متداولہ کا درس دیا اور طالب علموں کو فیض پہنچایا۔ ان کی جائے پیدائش پوربی علاقہ میں ہے۔ کیونکہ وہ یکسوئی اختیار کیے ہوئے تھے اس لیے وہاں انھیں کوئی نہیں پہچانتا تھا۔

1 میں سبحان ہوں میری کیسی شان عظیم ہے۔" اور" میں سلطان السلاطین" ہوں۔

میں نے انھیں اپنے شیخ کی خانقاہ میں دیکھا ہے اور مدتوں خانقاہ میں میرے پڑوسی رہے ہیں۔ وہ خود کو عالم ظاہر نہیں کرتے تھے بلکہ علمائے ظاہر کے مخالف رہتے۔ بلکہ توحید وجودی کے بارے میں بہت ہی سخت کھلی بات کہتے۔ اکثر اوقات گمشدگی اور حیرت کے عالم میں رہتے۔ مرتبۂ استغراق و استہلاک رکھتے تھے۔ ان کا مشرب تسلیم ورضا تھا۔ بعض علما ظاہر ان کو الحاد و زندقے سے منسوب کرتے تھے کہ ان کی باتیں طریقہ سلوک مشائخ سے الگ ہوتیں ہیں۔ وہ لوگوں کے برا کہنے سے ناخوش نہ ہوتے اور اچھا کہنے سے خوش نہ ہوتے۔ اپنے دسترخوان پر کسی کو نہ بلاتے اور بغیر پوچھے ان کے دسترخوان پر اراذل اسافل میں سے کوئی بھی ہو کھانے لگتا تو اس سے منع نہ فرماتے۔ کسی چیز کے چلے جانے سے انھیں غم نہ ہوتا نہ کسی چیز کے آنے سے خوشی۔ ان کی ایک قیمتی شمشیر چوری ہوگئی انھوں نے کسی سے نہ کہا میں نے یہ دیکھا کہ اس واقعہ سے انھیں بال برابر بھی فکر و تردد لاحق نہ ہوا۔

نقل ہے کہ ایک دن خادم نے حضرت شیخ زکریا قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ وہ دو لعل جو کہ بادشاہ نے آپ کی نذر کیے تھے گم ہو گئے ہیں۔ شیخ یہ سن کر سر مراقبے میں لے گئے پھر فرمایا۔ الحمدللہ۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اسی خادم نے آ کر کہا کہ وہ دونوں لعل فلاں جگہ رکھے ہوئے مل گیے ہیں۔ اس پر بھی شیخ نے مراقبے میں سر جھکا لیا اور پھر اٹھا کر فرمایا۔ الحمدللہ۔ جب دونوں مرتبہ الحمدللہ کہنے کی حقیقت دریافت کی تو شیخ نے فرمایا جب لعل گم ہوئے تو میں نے اس واقعے سے اپنے دل میں کوئی تکلیف اور تردد نہ پایا نہ غم ہوا اور جب مل گئے تو بھی میں خوش نہ ہوا۔ اسی لیے میں نے دونوں مرتبہ الحمدللہ کہا۔ انتہیٰ

شیخ ابوالقاسم باوجود اس حالت استغراق و استہلاک کے اکثر لوگوں کے برعکس فقرا باب اللہ کے ساتھ متواضع تھے اور اغنیا سے مستغنی۔ اگرچہ آج کل کے اکثر لوگوں کی روش زندگانی ایسی واقع ہوئی ہے کہ اغنیا کے ہاتھوں سے جب اتنا نقد ان کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے تو ان میں دنیاداری آجاتی ہے پھر خود غرضی میں یہ لوگ مجلس اغنیا میں چرب زبانی خوشامد گوئی اور چاپلوسی سے کام لے کر اپنا مقصد دلی پورا کرتے ہیں۔ افسوس اس جماعت پر جو حکم آیات قرآنی، احادیث نبوی (ﷺ) اور اقوال بزرگان سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ ان آیات کریمہ میں سے ایک آیت یہ ہے کہ ”مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمارِ یحملُ

اسفارا [1] ''مولانا حسین واعظ''تفسیر حسینی'' میں اس آیتِ کریمہ کی شرح میں عارف رومی کے یہ اشعار لائے ہیں

گفت ایزد یحمل اسفارہٗ   بار باشد علم کان نبود زہُو
علم ہائے اہل دل حمال شان   علم ہائے اہل تن احمال شان
علم چون بر دل زند یارے بود   علم چون برگل زند بارے بود
چون بدل خوانی ز حق گیری سبق   چون بگل خوانی سیہ سازی ورق [2]

جملہ احادیث میں سے یہ دو حدیثیں ہیں کہ''العلماء انصار اللہ مالم یخالطوا بالا غنیاءِ و لو یخالطوہم فاحذروہم فانہم لصوص الدین [3] ۔''دوسری حدیث شریف''من تواضع الغنی لِغناء ہٖ فقد ذہب ثلث دینہٖ [4] ''

''رشحات'' میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا کہ عبادت کی حقیقت خضوع، خشوع، شکستگی اور نیازمندی ہے جو کہ عظمتِ حق کے مشاہدے سے اس پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس قسم کی سعادت محبت پر موقوف ہے۔ اور محبت کا اظہار''سیدالاوّلین و الآخرین علیہ من الصلوٰۃ اتہما و من التحیات ایمنہا'' کی متابعت پر موقوف ہے۔ متابعت طریق متابعت جاننے پر موقوف

1 ان لوگوں کی مثال جنھیں تورات عطا کی گئی پھر انھوں نے اسے نہیں اُٹھایا (اس پر عمل نہیں کیا) اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اُٹھاتا ہے (مگر ان سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتا)

2 کہا کہ اللہ تعالیٰ خود اس کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔ وہ علم قیامت کے دن آدمی پر بار ہوگا جو منجانب اللہ نہ ہو۔ اہل دل کا علم ان کا بوجھ اُٹھانے والا ہے اور اہل تن کا علم ان پر بوجھ ہے۔ جب کوئی علم کو دل پر لے تو مددگار ہوتا ہے اور جب کوئی علم کو جسم یعنی صرف زبان پر لے تو بارے قیامت ہوگا۔ جب تو دل سے پڑھے گا تو حق تجھے معرفت عطا کرے گا۔ اور جب تو صرف زبان سے پڑھے گا تو اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرے گا۔ صرف کاغذ کالے کرے گا دل پر اثر نہ ہوگا۔

3 علما اللہ کے دین کے مددگار ہیں جب تک وہ اغنیا سے (خودغرضی کا) میل جول نہ رکھیں۔ اور اگر وہ (منافع دنیوی حاصل کرنے کی غرض سے) ان سے ربط رکھیں تو ان سے بچو کیونکہ وہ بے شک چور ہیں (تمھارا دین چرالیں گے)

4 جس نے غنی کی مالداری کی وجہ سے تواضع برتی اس کا ایک تہائی دین جاتا رہتا ہے۔

ہے۔ پس ضرورت ہے کہ علما کی صحبت جو کہ وارثان علوم دینی ہیں صرف اسی غرض کے لیے اختیار کی جائے۔ مگر ایسے علما کی ملازمت سے جنھوں نے علم کو معاش دنیوی کا وسیلہ بنالیا ہے اور حصول جاہ کا سبب کرلیا ہے دور رہنا چاہیے اور ان درویشوں کی صحبت سے بچو جو کہ رقص وسماع اختیار کیے ہوئے ہیں اور بغیر حرام حلال کی تحقیق کیے جو بھی مل جائے بے تحاشا لے لیتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ اور ایسے توحید و معارف کے مضامین کا سننے سے جو عقائد مذہب اہل سنت و جماعت کے نقصان کا سبب ہوں دور رہنا چاہیے۔ معارف حقیقہ کے ظہور کی تحصیل کے لیے محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت پر کمر کسنی چاہیے۔ والسلام

''نفحات الانس'' میں ہے کہ ابو ہاشم نے شُریک قاضی کو دیکھا کہ یحییٰ خالد کے گھر سے روتے ہوئے باہر نکل رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ''اعوذ باللہ من علم لاینفع'' (ایسے علم سے اللہ کی پناہ جو فائدہ نہ دے) خواجہ ابرار اس کے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ علم نافع وہ ہے جو عالم کو دنیاداروں کی صحبت سے روکتا ہے۔ ابو ہاشم کے رونے کا سبب مخلوق کی محبت وشفقت تھی کہ علما کا فساد عام خلائق کے فساد کو مستلزم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ خواجہ بیرنگ نے فرمایا ہے کہ ان علمائے دین سے جنھوں نے علم کو جاہ وتفاخر اور زباں رانی کا وسیلہ بنالیا ہے ان سے ایسے بچنا چاہیے جیسے کہ آدمی شیر سے بچتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک سخت جان قاری نے جو کہ ایک دنیادار کی صحبت میں رہتا تھا۔ ایک لشکری کے سامنے جو کہ جاہل تھا دوران بحث یہ حدیث پڑھی کہ ''الدنیا جیفة و طالبها کلابٌ'' (دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا ہے) مگر اس کے معنی نہ سمجھائے۔ اس جاہل نے جواب دیا۔ ''ٹھیک، طالبان دنیا تو کتے ہیں مگر ''آن ملّان کی کریان'' یہ مولوی کیا کررہے ہیں جو دنیاداروں کی صحبت میں مزے اڑا رہے ہیں، تو بھی مردار خوروں جیسا ہی تو ہے۔ ایک بار میں نے ایک قاری کو دیکھا کہ امیروں کی صحبت میں دلی خواہش سے رہ رہا تھا اور خود کو ان کے حوالے کردیا تھا۔ ایک دن میں نے اس حدیث کے معنی جو کہ شیخ ابن عربی کے کلام میں آئی ہے'' یقیم بجهلٍ لَهَبَطَ علی الله ''بطور استفادہ پوچھے۔ وہ بگڑ گیا اور بولا ''موضوع ہے، پھر میں نے کہا ان احادیث مشہورہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' انا احمد بلا میم، و من رانی فقد راء الحق، و من عرف نفسه فقد عرف ربه، وان الله خلق آدم علی صورته'' (1: میں

احمد بلا میم ہوں۔2: جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا شیطان کو نہیں دیکھا یا جس نے مجھے نظر اعتقاد و محبت سے دیکھا اس نے گویا اللہ کو دیکھ لیا یعنی مظہر صفات و ذات الٰہی کو دیکھ لیا۔3: جس نے اپنے نفس کی حقیقت پہچان لی اسے اپنے رب کی معرفت حاصل ہوگئی۔4: بیشک اللہ تعالیٰ نے ہی آدم علیہ السلام کی صورت خلق کی ہے۔یا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (مزاجاً) اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔(یہ سن کر) اور بھی خفا ہوا اور کچھ کا کچھ کہنے لگا تب میں نے کہا کلام مجید کی یہ آیات سنو اور اس کے معنی بتاؤ: ''وفی انفسکم افلا تبصرون، وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی، وھو الاوّل والاخر والظاھر والباطن، و فاینما تو لو فثمّ و جھہ اللہ'' 5: کیا تم اپنے نفسوں کی حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ عدم محض ہے وجود حقیقی بس وہی ذات واحد ہے۔6: جو کنکریاں اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم نے پھینکی وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھیں۔یعنی تم درمیان میں صرف آلہ تھے۔پھینکنے والا حقیقتاً اللہ ہی تھا۔7: وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔8: جس جانب بھی تم رخ کرو وہی اللہ کی جانب ہے۔) میں نے دیکھا کہ ان کے معنی کو صوفیا کے اعتقاد کے خلاف بیان کر رہا ہے اور لڑائی لڑنے لگا ہے تو میں نے فوراً اس کی بحث سے ہاتھ اُٹھا لیے کہ بزرگوں نے کہا ہے

جنگ ہفتاد دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند [1]

پھر جب میں نے یہ سنا وہ قاری اپنے علم وفضل پر مغرور ہے اور کسی سے بیعت نہیں ہے اور اس نے نہ ہی قوم صوفیہ کی صحبت اختیار کی ہے تو میں نے کہا سچ ہے (فرمان بزرگان) معاً مجھے ''نفحات الانس'' کی عبارت یاد آئی کہ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے۔اُس مرید کو فلاح نصیب نہیں ہوتی جس نے استاد و پیر کی سختی نہ برداشت کی ہو اور اس کے تھپڑ نہ کھائے ہوں۔اور اس کی لعنت اللہ (اللہ تجھ پر لعنت کرے) سن کر رحمک اللہ (اللہ آپ پر رحم فرمائے) نہ کہی ہو، اور نامرادی کے درد کے ساتھ زندگی نہ گزاری ہو وہ اپنی خودی سے چھٹکارا نہیں پاتا کیونکہ کامیابی بے توجہ استاد و پیر حاصل نہیں ہوتی۔انتہیٰ۔یہ مصرعہ خواجہ بیرنگ کے کلام میں ہے

---

1 لوگ جب حقیقت دین کی راہ نہیں پاتے تو افسانوں پر دین کی بنیاد رکھنے لگتے ہیں اور 72 فرقوں کی جنگ کی روایت کو بطور عذر پیش کرتے ہیں۔

''اے پیر من بخدائے من از تو بحق رسیدہ ام'' [1]

ایک دن میرا ایک قاری سے جو دنیاوی مال و متاع کے لالچ میں ایک ہندو کے بیٹے کو پڑھاتا تھا اور خوشی خوشی اس کے گھر آتا جاتا تھا، سے واسطہ پڑا۔ پہلی ہی گفتگو میں اس سے شیخ امان اللہ پانی پتی [2] کے علوم توحید و معارف کا ذکر آیا۔ شیخ امان اللہ اکمل موحدین اور محققین میں سے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ اگر دنیا والے انصاف کو بروئے کار لائیں تو وحدتِ وجود کے مقدمات سے ہر خرد و کلاں کی تسکین خاطر دلائل عقلی و نقلی سے کی جا سکتی ہے۔ شیخ کی وفات 957ھ (1551) میں ہوئی ہے۔ اس قاری نے سنتے ہی گندی گالی شیخ کو دی۔ مجھے غصہ آ گیا اور کہا کہ شیخ اکابر صوفیہ میں سے ہیں اور شیخ محی الدین ابن عربی اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کے تابع اور ان کے قدم پر چلے ہیں۔ مولوی جامی کے رسالے ''لوائح'' کی بہترین طرز پر شرح کی ہے اور علم توحید و معرفت کی داد دی ہے۔ کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتا کہ اس کے دوستوں کا ایسی قباحت کے ساتھ نام لیتا ہے اس نے براہ دشمنی کہا کہ ''شیخ علاء الدولہ نے ابن عربی کے کلام ''سبحان من اظهر الاشياء وهو عينها'' (پاک ہے وہ ذات جس نے اشیاء کو ظاہر فرمایا اس حال میں کہ وہ ان کی عین بھی ہے۔) کے سلسلے میں کہا ہے کہ یہ وہی اعتقاد ہے جو فضیلۃ الشیخ (ابن عربی) چیزوں کو عین وجود الٰہی جانتے ہیں'' اور بہت سی باتیں کہیں۔ جیسے کہ عوام اکثر شیخ ابن عربی پر ان کے قول ''مات فرعونُ طاهراً و مطهراً'' پر طعنہ زن ہیں۔ مولوی جامی کی نسبت کہا کہ ہم اُن کے حال کے معتقد نہیں ہیں کے ان علم کے معتقد ہیں۔ میں نے کہا کہ تمھارا یہ انکار جو اولیاء اللہ کی نسبت ہے ویسا ہی ہے جیسا کہ کہتے ہیں کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی [3] جو اکابر مشائخ میں سے ہیں اور صاحب وجد و حال اور اہل کرامات و مقامات میں سے ہیں۔ ایک دن سماع میں تھے۔ اس قصبے کی

---

1 اے میرے پیر خدا کی قسم میں آپ کی معرفت اللہ تک پہنچا ہوں۔

2 نام عبدالملک اور لقب امان اللہ ہے۔ عبدالغفور کے فرزند تھے۔ ''اثبات الاحادیث'' اور ''شرح لوائح جامی'' کے مصنف ہیں۔

3 شیخ عبدالقدوس گنگوہی صاحب علم و فضل درویش تھے شیخ محمد بن عارف بن شیخ عبدالحق ردولوی کے مرید تھے۔ ''انوار العیون'' ان کی مشہور تصنیف ہے آپ نے 945ھ/1538 میں وفات پائی۔

عورتیں اُن کے دیدار کے لیے آئیں جب شیخ کو مجلس میں رقصاں دیکھا تو ان میں کی ایک بوڑھی بولی "اس بوڑھے کمزور کو تو دیکھو بے چارہ پیٹ کے لیے کیسا ٹیڑا میڑھا ہو کر ناچ رہا ہے ہائے رے شکم تیرے قربان جاؤں تیرے لیے لوگ کیا کیا نہیں کرتے۔" پھر میں نے کہا اے قاری (عالم) صاحب اسی قیاس پر دوستانِ الٰہی کے بارے میں اپنے اعتقاد کو جانو۔

کار پا کان را قیاس از خود مگیر　　گر چہ باشد در نوشتن شیر و شِیر [1]

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دوستانِ خدا کی محبت ہی محبتِ خدا ہے۔ اور اللہ کا یہ فضل کسی علم سے واسطہ نہیں رکھتا نہ کسی ذریعے سے بلکہ اس ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے دستِ قدرت میں ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے جس کو نہیں چاہتا نہیں دیتا۔

حُسن ز بصرہ بلال از حبش، صہیب از روم　　ز خاک مکہ ابو جہل این چہ بوالعجبیست [2]

جب مجھے پتہ چلا کہ وہ قاری بھی کسی صاحب دل ولی اللہ کی صحبت میں نہیں پہنچا ہے نہ ہی اس راہ کے نشیب و فراز سے واقف ہے اس سے بھی میں مایوس ہو گیا کہ "نفحات الانس" میں ہے کہ سخن عشق جوان مرد ہے۔ جوان مرد کو چاہیے جوان مرد سے ہی بات کرے۔ جس نے کسی اللہ والے کی زیارت اس طرح کی کہ اس کو فنا (فنا فی اللہ) دیکھا تو اس نے گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ (انتہیٰ)

سید احمد غرب (غریب)

سید عمر بیجاپوری کے مرید ہیں تصوف میں سید حسین سواتی کے شاگرد، شیخ محمد فضل اللہ قادری اور سید محمود امروہی کی صحبت اُٹھائے ہوئے اور فیض یافتہ، سید محمود سورتی سے طریقہ نقشبندیہ اخذ کیے ہوئے اور بہت سے مشائخ کبار سے ملاقات کیے ہوئے ہیں، با استقامت و اخلاق، مروت و فتوت عالی سے متصف بزرگ تھے۔ انھیں اس راہ فنا و بقا، توحید و معرفت کی باتوں سے مکمل شناسائی تھی۔ توحید و سلوک کی گفتگو کیا کرتے۔ جمعیت صوری اور معنوی کے ساتھ زندگی

1　پاک باز ہستیوں کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس مت کر۔ اگر چہ لکھنے میں شیر اور شِیر ایک جیسا لگتا ہے۔

2　حسن بصرے کے بلال حبش کے اور صہیب روم کے ہوتے ہوئے مشرف بہ اسلام ہو گئے مگر ابو جہل جو مکّے کا ہوتے ہوئے بھی دولتِ ایمان سے محروم رہا۔ کیا حیرت والی بات ہے۔

گزارتے۔ درویشوں اور آنے جانے والوں کی خوب خاطر مدارات کرتے۔ سورت شہر میں آپ کی سکونت تھی۔ آخرکار رستم خاں دکھنی کی آشنائی کی وجہ سے سنبھل کے نزدیک مرادآباد آگئے تھے۔ وہیں رہنے لگے وہاں بہت تعداد میں لوگوں نے ان سے نسبت وتعلق ارادت پیدا کرلیا اور ان کی صحبت سے بہرہ ور اور مستفید ہوئے۔ ایک بار وہ دہلی آئے تھے وہیں میرے شیخ سے جان پہچان ہوئی۔ بڑے خلوص سے ملے اور متعدد صحبتیں اٹھائیں۔ میرے شیخ ان کے (ذکر احوال میں) حکایت بیان کرنے کے بعد فرماتے کہ وہ اس راہ کے اچھوں میں سے تھے۔ اخلاص واتحاد نسبت کے طفیل پہلے میری ان سے بن دیکھے خط وکتابت رہی اور اس کی باتیں زیر گفتگو آئیں۔ بہت سے سوالات وجوابات جو دقیق عارفانہ باتوں پر حاوی تھے دونوں کے درمیان پیش آئے ان کی تفصیل لمبی ہوجائے گی اس لیے بیان نہیں کرتا۔ اس کے بعد میں نے دوبار ملاقات کی ہے۔ پہلی مرتبہ فیروز پور گاؤں کی بنیاد کے دن۔ وہ مرادآباد سے پہنچے اور میں سنبھل سے۔ شروع میں انھوں نے مجھے نہیں پہچانا نہ میں نے انھیں۔ جب بات چیت ہوئی دونوں نے آپس میں جان لیا۔ اور صحبت نیک گزری۔ ''فیروز پور'' کوسری اور سنبھل کے درمیان سوت ندی کے کنارے سید فیروز نے بسایا تھا۔ کیسی دل خوش جگہ ہے اور وہاں کی عمارتیں اور باغ کیا ہی دل کش ہیں۔ وہاں یہ رباعی کہی گئی

فیروز پور است یا کہ فردوس بریں   معمورۂ ہند گشتہ و فخر زمیں[1]
ہر قصر وے از قصر جنان دادہ نشان   ہر باغ وے از باغ ارم بردہ زیں

دوسری مرتبہ امروہہ میں عرسِ غوث اعظم کی رات کو ہم دونوں ایک گوشے میں ساتھ بیٹھے تھے۔ وقت نہایت خوشگوار تھا۔ میں نے آہستہ سے ان سے عرض کیا۔ سیدی حسبۃ للہ میرے کام کے لیے دعا فرمائیں۔ انھوں نے کہا ''یہ میرے بس کا نہیں، تجھے چاہیے کہ میرے لیے دعا کرے۔ میں نے پھر اُن سے وہی عرض کیا۔ انھوں نے مجھ سے پھر وہی فرمایا۔ آخر میں، میں نے اُن سے عرض کیا۔ وہ دعا کہ جس میں نفسیات شامل نہ ہو اور محض اللہ واسطے ہو وہ شوق ومحبت خداوندی کی زیادتی کا سبب ہوتی ہے۔ وہ دعائے بے بہا ہے۔ یہ سن کر انھوں نے فرمایا۔ اس نیت سے اگر دعا کی

---

1 یہ فیروز پور ہے یا فردوس بریں۔ ہند کی رونق اور فخر زمیں ہے۔ اس کا ہر قصر جنت کے محل کا پتہ دیتا ہے۔ اس کا ہر باغ، باغ ارم کی زینت کو لیے ہوئے ہے۔

جائے کتنی خوشی والی بات ہے۔ اس کے بعد جو ہوا سو ہوا۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ ہمارے پیروں میں سے ایک شیخ کا قول ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اس نے کہا ہے کہ مجھ سے مانگو مجھے پکارو (وقال ربکم) ''اُدعونی استجب لکم۔ وماخلقت الجن والانس الایعبدون[1] '' حدیث شریف میں آیا ہے ''اِنَّ الدعامخ العبادۃ'' (دعا عبادت کا مغز ہے) میں ہرگز دعا نہ کرتا لیکن اس نے خود کہا اور حکم فرمایا کہ مانگ، تو میں مانگتا ہوں ورنہ میں کچھ نہیں چاہتا (راضی بہ رضا رہتا ہو)۔ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے۔ دعا کرنا (اکثر) صوفیوں کا طریقہ نہیں رہا۔ کیونکہ یہ لوگ حکم سابق تقدیر کو دیکھتے ہیں کہ جو کچھ ہونے ولا ہے ہو کر رہے گا۔ ابوحفص بغادر ایک پاس رات گزرنے پر کہا کرتے جو کام ہو چکا اسے میں (دعا مانگ کر) نہ ہوا کیسے کردوں۔ ساری مخلوق اس فکر میں لگی رہتی ہے کہ کیا ہوگا۔ اللہ کے دوستوں کے لیے حیرانی کی بات یہ ہے کہ کیا لکھا ہوا ہے۔ شیخ الاسلام نے فرمایا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دعا نہیں کرنی چاہیے اور کار برآری کے لیے وظیفہ نہ پڑھنے چاہیے۔ میں ہر دن رات میں اپنا روز آنہ کا وظیفہ پڑھتا ہوں اور وہ دعا کی 20 فصلیں ہیں لیکن طلب کچھ بھی نہیں رکھتا۔ وہ صرف زبانی ذکر (دعا) ہے فرمابرداری رب تعالیٰ کی نیت سے۔ ورنہ مجھے دعا سے سوائے اس کے اور کچھ مقصد نہیں ہے۔ ''نفحات الانس'' میں ہی ہے کہ علی بن موفق نے فرمایا اے اللہ اگر میں تیری دوزخ کے ڈر سے عبادت کرتا ہوں تو مجھے دوزخ میں ڈال دے اور اگر جنت کی امید میں عبادت کرتا ہوں تو ہرگز مجھے وہاں جگہ نہ دے اور اگر صرف تیری محبت میں ایسا کرتا ہوں تو مجھے ایک بار اپنا دیدار کرادے۔ پھر اس کے بعد جو تجھے پسند آئے وہ کرنا۔ انتہیٰ۔ جب سید احمد کا وقت رخصت قریب پہنچا چند لمحے سے زیادہ کسی کو اپنے قریب نہ رہنے دیتے۔ اسی نسبت باطنی میں جس کو فنا فی اللہ کہتے ہیں مستغرق تھے۔ ان کی قبر جامع مسجد کے سامنے مراد آباد میں ہے۔ میں نے ان کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ کہا

1 تم مجھ سے مانگو میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ (اور) ہم نے جنات اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اپنی عبادت کے لیے یعنی مجھ سے مانگنے کے لیے۔

قطعہ

چون سید احمد اہل کمالات سلوک راہ حق پیمودہ بیشک
سفر کرد از سرائے بے بقائے شدہ در باغ خلد آسودہ بیشک
بجستم از خرد تاریخ فوتش خرد گفتہ ''بہشتی بودہ بیشک'' [1]

1066ھ

میر محمد جان

وہ میرک جان کے نام سے مشہور ہیں۔ صاحب دل اور پرذوق سید تھے۔ ان کا وطن اصلی ملک بلخ ہے۔ وہیں انھوں نے نشو ونما پائی اور بہت سے مشائخ کبار کی صحبت اٹھائی اور بزگان صاحب آیات وکرامات سے فیض یاب ہوئے۔ عمر دراز پائی۔ آخر میں ہندستان آگئے تھے اور فرید آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ رباعی چند مرتبہ ان سے سنی ہے جسے بڑے ذوق سے پڑھتے تھے۔ پتا نہیں انھوں نے کہاں سے لی تھی

گل گفت مرا ز باغ گلدستہ برید من نازک عالم مرا رُستہ بُرید [2]
در مجلس عاشقان اگر می طلبند گر بے ادبی کنم مرا بستہ برید

1020ھ (1610) میں ان کو میں نے فرید آباد میں دیکھا تھا۔ اور وہ اسی سال دنیا سے چلے گئے تھے۔ وہ جھکی کمر کے ایک بوڑھے شخص تھے۔ صاحب اخلاق وکرم، علم وعمل۔ جبکہ میں نوجوان تھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ صفت احسان، فتوٰی اور مروت کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ ایک مذموم صفت، دل آزاری جو کہ بدترین صفات میں

---

1 بلاشبہ جب سید احمد اہل کمالات سلوک حق طے کر چکے تو انھوں نے اس سرائے فانی سے کوچ کر لیا اور باغ خلد میں آسودہ ہوگئے میں نے عقل سے ان کی تاریخ وفات پوچھی تو اس نے کہا ''بہشتی بودہ بیشک۔'' وہ بیشک جنتی تھے۔

2 گل نے کہا وہ مجھے باغ سے گل دستے میں لے گیا۔ ہائے میں دنیا بھر کا نازک طبیعت مگر کھلتے ہی مجھے توڑ کر لے گیا۔ جب مجھے عاشقوں کی مجلس میں بلاتے اور میں جانے سے انکار کرتا تو (زبردستی) مجھے باندھ کر

سے ہے اس سے منع فرمایا کرتے اور یہ دو شعر پڑھا کرتے

رباعی

در راہ خدا دو کعبہ آمد منزل   یک کعبۂ صورتست و یک کعبۂ دل
تاتوانی زیارت دلہا کن   کافزون بود از کعبۂ قلب مقبل [1]

شیخ سعدی فرماتے ہیں

باحسان آسودہ کردن دلے   بہ از الف رکعت بہر منزلے [2]

سید جاں کا یہ شعر جو کہ ایک مشکل گو شاعر تھے، ان میر محمد جان پر پڑھنا اچھا لگتا ہے (یعنی ان پر صادق آتا ہے:

اللہ اللہ ہر کہ بیند گوید   جان سید شاہ ہر کہ بیند گوید [3]

میرک جان نے دلوں کی رحمت رسانی کو اس مرتبے تک پہنچا دیا تھا کہ اجنبی ہم راہی کا سامان اپنے سر پر رکھ لیتے اور اپنا تعارف تک نہ کراتے۔ خواجہ شیراز نے کہا ہے

اگر شراب خوری جرعۂ فشان بر خاک   ازان گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک [4]

میرے شیخ نے فرمایا کہ ایک وقت میں دو بزرگوں نے آپس میں طے کیا کہ جو پہلے دنیا سے چلا جائے اسے چاہیے کہ آخرت کی کیفیت کی خبر دوسرے کو دے اور بتائے کہ اس جگہ کون سا عمل زیادہ مقبول ہے۔ جب دونوں میں سے ایک کا انتقال ہو گیا وہ دوسرا تین یوم کے بعد اس کے قبر پر گیا اور وعدہ وفا ہونے کی توقع لے کر بیٹھ گیا۔ ایک گھڑی کے بعد ایک لپٹا ہوا کاغذ ظاہر ہوا جب کھول کر دیکھا اس میں یہ شعر لکھا ہوا پایا

---

1 اللہ کے راستے میں دو کعبے آتے ہیں۔ ایک تو یہی ظاہری کعبہ ہے دوسرا باطنی کعبہ دل مقبل ہے۔ جہاں تک تیرے بس کی بات ہو دل (والوں) کی زیارت کیا کر کہ دل مقبول کی عظمت کعبہ کی صورت سے افضل ہے۔

2 (کسی دل کے ساتھ نیکی کر کے اسے آرام پہنچانا راہ حج میں جاتے ہوئے ہر ہر منزل پر ایک ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

3 اللہ اللہ، جو بھی شاہ سید جان کو دیکھتا ہے اللہ اللہ کرنے لگتا ہے یعنی اسے اللہ یاد آتا ہے۔

4 اے شیخ اگر آپ شراب عشق الٰہی پی رہے ہیں تو ایک گھونٹ پیاسی زمین یعنی مریدوں پر بھی بکھیر دیں۔ کیونکہ جس سے دوسروں کو نفع پہنچے اس کام کے کرنے سے کیا ڈرنا۔

چندین فنونِ شیخ نیرزد بہ نیم خس　　راحت بدل رسان کہ ہمین مشرب است و بس [1]

شیخ سعدی قدس سرہ کی بوستاں سے ایک دوسری حکایت سنو

یکے سیرتِ نیک مردان شنو　　اگر نیک مردی و پاکیزہ رو

کہ شبلی ز دوکانِ گندم فروش　　بدہ بُرد انبان گندم بدوش

نگہ کرد مورے دران غلہ دید　　کہ سر گشتہ ہر گوشہ ی دوید

ز رحمت برو شب نیار است خفت　　بماواے او بازش آورد و گفت

مروت نباشد کہ این مور ریش　　پراگندہ گر دانم از جاے خویش

درونِ پراگند گان جمع دار　　کہ جمعیت باشد از روزگار

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد　　کہ رحمت بر آن تربت پاک باد

میا زار مورے کہ دانہ کش است　　کہ جان دارد و جان شیرین خوش است [2]

اے دانائے ہوشمند اس سے زیادہ کیا ثبوت چاہتا ہے کہ صاحب جہاں و جہانیان علیہ الصلوٰۃ والسلام واکمل التحیات نے فرمایا

''ادخال السرور فی قلب المومن خیرٌ من عبادۃ الثقلین'' [3]

نقل ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کے وصال کے بعد جب حضرت عمر (ﷺ) ان کے جانشین بنے تو آپ کے تمام دن رات کے اعمال کو ان کے اہل خانہ سے دریافت کیا۔ گھر والوں نے بتایا

1　(شیخ کے بہت سارے علوم و معارف کی آدھے تنکے برابر نہیں بس کسی دل کو راحت پہنچا کہ یہی راہِ خدا ہے۔

2　ذرا نیک لوگوں کی سیرت کا ایک واقعہ سن۔ اگر تو نیک مرد اور پاکیزہ سرشت ہے۔ کہ حضرت شبلی ایک دن گندم فروش کی دکان سے۔ گیہوں کے بورے اپنے کاندھوں پر گاؤں لے گئے۔ گھر جا کر دیکھا تو ایک چیونٹی غلے میں تھی۔ کہ پریشان ہر کونے میں بھاگی پھر رہی ہے۔ اس پر رحمت کی وجہ سے انھیں رات بھر نیند نہ آئی۔ دوبارہ اس کو اسی کے ٹھکانے پر لے گئے اور خود سے کہا۔ یہ مروت کی بات نہ ہوگی کہ اس چیونٹی کو اس کی جگہ سے میں پریشاں کروں۔ پریشان حال لوگوں کے دل جمعی کر۔ تجھے پروردگار سے جمعیت حاصل ہوگی۔ فردوسی پاک باز کی قبر پر اللہ رحمت فرمائے انھوں نے کیا خوب بات کہی۔ دانہ چنتی چیونٹی کو بھی مت ستا کہ اس میں بھی جان ہے اور جان عزیز (سب کو) پیاری ہوتی ہے۔

3　کسی مومن کا دل خوش کرنا جن و انس کی نفلی عبادت سے بہتر ہے۔

یوں تھے اور یوں تھے۔اور ہر روز زوال کے وقت تھوڑا تر حلوہ بنا کر نخلستان میں لے جاتے تھے (یہ علم نہیں وہاں اس کا کیا کرتے تھے)۔روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھوڑا تر حلوہ لے کر اس جگہ پہنچے۔ایک مجذوم نابینا شخص جس کے ہونٹوں تک ورم آ گیا تھا جس کی بس جان سلامت بچی تھی، پڑا ہوا دیکھا۔حقیقت معلوم کی اور اس کے پاس بیٹھے اور کہا۔''دہن کھول'' اس نے اپنا منہ کھولا، آپ نے اپنی انگلیوں سے لے کر تھوڑا سا حلوہ اس کے منہ میں رکھا جب انگلیاں اس کے ہونٹوں سے ٹکرائیں تو اس نے کہا'' آہ ابو بکر دنیا سے چلے گئے۔''حضرت عمر نے فرمایا۔تو نے کیسے جانا کہ ابو بکر کا انتقال ہو گیا۔بولا۔وہ روز تھوڑا سا حلوہ اپنی زبان کی نوک پر لے کر میرے منہ میں رکھتے تھے۔انجی

ہائے فریاد کہ اس زمانے میں چند بے انصافوں کی جماعت مل کر صرف شریعت کے ظاہری اعمال پر بھروسہ کر کے کمزوروں اور بے چاروں کا دل دکھاتے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ اس بظاہر نیک نظر آنے والے کام کو کیسی بلائیں لپٹی ہوئی ہیں اور اس حلوے کے اندر کیسا زہر ملا ہوا ہے۔کیا وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سات سو مقبول نمازیں حرام کے ایک دانگ کے بدلے چلی جاتی ہیں۔عارف رومی نے فرمایا

ابلہان تعظیم مسجد می کنند　　در صفائے اہل دل جوی می کنند [1]

حضرت مولانا جامی ''سلسلۃ الذہب'' میں فرماتے ہیں۔(اس حکایت کا عنوان ہے ان لوگوں کی مذمت میں جو شریعت کو مسلمانوں کے ستانے کا بہانہ بناتے ہیں اور باطل کاموں کو حق کا نام دیتے ہیں۔)

آنکہ شرع خدا ازوست تباہ　　نیست گویا کہ ہست شرع آگاہ
کردہ در کوی و خانہ و بازار　　شرع و دین را بہانۂ آزار
کار باطل کند بصورت حق　　برد از شرع مصطفیٰ رونق [2]

1　بے وقوف لوگ مسجد کی تو تعظیم کرتے ہیں مگر اہل دل کے صفائے باطن میں نہر کھود دیتے ہیں یعنی انھیں پریشان کر کے ان کی صفائے دل کو مکدر کر دیتے ہیں۔

2　ترجمہ: جس کی دست درازی سے شرع خداوندی تباہ ہوتی ہو گویا وہ شخص شریعت کی حقیقت سے ناواقف ہے۔اس نے گلی کوچوں گھر بازار میں دین و شریعت کے اجرا کے پردے میں مخلوق خداوندی کو ستانے کا بہانہ بنا رکھا ہے۔وہ صورت حق میں بالکل باطل کام کر رہا ہے۔شرع مصطفیٰ کی رونق کو ختم کر رہا ہے۔

می کند پایۂ شریعت پست　　تادہد مایۂ طبیعت دست
میر بازار و شحنہ شہرت　　شرع ازو و از شرع بے بہرست
شرع را تیرہ سازد از نورہ　　قند را شیرہ ریخت در شورہ
کرد اسلام را وقایہ کفر　　کرد طبعش بلند پایۂ کفر
ساخت یکسان زنفس شور انگیز　　دین حق را تنورہ چنگیز
فی المثل گر یکے عوام الناس　　بفروشد سہ چار گز کرپاس
خالی از داغ، صاحب تمغا　　در ہمہ شہر افگند غوغا
اوّل از شرع دست موزہ کند　　زو سوال نماز و روزہ کند
سازد او را نکردہ ہیچ گناہ　　پشت و پہلو ز ضرب درہ سیاہ
کالہ اش را بگردنش ماند　　گرد بازار ہا بگرداند
بعد ازینش سوے عَسَس خانہ　　بفرستد براے جرمانہ
تا ستاند عسس بچوب از وے　　بہر شحنہ بہاء شاہد وے
این و امثالِ این فراوان است　　کہ بران بدنہاد تا وانست [1]

1　وہ شریعت کا مرتبہ پست کر رہا ہے تاکہ نفسانیت کو بڑھاوا مل جائے۔ حاکمِ بازار ہو کہ کوتوال شہر، شریعت ان دونوں سے اور یہ دونوں شریعت سے بے بہرہ ہیں۔ اس نے "نورہ" کتاب پر عمل ظاہری کے پردے میں شرع کو تاریک کر دیا ہے۔ وہ شکر قند کا شیرہ شورے میں ملاتا ہے اور اسلام سے کفر کی باڑھ کا کام لے رہا ہے۔ اس کی طبیعت نے مرتبہ کفر بلند کر رکھا ہے۔ نفس شور انگیز سے اس نے دین حق کا چنگیزی تنور گرم کر رکھا ہے۔ مثلاً اگر کوئی عوام میں سے تین چار گز کپڑا بیچتا ہے اگر چہ کتنا ہی بے داغ اور نفیس ہو لیکن حاکمِ بازار سارے شہر میں شور و غوغا مچا دیتا ہے۔ اوّل دست درازی کے لیے ہاتھ پر شرع کا دستانہ پہنتا ہے پھر اس غریب سے روزے نماز کا سوال کرتا ہے۔ پھر اسے ناکردہ گناہ سے منسوب کر دیتا ہے اور پھر دُرّے کی مار سے پشت اور پہلو کو سیاہ کر دیتا ہے۔ اس کا سامان اس کی گردن میں ڈال کر سارے بازار میں رسوائی کے لیے چکر لگواتا ہے۔ اس کے بعد اس کو جرمانے اور سزا کے لیے کوتوالی بھیج دیتا ہے۔ تاکہ سپاہی بہ زورِ چوب کوتوال شہر کے معشوق اور شراب کے لیے اس سے رقم اینٹھے۔ یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے ہیں جن بد باطنوں پر ظلم کی وجہ سے شرعاً حکم تاوان ہے۔ مکر و فریب سے یہ لوگ دشمن دین بنے ہوئے ہیں۔

خصم دین شد بحیلہ و دستان — اے خدا داد دین از و بستان
شرع را خوار کرد و خوارش کن — شرم بگذاشت شرمسارش کن
خود چہ حاجت کہ من دعا کنمش — بر جگر ناوک وِغا ز نمش
پیشتر زین ہشت صد و ہفتاد — بدعایش رسول دست کشاد
کاے خدا ہر کہ کرد نصرت دین — در دو کونش نصیر باش و معین
وانکہ خذلان شرع خواست امروز — در دل و جانش تیر خذلان دوز
خود چہ خذلاں ازان بتر کہ کسے — باغ رضوان بدل کند بخسے
روے در خلق، پشت بر مولیٰ — دین فروشی کند پے دنیا
بدہد دین و دنیا اندوزد — شمع دین بہر دنیا افروزد [1]

انتہی

''رشحات'' میں ہے کہ مولانا سعد الدین کاشغری [1] قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نجات کے حصول کا موجب ہے۔ لیکن اطاعت میں ادب، اللہ تعالیٰ سبحانہ کے قرب کا سبب ہے۔ کاملان مشائخ قدس اللہ ارواحہم کی یہی تحقیق ہے۔ چاہیے کہ اپنے باطن کو صاف کرے، تصفیہ اور تزکیہ میں مشغول ہوتا کہ دوام مراقبہ ذات حاصل ہو جائے۔ اس کے بغیر جو بھی اعمال بجالائے گا وہ اس کی دُوری کو ہی بڑھائیں گے۔

---

1 اے اللہ ان سے اپنے دین کا انتقام لے لے۔ شرع کو اس نے خوار کیا، اللہ تو اس کو ذلیل و خوار کر۔ اس نے شریعت کو خوار کیا ہے تو اس کو ذلیل و خوار کردے۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اس کے لیے بددعا کروں اور اس کے کلیجے پر جہاد کا تیر چلاؤں۔ اب سے آٹھ سو ستر سال پیشتر خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے بددعا کی ہے کہ اے خدا جو تیرے دین کا مددگار ہو تو اس کا ناصر و معین بن جا اور جو دین و شریعت کو خوار کرے اس کے دل و جان میں ذلت کا تیر پیوست کردے۔ اس سے زیادہ اور کیا ذلت ہوگی کہ جنت کے بدلے میں حقیر دنیا پر جان دیتا ہے۔ چہرہ تو مخلوق کی طرف اور پشت اپنے مولیٰ کی جانب کیے ہوئے دنیا کے لیے دین بیچ رہا ہے۔ دین دے کر دنیا بٹور رہا ہے۔ دین کی شمع دنیا کے لیے جلا رہا ہے۔ (انتہی)

2 آپ کی وفات 7/ جمادی الآخر 860ھ مطابق 10/ مئی 1456 کو بدھ کے دن بعد نماز ظہر ہوئی۔

ہر چہ گیرد علّتی علت شود (انتہیٰ) [1]

کہتے ہیں کہ لاہور میں ایک فقیہ مدرس تھے ایک دن ایک شکستہ دل غریب شخص نے مزامیر (گانے بجانے کے آلات) کی حرمت کا مسئلہ دریافت کیا۔ سلسلہ گفتگو میں طنبور (ساز) کا بھی ذکر آیا۔ مدرس صاحب نے دریافت کیا طنبور کیسا ہوتا ہے؟ اس غریب شکستہ خاطر نے کہا وہ کفگیر کی طرح ہوتا ہے۔ اس بات سے انھیں غصہ آ گیا۔ جو کتاب ان کے ہاتھوں میں تھی اس بے چارے کے سینے پر دے ماری اور قہر آلود لہجے میں کہا۔ اے نامعقول حرام چیز کی تشبیہ ایسی چیز سے دیتا ہے جس سے طعامِ حلال نکالا جاتا ہے۔ اس بیچارے عاجز و ناتواں نے اس چوٹ سے جو کہ اس کے سینے پر آئی آہ بھری کھڑا ہوا اور چلا گیا۔ شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا

سرہنگ لطیف و خوش گفتار بہتر ز فقیہ مردم آزار

جاہل نادان، پریشان روزگار بہ ز دانشمند نا پرہیزگار

کان ز نابینای در رہ اوفتاد وین دو چشمش بود در چہ او فتاد [2]

بلا ارادت کا شاگرد عاشق تہی دامن ہے۔ بے معرفت کا سالک بے پر کا، پرند ہے۔ زاہد بے علم بغیر دروازے کا گھر ہے۔ اور عالم بے عمل بے پھل کا درخت ہے۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ اس نے خود کو شان و بزرگی اور تعلق مع اللہ میں مشہور کر رکھا تھا میر سید فیروز نے فرمایا کہ میں نے ایک دن ان کی مجلس میں غضبناک ہو کر قہر آلود لہجے میں کہا کہ اے احمق شاید تجھے اپنی قدر معلوم نہیں کہ ایسی صفت قبیح غرور و بڑائی کے ہوتے عزت کا خواہاں ہے۔ تیرا یہ غرور تیرے منہ پر پھینک کر مارنا چاہیے۔ میر سید فیروز نے فرمایا کہ امیر دکنی جو کہ اپنے علاقے میں صفتِ دین داری اور مسلمانی سے متصف تھے ایک دن دستر خوان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خبر آئی کی ایک صالح بزرگ امیر کے دیدار کے لیے ہندستان پہنچے ہیں اور دروازے پر بیٹھے ہیں۔ امیر نے ان کو طلب کیا اور

---

1 بیمار جو بھی غذا لیتا ہے وہ بھی اس کے حق میں بیماری ہی بن جاتی ہے۔

2 خوش گفتار اور مہربان مزاج سپاہی۔ مردم آزار فقیہ سے بہتر ہے۔ بے پڑھا، نا سمجھ، پریشان حال۔ ناپرہیزگار عالم سے بہتر ہے۔ کیونکہ وہ تو آنکھ نہ ہونے سے راستہ میں گرا ہے۔ یہ دو آنکھوں کے ہوتے کنویں میں گر گیا ہے۔

دسترخوان پر بٹھایا۔ دکن میں طریقہ (شریعت) ہے کہ ایک شخص کھانا کھا کر دسترخوان سے اٹھ جاتا ہے تو دوسرا آکر اس کی جگہ بیٹھ کر بچا ہوا کھانا کھانے لگتا ہے اسی طرح اسی برتن میں اور کھانا ڈالتے رہتے ہیں۔ آخر تک "سود المومن شفاءٌ" حدیث کے موافق ایک دوسرے کا جھوٹا کھاتے رہتے ہیں۔ وہ بزرگ وہاں کی اس رسم دین کو نہیں جانتے تھے۔ جب انھوں نے طباق سے آدھا کھانا کھالیا تو باقی آدھے اپنے جھوٹے بچے ہوئے کھانے کو طبق سے الگ کرنے لگے۔ امیر نے جب یہ دیکھا تو غضبناک ہو کر فرمایا۔ اس کھانے کو کیوں ہٹاتے ہو کیا کسی کتے نے کھایا ہے یا مرغ نے؟ پھر خادموں سے فرمایا۔ انھیں اٹھاؤ اور دروازے سے باہر کردو۔ سپاہیوں نے کھینچ کھانچ کر انھیں دسترخوان سے الگ کر دیا۔ اسی امیر کا یہ واقعہ بھی بعض لوگ نقل کرتے ہیں کہ ایک رات وہ نماز میں تھے کہ ان کے کم عمر بچے کے دامن میں شمع سے آگ لگ گئی وہ لڑکا ان کے سامنے سارا جل گیا مگر انھوں نے نماز نہ چھوڑی۔

حافظ صالح تھانیسری

شیخ عبدالحی تبتی کے مرید ہیں اور وہ شیخ احمد سرہندی کے مرید ہیں۔ صالح، صائم الدہر، حافظ کلام مجید، مستقیم الحال اور اخلاق والے ہیں۔ میرے شیخ کے آشناؤں میں ہیں۔ میرے شیخ انھیں راست کردار اور نیکوکار فرماتے ہیں۔ میری ان سے پرانی دید شنید اور آشنائی ہے۔ شروع میں، میں نے سنا تھا کہ ان کے ہاتھ میں زخم ہے جس میں بہت تکلیف رہتی ہے اور اس میں کیڑے پڑ گئے ہیں اور وہ کسی بھی کیڑے کو اس زخم سے زمین پر نہیں گرنے دیتے اسی طرح درد والم سے خوبی کے ساتھ نباہ کر رہے ہیں۔ عنداللہ ان کی بات مانی جاتی ہے۔ جس کام اور جس مہم کے لیے جیسا ان کی زبان سے جاری ہوتا ہے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ ایک زمانے میں وہ دوسروں کی بھلائی کی نیت سے ضرورت مندوں کے نفع کی غرض سے رستم خاں دکنی کے ساتھ رہے ہیں۔ وہ ایسے امیر تھے جنھیں خیر زماں کہتے ہیں کہ ایک عالم ان سے نفع اٹھا کر جمعیت صوری بلکہ معنوی کو پہنچا اور وہ باوجود جود وسخا کے اس مرتبے کے فقرا کے نیاز مند ہیں اور ان کے نیازمندوں کے ساتھ متواضع تھے۔ جس وقت انھوں نے دامن کوہ کمایوں کے قلعہ

''ڈر پور'' کو فتح کر کے اس کا نام ''رسول پور'' رکھا۔ تمام فقرا اور صلحا وہاں آئے ہوئے تھے۔
جمعہ کی رات میں اور پیر کی رات میں مولود خوانی کی مجلس گرم تھی اور وہ بھی اس مجلس مولود میں
باادب تمام بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت اس قلعے کے نیچے ہنود کے حفاظتی دستے کے سپاہی ان
کے حکم سے ان کی تفریح گاہ کی نگہبانی کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک رات کو غریب و نامراد حافظ
عبداللہ دہلوی اس میدان میں جا کر قضائے حاجت کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ پہرے داروں نے
حافظ صاحب کو باہر نکال دیا۔ اس بات سے سارے حفاظ اور مولود خواں حضرات رنجیدہ ہو گئے
اور چاہا کہ وہ پہرے دار برطرف ہو جائیں۔ امیر رستم خاں نے کہا۔ پہرے دار میرے کہنے
کے مطابق اس جگہ کی نگہبانی کر رہے تھے۔ اس معاملے میں اُن کی غلطی نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے
کہ معاف کر دیں۔ انھوں نے کہا کہ جو مسلمانوں کی اہانت کرے اس کو سزا دینی واجب ہے۔
یہ سن کر امیر مسند سے اتر کر نیچے بیٹھ گئے سر جھکایا اور کہا لیجیے میں حاضر ہوں جو سزا دینی ہے مجھے
دے لیں۔ ان کی اس پسندیدہ ادا پر سب نے آفریں کہی۔ بعض تو آنکھوں میں آنسو بھر کر رو
دیے اور ان کی خاکساری پر شکر خداوندی بجالائے۔

تواضع ز گردن فرازان نکوست　　گدا گر تواضع کند خوے اوست [1]

اس کے بعد امیر رستم خاں دکھنی نے میر سید فیروز کی خوبی طاقت اور تدبیر سے لشکر ایران پر فتح
حاصل کر لی۔ اور بہادر فیروز جنگ کا خطاب پایا اور امرا شاہجہانی میں معزز ہو گئے اور اپنی انگوٹھی کا
سجع یہ بنایا

بفتح لشکر ایران ز لطف شاہجہان　　شدہ بہادر فیروز جنگ رستم خان

آخر 7 / رمضان 1068ھ (25 / مئی 1658) میں اکبر آباد کی جنگ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔
میں چونکہ ان سے پہلے بارہ سال اور دس سال چند ماہ ان کے ساتھ لشکری رہ چکا ہوں۔ وہ مجھ پر
بے حد لطف فرماتے۔ ان کی ہمراہی میں میں بے جمعیت قلبی نہیں رہا ہوں۔ میں نے ان کی تاریخ
وفات میں یہ قطعہ کہا

1　اونچی گردن والوں یعنی صاحب مرتبہ لوگوں سے تواضع اچھی اور خوبی کی بات ہے۔ گدا اگر تواضع کرتا
ہے تو کیا خوبی ہے اس کی تو عادت ہے۔

چون بہادر رستم فیروز جنگ　　عالمے در مدحتِ او لب کشود
در شجاعت رستم و سنان عصر　　در سخاوت حاتم آفاق بود
ترکتازی کرد در میدان ہند　　سر خرو گشت و بجنت رفت زود
چون فریدے مرتضٰی خان در جہان　　داد، خورد و بُرد، را خوش وا نمود
سال تاریخ و فاتش عقل گفت　　بُرد رستم گوے از میدانِ جود [1]

ان کے بیٹے رفعت خاں اور عظمت خاں ان کے بھتیجے اور دوسرے چند وفادار بھی ان کے ساتھ شہید ہو گئے۔ جبکہ وہ امیر سنبھل تھے۔ ایک بار بادشاہ نے فرمایا کہ انھیں سنبھل سے تبادلہ کر کے گجرات بھیج دیں انھوں نے حافظ صالح سے رجوع کیا۔ حافظ صاحب نے کہا اس شرط کے ساتھ کہ اگر بادشاہ آپ کو واپس سنبھل لوٹا دیں تو آپ مجھے تھانیسر جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں گے۔ تو میں دعا کروں۔ انھوں نے کہا ''ہاں ہاں'' اور اسی دن بادشاہ نے دوبارہ انھیں سنبھل کی امارت دے دی۔ یہ واقعہ اکبرآباد کا تھا۔ ایک مرتبہ اور بادشاہ نے حکم دیا کہ سنبھل شاہزادے کو دے دیں اور انھیں اپنے حضور طلب کر لیا۔ اس بار بھی حافظ صالح صاحب سے رجوع کیا اور اس بار بھی ان کی دعا و توجہ کے طفیل سنبھل کی حکومت پر ہی بحال رہے۔ میں ان دونوں واقعات سے واقف ہوں۔ ایک دن شہزادے نے چاہا کہ ہم لوگ حافظ صاحب کے پاس چلیں یا حافظ صاحب ہمارے پاس تشریف لائیں۔ انھوں نے دونوں صورتوں سے انکار کر دیا۔ ایک زمانے میں امیر رستم خاں نے میر سید فیروز کو اپنا وکیل مطلق بنا کر حکومت کا کاروبار ان کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی اسی زمانے سے حافظ صاحب سے نیاز اور اخلاص رکھتے ہیں۔ اور آج اس سے بھی زیادہ عقیدت ہے۔ سید فیروز شروع میں سات سال کی مدت ہوئی بف خان نام کے ایک

1　جب بہادر فیروز جنگ رستم خاں نے کہ جن کی تعریف ایک دنیا کر رہی ہے جو کہ شجاعت میں رستم اور سنان عصر تھے اور سخاوت میں حاتم آفاق تھے میدان ہند میں بہادری کے جوہر دکھائے۔ سرخرو ہوئے اور بہت جلد جنت چلے گئے۔ شیخ فرید مرتضٰی خاں کی طرح امیر رستم خاں نے بھی دنیا میں دوسروں کو دینے، کھلانے اور اپنے ساتھ لے جانے کو پسند کر لیا۔ ان کی تاریخ وفات عقل نے کہی ''برد رستم گوئے از میدانِ جود'' میدانِ سخاوت میں رستم خاں بازی لے گیے۔

نوجوان کی محبت میں جو کہ حسن وزیبائی میں بےنظیر اور نغمہ سرائی میں عالم گیر تھا سنبھل سے آئے اور درویشوں کے لباس میں وقت گزارا اور عاشقی اختیار کی۔ اور بہت سے عجائب وغرائب اس راہ محبت کے دیکھے [1] ۔ میں نے بھی بف خان کو دیکھا اور اس کا گانا سنا تھا۔ الحق وہ ایسا ہی تھا۔ ایک دن سید (فیروز)۔ ملک دکن کے جنگل میں سوئے ہوئے تھے۔ ان کے والد سید امجد نے خواب میں ان کے لات ماری اور کہا کیا سوتا ہے، اُٹھ اس نوجوان کی خبر لے۔ سید فوراً اٹھ بیٹھے اور بف خان کو ایک بدکردار دنیادار کی قید میں پایا تو پوری طاقت اور دلیری سے اس نوجوان بف خان کو چھڑا کر لائے اور حسبِ مراد دل اس کے حسنِ خداداد کا دیدار کیا۔ صحبت اٹھائی۔ میر سید امجد بڑے باہمت وفتوت صاحب اخلاق وکرم بزرگ تھے۔ وہ میرے والد کے ماموں تھے۔ آپس میں ہم جدی کی نسبت بھی تھی جیسا کہ اس کتاب کے خاتمے میں آتا ہے۔ میرے والد فرماتے تھے کہ ایک بار ایک لشکری نے مجھ سے پچاس روپے قرض مانگے میں نے ماموں صاحب سے کہا یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ لشکری کہاں کا ہے اور کیا نام ہے اور بے تامل روپے نکال کر دے دیے۔ میں، وہ لشکری اور دوسرے حاضرین ان کی اس ہمت سے حیران ہوگئے۔ سید امجد سنبھل میں قبیلے کے دوسرے بچوں کی بہ نسبت راقم الحروف (سید محمد کمال) پر زیادہ شفقت اور مہربانی فرماتے تھے۔ ایک دن ڈھاک شہید کی زیارت کو جو کہ سنبھل سے دو فرسنگ ہے گئے۔ اپنے بیٹے سید فیروز اور اپنے بھتیجے سید جعفر ولد سید اشرف، میرے نانا شیخ یحییٰ کے فرزند میرے ماموں شیخ خلیل، میں اور خاندان کے دوسرے چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سید فیروز سب سے بڑے تھے۔ اور ہم سب کم عمر تھے۔ مجھے ایک بہترین گھوڑے پر سوار کیا تھا۔ اس مقام ڈھاک شہید کے اردگرد بڑی خوبصورت جگہ تھی اور نہایت دلکش درخت تھے جن کے نام بھی معلوم نہ تھے۔ وہ سارا دن آنے جانے میں بڑی خوشی اور خرمی میں گزرا۔ سید امجد کی تاریخ وفات 2 ذی الحجہ 1020ھ (26 جنوری 1612) ہے۔ ان کی قبر دہودس کے قریب ہے۔ میر سید فیروز نے فرمایا کہ ایک زمانے میں، میں سید عبدالرحیم خاں دکھنی جو کہ پنج ہزاری سپہ سالار اور نیک کردار شخص تھے کے ساتھ تھا۔ عادل خاں بیجاپوری نے ان کو صاحب مدار بنا رکھا تھا۔ اس کے بعد ایک معاملے میں ان کو گرفتار کر کے بیجاپور کے ساتویں قلعہ میں اپنے کوشک

---

1 منزل مقصود پر پہنچ کر راستے کے یہ عجائب وغرائب سب جاتے رہتے ہیں۔

کے نیچے قید کر کے رکھا تھا اور میں اسی روز اسی پردیس کی جنگ میں زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔ جب اچھا ہو گیا۔ دوستی کی زیادتی کے سبب جو کہ میں ان سے رکھتا ہوں۔ چھ ماہ تک وہاں رہا اور ایسی عجیب وغریب تدبیریں کہ انسان کی بس کی بات اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتی کرتا رہتا تھا۔ ایک دن ان کو اس قید خانے سے نکال کر قلعہ شہر کی دیوار پر پہنچا۔ کنگرہ پر رسی باندھی اور نیچے اتار لایا۔ اور پایاب پانی کی خندق سے گزار کر دولت آباد لے آیا۔ اس کے بعد وہ دولت شوکت جاہ و مرتبے میں ممتاز ہو گئے۔ اس قصے کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کتاب میں کہ بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے اتنا ہی کافی ہے۔ سید فیروز نے ہی فرمایا ہے کہ میں نے شروع میں ایک رات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ باکمال وعظمت و دبدبہ بداؤں دروازے سے سنبھل میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں لوگوں سے آپ کی تشریف آوری کی وجہ پوچھ رہا ہوں لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ بی بی عائشہ کو دیکھنے آئے ہیں۔ اس کے بعد میرے گھر میں املی کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھے ہیں۔ میری والدہ سفید چادر چہرے پر اوڑھے ہوئے آئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک میں گر پڑیں اور مجھے بھی ڈال دیا۔ آنحضرت نے اپنا دستِ مبارک میرے سر اور پشت پر اور میری والدہ کے سر پر پھیرا اور عنایات اور الطاف کی برسات فرمادی۔" اس دن کے بعد ہی سے سید فیروز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الطاف وعنایات کے طفیل جمعیت صوری اور معنوی سے مشرف ہوئے ہیں۔ سید فیروز کی والدہ صاحبہ نے صدق وراستی کے ساتھ زندگی گزاری اور کمال کے ساتھ قبیلہ پروری اور خبر گیری کی رسم نباہی ہے۔ آخر 24 رمضان 1060ھ (9 ستمبر 1650) کو دنیا سے رخصت ہوئیں۔ وہ میری دادی لگتی ہیں۔ میں نے ان کی تاریخ لکھی ہے

چون ام المومنین دہر از دہر — شدہ در روضۂ قدس تبارک
غریبان جامۂ جان چاک کردند — بدردِ ماتمش ہر خانہ یک یک
ہمہ اخلاق او بودہ بعالم — چو خُلق فاطمہ خیر و مبارک
چو پر سیدم ز دل تاریخ فوتش — دلم گفتا "بہشتی بود بیشک" [1]

1060ھ

---

1 جب اپنے زمانے کی ام المومنین دنیا سے قبر مبارک میں چلی گئیں۔ غریبوں نے ہر گھر میں ان کے درد وغم میں اپنی جان کے لباس چاک کر دیے۔ دنیا میں ان کے تمام اخلاق حضرت فاطمہ کی طرح اچھے تھے۔ جب میں نے دل سے اُن کی تاریخ وفات دریافت کی۔ میرے دل نے کہا "بہشتی بود بیشک" وہ بلاشبہ جنتی تھیں۔

آج ان ہی کے طریقے پر سید فیروز کی اہلیہ میری بہن ہیں جنھوں نے مجھ سے ہی ذکر باطن حاصل کیا ہے اور مشغولی رکھتی ہیں۔ رابعۂ وقت باغیرت و باہمت، صفائے ظاہر و باطن رکھنے والی۔ معاملت میں مستقیم اور سخاوت میں روشن و ہویدا ہیں۔ ایک دن میں نے ان کے شوہر سید فیروز کے انتقال کے بعد ایک موقع پر ان سے کہا۔ اوقات غم میں اگر تمھیں کوئی قبض لاحق ہو تو مجھ سے اس کا اظہار کرنا تاکہ حسب قدرت تدارک کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے ایسا جواب دیا جو آب زر سے لکھنا چاہیے کہ میرا عقیدہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا علیہ السلام کے اعتقاد کے مطابق ہے۔ جس وقت انھیں آگ میں ڈالا گیا ابراہیم علیہ السلام سے ''جبرئیل علیہ السلام'' نے کہا ''هل لک حاجةٌ بِی'' آپ کو میری کوئی ضرورت ہے۔'' فرمایا ''بـلـی فلکابک'''' حاجت تو ہے مگر تم سے نہیں۔'' پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا ''سل ربک'''' تو اپنے رب سے کہیے۔'' ابراہیم علیہ السلام نے کہا ''حسبی سوالی علمه بحالی''۔ میرے سوال سے اس کا میرے حال کو دیکھنا میرے لیے کافی ہے۔ خواجہ احرار نے فرمایا ہے

جام جہان نما ست ضمیر منیر دوست　　اظہار احتیاج خود آنجا چہ حاجت ست [1]

ان کے اس مقولے سے میں بہت خوش ہوا اور میں نے انھیں مقبولان خاص الٰہی میں جانا۔ میر سید فیروز میری شناسائی کی وجہ سے میرے شیخ سے بھی بغیر ملاقات کیے محبت کرتے تھے۔ اس طرح خود کو اُویسی کہتے تھے۔ اس کے بعد میرے شیخ کی صحبت میں پہنچے اور مقبولان خاص میں ہو گئے۔ ایک روز سید فیروز نے مجھ سے خاص طور پر کہا کہ میں لاہور جارہا ہوں دل چاہتا ہے کہ خواجہ خرد کو لاہور لے جاؤں۔ (یہ سن کر) انھوں نے فرمایا مجھے ایک آزار ہے اور بعض بچے بھی بیمار ہیں اس وجہ سے جانے سے معذور ہوں۔ میں نے ازروئے اخلاص اجازت لے کر عرض کیا۔ خواجم! آپ کے متعلقین کے آزار کو میں دور کرتا ہوں۔ میں نے شوربا پکایا اور انھیں پینے کو دیا فوراً صحت ہوگئی۔ پھر میں نے سواری، پالکی، بیل اور سفر خرچ پیش کیا اور ان کو لاہور روانہ کیا۔ جانے کے بعد میں نے سنا کہ ایک فرزند ارجمند کو شادی کی رات کو مشکل ہو گئی اور شکایت باہ درپیش ہے۔ اس فکر میں میں ایک رات کو اٹھا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنیاز جھکا کر عرض کیا اے اللہ میں خود کو خواجہ پر فدا کرنا

1　دوست کا دل روشن، جامِ جہاں نما ہے۔ وہاں اپنی احتیاج کا اظہار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

چاہتا ہوں کہ ان کے بیٹے کو میری ضمن میں صحت عطا فرمادے) اسی دوران ایک جوان نے حلوائے شیر اور مرغ میری نذر کیا۔ میں سمجھ گیا کہ میری نیّتِ قربانی کا بدل یہ مرغ ہے۔ ذبح کر کے اس کو کھلا دیا۔ چند دن میں ہی کامیاب ہوگیا۔ اسی مدّت میں وہاں لاہور میں خواجہ کے معشوق و محبوب نے مدّت کی جدائی کے بعد ان سے ملاقات کی۔ اس وقت سید فیروز مقرب و معزز بادشاہ وقت ہیں۔ اس راہ کی گفتگو بہت صفائی سے بے خار کرتے بھی ہیں اور خوب سمجھتے بھی ہیں۔ بظاہر وہ جس رنگ میں بھی ہوں مگر نیّت درست و راسخ رکھتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ قباپوشی یا عباپوشی، اعمال ظاہری ہوں یا باطنی سب میں نیّتِ درست ہر حال میں مطلوب ہے۔ نبی (حضرت محمد) صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ترین حدیث ''انـماالاعمال بالنیات '' ہے (اعمال کا مدار نیتوں پر ہے) روایت ہے کہ ایک بار دو تاجر خرید و فروخت کی غرض سے ایک شہر کے لیے ساتھ ساتھ سفر پر روانہ ہوئے۔ ایک کی نیّت خریداری غلّہ اور دوسرے کی چمڑا خریدنے کی تھی۔ رات کو دونوں شہر کے بڑے مشائخ میں سے ایک صاحب کی خدمت میں (بغرض برکت و دعا) حاضر ہوئے۔ وہ فراست صادقہ سے دونوں کے احوال سے واقف ہو گئے۔ غلّہ خریدنے والے کو اپنے ساتھ کھلایا اور بہت لطف فرمایا مگر سوداگر چرم سے بات بھی نہ کی۔ دونوں اپنا اپنا سودا خرید کر پھر ان بزرگ کی خدمت میں پہنچے۔ اس بار بجائے خریدار غلّہ کے چمڑے والے پر لطف فرمایا۔ دونوں نے عرض کیا اے شیخ پہلی بار آپ نے جیسا سلوک کیا اب اس کے برعکس کیا اس میں کیا مصلحت تھی؟ فرمایا چلتے وقت خریدار غلّہ کی نیت تھی کہ اس شہر میں غلہ سستہ ہو، تا کہ میں حسب مراد خریدوں اور کھالوں کے خریدار کی نیت تھی کہ اُس علاقے میں بیل زیادہ مریں تا کہ میری برآئے۔ میں نے تم دونوں کی نیتوں کے مطابق ویسا ہی برتاؤ کیا مگر اب واپسی میں صاحب غلّہ کی نیت تھی کہ میرے شہر میں غلہ مہنگا ہوتا کہ مجھے فروخت میں نفع ہو۔ اور صاحب چرم کی نیت تھی کہ میرے ملک میں بیل نہ مریں تا کہ میں کھالیں بیچ کر نفع اُٹھا سکوں (پہلے غلے والے کی نیت بھلائی کی تھی اور اب چمڑے والی کی اس لیے میں اب اس کے برعکس پیش آیا ہوں) انتہی

''نیـت الـمومن خیرٌ من علمه'' (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوتی ہے) میرے والد فرماتے تھے کہ شیخ فرید مرتضٰی خاں جس وقت اکبر بادشاہ کے بخشی تھے انھوں نے سید محمد محتسب دہلوی

(متوفی: 1017ھ/1609) جو کہ نورانی طلعت بزرگ آدمی تھے۔ انھیں اکبرآباد بلایا تا کہ بادشاہ کے سامنے پیش کر کے ان کی خدمت بجالائیں۔ انھیں اپنے پاس بٹھایا۔ اسی دوران سنا کہ بادشاہ کا دیوان ٹوڈرمل بادشاہ کی آمد کا منتظر کھڑا ہے۔ شیخ اس کے پاس گئے اور سید صاحب کا بہت تعریف و توصیف کے ساتھ تعارف کرایا۔ ٹوڈرمل انھیں ایک نظر دیکھتے ہی معتقد ہو گیا اور بطور نیازمندی کہا۔ اے سید میرے لیے دعا فرمائیں۔ انھوں نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اور کہا اللہ تجھے مسلمان کرے۔ شیخ فرید اس بات سے فکر میں پڑ گئے اور سوچا ایسا نہ ہو کہ میرے معاملہ میں ان کی ہمدردی کرنے سے کوئی رخنہ پڑے۔ ٹوڈرمل نے شیخ سے کہا۔ پریشانی و پشیمانی کی کوئی جگہ نہیں کہ سید صاحب کی نیت درست ہے۔ جوان کے نزدیک بہتر تھا میرے لیے چاہا۔ اب میں قبول کروں یا نہ کروں۔ ایک بزرگ نے فرمایا ہے۔

من آنچہ شرط بلاغست با توی گویم   تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال [1]

اس کے بعد دیوان نے سید صاحب کو بادشاہ کے سامنے لے جا کر اچھی طرح سمجھایا اور بہت جلد وہ انھیں کامیاب رخصت کیا۔

سید محمد سرسوی

وہ بااستقامت بزرگ ہیں۔ صاحب معاملت اور غربت پیوستہ۔ اپنے گوشہ خانہ میں اوراد و وظائف میں مشغول رہنے والے۔ بزرگی کے آثار اور برکات ان سے ظاہر ہیں۔ کبھی کبھی تشریف لاکر مجھے خوش کرتے رہتے ہیں اور بہت شفقت و مہربانی فرماتے ہیں۔ حالت خاکساری اور نیازمندی ان سے ظاہر ہوتی ہے۔ خاکساری اور نیازمندی کے طریقے کی تعریف میں خواجہ شیراز نے فرمایا ہے

در راہ ماشکستہ دلی می خرند و بس   بازار خود فروشی ازان راہ دیگر است [2]

میرے شیخ شکستگی اور خاکساری کی صفت میں بہت سی باتیں بیان کرتے رہتے ہیں۔ اُن میں سے

---

1 حق بات پہنچانے کا حکم ہے اس لیے میں تجھ سے کہتا ہوں۔ اب تیری مرضی ہے نصیحت حاصل کر یا بُرا مان جا۔

2 ہماری راہ میں شکستہ دلی کی ہی خریداری کرتے ہیں خودنمائی اور خودفروشی کا بازار اس راہ سے الگ لگتا ہے۔

ایک آیۂ کریمہ "یقول الکافر یا لیتنی کنت تراباً" (کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا) کی تفسیر میں ایک تازہ توجیہ بیان کی ہے۔ کہا کہ کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا۔ اور خاکساری کی صفت مسلمانی کا خاصہ ہے۔ یعنی کہے گا کہ کاش میں مسلمان ہوتا۔ سید محمد جب بھی مجھے اپنے مبارک قدموں سے مجھے خوش فرماتے رہتے ہیں۔ میں جو کہ بزرگوں سے ادب و نیازمندی سے پیش آتا ہوں خود سے کہتا ہوں کہ یہ نسبت اور بزرگوں کے سید محمد کے ادب کا خیال رکھنا زیادہ اہم ہے اور ان کے ساتھ صادق القلب اور راست قول رہنا چاہیے کیونکہ انھوں نے خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کا دیدار کیا ہے جب کہ میں نے خواجہ بیرنگ کو نہیں دیکھا۔ "نفحات الانس" میں ہے کہ ایک بار علی بن پندار بن حسین صوفی شیخ ابوعبداللہ خفیف کے ساتھ ایک تنگ پل پر پہنچے۔ شیخ عبداللہ خفیف نے ان سے کہا اے ابوالحسن آپ آگے چلیے۔ علی بن پندار نے کہا۔ میں کس سبب سے آگے بڑھوں۔ ابوعبداللہ خفیف نے کہا آپ نے حضرت جنید بغدادی کو دیکھا ہے اور میں نے نہیں دیکھا۔ اسی کتاب میں ہے کہ خلیفہ بغداد نے حضرت رویم سے کہا۔ اے بے ادب۔ انھوں نے کہا۔ میں بے ادب کیوں؟ میں تو ایک زمانہ حضرت جنید کی صحبت میں رہا ہوں۔ جو شخص ان کی صحبت میں آدھا دن بھی رہا ہو اس سے بے ادبی نہیں ہوتی تو پھر جو زیادہ رہا اس سے کیسے ہوگی؟ سید محمد نے فرمایا جس وقت کہ خواجہ بیرنگ دہلی سے سنبھل تشریف لائے تو شیخ تاج الدین کے مکان میں فروکش ہوئے ہیں۔ اس وقت میں 12 سال کا تھا۔ میرے دادا سید مصطفیٰ کہ میری ظاہری و باطنی تربیت انھوں نے ہی کی ہے، مجھ کو خواجہ بیرنگ کے حضور لے جاتے اور آپ کے دیدار منور سے مجھے سرفراز کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے فرمایا اس شہر کے مشائخ کی قبور کی زیارت کے لیے جانا چاہیے۔ (اول) شیخ تاج الدین اور میرے دادا نے شیخ کبیر کلہ رواں کی قبر کا پتا دیا۔ آپ مشکی گھوڑے پر جو بہت سربلند تھا سوار ہوئے اکثر اکابر اور اہل شہر، کوئی سو آدمیوں کے قریب ہوں گے، آپ کے ہم رکاب تھے۔ روضہ شیخ کے قریب پہنچ کر آپ گھوڑے سے اُترے کچھ دیر کھڑے کھڑے لحہ بھر کو مراقب ہو گئے پھر قبر شیخ کے نزدیک بیٹھ گئے اور ایک گھڑی تک مراقبہ کیا۔ پھر اس جگہ سے اُٹھ آئے اور بڑے سرور میں فرمایا کہ شیخ بہت بزرگ ہیں۔ اسی دوران شیخ کبیر کلہ رواں کے پوتے شیخ عبدالشکور نے جو کہ صاحب جذبہ و تصرف تھے بڑی بہتر انداز کے ساتھ پیش آئے، نیازمندی دکھائی اور آپ کو لے جا کر چبوترے کے اوپر لا بٹھایا اور

بڑے لطف و مہربانی کا اظہار کیا۔ آپ کا 1020ھ (1610) میں انتقال ہوا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک دن خواجہ بیرنگ نے میرے دادا سے مجھے پوچھا کہ "یہ آپ کا کون ہے" کہا۔ "پوتا ہے" دوات و قلم منگا کر چند سطریں لکھیں مجھے سامنے بٹھایا اور فرمایا۔ پڑھ۔ میں ٹھیک سے نہ پڑھ سکا تو آپ نے مجھے اوّل سے آخر تک پڑھایا۔ وہ عبارت یہ ہے کہ "اے فرزند، نورِ چشمِ من، تمام ہمت اس پر لگا دے کہ تجھے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے کسی قسم کا قلبی تعلق نہ ہو۔ اللہ سبحانہ کے علاوہ جو کوئی بھی تیرے دل کو اپنی طرف مشغول کرے لا الہ الا اللہ کہہ کر اس چیز کو اپنے دل سے دور کر دیا کر۔ ایسا ہو جا کہ اس چیز کو وصول الی اللہ میں اپنا دشمن سمجھے۔ ہمیشہ حق سبحانہ سے بڑی عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ مانگ کہ تجھے اپنے سوا کسی چیز میں نہ پھنسائے۔ ہر وقت پاک صاف باوضو رہ اور خلوت میں نمازِ (نفل) پڑھا کر اور سر زمین پر رکھ کر حق سبحانہ سے طلب کر کہ اپنے خاص بندوں کے دلوں تک تیری رسائی فرما دے۔ سعادت و بھلائی اس بات میں جان کہ بندگانِ خاصانِ خدا تجھے اپنے دل میں جگہ دے کر حق سبحانہ سے تیرے لیے دعا فرمائیں کہ محبت خداوندی ترے دل میں جاگزیں ہو جائے۔

ترا یک پندبس، در ہر دو عالم — کہ برناید ز جانت بے خدا، دم [1]

اگر تو پاس داری پاس انفاس — بسلطانی رساندت (ہم) ازین پاس

تو مباش اصلاً کمال این است و بس — تو ز خود گم شو وصال اینست و بس [2]

سید بدھ فرید آبادی

صاحب زہد و ورع اور قوی المعاملہ بزرگ ہیں۔ اچھے اخلاق والے اور خاکساری میں بہت آگے نکلے ہوئے ہیں۔ لمبی عمر پائی۔ باوجود کمزوری اور بصارت کی کمی کے اپنے گھر سے جامع مسجد تک چل کر آتے اور وہاں روزانہ تین چار نمازیں جماعت کے ساتھ پڑھتے۔ عشاء کی نماز کے بعد لوگ

---

1 دونوں عالم میں کام آنے والی تجھے بس ایک نصیحت کافی ہے کہ تیرا ایک سانس بھی اللہ کے بغیر باہر نہ آئے۔

2 اگر تو پاس انفاس کا خیال رکھے گا تو یہی پاس انفاس سلطان الذکر تک پہنچا دے گا۔ کمال بس یہ ہے کہ تو نہ رہے یعنی احساسِ "میں" دل سے جاتا رہے۔ تو اپنے آپے سے گم ہو جا بس یہی وصل ہے۔

ان کو ہاتھ پکڑ کر ان کے گھر پہنچا دیتے۔ مستقل اپنے اوقات کو مسنونہ اوراد و وظائف اور ادعیۂ ماثورہ سے معمور رکھتے۔ میں جب بھی فرید آباد جاتا انھیں مسجد میں ہی دیکھتا تھا۔ مجھ پر بہت لطف و عنایت فرماتے۔ میں نے کبھی ان سے غیر ضروری (لایعنی) باتیں نہیں سنیں اور نہ کبھی ان کو اعمالِ دینیہ اور اشغالِ یقینہ سے خالی دیکھا۔ صلوٰۃ التسبیح جو کہ دینی اعمال کے غرائب میں ہے اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مقتبس ہے (بلاناغہ پڑھا کرتے تھے) فضائل صلوٰۃ التسبیح۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "یـا عبـاس، یـا عـمـاہ. الا اعـطیک؟ الا امـنحک. الا اَحْبُک (اَلَا اَخْبَرک)...... "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس سے فرمایا۔ اے عباس اے میرے چچا کیا میں آپ کو نہ دوں، کیا آپ کو عطا نہ کروں، کیا آپ کو اطلاع نہ دوں، کیا آپ کو دس نیک خصلتوں والا نہ بناؤں یعنی جو چیز میں ذکر کروں گا وہ دس خصلتیں ہیں یعنی میں آپ کو ایسی چیز سکھاؤں گا جو آپ کے دس قسم کے گناہوں کا کفارہ بن جائیں گی۔ جب آپ ان کو کریں گے تو خدا تمھارے گناہ بخش دے گا۔ اگلے پچھلے سب گناہ جواب سے پہلے کیے یا جواب کے بعد ہوں، یا وہ گناہ جو ایک دوسرے کے آگے پیچھے کیے ہوں۔ قدیم ہوں یا جدید۔ بغیر ارادہ کیے ہوں یا قصداً کیے ہوں۔ خرد ہوں یا کلاں۔ پوشیدہ ہوں یا آشکارا۔ پھر اوّل سے آخر تک طریقۂ صلوٰۃ التسبیح کا بیان ہے۔[1]

میر ابراہیم حسین

وہ خاندانی نجیب و شریف ہیں۔ بڑے مستقیم الحال گزرے ہیں۔ تعلق مع اللہ اور فتوت میں شان قوی کے مالک ہیں۔ خواجہ ابرار کے داماد تھے۔ ان کی وفات کے بعد جامع مسجد فیروزی میں یارانِ طریقہ نقشبندیہ کے ساتھ صحبت برپا رکھتے تھے اور پانچوں وقت نماز جماعت سے پڑھتے تھے۔ اس طرح ان کے طریقے کو گرم رکھتے تھے۔ بادشاہ صاحب قِران ثانی شاہجہاں نے ان کی حد درجہ دین داری اور دیانت کو دیکھ کر ہمایوں بادشاہ کے مقبرے کی تولیت ان کے نام کر دی تھی۔ وہ بہ سبب

1 آگے صلوٰۃ التسبیح کی مکمل ترکیب لکھی ہے۔ مگر اس میں کچھ اختلافات زیادہ ہیں۔ اس لیے میں نے اس کو حذف کرنا بہتر سمجھا ہے۔ دوسرا سبب محض طوالت ہے۔

تقویٰ اور پرہیز گاری اس مقبرے کے پھول بھی نہ سونگھتے۔ اوقاف کی چیزوں کو نہ خود چکھتے نہ اپنے اقربا کو چکھنے دیتے۔ اس باغ کا پانی تک بھی استعمال نہ کرتے۔ اس بات کی وجہ سے دین ودنیا میں سربلندی حاصل کر لی تھی۔ اور مرتبہ عزت، عظمت ووقار وافتخار کو پہنچ گئے تھے۔ ایک دن بادشاہ نے ان کو کلام مجید کے چند پارے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کے لکھے ہوے ہیں اس مقبرے میں رکھے ہوے تھے لے کر اپنے پاس اکبر آباد طلب کیا۔ ادب وتعظیم کے ساتھ ان کے ہاتھ سے لے کر بوسہ دیا اور ان کے بارے میں معلوم کیا اور ان ہی کے حوالے کر دیا۔ اور عزت کے ساتھ رخصت فرمایا۔ میں نے ان ہی پاروں کو ایک موقع پر اپنے شیخ کے ہمراہ پڑھا ہے۔ یہ قرآن پاک بڑی عظمت وشان کے ساتھ ایک چمڑے پر لکھا ہوا ہے۔ اس کا خط، خطِ کوفی سے مشابہت رکھتا ہے۔ اب بھی وہ سپارے مقبرے میں ہیں۔ نقل ہے کہ نصیرالدین محمد ہمایوں بادشاہ بہت صالح، عابد اور عادل تھے۔ وہ فقرا، مشائخ، علما اور درویشوں کے ساتھ خاکساری اور نیاز مندی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ جیسا کہ اس خط سے جو انھوں نے شیخ حمید مفسر سنبھلی کو لکھا ہے ان کے حسن سلوک اور اخلاق عالیہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس خط کی نقل شیخ اسماعیل کے احوال میں آئے گی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک رات بادشاہ نے شیخ زین الدین کمانگر جنھیں ''پیرم'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور مشائخ کبار میں سے تھے، کو آواز دی ''پیرم'' انھوں نے بات پر دھیان نہ دیا۔ کیونکہ انھیں غنودگی نے گھیر رکھا تھا۔ اس لیے بادشاہ نے قدرے سختی کے ساتھ کہا ''پیرم آپ ہی سے کہتا ہوں'' حاضر ہوئے اور فرمایا۔ بادشاہ میں حاضر ہوں لیکن میں نے سن رکھا ہے کہ بادشاہوں کے دربار میں آنکھ کی حفاظت کرنی چاہیے اور درویشوں کے سامنے دل کی۔ اور عالموں کے سامنے زبان کی۔ بادشاہ یہ جواب سن کر مسرور ہو گئے اور تعریف کی۔ یہ بھی روایت ہے کہ یہی بادشاہ ایک بار حسب تقدیر کردگار حوادث روزگار سے مجبور ہو کر ولایت ماوراالنہر کی طرف جارہے تھے۔ ایک دن ایک بڑا ڈیرگانے والے نے یہ دو شعر پڑھے

مبارک کشورے کان عرصہ را شاہے چنین باشد	ہمایون منزلے کان خانہ را ماہے چنین باشد
ز رنج و راحت گیتی مرنجاں دل بشو خرم	کہ آئین جہان گاہے چنان گاہے چنین باشد [1]

1 وہ ملک مبارک ملک ہے جہاں کا بادشاہ ایسا ہو۔ وہ منزل کیسی مبارک منزل ہے، جس کے مکان میں ایسا چاند رہتا ہے۔ دنیا کے رنج وراحت سے دل رنجیدہ نہ کر خوش وخرم رہ کہ دستور دنیا کبھی ایسا ہوتا ہے کبھی ویسا ہوتا۔

وہ خوش ہوگئے اور قبض کی جو حالت تھی بسط سے بدل گئی۔ایک قیمتی لعل جوان کے بازو میں بندھا تھا گانے والے کی نذر کردیا۔آخر بادشاہ ولایت سے لوٹے اور ہندستان کی سلطنت پر بیٹھے۔ایک دن اذان سننے کی غرض سے چھت کے زینے پر کھڑے تھے ان کا عصا لڑکھڑایا اور چھت سے گر کر دنیا سے رخصت ہوئے۔سال وفات 962ھ (1554) ہے اور یہ مصرعہ تاریخ وفات ہے

"ہمایوں بادشاہ از بام افتاد"

میں نے میر ابراہیم کی بہت زیارت کی ہے۔وہ قوی النسبت تھے۔ان کی صحبت میں تاثیر تھی۔میں اکثر انھیں اس شان و مرتبہ میں دیکھتا تھا کہ مصلا ہاتھ میں لیے زوال کے وقت تن تنہا گمنامی کے حال میں مسجد فیروزی میں آرہے ہیں۔ان کی وفات کا سال 1050ھ (1641) ہے۔اور قبر خواجہ ابرار کی قبر کے نزدیک مغرب رویہ ہے۔

شیخ اشرف دہلوی

شیخ تاج الدین کے مرید اور نیک لوگوں میں سے تھے۔جمعیت صوری و معنوی رکھتے تھے۔اللہ کے طالب، فقرا کے چاہنے والے تھے۔ان کو خدمت اور ضیافت کا بہت شوق تھا۔خوش خوش فقرا اہل اللہ کی دعوت کیا کرتے تھے۔یہ ان کی کرامت تھی۔جیسا کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے

کرامت جوانمردی و نان دہیست مقالات بیہودہ طبل تہیست [1]

انھوں نے اپنے شیخ کے ساتھ حج کیا، کچھ دنوں وہاں رہے پھر اپنے وطن لوٹ آئے۔شروع میں انھیں مجھ سے بہت محبت تھی مدتوں پڑوسی رہے تھے۔اس کے بعد جب مجھے اپنے شیخ کی صحبت کی سعادت میسر ہوئی اور انھوں نے مجھے اپنے شیخ کی خدمت اور محبت میں مشغول دیکھا تو انھیں رشک پیدا ہوا، اپنے دوستوں سے کہنے لگے اس نوجوان کو تو دیکھو کیسے درویشوں کے درمیان آگیا۔ایک بار میں سنبھل سے اپنے شیخ کے دیدار کے لیے دہلی حاضر ہوا۔بخار کی وجہ سے میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔میں نے سنا کہ سرائے ڈاسنہ میں شیخ احمد سنامی اور وہ، شیخ اللہ دیا قدس سرہٗ کے روضے پر ہیں، کیونکہ یہ رات ان کے عرس (انتقال) کی ہے۔مجھ پر دونوں کے دیدار کا شوق غالب آگیا اسی

1 کرامت جوانمری اور کھانا کھلانے کا نام ہے۔بیہودہ ڈینگیں مارنا بس خالی ڈھول ہے۔

حال میں اس مجلس میں پہنچ گیا۔ ان کی صحبت میں تمام رات خوش خوش گزاری۔ صبح کو میں اور وہ دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ لیکن میرے شیخ کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے سفر حجاز کے اپنے احوال جو اُن کو پیش آئے تھے۔ عجیب واقعات سنائے جب میں تیسرے فاقے کی حالت میں اپنے شیخ کے سامنے جیسے ہی پہنچا میرے شیخ کی مجلس میں دسترخوان پر مالیدے کا کھانا آیا۔ لب میرا اس کو کھاتا تھا اور میرا ٹھیک ہوتا تھا۔ جب شیخ اشرف بیمار ہوئے اور ان کی بیماری کو کئی دن ہو گئے اور بے ہوشی طاری ہو گئی۔ ایک دن میرے شیخ ان کی عیادت کے لیے مجھے ہمراہ لے گئے۔ دیکھا کہ بےخودی کی حالت ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ یوسف نے جو کہ ایک نیک مرد ہیں۔ جب میں نے ابتدا میں پندرہ سال کی عمر میں اپنے شیخ کی خدمت میں رہنا شروع کیا تھا اور بعد میں جدا ہو گیا تھا تو انھوں نے میرے شیخ کی بہت تعریف مجھ سے کی جس سے مجھے پُرشوق (ملاقات شیخ) غالب آیا۔ یہ مجھ پر ان کا احسان ہے۔ اس وقت اثنا گفتگو میرے شیخ کے یہ دو شعر جو انھوں نے بچپن میں کہے تھے پڑھے اور مجھے محظوظ کیا تھا۔

صوفیا نند کہ مے را بسحر نوش کنند　　نغمۂ مطرب نو خاستہ را گوش کنند
آتش سوختہ دل را بنظر سرد کنند　　آب سرمازدہ را ز آتش دل جوش کنند[1]

القصہ میرے شیخ سے کہا اگرچہ وہ بے ہوش ہیں لیکن جب کسی بزرگ کا نام زور سے کان میں کہتے ہیں وہ بس اس قدر جواب دے دیتے ہیں ''ھو الحق''۔ جب میرے شیخ کا نام ان کے کان میں کہا گیا تو فرمایا ''ھو الحق''۔ انہیں اپنا کچھ شعور نہ تھا اسی حالت استغراق میں دنیا سے 21/ ربیع الاوّل 1061ھ (1651) میں چلے گئے۔ میرے شیخ کی اجازت سے خواجہ بیرنگ کے چبوترے کے زینہ کے پاس ان کو دفن کر دیا گیا۔ میرے شیخ نے ان کی یہ تاریخ کہیں

شیخ اہل طریقہ شیخ اشرف　　چون ز تقید جسم شد مطلق
سال و صلش مطابق واقع　　گفت ہاتف کہ ''شیخ بود الحق''[2]

1　یہ صوفیوں کا گروہ ہے جو کہ وقت سحر شراب محبت پیتے ہیں اور نت نئے فیض روحانی کا مژدہ سنا کرتے ہیں، دل میں لگی ہوئی آگ کو ایک نظر میں ٹھنڈا کر دیتے ہیں اور سرد دلوں کو آتشِ عشق سے گرما دیتے ہیں۔

2　اہل طریقہ شیخ اشرف جب جسم کی قید سے آزاد ہو گئے تو ہاتف غیب نے ان کا سال وصال یوں کہا کہ ''شیخ بود الحق'' حقیقتاً وہ شیخ تھے۔

آج شیخ بدھوان کے یاروں میں سے امروہہ میں ہیں۔ وہ صاحب عشق ومحبت، تالی قرآن (قاری) اور میرے بہت زیادہ آشناؤں میں ہیں۔ اسراریہ کے مکمل ہونے کے بعد رمضان کے مہینے میں بیمار پڑ گئے۔ کسی نے کہا آپ بہت زیادہ بیمار ہیں کچھ کھالیں، بعد میں روزے کی قضا رکھ لیں۔ انھوں نے فرمایا روزہ توڑتے ہی میری موت آگئی تو قضا کون رکھے گا۔ 8 ر رمضان المبارک کی رات کو افطار کے بعد مکمل ہوش وحواس کے ساتھ درود پڑھتے ہوئے 1071ھ (مئی 1661) میں دنیا سے گئے۔ قبر فرید آباد میں ہے۔ شیخ اشرف کی قبر کے برابر ہی خواجہ محمد محسن کی قبر ہے۔ وہ میرے شیخ کے دوستوں میں سے ایک شخص تھے عقلمند اور سمجھدار۔ جب وہ سنبھل میں امیر رستم خاں دکھنی کے دیوان تھے مجھ سے خوب آشنائی تھی۔ مجھ پر لطف فرماتے۔ اس زمانے میں میرے شیخ نے ایک خط میرے نیاز نامے کے جواب میں جو میں نے سنبھل سے از سر اشتیاق لکھا تھا مجھے لکھا تھا۔

''حقا کہ خدمت وملازمت میاں شیخ مرتضٰی کا اس قدر مشتاق ہوں کہ تنہا انھیں کا اشتیاق کافی تھا پھر کیا کہنا اگر مخدومی خواجہ محسن بھی وہاں ہوں کہ وہ میرے برادر جان برابر بھی وہیں ہیں۔ اس علاقہ سنبھل کا اشتیاق متقاضی ہے لیکن ارادے کا پورا ہونا ارادہ الٰہی سے وابستہ ہے۔ انتہیٰ۔

انھوں نے مجھے بتلایا کہ ایک بار جب میں دہلی سے خواجہ خرد کی خدمت سے رخصت ہو کر ادھر سنبھل آرہا تھا میرے دل میں آیا کہ اگر خواجہ، خواجہ بیرنگ کے تبرکات میں سے کوئی تبرک مجھے عطا فرمائیں تو کیا اچھا ہو۔ ابھی یہ خطرہ دل پر پورا بھی نہ ہوا تھا کہ وہ اٹھے اندر گئے اور ایک دوسوتی کپڑا جو کہ چند بار خواجہ بیرنگ کے بدن مبارک پر رہا تھا، لائے اور مجھے عطا فرمایا۔ اس غیبی عطیے سے ان کا مشرف القلوب ہونا جان کر میں بہت ہی خوش ہوا اور اللہ تعالٰی کا شکر ادا کیا۔

''چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار''[1]

آخر میں وہ بادشاہ کے معززین ومقربین میں شامل ہو گئے تھے اور 1040ھ (1631) میں دنیا سے رخصت ہوئے قبر وہیں دہلی میں شیخ اشرف کی قبر کے متصل ہے۔

---

1 کیا ہی خوب ہو کہ ایک اشارے میں دو کام ہو جائیں۔

شیخ جلال سنبھلی

وہ بھی شیخ تاج الدین کے مرید ہیں پہلے وہ شیخ امجد سنبھلی کی صحبت میں رہتے تھے اس کے بعد خواجہ بیرنگ کی خدمت میں پہنچے اور آپ سے طریقہ کی طلب کی۔ آپ نے شیخ تاج الدین کی صحبت اختیار کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ صالح اور قاریٔ قرآن، مستقیم المعاملہ تھے اور اس کام میں منہمک تھے۔ وہ خود کو کبھی بھی درویش ظاہر نہ کرتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے۔ ان کا طریقہ ستر واخفا (خود کو چھپائے رکھنا) تھا۔ ہمیشہ اپنے گھر کے گوشے میں بسر کرتے۔ جس وقت وہ شیخ امجد کے صاحبزادوں شیخ فاضل اور شیخ عبدالکریم کی صحبت میں جن کا ذکر اس کے بعد ہی آتا ہے۔ آتے جاتے تھے اس وقت میں ان کو اپنے بچپن میں شیخ امجد کے بیٹوں کے گھر میں دیکھتا تھا۔ نورانی چہرہ تھا، مجھے بہت اچھے لگتے وہ بھی مجھ پر لطف وعنایت فرماتے تھے۔ ان کی وفات 1027ھ (1618) میں ہوئی ہے۔ آج اُن کے صاحبزادے شیخ جمال الدین ان کے نقش قدم پر ہیں۔ صالح، صائم الدہر اور نیک نسبت۔ میر سید عبدالحکیم ہجری کے مرید ہیں۔ کہتے ہیں کہ سید عبدالحکیم نے مجھ سے کہا کہ مجھے تمھیں مرید کرنے کے لیے حضرت امام جعفر صادق نے بشارت دی ہے۔ چونکہ ایک مدت کے بعد حضرت زین العابدین کے خاص مؤلفات میں سے کتاب ''صحیفۂ کاملہ'' ایک بزرگ سے انھیں پہنچی تھی اور اس کے ورد کا اشارہ ہوا تھا۔ وہ انھیں بشارت عالیہ کا اثر ہوگا جو کہ ظاہر ہو گیا ہے۔ عصمت اللہ جو کہ سید محمود امروہوی کے پسر، صالح اور نیک نہاد انسان ہیں کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں مجھے سات سال سے درد جگر رہتا تھا کبھی کبھی ہلاکت کی نوبت آجاتی تھی۔ ایک رات کو جب میں دہلی میں تھا زندگی سے مایوس ہو گیا۔ میں نے سوچا اولاد کی آزردگی سے والدین کا آزردہ خاطر ہونا مشہور بات ہے۔ اگر میں ائمہ عظام کی نسل سے ہوں تو ضرور دستگیری ہوگی اور کہا اگر اس رات دستگیری ہوتی ہے بہتر ورنہ ہرگز خود کو سید نہ کہلواؤں گا اسی سوچ میں نیند آگئی۔ دیکھتا ہوں کہ ایک باغ میں ایک چبوترہ ہے اس پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں اور فضلا کا ایک مجمع ان کے دائیں بائیں بیٹھا ہوا ہے اور اس کتاب میں جو ان کے ہاتھ میں ہے مشغول ہیں۔ میرے ہاتھ میں بھی ایک کتاب مجموعہ رمل ونجوم تسخیر ودعوات تھی ان بزرگ نے

معلوم کیا، کیا کتاب ہے؟ میں نے کتاب ان کے ہاتھ میں دے دی۔ کھولی، دیکھی اور فرمایا۔ یہ کس کام کی ہے کچھ نفع نہیں دیتی۔ میں نے عرض کیا "تو میں کیا کروں؟" انھوں نے وہی کتاب جس میں مشغول تھے مجھے دے کر فرمایا یہ کتاب پڑھ میں نے دریافت کیا۔ یہ کون سی کتاب ہے؟ جواب دیا۔ امام زین العابدین کی "صحیفۂ کاملہ" ہے۔ اس بات کو سن کر میری آنکھ کھل گئی کیونکہ تمام عمر میں نے کبھی "صحیفۂ کاملہ" کا نام بھی نہ سنا تھا۔ میں اس کی جستجو میں لگ گیا آخر بہت تلاش کے بعد پتا چلا کہ حکیم تقرب خاں کے کتب خانے میں وہ کتاب ہے لیکن معلوم ہوا کہ وہ کسی سنّی کو نہیں دیتے۔ جو کچھ خواب میں دیکھا تھا اسے ایک پرچے پر لکھ کر انھیں دیا کہنے لگے صحیفہ تو ہے مگر میں کسی کو نہیں دیتا۔ میں نے کہا ائمہ عظام کے فرزندوں میں سے ہوں اور ان کے حکم سے مانگتا ہوں اگر یقین کریں بہتر ورنہ جو مجھ سے فرمایا ہے آپ سے بھی ہوسکتا ہے کہ دینے کا حکم فرمائیں۔ کہا اگر ایسا ہوا تو دے دوں گا۔ ایک ہفتے کے بعد ان کے دروازہ پر جا کر میں نے وہ صحیفہ مانگا۔ اندر سے بالکل وہی صحیفہ جیسا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا مجھے بھجوایا کہ نقل کر لیں۔ اور کہا کہ مجھے بھی معلوم ہوگیا کہ تیرا خواب درست ہے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور اس کے مطالعے میں لگ گیا۔ اسی دن سے مرض میں کمی ظاہر ہونے لگی اور میں نے اسے نقل کرنا شروع کر دیا۔ لیکن چونکہ اصل نسخہ بہت درست، خوش خط اور محشّیٰ تھا مجھے اس سے قلبی لگاؤ ہوگیا۔ ہر رات میں حضرات ائمہ رضی اللہ عنہم سے اصل نسخے کے عطا کیے جانے کی درخواست خواب میں کیا کرتا۔ کہ انیسویں شب کو خواب دیکھا کہ ایک بہت وسیع صحرا ہے اس صحرا کے اندر ایک قلعۂ عظیم، عالی عمارت اور شاہانہ بارگاہ بنی ہوئی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں معلوم کیا کہا کہ امام جعفر صادق کا دربار ہے۔ میں دروازے میں داخل ہوا دیکھا کہ دونوں طرف معمر سپید ریش بوڑھے بڑے بڑے عماموں والے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں ہر چند میں نے خوشامد کی کہ اندر خبر پہنچا دیں لیکن کسی نے میری مطلق نہ سنی۔ دل کا وہی سابقہ وسوسہ لوٹ آیا کہ اگر میں ان کے فرزندوں میں سے ہوتا اتنی دیر نہ لگاتے اسی اثنا میں میرے چھوٹے بھائی سید حاجی محمد جو کہ دنیا سے جا چکے تھے اندر سے باہر آئے ان کو دیکھ کر میں منفعل ہوگیا اور اپنے آپ کو ان کے سامنے کیا۔ بولے کیوں کھڑے ہیں۔ میں نے کہا کوئی شخص اندر خبر نہیں کرتا۔ بولے فرزندوں کو خبر کی کیا ضرورت ہے آئیں، اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے میں نے

دہاں بجائے اوروں کے صرف قبیلۂ سادات کے مردوں، عورتوں، بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کا ایک جم غفیر دیکھا لیکن سب خاموش کوئی کسی کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ اس وقت دل پر القا ہوا کہ حضرت امام حجرے میں حالت مشاہدہ میں ہیں۔ حجرے سے بہت سے لوگ باہر آرہے ہیں۔ اس جماعت میں، میں نے اپنے والد اور دادا محترمین کو بھی دیکھا۔ جب کسی کی توجہ اپنی طرف نہ دیکھی میں باہر نکل آیا اور دیوان عام میں کتابت میں مشغول ہوگیا۔ اسی دوران غلغلہ اُٹھا دیکھا کہ حضرت امام بنورانیت تمام سبز برقع پہنے ہوئے کہ علاوہ چشم مبارک کے بدن شریف کا حصہ نظر نہ آتا تھا باہر آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ سارے بزرگان جو انتظار میں بیٹھے تھے ادب میں چاروں طرف کھڑے ہوگئے کسی کی یہ ہمت نہ تھی کہ سانس بھی لے لے میں بھی وہ جزو (کتابت شدہ اوراق) ہاتھ میں لیے بہیبتِ تمام کھڑا ہوگیا۔ کیونکہ میرا کوئی وسیلہ نہ تھا اس لیے دلیری کر کے حضرت کے پاؤں پر گر پڑا۔ بیچ کی دو انگلیوں کے اشارے سے سر اٹھانے کا حکم فرمایا۔ میں روبرو باادب کھڑا ہوگیا۔ فرمایا۔ صحیفہ کتنا لکھ لیا۔ میں نے جزو کو دست مبارک میں دے دیا اور کہا۔ یہاں تک لکھا ہے (اور دریافت کیا) آگے بھی لکھوں۔ فرمایا ''مت لکھ۔ میرے دل میں آیا کہ غضبناک ہوکر فرما رہے ہیں، کہ مت لکھ۔ مجھے ڈر نے گھیر لیا۔ تو فرمایا جس سے تو نقل کر رہا ہے وہ صحیفہ ہی ہم نے تجھے بخش دیا۔ پھر دل میں آیا اس نسخے کے مالک تو تقرب خاں ہیں حضرت کے بخشنے سے کس طرح میری ملک میں آتا ہے۔ یہ وسوسہ ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ تقرب خاں کو حاضر کیا گیا۔ ان سے فرمایا کہ تیرے پاس دوسرا صحیفہ بھی تو ہے اس صحیفے کو میں نے اس فرزند کو عطا کر دیا۔ اس کے بعد مجھ سے فرمایا مگر یہ نسخہ چند اور دعائیں بھی ہیں جو یہ نہیں رکھتا۔ اگر چاہے، لکھ لے۔ صبح کو سارا ماجرا خواب کا لکھ کر میں نے تقرب خاں کو پہنچا دیا انھوں نے نسخہ دے کر کہا یہ میں نے آپ کو دیا۔ ملک فصیح ان کے آدمی نے اس صحیفے کی پشت پر یہ عبارت لکھی کہ 2/رجب المرجب 1066ھ (1655) حسب اشارہ حضرات ائمہ عظام اس صحیفے کو تقرب خاں نے سید عصمت اللہ کو ہبہ کر دیا۔ وہی فرماتے ہیں کہ دوسرے روز میں نے تقرب خاں سے کہا آپ کے طفیل، میں اس نعمت سے مشرف ہوا ہوں۔ بولے میرا کوئی احسان نہیں، دلوایا ہے تو میں نے دے دیا ہے۔ اس کے بعد اس صحیفے کے پڑھنے کی ترتیب کے بارے میں میرے دل میں تشویش ہوئی کہ رات کو میں نے

خواب میں دیکھا کہ ایک سیدزادہ نوجوان آدمی کہہ رہا ہے ''حصول مہمات کے لیے اس کے ختم کی آخری حد بیس مرتبہ تک ہے۔ دوبارہ مجھ سے خواب میں کہا کہ آٹھ دن میں بارہ ختم کرنے چاہیے اوران کا ثواب بارہ اماموں کی ارواح طیبات کو بخشنا چاہیے۔ وہی کہتے ہیں کہ ایک بار اسی سخت بیاری میں اس عالم کا شعور ہی نہ رہا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ میں ایک بہت وسیع صحرا میں گرا پڑا ہوں اور کوئی آدمی نظر نہیں آتا اور مجھے سخت پیاس لگی ہوئی ہے۔ ناگاہ ایک شخص ظاہر ہوا اس نے مجھے پانی پلایا میں اٹھا اور آبادی کی تلاش میں ہر طرف جاتا ہوں تو دیکھا کہ ایک چبوترہ ہے صاف ستھرا اور بہت اونچا۔ اس چبوترے پر بے شمار طنابیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ میں ان کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ زنجیریں کیسی ہیں کہ ایک شخص ظاہر ہوا۔ میں نے سلام کیا اور اس کی حقیقت (دریافت) کی کہا کہ یہ تمام مشائخ کے سلسلے ہیں۔ یہ نقشبندیہ سلسلہ ہے، یہ قادریہ ہے، یہ فلاں ہے۔ میں نے معلوم کیا، کیا سلسلہ سادات بھی انہیں میں ہے۔ کہا ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے دکھلا یئے۔ اس نے مجھے ان میں سے بہت سی طنابیں دکھائیں۔ بعضی گنجلک اور بعضی بالکل نمایاں۔ علاحدہ علاحدہ میں نے کہا بندے کی سیادت کا سلسلہ کہاں ہے کہا ڈھونڈ لیں'' میں نے کہا اگر مجھے اتنا علم ہوتا تو آپ سے نہ پوچھتا۔ انھوں نے ایک تنگ رسی دکھائی کہ یہ تیرا سلسلہ ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ طناب آخر تک پہنچی بھی ہوگی۔ میں نے کہا کہ جب سب کی سیادت برابر ہے تو یہ فرق کیسا ہے؟ کہا گیا کہ یہ علم، تقویٰ اور مجاہدے کی راہ سے ہے۔ تم بھی نیک اعمال زیادہ کرو تو یہ طناب مضبوط ہو جائے گی۔ میں نے کہا اگر آپ اجازت دیں تو میں آسمان کے اوپر چڑھ کر دیکھوں۔ کہا حکم نہیں ہے کہ کوئی بھی شخص اس جسد خاکی سے عالم بالا تک نہیں پہنچ سکتا اور ابھی تیرا جسم سے جدائی کا وقت نہیں آیا ہے۔ جب میری آنکھ کھلی اپنے مرض میں خفت دیکھی اور میں ہوش میں آ گیا اور تین دن بعد بالکل اچھا ہو گیا۔ وہ ہی کہتے ہیں۔ ایک بار ایک مرض کے علاج کے لیے میں دوائیاں استعمال کرتا اور اوپر سے دودھ پی لیتا لیکن بالکل اچھا نہیں ہوتا تھا کہ ایک رات خواجہ خرد کو خواب میں دیکھا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ان دوائیوں کو دودھ میں ملا، تب کھا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور میں مرض سے کلی طور پر رہا ہو گیا۔

شیخ فاضل و شیخ عبدالکریم سنبھلی

دونوں بھائی بزرگ گزرے ہیں۔قوی المعاملہ،عظیم الاخلاق مستقیم الحال،اہل علم وعمل وفتوت۔شیخ فاضل،فاضل العلوم تھے۔دینی علوم وعلم تصوف کے عالم ہیں۔شیخ تاج الدین کے مرید ہیں اور خواجہ بیرنگ کو دیکھا ہے۔ان کی صحبت میں رہے اور فیض یاب ہوئے ہیں۔شیخ جمال الدین کا کہنا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جب میں اپنے شیخ کے پاس دہلی میں تھا قدم گاہ مبارک کے بارے میں کبھی کبھی دل میں شبہ پیدا ہوتا تھا۔ایک دن میں مراقب تھا۔واقعے میں،میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور انھوں نے مجھے اپنا قدم مبارک دکھایا اور فرمایا میرا قدم (تو) یہ ہے۔شیخ عبدالکریم اپنی نسبت اپنے والد محترم شیخ امجد سے درست کرتے ہیں۔وہ ہمیشہ زاویہ غربت وناداری میں گزارتے اور درس و تدریس میں مشغول رہتے۔شغل باطن کو اس فن میں چھپائے رکھتے۔شریعت میں درست گفتگو فرماتے۔انھیں مکتب چلانے کا بہت ملکہ تھا۔''رشحات''میں ہے کہ مولانا جلال الدین آبنیری فرماتے تھے کہ سلطان ابوسعید مرزا کے زمانے میں حضرت خواجہ عبداللہ قدس سرۂ''ہرے''تشریف لائے تھے۔پہلی بار جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا پوچھا کون ہے کیا کام کرتا ہے؟ میں نے کہا مولانا سعدالدین کاشغری کے خدام میں سے ایک فقیر آدمی ہوں اور مکتب داری کرتا ہوں مکتب کا مُلّا ہوں۔فرمایا۔حقارت کے ساتھ مت کہہ کہ مدرسہ چلانا بہت بڑا کام ہے اس پر بہت سے فائدے اور وعدے مرتب ہوتے ہیں یعنی اس کام پر آخرت میں بہت نفع ہوگا اور اس کے کرنے والے سے آخرت میں بہت سے وعدے ہیں شیخ عبدالکریم،شیخ فاضل سے چند ماہ قبل 1030ھ (1621) میں دنیا سے چل دیے پھر ان کے بعد شیخ فاضل گئے ان دونوں حقیقی بھائیوں کی قبریں ان کے دروازے کے آگے ہم پہلو ہیں۔شیخ فاضل علوم ظاہری کے افادے اور درس کے باوجود شعر بھی کہتے یہ دو شعر ان کے ہیں

آویختہ ز لفت کہ بچاہ ذقن است این — از بہر بر آوردن دلہا رسن است این
در زلف چلیپاے تو مسکین دل فضلی — آرام چنان کرد کہ گوی وطن است این[1]

---

1 ٹھوڑی کے کوئیں میں لٹکی ہوئی تیری یہ زلف دلوں کو باہر نکالنے کے لیے رسی ہے۔تیری زلفوں کی صلیب پر فضلی کا بے چارہ دل ایسے آرام کرتا ہے گویا کہ یہ اس کا وطن ہے۔

انھوں نے دو بے چند اور الماس کا قصہ نظم کے اندر بہت اچھا باندھا ہے۔اس کا نام ''چند الماس'' رکھا ہے۔اس کا مجمل بیان یہ ہے کہ الماس مغل قوم سے تھا۔ مالدار اور بہادر۔ایک دن سنبھل میں بزاز کی دکان پر کپڑا خریدنے کے لیے گیا۔ بزاز کا لڑکا جس کا نام دو بے چند تھا، صاحب جمال تھا۔ الماس اس پر عاشق ہوگیا۔اور جو کچھ اس کے پاس تھا سب کچھ لٹا کر دیوانہ وار گلی کوچوں اور بازاروں میں پھرا کرتا تھا۔شروع میں دو بے چند حیا کی وجہ سے پریشان ہوتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ترکیب کروں کہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاؤں۔ایک دن اس نے الماس سے کہا۔ جافلاں کوہستان سے پہاڑی گھوڑا اور ہرن کا مشک لے کر آیا۔اور جھنڈا بھی لانا۔اس کوہستان میں مسافر بہت کم چلتے تھے خاص کر جو کہ مغل ہوں۔گیا اور بہت محنت کے بعد خود کو وہاں کے راجہ کے پاس پہنچایا اور اپنا حال بیان کیا۔راجہ کے دل میں رحم آگیا اور مذکورہ بالا تینوں چیزیں اس کے حوالے کردیں۔وہ لایا اور دو بے چند کے روبرو رکھ دیں۔دو بے چند اور اس کے اقربا حیرت زدہ رہ گئے اور بہت شرمندہ ہوئے لیکن اب دو بے چند نے بھی تھوڑا پنہاں طور پر لطف کرنا شروع کیا۔اگرچہ ظاہراً اب بھی بے تعلق اور بے پرواہی کا ہی مظاہرہ کرتا۔

تغافل کرد یکچندے کہ کم گردد جنونِ من منش لطف نہان پنداشتم دیوانہ تر گشتم [1]

ایک دن دو بے چند کا باپ مر گیا۔جب اس کے بیٹوں نے داڑھی موچھیں منڈائیں تو الماس نے بھی منڈوا دیں ان کے ساتھ نعش اُٹھائی اور شمشان گھاٹ لے کر پہنچا۔اس قسم کے بہت بار ملامت بڑے خلوص کے ساتھ اس نے دو بے چند کی محبت میں اٹھائے اور بدنامی کی لذت چکھی

گرت دل راست در عشق احترامے ز بدنامی نکو تر نیست کامے [2]

آخر الماس دو بے چند کے گھر کے افراد میں شامل ہوگیا۔سارے ہندو اس سے مہربانی سے پیش آنے لگے۔اس نے طریقہ عشق بازی کو کمال حد تک پہنچا دیا۔اس زمانے میں وہ ہندی کے شعر کہا کرتا اور شاداں شاداں اپنے معشوق کے نام نسبت کرکے اس کے کوچے میں گاتا پھرتا تھا۔ایک

---

1 اس نے تھوڑا سا تغافل برتا کہ میرا جنون کچھ کم ہوجائے۔میں نے اس کو بھی لطف نہاں سمجھا اور پہلے سے بھی زیادہ دیوانہ ہوگیا۔

2 اگر تیرے دل میں عشق کا سچا خلوص واحترام ہے تو اس راہ میں بدنامی سے زیادہ نیک تر کوئی کام ہی نہیں۔

باراس نے یہ شعر کہا جس کا مضمون تھا کہ دو بے چند شادی کرا اور جشن منا کہ تیرے گھر عالم چند آتا ہے۔ اسی زمانے میں اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اس کا نام عالم چند رکھا۔ آخر جب دو بے چند مر گیا تو الماس کی عقل جاتی رہی بے ہوش ہو کر گر پڑا نہ کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ تیسرے دن وہ بھی 980ھ (1572) میں مر گیا۔ اس کی سمادھی بدایوں دروازے کے پاس بنی جس کا مندر بن گیا۔ میرے والد فرماتے تھے کہ میں نے بچپن میں الماس کو دیکھا تھا کہ سارے بچے اس کے پیچھے تماشا کرتے پھرتے تھے۔ بچوں کو بہت سی چیزیں کھلاتا اور اشعار اور نغمات سناسنا کر ناچا کرتا تھا بلکہ اس سے بھی آگے نکل جاتا تھا۔ میرے والد فرماتے تھے کہ شیخ مرتضیٰ کہتے تھے کہ سنبھل میں ایک اور دیوانہ، کشنیا نام کی عورت کا گزرا ہے۔ ایک دن کشنیا نے اس سے کہا باورو بھیو ہے (बावरो भयो है)۔ اسی سے وہ دیوانہ ہو گیا۔ بس یہی کہتا پھرتا تھا۔ شیخ مرتضیٰ سے روایت کی ہے کہ ایک وقت سرائے لاہوری میں سعد اللہ نام کا ایک مسافر سنبھل آیا۔ ایک دن میرے گھر مہمان ہوا۔ ناگاہ کسی کی زبان پر ملہی نام آیا جو کہ سنبھل کا چودھری تھا۔ یہ نام سنتے ہی سعد اللہ نے ایک آہ جگر سوز بھری اور نہایت بلند آواز میں پکارا ''ہے ملہا'' میں نے معلوم کیا کہ کیا بات ہوئی؟ کہنے لگا۔ ہماری قوم میں ایک حسین و خوبرو نوجوان تھا اس کی شادی ہو گئی۔ اسے اپنی دلہن سے جو کہ خود بھی حسین و جمیل تھی بہت محبت ہو گئی۔ ایک بار وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تجارت کے لیے باہر گیا ہوا تھا کافی دنوں کے بعد جب واپس آ رہا تھا لاہور جب دو تین منزل رہ گیا جوان پر بیوی کے دیدار کا شوق غالب آ گیا اور جلدی پہنچنے کی غرض سے قافلے سے الگ نکل کر بہت تیز چلنے لگا۔ ناگاہ رہزنوں نے اس کو مار ڈالا۔ اس کی بیوی قافلہ کی آمد کی خبر سے شوہر کے شوق میں زیب و زینت کیے اپنے عاشق بلکہ معشوق کے وصال کی منتظر بیٹھی تھی کہ یکایک اس نوجوان کی لاش اس کے دروازہ پر پہنچی تو اس کا صبر جاتا رہا اپنے آپ سے بے خود گھر سے باہر نکلی اور فریاد کرنے لگی بار بار بس یہی کہتی تھی ''ہے ملہا، ہے ملہا''۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں خود بھی بے قابو ہو گیا اور مدتوں دیوانہ طور پھرا کیا۔ حالانکہ آج تک کئی سال اس واقعے کو ہوئے مگر اس عورت کی وہ حالت میری آنکھ سے نہ گئی۔ شیخ مرتضیٰ جب بھی یہ حکایت سناتے بڑے درد کے ساتھ سناتے۔ یہ واقعہ میرے شیخ نے خود شیخ مرتضیٰ کی زبان سے سنا ہے وہ خود جب بھی سناتے ہیں شیخ مرتضیٰ ہی کے درد بھرے انداز میں

سناتے ہیں۔ یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ سنبھل کی زمین معشوق خیز اور عشق انگیز زمین ہے اگر چہ یہ شہرو یرانہ ہے۔ خود میں نے بھی جوانی کے دنوں میں عاشقی کی بہت مصیبتیں جھیلی ہیں اور عشق ومحبت کے مشروب پیے ہیں مگر ان کی تفصیل کے بیان کی ان اوراق میں گنجائش نہیں ہے۔

شیخ اسماعیل سنبھلی

وہ سید ہیں اور فروتنی میں شیخ حمید مفسر کے جانشین ہیں۔ وہ ایک بلند مرتبہ صاحب استقامت بزرگ تھے۔ استقامت علی الشریعت میں یگانہ وقت اور توکل میں درست قدم تھے۔ وہ دنیاداروں یا غیر دنیاداروں کسی کے گھر نہ جاتے تھے نہ ہی کسی کی تعظیم کو اُٹھتے تھے۔ اچھے اخلاق والے تھے۔ درویشوں اور آنے والوں کے ساتھ مدارات برتتے تھے۔ ہمیشہ اپنے گھر میں مست وخوش ہوکر گزارتے تھے۔ میں نے بارہا ان سے ملاقات کی ہے اور ان کے الطاف سے بہرہ ور ہوا ہوں۔ ان کا گھر میرے گھر کے نزدیک ہے۔ وفات 3 ربیع الاوّل 1043 (اگست 1634) میں ہوئی ہے اور قبر شیخ حمید مفسر کی قبر کے پہلو میں ہے۔ آج سید درویش ان کے صاحبزادے ان کے نقش قدم پر ہیں۔ ان ہی کی طرح صالح متوکل با اخلاق اور گوشہ نشین۔ نقل ہے کہ شیخ حمید مفسر خود کو قوم خلجی سے بتاتے تھے۔ جس زمانہ میں وہ نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کی صحبت میں رہتے تھے ناگاہ انھیں بادشاہ کی کنیزوں میں سے ایک حسین عورت سے محبت ہوگئی۔ وہ بادشاہ کے ساتھ (سنبھل سے) کابل تک پہنچ گئے۔ جب بادشاہ کو وہاں جا کر حقیقتِ حال معلوم ہوئی۔ مہربانی کی اور اس عورت کو ان کے نکاح میں دے دیا۔ جب بادشاہ پھر ہندستان آئے انھیں چند گاؤں دے دیے۔ سنبھل آکر انھوں نے اپنے لیے نشیمن گاہ (زنانہ مکان) کی بنیاد رکھی مسجد بنوائی، خانقاہ بنائی اور تفسیر واحادیث مثل تفسیر حسینی اور مشکوٰۃ شریف کے مطالعے میں لگ گئے۔ اس زمانے میں جو بھی ان کے پاس آتا۔ چند تنکے کا بیڑا بنا کر اسے دے دیا کرتے تھے۔ اگر وہ لے کر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتا تو ایک بیڑا اور دیتے۔ تین بار تک ایسا ہی کرتے۔ تعمیر کے اندر ان کی نیت یہ تھی کہ غربا کو ان کے یہاں کام کرکے مزدوری ملے اور روزی مند ہوں۔ اکثر لوگ ظاہراً وباطناً دونوں طرح ان سے مستفیض ہوتے تھے بعض کہتے ہیں کہ اکسیر کی ڈبیہ ان کے ہاتھ لگ گئی تھی جس سے سونا بنا کر

خرچ کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ ان کی بادشاہ سے خط و کتاب رہتی تھی۔ بادشاہ نے جو خط ان کو لکھا تھا وہ میں نے دیکھا ہے اس کی نقل یہ ہے

''بسیار خط می نویسم۔ می ترسم از کثرت خط فرستادن شمارا مکدر تر نسازم غرض آنست کہ آن عزیز و شما از آن عزیز تر، چرا بہر جزوے کدورت باید کشید یا خاطر پریشان ساخت۔ والا کہ بائستیہاے این خود لائق نیست کہ شما (براے آن) مکدر شوید۔ شگفتہ باشید و خرم و خندان کہ (این بائستیہا) حیف باشد و ہزار حیف۔ معلوم نیست (کہ) چہ مقدر باشد تفرج این عالم بے وفا (نہ چنداں) کہ باین قدر بار خاطر اشرف عمر لطیف بقیل وقال این نوع امور ضائع شود۔ اگر (شما) این سخن در گرفت اثرش البتہ ظاہر خواہد شد و شگفتگی پیش خواہد آمد و الا پناہ بخدا، آنچہ خیر باشد نصیب شود، آمین۔ والسلام۔ [1] ''

کہتے ہیں کہ آخر عمر میں شیخ (حمید) پر فقر غالب ہو گیا اور کمزوری بدن لاحق ہو گئی۔ اس وقت بھی اُن کو اُٹھا کر فقرا کی صحبت میں پہنچایا جاتا۔ ان کے مرض آخر میں ان کی اہلیہ نے ایک سفید کپڑا دکھایا جب ان کی نظر اس پر پڑی پوچھا کیا ہے؟ کہا آپ کے کفن کا کپڑا ہے۔ کہا نہ نہ میں تو فقیر آدمی ہوں ایک پرانے بوریے میں لپیٹ کر قبر میں ڈال دیں اور اس کپڑے کو بیچ کر فقرا پر خرچ کر دیں۔ اسی طرح کیا گیا۔ جب ان پر احتضار طاری ہوا اپنی اہلیہ سے کہا کہ میرے تمام اعضا پر لفظ اللہ لکھ دے اور محرم 983ھ (14 رمئی 1575) کو دنیا سے چلے گئے۔ ان کی قبر ان کی مسجد کے

---

1 میں آپ کو بہت خط لکھتا ہوں ڈرتا ہوں کہیں زیادہ خط لکھنے سے آپ کی طبیعت مکدر نہ ہو۔ غرض یہ کہ وہ عزیز اور آپ اس سے عزیز تر (دونوں بھائی) کیوں ذرا سی چیز کے پیچھے ایک دوسرے سے کبیدہ خاطر ہوتے ہو یا پریشان ہو۔ واللہ دنیا کی مال و متاع اس لائق نہیں کہ آپ اس کی خاطر مکدر رہوں۔ خوش و خرم رہیں کہ غم دنیا میں گھلنا حیف اور ہزار حیف ہے۔ معلوم نہیں کہ قسمت میں کیا ہے۔ اس عالم بے وفا کی خوشیاں ہی کتنی ہیں کہ جن کے لیے اس قدر بار، خاطر اشرف پر ڈالیں اور عمر لطیف اس قسم کے کاموں میں ضائع کریں۔ اگر یہ بات آپ نے سمجھ لی تو اس کا اثر ضرور ظاہر ہوگا اور شگفتہ دلی پیش آئے گی ورنہ اللہ کی پناہ، جو خیر ہو اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔ آمین والسلام۔

سامنے چھپر کے سائے میں ہے۔ کہتے ہیں کہ انھیں شریعت کی رعایت کے ساتھ سرود سے بہت میلان تھا۔ ایک دن قوالوں نے ان کے سامنے ترانے اور خیال گانے شروع کیے۔ انھوں نے کہا ایک دو کلام اگر ایسے ہوں جو خلاف شرع نہ ہوں تو گائیں اور کسی کو گانے کو کہا۔ حاضرین یہ سن کر خوش ہو گئے۔ میرے شیخ فرماتے تھے کہ جس وقت خواجہ بیرنگ اکبرآباد جا رہے تھے، جب متھرا کے علاقے میں پہنچے سواری کو بہت تیز ہانکا اور فرمایا یہاں سے عشق کی بو آتی ہے یہاں سے جلدی گزر جانا چاہیے۔ یہاں کوئی عاشق (صادق) جو توحید (وجودی) سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر چہ توحید ہی کی حالت میں کیوں نہ ہو۔ یہ بھی ان حضرات کی نسبت عالیہ سے گری ہوئی چیز ہے۔

میرے شیخ کے ملفوظات میں ہے جو ان کے پسر خواجہ سلام نے جمع کیے ہیں کہ مخدوم جہانیان جہاں گشت نے لکھا ہے کہ میں نے شروع شروع میں سیر بہت کی ہے کوئی شہر اور کوئی صحرا نہ ہوگا کہ میں وہاں سے نہ گزرا ہوں۔ ایک دن ایک جنگل میں پہنچا۔ دیکھا کہ وہاں ایک محل ہے نقش ونگار والا۔ جب اندر داخل ہوا نہایت صفائی ستھرائی دیکھی وہاں ایک بڑا تخت بچھا ہوا ہے اور اس کے اردگرد حسین حسین عورتیں بیٹھیں ہیں۔ جب مجھے دیکھا بھاگ گئیں اور میں اس تخت پر بیٹھ گیا ایک ساعت بعد ایک ڈراونی صورت ظاہر ہوئی اور وہ شخص آ کر تخت پر بیٹھ گیا چاہتا تھا کہ مجھ پر ہوائی وار کرے اور مجھے ہلاک کر دے میں بھی اس کے ہلاک کرنے کے لیے متوجہ الی اللہ ہوا۔ اچانک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ ظاہر ہوئی اور مجھے منع فرمایا کہ توجہ مت کر جلد باہر نکل جا۔ جب باہر آیا دیکھا کہ ایک بزرگ سپید داڑھی والے دروازے پر کھڑے ہیں۔ میں نے سلام کیا اور مصافحہ کیا اور دریافت کیا آپ کا نام کیا ہے؟ کہا۔ خضر اور میں اس علاقے کا خادم ہوں یہ کالے رنگ کا آدمی کشن ہے۔

شیخ تاج الدین بلگرامی

وہ شیخ تاجو سے مشہور ہیں۔ صاحب احوال عظیمہ تھے، وارستہ اور آزاد مزاج۔ ان کی صحبت میں اہل دل صاحب تجرید وتفرید فقرا رہتے تھے۔ انھوں نے میرے شیخ کو دیکھا ہے صحبت اٹھائی ہے، بڑی اچھی مجلسیں درمیان میں رہی ہیں۔ میرے شیخ بھی ان کو بہت اچھا کہتے ہیں اور اس قوم عشاق اور

صوفیا میں آگے نکل جانے والا سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کو بلگرام میں دیکھا بڑے پرشوکت مرد تھے۔ گم شدگی اور گمنامی میں ممتاز۔ میں نے وہاں کے رہنے والوں کو ان کی بابت دو گروہ پایا۔ بعضے اہل ظاہران سے نیک گمان نہ تھے اور اعتراض کرتے تھے کہ وہ دائرہ شریعت میں قدم درست و مستقیم نہیں رکھتے لیکن اس قوم صوفیہ کے اکثر دانشمند ان حضرات ان کے معتقد تھے کہ ان کا مشرب، مشرب توحید تھا۔ جو بہت وسیع اور پاکیزہ ہے۔ وہ ہر دو گروہوں کے ساتھ مدارات رکھتے تھے بلکہ بہتر فرقوں کے ساتھ ان کا برتاؤ صلح کل کا تھا۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ مولانا سراج الدین قونوی صاحب دولت ظاہری و معنوی گزرے ہیں۔ لیکن مولانا جلال الدین رومی سے خوش نہ تھے۔ (ایک بار) لوگوں نے ان سے بیان کیا کہ مولانا کہتے ہیں کہ میں بہتر فرقوں کے ساتھ یکساں ہوں۔ چونکہ وہ صاحب مرتبہ تھے چاہا کہ مولانا کو پریشان کریں اور ان کی بے حرمتی کریں اپنے پاس سے ایک عقلمند بزرگ کو بھیجا کہ مجمع میں مولانا سے پوچھنا کہ آپ نے ایسا کہا ہے؟ اگر اقرار کریں تو ان کو بہت گالیاں دینا اور سزا دینا۔ وہ شخص آیا اور مولانا سے سوال کیا کہ آپ نے ایسا کہا ہے کہ میں بہتر فرقوں کے ساتھ ایک سا ہوں یعنی سب سے راضی ہوں، حامی ہوں۔ کہا کہ ہاں کہا ہے۔ اس شخص نے زبان کھولی گالی دینی اور بےہودہ گوئی شروع کی۔ مولانا ہنسے اور فرمایا یہ جو کچھ تو کہہ رہا ہے اس کا بھی حامی ہوں۔ وہ شخص شرمندہ ہوا اور لوٹ گیا۔ انتہیٰ

میرے شیخ اپنے رسالے ''نور وحدت'' میں لکھتے ہیں کہ ہر فرقہ دوسرے فرقے سے جنگ وجدال میں ہے مگر توحید والے ہر ایک کے ساتھی ہیں۔ حالانکہ ان سب فرقوں میں سے کوئی بھی اہل وحدت کے ساتھ نہیں۔ انتہیٰ

معشوقِ ما بمذہب ہر کس موافقست بابا شراب خورد و بزاہد نماز کرد[1]

سید تاجو کا طریقہ، طریقۂ ملامتیہ ہے۔ جیسا کہ خواجہ بیرنگ نے لکھا ہے کہ اہل اللہ کے تین فرقے ہیں۔ عباد، صوفیہ، ملامتیہ۔ آپ تیسرے فرقے میں ہیں۔ اوّل جو عباداللہ ہیں وہ صرف صورت عبادت (ظاہری عبادت) پر اکتفا کرتے ہیں وہ فرائض اور سنن کے بعد نفلی عبادات اور دیگر متفرق

1 ہمارا معشوق ہر شخص کے طریقے سے موافقت رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ اس نے شراب پی اور زاہد کے ساتھ نماز پڑھی۔

نیک کاموں میں لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ ذرا ذرا سے نیک عمل کو بھی (جو کہ شریعت میں آیا ہے) عمل کیے بغیر نہیں چھوڑتے لیکن صوفیہ کے اذواق و مواجید سے بہرہ مند نہیں ہوتے۔ عباد میں سے جو لوگ اذواق و مواجید صوفیہ سے بھی بہرہ ور ہو جاتے ہیں وہ صوفیا میں داخل ہیں۔ وہ اپنے مرتبہ عباد سے نکل آئے ہیں۔ دوسرا فرقہ صوفیا کا ہے جو اذواق و مواجید سے بہرہ مند ہیں اور اپنے خوارق و کرامات کو لوگوں کی نظر سے بچانے کی فکر میں لگتے ہیں اور نہ ہی چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر کام میں ان کی نظر حقیقت پر رہتی ہے۔ مخلوق کو مظہر حق جانتے ہیں۔ اس فرقے میں بھی کچھ نہ کچھ خودی اور رعونت رہ جاتی ہے۔ تیسرا فرقہ ملامتیہ کا ہے جو کہ عوام کے ہم رنگ رہتے ہیں عوام سے ان کی الگ کوئی پہچان نہیں۔ اپنی عبادت کو انھوں نے ظاہری سنت و فرائض کی ادائیگی تک محدود کر دیا ہے۔ مگر اخلاق باطن و اخلاص نیت میں حد درجہ کوشش کرتے ہیں۔ اپنی کرامتوں کا بجائے اظہار کے اِخفا فرماتے ہیں۔ نہ دعوے کرتے ہیں نہ اظہار۔ اس معاملے میں وہ حضرت حق سبحانہ کا اتباع کرتے ہیں کیونکہ دنیا اظہار کا محل نہیں حضرت حق سبحانہ نے بھی خود کو عوام کی نظر سے چھپا رکھا ہے۔ یہ بھی خود کو لوگوں کی نظر سے چھپاتے ہیں۔ لہٰذا اکثر لوگ ان کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ کلی طور پر اس جماعت سے رعونت ختم ہو چکی ہے اور عبدیت کے انتہائی مقام کو پہنچے ہوئے ہیں۔ شیخ ابن عربی نے اس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام میں حضرت صدیق اکبر، سلمان فارسی مشائخ میں بایزید بسطامی، ابوسعید خراز اور ابوسعید برغش کی جماعت کہا ہے۔ دوسروں کا ذکر اگر چہ نہیں کیا ہے مگر ان کی نفی بھی نہیں کی ہے۔ شیخ ابن عربی کی روش یہ ہے کہ کسی خاص وقت پر انہیں جو کشف ہوتا ہے وہی لکھتے جاتے ہیں۔ بعض لوگ دوسروں کے سامنے ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں جو بظاہر ممنوع ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ سفر میں رمضان کے مہینے میں بازار میں کھاتے پھرتے ہیں تا کہ مخلوق کی نظر میں بے اعتبار ہو جائیں۔ ایسے لوگ مرتبے میں صوفیہ سے کم ہیں ابھی مخلوق ان کی نظر سے کلیتاً ساقط نہیں ہوئی ہے۔ انتہیٰ

ایک شب شیخ تاج فقرا کے مجمع میں معارف بیان کر رہے تھے۔ ختم مجلس پر اپنے ایک مرید کو لکھا کہ تو کیوں نہ آیا۔ اس نے جواب میں یہ شعر لکھ دیا

عشق را خانہ ایست بر سر دار بے درش تا نہ بستہ نے کسے بار [1]

ایک رات مظفر پور کے گاؤں میں جو کہ شہر بلگرام کے دیہات میں سے ہے رات گذارنے کا اتفاق ہوا۔ نیک صحبت اور دلکش جمعیت میسر ہوئی۔ میں والد کے ساتھ شامل محفل تھا۔ علاقے کے صاحب معنیٰ فقراء کا ایک مجمع سید تاجو کے ساتھ یہاں جمع تھا۔ قنوج کے سادات تفرقے کے سبب اسی گاؤں میں آئے اور اس مکان میں ٹھہرے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پیراہن مبارک جواب بلگرام میں ان کے گھر ہے اسی رات کو اس گھر میں رکھا گیا تھا۔ سید تاجو نے بے تکلفانہ خوش دل انداز میں فرمایا۔ کیونکہ آج کی رات زندہ رکھنے کی ہے۔ اچھا ہو کہ تمام حاضرین جو اس علاقے اور اس شہر کے ہوں جو کلام وہ اچھا پڑھتے ہوں، پڑھیں۔ بلگرامی حضرات نغمہ سرائی میں مشہور و معروف تھے۔ نشاط میں آ کر گانے لگے اور طے شدہ ترتیب کے مطابق بڑے اچھے سلیقہ دار کلام پڑھنے لگے۔ سامعین بہت محظوظ ہوئے جب میرا نمبر آیا فکر ہوئی کیا کروں آخر میں نے کہا۔ میں ایسی چیز جو سرود سے کم نہ ہو سناتا ہوں۔ سید تاجو نے اجازت دی۔ مجھے ایک درویش کامل کی ہندی تصنیف ''کشن چرت'' یاد تھی پڑھنی شروع کی۔ کشن چرت یہ ہے

جہاں تہاں پرکٹ کشن مرارا کون دشت کون دیکھن ہارا

تہوں باس بن جنم نہوئی بے باسہ نہ دکھیا کوئی

سونگہت لیوے بس نے آوے تہورہ باس کے کون بتاوے

گہت مین جیے سہے کو جانے تہورہ باس کو کون بکھانے

نین کش بسے گہٹ میرے ایک کانسہہ سہس دو پہری

دوہرہ

دہی مدوکروہی مالتی وہی باس مہکائے جیے نہ جانت بابری باتین کہت بنائے

ایکن نہور پھول ہوئی پھولا ایکن نہور باس لک پھولا

ایکن بہروپ بہہ دیہے ایکن تہور رس لیہئے

کہون گوارن سنگ۔ دیکھیں چراوے کہون رادھا پگ لاگ مناوے

---

1 اگر چہ عشق کا گھر سولی پر ہے۔ مگر اس کے دروازہ سے چپنے بغیر کسی کی یار تک رسائی نہ ہوئی۔

اندھون کے ری کہند لکانا جن جن بوجہاتس تس جانا
جو مین اردہ دشت کی ہیرا وہی چتر وہی چتیرا
وہی چتیرا چترہے وہی کنت وہی لیو جن جن بوجہاتس تس کوں جانت نہ کوہیو
ایک روپ بہوگن چنیا چھن چھن روپ مراری بھینا
چور ہوئی کبھوں کرت ہے چوری موہن ہوئی کبھون من مہوری
بیٹھے کبھوں رام سنگہاسن کبھوں دگنیر (گرہٹر) جوگی آسن
رییئے ہری راون بن سنکا ہنوت ہوئی حراتس لنکا
ہوئی بچین کہر کر لیہو آپن کہیو آن نہ کہیو

دوہرہ

وہی کوتک وہی پوتری وہی نچاون ہار نانو بہن ہم یو کہت جات نہ برہم و چار
روگیا ہوئی کبھوں دکھ پاوے کبھوں مورہ پہہ موے لاوے
کبھوں بل ہوئی سربس دیہی باون ہوئی کبھوں بر لیی
چور ہوئی لے سونج پرائی سنہا ہوئی کرے سنہائی
درپن ایک لاگ جدارے دیکھت لاگ تہور ہوئی جارے
جی کی موہ بوجھے پر کیسا ہون کہوں جنہ جناتنہ تیسا

دوہرہ

ہوں کہوں نس بات تج جہاں تہاں نیاپت سوی سہا ڈرے پیال منہ کوکہ بیری موے
بدری گیا تو کوں بدھ آئی مگھر رہا تو کیا گھٹ پائی
کانسی جائے جو کروٹ لینا پاپا کھا جو رسہ بچینا
پاپا کہا جوگیا نبارس لاہا کہا جو آیا جارس
جتلک ہون تیلک وہ ناہیں سورج دشت کہاں پر چھائیں
جب ہوں جاتو تبھی وہ آوے آپ آپ منکال دکھاوے

دوہرہ

ہم گہت مھترواہ ہرانیاں مورت نند لال نس دن برسوں دھیاں دھرا جھا وہی جنجال

جب میں نے پڑھنا ختم کیا۔سید تاجو اور دوسرے حاضرین بول اُٹھے۔احسنت احسنت۔بڑا اچھا کلام سنایا سب کے سب بہت ہی خوش و محظوظ ہوئے۔پھر اس رات کے آخری حصے میں سید تاجو اور بلگرامیوں نے اس کلام کو قلم و دوات منگا کر لکھا۔صبح تک یہ ہنگامہ گرم رہا۔صبح کو میں والد کے ہمراہ اکبرآباد کے لیے روانہ ہوا۔سید عیسیٰ بھکری جو کہ نیک، میرے والد کے دوست اور ہمرنگ تھے اس سفر میں ساتھ تھے۔میرے والد سنایا کرتے تھے کہ سید عیسیٰ اور میں جوانی کے زمانے میں مدتوں فرید آباد اور دہلی میں ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ایک رات وہاں کے حوض کے کنارے شب برات کے نوافل میں ہم نے صبح کر دی تھی۔وقت بہت ہی مبارک تھا ہم دونوں نے کہا کہ اس نیک وقت میں اللہ تعالیٰ سے اپنی مراد مانگنی چاہیے۔سید عیسیٰ نے تو وسعت رزق مانگی اور میں نے سلامتی دین۔خدا تعالیٰ نے دونوں کی مرادیں پوری فرمائیں۔میں نے سید عیسیٰ کو آخر عمر تک دیکھا ہے میرے والد جیسا ان کے بارے میں فرماتے تھے ویسا ہی دیکھا اور اپنے والد کو ایسا ہی دیکھا جیسا انھوں نے مانگا تھا۔میرے والد کے مجمل احوال شیخ رفیع الدین کے ذکر میں گزرے ہیں اور اس سے زیادہ خاتمہ کتاب میں آئیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔بلگرامیوں کی یہ مجلس 1029ھ (1660) میں ہوئی ہے۔اس مجلس کے چند سال بعد میں نے سید تاجو کے پسر سید نتھا کو ان ہی کی طرح اپنے شیخ کے سامنے دیکھا تو ان کے والد کے سال وفات کو معلوم کیا کہا کہ 1051ھ (1661) میں ان کا انتقال ہوا ہے۔سید قاسم جو شیخ تاجو کے سب سے بڑے بیٹے تھے وارستہ آزاد اور صاحب معنیٰ تھے۔(دوبارہ) چند دن میں نے بلگرام میں گزارے۔وہاں سادات کی ملاقاتیں اور وہاں کے دیگر باشندوں سے ملنا جلنا بڑا پر لطف تھا۔ان چند دنوں میں میں نے سید قاسم کے ساتھ ''نفحات الانس'' کے مقدمے کے مقابلے کا شغل رکھا۔وہ صاحب فہم و فطرت شخص تھے شعر بھی کہتے تھے۔قاسم اسرار لقب تھا۔اس کے بعد میں نے انھیں حالت تجرد اور آزادیٔ تمام کی حالت میں دہلی میں دیکھا۔وہ اپنے شیخ کے انتقال کے چند سال بعد ہی دنیا سے چل بسے۔قبر گنگا ندی کے کنارے ایک دل کش جگہ ہے۔

شیخ جمال الدین بلگرامی

انھوں نے بہت سے مشائخ کو پایا۔ میر عبدالواحد بلگرامی کی صحبت اختیار کی۔ صاحب سخن، اہل ذوق اور مشائخ کبار میں سے تھے۔ انھوں نے ''نزہۃ الارواح'' کی شرح لکھی ہے جو نہایت لطیف شریں اور ان کے حال کی شاہد ہے۔ اس میں بہت سے ذوقی اشعار پائے جاتے ہیں۔
اُن کی وفات 1079ھ (1669) میں ہوئی اور قبر ان کے وطن میں ہی ہے۔ میں نے قصبہ سہسوان میں شیخ اللہ داد نام کے ایک درویش کو دیکھا۔
وہ ایک اہل تجرید اور بامعنیٰ شخص تھے انھوں نے بھی زمزمہ کے نام سے شرح لکھی ہے میں نے وہ شرح بھی دیکھی ہے۔ غیر متعارف باتیں اس میں لکھی ہیں اور بہت ہی روشن۔ مجھے ایک گوشے میں لے گئے اور دکھائی اُس قصبے میں انھیں کوئی نہیں پہچانتا۔ جب کہیں ان کی شہرت ہونے لگتی تو کہیں اور کا سفر کرتے۔ یہ 1040ھ (1630) کا واقعہ ہے۔
آخر میں شیخ جمال سنبھل آ گئے تھے۔ یہیں سے خواجہ بیرنگ کی خدمت میں دہلی پہنچے اور صحبت اختیار کی اور فیض یاب ہوئے۔ اسی دوران بیمار ہو گئے خواجہ بیرنگ نے انھیں تیمارداری کے لیے خواجہ ابرار کے سپرد کر دیا۔ خواجہ ابرار نے انھیں پرہیز بتایا۔ دلیا کھانے کو دیا۔ انھوں نے اس سے انکار کر دیا اور روغنی لقمہ چاہا جب انھوں نے خواجہ بیرنگ سے آ کر حال بیان کیا تو فرمایا جو چاہے کھا اور ٹھیک ہو گئے۔ اس کے بعد پھر شیخ عبدالنبی نام کے ایک نوجوان کی طلب میں سنبھل آئے اور 40 سال سے زیادہ شیخ کبیر کلہ رواں کے آستانے پر گزارے۔ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ ہمیشہ ایک ہی لباس پہنے رہتے تھے۔ سر پر تاتاری ٹوپی، بدن پر نیمۂ باریک، کمر میں رنگین پٹکا۔ خوشبودار تیل ٹوپی پر چھڑکا کرتے آزادانہ اور بے تکلفانہ زندگی گزارتے تھے۔ اس زمانے کے مستوں کے برعکس صوفیہ کی اصطلاح میں گفتگو کرتے تھے۔ انھیں حقیقت کا رحاصل تھی اس لیے الحادی کلمات بکنے والے موحدوں سے ناراض رہتے تھے اور مولوی جامی کی یہ رباعی پڑھتے

رباعی

اے بردہ گمان کہ صاحبِ تحقیقی   وندر صفتِ صدق و یقین صدیقی
ہر مرتبہ از وجود (وجوب) حکمے دارد   گر حفظ مراتب نکنی زندیقی [1]

ان کی عمر 100 سال ہوگئی تھی آخر تک بھی مشاہدۂ حسن صوری دل سے نہ گیا تھا، کوچہ گردی اور تماشا بینی سے باز نہ آئے تھے۔ سادہ الفاظ میں شعر کہتے تھے مگر عالی مطالب کے ساتھ۔ جب میرے شیخ سنبھل آتے تھے ان سے ملتے اور ان کے سادہ شعروں سے محظوظ ہوتے تھے۔ میں اکثر ان کے پاس جاتا اور وہ بھی کبھی کبھی میرے پاس آتے اور وہ بہت سے درویش مشائخ کی صحبت اُٹھائے ہوئے تھے۔ بڑی قیمتی حکایات بیان کرتے تھے۔ میں ان کی آخری بیماری میں عیادت کے لیے گیا۔ بے خودانہ لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے بلند آواز سے سلام کیا۔ آنکھ کھولی اور جواب دیا۔ میں نے عرض کیا اے شیخ میرے معاملے میں دعا فرمائیں۔ کہا "تو اچھے لوگوں میں سے ہے" اور آنکھ بند کر لی ایک لمحے کے بعد میں نے رخصت چاہی۔ کہا "ہم نے تجھے خدائے کریم کے سپرد کیا" سید ولی محمد سرسوی جو کہ صاحب معاملہ اور پر ذوق آدمی ہیں کہتے ہیں کہ وہ ایک دن فرمار ہے تھے کہ ہندستان میں خلل عظیم ہونے والا ہے، اسی زمانے میں بادشاہ صاحب قران ثانی بیمار ہوئے۔ اس وجہ سے ہندستان کے چاروں طرف بہت بڑا تفرقہ برپا ہوا جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ ان کی وفات ذی قعدہ کے اوائل میں 1068ھ (1658) کو ہوئی اور ان کی قبر شیخ کبیر کے روضے کے نزدیک ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے انتقال کے بعد ایک شخص نے ان کو تماشا گاہ میں دیکھا اور سلام کیا۔ انھوں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ جب وہ شخص گھر پہنچا سنا کہ دو ماہ ہوئے وہ دنیا سے انتقال کر گئے ہیں۔ حیرت زدہ رہ گیا بلکہ سچ نہ جانا۔ جب ان کی قبر پر پہنچا تو سمجھا کہ حقیقت ہے۔ ڈھولا نام کا میرا ایک پڑوسی تھا وہ لشکری تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک مورچال قلعۂ قندھار میں اس کا حال دگرگوں ہوگیا۔ جو قرض اس کے ذمے تھا ادا کیا ایک تفنگ (بندوق) اس کے سر پر آکر لگی اور وہ 1061ھ (1651) میں دنیا سے چلا گیا اور ایک بزرگ کی قبر کی پائتی دفن ہوا۔ ان کے بھائی جو کہ

1 تو نے یہ گمان کر لیا کہ تو صاحب تحقیق یعنی صفت صدق و راستی اور یقین میں کامل ہوگیا ہے۔ وجوب وجود کے ہر مرتبے کا حکم جدا جدا ہے۔ اگر تو مراتب کی نگہداشت نہیں کرتا تو سمجھ لے بجائے صدیق کے تو زندیق ہے۔

صاحب دل ہیں کہتے ہیں کہ اگلی رات وہ لباس فاخرہ میں آئے اور کھڑے ہوگئے اور کہا میں بہت خوش ہوں مگر گھوڑا مانگتا ہوں کہ مجھے دے دیں اور نظر سے غائب ہو گئے ۔ صبح کو ان کا گھوڑا ذبح کر کے فقرا کو تقسیم کر دیا یہ بھی کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد بھی وہ بعضے آشناؤں پر ظاہر ہوئے ۔ واللہ اعلم ۔ جب میں نے دہلی میں سنبھل سے ان کے انتقال کی خبر سنی فوراً ایک ہندی کا قدیم شعر میری زبان پر آیا جب میں نے اس پر غور کیا دیکھا کہ اس سے ان کا سال وفات نکلتا ہے بے کمی بیشی کے ۔ وہ شعر یہ ہے

دوہرہ

جب ڈھورا تب پائیاں جب دہنیں تب بیوہار

ڈھورا موئین دہن گئیں و کوئے نہ جھانکے پار

(شاہ) ابورضا دہلوی

وہ شیخ عبدالعزیز چشتی کے پوتے ہیں ۔ اور شیخ عبدالحق کے نواسے ۔ ان کے والد خواجہ بیرنگ کے صحبت داروں میں اور ان کے دیدار منور سے مستفیض ہیں ان کے ملفوظ کی چند مجلس انھوں نے لکھی ہیں اور بہت ہی خوب لکھی ہیں ۔ ان میں لکھا ہے ۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ جو کچھ مجلس عالی میں ذکر ہوا کرے آنحضرت کی اجازت سے لکھ لیا جاوے ۔ فرمایا: ''لکھو اور مجھے دکھاؤ'' چند مجلسیں جو میں نے بغیر اجازت لکھی تھیں دکھائیں ۔ فرمایا ۔ اس قسم کی باتیں اہل اللہ کی کتابوں میں بہت ہیں کیا ضرورت ہے اس بات کی کہ تم یہ کہو میں نے فلاں سے سنا ہے ۔ میں نے عرض کیا کہ ان باتوں کے نور سے میرا دل نورانی ہوتا ہے ۔ فرمایا اگر تمھیں اس قسم کی باتوں کی دھن ہے تو تم سنتے ہی ہو مگر لکھنے سے کیا فائدہ؟ اس کے بعد شیخ احمد سرہندی وغیرہ مقربان درگاہ نے جمع ہو کر مکرر اس بات کی درخواست کی تو فرمایا جن باتوں کو طریق وصول میں دخل ہو لکھ لیں ۔ مشائخ کے حالات، معاملات اور حکایات کو ان کے ساتھ نہ ملائیں اور دوکان نہ سجائیں ۔ وہ ہی لکھتے ہیں کہ ایک دن اس فقیر کو دیکھ کر مسکرا کر فرمایا ''اچھا باتیں سننے کے لیے آئے ہو'' اسی سلسلے میں حاضرین میں سے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ابی عبداللہ فیروزی جہاں بھی مشائخ کی گفتگو سنتے کسی سے کہتے

کہ یہ میرے لیے لکھ دے چنانچہ مشائخ کی باتوں سے انھوں نے ایک جلد تیار کر لی تھی جسے اپنے پاس رکھتے تھے۔ ایک دن ایک دریا کے کنارے وضو کر رہے تھے وہ جلد پانی میں گر گئی۔ ان ہی کا بیان ہے کہ میں اس بات سے غم زدہ ہوا اسی غم و افسوس میں تھا کہ میں نے سہل بن عبداللہ تستری کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہہ رہے ہیں ان حضرات کے کہنے پر عمل کرنا چاہیے۔ لکھنا کچھ کام نہیں آتا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ اسی خواب میں حضرت رسالت (پناہ محمد) صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئے اور مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا اے میرے دوست کے بیٹے، سہل تستری سے کہو کہ ان حضرات کے ملفوظات کا لکھنا ان کی محبت کے آثار میں سے ہے اور ان حضرات کی محبت عین مقصود ہے۔ جس دن شیخ اسماعیل کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ انھوں نے خواجہ بیرنگ کی خدمت میں لا کر عرض کیا کہ اس لڑکے کا نام جو زبان مبارک سے فرمائیں وہی رکھا جائے۔ آپ کے دست مبارک میں اس وقت کتاب ''نفحات الانس'' تھی۔ کھولی تو ابو رضا رتن کی حکایت سامنے آئی فرمایا یہی نام رکھو۔ اتفاق دیکھیے اُن کی پیدائش کی تاریخ بھی لفظ ''ابو رضا'' (1010ھ) سے نکلی ان کو رتن بھی کہتے ہیں۔ بچپن سے ہی اُن کا طریقہ زندگی صلاح اور سلامتی والا رہا ہے۔ علوم دینیہ یقینیہ کے عالم اور نیک اخلاق تھے۔ انھیں ایک خاص مقبولیت حاصل تھی۔ کیونکہ ان کا نام خواجہ بیرنگ نے بڑے لطف میں رکھا تھا۔ میرے شیخ کے غایت درجہ نیاز مند تھے اور اخلاصِ درست سے پیش آتے تھے۔ حرمین محترمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور پھر وطن واپس آ گئے۔ اور 1063ھ (1653) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ''حاجی ابو رضا'' ان کی تاریخ وصال ہوئی۔ ''نفحات الانس'' کی حکایت یہ ہے کہ شیخ رضی الدین علی لالا الغزنوی بہت سے مشائخ کی صحبت میں پہنچے تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے 124 کامل واکمل مشائخ سے خرقہ حاصل کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان میں سے 117 خرقے باقی بچے تھے۔ ہندستان کا سفر کیا ابو رضا رتن کی صحبت اختیار کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت کو ان سے حاصل کیا جیسا کہ رکن الدین علاء الدولہ نے اس واقعے کی تصحیح کی ہے۔ اور فرمایا ہے

''صحب الشیخ رضی الدین علی لالا الغزنوی صاحب رسول الله صلی الله علیه و سلم اباالرضا رتن بن نصر رضی الله تعالیٰ فاعطاه مشطاً من امشاطِ رسول الله صلی علیه و سلم''

شیخ رضی الدین علی لالا الغزنوی نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنگھی عطا کی۔ شیخ رکن الدولہ نے اس کنگھی کو خرقے میں لپیٹ کر اور اس خرقے کو ایک کاغذ میں لپیٹا اپنے دستِ مبارک سے اس کاغذ پر لکھا:

"'ھذا المشط من امشاطِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم و صل (بلغ) الی ھذا الضعیف"

یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کنگھیوں میں سے ایک کنگھی ہے جو اس عبد ضعیف کو پہنچی ہے۔ شیخ رکن الدین نے بھی اپنے دست مبارک سے یہ لکھا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ وہ امانت شیخ رضی الدین علی لالا کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے (انتہیٰ) "نفحات الانس" کے محشی خواجہ محمد دہدار لکھتے ہیں کہ انھوں نے ابو رضا رتن کی صحبت اُٹھائی۔ الخ "ارباب حدیث نے ان ہندی شخص یعنی شیخ ابو رضا رتن کی شخصیت کا انکار کیا ہے[1]۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات اور ان کا احادیثِ مبارکہ کا راوی ہونا علماے حدیث اور علماے رجال کے نزدیک کوئی اصلیت واعتبار نہیں رکھتا، یہ سب جھوٹ ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ رکن الدین نے اس کنگھی کو خرقے میں لپیٹ کر......الخ

معلوم ہو کہ شیخ رکن الدین علاء الدولہ کی یہ خود نوشت اور اس کا اقرار کرنا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کنگھی ہے نقاد حدیث کی اس بات سے کہ وہ اس ہندی ابو رضا رتن کی حکایت کو غلط بیانیوں میں شمار کرتے ہیں منافات نہیں رکھتا کیونکہ شیخ رکن الدین علاء الدولہ محدث نہیں ہیں۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ صوفیہ کسی بھی چیز کی آنحضرت صلی علیہ وسلم کی طرف نسبت سے بھی اس کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں کیونکہ اگر ٹھیک ہے فائدہ ہوگا اور اگر غلط روایت ہے تو انھیں کوئی نقصان اس سے نہیں پہنچے گا۔ چونکہ علاء الدولہ کا ملان میں تھے اور رجال الغیب خصوصاً حضرت خواجہ خضر کے ساتھ صحبت تام رکھنے والے تھے اور اہل کشف میں سے تھے۔ شاید انھیں طریق روایت حدیث کے برخلاف کسی دوسرے طریقے سے یہ حدیث محقق ہوگئی ہو۔ میرے شیخ نے بھی

1 یہ ابو رضا رتن وہ شخصیت ہیں جن کو بعض مورخین نے صحابی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بتایا ہے۔ بعض حضرات ضلع بجنور روہیل کھنڈ میں ان کا مزار بتاتے ہیں۔

''نفحات الانس'' کے بعض مقامات پر حواشی تحریر کیے ہیں۔ اس موقعے پر لکھتے ہیں کہ (صحابیت کی) یہ نسبت صحیح ہے کیونکہ کشف کی بہت سی باتیں روایتِ حدیث کے مخالف بھی تحقیق ہوتی ہیں۔ مخالفت کی صورت میں اہل کشف پر یہ خلاف حجت نہیں ہے۔ یہ بات حضرات صوفیہ کے کشف میں مذکور ہے۔

شیخ محمد حصاری

وہ صاحب احوال عظیمہ اور نسبت لطیفہ بزرگ تھے۔ میرے شیخ انھیں خوب جانتے ہیں کہ وہ دوستان خدا میں سے تھے۔ میں نے بھی ایک بار 1030ھ (1620) میں ان کو دیکھا کہ ایک رات مجلس کے ایک گوشہ میں سر جھکائے جھکائے محو ہو گئے۔ حالت استغراق میں وہ اس عدم کے خواہاں ہیں جس کے بعد پھر وجود ہی نہ ہو۔ جیسا کہ خاتم الکبار خواجہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا ہے۔ ''قدما لاعود له'' (ایسا قدم جس کے بعد رجوع ہی نہ ہوا۔) جب انھوں نے سر اوپر اُٹھایا تو یہ پڑھ رہے تھے

سائین کے گھر جات ہیں سنگ نہ پیچھے کوی پا چھیں پاؤں ندیجئے آگیں ہو سو ہوی [1]

میرے شیخ نے فرمایا کہ متوجہ وحدت رہنا چاہیے۔ ظہور کے تمام مراتب سے نظر ہٹا لینی چاہیے لیکن بغیر کسی صورت کی مدد کے وحدت محض کی جانب توجہ کرنی عام طور پر میسر نہیں ہے۔ وجہ خاص معیت خاص سے عبارت ہے۔ یہ جذبے کا طریق ہے۔ جس پر نقشبندیہ کے اکابر و ائمہ۔ سالک کو چلاتے ہیں۔ جب سالک اس راہ کے حقیقۃ الحقائق تک پہنچ جاتا ہے اور حقیقت مطلقہ ظہور کرتی ہے تو وہ توحید ذاتی اکملی محمدی سے متحقق ہو جاتا ہے۔ اس سے اوپر کوئی مقام نہیں۔ ایک دن میرے شیخ مقصودِ ''لا منتھیٰ له'' (بے نہایت درگاہ الٰہ) کی طلب میں یہ شعر بھی ذوق کے ساتھ پڑھ رہے تھے

اے برادر بے نہایت درگہے است ہر چہ بروے می رسی در وے مایست [2]

فرماتے ہیں کہ اس کار وصول الی الحق کی حقیقت یہ ہے کہ جب تو ادھر متوجہ ہو تو اپنے آپ سے

---

1. سائیں کے گھر جارہے ہیں نہ کوئی ساتھ ہے نہ پیچھے۔ پیچھے پیر نہ بڑھائیے آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔
2. اے بھائی درگاہ الٰہی بے نہایت درگہہ ہے۔ جو وہاں پہنچا اسی میں فنا ہو گیا گم ہو گیا۔

غیریت اختیار کر لے۔ یہ وہی بات ہے جیسی کہ شیخ احمد سرہندیؒ کے بیان میں گزری ہے۔
''نفحات الانس'' میں فرماتے ہیں کہ حضرت ابوعبداللہ خفیف سے دریافت کیا گیا کہ تصوف کیا ہے؟ فرمایا۔''وُجود اللہ فی حین غفلۃ''[1] ''نفحات الانس'' میں ہی روایت ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ حضرت معزنے مجھ سے کہا کہ صوفی جب تک اپنی ہستی سے گزر نہیں جاتا صوفی حقیقی نہیں بنتا۔ جب تک صوفی صوفی ہے صوفی نہیں ہوتا اگر ہوتو صوفی نہیں'' کا یہی مطلب ہے واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے مگر یہ ان کی اپنی بات نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے کسی سے سنی تھی (یعنی جعفر خلدی سے سنی تھی) شیخ الاسلام نے فرمایا۔ اس سے زیادہ دل خوش یہ بات ہے کہ''جس کا دیدار دنیا میں نہیں وہ وجود میں چھپا ہے۔'' جیسے کہ کوئی شخص لباس میں چھپا ہو۔ کہتے ہیں کہ''وہ ہے، تو نہیں ہے۔ تیرا یہ قالب دل میں گم ہے دل جان میں، جان جاں آفریں میں جو ہمیشہ زندہ ہے۔ انتہیٰ

شیخ یار محمد لاہوری

شیخ آدم بنوری کے مرید ہیں۔ بڑے صاحب استقامت۔ اس کام میں راسخ اور درست معاملہ۔ اپنے یارانِ طریقہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ اشغال باطنی کا نور ان کے حد درجہ بارونق چہرے سے ہویدا ہے۔ وہ میرے شیخ کے مخلص و صادق ہیں میرے شیخ بھی ان کو زمانے کے نیک لوگوں میں فرماتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے میرے شیخ کی دعوت کی۔ تمام دوسرے مریدین اور میں ساتھ گئے۔ بڑی اچھی صحبت (مجلس) رہی۔ وہ عوام کے لباس میں رہتے ہیں۔ جیسے کہ اہل سلسلۂ نقشبندیہ کی روش ہے حالانکہ دعا والے اور صاحب توجہ و تصرف ہیں۔ کیونکہ ان حضرات کا طریقہ نہایت سرو اخفا ہے۔
بہت کم لوگ ان کے احوال پر مطلع ہو پاتے ہیں۔ نقل ہے کہ ایک دن ایک مجذوب خواجہ احمد بسوی قدس سرہٗ جو کہ اکابر اولیاء میں سے ہیں، کی قبر پر بیٹھ گیا فوراً وہ قبر ہلنے لگی اور اس کو نیچے پھینک دیا۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر اکابر نقشبندیہ میں سے کسی کی قبر پر جا بیٹھا۔ وہ قبر بالکل نہیں

---

1 بندے کی غیب میں اللہ تعالیٰ کا وجود (اپنی غیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا احساس ہونا۔)

ہلی۔ وہ اٹھا اور چلنے لگا راہ میں اچانک کہیں سے محتشم کا لڑکا آ رہا تھا اور جھنجلایا ہوا تھا خدام سے کہا کہ اس مجذوب کی پٹائی کر دو۔ وہ مجذوب پٹ کر خوش خوش جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا ہاں، ہاں۔ نقشبندیوں کی یہی روش ہے کہ اپنا کام دوسروں کے ہاتھ سے لیتے ہیں۔ (الزام) بظاہر اپنے سر نہیں لیتے۔ رشحات میں ہے کہ شیخ ابوسعید آہنیری کا فرمانا ہے کہ ایک بار حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ شروع عہدِ جوانی میں ہمارے گھر تشریف لائے تھے تو ہم برادران، بچوں اور متعلقین سمیت آپ کی خدمت میں مشغول ہوئے۔

آپ پر آثار جذب اور بڑے احوال کا ظہور ہم کو نظر آ رہا تھا۔ ان کے یہ آثار و احوال ہمارے اعتقاد کو بڑھا رہے تھے۔ اتفاق کی بات کہ بڑے بھائی روتے ہوئے داخل ہوئے کہ اسد چوب دار کے لڑکے نے مجھے بہت ایذا پہنچائی ہے اور حد سے زیادہ ڈانٹا ڈپٹا ہے۔ اسی اثنا میں میری والدہ نے مضطرب متضرّع اور پریشان ہو کر حضرت والا سے درخواست کی کہ میرے فرزند کے لیے آپ متوجہ الی اللہ ہوں کہ یہ شخص نہایت فاسق اور ظالم آدمی ہے۔ بہت سے فقرا کو اس سے نفرت ہے۔ ایسا لگا کہ حضرت ایشاں والدہ کے اضطراب اور اضطرار سے رنجیدہ ہوئے۔ نماز نفل کا وقت تھا یعنی اشراق کا۔ فوراً نماز کے لیے اُٹھے اور جب نماز ادا کر لی تو فرمایا یہ کتا مجھے نماز میں نظر آیا میں نے اس کا کام تمام کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اس شخص نے کسی سے جھگڑا کر لیا۔ لوگوں نے پیٹ کر اسے خوب ادب سکھا دیا کیونکہ ہم خاکسار باپ دادا سے آپ اور آپ کے بزرگوں کے مرید اور مخلص رہے ہیں اس لیے آپ ہمارے یہاں تشریف لاتے رہتے ہیں۔ جب آپ دوبارہ تشریف لائے تو میری والدہ نے سنایا کہ آپ کی دعا کی برکت سے ہمارے دشمن کی خوب تادیب ہوگئی ہے۔ آپ نے فرمایا وہ جو ہم نے کہا تھا کہ ہم نے اس کے کام کی کفایت کر دی ہے وہ یہ نہیں ہے وہ تو ابھی سامنے آنا ہے۔ چند دن کے بعد بادشاہ وقت کے حکم سے گھوڑے کی دم سے باندھ کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد اس کے جسم کے ٹکڑوں کو جمع کر کے جلا دیا۔ انتہیٰ۔ حضرت مولانا جامی ''نفحات الانس'' میں حضراتِ نقشبندیہ کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

قطعہ

نقشبندیہ عجب قافلہ سالارند | کہ برند از رہ پنہان بحرم قافلہ را
از دلِ سالک رہ جاذبہ صحبت شان | می برد وسوسہ خلوت و فکر چلہ را
قاصرے گرکند این طائفہ را طعن قصور | حاش لِلّٰہ کہ بر آرم بزبان این گلہ را
ہمہ شیرانِ جہان بستہ این سلسلہ اند | روبہ از حیلہ چسان بگسلد این سلسلہ را [1]

مولانا فخرالدین علی جو صفی تخلص سے مشہور ہیں انھوں نے خواجہ عبیداللہ احرار قدس سرۂ کی منقبت میں "رشحات" کے آخر میں یہ قصیدہ کہا ہے

قصیدہ

نقشبندیہ عجب طائفۂ پرکارند | کہ چو پرکار درین دائرہ سر بر کارند
ہمہ گرد آمدہ بر مرکزِ یک دائرہ اند | ہمہ واقف شدہ از گردشِ یک پرکارند
نقشبندند ولے بند بہر نقش نیند | ہر دم از بوالعجبی نقش دگر پیش آرند
ہر زمان بوقلمون دار برنگے دگرند | وین عجب ترکہ زرنگ دو جہان بیزارند
گر چہ در ظاہر عامند بباطن خاصند | گر چہ در صورت خصمند بمعنی یارند [2]

---

1 نقشبندیہ عجیب قافلہ سالار ہیں کہ راہ پنہاں سے قافلے کو حرم تک لے جاتے ہیں۔ ان کا جذبۂ صحبت سالک کے دل سے وسوسۂ خلوت اور فکرِ چلہ کو لے جاتا ہے۔ اگر کوئی کوتہ نظر اس طائفے کو قصور کا طعنہ دیتا ہے۔ اللہ کی پناہ میری زبان پر یہ گلہ آتا ہے۔ "دنیا کے سارے شیر (اللہ والے) اس سلسلہ میں بندھے ہیں۔ لومڑی فریب کے ساتھ کس طرح اس زنجیر کو توڑ سکتی ہے۔

2 نقشبندیہ عجب مشغولی کے حضرات ہیں۔ پرکار کی مانند ایک دائرے (کثرت) میں مرکز توحید کے گرداگرد گھوم رہے ہیں سب اسی ایک دائرے کے مرکز کے گرد آگئے ہیں۔ سب کو گردش پرکار کی واقفیت ہے کہ یہ مرکز کے نقطے پر گھوم رہی ہے۔ نقشبند ہیں لیکن کسی ایک نقش کے قیدی نہیں ہیں۔ ہر دم جدید کیفیات سے دوسرا ہی معاملہ در پیش رکھتے ہیں۔ ہر وقت بوقلموں رنگوں کی مانند نئے ہی حال میں ہوتے ہیں۔ اس پر حیرت یہ ہے کہ دونوں جہاں کے رنگ سے بیزار رہتے ہیں۔ اگر چہ بظاہر عوام ہیں مگر بباطن خواص ہیں۔ اگر چہ صورتاً مخالف توحید نظر آتے ہیں مگر باطنی طور پر توحید دوست ہیں۔

آب نیل اند ولے بر لب قبطی خونند — روح محض اندولے بر خر عیسیٰ بارند

گر چہ مرآت صقیل اند حبش را زنگند — ورچہ گلزار خلیل اند خطب را نارند

در قبا از روش اہل عبا یاد دہند — نہ چو زرّاق و شان خرقہ ارزق دارند

سحر و تلبیس بود شیوہ این عیاران — ملتبس بصفات ملک ستارند

ستر این کثرتِ موہوم دران وحدتِ صرف — چشم دارند ازان بر سر استغفارند

نکند کثرت آثار در ایشان تاثیر — خویش را دوختہ بر مبداءِ این آثارند

پاس انفاس بود خصلت این شاہ و شان — پاسبانند ولے باد شہِ اخیارند

دم نگہداشتہ چون نافۂ مشکند دگر — لب کشایند روان بردر صد عطارند

خامشانندولے وقت سخن طوطی دار — ہمہ شیرین حکایات و شکریں گفتارند

نجم آسا ہمہ را خلوتے در انجمن است — شمع ہر انجمن و رونق ہر بازارند[1]

---

1 اگر چہ بظاہر عوام ہیں مگر بباطن خواص ہیں۔ اگر چہ صورتاً مخالف توحید نظر آتے ہیں مگر باطنی طور پر توحید دوست ہیں۔ ویسے تو وہ مخلوق کے فائدہ پہنچانے میں نیل کے پانی کی مانند ہیں مگر فرعون کی قوم قبط کے لیے خون بن جاتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اگر چہ روح محض ہیں لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے گدھے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بدن کی طرح بار نہیں ہیں۔ اگر چہ صاف شفاف آئینہ ہیں لیکن حبشی کی نظر میں زنگ کی مانند ہیں۔ اگر چہ دوستوں کے حق میں مانند گلزار خلیل علیہ السلام ہیں مگر سوختے کے لیے تو جلانے والی آگ ہیں۔ یہ حضرات عمدہ لباس میں بھی درویشوں کی یاد دلاتے ہیں نیلے کپڑے رنگ کر بناوٹی درویش بن کر خرقہ ریاکاری نہیں پہنتے۔ ان ہوشیاروں کا شیوۂ زندگی اپنے حال کا سرّ و اخفا ہے۔ اس معاملے میں وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ستاری کے مظہر ہیں۔ وہ وحدت صرف میں کثرت موہوم کی پوشیدگی کا نظارہ کرتے ہیں پھر اس سے بھی (غیرت تنزیہہ کے سبب) استغفار کرتے رہتے ہیں۔ آثار کی کثرت ان پر کوئی اثر نہیں ڈالتی کیونکہ انھوں نے خود کو مبدا آثار سے چمٹالیا ہے۔ جیسے بادشاہ اپنی رعایا پر حکومت کرتے ہیں یہ حضرات بھی اپنے سانسوں پر حاکم ہیں۔ بظاہر اگر چہ انفس کے پاسبان ہیں مگر بباطن اخیار کے دلوں کے بادشاہ ہیں۔ اپنی سانسیں روکے ہوئے نافۂ مشک کی طرح مہر بلب ہیں۔ لیکن اگر ہونٹ کھول دیں تو سیکڑوں عطر فروشوں کی روحوں کو زندگی بخش دیں۔ اگر چہ خاموش رہتے ہیں مگر بولنے کے وقت طوطی کی طرح بولتے ہیں سب کے سب شیریں حکایات اور شیریں گفتار ہیں۔ ستاروں کی مانند انہیں انجمن میں خلوت حاصل ہے حالانکہ ہر انجمن اور ہر بازار کی رونق ہیں یعنی گوشہ نشینی کے بجائے انجمن آرائی کرتے ہیں مگر خلوت میں انجمن کی صفت سے موصوف ہیں۔

چون مہ ہالہ نشین شانِ سفر اندر وطن است — بتن ایستادہ بدل در کشش و رفتارند
حال این گرم روان تحسبہا جامدہ است — لیکن افسردہ دلان چون خود شان پندارند
اہلِ دل قافلۂ کعبۂ عشقند ولے — این حکم دارانِ آن قافلہ سالارند
در سیۂ خانہ صحرای فنا کردہ نزول — خیمہ بر سر زدہ زین نہ تتق زنگارند
ہر یکے سرو شان مانند بمیدان جہاد — کوہے از لومہ لائم بجوے نشمارند
ماہیانند کہ در بحر صفا راست روند — ہمچو خرچنگ لب جوے نہ کژ رفتارند
بر لب تشنہ دہان روح فزایا قوتند — در کف وسوسہ کیشان زر مشت افشارند
دیدہ پاکان نَے روشنیٔ دیدہ پاک — سر دینداری نَے بر سر دین دستارند
شاہد شاہ وجوند درین دار ولے — نہ چو منصور سر عربدہ جوے دارند
میر سد شان رطب معرفت نخل وجود — یا رب از بخت خود این قوم چہ بر خوردارند[1]

1 حالہ نشین چاند کی طرح سفر میں رہتے ہیں۔ جسمانی طور پر ایک جگہ کھڑے نظر آتے ہیں مگر باطنی طور پر ہردم رواں دواں چلے جارہے ہیں۔ دیکھنے میں ان تیز چلنے والوں کا حال جامد لگتا ہے۔ اسی وجہ سے جو افسردہ دل لوگ ہیں جن میں طلب حق نہیں انھیں اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ اہل دل کعبہ عشق کے قافلے والے ہیں تو یہ بزرگواں قافلہ سالار ہیں۔ اول صحرائے فنا کے اندھیرے گھر میں آکر اُترتے ہیں مگر ساتوں آسمان سے اوپر خیمے گاڑ دیتے ہیں یعنی فنائے اتم سے بقائے اتم حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں کا ہر ایک سرو کی طرح میدان جہاد میں کھڑا رہنے والا ہے۔ لومۃ لائم کے کسی بھی پہاڑ کو گنتی میں نہیں لاتے۔ جَو کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ گویا بحرصفا میں سیدھی تیرتی مچھلیاں ہیں۔ کیکڑے کی طرح ندی کے کنارے کج رفتار نہیں ہیں۔ تشنہ دہاں لوگوں کے لبوں پر روح افزاء یاقوتی (ایک قسم کی سرخ شراب) ہیں۔ روزی سے پریشان حال لوگوں کے ہاتھوں پر سونا بکھیرنے والے ہیں۔ پاک نظر ہیں بلکہ دیدہ پاک کی روشنی ہیں۔ دین داروں کے رہبر ہیں بلکہ دین کے سر کی دستار یعنی عزّت ہیں۔ اگرچہ وہ اس دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے شاید عدل ہیں لیکن حضرت منصور کی طرح دعوی انا الحق کر کے سولی پر ہنگامہ آرائی کا خیال نہیں رکھتے۔ توحید وجودی کی معرفت کی رس دار کھجوریں انھیں پہنچتی ہیں یعنی توحید وجودی کی کیفیات سے لطف اندوز رہتے ہیں۔ اے رب یہ حضرات کیسی بانصیب قوم ہیں۔ عارف رومی جن کے کلام کے بھی والہ وشیدا ہیں

هست بیت از غزلِ بے بَدَلِ عارف روم — کہ ہمہ با خبران والہٴ آن گفتارند
می کنم تضمین کہ اندر صفت این پاکان — آن گہر ہاے شرف عقدِ ثریا دارند
چون صدف گوش نہ و جای دہِ اندر دل صاف — این غزل را کہ بجز عقد دُرش نشمارند
جملہ ہشدار کہ در شہر دو سہ طرّارند — کہ بتدبیر کلاہ از سر مہ بردارند
دوسہ رنداند کہ ہشیار دل و سرمستند — نہ فلک را بیکے عربدہ در چرخ آرند
صورتے اندولے دشمن صورتہا اند — در جہانند ولے از دو جہان بیزارند
یادِ آن صورت غیبند کہ جان طالب اوست — ہمچو چشم خوش خود خیرہ کش و بیمارند
سردہانند کہ تا سرندہی سر ندہند — ساقیا نند کہ انگور نمے افشارند
گر بکف خاک بگیرند زر سُرخ شود — روز گندم درودند ارچہ بشب جوکارند
مردی کن مرو از صحبت شان مردم شو — زانکہ این مردم و دیگر ہمہ مردم خوارند
اے صفی مرد می آموز ازیشان کایشان — مردم دیدۂ بینائی اولواالابصارند[1]

---

1 ان کی ایک بے بدل غزل کے ایک شعر پر تضمین کرکے میں نے ان پاکبازوں کی صفات کہی ہیں۔ عارف رومی کی اُس غزل کے گوہر پارے عقدِ ثریا کا شرف رکھتے ہیں اس غزل پر صدف کی مانند کان لگائے رکھ اور دل میں بسالے کہ اہل دل حضرات اس غزل کے معنی کو بجز الہامی اور کچھ نہیں مانتے۔ شعر

''جملہ ہشدار کہ در شہر دوسہ طرّارند — کہ بتدبیر کلاہ از سرمہ بردارند

ترجمہ: حالانکہ شہر میں دو تین ہی ایسے چھپے ہوئے کامل واکمل ہیں جو اپنی تدبیر سے چاند کے سر کی ٹوپی اتار لیں یعنی منزل مقصود تک پہنچا دیں۔ ان دو تین کی طلب میں سب کے ناز اٹھا۔ دو تین رند ہی ایسے ہیں جو ہوشیار دل و مست دماغ ہیں۔ نو فلک کو ایک ہنگامے میں نچا کر رکھ دیں۔ صورت ہیں مگر صورت کے دشمن ہیں، دنیا میں ہیں مگر دنیا سے بیزار ہیں۔ اس غیبی صورت کی جس کے وہ چاہنے والے ہیں یادگار ہیں۔ گویا اپنی ہی خوبصورت آنکھ کے دیوانے اور بیمار ہیں۔ وہ ایسے آگاہی بخشنے والے ہیں کہ جب تک کوئی سر کی بازی نہ لگا دے۔ اسے راز دار نہیں بناتے۔ ایسے ساقی ہیں انگور کی شراب نہیں پلاتے بلکہ معرفت الٰہی کے جرعے لنڈھاتے ہیں۔ اگر وہ ہاتھ میں مٹی اٹھالیں تو وہ سونا بن جائے۔ رات کو جَو بو کر صبح کو گندم کاٹتے ہیں۔ بہادری دکھا اِن کی صحبت سے گریزاں مت ہو۔ اور مردانِ خدا میں شامل ہو جا کیونکہ حقیقتاً یہی مرد ہیں ان کے سوا دوسرے سب تو مردم خوار ہیں۔ اے صفی ان حضرات سے آدمیت سیکھ لے کیونکہ۔ یہ حضرات اولوالابصار لوگوں کی آنکھوں کی پتلی ہیں۔

نورِ این مردمک دیدهٔ بینا که بود — آن کز و اہل نظر چشم عنایت دارند
قطب آفاق شه کون و مکان خواجہ عبید — کز عموم نِعَم او ہمہ روزی خوارند
نیر عالم توحید که از کون و مکانش — ہمہ ذرّات جہان مقتبس انوارند
خواجۂ زمرۂ احرار کہ شاہانِ جہان — بر درِ حشمتِ او بندہ خدمت گارند
دین پناہا توی اے قبلۂ حاجات کہ خلق — بیخود از ہر جہتے روے بتو می آرند
ہمہ با طوقِ وفا حلقہ بگوشانِ تواند — گر عبیداند درین راہ و گر احرارند
جاہلانے کہ سراز ربقہ امرت پیچند — در چرا گاہ ولایت خرِ بے افسارند
کہ سراسیمہ فتادہ ہمہ تیہ ضلال — گاہ حیرت زدہ در بادیہ اِدبارند
ناکسانے کہ ز احسانِ تو محروم زیند — بر لب بحر جگر تشنہ چو بو تیمارند
آن حریفان کہ مے از ساغر عشقت نوشند — گر چہ بس بے خود و مست اند عجب ہشیارند
بیخودان را بجناب تو دمادم کششے — بیدلان در خم قلّاب تو ماہی وارند
ماہی بحر توام و ز صفت و مدح تو پُر — چون صدفہا کہ لبالب ز دُرِ شہوارند [1]

---

1 ان روشن نظر حضرات کی آنکھوں کی پتلی کا نور کون ہے؟ وہ کہ جس کی اہل نظر چشم عنایت پاتے ہیں۔ قطب آفاق شہ کون ومکان خواجہ عبیداللہ احرار کہ جن کی نعمت عام کے سب روزی خوار ہیں۔ عالم توحید کے خورشید جہاں تاب کہ جن کے نور سے سارے جہان کے ذرّے نور حاصل کرتے ہیں۔ زمرۂ احرار کے آقا کہ دنیا کے بادشاہ ان کے درکی حشمت کے بندۂ خدمت گار ہیں۔ اے قبلہ حاجات دین پناہ آپ ہی ہیں کہ مخلوق خدا محبت سے بھری آپ کی عقیدت میں ہر سمت سے آپ کی جانب دوڑی چلی آرہی ہے۔ اس راہ درویشی میں بظاہر سب کے سب آپ کی طوق وفا کے حلقہ بگوش ہیں، چاہیں وہ غلام ہوں یا آزاد۔ چند جاہل جو آپ کے حکم سے گردن پھیرتے ہیں چراگاہِ ولایت سے۔ رسی تڑائے گدھوں جیسے ہیں۔ کبھی سراسیمہ وادیٔ ضلالت میں جاگرتے ہیں اور کبھی ذلّت بھرے صحرا میں حیرت زدہ کھڑے ہیں۔ وہ کم ظرف لوگ جو آپ کے احسان سے محروم ہوکر زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ پانی کے کنارے بگلے کی طرح جگر تشنہ ہیں۔ وہ محبّ جو آپ کے عشق کی شراب پیتے ہیں اگر چہ حد درجہ بے خود و مست ہیں مگر عجیب ہوشیار حضرات ہیں۔ بے خودوں کو تیری درگاہ میں لحہ لحہ ایک کشش ہے۔ تیرے بے دل تیرے قلابے میں مچھلی کی طرح رہتے ہیں۔ میں بھی تیرے بحر کی مچھلی ہوں صدف کی مانند جو کہ دُرِ شہوار سے بھرے ہیں۔

ہر کہ شد غرقہ بحر تو فزود آب رخش   اہل ساحل چو صدف ریزۂ بیمقدارند
جاودان غرقہ درین بحر صفاہا وصفی   ہر گزش یا رب ازین بحر برون نگذارند [1]

شیخ کریم اللہ سہارن پوری

صاحب اخلاق عظیمہ تھے۔ صفا و لطافت کا نور ان کے چہرے سے صاف جھلکتا تھا۔ ربط باطنی خوب تھا اور استقامت اس سے بھی خوب تر۔ کہتے ہیں کہ وہ جب بچے تھے شیخ ابوالفتح پھلتی جو کہ بہت بزرگ شخص تھے جب سہارنپور پہنچے تو انھیں دیکھ کر کہا اے لڑکے میرا مرید ہو جا۔ وہ اپنے والد کی اجازت سے شیخ ابوالفتح سے بیعت ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ خواجہ عبدالرشید نام کے ایک بزرگ بوریہ میں تھے وہ بھی جب ان کو دیکھتے کہتے کہ "یہ لڑکا ولی ہوگا۔" یہ بھی کہتے ہیں کہ جب وہ جوان ہو گئے تو وہ شیخ فیض اللہ معروف بہ شیخ فضو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فیض اُٹھایا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب انھوں نے ایک رات کو خواب میں دیکھا کہ حضرت غوث اعظم نے اُن کو لباس عطا کیا ہے۔ جب جاگے ایک درویش صفا کیش ان کی خدمت میں ایک دنبہ لایا اور بولا "یہ غوث اعظم کی نذر ہے۔" اسی دن سے انھوں نے دل میں بٹھا لیا کہ سلسلہ قادریہ کے کسی بزرگ کی خدمت میں جا کر خرقۂ خلافت حاصل کرنا چاہیے۔ پھر وہ پٹنہ آئے اور یہ ارادہ شیخ عبداللہ سے ظاہر کیا۔ شیخ نے شروع میں خلافت دینے میں توقف کیا اور فرمایا۔ پہلے دیکھوں کہ مجھ پر اس بابت کیا کھلتا ہے۔ جب رات گزر گئی شیخ نے بڑی خوشی کے ساتھ اُن کو خرقہ خلافت عطا کیا۔ شیخ محمد عالم سہارنپوری جو کہ عالم و فاضل ہیں کہتے ہیں میں نے دنیا میں ایسا باتقویٰ، صاحب تسلیم و رضا آدمی نہیں دیکھا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ تمام عمر قہقہہ لگا کر نہیں ہنسے۔ اگر خوش ہوتے تو بس مسکرا کر رہ جاتے۔ وہ جس جگہ بھی تشریف لے جاتے قبلہ رُخ بیٹھتے تھے۔ قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ تھوکتے۔ مال و متاع اور دوسری چیزوں کے چلے جانے سے غمگین نہ ہوتے۔ خوش و خرم زندگی گزارتے تھے۔ ان کے سب

---

1 میں بھی تیری مدح و ثنا سے بھرا ہوا ہوں۔ جو بھی تیرے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے اس کے چہرے کا نور دوبالا ہو جاتا ہے۔ مگر کنارے پر رہنے والے کنکریوں کی طرح بے قیمت ہی رہتے ہیں۔ اے اللہ صفی کو ہمیشہ بحر صفا میں غرق رکھنا۔ اسے کبھی بھی اس سمندر سے باہر مت نکالنا۔

طور طریق مناسب ولایت تھے۔ وفات کا سال 1049ھ (1639) ہے اور ''شیخ الحق'' تاریخ وفات ہے۔ میں 1038ھ (1629) میں جب سہارنپور پہنچا تھا تو ان کا دیدار کیا تھا۔ انھوں نے بھی مجھ پر لطف فرمایا۔ اسی زمانے میں ان کے دروازے کے سامنے ندی کے کنارے ایک خوبصورت نئی مسجد تیار ہوئی تھی۔ کیا ہی خوب دل کش اور فرحت بخش جگہ ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ سادہ شعر کہتے۔ اس مسجد کا قطعہ تاریخ بھی انھوں نے کہا تھا۔ اس کا آخری مصرعہ یہ ہے

آمد اندر قطعہ ام تاریخ بیت اللہ ''غزل'' 1037ھ

شیخ قاسم سہارنپوری

شیخ آدم بنوری کے مرید ہیں۔ آپ پڑھے لکھے نہ تھے۔ بڑے صاحب معنیٰ، وارستہ اور آزاد مزاج بزرگ تھے۔ اس راہ کی بہت اونچی باتیں کرتے تھے۔ جہل و حیرت کو مرتبہ علم و معرفت پر فوقیت دیتے تھے۔ یہاں غالباً اس جہل کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ ''رشحات'' میں ہے کہ شیخ عبدالکریم یمنی نے فرمایا ہے۔ جہل و حیرت کی طرف آنا چاہیے اور نماز کی نیّت ایسے کرنی چاہیے کہ میں اس خدا کی عبادت کرتا ہوں جسے نہ دیکھا ہے نہ کماحقہٗ جانا ہے۔ اللہ اکبر۔

میرے شیخ نے شروع میں اپنے صاحبزادے خواجہ غلام بہاء الدین شناسا کو نورالدین حسین برانی اور سید غلام محمد امروہوی کے ساتھ جو کہ میرے شیخ کے مریدوں میں سے ہیں۔ وارستہ مزاج، آزاد منش اور عالم فاضل ہیں۔ ان کی خدمت میں سہارنپور بھیجا۔ خوب صحبتیں رہیں لیکن چند روز بعد واپس آ گئے۔ پھر میرے شیخ کی صحبت میں مقام بلند اور مرتبہ والا کو پہنچے جیسا کہ تھوڑا سا بیان ان شناسا کے ذکر میں گزرا ہے۔ ایک بار میں سنبھل سے لاہور اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ راہ میں حاجی محمد خیرآبادی سے جو کہ صاحب معنیٰ، آزاد اور نیک نہاد شخص ہیں، ملے۔ اس دن مجھے بخار آ رہا تھا۔ پہلی بار جب میں نے انھیں دیکھا تو کیونکہ انھوں نے مجھے دیکھا نہ تھا میری طرف دھیان نہ دیا۔ لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ میں کون ہوں تو مہربانی فرمائی اور بڑے اخلاص سے پیش آئے اور اپنے ابتدا حال کی باتیں سنائیں کہ میں اپنے شیخ کی خدمت میں بہت زیادہ مشغولیت رکھتا تھا۔ اور ریاضاتِ شاقہ کر رہا تھا اور اس کے آثار مجھ پر ظاہر ہوتے تھے اور کرامتوں کا ظہور ہوتا

تھا۔لیکن اب وہ سب ختم ہوگیا ہے اور اُن تمام احوال سے عریاں ہوگیا ہوں۔آج میرا حال ایک بھولے بسرے بیل کی طرح ہے۔اسی درمیان بہت اونچی گفتگو چل پڑی۔یہاں تک کہ میں نے مولانا جلال الدین دوانی کی رباعی پڑھی پھرتو جوگزرا گزرا

اے در قدم و حدوث عالم حیران پیوستہ میانِ این و آن سرگردان
بشنو از وے ہست قائم دو جہان پیش و بعد از وے نہ این است و نہ آن[1]

ایک بار میں نے اس رباعی کی شرح لکھ کر اپنے شیخ کے پاس دہلی بھیجی تھی پسند فرمائی۔(ایک بار)لاہور میں مجھ سے محمد صالح لاہوری نے معلوم کیا؟کیسی طبیعت ہے؟میں نے کہا"جیسی کہ چاہیے۔"اس کے بعد شیخ قاسم نے میرے سامنے کھانا پیش کیا۔کھیر تھی۔میں نے کہا۔مجھے تو بخار ہے میں نہیں کھا سکتا۔کہا۔کھا،کہ ٹھیک ہوجائے گا۔کھانے کے دوران ہی میں نے اپنے مرض میں کمی محسوس کی اور ٹھیک ہوگیا۔میں نے اس کرمت کو شیخ قاسم کی طرف منسوب کیا وہ چند قدم میری مشائیت میں آئے۔اس کے چند سال بعد میں نے اُن کو اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی میں دیکھا۔خوب اچھی ملاقاتیں رہیں۔

شیخ اللہ بخش سہارنپوری

وہ بھی اَن پڑھ ہیں۔شیخ قاسم سہارنپوری کے مرید ہیں۔وارستہ،آزاد،بامعنی فقیر ہیں۔ان کی صحبت میں بہت تاثیر ہے۔اس راہ کی بے خار باتیں کہتے ہیں اور اس سے بہتر سمجھتے بھی ہیں۔ان کے بہت سے بااحوال مرید ہیں۔مدّت گزری کہ وہ دہلی میں میرے شیخ کی صحبت میں رہتے ہیں۔شیخ ان کے طریقہ آزادی اور بے تعینی کو پسند کرتے ہیں۔حسب مراد دل زندگی گزارتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ شیخ قاسم ابتدا میں طریقۂ آزادی کو یا دوسرے طریقوں کو وہ کوئی بھی طریقہ کیوں نہ ہو ملائے رکھتے تھے۔جب اور جہاں چاہتے بے تعینی و بے قیدی کے طریقے کو اختیار کر لیتے۔جس بزرگ کی بھی خدمت میں پہنچتے ان کے ساتھ باادب تمام پیش آتے تھے اور بہت خوب

1 اے وہ جو شخص جو عالم کے حادث وقدیم کی بحث میں حیران ہے۔مستقل یہ اور وہ کے درمیان سرگرداں ہے۔سن اُسی اللہ واحد کی ہستی سے دو جہان قائم ہیں۔نہ کچھ اُس کے قبل ہے اور نہ کچھ اُس کے بعد ہے۔

صحبتیں اس طریقہ کی باتوں میں گزرتی تھیں۔ ایک دن وہ بے قیدی کی حالت میں ایک باغ میں داخل ہوئے اور جس جگہ بیٹھے اتفاق کی بات کہ اسی جگہ سوار و پیادہ ہندوؤں کا ایک بڑا مجمع ایک شادی کی تقریب میں وہاں پہنچا ہوا تھا وہ بھی وہیں فروکش ہو گئے۔ ہندوؤں کے سردار نے ان سے کہا کہ یہ جگہ تیرے لیے نہیں اٹھ کہیں اور جا کر بیٹھ۔ وہ دل برداشتہ وہاں سے اُٹھے اور نزدیک ہی کچھ دور جا کر بیٹھ گئے۔ اسی اثنا میں غیب سے آ کر ایک چنگاری ان کی آتش بازی میں آ گری اور آتش بازی میں آگ لگ گئی اور ہر طرف لپکنے لگی ان کے اکثر لوگوں کے کپڑے اور جسم جلا ڈالے اور سارے زخمی و درہم برہم ہو کر جا بجا جا پہنچے اور شادی کا معاملہ ملتوی ہو گیا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ ایک دن شیخ قاسم ایک مجمعے میں بیٹھے تھے ہندوؤں کے ایک بوڑے سادھو بھی وہاں بیٹھے تھے۔ اتفاقاً حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہ کی تعریفیں ہونے لگیں۔ ایک بزرگ نے کہا کہ ایک دن ایک شخص حضرت رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور بولا۔ یا رسول اللہ فلاں مسجد میں ایک مرد عورت بغرض فساد داخل ہوئے ہیں۔ آنحضرت نے حکم فرمایا کہ مسجد میں جا کر دیکھیں کہ کیا معاملہ ہے۔ حضرت امیر (حضرت علیؓ) اُٹھے اپنی لکڑی کی جوتیاں پہنیں ہتھیار باندھ مسجد کا قصد کیا۔ وہ مفسد کھڑاؤں کی آواز سے باہر نکل گئے۔ امیر نے کسی شخص کو مسجد میں نہ پایا، لوٹ کر کہا۔ یا رسول اللہ میں نے کسی کو بھی اس مسجد میں نہ پایا۔'' ایک دن پردہ پوشی کے بارے میں میرے شیخ حسب ذیل بیت بڑے ذوق کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔

من بآئینہ رو برو گفتم عیب پوشی بہ از نمد پوشی است[1]

اسی دوران اس بوڑھے سادھو نے اس کے منہ میں خاک ڈال دی اور حضرت علی رضی اللہ کو سب وشتم کرنا شروع کر دیا۔ شیخ قاسم یہ بات سن کر اس جگہ سے دل برداشتہ اُٹھے۔ انھیں قبض وغضب کی حالت طاری ہو کر بے چینی ہو گئی۔ احباب نے معلوم کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے سارا ماجرائے غم آلود دوبارہ کہا اور سراسیمگی کی حالت میں جنگل کی راہ لی اور نہایت غصے کی حالت میں ہاتھ میں لکڑی لے کر بڑے بت کو پیٹنا شروع کیا۔ اتفاق کی بات کہ عاشق محمد جو'' سہارنپور کے

---

1 میں نے آئینے کے روبرو کہا۔ عیب پوشی نمد پوشی سے بہتر ہے یعنی دوسروں کے عیبوں کا چھپانا نمد پہننے سے بہتر ہے۔

بڑے زاہدوں میں سے تھے اس سادھو کو جو کہ حاکم کے گھوڑے پر سوار تھا اور حاکم کے دربار میں جارہا تھا گھوڑے سے نیچے کھینچ کر خنجر آبدار سے ٹھنڈا کر کے کھینچتے ہوئے حاکم کے پاس لے گئے اور کہا کہ حضرت امیر (حضرت علیؓ) کو گالی دیتا سن کر میں نے اس کو مارا ہے۔ میں حاضر ہوں جو حکم شرع ہو کریں۔ حاکم نے انھیں قید کر دیا اور حقیقت حال بادشاہ صاحب قران ثانی شاہ جہاں کو لاہور لکھی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ (حضرت امیر اور دوسرے تمام اصحاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والا لائق قتل ہے، اچھا کیا۔ اس شخص کو قید سے نکالو (تب) ان کو قید سے آزاد کیا۔ یہ واقعہ 1050ھ (1640) میں گزرا ہے۔ اس وقت میں اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی تھا۔ اور ان بزرگ زادے کی قید کی خبر سنتا تھا میں دیکھتا تھا کہ میرے شیخ اس کی رہائی کے لیے (دعا مانگا کرتے اور) متوجہ الی اللہ ہوتے تھے یہاں تک کہ وہ قید سے نکالے گئے۔

حاجی میر دوست

جب شیخ فرید مرتضٰی خاں نے فرید آباد کو بسایا۔ مسجد، حوض، قلعہ، سرائے، بہت خوبصورت انداز میں بنوائے جیسا کہ عمارات سے ظاہر ہے۔ میرے والد میرے چچا شیخ محمود بادل کے ساتھ داروغۂ حوض تھے۔ اس مسجد کی تاریخ تعمیر یہ ہے

قطعہ

بعہد (خوب) نورالدین جہانگیر شہنشاہے بدین و داد و احسان

اساسے این بنائے خیر بنہاد فرید عصر و ملت مرتضٰی خان

بفر و شوکت وجود و شجاعت خلف ابن خلف تا شاہ مردان

رقم "خیرالبقاع" از خامہ سرزد پئے تاریخ این جاوید بنیان[1]

1014ھ

---

1 جب صاحب احسان شہنشاہ دیندار نورالدین جہانگیر کے زمانہ میں فرید عصر و ملت مرتضٰی خاں جو کہ شان و شوکت، کر و فر اور سخاوت و شجاعت میں خلف ابن خلف ہیں، نے اس خیر بنیاد جگہ کی بنیاد رکھی تو ہمیشہ قائم رہنے والی عمارت کی تاریخ قلم نے "خیر البقا" لکھی۔

شیخ فرید نے شیخ صالح کے عزیزوں میں سے علما، حفاظ، فضلا اور غربا کو اس جگہ جمعیت تام کے ساتھ بسایا چنانچہ ان میں سے بعض جنھیں میں نے دیکھا ہے ان کا ذکر اس کتاب اسراریہ میں کیا ہے۔ حاجی میر دوست بھی انہی میں سے ہیں۔ باکمال صاحب احوال و مقامات، روشن طلعت بزرگ تھے۔ جس کی نظر بھی ان کے جمال پر پڑتی بس ان کا معتقد ہو جاتا تھا۔ ان کی صحبت و کلام سے پُر ذوق ہو جاتا تھا۔ جہانگیر بادشاہ نے بہت چاہا کہ وہ ان کے ساتھ (دہلی) رہیں۔ کیونکہ ان کے کئی بھائی حکومت میں معزز عہدوں پر تھے۔ انھوں نے کہا اے بادشاہ میں گوشۂ نامرادی کو پسند کرتا ہوں کہ قناعت کے ساتھ بقیہ عمر خوش دلی سے وہاں گزاردوں اور آپ کے لیے دعا کرتا رہوں۔ منصف مزاج بادشاہ خوش ہو گئے۔ عظمت و حرمت کے ساتھ رخصت کیا۔ انھوں نے پائے ہمت کو دامانِ قناعت میں سمیٹ لیا اور روکھی سوکھی پر استقامت سے گزاردی۔ وہ فرماتے تھے کہ خشک و تر پر گزر کرنا خود کو راہ خدا میں ڈال دینا اپنے گھر کے گوشے میں پڑے رہنا اور کسی طرف نگاہ نہ کرنا، دونوں جہاں کی نعمتوں سے بہتر ہے

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش دردِ سراست
ہر کہ قانع شد بخشک و تر شہ بحر و براست [1]

یہ امیر خسرو دہلوی کے قصیدے ''بحرالابرار'' کا مطلع ہے۔ دیگر شعراء کے بھی اسی معنیٰ میں چند مطلعے ہیں

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش دردِ سراست
می کند آگاہ کہ ہاں نوبت از آن دیگراست [2]

کلبے خشکے کہ بر دندان بگورستان در است
خندہ دارد بر کسے کو را غرورے در سراست

دولت دنیاے دونان را ازان فخر و فراست
اولش دو آخرش لت حاصلش دردِ سراست

آتشین لعلے کہ تاج خسروان را زیور است
اخگرے بہر خیال خام پختن در سراست [3]

1 شاہی نقارہ خالی ہے اور اس کا شور دردِ سر کے علاوہ کچھ نہیں۔ جو اپنی خشک و تر روٹی پر قانع ہو گیا وہ خشکی اور تری دونوں کا بادشاہ ہے۔

2 معلوم بھی ہے کہ نقارہ شاہی کیوں شور و فغاں میں ہے۔ آگاہ کر رہا ہے کہ ہوشیار اب دوسروں کی باری ہے۔

3 (قبرستان کی سوکھی کھوپڑی جو دانت دکھا رہی ہے۔ یہ اس شخص پر ہنس رہی ہے جس کے سر میں غرور بھرا ہوا ہے۔ حقیر دولت دنیا کو کیا اسی پر فخر و ناز ہے کہ اس کا اوّل دوو (جانور اور اس کا آخر لت لات) ہے حاصل سر دردی ہے۔ آتشیں (سرخ رنگ) لعل جو کہ بادشاہوں کے تاج کا زیور ہے۔ سر میں خیالِ خام پکانے کے لیے ایک انگارہ ہے۔

میں نے ان کو 1032ھ یا 1033ھ میں دو تین مرتبہ فرید آباد میں دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں فرمایا کرتے ''اگر کسی کو زندگی کی لذت اور اس جہان کی عشرت کی آرزو ہے اس سے کہہ دو کہ اپنے گھر کے کونے سے کم وبیش کے لیے باہر نہ نکلے اور جَو کی روٹی چھوڑ کر گیہوں کی روٹی کے لیے نہ دوڑے۔ اس بات کی موافقت میں بزرگوں کی حکایتیں سناتے۔ اور اس قسم کے شعر پڑھا کرتے

دو نانِ خشک گر از گندم است یا از جو ۔۔۔ سہ تاے جامہ اگر کہنہ است یا از نو

چہار گوشۂ دیوار خود بخاطر جمع ۔۔۔ کہ کس نگوید ازین جا بخیز و آن جا رو

ہزار بار نکوتر بہ نزد دانا یان ۔۔۔ زِ فرِّ مملکت کیقباد و کے خسرو

اگر دوگا و بدست آوری و مزرعۂ ۔۔۔ یکے امیر و دگر را و زیر نام کنی

ہزار بار ازاں بہتر است کز پئے رزق ۔۔۔ کمر بہ بندی و بر مرد کے سلام کنی [1]

اسی کے مناسب حال حضرت شیخ سعدی کی گلستاں سے ایک حکایت مجھے یاد آئی وہ یہ ہے کہ دو بھائی تھے ایک بادشاہ کی خدمت میں تھا دوسرا اپنے قوت بازو سے روٹی کھاتا تھا۔ مالدار بھائی نے درویش سے کہا بادشاہ کی نوکری کیوں نہیں کر لیتا تاکہ کام کرنے کی مشقت سے چھوٹ جائے۔ بولا۔ تو محنت کر کے کیوں نہیں کھاتا تاکہ ذلت سے نجات پا جائے۔ حکما نے کہا ہے کہ جَو کی روٹی کھانا اور زمین پر بیٹھنا کمر میں سونے کی تلوار لٹکا کر خدمت مخلوق میں کھڑا ہونے سے بہتر ہے۔

بیت

بدست آہک تفتہ کردن خمیر ۔۔۔ بہ از دست بر سینہ پیش امیر [2]

عمر گرانمایہ درین صرف شد ۔۔۔ تا چہ خورم صیف چہ پوشم شتا [3]

---

1 کھانے کو دو سوکھی روٹیاں گیہوں کی ہوں یا جَو کی، پہننے کو موٹا لباس پرانا ہو یا نیا۔ رہنے کو چار گوشہ دیواریں ہوں تاکہ دل جمعی حاصل ہو کر کوئی یہ نہ کہے کہ یہاں سے اُٹھ اور وہاں بیٹھ۔ یہ بات عقلمندوں کے نزدیک کروفر ''کیقباد'' و ''کے خسرو'' سے ہزار درجہ اچھی ہے۔ اگر تیرے پاس دو بیل ہوں اور ایک کھیت ہو تو ایک کا امیر اور دوسرے کا وزیر نام رکھ دے یہ بات اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ روزانہ کمر میں پٹکا باندھے اور خدمت امرا میں، ان کے سامنے سلام کرنے کے لیے حاضر ہو۔

2 ہاتھ سے گرم چونے کا گارا بنانا امیر شخص کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھنے سے اچھا ہے۔

3 یہ قیمتی عمر اسی میں خرچ ہو گئی کہ گرمیوں میں کیا کھاؤں جاڑوں میں کیا پہنوں۔

اے شکم خیرہ بنانے بساز تا نکنی پشت بخدمت دو تا [1]

یہ قطعہ بھی "گلستان" کا ہے

ہان تاسپر نیفگنی از حملہ فصیح کو را بجز معاملت مستعار نیست

دین ورز و معرفت کہ سخندان سجع گو بر در سلاح دارد و کس در حصار نیست [2]

میر عوض سنبھلی فرید آبادی

وہ بھی حاجی میر دوست کی طرح فرید آباد میں رہتے تھے۔ معاملہ باطنی میں بھی اچھے اور استقامت، علی الشریعت میں بھی خوشتر تھے۔ بااخلاق و بامروت تھے۔ مشائخ کی ذوقیات کی کتابیں بہت شوق کے ساتھ پڑھتے تھے اور اس قوم کے اقوال کو اس خوبی کے ساتھ ادا فرماتے کہ سننے والوں کا دل لے جاتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے کہ "میرے نزدیک تلاوت کلام مجید اور احادیث نبوی کے بعد مشائخ کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی باتیں سننا اور اوراد و وظائف اور نوافل میں اشتغال سے بہتر ہے۔" "رسالۂ قدسیہ" سے نقل ہے کہ خواجہ یوسف ہمدانی قدس سرہٗ سے دریافت کیا گیا "جب اولیاء اللہ خود کو چھپالیں تو ہم کیا کریں جس سے کہ ان کے انفاس قدسیہ کی برکات سے مستفیض ہو کر سلامت رہیں (جیسے کہ ان کی زندگی میں رہتے تھے) فرمایا: ہر دن ان کے ملفوظات ایک سی پارے کی مقدار پڑھیں۔ ایک اور صدیق فرماتے ہیں کوئی ہو جو اس (اللہ تعالٰی) کا ذکر کرے اور میں سنوں یا میں کہوں اور وہ سنے۔ اگر جنت میں اسی کا ذکر نہ ہو تو مجھے جنت سے کیا لینا ہے۔ ان کے انفاس طیبات سے جذبات اور مواجید کو اخذ کرنا چاہیے" **و من احسن قولا ممن دعا الی اللہ و عمل صالحاً** "(اس سے زیادہ کس کی بات اچھی جو خود بھی عمل

---

1 اے پیٹ کی بھوک سے پریشان ایک روٹی پر قناعت کر لے تاکہ دوسروں کی خدمت میں کمر دوہری نہ کرنی پڑے۔

2 دیکھ معنی سے کورے فصیح کے حملے سے ڈھال نہ پھینک دینا۔ کہ اس کے پاس بجز دوسروں کے مستعار جملوں کے کچھ نہیں ہے۔ دین و معرفت کو اپنا لے کہ سجع کلام کرنے والے نے ہتھیار تو جمع کر رکھے ہیں لیکن باڑے میں کوئی نہیں جو انھیں چلائے۔

کرے اور دوسروں کو بھی اللہ کی طرف بلائے)انتہیٰ۔

میں نے فریدآباد میں شیخ عوض سے بارہا ملاقات کی ہے، ان کا دیدار کیا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ شعر کہتے اور مجھے سنایا کرتے تھے۔ لمبی عمر پائی۔ ہوت نہ ہوت میں اپنے زاویہ گمنامی میں خوب بسر کرتے رہے۔ زندگی کی قدر و قیمت جیسی کہ چاہیے وہ سمجھ گئے تھے۔ اس سلسلے میں شیخ بہاء الدین آملی نے رسالہ ''نان وحلوا'' میں بہت اچھا کہا ہے۔ مثنوی

از ہوس بگذر رہا کن کش و فش ‏ ‏ پا زدامان قناعت بر مکش

گر نباشد جامۂ اطلس ترا ‏ ‏ دلق کہنہ ساتر تن بس ترا

ور مزعفر نبودت یا قند مشک ‏ ‏ خوش بود دوغ و پیاز و نانِ خشک

ور نباشد مشربہ از زرِ ناب ‏ ‏ باکف خود می توانی خورد آب

ور نباشد مرکب زرّین لگام ‏ ‏ می توانی زد بپاے خویش گام

ور نباشد دو رباش و پیش و پس ‏ ‏ دور باش نفرتِ خلق از تو بس

ورنہ باشد مرکب خانہا ‏ ‏ ی توان بردن بسر در کنج غار

ورنہ باشد فرش ابریشم طراز ‏ ‏ با حصیر کہنہ و مسجد بساز

ورنہ باشد شانۂ از بہر ریش ‏ ‏ شانہ بتوان کرد با انگشتِ خویش

ہر چہ بینی در جہان دارد عوض ‏ ‏ و ز عوض گردد ترا حاصل غرض

بے عوض دانی چہ باشد در جہان ‏ ‏ عمر باشد عمر، قدر آن بدان[1]

---

1 ہوس اور اس کی اُس کی فکر چھوڑ۔ دامان قناعت سے پیر باہر نہ نکال۔ اگر تیرے پاس اطلس کا لباس نہ ہو تو پرانی گدڑی ہی تن ڈھکنے کو کافی ہے۔ اگر تجھے مزعفر یا قند مشک کھانے کو نہیں ملتا تو تیرے واسطے سوکھی روٹی، پیاز اور چھاچھ ہی اچھی ہے۔ اگر تیرے پاس چمکتے سونے کا پیالہ نہیں ہے نہ سہی، ہاتھ سے پانی پی سکتا ہے۔ اگر زریں لجام سواری کا گھوڑا نہ ہو اپنے پیروں سے کام چلا سکتا ہے۔ اگر تیری ماتحتوں پر پیش رو، دور باش آگے پیچھے نہیں ہے کوئی بات نہیں تجھ کو مخلوق خدا سے حقارت نہ ہو یہ ضروری ہے۔ اگر تیرے کے لیے کوئی منقش زرنگار گھر نہیں ہے تو کنج غار میں بھی بسر کی جا سکتی ہے۔ اگر تیرے پاس ریشمی بستر نہیں تو مسجد کی پرانی چٹائی سے کام چلالے اور اگر داڑھی کا کنگھا نہیں تو ہاتھ کی انگلیاں کنگھے کا کام دے سکتی ہیں۔ دنیا میں جو تو دیکھتا ہے ہر ایک کا بدل مل سکتا ہے۔ دنیا میں جو بے بدل چیز ہے کچھ تجھے معلوم ہے کیا ہے عمر ہے۔ عمر ہے۔ عمر کی قدر جان۔

میر عوض کا انتقال 1050ھ (1640) میں ہوا۔ قبر اسی جگہ ہے۔ (فرید آباد میں)

شیخ دوست لونی

آپ صاحب وجد و ذوق اور دنیا کی سیر کیے ہوئے یعنی سرد و گرم زمانہ چکھے ہوئے بزرگ تھے۔ محنت عشق و محبت کا بار اٹھائے ہوئے تھے اسی لیے جب درد و محبت کی گفتگو کرتے دل کی گہرائی، سچائی سے کرتے تھے جو دل پر اثر انداز ہوتی تھی۔ ہاں محبت کی بات تو وہی ہوتی ہے جو مؤثر ہو۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سخن محبت (دنیا کو اپنی گرفت میں لینے والی ہے) دل لے لیتی ہے محبت میں کوئی خلل بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ خواجہ شیراز نے کہا ہے

خلل پذیر بود ہر بنا کہ بے بنیادست مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است [1]

میں بچپن میں لونی سے ایک فرسخ کی دوری پر بغرض تعلیم ایک جگہ رہتا تھا۔ ایک دن شیخ دوست میرے مدرسے پہنچے اور دروازے پر دستک دی۔ میرے استاد نے معلوم کیا۔ کون صاحب ہیں؟ کہا دوست۔ کہا۔ اگر دوست ہے تو اندر کیوں نہیں آتا؟ کہا۔ ایک دوسرا دوست میرے ساتھ ہے۔ کہا۔ جو کوئی بھی دوست ہے اس سے کہو اندر آئے۔ پس دونوں دوست اندر آ گئے۔ میرے استاد نے فرمایا۔ دوست کا دوست کے ساتھ خیر مقدم ہے۔ پھر مل بیٹھ کر دوستی و محبت کی حکایتیں بیان ہونے لگیں۔ اسی اثنا میں دوست محمد نے کہا۔ ایک زمانے میں میری ایک صاحب درد با معنی دوست سے دوستی تھی۔ اتفاق کی بات ہم میں جدائی ہوگئی۔ وہ میری جستجو میں کو بہ کو شہر بہ شہر پھرتا۔ ناگاہ اسی شہر میں جس میں، میں تھا مگر اسے پتا نہ تھا مست دیوانے کی مانند تشنہ لب گھر کے دروازے میں داخل ہوا مجھے پہچانا اور فریاد کرتے ہوئے گویا ہوا۔ اے دوست یہ مشہور شعر میرے حال کے موافق ہے

دوست در خانہ و من گرد جہان می گردم آب در کوزہ و من تشنہ دہان می گردم [2]

---

1 جو بھی بنیاد ہے وہ خلل پذیر ہے (ختم ہونے والی ہے) مگر محبت کی بنیاد خلل (نقصان) سے محفوظ ہے۔
نوٹ: دیوان حافظ مطبوعہ سب رنگ کتاب گھر دہلی میں ص 74 پر مصرعۂ اول اس طرح درج ہے ”خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی۔

2 دوست گھر میں ہے میں دنیا میں چکر کاٹ رہا ہوں۔ کوزے میں پانی ہے میں تشنہ لب پھر رہا ہوں۔

اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آئی جو کہ خواجہ محمد پارسا قدس سرہٗ کے جمع کردہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ کے ملفوظات میں سے ہے۔ اپنے اوائل حال کی حکایات بیان فرماتے ہوئے فرمایا۔ ایک بار چھ ماہ تک یہ دروازہ مجھ پر بند ہوگیا تھا کہ عالم باطن سے کوئی فیض مجھے نہ پہنچا۔ بے بس و بے آرام ہوگیا تو یہ ارادہ کیا کہ دوبارہ مخلوق کی صحبت میں مشغول ہو جاؤں اسی حال میں میرا گزر ایک مسجد کے سامنے سے ہوا۔ اس مسجد میں لکھا ہوا دیکھا کہ

اے دوست بیا کہ ما ترائیم بیگانہ مشو کہ آشنائیم[1]

میرا قبض، بسط میں مبدل ہوگیا۔ بے پناہ عنایت حاصل ہوئی اور میں بہت خوش ہوا کہ یہ دروازہ مجھ پر پھر سے کھل گیا۔ اس حال کے ذوق سے میں بہت رویا۔

میر صالح لونی

آپ ایک صالح عابد و زاہد سید تھے۔ راہ شریعت پر مستقیم الحال۔ سنت کے بالمقابل کسی (کار) بدعت میں مساہلت اور مداہنت سے کام نہ لیتے۔ لمبی عمر پائی۔ باوجود پیری، نحافت اور ضعف بصارت، نماز نوافل اور تلاوت قرآن مجید کبھی بھی ترک نہ کرتے تھے۔ روز و شب انھیں دونوں کاموں میں (علاوہ فرائض کے) مشغول رہتے تھے۔ ایک بار وہ اور میں اپنے شیخ کی خانقاہ میں ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ میں ان کے حفظ اوقات اور ضبط معاملت سے حیران ہوتا تھا، کیونکہ یہ حالت استقامت اس زمانے میں زاہدوں عابدوں، اہل ریاضات و مجاہدات میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک دن وہ نہایت ضعف و ناتوانی کے عالم میں اسی خانقاہ میں ایک پتھر کے فرش پر پڑے تھے۔ اُن کا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا، خون نکل آیا تھا اور درد کی شدت نے انھیں مضمحل کر دیا تھا تب بھی انھوں نے اپنے معمولات شب و روز نہ چھوڑے۔ اُن کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی۔ سماع کو پسند نہ کرتے تھے اور (عام) اہل سماع کے معتقد نہ تھے۔ فرمایا کرتے "جب تک اس (سماع) کا اہل نہ ہو یہ کام اس پر حرام ہے۔" اس مسئلے پر سراج الدین لونی کا ذکر گزر چکا اور ان (حضرات) کے درمیان بڑی خوشگوار گفتگو رہی ہے۔ کیونکہ وہ اہل سماع تھے اور یہ ان کے برعکس۔

---

1 اے دوست آجا کہ ہم ترے ہیں۔ بیگانہ مت بن کہ ہم تیرے شناسا ہیں۔

''فوائدالفواد'' میں ہے کہ'' سماع کے بارے میں گفتگو تھی۔حاضرین میں سے ایک صاحب بولے شاید اس وقت یہ حکم ہوا ہے کہ خدمت مخدوم کسی بھی وقت سماع سنیں ان کے لیے حلال ہے۔خواجہ ذکراللہ بالخیر نے فرمایا۔جو چیز حرام ہے کسی کے کہنے سے حلال نہیں ہوتی اور جو چیز حلال ہے کسی کے حکم سے حرام نہیں ہوتی۔اب ہم مسائل مختلف فیہ کو لیتے ہیں مثلاً یہی حکم سماع ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے علما کے برخلاف دف چغانہ اور مزامیر کے ساتھ سماع کو مباح رکھتے ہیں۔اب اس اختلاف میں حاکم وقت جس بات کا بھی حکم کرے وہی حکم ہوگا۔حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ انھیں دنوں آستانے کے منتظمین میں سے بعض درویشوں نے اس مجمع میں جس میں (دوران سماع) چنگ و رباب بج رہے تھے رقص کیا ہے۔خواجہ ذکراللہ بالخیر نے فرمایا کہ انھوں نے اچھا نہیں کیا۔جو چیز نامشروع ہے، ناپسندیدہ ہے۔اس پر یہ حکایت بیان کرنے والے شخص نے عرض کیا کہ ان حضرات سے جب وہ باہر نکلے تو ان سے کہا گیا کہ تم نے یہ کیا کیا جس (محفل) میں مزامیر تھے اس مجمع میں تم نے کیوں سماع سنا اور رقص کیا؟ انھوں نے جواباً کہا کہ ہم سماع میں ایسے غرق تھے کہ ہمیں پتا ہی نہ چلا کہ یہاں مزامیر ہیں یا نہیں۔خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے جب یہ بات سنی تو فرمایا۔یہ جواب بھی کوئی چیز نہیں۔یہ بات تو تمام معصیتوں میں کہی جاسکتی ہے۔ اسی دوران بندے نے عرض کیا کہ صاحب ''مرصاد'' نے اسی معنی میں ایک رباعی لکھی ہے (اور اس کا) یہ شعر عرض کیا

گفتی کہ نزدِ من حرامست سماع   گر بر تو حرام است حرامت بادا[1]

خواجہ ذکراللہ بالخیر نے فرمایا ''ہاں'' اور یہ (پوری) رباعی زبان مبارک سے فرمائی:

دنیا طلبا جہان بکامت بادا   وین جیفۂ مردار مُدامت بادا

گفتی کہ نزدِ من حرامست سماع   گر بر تو حرامست حرامت بادا[2]

پھر بندے نے عرض کیا کہ اگر علما اس بارے میں بحث کریں اور سماع کی نفی کی بات کریں بھی تو

---

1 تو کہتا ہے کہ میرے نزدیک سماع حرام ہے۔ٹھیک ہے اگر تجھ پر حرام ہے تو حرام ہی رہے۔

2 اے طالب دنیا دنیا تجھے نصیب ہو۔یہ مردار سڑا ہوا جانور ہمیشہ تجھے حاصل رہے۔تو کہتا ہے کہ تیرے نزدیک سماع حرام ہے تو پھر اگر تجھ پر حرام ہے تو حرام ہو۔

اچھا لگتا ہے۔ مگر جو شخص لباس فقر میں ہو وہ کس طرح نفی کرتا ہے۔ اگر اس کے نزدیک بھی حرام ہے تو اتنا کرے کہ خود نہ سنے لیکن دوسروں سے جھگڑے نہیں کہ تم بھی مت سنو۔ جھگڑا اور دشمنی درویشوں کی صفت نہیں ہے۔ خواجہ ذکر اللہ بالخیر مسکرائے اور اسی سلسلے میں ایک حکایت بیان فرمائی۔ ایک بار ایک طالب علم امامت کر رہا تھا جماعت میں سارے اہل علم حضرات تھے ایک عام شخص بھی تھا چار رکعت والی نماز تھی۔ اس متعلم سے قعدہ اولی چھوٹ گیا۔ دوسری رکعت کے بعد بغیر قعدے میں بیٹھے تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا چونکہ وہ عالم تھا جب احساس ہوا تو سوچ لیا کہ اس نماز کو کیسے تمام کرنا ہے۔ جو علما اس وقت اس کے مقتدی تھے وہ بھی چپ رہے مگر ایک عامی نے شور مچانا شروع کیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ اتنی بار کہا کہ خود اپنی نماز ہی باطل کر لی۔ جب امام نے نماز کا سلام پھیرا اس عامی کی طرف منہ کر کے کہا۔ اے خواجہ تجھے کیا ہو گیا تھا اتنے علما حاضر تھے ان کو علم تھا کہ یہ نماز کیسے درست ہوگی جب انھوں نے کچھ نہیں کہا تو پھر تو کون ہوتا ہے کہ اتنا شور مچائے کہ اپنی نماز ہی باطل کر لے۔ میں نے پھر عرض کیا کہ بندہ ان منکرین سماع کو خوب جانتا ہے اور ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ غرض یہ کہ جب یہ ذوق سماع ہی نہیں رکھتے تو ایسا کہتے ہیں کہ سماع حرام ہے اس لیے ہم نہیں سنتے۔ بندہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ اگر سماع حلال بھی ہوتا تب بھی یہ نہ سنتے۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر[1] اس بات پر ہنس پڑے اور فرمایا کہ ہاں جب ان میں ذوق ہی نہیں کیسے سنتے اور کیا سنتے۔ (انتہی)

''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ کسی نے ابوبکر رازی سے دریافت کیا کہ آپ سماع کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ نے فرمایا نہایت فتنہ آمیز اور طرب انگیز چیز ہے۔ اپنے آپ کو فتنے سے بچا۔ اس شخص نے سوال کیا۔ کیا مشائخ نے یہ کام نہیں کیا ہے؟ کہا۔ ٹھیک ہے کیا ہے لیکن جب تیرا حال بھی ان جیسا ہو جائے تو بھی ایسا کر لینا۔ اسی کتاب میں ہے ابو سہیل صعلوکی سے سماع کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا۔ ''یستحبّ لاھلِ الحقایقِ و یباحُ لاھل العلم و یکرہ لاھل الفجور[2]'' اسی کتاب میں ہے کہ ابن سمعون سے لوگوں نے کہا کہ آپ

---

1 خواجہ ذکر اللہ بالخیر سے حضرت نظام الدین اولیاء مراد ہیں۔

2 اہل حقائق کے لیے مستحب ہے اہل علم کے لیے مباح اور بدکرداروں کے لیے مکروہ ہے۔

لوگوں کوتو زہداور ترک دنیا کے لیے کہتے ہیں اور خود بہترین لباس استعمال کرتے ہیں اور لذیذ ترین کھانے کھاتے ہیں یہ کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا جس وقت تیرا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہو جائے جیسا کہ چاہیے اس وقت نرم کپڑے اور لذت بخش کھانے زیاں نہیں کرتے۔ اسی کتاب میں ہے کہ ایک بوڑھیا اپنے بیٹے کو شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے پاس لائی اور عرض کیا۔ میں اپنے بیٹے کے دل کا آپ سے بہت ربط دیکھتی ہوں میں اس سے اپنے حق سے بری الذمہ ہوتی ہوں اور آپ کی صحبت میں اللہ تعالیٰ کے لیے چھوڑتی ہوں۔ شیخ نے اس کو قبول کر لیا اور مجاہدے اور ریاضت کا حکم دیا۔ چند دن کے بعد بوڑھی اپنے بیٹے کو دیکھنے آئی دیکھا کہ بیٹا جو کی روٹی کھا رہا ہے۔ کم کھانے اور جاگنے سے لاغر اور پیلا ہو گیا ہے۔ وہاں سے شیخ کے پاس پہنچی ان کے آگے مرغ کی ہڈیوں سے بھرا ایک طباق رکھا دیکھا۔ بوڑھی نے شیخ سے کہا۔ اے سیدی آپ مرغ کا گوشت کھا رہے ہیں اور میرا بیٹا جو کی روٹی۔ شیخ نے اپنا ہاتھ ان مرغ کی ہڈیوں پر رکھا اور کہا۔ "قم باذن اللہ الذی یحیی العظام وھی رمیم [1] " وہ مرغ زندہ ہو گیا اور بانگ دینی شروع کر دی۔ اس کے بعد شیخ نے بڑھیا سے کہا۔ جس وقت تیرا فرزند ایسا ہو جائے، تو کہہ دے کہ جو چاہے کھا۔

شیخ جان محمد میرٹھی

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے صحبت یافتہ ہیں۔ صاحب معنی اہل ذوق و محبت تھے۔ نیک معاملت تھے۔ ہمیشہ تلاوت کلام مجید کرتے۔ جس وقت ان کو ایک قوال کے بیٹے سے ربط و ضبط باطنی اور محبت مفرط دامن گیر ہوئی اور کارخانہ جنوں نے رونق پائی تو ان کا بازار پارسائی مندا پڑ گیا

پنجہ زد عشق لباس پارسای پارہ شد   طاعت صد سالہ ام تاراج یک نظارہ شد [2]

آخر کار وہ اپنے معشوق کے ساتھ دہلی سے فرید آباد پہنچے اور جامع مسجد میں سکونت پذیر ہوئے۔ میں نے ان کو وہاں دیکھا تھا۔ ان کی عاشقی اور اس جوان کی معشوقی کی اداؤں سے انبساط حاصل کرتا تھا۔

---

1 اس اللہ کے حکم سے جو ہڈیوں کو بوسیدہ ہونے کی حالت میں (دوبارہ) زندہ کرے گا کھڑا ہو جا۔

2 جیسے ہی عشق نے قبضہ جمایا لباس پارسائی پارہ پارہ ہو گیا۔ میری سو سالہ طاعت ایک نظارے میں تاراج ہو گئی۔

وہ جوان حسن و جمال میں بھی کامل تھا اور گلا اور آواز بھی اس کی بڑی دلربا اور روح افزا تھی۔ جس طرح عاشق عارف حسن صورت سے لذت یاب ہوتا ہے حسن صوت سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔ دونوں یکساں ہیں جیسے کہ کہا ہے

سرود چیست کہ چندین فنون عشق دروست　　سرود محرم عشقست عشق محرم اوست [1]

ایک دن جان محمد زینے کی چھت پر مسجد میں تنہا بیٹھے تلاوت کر رہے تھے کہ ایک معزز امیر جو کہ لڑائی پر جا رہے تھے آرام کرنے کی غرض سے اس چھت پر پہنچے۔ انھوں نے امیر کا کچھ خیال نہ کیا اور تلاوت میں مشغول رہے۔ امیر لشکر کو غصہ آ گیا انھیں پیٹا اور بے حرمتی کی۔ شیخ مصطفیٰ اور میں نے چاہا کہ خدا واسطے اس امیر سے لڑ پڑیں۔ اگر زندہ بچے تو بھی ٹھیک اور مارے گئے تو بھی خوب۔ (مگر) اسی دوران وہ امیر ناگواری کے ساتھ نیچے آیا اور حوض کے کنارے جا کر بیٹھ گیا۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ اس امیر کا معاملہ اور کاروبار خراب اور درہم برہم ہو گیا۔ میرے شیخ کا ملفوظ ہے ایک روز لوگوں نے حضرت خواجہ بیرنگ کو خبر دی کہ فلاں غریب کا گھر جو کہ قلعے میں ہے ایک لشکری کو دے رہے ہیں اور اس کام کے لیے حاکم کا ایک معتمد اس شہر میں آیا ہے اور مکان خالی کرنے کے لیے اصرار اور ضد کر رہا ہے اور اس نامراد بیچارے کو گھر سے نکال رہا ہے۔ یہ بات سنتے ہی آپ اُٹھے اور چل دیے تاکہ اس بے چارے کی سفارش کریں۔ اس معتمد نے آپ کو نظر انداز کر دیا اور بغیر ملے چلا گیا۔ آپ رنجیدہ کھڑے رہ گئے کیونکہ اس کا یہ طریقہ آپ کو پسند نہ آیا تھا۔ اسی اثنا میں آپ کی زبان مبارک سے ایک ایسا جملہ نکلا جو اس کی خرابی پر دلالت کرتا تھا۔ اسی دوران اس کے بعض قبیح اعمال کی اطلاع لوگوں نے بادشاہ کو کر دی۔ بادشاہ نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کو اس کے سب چھوٹے بڑوں کے ساتھ قتل کر دیں۔ اور اس کے تمام مال و اسباب اور گھر کو خانقاہ کے لیے ضبط کر لیں۔ خواجہ حسین ہروی نے جو کہ نیک انسان گزرے ہیں مجھ سے یہ حکایت بیان کی کہ ماوراء النہر کی ولایت میں یہ مشہور ہے کہ ایک بار مولانا جامی غسل کرنے کے لیے ایک حمام میں داخل ہوئے اور سامان و لباس اتارا اتفاق کہ ریاضی شاعر شہزادہ الغ بیگ کا مصاحب، حمام کے

1　نغمہ سرائی بھی کیا خوب چیز ہے کہ اس میں بہت سے فنون عشق پائے جاتے ہیں۔ نغمہ سرائی محرم عشق ہے اور عشق محرم سرود ہے۔

اندر تھا۔ اس نے آپ کو نہ پہچانا اور قلعی دار طاس کو الٹا کر کے ہاتھ میں لے کر مولانا سے بولا ''آپ کا سر اس طاس کے بہت مشابہ ہے کیونکہ آپ کے سر پر بال نہ تھے۔'' آپ کو برا لگا اور فرمایا ''ہاں اے نوجوان تو فضیلت علم تو رکھتا ہے مگر تو ہے بے ادب۔ بے ادب ہرگز کمال کو نہیں پہنچے ہیں، غسل کیے بغیر ہی واپس آ گئے اور اپنے گھر چلے گئے۔ اس بات کو سن کر اس کا حال غیر ہو گیا۔ دیوانوں کی طرح اس جگہ سے نکل کر اپنے مکان پہنچا اور گر پڑا۔ اسی اثنا میں الغ بیگ دو پہاڑیوں کے بیچ ندی پر بنے پل کی سیر کے لیے روانہ ہوا اور ریاضی کو طلب کیا پھر دونوں اُس پل کے اوپر جا کر بیٹھے اور شراب پینے میں مشغول ہو گئے۔ ناگاہ شہزادے کی زبان سے نکلا کوئی ہے جو اس جگہ سے پانی میں کود جائے وہ پانی اس جگہ سے بہت ہی نیچے تھا اور تیزی اور طغیانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ ریاضی نے کہا ''میں کودتا ہوں، شہزادہ بولا نہ، میں تجھے نہیں کہہ رہا۔ اسی میں ریاضی نے یہ غزل پڑھنی شروع کی۔

غزل

آن پری رخسار آمد، جاے در دل کرد و رفت — مرغ جانم را بتیغ غمزہ بسمل کرد و رفت

اہل دل را آن پری در یک نظر دیوانہ ساخت — عقل را حیران آن شکل و شمایل کرد و رفت

رفت آن عیسیٰ دم و انداخت در جان کندنم — زیستن را بر من بیچارہ مشکل کرد و رفت

از فروغ ماہ رخسار جہان افروز خود — نور قدسی را چراغ خانۂ دل کرد و رفت

رفت از عالم ریاضی برد داغ مہر او — شکر للہ کز جہان مقصود حاصل کرد رفت [1]

جیسے ہی اس نے غزل تمام کی ایک جست لگائی اور پانی میں جا گرا۔ شاہزادہ فریاد کرتا ہوا ندی کے کنارے آ گیا اور لوگوں سے کہا ''اسے پکڑو'' جب باہر نکال کر لائے تو اس میں زندگی کی ذرا بھی

---

1 وہ پری رخسار آیا، میرے دل میں جگہ بنائی اور چلتا بنا۔ غمزے کی تیغ سے میرے مرغ جاں کو ذبح کیا اور چل دیا۔ وہ پری رُخ، دل والوں کو ایک نظر میں دیوانہ کر کے اور ان کی عقلوں کو اپنی شکل و شمائل کا حیران بنا کر چلا گیا۔ وہ عیسیٰ دم چلا گیا اور مجھے حالت جان کندنی میں ڈال گیا۔ ہائے زندگی کو مجھ بے چارے پر مشکل کر گیا۔ اپنے جہاں افروز رخسار کے چاند کی چمک سے نور قدسی کو خانۂ دل کا چراغ بنا کر رخصت ہوا۔ ریاضی اس دنیا سے اس کی محبت کا داغ لیے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے دنیا سے اپنا مقصود حاصل کر لیا تب اُٹھا۔

رمق باقی نہ تھی۔ شہزادہ اس کا سر اپنے زانوں پر رکھے روتا رہا۔ شہزادے نے اس کے اشعار کے مجموعے کو اس کے حال کی مطابقت کی غرض سے کھول کر دیکھا۔ اتفاقاً یہ غزل نکل کر آئی

قامتش گر کند ہلاک مرا زیر سروے کنید خاک مرا [1]

جس جگہ شہزادہ بیٹھا ہوا تھا وہ سرو کا باغیچہ تھا۔ اس کو اسی جگہ سپرد خاک کر دیا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے دفن کے بعد شہزادے نے آخری غزل کا یہ آخری مصرعہ پڑھا

شکر للہ کز جہان مقصود حاصل کردورفت

واللہ اعلم۔ خواجہ حسین نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے وہ ندی، پل، باغیچہ اور ریاضی کی قبر سب چیزیں دیکھی ہیں۔

صوفی گدا

وہ دوستان خدا میں سے تھے۔ ظاہراً اگر چہ ان کا نام گدا تھا مگر باطناً وہ بادشاہ تھے۔ یہ مصرعہ ان کا شاہد حال ہے۔

''گدا بادشاہ است و نامش گدا است [2] ''

ان کی نیت خالص تھی اور طریقہ بے ریائی تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو ''لا الـہ الا اللہ '' کو ستر ہزار مرتبہ پڑھ کر کسی مردے کی روح کو بخشے اس مردے کے لیے مغفرت ہے۔ وہ چند ختم پڑھ کر اپنے پاس (بطور ذخیرہ) روکے رکھتے تھے۔ جب سنتے کہ فلاں دنیا سے چلا گیا، آشنا ہوتا یا نا آشنا، اخلاص کے ساتھ دونوں ہاتھ اُٹھاتے اور ایک ختم اس کی روح کو پیش کر دیتے اور دعا کرتے۔ مسجد فیروزی میں رہتے تھے۔ ان کا کوئی بھی شب و روز کا وظیفہ یا کوئی عمل کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ کیونکہ مطلوب اخلاص نیت ہے اور کچھ نہیں (وہ انھیں حاصل تھا ہی) مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''ان اللہ لا ینظر الیٰ صور کم ولا الی اعمالکم ولکن

---

1 اگر اس کے قد کا حسن مجھے ہلاک کر دے۔ تو مجھے سرو کے درخت کے نیچے دفن کرنا۔

2 گدا حقیقت میں بادشاہ ہے بس اس کا نام ہی گدا ہے۔

يـنظر الى قلوبكم و نيّاتكم [1] ''ایک دن ایک اجتماع کے موقع پر بے ریائی اور اخلاص نیت کی بات چل رہی تھی ایک صاحب نے کہا۔ جو صدقہ کسی نابینا کو دیا گیا وہ اللہ کے لیے ہے کیونکہ وہ نہیں دیکھتا کہ کس نے دیا۔ دوسرے نے کہا۔ وہ نابینا تو جانتا ہے کہ مجھے کس نے دیا ہے اور اس کے لیے دعائے خیر کرتا ہے تو اس میں بھی (شائبہ) غرض ہے اور کہا کہ سوتے فقیر کے سرہانے رکھ دینا چاہیے۔ ایک اور شخص نے کہا کہ وہ فقیر اس قدر تو جان ہی جائے گا کہ کس نے اسے دیا ہے، غیب سے نہیں پہنچا ہے۔ تو حاضرین بولے ''یہ تو وہی بات ہوئی'' میں نے بھی اُن صوفی گدا کو اسی مسجد میں دیکھا ہے۔ بڑے صاحب ذوق واہل معنی، باقیمت بزرگ تھے۔ نور وصفا ولطافت نسبت لیے ہوئے۔ یہ خواجہ بیرنگ کی نسبت خاص کی تاثیر ہے کہ اس سے بالا کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس قوم کی اصطلاح میں اسے نسبت بے رنگی کہتے ہیں، بے وصفی کا نام دیتے ہیں۔ جب وہ اس مسجد کے حجرے کے طاق میں جس کے نیچے صاف شفاف دریا بہہ رہا ہے اور ایک سبزہ زار ہے جو نظر کے سامنے رہتا ہے بیٹھ کر محظوظ ہوتے تھے تو خواجہ شیرازی کا یہ شعر ان پر صادق آتا تھا

گدا چرا نزند لافِ سلطنت امروز   که چتر سایۂ ابرست و بزمگہ لب کشت [2]

سید اسحاق پنجابی

وہ صاحب احوال و کیفیات، اذواق و مواجید کے حامل بزرگ تھے۔ اس دیار کے بہت سے حضرات ان کی صحبت میں رہ کر جہل وغفلت کی دہلیز سے نکل کر حضور وآگاہی کے مرتبۂ بلند کو پہنچے ہیں۔ ان کی اقامت گاہ (درگاہ) ''بھیرہ'' اور ''خوشاب'' کے علاقے میں قصبۂ ''دیپتن'' میں ہے۔ وہ اس سرزمین میں بزرگی میں مشہور ومعروف گزرے ہیں۔ جس زمانے میں میرے والد مرتبۂ شہادت کو پہنچیں گے، ان سے ملاقات کی تھی اور بہت اچھی صحبتیں ان کے درمیان رہیں

---

1 بیشک اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں کو نہیں دیکھتا نہ تمھارے اعمال کو دیکھتا ہے بلکہ تمھارے قلوب اور نیتوں کو دیکھتا ہے۔

2 گدا آج کیوں سلطنت کی ڈینگیں نہ مارے کہ بادل کا سایہ اس کا چتر شاہی ہے اور سبزہ زار کے کنارے اس کی بزم گاہ بنی ہوئی ہے۔

تھیں۔ میں انھیں دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوتا تھا۔ ان مجالس صحبت میں گانے والے پنجابی درمندانہ اور عاشقانہ کلام پڑھا کرتے تھے۔اس میں سے ایک پٹہ ہے جس کا سرور میرے والد پر طاری تھا کہ اس کے معانی سے حال شہادت کی بو آتی تھی اس پٹے کا پہلا شعر یہ ہے

آہ و بکا چیخ گہران دے آئی ہُن کیا کیجئے ہیران
رانجھن ہوری متلم کیری تسیان سکھران

جس رات کی صبح کو میرے والد دنیا سے جائیں گے اس پٹے سے محظوظ ہو رہے تھے، تمام رات عاشقان صادقان کی عشق و محبت کی باتوں میں گزار کر صبح کر دی۔صبح کی نماز کے بعد میرے والد 25 آدمیوں کے ساتھ شہید ہوئے۔سید اسحاق جہاں تھے وہاں سے اس مقام شہادت پر پہنچے وہ ہر شہید کے پیروں کی خاک ہاتھ پر لگا کر اپنے ماتھے پر ملتے تھے کہ تم چند آدمیوں نے ہزاروں مفسدوں کے مقابلے میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔انھوں نے سب کو سپرد خاک کیا میں بھی اس وقت زخمی ہو گیا تھا بعد میں اپنے شیخ کی برکت اور توجہ تامہ کی بدولت بہت جلد زخموں سے نجات مل گئی اور شفایاب ہو گیا۔اس قصے کا مجمل بیان خاتمے میں آتا ہے۔اس کی تفصیل، میں اب سے برسوں پہلے ''جمع الجمع'' کے نسخے میں لکھ چکا ہوں۔ چونکہ میں ان غموں میں اپنے آپ سے کہتا تھا کاش ''رشحات'' اور ''کلیات خواجہ بیرنگ'' لوٹ کے سامان کے ساتھ نہ جاتیں تو (دنیا کے) اس غم کدے میں میری مونس حال ہوتیں۔اسی اثنا میں سید اسحاق کا خادم وہ کتابیں اور دوسرا سامان ان کے رقعے کے ساتھ لے کر پہنچا۔لکھا تھا۔تقدیر الٰہی سے چارہ کار نہیں ہے، بالکل غم نہ کھا، خدا کی طرف سے جان اور خدا سے راضی رہ۔ میں نے ''رشحات'' کو اپنے اس عجیب حال کے بارے میں جو پیش آیا تھا کھولا یہ نکل کر آیا، جدوجہد کر، دو تین روز کی زحمت سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ میرے پدر کی وفات کا تیسرا دن تھا۔

سید یوسف بھکّری اور سید عیسٰی سندھی

دونوں شیخ جعفر کے مرید ہیں۔ دونوں صاحب ذوق و مستی و شورش ہیں۔ عجیب حال و کیفیت دونوں پر طاری ہے۔ دونوں سے نرالا ہی سکر محبت اور شیدائیت ٹپکتی ہے۔ جب بھی وہ دونوں

میرے شیخ کے پاس آتے ہیں مست و بے خود آتے ہیں اور باادب زمین پر ایک گوشے میں بیٹھتے ہیں اور علاوہ میرے شیخ کی صورت کے کسی طرف نظر نہیں کرتے۔ خاطر سلیمہ میں یہی آتا ہے گویا شراب پیئے ہوئے اور عقل و ہوش رفتہ ہیں۔ بات بہت کم کرتے ہیں۔ چلنے میں اِدھر اُدھر بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ شراب شوقِ الٰہی کے مستوں کی صفت میں بزرگوں نے کہا ہے

''ہر کرا عشق شور انگیز نیست، این کار برو حرام است'' [1]

دوست دارد دوست این آشفتگی کوشش بیہودہ بہ از خفتگی [2]

مجھے عنفوانِ شباب سے ہی ایک بزرگ کی زبان سے سنی ہوئی مذکورۂ ذیل دو رباعیاں یاد ہیں

مارا نہ مریدِ ورد خوان می باید نے زاہد و حافظ قرآن می باید
صاحب دردے سوختہ جانے می باید آتش زدہ بخان و مان می باید
آن کس کہ ترا شناخت جان را چہ کند فرزند و عیال و خانمان را چہ کند
دیوانہ کنی دو جہانش بخشی دیوانہ تو ہر دو جہان را چہ کند [3]

لیکن اس دیوانگی میں بھی ایک شعور ہے، اس بے خودی میں بھی ایک حضور ہے جسے بجز اس کے اہل کے اور کوئی نہیں پاسکتا۔ ''رشحات'' میں ہے کہ خواجہ احرار قدس سرۂ فرماتے تھے کہ فنائے مطلق کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صاحبِ فنا کو اپنے اوصاف و افعال کا شعور نہیں رہتا بلکہ اوصاف اور افعال کی نسبت (اپنی طرف کرنے کے بجائے) خود سے بطریق ذوق اس کی نفی کرتا ہے اور خالق حقیقی جل ذکرہٗ کی طرف اثبات

1 جسے عشق شور انگیز حاصل نہیں ہے، یہ کام اس پر حرام ہے۔
2 دوست اس آشفتہ مزاجی کو دوست رکھتا ہے۔ سونے سے، تو بیکار کوشش بھی اچھی۔
3 مجھے وظیفہ خواں مرید نہیں چاہیے نہ (کسی) زاہد یا حافظ قرآن کی حاجت ہے۔ مجھے تو ایسا صاحب درد، سوختہ جان مرید چاہیے جو عشقِ الٰہی میں گھر بار ساز و سامان کو آگ لگا چکا ہو۔ جس نے تجھے پہچان لیا وہ جان کا کیا کرے۔ اسے فرزند و عیال، ساز و سامان کی کیا ضرورت۔ تیرا دیوانہ تو اپنے دونوں جہاں خوشی سے قربان کر دیتا ہے۔ بھلا تیرا دیوانہ (آہ) دونوں جہان کا کیا کرے۔ نوٹ: یہ رباعی ''صاحب تذکرۂ حسینی'' میر حسین دوست سنبھلی نے حضرت خواجہ کرک ابدال قدس سرۂ (متوفی 700ھ) کے نام سے درج کی ہے اور ''اسراریہ'' کے نسخۂ ندوہ میں یہ دونوں مصرعے اس طرح لکھے ہیں:

برباد دہد ہر دو جہان را بخشی دیوانہ تو ہر دو جہان را چہ کند

کرتا ہے۔ یہ جو صوفیہ نے کہا ہے نفی واثبات میں جنگ نہیں اسی معنی میں ہے۔ پھر فرمایا مثلاً یہ کپڑا جو میں پہنے ہوئے ہوں چونکہ بطور عاریت میرے بدن پر ہے۔ فی الحال میرے دل کا تعلق اس سے منقطع ہو گیا ہے حالانکہ میرا اس لباس کو پہننا بالفعل واقعی ہے۔ ساری صفات کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے کہ سب عاریت ہیں تا کہ دل غیر اللہ سبحانہ سے منقطع اور پاک وصاف ہو جائے۔ انتہیٰ۔

شیخ حسن و شیخ حسین

اِن کی والدہ کا نام فاطمہ ہے۔ دونوں بھائی نیک، صالح، تالیٔ قرآن معاملت میں راسخ اور شیخ الہداد کے صحبت یافتوں میں تھے۔ ایک زمانے میں میں نے شیخ حسن کو دیکھا ہے جب وہ شیخ جامی کے رسالے ''لوائح'' کو میرے شیخ کی خدمت میں سنا رہے تھے۔ اس کی مقررہ اصطلاحات کو خوب سمجھتے تھے اور تقریر کے دوران خوب استعمال کرتے تھے۔ ایک بار میں ان کے ساتھ دہلی سے سنبھل آیا ہوں۔ راستے میں ان کے سلوک و برتاؤ سے بہت محظوظ ہوا۔ ان کی آخری بیماری میں میں ان کی عیادت کے لیے گیا خوب باہوش و آگاہ تھے۔ اسی زمانے میں میرے شیخ نے مجھے جو حقائق و معارف لکھے تھے، انھیں دِکھائے، پڑھے اور خوش وقت ہوئے۔ اور 1055ھ (1645) میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کی قبر شیخ ہلالی سنبھلی کی قبر کے پاس ہے۔ شیخ ہلالی شیخ سماء الدین کنبوہ دہلوی کے مرید ہیں۔ وہ ایک صاحب احوال عظیمہ اور مقامات جلیلہ بزرگ تھے۔ ایک دن شیخ ہلالی نے ایک خادم سے فرمایا یہ جو بگولہ جا رہا ہے اسے میری طرف سے مبارکباد دے کر کہنا کہ ہمارا حصہ لاؤ۔ جب خادم نے ایسا کیا اس بگولے کے نیچے سے شیرینی کا بھرا ہوا بہت بڑا برتن زمین پر رکھا ملا۔ خادم اپنے شیخ کے سامنے لایا، شیخ نے حاضرین میں وہ مٹھائی تقسیم کی اور خود بھی کھائی۔ کسی اور وقت، ایک شخص جس نے یہ معاملہ دیکھا تھا بگولے کے قریب گیا اور شیخ کی طرف سے مبارکباد دی اور حصہ مانگا۔ گردباد میں سے چند ڈنڈے نکلے اور اس کو خوب پیٹا۔ وہ خستہ حال شیخ کی خدمت میں آیا جو گزرا تھا مفصل سنایا۔ شیخ نے فرمایا اس دن ایک جن اپنی شادی کر کے خوشی خوشی جا رہا تھا اسی لیے مٹھائی دی۔ آج غمگین تھا تو ہوا جو ہوا۔ شیخ ہلالی کی وفات 930ھ (1524) میں ہوئی ہے اور ''شیخ ہادی'' ان کی تاریخ وفات ہے۔ شیخ سماء الدین مشائخ کبار میں سے تھے۔ صاحب کرامات ظاہرہ و خوارق

عادات باہرہ تھے۔ وہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے شیخ کبیر الدین کے مرید ہیں۔ بیان حقائق میں انھیں بہت خوب زبان ملی ہے۔ رسائل تصوف کا دقائق تمام کے ساتھ علم رکھتے ہیں۔ شیخ کبیرالدین کے انتقال کے بعد سفر مکہ میں شیخ احمد کھتو[1] کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ شیخ احمد کھتو اعظم مشائخ گجرات ہیں۔ ان کے آبائے کرام دہلی میں رہتے تھے کہ ایک دن وہ دہلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ناگاہ ایک بگولہ آیا اور ان کو لے اُڑا اور وطن سے بہت دور لے جا کر ایک جگہ ڈال دیا۔ ایک مدت کے بعد بابا اسحاق مغربی کی صحبت میں جو کہ شیخ ابو مدین کے سلسلے کے درویشِ کامل تھے کنبوہ میں جو کہ اجمیر کے قریات میں سے ایک قریہ ہے، جا پہنچے اور ان کے سایۂ تربیت میں نشو و نما پا کر مرتبہ کمال و تکمیل کو پہنچ گئے۔ ہندستان میں امیر تیمور کے زمانے میں مشہور ہوئے، مرزا شاہ رخ کے آخری زمانے تک زندہ رہے۔ سال 849ھ (1446) میں (دنیا سے) سدھارے۔ شیخ سماء الدین کا انتقال 901ھ (1496) میں ہوا ہے۔ مگر ''کلمات الصادقین'' میں ہے کہ ان کی وفات ۱۷ر جمادی الثانی 907ھ کو سکندر لودھی کے عہد میں ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار وہ اپنے دروازے پر کھڑے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مخلوق پر شفقت و مہربانی کا غلبہ اس بات پر آمدہ کرتا ہے کہ تمام مخلوق خدا سماء الدین کی آنکھوں میں راہ یاب ہو جائے۔ انھوں نے شیخ فخر الدین عراقی کی ''لمعات'' پر جو حواشی لکھے ہیں وہ اس کے حلِ معانی میں کافی ووافی ہیں۔ شیخ سماء الدین کے مریدین میں سے ایک شیخ جمالی دہلوی ہیں۔ انھوں نے جس طرح شیخ عجائب الدین کا لقب ہلالی فرمایا اسی طرح جلال الدین خاں کو جمالی تخلص دیا۔ ان کے اشعار بڑی تعداد میں ہیں۔ حجاز کا سفر کیے ہوئے تھے۔ زیارتِ حرمین کے بعد قلندرانہ بھیس میں ہرات پہنچے۔ مولانا جامی سے ملے، مولانا جامی کو ان کے دو شعر بہت پسند آئے

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتو صفات　　تو عین ذات می نگری، در تبسمی[2]

1　شیخ احمد کھتو اپنے زمانہ کے مشہور اور اکابر مشائخ میں سے تھے۔ آپ کا مزار قصبہ سرکھیج مضافات احمد آباد میں مرجع خلائق ہے۔ ''اخبار الاخیار'' کے مطابق آپ کی تاریخ وفات 849ھ/1446 ہے۔

2　حضرت موسیٰ پرتو صفات کی ایک جھلک سے بے ہوش ہو گئے۔ آپ عین ذات دیکھتے ہیں مگر پھر بھی مسکراتے ہیں۔

ما را ز خاک کویت پیرا ہنیست برتن آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن[1]

انھوں نے مشائخ ہند کے احوال میں ''سیر العارفین'' کے نام سے ایک نہایت مفید تاریخ لکھی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ یہ فقیر حرمین کی زیارت کے بعد شہر ہرے میں پہنچا۔ وہاں شیخ زین الدین جامی کے خلفا میں سے شیخ صوفی، مولانا محمد روحی، شیخ عبدالعزیز جامی، مولانا عبدالرحمٰن جامی، شیخ الاسلام جنھوں نے بعد میں شاہ اسماعیل صفوی کے ہاتھ سے شہادت پائی، مولانا مسعود شیرازی، مولانا حسین واعظ و مولانا معین واعظ اور مولانا عبدالغفور لاری جیسے اکابر (موجود) تھے۔ اگر چہ یہ تمام بزرگوار فقیر سے بہت محبت کرتے تھے مگر ہرے میں مجھ درویش کا تکیہ گاہ مولانا عبدالرحمٰن جامی کا گھر تھا۔ ایک دن میں ان کے ساتھ ایک حجرے میں بیٹھا ہوا تھا اور شیخ فخر الدین عراقی کی ''لمعات'' زیرِ بحث تھی۔ ناگاہ مولانا جامی نے شیخ محی الدین ابن عربی کے مسترشد شیخ صدرالدین قونوی کی تعریف میں مبالغہ کیا اور فرمایا کہ شیخ فخر الدین عراقی کی ''لمعات'' شیخ صدرالدین قونوی کی تالیفات عالی درجات کی برکات کا نتیجہ ہے۔ آپ کا یہ تبصرہ اس درویش کی خاطر میں نہ آیا تو میں نے عرض کیا ''کسی بھی شخص کا مرتبہ پیش حق تعالیٰ پوشیدہ نہیں کہ کس کی (برکات و) عطیات کا نتیجہ ہے۔ اتفاقاً اسی رات حضرت مولانا جامی نے خواب دیکھا۔ فرماتے ہیں کہ '' گویا ایک نورانی چبوترہ ہے، اس پر شیخ فخر الدین درویشوں کے ایک مجمع کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور شیخ صدرالدین شیخ فخر الدین کے جوتے تھامے ادب سے کھڑے ہیں اور شیخ فخر الدین میری طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ آؤ اور تم بھی اس مجلس میں حاضر ہو جاؤ۔ میں چبوترے پر پہنچا اور شیخ فخر الدین عراقی کی دست بوسی سے شرف یاب ہوا حال یہ تھا کہ ان کا رعب و دبدبہ مجھ پر اثر ڈال رہا تھا۔ تم مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اب تو آپ کا مقام معلوم ہوا۔ میں جواب میں یہی کہہ رہا تھا کہ حق آپ کی جانب تھا۔'' صبح کو جب ہم ملے تو مولانا جامی نے اپنا یہ خواب بیان فرمایا اور شیخ فخر الدین عراقی کی روح کو فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب کیا۔ انتہیٰ

شیخ جمالی دہلوی کی وفات 942ھ (1536) میں ہوئی اور ان کی قبر مولانا فخر الدین جاجی کے روضے

---

1 . میرے جسم پر اس کے کوچے کی خاک کا پیراہن ہے۔ وہ بھی آنکھوں کے آنسوؤں سے دامن تک سو جگہ سے چاک چاک ہے۔

میں حضرت قطب الدین قدس سرہٗ کے پاس میں ہے۔انھوں نے دو بیٹے چھوڑے ایک شیخ گدائی جو بزرگی اور مرتبے میں اپنے والد کے ہم پلہ ہیں۔شروع سے آخر تک شاہی دربار میں عز و جاہ کے حصول میں کوشاں رہے (تا کہ اس سے حاجت مندوں کی حاجت برآری کریں)۔ ابتدا میں نصیرالدین محمد ہمایوں بادشاہ معظم کے مقربوں میں منسلک ہوگئے تھے۔شیر شاہ کے غلبے کے بعد حرمین شریفین چلے گئے اور جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے عہد میں اپنے وطن لوٹے اور درجات معتبرہ کی انتہا کو پہنچے۔اور 968ھ (1561) میں دنیا سے گزر گئے۔دوسرے شیخ عبدالحق کہ جن کا تخلص خیالی ہے۔بہت بڑے عالم اور شاعر تھے اور جوانی میں ہی انتقال کیا۔ایک سو تیس تصانیف کے مالک تھے۔959ھ (1552) میں ہی وفات پا گئے تھے۔سید میر جو کہ میر سید (مفاخر) کی اولاد میں ہیں انھوں نے اُن کی تاریخ وفات کہی

نادرالعصر شیخ عبدالحق   کہ بو صفش مرا زبان بکشود
وقت نزعش بسر رسیدم من   گفتم اے چون تو در جہان نبود
سال تاریخ خویش خود فرما   کہ چو ادئ درین زمان نبود
گفت تاریخ من بود نامم   بندہ وقتے کہ در میان نبود[1]

شیخ حسین یہ شیخ عبدالواحد سنبھلی کے مرید ہیں اور وہ شیخ فتح اللہ ترین کے اور وہ شیخ سلیم فتح پوری (چشتی) کے (قدس اللہ ارواحہم) ان سب کے حالاتِ زندگی اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔شیخ عبدالواحد کے مریدین میں سے ایک شیخ محمود صالح سنبھلی تھے جو صاحب وجد و حال تھے۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں جب انھیں اس راہ کا شوق جنون آمیز پیدا ہوا تو ان کے اقارب میں سے شیخ محمود نے جو کہ اس راہ کے صاحب مشرب اور اہل سخن حضرات میں سے تھے اور صوفیہ کے مذاق میں بہت سے رسالے بھی لکھے اور شیخ امان (اللہ) پانی پتی کے صحبت یافتہ ہیں،ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں تو انھوں نے ذوق میں بھر کر یہ مشہور شعر پڑھا

---

1   نادرالعصر شیخ عبدالحق جن کی تعریف میری زبان پر ہے۔وقت نزع میں ان کے سرہانے پہنچا اور میں نے کہا کہ آپ جیسا کوئی دنیا میں نہ ہوگا۔خود ہی اپنا سال وفات فرمادیں کہ ایسی کسی نے اس زمانے میں نہ کہی ہو انھوں نے فرمایا کہ میرا نام ہی میری تاریخ وفات ہوگی جس وقت بندہ درمیان میں نہ رہے گا۔

پائے مجنون نہ ہمین سلسلۂ سودا داشت   ہر کہ دیوانہ شد این سلسلہ را برپا داشت[1]

اس کے بعد انھوں نے اپنے شیخ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ اسی اثنا میں شیخ فتح اللہ ترین کو دیکھا کہ خواب میں ان سے کہہ رہے ہیں "ہمارے روضے پر آ۔ اور کام میں لگ۔" انھوں نے وہاں قیام کیا۔ تیس سال سے زائد وہاں گزارے اور مقصد کو پہنچے۔ 1035ھ (1626) میں دنیا سے کوچ کیا۔ قبر، شیخ فتح اللہ ترین کے روضے کے نزدیک ہے۔ قدس اللہ سرہٗ۔ یہ مصرعہ ان کی تاریخ وصال ہے۔

"میاں محمود صالح رفت از جا"[2]

شیخ محمد ہاشم ان کے نواسے جو کہ فاضل اور صاحب اخلاق ہیں اور میرے شناسا ہیں فرماتے ہیں کہ شیخ حسین نے اوائل میں خواجہ بیرنگ کو دیکھا (اور ان کی صحبت اُٹھائی) ہے۔ ان کے بعد شیخ الہداد کی صحبت اختیار کی۔ آخر میں میرے شیخ کے بڑے مخلصین میں ہو گئے تھے۔ ایک بار میرے شیخ نے انھیں یہ لکھا کہ ذات حق ایک غیر متناہی نور ہے اور سارے عوالم (دُکھوں) سے بالا ہے۔ (حقیقتاً) اس کے ماسوا کوئی چیز دیکھی اور سنی نہیں جاتی سب کچھ وہی ہے۔ اور وہ سب میں ہے۔ جو غیر نظر آتا ہے غیر نہیں ہے۔ بلکہ غیر بھی اسی دریائے بے کراں کی موجیں ہیں۔ چاہیے کہ اسی خیال میں شب و روز مشغول رہیں اور اتنی کوشش اور سعی کریں کہ یہ خیال جو ہر دل کے ساتھ مل جائے اور بے تکلف اس اندیشے میں رہنا میسر ہو جائے۔ ہر کام میں اسی طرح مشغول ہونا چاہیے۔

کار اینست وغیر ایں ہمہ ہیچ[3]

وہ مجھ پر بہت لطف و مہربانی فرماتے اور مجھے بہت دوست رکھتے تھے۔ کئی برسوں ہم دونوں نے باہم خوب سیر و سفر کیے ہیں۔ کیا دہلی کیا آگرہ، کیا امروہہ کیا حسن پور بڑی خوبی اور حسن (رعایت) کے ساتھ یکجا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس زمانے میں، میں شیخ فرید مرتضٰی خاں جو کہ صاحب دولتِ صوری و معنوی اور بخاری الاصل سید تھے، کی خدمت میں تھا۔ ایک دن خواجہ بیرنگ ان کے گھر تشریف لائے۔ سید ان سے نیچے ہو کر بیٹھے انھیں تخت کے اوپر بٹھایا۔ آپ نے ایک صالح شخص کے وظیفے کی

---

1 صرف مجنون کے پاؤں کو ہی اس زنجیر کا سودا نہ تھا۔ جو بھی دیوانہ ہوا اس نے ہی یہ سلسلہ جاری رکھا ہے۔

2 میاں محمود صالح یہاں سے چلے گئے۔

3 اصل کام تو یہ ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ بیکار ہے۔

سفارش کی۔ سید صاحب نے ان کی مرضی کے موافق مقرر کردیا۔ ''درخواست کی کہ آئندہ حضرت ایسی تکلیف نہ اُٹھائیں بلکہ جس کام کے لیے دل میں آئے اِن شیخ حسین سے فرمادیا کریں'' اور سید صاحب نے مجھ سے کہا جو آپ فرمائیں وہ کام پورا ہو جانا چاہیے۔ آپ (خواجہ بیرنگ) کی سید صاحب کے حال پر نہایت درجہ توجہ باطنی رہتی تھی۔ سید صاحب آپ کی توجہ خاص کی بدولت نسبت باطن اور شغل طریقہ سے مستفید ہو گئے تھے۔ نیز آپ کی ترغیب اور دعا سے جود وسخا کے مرتبہ کمال سے متصف تھے۔ چنانچہ اکثر صلحا، مستحقین، بیوگان، چھوٹے بڑے ہندستان بھر میں آپ کے خوان احسان کے روزی خوار تھے۔ آپ اس وقت بھی جبکہ تکمیل وارشاد کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو گئے تھے۔ سید صاحب (مرتضیٰ خاں) کو قبلہ گاہی کے عنوان سے خط لکھا کرتے تھے۔ سابقہ حقوق کا لحاظ فرماتے تھے۔

ایک بار سید صاحب کی مشغولی (باطنی) کے ایام میں سید صاحب کو یہ لکھا

یکے لحظہ ازو دوری نشاید   کہ از دوری خرابی ہا فزاید
بہر جائیکہ باشی پیش او باش   کہ از نزدیک بودن مہر زاید [1]

سید (مرتضیٰ خاں) کی وفات ماہ ربیع الآخر 1025ھ (1616) میں ہوئی۔ داد، خورد، برد، ان کی تاریخ وفات ہے۔ میرے والد جوانی کے دنوں میں سید صاحب کے ساتھ جبکہ حوض فرید آباد اور سرائے کٹرہ کے داروغہ تھے رہے ہیں۔ جب شیخ حسین کی وفات نزدیک پہنچی تو فرمایا کہ آج جمعے کی رات کو چاہتا تھا کہ چلا جاؤں مگر نصیب نہ تھا۔ جب دوشنبے کی رات آئی تو کہنے لگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم وصال دوشنبہ ہے اگر اسی دن میں وصال میسر ہو تو خوب ہے اور یہ شعر پڑھا

نفسے درمیان میانجی بود   آن میانجی ہم از میان برخاست [2]

اپنی تجہیز و تدفین کے انتظامات خود بہوش تمام انجام دیے۔ آخر شب میں ایک بزرگ نے ان کی خبر کے لیے کسی کو بھیجا۔ واپس آکر کہا۔ ایک گھڑی سے زیادہ انھیں گزرے ہوئے ہوا ہوگا۔ صبح

---

1 ایک لمحے کو بھی اس ذات سے دوری نہ چاہیے کہ دوری سے خرابی بڑھتی ہے۔ جہاں بھی رہے اس کے سامنے رہ کہ نزدیک رہنے سے محبت بڑھتی ہے۔

2 میاں جی، ایک سانس اندر باقی تھا لو میاں جی وہ بھی جاتا رہا

کے وقت بروز دوشنبہ 14 رر جب 1069ھ(1659) کو رخصت ہوئے۔ ان کی قبر ان کے بھائی شیخ حسن کی قبر کے پائنتی ہے۔

شیخ بہاء الدین و شیخ اسمٰعیل

دونوں آپس میں رشتہ دار اور ہم زمانہ ہیں۔ گنج شکرؒ کی اولاد میں سے شیخ علاء الدین چشتی جو کہ علاء الدین جوانمرد کے لقب سے مشہور ہیں، کے پوتے ہیں۔ شیخ علاء الدین چشتی کا انتقال 945ھ(1539) میں ہوا ہے۔ ان کی قبر دہلی سے سمت جنوب میں ایک فرسنگ پر ہے۔ شیخ اسمٰعیل کہتے ہیں کہ جب شیخ بہاء الدین چھ دن کے تھے ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ تجہیز و تدفین کی مشغولی میں کسی نے اس بچے کی خبر نہ لی۔ سب کے سب بھول گئے۔ رات کو ان کے والد شیخ بدرالدین نے کسی سے معلوم کیا کہ وہ بچہ کہاں ہے۔ دیکھا کہ بچہ بکری کے باڑے کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ بستر پر لائے۔ بکری بھی اس کے ساتھ آئی اور اس کو چاٹنا شروع کیا اور اپنے دونوں پیروں کے بیچ اس کو کر کے اس طرح کھڑی ہوئی کہ اپنے تھن اس کے منہ سے لگا دیے اور شکم سیر دودھ پلایا۔ سب کو بڑی حیرت ہوئی اور سمجھ گئے کہ بچے کا تمام دن اسی طرح بکری کے تھن سے دودھ پیتے گزرا ہے۔ دوسرے دن لوگ دایا کو لائے تا کہ بچے کو اس کے حوالے کریں۔ ان کے والد محترم نے کہا جب خدائے تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ اور رحمت شاملہ سے بکری کے ذریعے دودھ عطا کر دیا، یہی کافی ہے۔ دایہ کی حاجت نہیں ہے۔ وہ بکری شب و روز دودھ پلانے، چومنے چاٹنے اور اس کی نگہبانی میں ماں کی طرح لگ گئی۔ حالانکہ اپنے بچوں کو اپنے پاس سے بھگا دیتی اور ان کو دودھ نہ پلاتی تھی۔ تین مہینے تک اس بکری کا دودھ کم نہ ہوا۔ ان تین مہینوں میں ان کے والد مرغن کھانا اس بکری کو کھلاتے تھے۔ اس کے بعد بچے کو بھی کھانا کھلانے لگے وہ بھی بکری کے ساتھ بیٹے اور ماں کا معاملہ کیا کرتا۔ جب وہ پندرہ سال کا ہو گیا بکری بیمار اور کمزور ہوگئی۔ والد نے اسے اطلاع کیے بغیر کسی سے کہا کہ اسے ذبح کرلے۔ جب اس نے بکری کو دیکھا رونا پیٹنا شروع کر دیا کسی کو بھی بکری کا گوشت نہ کھانے دیا۔ ایک نفیس کفن خرید کر لایا اور اس کو دفن کیا۔ والد نے کسی سے کہا کہ رات کو چھپ کر ذبح شدہ بکری کو لے آنا اور استعمال کر لینا۔ اس شخص نے کفن کو

الگ کر کے اور بکری کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ شیخ بہاء الدین میرے والد کو بہت دوست رکھتے تھے اسی طرح وہ بھی ان سے بڑھ کر انھیں دوست رکھتے تھے۔ وہ صاحب ذوق وسماع تھے۔ اُن کے سماع میں ایک تاثیر تھی، جو دل میں بیٹھ جاتی تھی۔ عمر دراز پائی۔ آخری عمر میں دوران سماع تو صحیح البدن اٹھتے اور گشت لگاتے اس کے علاوہ بیٹھے رہتے تھے یہ ان کی کرامت تھی۔ ایک دن میں نے انھیں دیکھا کہ شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے عرس میں آئے ہوئے ہیں اور بہت خوش ہیں۔ شیخ احمد قاضی کو جن کا ذکر عنقریب ہی آئے گا اور کریم داد قوال کو جو کہ ایک ظریف شخص تھے۔ دونوں کو بغل میں دبائے ہوئے ہیں اور تینوں ایک ساتھ سماع کر رہے ہیں حالانکہ یہ دونوں حضرات اہل سماع نہ تھے بلکہ ہم میں کے بھی اکثر لوگ جوان کے آس پاس کھڑے تھے گریاں تھے اور نعرے لگاتے ہوئے ذوق سے لبریز تھے۔ قوال، مسعود بک کی یہ غزل گا رہا تھا

(غزل)

دل خون نشدے چشم تو خنجر نشدے گر	رہ گم نشدے زلف تو ابتر نشدے گر
ہند و بچۂ ملک خراسان نگرفتے	بارے دہ دے غمزہ کافر نشدے گر
پرکار قضا دائرہ مہ نکشیدے	خط بر رخت از مشک مدوّر نشدے گر
در جنت فردوس کسے پا نہ نہادے	آن چاہِ زنخدانِ تو کوثر نشدے گر
از قبلہ عام این دل گمراہ نگشتے	محراب دوا بروے تو رہبر نشدے گر
اندر دل من نقش خیالت نہ نشستے	آن قامت قدِ تو صنوبر نشدے گر
اقلیم دل و ملک بتا راج کہ بُردے	سلطان غمت مثل سکندر نشدے گر [1]

1 اگر تیری نظر کے خنجر کا وار نہ ہوتا تو میرے دل کا بھی خون نہ ہوتا۔ اور اگر تیری زلف پریشان کی کارفرمائی نہ ہوتی تو میں از خور رفتہ نہ ہوتا۔ اوا گر اسے تیرے غمزۂ کافر ادا کی طرف راہ نہ ہوتی تو کوئی عاشق تیرے ملک خراسان میں نہ رہتا۔ اگر تیرے چہرے پر مشکیں مدور خط نہ ہوتا تو تقدیر الٰہی چاند کے چاروں طرف ہالہ نہ بناتی۔ اگر وہاں ترے چاہ زنخداں کے کوثر میں جلوے نہ ہوتے تو کوئی جنت الفردوس میں پیر بھی نہ رکھتا۔ اگر تیرے دوابروؤں کے محراب کی جانب سے کشش رہبر نہ ہوتی تو یہ دل قبلہ عوام سے برگشتہ نہ ہوتا۔ اگر تیرے بلند وبالا قد کا صنوبر نہ ہوتا تو میرے دل میں ترا خیال نقش پذیر نہ ہوتا۔ اگر تیرا غم سکندر بادشاہ کی مثل اس پر غالب نہ ہوتا تو کوئی اپنے دل کے ملک واقلیم کو تاراج نہ کرتا۔

از نقش جہان لوح ضمیرم نشدے پاک　　نقش تو درین دیدہ مصوّر نشدے گر

مسعود بک از بادہ چنین مست نگشتے

کان لعل دلآویز تو ساغر نشدے گر [1]

وہ پانچوں خواجگانِ چشتیہ سے محبت تام رکھتے تھے اور ان کے عرسوں میں پوری عقیدت کے ساتھ پہنچتے تھے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ خواجگانِ خمسہ چشتیہ قدس اسرا ہم کے وصال کے دن ہفتے کے دنوں کی ترتیب سے واقع ہوئے ہیں۔ خواجہ معین الدین کا وصال اتوار کے دن 6/رجب المرجب 663ھ (7/جون 1265) کو خواجہ قطب الدین کا پیر کے دن 14/ربیع الاوّل 633ھ (4/دسمبر 1235) کو شیخ فریدالدین کا منگل کے دن 5/محرم 664ھ (1266) کو، شیخ نظام الدین کا بدھ کے دن 18/ربیع الآخر 725ھ (2/اپریل 1325) کو اور شیخ نصیرالدین (محمود چراغ دہلی) کا جمعرات کے دن 18/رمضان المبارک 757ھ (1356) کو ہوا۔ شیخ بہاءالدین کا یہ معمول تھا کہ جمعہ کی رات میں پہلے تمام انبیاء کرام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، اولاد (صلی اللہ علیہ وسلم)، اور مشائخ سلسلہ کی ارواح۔ مسلمانوں کے مختلف گروہوں اگلے ہوں یا پچھلے سب اور اپنے تمام آشناؤں کے لیے جو کہ دنیا سے گزر گئے تھے اور عورتوں کے لیے بھی نام بنام فاتحہ پڑھتے، دعا کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس پڑھنے میں بہت دیر لگتی تھی۔ ان کے وطن آبائی دہلی میں شیخ علاءالدین چشتی کی سرائے ہے لیکن ان کے بزرگوں میں سے شیخ لاڈن نے سنبھل آ کر سکونت اختیار کر لی تھی اور مدتوں بڑے اکرام سے گزارے اور یہیں سنبھل میں 1000ھ (1592) میں انتقال ہوا مگر ان کی نعش کو شیخ علاءالدین کی سرائے لے جا کر دفن کیا گیا۔ سنبھل میں ان کی سکونت کی جگہ کو لاڈن سرائے کہتے ہیں۔ جب سنبھل میں ان کے قبیلے کا کوئی دنیا سے چلا جاتا ہے تو اس کو دہلی میں اسی سرائے شیخ علاءالدین میں لے جا کر شیخ علاءالدین کے روضے کے نزدیک دفن کر دیتے ہیں۔ جب شیخ بہاءالدین کا بھی 1060ھ (1650) میں انتقال ہوگیا

1　میرے دل کی تختی نقش جہاں سے پاک نہ ہو سکتی تھی اگر تیری صورت میری ان آنکھوں میں نہ ہوتی۔ مسعود بک شراب معرفت سے ایسا مست نہ ہوتا اگر پینے کے لیے تیرے لبوں کے دلآویز ساغر نہ ہوتے یعنی اگر تیری زبان سے سخنانِ معرفت نہ سنتا۔

ان کی نعش کو بھی چند ماہ کے بعد وہیں لے جا کر دفن کیا گیا۔ شیخ اسماعیل کو تیس سال سے بھی زیادہ ہو گئے کہ نوکری چھوڑ کر لاڈن سرائے سنبھل میں ہمت و مروّت اور اخلاق پر جمے ہوے ہیں۔ مجھ پر بہت لطف فرماتے ہیں اور آپس میں اکثر ملاقات رہتی ہے۔ اسرار یہ کی تکمیل کے پانچ سال بعد وہ دہلی چلے گئے اور وہیں 6/رمضان المبارک 1073ھ (1660) میں دنیا سے رخصت ہوئے ان کی نعش کو بھی سرائے شیخ علاء الدین میں لے جا کر دفن کیا گیا۔ میں نے اللہ کے فضل سے ان کی تاریخ وصال کہی

شیخ اسماعیل چون رفت از جہان   ہر کسش اندر بہشت آسود گفت
بود بینا در رہِ دل، ہم دلم   شیخ اسماعیل بینا بود گفت [1]

شیخ خضر بریلی

وہ اس کار درویشی میں واثق، محبت و معاملت میں موافق اور سچے درویش تھے۔ بریلی کے پاس قصبہ سیتھلی میں حلقۂ فقرا میں دل جمعی کے ساتھ رہتے تھے۔ میں نے شروع میں اُن کو اپنے شیخ کی صحبت میں دیکھا ہے۔ وہ شیخ سے خوب آشنا ہو گئے تھے۔ دہلی کی سیر کی تھی۔ اس وقت اس راہ کے طالبین میں سے ایک درویش اُن کے ساتھ تھے۔ جنھوں نے آپ سے تلقین ذکر حاصل کی تھی اور ان کی خدمت کیا کرتے تھے لیکن کوئی کارکشادانھیں نظر نہیں آئی تھی۔ اس بات کا انھوں نے مجھ سے گلہ کیا۔ جب بھی میں، شیخ خضر سے اس کا ذکر کیا کرتا تو وہ فرماتے کیا کروں مُراد ہے۔ یعنی خود مراد ہے۔ اسی وجہ سے اس درویش کا کام آگے نہیں بڑھتا۔ اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ طالب کو شیخ کا تابع ہونا چاہیے نہ کہ خود رائے۔ میں نے کسی کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ ایک صاحب ارشاد شیخ تھے، ان کی خدمت میں دو مرید رہتے تھے۔ ایک بہت خدمت کرتا تھا مگر اسے کوئی کارکشاد نہیں ہوتی تھی۔ دوسرا جو کہ اس کے برعکس تھا صاحب احوال ہو گیا۔ ایک بزرگ نے ان شیخ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے اُس بے پرواہ پر تو آپ کی توجہ اور لطف و کرم ہے لیکن اِس خدمتگار پر نہیں۔ کہا۔ وہ میرا مرید ہے، یہ اپنا مرید

1 جب شیخ اسماعیل جہاں سے چلے گئے ہر کسی نے دعا دی کہ وہ بہشت میں آرام سے ہیں۔ راہ دل میں وہ دانا بینا تھے تو میرے دل نے بھی (ان کی تاریخ وفات) ''شیخ اسماعیل بنیا بود'' کہی۔

ہے۔۔کہا۔اس مشکل کو حل کریں۔شیخ نے کہا بیٹھو اور دیکھو پھر اس خدمتگار کو بلا کر فرمایا۔وہ اونٹ جو بیٹھا ہے باندھ کر اپنی پشت پر لاد کر مسجد کے اس دریچے میں لے آ۔اس نے کہا۔اے شیخ پہلے تو اونٹ کو کمر پر لادنا مشکل اور دریچے میں لانا تو اور بھی مشکل تر ہے۔یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔کہا "میرے پاس سے چلا جا"۔پھر اس بے خدمت کو بلایا اور اسی کام کو کہا۔وہ بلا تامل دوڑا۔دستار سر سے اتاری،فوطہ کمر سے کھولا دونوں کی رسی بٹی اونٹ کے نیچے سے نکالی اپنی کمر پر باندھی اور اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک گھڑی تک وہ اسی محنت میں تھا کہ شیخ نے اس سائل سے کہا "مرید یہ ہے"۔کبھی کبھی سید خضر اور میں مشائخ کی قبور کی زیارت کے لیے ساتھ جایا کرتے اور خوب سیر کرتے تھے۔وہ حسین صورتوں پر مائل تھے خاص کر عورتوں کے حسن اور اپنی جوانی کے عشق کی حکایات سناتے تھے۔عارفین کہتے ہیں کہ عورتیں دنیا کی سب سے آخری مخلوق ہیں اسی لیے ان کا عشق اتم و اکمل ہوگا۔محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔"حُبّبَ اِلَیَّ من دنیا کم ثلثۃُ الطیب والنساء و قرۃُ عینی فی الصلوٰۃ "[1] اسی طرح عرب کے مشہور عشاق مجنوں،لیلیٰ،سلامان و ابسال اور وامق و عذرا کی حکایات عشق و محبت کی یہی حقیقت رہی ہو۔میرے شیخ نے اس حدیث کے معنی میں یہ فرمایا ہے کہ وجود انسانی میں کل تین مرتبے ہیں۔مرتبۂ نفس،مرتبۂ روح اور مرتبۂ جامع کہ اس سے قلب مراد ہے۔خوشبو نفس کی غذا ہے۔نماز روح کی اور عورتیں قلب کی غذا ہیں۔ایک دن سید خضر اور میں قدم گاہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زیارت سے واپس آ رہے تھے۔راستے میں ایک بہت ہی حسین و جمیل ہندو عورت نظر پڑی۔وہ اس کے جمال کو دیکھ کر حیرت زدہ کھڑے ہو گئے۔میں نے دیکھا کہ وہ خود سے بے خود اور اپنے آپ سے گم ہونے لگے۔انھیں نہ آگے بڑھنے کا یارا نہ راہ چلنے کی سکت رہی۔میں بڑی کشمکش میں پڑ گیا،کیا کروں کہ وہ پری پیکر ایک نگاہ ان پر ڈال کر ایک لمحے کی جلوہ گری کر کے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔اس جلوے سے انھیں جو ملا وہ جانیں۔اس موقع پر میں نے اپنے شیخ کا یہ مطلع

بازم بسر فتاد ہوائے پری رخاں　　صبر و قرار گشت ز دل چوں پری رواں[2]

1　تمھاری دنیا کی تین چیزیں میرے لیے محبوب بنادی گئی ہیں۔خوشبو،عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

2　پھر میرے سر میں پری رخوں کا سودا سوار ہے۔پری کی مانند میرے دل کا صبر و قرار رخصت ہو گیا ہے۔

کچھ ترمیم کے ساتھ یوں پڑھا۔

تاآں پری شدہ ز بس دلبری نہاں　　صبر و قرار گشت ز دل چوں پری رواں [1]

میں انھیں اسی حال مستی و دیوانگی میں اپنے شیخ کے مکان لے کر پہنچا تب کہیں جا کر اُن کی اس حالت جذب و مستی کو سکون ہوا۔ لیکن اس زیبا رُخ کے تیر نظر کی تاثیر ان درویش کے دل پر ایسی کارگر ہوئی کہ تمام عمر اسے یاد کیا کرتے تھے اور اس حکایت کو بار بار درد دل کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ جب بھی وہ اپنے گھر سے سنبھل تشریف لاتے اس نگار وقت کی یاد کو تازہ کیا کرتے گویا کہ اس نگار وقت کی نگاہ کا زخم اُن کے دل کا ناسور بن گیا تھا۔ اس راہ کی شمشیر کھائے ہوئے ایک دردمند نے کہا ہے

نیّت جان بازی داری رب ترا فرصت دہاد　　زخم شمشیر نگاہے خوردۂ ناسور باد [2]

ایک بار وہ سنبھل آئے۔ اتفاقاً اس وقت میرے فرزند (سید) کاظم کی تقریب نکاح تھی۔ چند دن خوشی خوشی گزارنے کے بعد وہ واپس گئے تو دنیا سے ہی چلے گئے۔ ان کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی، ان کی قبر، ان ہی کے باغیچے میں ہے۔

شیخ احمد دہلوی

ان کی جائے ولادت و پرورش سلیم گڑھ ہے جو کہ دہلی شہر کے متصل ہے۔ اور وہ وہاں کے قاضی تھے۔ فضائل و کمالات سے آراستہ۔ صلاح و معاملات سے پیراستہ۔ جب بادشاہ اعظم، اکرم، شجاع، عادل ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ غازی نے 1058ھ میں اس مقام (دہلی) کو پسند فرما کر یہاں ''شاہ جہاں آباد'' نام کے شہر کی بنیاد ڈالی۔ اور بہت سی شاندار عمارتیں، مسجدیں، قلعے، بازار، انداز و طرز کے بنوائے اور چند سال کی مدت میں اس شہر عظیم الشان کو اتمام تک پہنچا دیا۔ اس شہر کی جامع مسجد عظمت، رفعت، لطافت اور صرافت میں ایسی واقع ہوئی ہے کہ جہاں دیدگان و فہمیدگان ہفت اقلیم کہیں بھی اس جیسی کسی مسجد کا نشان نہیں

1　جیسے ہی وہ پری رخ عجیب انداز سے دل لے کر چھپا ویسے ہی دل کا صبر و قرار بھی مانند پری روانہ ہو گیا۔

2　تیری جان دینے کی نیت ہے اللہ تجھے توفیق دے۔ تو نے شمشیرِ نگاہ کا زخم کھایا ہے اللہ کرے ناسور بن جائے۔

بتاتے۔آج اس جیسا شہر ایران، توران، ہندوستان میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔اس شہر کی بنیاد کی تاریخوں میں سے ایک تاریخ یہ ہے"شد جہاں آباد از شاہِ جہاں"

ایک دن میرے شیخ حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت سے اپنے مکان لوٹ رہے تھے۔میں بھی ساتھ تھا۔راستے میں یکا یک شیخ احمد ملے ملاقات کی اور ساتھ ہو گئے۔میرے شیخ نے توحید وجودی کی بات چھیڑی اور ان سے دریافت کیا آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔کہا کہ میرا اعتقاد موحدین سابقین کے اعتقاد کے مطابق ہے اور انھوں نے اس قوم صوفیہ کی اصطلاح کے مطابق توحید کے اتنے اسرار و دقائق بیان کیے کہ میرے شیخ خوش و مسرور ہو گئے اور آپ نے بھی اس علم کی بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں کہ شیخ احمد بہت محظوظ ہوئے اور آپ کے معتقد ہو گئے۔اس واقعے کے بعد میرے شیخ نے اُن کی تعریف کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ فرمایا۔"وہ اس جماعت میں سے ہیں جو اپنے علوم نادرہ کو علما اور قضات کے لباس میں چھپائے رکھتے ہیں۔"کسی کا گمان بھی اس طرف نہیں جاتا کہ یہ حضرات علوم و احوال صوفیہ بھی رکھتے ہوں گے۔حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ علم اسی کو زیبا ہے جو اس کا بخوبی اِخفا کر سکے۔"رشحات" میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار فرماتے ہیں کہ مولانا حسام الدین شاشی جمعیت قوی اور استغراق تمام رکھتے تھے۔آثار جمعیت ان سے ظاہر ہوتے تھے۔عجیب پرخمار آنکھیں تھیں کوئی کیسا ہی بے ذوق ہوتا آپ کا معتقد ہو جاتا تھا۔آپ میں جمعیت قلب اور غلبات جذبات کی جو شدت و حرارت تھی اس کی وجہ سے جاڑوں میں بھی برف کے پانی میں اپنے پیر ڈالے رہتے اور سینے کے بٹن کھولے رکھتے اور اپنے سینے پر سرد پانی چھڑکتے رہتے تھے۔مرزا اُلغ بیگ نے آپ کو بخارا کے عہدۂ قضا کے لیے مجبور کیا اور انھیں زبردستی قاضی بنا دیا۔جس زمانے میں وہ دارالقضا میں تشریف رکھتے تھے اور جھگڑوں کے فیصلے کرتے تھے طالبانِ علوم معرفت کا مجمع دور بیٹھا آپ سے کسب جمعیت باطن کرتا رہتا تھا۔میں آپ کے محکمے میں حاضر ہوتا تھا آپ کے سامنے ایک دریچہ تھا کہ اس سے میں تو آپ کو دیکھ سکتا تھا لیکن آپ مجھے نہیں دیکھتے۔وہاں بیٹھا ہوا میں آپ کا نظارہ کر رہا تھا۔خواجگان نقشبندیہ قدس اللہ ارواحہم کی نسبت میں آپ سے ذرا سی غفلت بھی میں نے نہ دیکھی کیونکہ آپ باطنی جمعیت اور اپنے طریقے کے ستر و اخفا میں بہت احتیاط رکھتے تھے۔نسبت باطنی کو عہدۂ قضا کے پردے میں

چھپاتے تھے۔آسانی سے کوئی چیز ان سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔بارہا فرمایا کرتے تھے کہ پوشیدگی نسبت کے لیے کوئی لباس علمی استفادے اور افادے کی صورت سے بہتر نہیں ہے۔انتہیٰ کلامہٗ۔ میرے والد شیخ احمد کے شناساؤں میں تھے۔شروع میں کبھی کبھی اُن کی خدمت میں جایا کرتے اور ان کے حسن اخلاق سے متاثر ہوکر خوش خوش واپس آیا کرتے اور فرماتے کہ انھوں نے اپنی درویشی کو تدریس اور لباس قضا میں خوب چھپا رکھا ہے۔مجھے اُن سے ملاقات کر کے بڑی مسرت اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ان کی وفات 1051ھ(1641) میں ہوئی۔

شیخ عبدالرحیم سنبھلی

شیخ مرتضیٰ سنبھلی کے بھانجے ہیں اور شیخ عبدالرحمٰن کے بھائی۔اس راہ درویشی میں سچے اور مضبوط ہیں۔انھیں خواجہ بیرنگ سے نسبت اویسی حاصل ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ''ایام شباب میں میرے دل و دماغ میں ایک شوق و ولولہ پیدا ہوا کہ بنا بتائے گھر سے نکل پڑا اور دیوانہ وار دہلی آ پہنچا اور خواجہ بیرنگ کے آستانہ مقدسہ میں اقامت پذیر ہوگیا۔وہاں ایک خادم تھا وہ روزانہ میرے لیے دو نان لایا کرتا۔میں ان میں سے ایک لے لیتا اور کھا کر روزانہ کوہ و صحرا کو نکل جاتا اور مستانہ وار گھومتا پھرتا تھا اور رات کو خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی قبر کے پائیں سر گریبان میں ڈال کر صورت مراقبہ میں بیٹھا کرتا۔ایک دن میں ایسے ہی مراقب تھا کہ واقعۂ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ مشائخ کبار کا ایک مجمع خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی قبر کے گرداگرد مراقب بیٹھا ہوا ہے۔آپ ہاتھ میں ایک لکڑی لیے ہوئے خوش خوش گرداگرد گھوم رہے ہیں۔میرے پاس پہنچے اور اپنے دست مبارک سے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھایا اور اس جماعت کے برابر لا بٹھایا۔اسی لمحہ ذکر اسم ذات میرے دل میں آ گیا اور میں نے خوب دل سے ذکر شروع کر دیا۔جب مجھے غیبت سے افاقہ ہوا تو میرا دل دائمی طور پر ذاکر بن چکا تھا اور جمعیت قلب حاصل ہو چکی تھی۔جب میں سنبھل آیا تو ساری سرگذشت شیخ مرتضیٰ اور شیخ عبدالرحمٰن کو سنائی تو انھوں نے فرمایا کہ اب تجھے دوسروں کی تلقین کی ضرورت نہیں رہی۔''نفحات الانس'' کے مقدمے میں ہے کہ شیخ طریقت شیخ فریدالدین عطار قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اولیاء اللہ کا ایک گروہ ہوتا ہے کہ انھیں مشائخ طریقت اور کبرائے حقیقت اویسی کہتے ہیں۔

انھیں بظاہر پیر کی کوئی احتیاج نہیں ہوتی کیونکہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنی عنایت میں پرورش کرتے ہیں۔ بغیر کسی کے واسطے کے جیسا کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی، کی ہے۔ یہ مقام عظیم ہے اور بہت عالی کسی خوش قسمت کو ہی یہ دولت ملتی ہے۔ ''ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء'' اسی طرح بعض اولیاء اللہ بھی جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہیں روحانی طور پر بغیر اس کے کہ کوئی ظاہری پیر ہو تربیت کیے جاتے ہیں۔ یہ جماعت بھی داخل اولیاء ہے۔ انتہیٰ۔ پوشیدہ نہ رہے کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں جیسا کہ ظاہر ہے دو بزرگ اویسی نسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تربیت بزرگوں کی ارواح نے کی ہے۔ یہ روحانی تربیت بھی باطنی تربیت ظاہری جیسی ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ کے رسالے ''قدسیہ'' میں لکھا ہے کہ شیخ ابوالحسن خرقانی کی تربیت روحانی طور پر سلطان العارفین شیخ ابویزید بسطامی کے زیر تصرف ہوئی اور سلوک میں شیخ ابویزید بسطامی کی ترتیب امام جعفر صادق کی روح مبارک سے ہے۔ نقل صحیح سے ثابت ہے کہ شیخ ابوالحسن کی ولادت شیخ ابویزید کی وفات کے مدتوں بعد ہوئی ہے اور شیخ ابویزید کی ولادت امام جعفر صادق کی وفات کے بعد۔ انتہیٰ۔

شیخ عبدالرحیم کو میرے شیخ سے ایک خاص خلوص و محبت ہے۔ میرے شیخ ان کو اچھوں میں گنتے ہیں اور ان پر بہت لطف و عنایت رکھتے ہیں۔ اگر چہ وہ اَن پڑھ ہیں مگر اس راہ درویشی کی صاف ستھری باتیں کرتے ہیں اور خوب سمجھتے بھی ہیں۔ کلام مجید کی (زبانی) تلاوت اپنی فہم (طاقت) کی بقدر کرتے ہیں۔ مستقیم المعاملات اور بلند فتوت ہیں۔ میں ان کا گہرا دوست ہوں۔ ظاہر و باطن میں مجھے ان سے (یکسانیت اور) اتفاق مزاج ہے۔ جب تک میں لشکری تھا وہ بھی رہے۔ جب میں نے لشکر کی نوکری ترک کی انھوں نے بھی چھوڑ دی۔ وہ مجھ سے کہا کرتے ہیں ''میں تجھے بھائی سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔'' میں بھی انھیں ایسا ہی جانتا ہوں اور ایسا ہی کہتا ہوں۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک صحرائے عظیم ہے ایک طرف سے ایک بہت بڑا لشکر مع بادشاہ آ رہا ہے۔ اور جنگی ساز و سامان بھی ساتھ ہے کہہ رہے ہیں کہ بادشاہ سلامت آ رہے ہیں۔ مجھ سے کہا گیا یہ بادشاہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میں حد درجہ شوق میں دوڑا اور اپنا سر آنحضرت (ﷺ) کے مبارک قدموں میں رکھ دیا۔ آنحضرت نے

اپنے دست مبارک سے میرا سر اُٹھایا۔ آپ کی ریش مبارک بھی سفید تھی گھوڑا بھی سفید تھا اور لباس بھی سفید تھا۔ ان کا ہی فرمانا ہے کہ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک نہایت بلند و بالا جگہ پر پہنچا ہوں۔ اس جگہ اپنے بھائی شیخ عبدالرحمٰن کو پایا جب میں نے اس جگہ سے اور اوپر جانا چاہا بھائی نے کہا۔ بس کیجیے۔ ان کا ہی قول ہے کہ ایک دن میں نے واقعے میں دیکھا کہ غیب سے ایک آدمی ظاہر ہوا اور میرے سینے میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا۔ اس کے بعد سے اپنے دل میں نئی ہی صفائی پاتا ہوں۔ ان کا ہی ملفوظ ہے کہ میرا ایک سمجھدار دوست تھا ایک رات خواب میں میں نے اس کو کھانے کے ترنوالے پیٹ بھر کر کھلائے۔ صبح کو جب وہ آیا تو کہنے لگا کہ آج رات تم نے مجھے نہایت لذیذ و مرغوب کھانا اپنے ہاتھ سے کھلایا ہے۔ انھیں کا بیان ہے کہ میرے نانا شیخ مصطفیٰ کے والد شیخ جمال کا ایک جوگی شناسا تھا۔ دونوں میں باہم صحبتیں اور خلوتیں رہتی تھیں۔ ایک دن وہ جوگی ان کے پاس آیا اور اس وقت وہ اندر سے حجرہ بند کیے ہوئے مشغول (بذکراللہ) بیٹھے تھے۔ اس نے کہا۔ دروازہ کھولیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ اس وقت فرصت نہیں ہے پھر آنا جوگی بولا اگر تم نہیں کھولتے تو میں ہی اندر آئے جاتا ہوں۔ کہا۔ آجا۔ وہ جوگی دروازہ بند ہوتے ہوئے بھی اندر آ گیا اور تکبر کے ساتھ بولا۔ اگر تم چاہو تو اس سے بھی اچھا تماشا دکھاؤں۔ کہا۔ دکھا۔ جوگی نے ایک عمل کیا اور خود کو ایک بھیانک شیر کی صورت میں تبدیل کر کے اٹھا اور ان پر حملہ کر دیا۔ وہ بہت طاقتور تھے مردانہ وار اس کا گلا پکڑا اور اپنے نیچے دبا کر قید کر لیا۔ شیر نے عاجز آ کر امان چاہی۔ جب انھوں نے چھوڑ دیا تو جوگی نے اپنی اصلی صورت میں آ کر کہا تم نے تو مجھے مار ہی ڈالا تھا۔ کہا "میں نے تجھے کہاں مارا میں تو شیر کو مار رہا تھا۔" جوگی کے دل میں کینہ آ گیا اور بولا۔ چلو جنگل میں اس سے بہتر تماشا دیکھو۔ پھر دونوں جنگل میں پہنچے۔ جوگی نے ایک رسی ان کے ہاتھ میں دی کہ اسے مضبوطی سے پکڑے رہو اور خود اٹیا کو کھینچتا ہوا ایک طرف چلا گیا یہاں تک کہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔ انھوں نے رسی کا سرا ایک درخت میں لپیٹ دیا اور الگ بیٹھ گئے اور دیکھتے رہے۔ دیکھا کہ آگ کا ایک بگولہ اس رسی پر دوڑا آتا ہے اور قہر کے ساتھ اُس درخت پر آ کر لگا اور درخت کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور پھر اسی رسی پر اسی راہ چلا گیا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے چلے دیکھا کہ جوگی کے بند بند الگ الگ ہو کر جا بجا پڑے ہیں۔ وہ بغیر دہشت کے آگے گئے اور جو چیزیں جوگی کی جھولی میں

تھیں، لے لیں اور گھر واپس آ گئے۔ اس سامان میں سے ایک آئینہ بھی تھا کہ اس کے دیکھنے سے لقوے کا مرض چلا جاتا تھا۔ انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ اس آئینے کو میں نے بھی دیکھا تھا اپنے ماموں شیخ مرتضیٰ کے پاس۔

شیخ مقیم لاہوری

شیخ احمد سرہندی کے مرید ہیں۔ شروع میں میں نے لاہور میں انھیں لشکریوں کی جماعت میں دیکھا تھا، اس وقت میں بھی لشکری تھا۔ ملاقات کے وقت ان سے لشکریانہ ہی سلوک کرتا تھا اس لیے کہ ان کے طریقے اور احوال باطنی سے غافل تھا۔ لیکن جب ایک لمبی مدت تک صحبتیں رہیں تو ایک دن انھوں نے مجھ سے میرے شیخ کا نام پوچھا تو میں نے بھی اُن سے اُن کے شیخ کو پوچھا کہ کیا میرے شیخ ہی تمھارے بھی شیخ ہیں یعنی خواجہ خرد تو انھوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔ اس وقت ان کی نسبت باطنی کی کہ نہایت ستر واخفا میں رکھتے تھے کچھ جھلک جو اس وقت محسوس ہوئی تھی اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ یعنی نسبتِ (نقشبندیہ) خواجگان و بزرگان (قدس اللہ سرہما) جو کہ حد درجہ لطیف اور پوشیدہ ہے جس کا میرے شیخ خواجہ خرد کے ذکر میں بھی اشارہ گزرا ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ کسی بھی شخص کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے سب کے ساتھ حسن ظن رکھنا چاہیے۔

خاکساران جہان را بحقارت منگر　　تو چہ دانی کہ درین گرد سوارے باشد [1]

''رشحات'' میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اوائل حال میں میرے والد کی کلس میں کھیتی باڑی تھی۔ انھوں نے ایک صحرائی ترک کے ہاتھ میرے پاس غلّہ بھیجا کہ اس کو لے لوں اور کوٹھری میں جمع کر لوں۔ میں غلّہ لینے میں مشغول تھا کہ وہ ترک اپنی بوریاں لے کر چلا گیا۔ جب مجھے پتا چلا تو وہ جا چکا تھا۔ میرے دل میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی کہ میں نے اس سے دعا کی درخواست کیوں نہ کی اور نیاز مندی سے کیوں نہ پیش آیا اس غلطی سے اپنے اندر ایک عجیب قسم کا غم محسوس کیا غلے کو ویسے ہی چھوڑا اور میں جلدی سے اس کے پیچھے دوڑا۔ اور اس کو شہر سے آدھی راہ

1　دنیا کے خاکساروں (فقرا و مساکین) کو حقارت کی نظر سے مت دیکھ تو کیا جانے کہ اس گرد میں کوئی سوار (صاحب باطن) ہو۔

میں جا کر پالیا۔ سرراہ نیاز و تضرع سے اس کا دامن پکڑ لیا اور اس سے درخواست کی کہ میرے حال پر توجہ فرمائیں اور میرے معاملے پر نظر ڈالیں ہو سکتا ہے آپ کی برکت سے حق سبحانہٗ مجھ پر رحم فرمائیں اور میری گرہ بستہ کو کھول دیں۔ وہ صحرائی ترک متعجب اور متحیر ہو کر بولا ''غالباً آپ ترک مشائخ کے قول پر عمل کرتے ہیں۔

ہر کیم کور سانک خضر بیل وہر تون کور سانک قدر بیل [1]

ورنہ میں تو نہایت بے کار جنگلی ترک ہوں اپنا منہ بھی ضرور نا دھوتا ہوں مجھے اس بات کی جس کا آپ مجھ سے مطالبہ کرتے ہو کیا خبر۔ میرے عجز و نیاز سے اس ترک صحرائی میں ایک اثر اور کیفیت پیدا ہو گئی اور اس نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے اور میرے لیے چند دعائیں کیں۔ اس ترک کی دعاؤں سے میں نے اپنے باطن میں بہت کشادگی محسوس کی۔ (انتہیٰ) ''رشحات'' ہی میں ہے کہ مولوی جامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ تمام (مخلوق خدا) وہ گدا ہو یا سپاہی سب پر شفقت و رحمت کی نظر رکھنی چاہیے۔ نیک ہو یا بد کسی سے اپنا کھانا اٹھا کر نہ رکھنا چاہیے۔ نظر اس پر رکھنی چاہیے کہ ان کا خالق کون ہے۔ کسی جنید یا کسی شبلیؒ وقت کو اس کی حاجت نہیں کہ لوگ ان پر احسان کریں۔ کوئی عالی ہمت اور کوئی پرہیز گار اس کے دروازے پر بھیک مانگنے نہ آئے گا۔ اسے کہاں سے پتا لگ گیا کہ اس گدڑی اور موٹے لباس میں کوئی صاحب دولت نہیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ اولیاء حق سبحانہٗ اپنے حال کا اِخفا بے سرو سامانی کی حالت میں کرتے ہیں۔ (انتہیٰ) میں نے ایک بزرگ سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ شیخ سلیم چشتی کے دوستوں میں سے ایک درویش ایک بار ایک مطربہ پر عاشق ہو گئے اور محبت حد سے گزر گئی چند دن کے بعد ایک امیر شخص اس مطربہ کو لے کر بنگال چلا گیا۔ ان درویش نے غایت قلق و اضطراب سے مجبور ہو کر حضرت شیخ سلیم چشتی سے جا کر حقیقت حال عرض کی۔ شیخ نے کہا کہ جوتے گانٹھنے والا جو بادشاہ کے لشکر گاہ میں بیٹھا ہے وہاں جا اور اس سے رجوع کر۔ جب اس کے پاس پہنچا اوّل اس نے انکار کیا اور توجہ نہ کی۔ آخر جب جانا کہ کہاں سے آیا ہے تو اس کے کان میں کہا جا فلاں سرگین گر سے رجوع کر۔ جب پہنچا دیکھا کہ وہ آدھی دمڑی کے لیے ایک

1 تو جسے بھی دیکھے اس کو خضر سمجھ اور جو کچھ تجھ پر آ کر پڑے تقدیر سمجھ۔

آدمی سے لڑ رہے ہیں۔ حیران ہوا۔ آخر حقیقتِ حال عرض کی انھوں نے کہا۔ اے درویش میری آدھی دمڑی کے لیے جنگ جو کہ میرا حق ہے اس لیے ہے کہ اس رقم سے میں مسجد کا چراغ روشن کرتا ہوں۔ اس کے بعد ایک کاغذ پر نقش بنا کر اس کے سپرد کیا کہ فلاں جگہ جا کر کھڑا ہو جا اور اس کاغذ کو فلاں جانب دکھا۔ اس نے جا کر ویسا ہی کیا۔ فوراً جنوں کا بادشاہ کروفر کے ساتھ جیسا کہ مشہور ہے تخت پر بیٹھا حاضر ہوا اور پوچھا کہ کیا چاہتا ہے اس نے کہا فلاں مطربہ کو چاہتا ہوں۔ اس نے ایک جن کو حکم دیا۔ اس نے ایک ساعت میں اس مطربہ کو حاضر کر دیا اور جنوں کے بادشاہ نے اس کو اس درویش کے حوالے کر دیا۔ اس کی مراد پوری ہوگئی۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

محمد مقیم انصاری سنبھلی

ایک قرن سے بھی زیادہ ہوا کہ وہ پائے ہمت کو دامان قناعت میں سمیٹے اپنی خانقاہ میں خوش زندگی گزارتے ہیں۔ معاملت میں مستقیم الحال، اخلاق میں یگانہ اور اس کار درویشی میں راسخ ہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ میں مدتوں ایک صاحب معنیٰ مجذوب شاہ برجندی کی صحبت میں رہا ہوں اور بہرہ ور ہوا ہوں۔ ایک دن ان مجذوب نے میری نسبت فرمایا کہ لوگ تو قسم قسم کے کھانے کھاتے ہیں مگر وہ خون جگر کھاتا ہے۔ ان کی یہ بات میرے دل میں جم گئی اور میرے لیے بہت کارگر ثابت ہوئی۔ ان کا ہی فرمانا ہے۔ ایک دن ان مجذوب نے مجھ سے فرمایا کہ پانی کم پیا کر۔ میں نے مدتوں بالکل ہی پانی نہ پیا۔ انھیں کے اشارے سے میں صوم دہر رکھتا اور سخت ریاضتیں کرتا تھا۔ ان کی میرے حال پر بہت لطف و مہربانی ہے۔ اکثر اچھی ملاقاتیں رہتی ہیں۔ آج شہر میں وہی ایسے ہیں جو لباس ظاہری اور رنگ عوام میں اپنی حالت چھپائے ہوئے ہیں۔ ظاہر میں لوگ انھیں اپنے جیسا ہی خیال کرتے ہیں اور ان کی طرف برائے حصول (فیض روحانی) منہ بھی نہیں کرتے۔ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ اپنی تنگدستی، فقر و فاقے کو مخلوق کی نظر سے پوشیدہ رکھو اور خود کو تر و تازہ اور تندرست آدمی ظاہر کیا کرو۔ اور ہر نعمت پر اللہ سبحانہ کا شکر بجالایا کرو اور ہر بلا پر صبر کیا کرو۔ حدیث قدسی ہے کہ ''**من لم یشکر علی نعمائی ولم یصبر علی**

البلائی فیطلب رباً سوائی [1]'' بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اپنی مراد کو چھوڑنا اور حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی مرضی پر کاربند رہنا بہت دشوار کام ہے۔ مرید وہی ہے جو تمام مرادوں سے مایوس ہوجائے۔ قطعہ

ایوانِ مراد بس بلند است کاں جا بہوس رسیدن نتوان
این شربتِ عاشقیست خسرو جز خون جگر چشیدن نتوان [2]

میرے شیخ نے اوائل حال میں نامرادی اور نومیدی کی صفت میں یہ شعر کہا تھا

بجز دریاے نومیدی ندارد گوہر وصلش تو خواہی در بیابان گرد و خواہی در چمن بنشین [3]

نوٹ: ''اسراریہ'' پوری ہونے کے بعد ماہ جمادی الآخر 1071ھ (20 رجنوری 1661) میں آپ نے دنیا سے کوچ کیا۔

شیخ عبدالواجد سنبھلی

شیخ عبدالواحد سنبھلی کے مرید ہیں۔ ایک بار، ان کے شیخ نے فرمایا تھا ''عبدالواجد، عبدالواحد ہے۔'' صاحب ذوق ووجد وسماع تھے۔ بس ذرا سے نغمے سے بے قابو ہو جاتے تھے۔ ان کے سماع میں بہت تاثیر تھی۔ لمبی عمر ہوئی۔ میں نے بھی ان کو دیکھا ہے۔ مرتاض بزرگ آدمی تھے۔ ان کے سماع کا صدق اور سچائی بالکل کھلی تھی۔ (شیخ) محمد مقیم انصاری کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی قبر کھود لی تھی۔ ایک دن اس قبر میں داخل ہوئے اور مردوں کی طرح لمبے لیٹ گئے اور ایک ساعت خاموش رہے آرام کیا اور پھر شوق میں بھرے باہر آئے۔ جو لوگ ان کے منتظر تھے ان سے فرمایا۔ میری منزل و ماویٰ اور خوابگاہ روح آسا یہ گھر ہے، یہی ویرانہ ہے۔ مصرعہ

---

1 جو میری نعمتوں پر شکر نہیں کرتا اور میری بھیجی ہوئی بلا پر صبر نہیں کرتا وہ میرے سوا دوسرا رب ڈھونڈھ لے۔

2 مقام مراد بہت بلندی پر ہے وہاں ہوس سے نہیں پہنچا جا سکتا۔ خسرو یہ تو شربت عاشقی ہے جو بغیر خون جگر پئے نہیں چکھا جا سکتا۔

3 وصل کا گوہر دریائے مایوسی میں ڈوبے بغیر نہیں نکالا جا سکتا۔ چاہے تو بیابانوں کے چکر کاٹتا پھر، چاہیں چمن میں جا بیٹھ۔

"عاقبت منزل ما وادئ خاموشانست [1]"

حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب سے فرمایا کرتے۔"کن فی الدنیا کانک غریبٌ او کعابری سبیلٍ و عدنفسک من اصحاب القبور [2] "تمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عقیدہ اور عمل تھا۔ شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی جو مشائخ کبار میں ہیں اور شیخ محمد محسن کے مرید ہیں اور روحانیت حضرت غوث اعظم سے بے واسطہ مستفید ہوئے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک سید کو ایک امیر نے گرفتار کر رکھا تھا۔ شیخ نے جب اس کو دیکھا تو اس کی ضمانت لے لی اور اس سے کہا کہ شہر سے باہر چلا جا۔ کہ میں بجائے تیرے قید ہو جاؤں گا۔ اس طرح قید میں ان کے سر بہت سی محنتیں آ پڑیں۔ سب کو برداشت کرتے رہے اور اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا۔ آخر میں بادشاہ عادل جنت آشیانی (جلال الدین محمد اکبر) کے عہد میں 949ھ (1543) میں دنیا سے چل دیے۔ وہ اپنے مریدوں کو قبر کا مراقبہ کرنے کا حکم دیتے تھے۔ اس طرح کہ اوّل سے آخر تک اس کا سررشتہ نہ ٹوٹے۔ محمد مقیم انصاری فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالواجد کی آخری بیماری میں جبکہ وہ حالت احتضار میں تھے، میں پہنچا تو مجھ سے کہنے لگے "ہم کنارے لگ گئے۔" میں نے کہا۔ آخر جانا تو ہے ہی لیکن چند دن اور دنیا میں رہیں اور یادِ الٰہی میں گزاریں۔ لیکن 1060ھ (1650) میں اسی بیماری میں چل بسے۔ ان کی قبر بھی وہیں سنبھل میں ہے۔ محمد مراد جو کہ ان کے اقربا میں ہیں کہتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد میں نے اُن کو خواب میں دیکھا۔ اتنا چمکتا ہوا چہرہ کہ میں نظر نہ ملا سکا۔ میں نے معلوم کیا کہ اے شیخ آپ پر کیا حال گزرا؟ کہا۔ کیا حال گزرتا ایک مکان سے اٹھا اور دوسرے مکان میں آ کر بیٹھ گیا۔ آج ان کے کالے خاں نام کے ایک پسر ہیں جو عقلائے مجانین میں سے ہیں۔ پیوستہ متحیر اور خاموش رہتے ہیں۔ انھیں نہ تو باہوش کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی بے ہوش۔ نہ عاقل ہی کہہ سکتے ہیں نہ دیوانہ۔ میں نے بارہا ان کو نماز میں بھی دیکھا ہے۔ اسی طرز اور اسی حالت میں ایک بار وہ مجلس سماع میں حاضر ہوئے۔ ایک لڑکے کے ہمراہ مجالس اعراس میں بھی حاضر ہوتے ہیں اور ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ کیونکہ

---

1 آخر کار ہماری منزل وادئ خاموشیاں (قبرستان) ہے۔

2 دنیا میں ایسے رہ جیسے کوئی اجنبی پردیسی ہو یا جیسے کوئی راہ چلتا مسافر اور اپنے آپ کو مردوں میں گن (زندوں میں مت سمجھ)۔

میں بھی مجلس میں نہیں بیٹھتا ہوں اور ایک طرف رہتا ہوں وہ وہاں آتے اور ذوق وشوق میں ہوتے جو چیز بھی ان کو پیش کرتا لیتے اور مسکرانے لگتے۔ ان کے دل میں میرے لیے بے قیل وقال، بغیر کسی ایما اور اشارے کے توسط کے ایک نرم گوشہ ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنے گھر میں بھی کسی سے بات نہیں کرتے۔ انھیں بس اتنا ہی شعور ہے کہ گھر سے نکل کر کسی کو اشارہ کر کے ہاتھ پکڑ کر بازار میں تمباکو فروش کی دکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ چلم بھر کر دیتا ہے بیٹھ جاتے ہیں اور ذوق سے پیتے ہیں پھر وہاں سے اٹھ کر چل دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی جگہ کوئی کاروبار ان کا نہیں ہے۔ بس کاروبار ہے تو یہی ہے۔ حکیم نورالدین جو کہ میرے شیخ کے نیازمندوں سے ہیں، صاحب سخن ہیں۔ میرے آشناؤں میں سے ہیں۔ ان کی ایک رباعی ان کی اس حالت پر سچی اترتی ہے۔

تنباکوے ما خلوت پاسِ نفس است　　از دست بدہ اگر ترا دسترس است
گفتیم رمزے اگر توانی فہمید　　در خانہ اگر کس است یکحرف بس است [1]

حکیم نے یہ رباعی استادِ فن کی اِس رباعی کے تتبع میں کہی ہے

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است　　تعلیم کن کز ترا دسترس است
گفتم الف "گفت" دگر "گفتم "ہیچ"　　در خانہ اگر کس است یکحرف بس است [2]

ایک بار میں نے بھی اس رباعی کے آخری مصرعے سے متفق ایک رباعی کہی تھی جو میرے شیخ کی پسندیدہ ہے۔

آنکس کہ بعشق دوست گم گشت کس است　　و ان کس کہ بگفت یافتم بوالہوست
بہتر کہ ازین گفت و شنو در گذرم　　نایافت او یافتم این یافت بس است [3]

1　ہمارا (تمباکو) خمار تو پاس انفاس کی خلوت ہے۔ اگر تجھے دسترس ہو تو ہاتھ سے دے دے۔ میں ایک رمز کہتا ہوں بشرطیکہ تو سمجھدار ہو۔ اگر ایک بھی سمجھدار خانہ مجلس میں ہو تو اس کے لیے ایک جملہ ہی کافی ہے۔

2　دل نے مجھ سے کہا کہ میں علم لدنی کی تمنا رکھتا ہوں اگر تجھے دسترس ہو تو مجھے تعلیم کر۔ میں نے کہا الف۔ بولا 'آگے دوسرا حرف۔ کہا" کچھ نہیں" اگر ایک سمجھدار بھی گھر میں ہے تو اس کے لیے ایک بات ہی کافی ہے۔

3　جو دوست کے عشق میں گم ہو گیا وہ واقعی آدمی ہے اور جس نے کہا کہ میں نے دوست کو پالیا، وہ بوالہوس ہے، جھوٹا ہے۔ یہی بہتر ہے کہ اس گفت وشنید سے گزر جاؤں۔ اس کا نہ ملنا ہی ملنا ہے یہی یافت کی انتہا ہے۔

اسراریہ کی تکمیل کے بعد کالے خاں بیمار ہو گئے۔ احتضار کے وقت میں نے ان سے دریافت کیا "اس نسبت سے آگاہی ہے جو آپ رکھتے ہیں؟" سر سے اشارہ کیا کہ ہاں آگاہ ہوں۔ اس کے بعد کہا۔ میرے سامنے سے یکسو ہو جائیں اور دروازہ کھول دیں کہ وہ آرہے ہیں یعنی فرشتے۔ پھر بشاشت اور خوش وقتی کے حال میں آخر ماہ ذی الحجہ 1071ھ (اگست 1661) میں دنیا سے چلے گئے۔

شیخ عبداللطیف سنبھلی

وہ شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی کے پوتے ہیں۔ روشن چہرے والے صاحب اخلاق۔ میں نے اپنے بچپن میں ان کو دیکھا ہے اپنے والد شیخ حسن سے نسبت کو درست کرتے ہیں اور وہ اپنے والد شیخ فتح اللہ ترین سے اور وہ شیخ سلیم چشتی سے جو کہ مشائخ کبار میں سے ہیں اور بڑے اہل ہدایت وارشاد، صاحب احوال ومقامات وکرامات بزرگ تھے۔ روایت ہے کہ شیخ فتح اللہ کی راہ درویشی اور توبہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ انھوں نے ایک رات کو خواب دیکھا کہ قیامت قائم ہو گئی ہے اور حشر برپا ہے۔ (فرشتے) جو بہشت کے لائق ہے اسے اس طرف لے جا رہے ہیں اور جو سزاوار دوزخ ہے اسے اس طرف کھینچا جا رہا ہے۔ آخر خود انھیں بھی دوزخ کی جانب کھینچنے لگے۔ بہت الحاح وزاری کر رہے ہیں اور اس گرفتاری میں عجز، خاکساری اور درماندگی، مختلف قسم کی معذرتیں دکھا رہے ہیں۔ اسی اثنا میں آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہوئے اور اپنے حال پر متنبہ ہو کر ظاہری قید یعنی گرفتاریٔ دنیا سے خود کو آزاد کر لیا۔ چونکہ اُن ہی ایام میں شیخ سلیم چشتی مکہ معظمہ سے آکر سیکری کی پہاڑیوں میں سکونت پذیر ہوئے تھے اور ارشاد طالبان الٰہی میں مشغول اور متوجہ تھے۔ آپ نے بھی خود کو ان کی خدمت میں پہنچا دیا اور ایسی شدید ریاضتیں اور مجاہدے جو کہ کسی عام انسان کی قوت سے بھی باہر ہوں اختیار کر لیے اور خواجہ حافظ شیرازی کے اس شعر کا مضمون اچھی طرح دل میں جما لیا۔

دست از طلب ندارم تا کام من برآید ۔۔۔ یا جان رسد بجانا یا جان ز تن برآید[1]

شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی فرماتے ہیں کہ ایک رات میں خانقاہ کے صحن میں بیٹھا تھا اور سب لوگ سوئے

---

1 جب تک میرا کام نہیں ہو جاتا میں دست طلب باز نہ کروں گا۔ اب یا تو میری جان ہی جائے گی یا وصل جاناں ہی میسر ہوگا۔

ہوئے تھے۔ ناگاہ ایک شخص سفید لباس میں میرے روبرو آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دریافت کیا آپ کون؟ جواب نہ دیا۔ میں نے جب دوبارہ پوچھا تو اپنے آپ بہت لمبا ہوتا چلا گیا اور بہت ڈراؤنا لگنے لگا۔ میں اُٹھا تا کہ اُسے پتھر ماروں وہ بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا مگر میں اس تک نہ پہنچ سکا کہ وہ بہت تیز جارہا تھا یہاں تک باہر بادشاہ کی باؤلی (تالاب خرد) میں جا پہنچا۔ اس باؤلی کے گرد وپیش میں بہت بڑا جنگل تھا اور جنگلی جانور اور درندے وہاں رہتے تھے کہ دن میں بھی کوئی وہاں نہیں جا سکتا تھا۔ میں اس شب تاریک میں بھی بے محابا اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا اور اس باؤلی میں جا داخل ہوا۔ بہت گہری تھی۔ اس کے پانی پر بھی کائی جمی تھی۔ کانٹے اور پتھر اس میں پڑے تھے۔ ایک بار غوطہ لگا کر میں نے اس کی تلی میں تلاش کیا۔ علاوہ سنگ وخار کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ نکل کر اس کے پشتے کی پیڑیوں پر کھڑا ہو گیا۔ پھر دل میں آیا کہ ایک مرتبہ اور جستجو کروں تا کہ حقیقت حال معلوم ہو جائے۔ اُترا اور تہہ تک پہنچ کر ادھر ادھر تمام میں گھوما پھرا کہ پانی بھی گادلا ہو گیا مگر علاوہ پتھروں، کانٹوں کے اور چند ہڈیوں کے کچھ میرے ہاتھ نہ لگا آخر باہر نکل آیا۔ انھیں کا فرمانا ہے کہ مجھے کچھ وقت کے لیے ایک قحبہ سے عشق مجازی ہو گیا تھا۔ وہ باوری قصبے میں اور میں اس سے چودہ پندرہ میل کے فاصلے پر فتح پور میں رہتا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر بلا کسی کو بتائے تنہا خانقاہ سے نکل وہاں کا قصد کرتا اور اس کے مکان پہنچ کر نظارہ کر کے لوٹ آتا اور نماز صبح شیخ کی مسجد میں ادا کرتا اور کسی کو اس کی خبر نہ لگتی۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں آخری رات میں حوض پر گیا۔ چاند ڈوبنے کے قریب تھا، پانی میں چمک رہا تھا مجھے اچھا لگا۔ حوض کے کنارے ایک پتھر تھا اس پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران ایک شیر آیا اور میرے نزدیک آ کر کتے کی طرح پانی پینے لگا۔ اس کی آنکھیں میرے مقابل چمک رہی تھی۔ مجھے اچھا لگا، بغیر کسی ڈر جھجک کے اس کے سر اور کانوں پر میں نے ہاتھ پھیرا وہ اپنے کان جھاڑتا ہوا جنگل کی طرف چلا گیا۔ انھیں کا مقولہ ہے کہ ایک بار غلبات شوق میں اپنے شیخ سے اجازت لے کر سر میں سودائے عشق و آزادگی لیے چلتے چلتے جھنجھانہ شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی کے پاس پہنچ گیا اور عرض کیا اے شیخ اگر آپ میری کارکشاد کر سکیں تو میں ٹھہروں۔ انھوں نے فرمایا۔ تین دن کے بعد تجھے جواب دوں گا۔ تین دن کے بعد جواب دیا۔ واپس سلیم چشتی کے پاس فتح پور جا، وہیں تیرا کام پورا ہوگا۔ لوٹ کر وہیں پہنچا اور میرا کام تمام ہو گیا۔ شیخ سلیم چشتی کی وفات 29 رمضان المبارک 979ھ

(28 رجنوری 1572) میں اور شیخ فتح اللہ کی 28 رجمادی الثانی 978ھ (1571) میں، اور شیخ عبداللطیف کی 1020ھ (1612) میں ہوئی۔

شیخ نجم الدین سنبھلی

شیخ محمد مرشد جہاں بن شیخ کبیر کلّہ رواں کے اقربا اور مریدین میں سے ہیں اور (خود بھی) شیخ کبیر کلّہ رواں کی اولاد میں سے ہیں۔ بڑے بلند اخلاق غریب، شکستہ خاطر تھے۔ جب جہاں گیر بادشاہ نے اُن سے معلوم کیا کہ کلّہ رواں کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ کہا، جو کوئی بھی ان بزرگ کے پاس آتا کچھ نہ کچھ ضرور کھلاتے تھے اسی لیے انھیں کلّہ رواں کہتے ہیں۔ لوگ دوسری وجوہات بھی بیان کرتے ہیں مگر وہ درست نہیں۔ شیخ کبیر کلّہ رواں اپنے والد شیخ محمد کلّہ رواں کے صحبت یافتہ تھے اور بہت سے اکابر سے بہرہ ور تھے۔ صاحب احوال ومقامات، خوارق وکرامات تھے۔ ہمت بلند رکھتے تھے۔ وہ روزانہ صبح صادق میں روزے کی نیت کرتے اگر کوئی کھانے کی چیز لے آتا تو یہ نہیں کہتے تھے کہ میں روزے سے ہوں بلکہ کھالیتے۔ ایک دن ایک آدمی شام کے وقت کچھ لایا، انھوں نے بے تکلف لے کر کھا لیا۔ موحد اور عارف تھے اور شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی کے معاصرین میں سے تھے۔ وہ شیخ عبدالعزیز کا ابتدائی اور ان کا آخری دور تھا۔ شیخ عبدالعزیز نے اپنے رسالے ''عینیہ'' میں ان کے یہ دو شعر لکھے ہیں۔

ہیچ می دانی کہ چیزے چیستی یا کیستی	در ولت در یاب نیکو ہستی یا نیستی
آنکہ می بینی بصیر و انکہ ی شنود سمیع	آنکہ ی داند علیم و پس بگو تو کیستی [1]

شیخ نجم الدین باوجود شیخ اور شیخ زادہ ہونے کے کبھی بھی دائرۂ نیستی اور نامرادی سے باہر قدم نہ رکھتے تھے۔ ایک دن ایک شخص میرے شیخ کے پاس آیا اور یہ شعر پڑھا

رہ بے خودی چون راہے بدیار دوست دارد	بہ ہزار حیلہ خود را کنم آشنائے مستی [2]

1 تجھے کچھ خبر ہے کہ تو کیا ہے اور کون ہے؟ خوب اپنے دل میں غور کر، تو ہے بھی یا تو ہے ہی نہیں۔ دیکھنے والی ذات بصیر ہے۔ سننے والی سمیع ہے، جاننے والی علیم ہے پھر اب بتا تو کون ہے؟

2 چونکہ بے خودی کا راستہ دوست کے دیار کو جاتا ہے اس لیے میں ہزار بہانے حیلے کر کے خود کو بے خود و مست بناتا ہوں۔

(یہ سن کر) میرے شیخ نے فی البدیہہ یہ شعر کہا

قدمِ فرا ترک نہ، کہ بری بہ نیستی پے   چہ زنی چو خود پرستان ہمہ دم نوائے مستی[1]

میں نے شیخ نجم الدین کی بارہا زیارت کی ہے مجھ سے بہت لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے اور بزرگان دین کی حکایتیں سنایا کرتے تھے۔ شیخ کبیر کلہ رواں کی وفات 961ھ (1554) میں ہوئی، تاریخ وفات "مشتاق حق بود" ہے اور مرشد جہاں کی وفات 1000ھ (1592) میں اور شیخ نجم الدین کی 1040ھ (1631) میں اور قبر شیخ کبیر کلہ رواں کے روضے کے نزدیک ہے۔ اس وقت ان کے بیٹے شیخ فتح اللہ ان کے سجادہ نشین ہیں اور انھیں کے طریقے پر ہیں۔ نیک، صالح، صاحب معاملت۔

شیخ ابدال سنبھلی

وہ شیخ کبیر کلہ رواں کے بھائی شیخ جمال بن شیخ الہداد کی اولاد میں سے ہیں۔ اپنے والد شاہ معز الدین سے اپنی نسبت درست کرتے ہیں۔ صالح اور قاریٔ قرآن تھے۔ سفر و حضر میں تفسیر و حدیث کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان کے اوقات طاعت و عبادت اور اوراد سے معمور رہتے تھے۔ صلحا اور اتقیا سے صحبت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ کسی اور قسم کے لوگوں سے پیوستگی نہ تھی۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جس طرح صلحا کی صحبت میں قوی تاثیر ہے کہ بہت جلد ہمنشین کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اسی طرح بروں کی صحبت بھی اثر کرتی ہے۔ اسی لیے بزرگان سلف اس بات کی طالبان راہ کو تاکید فرماتے رہے ہیں۔ خواجہ علی رامتی جو کہ عزیزان سے معروف ہیں۔ سلسلۂ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس اللہ اسرارہم دو واسطوں سے ان تک پہنچتا ہے، آپ نے اپنی اس رباعی میں مریدین اور مخلصین سے فرمایا ہے

با ہر کہ نشستی و نشد جمع دلت   و ز تو نرمید رخت آب و گلت

از صحبتِ وے اگر تبرا نکنی   ہر گز نکنی روح عزیزان بحلت[2]

---

1 ایک قدم اس سے آگے بڑھ تا کہ نیستی کا سراغ پا جائے۔ یہ کیا کہ خود پرستوں کی طرح اپنی مستی (سے ہستی) کا دعویٰ کرتا ہے۔

2 تو جس کے پاس بیٹھا اگر تجھے جمعیت دل حاصل نہ ہوئی، اور تجھ سے تیری نفسانیت دور نہ ہوئی اگر تو نے اس کی صحبت سے بیزاری نہ دکھائی تو روح عزیزاں تجھے ہرگز معاف نہیں کرے گی۔

''نزہتہ الارواح'' سے میر حسینی کی یہ نصیحت دوسری جگہ بھی آئے گی اور یہاں بھی برمحل ہے

زِ من جانِ پدر این پند بپذیر　　بر و فتراک صاحب، دولتے گیر
کہ قطرہ تا صدف را در نیاید　　نگردد گوہر روشن نتابد
کہ سنگ از تربیت لعل است و یاقوت　　چنان اطلس شود از تربیت توت
اگر تاثیر صحبت نیست اے دون　　نیاید ہیچ مرغ از بیضہ بیرون
اساس کار وقتے محکم افتاد　　کہ موسیٰ خضر را می کرد اوستاد
چون ممکن نیست رفتن بے دلیلے　　بباید مصطفیٰ را جبرئیلے [1]

ایک دن میں بچپن میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ شیخ ابدال کی خدمت میں گیا۔ تفسیر ''حسینی'' دیکھ رہے تھے۔ مجھے پیار کیا اور فرمایا ''تیرے چہرے سے نور ظاہر ہوتا ہے۔'' کہتے ہیں کہ احتضار کے وقت ان پر بے خودی طاری ہوگئی حاضرین میں سے ایک صاحب بولے اے شیخ! اس وقت آپ غافلِ ذکر کیوں ہیں۔ انھوں نے مکمل شعور کے ساتھ آنکھ کھولی اور ہوش تمام سے اس شعر سے اُن کو جواب دیا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدہ عالم دوامِ ما [2]

ان کی وفات 1030ھ (1621) میں اور قبر شیخ کبیر کلّہ رواں کے روضے کے نزدیک ہے۔

1　اے جان پدر میری یہ نصیحت قبول کر۔ کسی صاحب دل کے دامن سے چمٹ جا۔ کہ قطرہ جب تک صدف کے اندر نہیں آتا ہے۔ چمکدار موتی بن کر نہیں چمکتا۔ پتھر تربیت سے لعل و یاقوت بن جاتا ہے۔ جیسا کہ توت تربیت سے اطلس بن جاتا ہے۔ اے کم ظرف اگر صحبت کی تاثیر نہ ہو تو کبھی کوئی مرغ انڈے سے باہر نہ نکلے۔ اساس کار اس وقت محکم ہوئی جب موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر کو استاد بنا لیا۔ جبکہ بغیر رہبر کے چلنا ممکن نہیں ہے اس لیے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے لیے جبرئیل علیہ السلام کی ضرورت پڑی۔

2　جس کا دل عشق الٰہی سے زندہ ہوجاتا ہے وہ ہرگز نہیں مرتا۔ جریدۂ عالم پر ہمارا (عشاق کا) دوام (ہمیشگی) ثابت ہے۔

شیخ منور سنبھلی

شروع میں اپنے والد شیخ منصور سے اپنی نسبت درست کی۔ آخر میں شیخ تاج الدین کی صحبت اختیار کی اور بہرہ وافر حاصل کیا۔ پُر ذوق ومحبت اور معاملات میں رسوخ رکھنے والے بزرگ تھے۔ اعلیٰ اخلاق کے مالک، نیک فتوت اور حسن صوری پر مائل تھے۔ مشائخ سلف کی یادگار تھے۔ کہتے ہیں کہ اُن کے دادا شیخ پنجو بہت بزرگ آدمی تھے۔ صاحب احوال صافیہ ومقامات عالیہ۔ علوم ظاہری و باطنی میں عبداللہ طلبنی[1] کے شاگرد تھے۔ بہت سالوں تک درس دیا۔ آخر عمر میں جذباتِ الٰہی کے جذبے نے ان کو پکڑ لیا۔ درس سے دل برداشتہ ہوکر، پُر مشقت ریاضتوں اور مجاہدوں میں لگ گئے۔ شیخ علاء الدین چشتی کی صحبت میں پہنچے اور مرزوق ہوئے۔ اس حالت جذبہ میں کبھی بھی ان کا سراوپر نہ اٹھا۔ محبت حق نے ان پر ایسا غلبہ پالیا تھا کہ جو بھی انھیں اس حال میں دیکھتا بے قابو ہوجاتا اور ان کی صحبت کی برکت سے اس پر بھی کیفیت بےخودی، طاری ہوجاتی۔ سرود سن کر وجد میں آجاتے اور مست ہوجاتے۔ شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری کی بھی خدمت میں رہے اور خوب صحبت اُٹھائی۔ ان کی بیٹی جب جستجوئے حق میں شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو (ان کی بلاتکلف اصلاح کی غرض سے) شیخ نے ان سے نکاح کرلیا۔ شیخ پنجو کی تاریخ وفات 17 محرم 969ھ (9 ستمبر 1562) ہے۔ روایت ہے سپہ سالار ہند بیرم خان خاناں نے جو کہ عالم وفاضل آدمی تھے ان کی تاریخ وفات کہی۔

محیط فضل و عرفان شیخ پنجو — کہ چون او رفت عالم گشتہ دل ریش
چو اُو درویش و دانشمند بودہ — شدہ تاریخ دانشمند درویش[2]

---

1 وحید العصر یکتائے زمانہ بے مثال عالم وفاضل حضرت شیخ عبداللہ طلبنی ابن شیخ الہ داد عثمانی ساکن طلبن از مضافات ملتان۔ آپ کی وفات 922ھ/1517 میں ہوئی۔ ''بدیع المیزان'' اور ''شرح میزان منطق'' ان کی یادگار تصانیف ہیں۔

2 فضل وعرفان کے جامع شیخ پنجو جب دنیا سے زخمی دل لے کر گئے تو چونکہ وہ ایک درویش اور عالم شخص تھے اس لیے ان کی تاریخ وفات ''دانشمند درویش'' ہوگئی۔

شیخ منور سے میری بہت ملاقات رہی ہے۔ان کے روشن چہرے پر کالی دستار بڑی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔"النور فی السواد" یعنی اندھیرے میں اجالا کے معنی کھلتے تھے۔مجھ پر بہت لطف فرماتے۔وہ اپنے آبائے کرام کی رسم دستار سیاہ اور باوقار لباس میں رہنے والے بڑے پُرشکوہ شیخ تھے۔ان کی وفات 1038ھ (1629) میں ہوئی ہے۔ان کی تاریخ وفات "تاریک شدزمانہ" ہے۔ان کی قبران کے والد اور دادا کی قبر کے نزدیک ہے۔

شیخ عبدالعظیم سنبھلی

وہ شیخ منور کے پسر اور شیخ تاج الدین کے داماد ہیں۔ بلند اخلاق اور بڑے مروّت رکھتے تھے۔ پسندیدہ وضع قطع والے تھے۔ایک رات کو شیخ فتح اللہ جن کا ذکر آگے آئے گا، میں اور دیگر دوست ان کی خدمت میں پہنچے۔ وہ نہایت اخلاص و مروت سے پیش آئے۔قوال کے لڑکے کو بلایا اور پُر لطف کھانا، پان اور خوشبو پیش کیے۔آخری شب تک بڑی روحانی مجلس برپا رہی۔وہ اور ہم سب ہم عمر نو جوان تھے۔ہم میں کا ایک قوال کے لڑکے کی محبت میں گرفتار تھا۔دونوں ہم مجلس تھے اور خواجہ شیراز کی اس غزل کے مفہوم کے مطابق سب کچھ حاضر تھا

عشق بازی و جوانی و شراب لعل فام	مجلس انس و حریف ہمدم و شرب مدام
ساقی شکر دہان و مطرب شیرین سخن	ہمنشین نیک کردار و رفیق نیک نام
شاہدے از لطف و پاکی، رشک آب زندگی	دلبرے در حسن و خوبی غیرت ماہ تمام
بزمگاہ دلنشین چون قصر فردوس برین	گلشنے پیرامنش چون روضۂ دارالسلام [1]
صف نشینان نیکخواہ بادب اہل شعور	دوستداران صاحب اسرار و ندیمان دوست کام

1 عشق بازی اور جوانی اور لعل جیسی شراب، محبت کی مجلس اور ہمہ وقتی دوست اور جام پر جام شیریں دہن ساقی اور شیریں کلام مطرب۔ نیک کردار ہم نشین اور نیک نام دوست۔ایسا معشوق جو لطافت اور پاکی میں آب حیات کے لیے باعث رشک ہو، ایسا دلبر جو حسن وخوبی میں چودھویں کے چاند کے لیے باعث غیرت ہو۔فردوس بریں کے محل کی طرح دل نشین بزم گاہ، ایسا گلشن جس کے چاروں طرف جنت جیسے باغیچے ہوں۔نیک خواہ صف نشین ہوں اور باادب خدمتگار ہوں، راز دار دوست ہوں اور مقصد کو دوست رکھنے والے ساتھی ہوں۔

بادۂ گلرنگ و تیز و تلخ و خوشخوار و سبک — نقلے از لال نگار و نقلی از یاقوت فام
غمزۂ ساقی بہ یغمائے خرد آختہ تیغ — زلف جانان از برائے صید دلہا گشتہ دام
نکتہ دان بذلہ گو چون حافظ شیرین سخن — بخشش آموز جہان افروز چون حاجی قوام
آنکہ این صحبت نجوید خرمی بروے تباہ — و انکہ این عشرت نخواہد زندگی بروے حرام [1]

شیخ مرتضیٰ سنبھلی کہتے ہیں کہ میں عبدالعظیم کے احتضار کے وقت حاضر تھا۔ وہ ابھی جوان المعر ہی تھا مگر عجیب حال رکھتا تھا۔ اسی حال میں دنیا سے 1040ھ (1631) میں چلا گیا۔ ان کے بیٹے شیخ عبدالاوّل جو کہ شیخ تاج الدین کے نواسے ہیں سجادہ نشین ہوئے۔ وہ ایک خوبصورت باحیا بامروّت، صالح اور صاحب فتوت جوان تھے اور اپنے آباواجداد کے طریقے پر جمے ہوئے تھے۔ ایک باران کو سفر حجاز کا داعیہ پیدا ہوا اور حرمین محترمین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ان کے نانا کے خلفا ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ جب واپس آئے کچھ دن بعد پھر حرمین پہنچے وہاں سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں چل بسے۔ 1068ھ (1658) میں (اسی لیے ان کی) قبر اورنگ آباد میں ہے۔

شیخ عیسیٰ سنبھلی

شیخ بایزید سنبھلی کے مرید اور صاحب ذوق وسماع تھے۔ بزرگی کے آثار اور برکات ان سے خوب ظاہر تھے۔ بہت سے مشائخ کی صحبت اُٹھائے ہوئے سن رسیدہ بزرگ تھے۔ شہر کے سب خرد وکلاں ان کی دعا اور ان کے اقوال سے برکت حاصل کرتے تھے اور وہ مکتب داری کی خدمت سے اپنی اور اپنے بچوں کی روزی چلاتے اور ہمیشہ گوشہ نشین رہتے تھے۔ جس وقت وہ سماع میں آتے تھے بے تعلقی اور بے تعینی کا جوش وخروش ان سے ظاہر ہوتا تھا چنانچہ تمام حاضرین میں ان کی حالت سرایت کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ شیخ فاضل کے پاس جن کا ذکر گزرا آتے اور رسائل ذوقیات ان کے سامنے

1 پھول کے رنگ کی شراب جو کڑوی اور شیریں خوشگوار اور ہلکی ہو، ایک نقل محبوب کے ہونٹ کا اور ایک نقل جام کے یاقوت کا۔ ساقی کی ادا عقل کی لوٹ مار کے لیے تلوار سوتے ہوئے ہو، دلبر کی زلف دلوں کو شکار کرنے کے لیے جال بچھائے ہو۔ نکتہ داں اور بذلہ گو شیریں سخن حافظ ہو۔ بخشش آموز اور جہاں کو روشن کرنے والا حاجی قوام جیسا میر مجلس ہو۔ جو شخص ایسی صحبت نہ چاہے اس کی خوشی بتاہ ہے، جو اس طرح کا عیش نہ چاہے اس پر زندگی حرام ہے۔

سناتے اور محظوظ ہوتے تھے۔ ایک دن مجھے یاد ہے کہ انھیں استاد شاعر کے اس شعر پہ ذوق آگیا

نام او را بگور خواہد (خواہم) برد   زانکہ او یار مہربان من است [1]

ایک دن میں ان کے مدرسے میں گیا۔ (دیکھا کہ) وہ سماع میں مشغول تھے ان کے تلامذہ میں سے ایک نے شیخ احمد جام کی یہ مکمل غزل تمام پڑھی، اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔

منزلِ عشق از مکانے دیگر است   مرد این رہ را نشانے دیگر است
کشتگانِ خنجر تسلیم را   ہر زمان از غیب جانے دیگر است
بر سر بازارِ صرافان عشق   زیر ہر دارے دو کانے دیگر است
دل چہ ی بندی درین فانی مقام   این جہان را ہم جہانے دیگر است
آن فقیرانے کہ این رہ ی روند   ہر یکے صاحب قِرانے دیگر است
عقل کے داند کہ این رمز ازکجاست   این حکایت را بیانے دیگر است
دل خورد زخمے ز دیدہ خون چکد   این چنین تیر از کمانے دیگر است
دوزخ اندر راہ مشتاقان او   پُر شرارے بوستانے دیگر است

احمد اما گم نگردی ہوش دار
کین جرس را کاروانے دیگر است [2]

---

1 میں اس کا نام قبر میں لے جاؤں گا۔ کیونکہ وہ میرا یار مہربان ہے۔

2 عشق کی منزل کا اور ہی مکان ہے اس راہ کے سالک کی اور ہی پہچان ہے۔ تسلیم و رضا کے خنجر کھائے ہوؤں کو تو غیب سے ہر لمحے اور ہی جان عطا ہوتی ہے۔ عشق الٰہی کے صرافوں کے بازار میں ہر گھر کے نیچے ایک اور ہی دکان کھلی ہوئی ہے یعنی ایک تو عشاق کا ظاہر ہے جو مسکراتا رہتا ہے اور باطن ہے جس میں آتش شوق بھڑک رہی ہے۔ اس فانی مقام یعنی دنیا سے کیا دل لگانا ہے۔ اس جہاں کی جزا سزا کے لیے ایک دوسرا جہان آخرت ہے۔ جو درویش اس راہ عشق کو طے کرتے ہیں ہر ایک اپنے اپنے وقت کا بادشاہ باطن ہے۔ عقل کو ان رازوں کا کیا علم کہ کہاں سے توحید و معرفت کی یہ حکایتیں بیان ہوتی ہیں یہ تو لسان و بیان غیب اور ہی ہے۔ زخم تو دل کھا رہا اور خون آنکھ سے ٹپک رہا ہے، ایسا تیر کسی اور ہی کمان سے چلا ہے۔ مشتاقان عشق الٰہی کے سینوں میں اشتیاق کی آگ کی دوزخ اس راہ کے سالکوں کی راہ میں ایک دوسرے ہی انداز کا گلستان ہے۔ احمد کہیں کھو نہ جانا ہوش سنبھال کر رکھ کہ اس "الست بربکم" کے جرس کی آواز پر چلنے والا کارواں اور ہی ہے۔

کہتے ہیں کہ آخری عمر میں وہ بیٹھے رہتے تھے کھڑے ہونے سے معذور ہو گئے تھے۔ ان دنوں انھیں کسی سواری پر بٹھا کر بزرگوں کے اعراس میں لے جاتے تو جیسے ہی قوال اس غزل کو پڑھتے انھیں وجد آ جاتا اور وہ وجد میں آ کر کھڑے ہو جاتے اور رقص کرنے لگتے اور گشت لگانے لگتے۔ افاقہ ہونے پر پھر بیٹھ جاتے۔ منقول ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس اللہ سرہٗ شیخ علی عسکری کے گھر تھے۔ قوالوں نے شیخ احمد جام قدس سرہٗ کا یہ شعر پڑھا۔ خواجہ کو اس شعر نے اچک لیا۔ چار دن حالت سکر طاری رہی اور اسی شعر سے ذوق لیتے رہے۔ پانچویں رات 14/ ربیع الاوّل 633ھ کی رات کو اسی شعر پر رحلت فرمائی۔ میر حسن دہلوی نے ایک غزل میں جو اسی زمین میں کہی ہے اس قصے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

جان برین یک بیت داد است آن بزرگ　　　آرے این گوہر ز کانے دیگر است [1]

کشتگانِ خنجر تسلیم را　　　ہر زمان از غیب جانے دیگراست

جس وقت مہابت خاں جن کا تعارف شیخ جلال کسکی کے ذکر میں گزرا ہے، دہلی کے حاکم تھے، وہ حضرات خواجگان چشت قدس اللہ اسرارہم سے اعتقاد اور اخلاص راسخ رکھتے تھے اور اُن حضرات کے عرسوں میں بڑے ذوق سے جاتے تھے اور رونق بڑھاتے۔ انھوں نے بھی اسی زمین میں اشعار کہے ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے

عاشقان خواجگانِ چشت را　　　از قدم تا سر نشانے دیگر است [2]

شیخ طہٰ دہلوی اور شیخ شاہ محمد جانی کہ جن کا ذکر گزر چکا ہے ان حضرات نے بھی اسی زمین میں قصیدے کہے ہیں لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ یہ شیخ عیسیٰ میرے پڑوسی ہیں۔ میرے والد سے اخلاص و دوستی کا معاملہ رکھتے تھے۔ اگرچہ میں نے ان کی شاگردی نہیں کی ہے لیکن میں ان کا بہت نیاز مند ہوں اور وہ مجھ پر بہت لطف و عنایت رکھتے تھے اور اس راہ درویشی کی پند و نصائح کرتے رہتے تھے۔ ان کی وفات 1030ھ (1621) میں ہوئی۔ قبر شیخ بہاء الدین بودلہ کی قبر کے پاس ہے۔

---

1 ۔ اسی ایک شعر پر اُن بزرگ (خواجہ قطب الدین بختیار کاکی) نے جان دے دی ہے ہاں ہاں یہ گوہر دوسری ہی کان کا ہے۔

2 خواجگان چشت کے عاشقوں کی تو سر سے پیر تک شناخت ہی اور ہے۔

شیخ عبداللطیف سنبھلی

وہ بھی شیخ بایزید کے مرید اور صاحب ذوق وسماع ہیں۔ ان کی وفات 1052ھ (1643) میں ہوئی۔ حصور (غیر شادی شدہ) تھے۔ دلالی (Guidence) کا کام کرتے تھے اور سب کچھ فقراء، گانے والوں اور حسینوں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ ان کے ظاہر و باطن کا میلان بس حسن صوت و صورت کی طرف تھا (نہ کہ کچھ اور نفسانی جذبہ)۔ معلوم ہو کہ عشق کو مظاہر خاصہ الٰہیہ ہونے کے سبب حسن صوت وصورت سے اَزَلی و اَبَدی مناسبت ہے۔ اس کی قدر جانباز ہی جانتے ہیں اور اس کی لذت کو محرم راز ہی پاتے ہیں

دلاّل غمش رغبت جانبازان دید زد نعرہ و فریاد کہ صدجان بجوے [1]

مشہور ہے کہ اکابر صوفیہ میں سے جو حسن صورت سے ربط رکھتے تھے وہ چار بزرگ گزرے ہیں۔ ایک عارفِ محقق مولانا عبدالرحمٰن جامی، دوسرے موحدِ عاشق شیخ فخرالدین عراقی۔ تیسرے کاملِ مدقق شیخ احمد غزالی۔ چوتھے عاشقِ صادق اوحدالدین کرمانی جیسا کہ ''نفحات الانس'' میں ہے۔ ''اُس طریقے کے حضرات وہ لوگ ہیں جو کہ مظاہر وصُوَر زیبا کے عشق میں مقید ہیں جب سالک کے آگے عدم ترقی کی باڑھ لگ جاتی ہے اور وہ حالت قبض وحجاب میں ہوتا ہے تو وہ صورت جمیلہ کی دید کی لذت سے عارضی سکون حاصل کرتا ہے جیسا کہ بعض بزرگان قدس اللہ اروا‌حہم نے اس سے استفادہ کیا ہے اور قبض کا علاج کیا ہے (لیکن اس حال میں قیام نہیں کیا ہے بلکہ اسے حجاب ہی خیال کرکے) یوں فرمایا۔ ''نعوذباللہ من التنکیر بعدالتعریف و من الحجاب بعد التجلی'' [2] اگرچہ اس حرکت حسّی کا تعلق صرف اس صورت ظاہری حسّی سے جو حسین وجمیل ہے آگے تجاوز نہیں کرتا مگر کیونکہ اسے شہود و کشف مقید بصورت ظاہری ہوا ہے۔ وہ تعلق اور حسّی میلان طبیعت ایک صورت سے منقطع ہو کر دوسری صورت سے جو اس سے زیادہ حسین ہو جا جڑ تا ہے۔ اس طرح عاشق

---

1 اُس کے غم کی بولی لگانے والے نے جب جانبازوں کی رغبت دیکھی تو نعرہ لگایا اور فریاد کی کہ سو جانیں ایک جَو بھر غم عشق کے بدلے۔

2 ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں معرفت کے بعد انکار سے، تجلّی کے بعد حجاب سے۔

صوت وصورت ہمیشہ کشاکش میں رہتا ہے (اور اسے شہود و کشف مطلق سے محرومی ہو جاتی ہے جو صوت وصورت سے منزہ اور مبرئی ہے) اس طرح اس کی محرومی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور آفت جان وایمان اور باعث نقصان بن جاتا ہے۔ اللہ عزوجل ہمیں اور تمام سالکین وصالحین کو اس کے شر سے بچائے۔ شیخ احمد غزالی، شیخ اوحدالدین کرمانی اور شیخ فخر الدین عراقی وغیرہ قدس اللہ اسراہم اکابر جو کہ جمال صوری حسّی میں مشغول رہے ہیں، کی جماعت کی نسبت حسن ظن بلکہ صدق اعتقاد یہ ہے کہ یہ حضرات اس مقام صورت سے مشاہدۂ جمال مطلق حق سبحانہ کی جانب رجوع ہو گئے ہیں اور صوتِ حسّی میں مقید نہیں رہے۔ اگر بعض دوسرے اکابر نے ان کی اس رجوعیت سے انکار کیا ہے ان کا مقصود اس سے یہ ہوگا کہ حقیقت سے محجوبین اسے دستور نہ بنا لیں اور اپنی حالت (نفسانی) کو ان کی حالت (رحمانی) پر قیاس کر کے گمراہ نہ ہوں اور ہمیشہ نقصان کی کھائی میں اور اسفل السافلین طبیعت میں نہ گھرے رہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ انتہیٰ۔ مگر مولانا عبدالغفور نے ''نفحات الانس'' کے حاشیہ کے تکملہ میں لکھا ہے کہ مولوی جامی ابتدا حال سے مرتبہ کمال تک دغدغہ عشق سے خالی نہیں رہے۔

عشق کی کشش اور جذبۂ محبت کا ان کے احوال میں غلبہ رہا ہے لیکن راز عشق کا چھپانا ان کے لیے لازم فطرت اور طبیعت رہی ہے۔ آپ اوائل حال میں حسین وجمیل ظاہری صورتوں کی محبتوں میں گرفتار رہے ہیں اور اس بات کے افشا سے احتیاط برتتے رہے ہیں اور اپنی طاقت اور امکان کی حد تک چھپاتے تھے اور اگر بنا بر غلبۂ معنی عشق اور استیلائے محبت جوئے بارزلال شوق کا کوئی چھینٹا ظاہر ہو جاتا تو مخلوق کی ملامت اور انکار سے بھی وحشت (وندامت) کا کوئی غبار ان کے دل میں نہیں آتا تھا اور اس شغل دلی سے جو ان پر طاری ہوتا باز نہ آتے تھے۔

کارِ جامی عشق خو بانست د ہر سو عالَمے در پئے انکارِ او، او ہمچنان درکارِ خویش [1]

اور اس معاملے میں ان کی عفت و پاکیزگی وہم وخیال کے اندیشے سے بھی خارج ہے۔

---

1 جامی کا کام تو دنیا میں حسینوں کا عشق ہے اگر چہ ہر طرف دنیا اس کے انکار کے پیچھے لگی ہے لیکن وہ ملامت کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام میں لگا ہے۔

آنم کہ بملک عاشقی بے بدلم   در شہر وفا پاکبازی مثَلم
پاک آمدہ ز آلائش علم و عمل   بنہادہ نظر بقبلہ گاہِ ازَلم [1]

اس قسم کے حضرات کی محبت کا منشا عشق حقیقی ہے نہ کہ وسوسۂ حظوظِ نفسانی۔ ان حضرات کا مقصود صرف حصول درد محبت ہے نہ کہ دل کی خوشی اور راحت نفس

غرض از عشق توام چاشنی درد و غم است   ورنہ زیرِ فلک اسباب تنعم چہ کم است [2]

وہ جو مولانا جامی نے شیخ فخر الدین عراقی[3] کی حکایت ''نفحات الانس'' میں بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ جب شیخ بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ نے شیخ فخر الدین عراقی کو خلوت میں چلّے میں بٹھادیا۔ ان کے چلّے کا ایک عشرہ ہی گزر رہا تھا کہ انھیں وجد ہونے لگا اور ان پر حال طاری ہوگیا اس میں یہ غزل کہی

نخستین بادہ کاندر جام کردند   ز چشم مست ساقی وام کردند [4]

اس شعر کو وہ بآواز بلند پڑھتے اور رونے لگتے۔ جب اہل خانقاہ نے ان کو اس حال میں دیکھا تو شیخ بہاء الدین زکریا کے طریقے کے خلاف سمجھے کیوں کہ آپ کا طریقہ خلوت میں علاوہ ذکر یا مراقبے کے کوئی دوسرا شغل نہ ہوتا تھا اس بات کو بطور برائی شیخ کے کانوں تک پہنچایا تو شیخ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کو یہ سب منع ہے لیکن ان کو نہیں ہے۔ جب چند دن اور گزر گئے، شیخ کے ایک مقرب مرید کا شراب خانے کی جانب گزر ہوا تو دیکھا کہ وہاں شرابی چنگ چغانے کے ساتھ اسی غزل کو گا رہے ہیں شیخ کے پاس آئے صورت حال بیان کی اور کہا کہ '' آگے جو حکم شیخ''، شیخ نے سوال کیا کہ کیا سنا، پھر سناؤ۔ جب اس شعر پر پہنچے

چو خود کردند رازِ خویشتن فاش   عراقی را چرا بدنام کردند [5]

---

1. میں ہی ہوں جو ملک عاشقی میں بے بدل ہوں۔ پاکبازی اور وفا کے شہر میں میری مثال دی جاتی ہے۔ میں علم و عمل کے دعوے کی آلائش سے پاک ہوں۔ میں قبلہ گاہِ ازلی حضرت احدیت پر نظر جمائے ہوئے ہوں۔
2. مجھے عشق سے صرف درد و غم چاہیے ورنہ تو دنیا میں اسباب عیش و عشرت کی کیا کمی ہے۔
3. شیخ فخر الدین ابراہیم متخلص بہ عراقی۔ فارسی زبان کے مشہور شاعر بھی تھے۔ آپ کی وفات ماہ ذی الحجہ 688ھ/1290 میں ہوئی۔
4. انھوں نے اوّل اوّل جام میں جو شراب ڈالی وہ ساقی کی چشم مست سے ادھار لی گئی تھی۔
5. جب انھوں نے خود ہی اپنا راز فاش کیا تو عراقی کو کیوں بدنام کیا۔

شیخ نے فرمایا کہ اس کا کام پورا ہوگیا۔ اٹھے اور شیخ عراقی کے خلوت خانے کے دروازے پر پہنچے اور کہا "عراقی (اب) کیوں پریشان گوئی میں تضیع اوقات کر رہا ہے۔ باہر آ۔ باہر آئے اور شیخ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ شیخ نے اپنے دست مبارک سے اُن کا سر اُٹھایا اور پھر اُن کو خلوت میں نہ رہنے دیا۔ اپنے تن مبارک سے خرقۂ درویشاں اتار کر انھیں پہنا دیا۔ اس کے بعد اپنی دختر سے ان کا نکاح کر دیا۔ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی بیٹی سے ان کے ایک بیٹا ہوا جس کا نام انھوں نے کبیر الدین رکھا۔ وہ پچیس سال شیخ زکریا کی خدمت میں رہے۔ جب شیخ کی وفات قریب پہنچی تو شیخ عراقی کو بلایا اور اپنا خلیفہ نامزد کیا اور جوارِ رحمت خداوندی سے پیوست ہو گئے۔ دوسروں نے ان پر جب شیخ زکریاؒ کی یہ توجہ دیکھی تو ان کی رگ حسد بھڑک اُٹھی۔ بادشاہ وقت تک یہ شکایت پہنچائی کہ ان کا اکثر وقت شعر و شاعری میں گزرتا ہے اور حسین نوجوانوں کے ساتھ مجالست رکھتے ہیں۔ انھیں شیخ کی خلافت کا حق نہیں ہے۔ جب شیخ عراقی نے یہ بات سنی تو وہ زیارت حرمین شریفین کو روانہ ہو گئے۔ زیارت حرمین محترمین کے بعد شیخ صدر الدین قونوی کی خدمت میں روم جا پہنچے اور ان کے تربیت یافتہ ہوئے۔ وہاں طلبہ کی ایک جماعت شیخ صدر الدین سے درس "فصوص (الحکم)" لیتی تھی۔ آپ نے بھی سماعت کی اور دوران درس "لمعات" لکھی اور تکمیل کے بعد شیخ کو دکھائی۔ شیخ نے پسند کر کے اَحْسَنْتَ کہا۔ امیر معین الدین پروانہ جو امرائے روم میں سے تھے ان کے معتقد تھے۔ انھوں نے شیخ عراقی کے لیے "توجات" میں ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہر روز شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن حسب معمول جب شیخ کی خدمت میں آئے تو کچھ زرنقد بھی ساتھ لائے۔ اور بڑی عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ شیخ سے عرض کیا۔ آپ کبھی مجھ سے کسی خدمت کے لیے فرماتے ہیں نہ ہی میرے حال پر توجہ فرماتے ہیں۔ شیخ ہنسنے لگے اور فرمایا اے امیر تم مجھے زر سے فریفتہ نہیں کر سکتے۔ (توجہ کے طالب ہو تو جاؤ) کہیں سے ڈھونڈ ھ کر حسن قوال کو میرے پاس لے آؤ۔ حسن قوال نہایت حسین اور حسن صوت میں بے نظیر تھا۔ ایک خاصی تعداد اس کے چاہنے والوں کی تھی۔ جب امیر نے شیخ کے دل کا میلان جان لیا تو فوراً اپنا آدمی اسے بلانے کے لیے بھیجا (راستے میں) اس کے مداحوں اور عشاق نے اسے گھیر لیا۔ ان کی مزاحمت کو دبا کے جب اُسے لائے تو (شہر سے باہر آ کر) حضرت شیخ عراقی،

امیر معین الدین پروانہ اور دوسرے اکابرین شہر نے اس کا استقبال کیا۔ جب نزدیک پہنچا تو شیخ نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور بغل گیر ہوئے۔ اسی وقت شربت منگایا اور اپنے دست مبارک سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو پیش کیا۔ وہاں سے شیخ کی خانقاہ پہنچے اور مجلس سماع برپا ہوئی۔ حضرت شیخ نے خود کئی غزلیں کہیں۔ ان میں سے ایک غزل[1] یہ ہے

سازِ طرب عشق چہ داند کہ چہ ساز است
کز زخمہ آن نہ فلک اندر تگ و تاز است[2]

سید اللہ یار امروہہ

(سید اللہ یار بن سید یحیٰی[3]) وہ شیخ تاج الدین سنبھلی کے اصحاب کاملین میں سے ہیں۔ جذبہ قوی اور ہمت عالی رکھتے تھے۔ شجاعت اور سخاوت میں معروف تھے۔ ان کی پیشانی کے جمال و جلال سے نور ولایت اور آثار کرامت صاف نمایاں تھے۔ انھوں نے خدمت فقرا کو اپنے ذمہ لازم کر رکھا تھا۔ شروع میں لشکریانہ لباس میں ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے مگر جب جذبہ محبت الٰہی نے انھیں اپنا لیا تو سارے بناؤ سنگار سے ہاتھ اُٹھا لیا اور شیخ تاج الدین سنبھلی سے وابستہ ہو گئے، بہت کم مدت میں ہی مرتبۂ کمال کو پہنچ گئے۔ خلافت پائی اور ناقصیں کی تکمیل میں لگے مگر بس حکم شیخ کی بجا آوری کے لیے صرف چند کو مرید کیا اور اس کے بعد مشیخت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا اور یاد یار کا دروازہ کھول، انقطاع تام اور آزادگی تمام کے ساتھ گوشۂ فقر و فنا، توکل و استغنا میں زندگی گزاری۔ انھوں نے تلاوت کلام پاک کی مقدار یہاں تک پہنچا دی تھی کہ اکثر اوقات دو دن میں ورنہ کبھی کبھی ایک دن میں ایک قرآن کر لیا کرتے تھے۔ جب میرے شیخ امروہہ گئے تھے تو انھوں نے خصوصی اخلاص و محبت کا برتاؤ کیا۔ میرے شیخ کی جانب سے بھی عنایت کاملہ کا معاملہ تھا۔ بڑی خیر و خوبی والی مجالس گزریں۔ میرے شیخ کو سید فتح محمد امروہوی سے حد درجہ محبت تھی جس

---

1 راقم الحروف کو "اسراریہ" کے تینوں دستیاب نسخوں میں صرف مندرجہ ذیل شعر ہی ملا ہے۔

2 سازطرب عشق کو تو کیا جانے کہ اس کے زخمہ کی حرکت سے نو (9) فلک گردش میں ہیں۔

3 از تذکرۃ الکرام ص 62 مؤلفہ محمود احمد عباسی۔

کا ذکر، تذکرۂ غوث عالم میں آتا ہے۔ سید شرف الدین امروہوی[1] جو کہ سید اللہ یار کے ہمشیرہ زادے ہیں فرماتے ہیں کہ ایک بار مجھے ایک مرض ہو گیا جس سے مجھے موت کی آرزو ہونے لگی تھی۔ ایک دن وہ میری عیادت کے لیے تشریف لائے میں نے ان سے بڑی عاجزی و نیازمندی سے عرض کیا کہ یہ وقت میری دستگیری کا ہے۔ انھیں میرے حال پر رحم آیا ایک گھڑی بیٹھے بیٹھے متوجہ الی اللہ رہے پھر فرمایا خاطر جمع رکھ کہ تیری بیماری کو بہت جلد لیتا ہوں۔ اِسی وقت میں نے دیکھا کہ مجھ میں تخفیف مرض کے آثار ظاہر ہوئے۔ میں ان کی تعظیم کے لیے اُٹھا اور تین دن میں، میں بالکل ٹھیک ہو گیا مگر وہ چند دن اسی بیماری میں مبتلا رہے۔ اس دوران، میں ان کی عیادت کے لیے جایا کرتا تھا۔ آخر کار صحت یاب ہو گئے۔ ان کے ہمسایے کمال خاں امروہوی کہتے ہیں کہ انھوں نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی تجھے کوئی مشکل پیش آیا کرے میری صورت کا تصور کر لیا کر۔ ایک بار میں نے ایک مشکل کے موقع پر ان کا تصور کیا اور کہا اے سید اللہ یار، وقت یاری و مددگاری کا ہے۔ ناگاہ دیکھا کہ گھوڑے پر سوار عصا ہاتھ میں لیے ہوئے ہمارے عقب سے ظاہر ہوئے جس کسی کے بھی سر پر عصا مارتے گھوڑے سے گر پڑتا۔ ایک گھڑی کے بعد دشمن شکست کھا گیا اور میں اس پر فتح یاب ہوا۔ وہ بھی غائب ہو گئے۔ جب پھر میں نے ان سے وطن میں ملاقات کی تو فرمایا۔ ''زنہار اسرار الٰہی مکشوف نشود'' (خبردار راز الٰہی فاش نہ ہو) سید غلام محمد جوان کے بیٹے ہیں عالم و فاضل ہیں۔ علوم ظاہری و باطنی ہر دو میں میرے شیخ کے شاگرد ہیں کہتے ہیں کہ ایک سال موسم برسات میں بارش کو بہت دیر ہو گئی اتنی کہ اہل جہاں مایوس ہو گئے۔ ایک دن میرے والد اپنے گھر میں چارپائی پر بیٹھے کہنے لگے کہ جب تک یہ چارپائی غرق نہ ہو جائے انشاء اللہ اٹھوں گا نہیں۔ متوجہ الی اللہ ہو گئے، میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا ناگاہ ابر کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا اور ایک ساعت کے بعد تمام آسمان پر چھا گیا اور بادل گھر کر برسنے لگا اتنا برسا کہ گھر کا صحن پانی سے بھر گیا۔ چارپائی ڈوب گئی اور ان کی کمر تک پانی پہنچ گیا اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے تو اس وقت پانی برسنا بند ہو گیا۔ اس سال زیادتی بارش کی وجہ سے پیداوار اچھی ہوئی اور غلہ بہت سستا بکا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میرے دادا سید یحییٰ

1 سید شرف الدین ابن سید افضل ابن سید عبدالرحمٰن۔ از تذکرۃ الکرام ص 62۔

یکتا بزرگوں اور دوستان خدا میں سے تھے۔ شیخ اللہ بخش گڑھ مکٹیشری نے بس دو شخصوں کو ہی خلافت نامہ عطا فرمایا تھا۔ ایک شیخ تاج الدین کو دوسرے میرے جد بزرگوار کو۔ میرے دادا کا 25/ماہ جمادی الآخر 1012ھ (19/نومبر 1603) کو خواجہ بیرنگ کے وصال کے دن انتقال ہوا اور میرے والد شیخ اللہ یار کا 1040ھ (1631) میں۔ اُن کی قبر امروہہ میں ہے۔ سید غلام محمد کا عربی و فارسی کلام بھی ہے۔ اس میں سے ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں

ظَھَـر الـحـقُ بـصـورِ الاشیـاء بجمع الصفات والاشیاء

گر چہ بے صورت است وے چون لیک اوست پیدا بصورت چونہا

ہر چہ پوشید خلعتِ ہستی لَیْـسَ غیـرَ لِـذاتـہٖ الاعلـیٰ

ذاتہاے منِ و تو ذاتہاے ویست صفت او صفاتِ ما و شما

اوست دانا بدانشِ من و تو دانشِ اوست جملہ دانش ما

او ہمیشہ بچشم ما بینا اوست دایم بگوشِ ما شنوا

لَیس فی الکون غیرہٗ ازلاً لَیْـسَ فـی الـدھـر غیـرہ ابـدا

کـل مـافـی الـوجـود مـوجـودٌ کـل مـافـی الشھـود قـد شَھَـدَا

کشف این راز از زبانم گفت در حقیقت خود است حق گویا[1]

---

1 صور اشیا میں تمام صفات و شیون حق کا ظہور ہے۔ گر چہ اس کی ذات بے صورت اور بے چوں ہے مگر ممکنات میں ظاہر بھی وہی ہے۔ اس کی ذات عالی کے سوا کوئی ہے ہی نہیں اور لباس ہستی میں چھپا بھی وہی ہے۔ میری تیری ذات اسی کی ذات کا عکس ہے۔ اسی طرح ہماری صفات بھی اسی کی صفات کا پرتو ہیں۔ ہماری عقلیں اسی عقل کل سے ہیں۔ گویا ہماری عقل ہے ہی نہیں۔ ہماری آنکھ سے وہی دیکھتا ہے ہمارے کان سے وہی سنتا ہے اس کے سوا کائنات میں کوئی ہستی ہے ہی نہیں اور دہر میں نہ کوئی ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے۔ وجود میں جو کچھ موجود ہے اور نظر جو کچھ بھی دیکھتی ہے (وہ وہی ہے) اگر چہ یہ راز بظاہر میری زبان سے کہا ہے در حقیقت خود حق ہی گویا ہے۔

شیخ عبدالحکیم امروہوی[1]

شیخ عبدالمجید کے مرید اور جانشین ہیں۔ انھیں کے طریقے پر، صاحب احوال واز واق تھے۔ خلق عظیم کے حامل اور خدمات فقرا میں چست تھے۔ ایک باران کو سفر حجاز کا شوق اُٹھا۔ بڑے شوق میں روانہ حجاز مقدس ہوئے، حرمین محترمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور جمعیت تام لے کر لوٹے۔ دہلی میں میرے شیخ سے ملاقات کی، بہت خوب مجلس (معرفت) رہی۔ جب انھوں نے اجازت چاہی میرے شیخ نے میرے ذریعہ بہت اچھا لباس تبرکاً انھیں بھجوایا۔ اس کو ادباً سر پر رکھ لیا اور اسی طرح امروہہ پہنچے۔ امروہہ پہنچ کر استقامت اختیار کی اور شیخ عبدالمجید کے روضے کے نزدیک گوشہ نشین ہوگئے۔ فقرا اور درویش ان کے پاس آتے اور ان کے حسن سلوک، طریقہ احسان وایثار سے خوش وخرم ہو کر جاتے۔ وہ بھی دوستوں سے ملاقات کر کے بے حد خوش ہوتے تھے۔ ایک دن چند فقرا حضرات کے ساتھ میری جائے قیام پر پہنچے۔ بڑی باقیمت صحبتیں درمیان میں رہیں۔ جس دن وہ بیمار ہوئے اور انھیں (کشفاً) معلوم ہوا کہ یہ آخری بیماری ہے اپنے تمام دوستوں جیسے حافظ طیب حسن پوری کا ذکر آگے آئے گا وغیرہ کو اپنے شیخ (شیخ عبدالمجید کے) طریقے کی مطابعت میں خط لکھے کہ میرا آخری وقت ہے کرم کرو اور مجھے دیکھ جاؤ۔ اسی اثنا میں مجھے بھی چاہتے تھے کہ بلائیں مگر پھر کہا کہ وہ یہاں سے ابھی تین چار روز ہوئے ہیں گیا ہے، ہوا گرم ہے، تکلیف اُٹھائے گا۔ جب وہ دوست ان کے پاس پہنچے ہر ایک کو سینے سے لگا کر گود میں بھر کر روئے۔ اس کے بعد ان پر سکر ومستی کی زبردست حالت طاری ہوگئی اور حیرت زدوں کی طرح آسمان میں آنکھیں جما کر بیٹھ گئے۔ حاضرین بولے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے وہ ہنس کر بولے نماز (حقیقی) یہ ہے یعنی جو حال مجھ پر طاری ہے۔ پھر اپنے یاران طریقت اور منتسبان نسبت سے جو رو رہے تھے فرمانے لگے روتے کیوں ہو؟ جو حقیقت ہے وہ زائل نہیں ہوتی۔ تغییر اور تبدیلی جو کچھ ہے صرف صورت میں ہے اس کا کوئی اعتبار ہے ہی نہیں

---

1 بن سید عبدالصمد۔ امروہہ کے اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ آپ کا نسب سید امیر علی ابن سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ امروہہ سے متصل ہوتا ہے۔

اگر جان رفت در عشق تو گو، رو   تو باقی مان کہ مارا باتو کار است[1]

اطبا ان کو جو دوا یا مشروب دیتے استعمال نہ کرتے اور کہتے "میں ایک اور ہی حال میں ہوں۔"
اسی حال میں 27/ذی الحجہ 1070ھ (23/اگست 1660) کو جمعہ کے دن دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی قبر ان کے شیخ کی پائتی پر ہے جو مسجد کے سامنے ان کی وصیت کے مطابق بنائی گئی ہے۔ میں نے ان کو جب کہ ان کی وفات کو ایک مہینہ گزر چکا تھا ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ ان کی فاتحہ کے لیے جانا چاہیے۔ ان کے چہلم کی رات کو میں وہاں پہنچا۔ بہت سے فقراء درویش اس مجلس میں آئے ہوئے تھے۔ سب نے مل کر چند کلام مجید ختم کیے۔ میں بہت خوش ہوا۔ اگر چہ ان کے وصال کا وقت اسراریہ کے مکمل ہونے کے بعد کا ہے لیکن میں نے تاریخ وصل کی ان دو رباعیوں کو نسخے میں شامل کرلیا ہے

سید کہ براہ فقر بر جا بود   در زمرۂ ارباب وفا یکتا بود
سال فوتش مطابق واقع بین   ہاتف گفتہ کہ خادم الفقراء بود[2]

رباعی

آن عبدالحکیم سید پاک نہاد   کو در رہ حق پاے وفا نیک نہاد
بگذشت بہ بیست و ہفتم ذی الحجہ   در جمعہ از سال ہزار و ہفتاد[3]

کہتے ہیں کہ ان کے پہلے عرس کی شب جو 1071ھ میں لوگوں نے کیا تھا جس میں مولود خوان حضرات بھی تھے۔ اُن کی قبر کے تعویذ کا غلاف اُن کی قبر کے اوپر جنبش میں آگیا اور چند گھڑی یہ حال نظر آیا۔ جب غلاف اُٹھایا اور پھر ڈالا تو پھر جنبش میں تھا۔ ہزار آدمیوں کے نزدیک حاضرین نے اس کا مشاہدہ کیا اس حد تک کہ اس سلسلے میں کوئی شک وشبہ نہ رہا، میں نے نیک لوگوں سے یہ

---

1 اگر عشق میں جان جاتی ہے کہہ دے چلی جا۔ تو سلامت باقی رہے کہ مجھے تجھ سے ہی غرض ہے۔

2 سید عبدالحکیم جو فقیری میں مستقیم ومتوکل اور زمرہ ارباب وفا میں یکتا تھے، ان کی تاریخ وفات ہاتف نے "خادم الفقراء" کہی ہے۔

3 وہ پاک فطرت سید عبدالحکیم جنھوں نے راہ حق میں کیا خوب قدم وفا رکھا، 27/ذی الحجہ کو جمعہ کے دن 1070ھ میں گزر گئے۔

واقعہ سنا ہے۔ دوسرے عرس کے موقع پر کہتے ہیں ان کی قبر کا تمام غلاف جل رہا تھا۔ شیخ عبدالمجید کے مریدوں میں سے ایک شیخ فاضل امروہوی ہیں جو اہل ریاضت و مجاہدات، صاحبان وجد و سماع حضرات میں سے ہیں۔ ان کے سماع میں بہت تاثیر ہے۔ ایک دن انھوں نے ایک سادہ شعر کہا اور ایک قوال کو یاد کرایا۔ قوال اس کو پڑھتا تھا اور وہ رقص کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں ابن الوقت ہوں۔ شعر یہ ہے۔

از خدا غافل مشو تو یک زمان   تابیابی در دلت حق را نشان [1]

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اللہ سبحانہٗ کے دوستوں کو الفاظ کے معنیٰ پر ذوق آتا ہے نہ کہ صورت الفاظ پر۔ جیسا کہ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ شبلی نے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے ''عشرۃ خُبزٍ لدانق[2]'' سنتے ہی انھوں نے نعرہ مارا اور وجد میں آ کر کہا ''اذا کان عشرۃً خبز لدانقٍ فکیف الشرار[3]'' انتہیٰ۔ مشہور ہے کہ گنج شکرؒ نے کسی خادم کو کوئی سامان لینے کے لیے بھیجا۔ اسے ملا نہیں تو لوٹ کر ان سے آ کر کہا ''نہیں ملا'' اتنا سنتے ہی وہ وجد و سماع میں آ گئے۔ شیخ عبدالمجید کے یاران سلسلہ میں سے ایک شیخ گھاسی امروہوی[4] ہیں جو صاحب معاملت نیک اور گوشہ نشین ہیں۔ علاوہ عیدین اور جمعہ کی نماز کے اور اپنے شیخ کی قبر پر آنے کے کہیں نہیں جاتے۔ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے ایک گوشہ نشین درویش سے کسی نے دریافت کیا کہ تیرا دل کیا چاہتا ہے؟ کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمیشہ نماز استغراق میں رہوں تا کہ فرض نمازوں کی جماعت کے لیے باہر نہ آنا پڑے۔ ان کا مشغلہ اکثر اوقات مثنوی مولانا معنوی کا مطالعہ اور اس کے انمول چمکیلے موتی اس دریائے اسرار و معانی سے نکالنا تھا۔ ایسی غوطہ خوری جیسی کہ چاہیے۔

---

1 تو ایک لمحے کے لیے بھی خدا سے غافل مت ہونا تا کہ تو اپنے دل میں حق کا نشان پائے۔

2 ایک دانق کی دس روٹیاں۔

3 جب دس روٹیاں ایک دانق کی ہیں تو کیا خوب خریداری ہے

4 ولایت پناہی شیخ گھاسی چشتی نے جو کمالات صوری و معنوی کے جامع تھے اور واضح کرامات و ظاہرہ کشف رکھتے تھے۔ 29/ رمضان المبارک 1099ھ/ 17 جولائی 1688 کو وفات پائی۔ آپ کا مزار مبارک زیارت گاہ خلائق ہے۔

رباعی

غواصی بکن گرت گہر می باید	غواصے را چار ہنر می باید
سر رشتہ بدست یار جان بر کفِ دست	دم تاز دن و قدم ز سر می باید[1]

میں ان کو خوب جانتا ہوں۔ ان کا شوق باطنی ان کے ملاحت خیز چہرے سے عیاں ہے۔ گویا کہ ان کے دل کی کیفیت کا مثنوی مولوی کے مطابق ان کے ظاہر پر عکس پڑ گیا ہے۔

چون پری غالب بود بر آدمی	گم شود از مرد وصف مردمی[2]
ہر چہ گوید آن پری گفتہ بود	زین سری از آن سری گفتہ بود
کرد گار آن پری خود چون بود	چون پری را ایں دم و قانون بود[3]

وہ دریافت کی اس حالت کے باوجود فقرا کی صحبت سے کسب فیض معنوی کرتے رہتے ہیں، یہ بات بھی مثنوی میں ہے

حرفہ آموزی طریقش فعلی است	علم آموزی طریقش قولی است
فقر خواہی آن بصحبت قائم است	بے زبانت کار می آید بدست[4]

شیخ عبدالمجید کے یاران طریقت میں ایک شیخ علاول ہیں جو گوشہ نشین اور بابرکت انسان ہیں۔ برسوں ہوئے اپنے شیخ کے روضے کے جوار میں رہ رہے ہیں۔ میں نے انھیں بلکہ شیخ عبدالمجید کے زیادہ تر مریدین و منتسبین کو جو امروہہ کے آس پاس ہیں دیکھا ہے سب کے سب معاملات میں واثق، بات کے سچے ہیں۔ شیخ عبدالحکیم کے مریدین بھی کار درویشی کے لائق اور اللہ تعالیٰ کے منتخب اور پسندیدہ ہیں۔

---

1 غوطہ خوری کر اگر تجھے گہر کی چاہت ہے۔ غوطہ خوری کے لیے چار ہنر چاہئیں، رستے کا سرا تو دست یار میں ہو، جان ہتھیلی پر ہو اور سر سے پیر تک سراپا رضا بن جانا چاہیے کہ مرضی محبوب کے خلاف ایک سانس بھی نہ نکلے۔

2 جب کسی آدمی پر پری کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس کی ساری مردی (خودی) دھری رہ جاتی ہے۔

3 جو وہ پری کہتی ہے کہتا ہے، اس کا دماغ اس کا دماغ بن جاتا ہے۔ جبکہ پری کے لیے یہ تصرف اور تاثیر ثابت ہے تو بھلا اسی پری کے پروردگار کا کیا معاملہ ہوگا۔

4 اگر تو ہنر سیکھنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ عمل ہے اور اگر علم سیکھتا ہے تو اس کا طریقہ قولی ہے اور اگر فقر و درویشی کا خواہاں ہے تو وہ فقرا حقیقی کی صحبت سے بغیر تیری جدوجہد کے حاصل ہوتا ہے۔

شیخ طیب امروہوی

وہ صالح اور جواں مرد تھے۔ صاحب ذوق وسماع اور اہل درد ومحبت۔ ان کے سماع میں بڑی تاثیر تھی۔ شیخ عبدالمجید کے صحبت داروں میں سے تھے۔ ایک دن وہ سنبھل میں شیخ نظام الدین کے پاس جو کہ سنبھل میں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے بوجہ شناسائی آئے۔ شیخ نظام کو ایک کام سے اکبرآباد جانا پڑ گیا اور وہ وہاں چلے گئے اور اپنے مکتب کو شیخ طیب کے حوالے کر گئے۔ وہ مکتب میں ایک ہندو لڑکے کے حسن پر فریفتہ ہوگئے اور ایک سخت حال ان پر طاری ہوگیا۔ میں اس زمانے میں ان کے پاس جایا کرتا۔ ان کی اور ہندو لڑکے کی عاشقی اور معشوقی سے محظوظ ومسرور ہوا کرتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ جو ادب شاگرد استاد کا کرتا ہے وہ ادب وہ شاگرد کے ساتھ برتتے تھے۔ اس وقت مجھے ''گلستان'' کی وہ حکایت یاد آئی کہ طالب علموں میں سے ایک طالب علم کمال خوبصورتی اور خوش آوازی رکھتا تھا۔ معلم بحکم فطرت بشریت اس کے حسین چہرے پر عاشق تھا۔ جو ڈانٹ ڈپٹ وہ دوسرے بچوں پر روا رکھتا تھا اس کے حق میں نہ رکھتا تھا۔ جب بھی اسے کہیں تنہا پاتا تو کہتا: قطعہ

نہ آنچناں بتو مشغولم اے بہشتی رو ‏ ‏ که یاد خویشتنم در ضمیر ی آید
ز دیدنت نتوانم کہ دیدہ بر بندم ‏ ‏ وگر مقابلہ بنیم کہ تیر ی آید[1]

ایک بار لڑکے نے عرض کیا کہ جس طرح آپ دوسروں کو ادب اور طور طریقے سکھانے میں جدوجہد فرماتے ہیں میری اصلاح نفس میں بھی توجہ فرمائیں اگر کوئی بات آپ مجھ میں ایسی دیکھیں جو ناپسندیدہ ہو اور مجھے وہ پسند ہو تو مجھے اس کی اطلاع فرمائیں تاکہ میں اس کی تبدیلی میں کوشش کروں۔ کہا اے لڑکے یہ بات کسی اور سے پوچھ۔ جس نظر سے میں تجھے دیکھتا ہوں اس کے ہوتے ہنر کے علاوہ کچھ نہیں نظر پڑتا۔ قطعہ

---

1 ‏ اے جنتی چہرے والے میں تیرے دیدار میں ایسا مشغول ہوں کہ اپنا خیال بھی میرے دل میں نہیں آتا۔ میں تیری دید سے آنکھ بند نہیں کر سکتا اگرچہ سامنے سے دیکھ رہا ہوں کہ تیر آتا ہے۔

چشم بد اندیش پراگندہ باد   عیب نماید ہنرش در نظر
ور ہنرے داری و ہفتاد عیب   دوست نہ بیند بجز آن یک ہنر [1]

شیخ طیب معمے کے فن میں کمال رکھتے تھے۔ ایک دن مجھے اس کے قواعد وضوابط انھوں نے سکھائے۔ میں نے دوسرے دن سات معمے کہے اور انھیں دکھائے، حیران ہوئے اور بہت تعریف کی کیونکہ میں نے پہلی بار ہی یہ کہے تھے۔ ان معموں میں سے تین معمے یہ ہیں۔

باسم (معنی)

چہ تیرے از سرِ مستی زدی براستخوانِ من   کہ ہردم لذّت مستی دہد در چشم و جانِ من

(فیل وشتر)

فرزین چون سوے مہرۂ پیدل، زچشمِ او   کار تو در خلا و ملا خود تباہ شود

(باسم غلامی)

فتاد زلف بران چہرہ چون زنل بشگفت   ہزار مہ بسرِ سروِ او چوگل بشگفت

شروع میں انھیں اس موحدانہ شعر پر بہت ذوق وسماع ہوتا تھا

کجا غیر و کو غیر و کو نقشِ غیر   سوی اللہ واللہ مافی الوجود [2]

آخر ہندولڑکے کی محبت میں ہی ان کی شہادت کا دن نزدیک پہنچ گیا۔ اس رباعی پر وجد وسماع کرتے اور آہیں بھرتے تھے

عالم ز جمال تو جمیل است و جمیل   و ز فرقتِ تو بسے قتیل است و قتیل
من بندہ بخونِ خویش دعویٰ چہ کنم   خونِ ہمہ عاشقان سبیل است و سبیل [3]

اسی مدت میں وہ 1040ھ (1630) میں راہ معشوق میں شہید ہوگئے۔ اُن کے دوستوں نے امروہہ

---

1 بداندیش کی آنکھ غبار آلود ہو کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب نظر آتا ہے۔ اس کے برخلاف دوست کی نظر اس ہنر کے سوا نہیں دیکھتی جو تو رکھتا ہے۔ اگر چہ تجھ میں صرف ایک ہی ہنر اور ستر عیب ہوں۔

2 واللہ وجود میں اللہ کے سوا غیر کہاں کون غیر اور کون نقش غیر ہے۔

3 سارا عالم تیرے جمال سے جمیل وحسین ہے۔ تیری فرقت میں کتنے قتیل شہید ہوگئے ہیں۔ میں بندہ اپنے خون کا دعویٰ کیا کروں عاشقوں کا خون تو راہِ محبوب میں بہتا ہی بہتا ہے۔

میں ان کی تاریخ وفات لفظ "غم" سے نکالی۔ اتفاقاً میں نے بھی سنبھل میں یہی تاریخ کہی

چون گشت شہید طیب عاشق پاک　　او را شدہ شادی ز غم و مارا غم
تاریخ و فاتش چون ز دل پرسیدم　　دل نعرہ زنان شد ز غم و گفتا غم [1]

شیخ نور محمد امروہوی جو کہ شیخ عبدالمجید کے مرید ہیں اور بہت سمجھدار سنجیدہ انسان ہیں فرماتے تھے کہ وہ شیخ طیب ایک بار اپنے معشوق کے ہمراہ ایک جگہ گئے تھے۔ وہاں ظالموں کے ایک مجمع نے اس لڑکے کے بارے میں بات بڑھائی اور جھگڑا شروع کر دیا اور چاہا کہ اس لڑکے کو قید کر لیں اسی اثنا میں شیخ طیب شمشیر لیے درمیان میں گئے اپنے معشوق کو ایک جانب کر دیا اور بدمعاشوں میں سے کئی کو مار ڈالا اور خود بھی شہید ہو گئے مگر ان کے معشوق کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ پوشیدہ نہ رہے کہ اس قسم کی وفاداری راہِ عشق میں ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہاں بھی مجھے "گلستان" کی ایک حکایت یاد آئی۔

جوانے پاک باز و پاک رو بود　　کہ با پاکیزہ روے در گرو بود
شنیدستم کہ در دریاے اعظم　　بگردابے در افتادند باہم
چون ملاح آمدش تا دست گیرد　　مبادا کاندران حالت بمیرد
ہمی گفت از میان موج تشویر　　مرا بگذار و دستِ یارِ من گیر
درین گفتن جہانے بروے آشفت　　شنیدندش کہ جان می داد و می گفت
چو من باشم، نباشد یارِ جانی　　چہ کار آید مرا آن زندگانی
حدیث عشق ازان بطال مینوش　　کہ در سختی کند یاری فراموش [2]

1　جب عاشق پاک طیب شہید ہو گئے۔ انھیں تو غم سے خوشی مل گئی لیکن ہمیں غم ملا۔ جب میں نے دل سے ان کی تاریخ وفات پوچھی تو دل نے نعرہ لگایا اور بولا "غم"۔

2　ایک پاک باز اور حسین نوجوان تھا۔ جو ایک پاکیزہ رو کے عشق میں مبتلا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ دریائے اعظم میں دونوں گرداب میں آ گئے۔ جب ملاح اس کے قریب آیا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے کہیں ایسا نہ ہو کہ دریا میں ڈوب کر مر جائے۔ اس شوریدہ سر موج میں بھی یہی کہہ رہا تھا۔ مجھے چھوڑ، میرے یار کا ہاتھ پکڑ۔ یہی کہتے کہتے دنیا اس پر تنگ ہو گئی۔ لوگوں نے اسے کہتے سنا کہ جان دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ اگر میں بچتا ہوں تو میرا جانی یار ڈوب جائے گا۔ پھر اس کے بغیر زندگی کس کام کی۔ کسی بت بنے سے عشق کی بات نہ پوچھ جو کہ سختی کے وقت اپنی دوستی فراموش کر دیتا ہے۔

چنین کردند یاران زندگانی | ز کار افتادہ بشنوتا بدانی
کہ سعدی راہ و رسم عشق بازی | چنان داند کہ در بغداد تازی
دل آرامے کہ داری دل دروبند | دگر چشم از ہمہ عالم فروبند
اگر لیلیٰ و مجنون زندہ گشتے | حدیثِ عشق ازین دفتر نوشتے [1]

شیخ طیب کے دوست نظام الدین آج میرے بہترین شناساؤں میں ہیں۔ ہندی شاعری سے شغف رکھتے ہیں۔ میں شیخ ابنؒ کے عرس میں ہر سال جب امروہہ جاتا ہوں وہ نہایت گرم جوشی سے پیش آتے تھے۔ بڑی خوب صحبتیں گزرتی تھیں۔ میں چار پانچ دن بعد لوٹ کر آتا تھا۔ جب سال 1063ھ (1653) تھا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ ان دنوں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹا عطا کیا ہے لیکن ابھی تک اس کا نام مقرر نہیں ہوا ہے۔ تو اس کا نام رکھ دے اور تاریخ پیدائش بھی کہہ دے۔ اس وقت فوراً میری زبان پر آیا "شیخ محی الدین۔" جب بعد میں میں نے حساب لگایا حسن اتفاق کہ پورے پورے 1063 عدد تھے۔ اس لڑکے کا نام اور تاریخ ولادت بھی مقرر ہوئی۔ حاضرین تو خوش ہوئے ہی میں اور بھی زیادہ خوش ہوا۔ اور یہ بیت فی البدیہہ کہی

سخنے نیک از کمالات است | بلکہ آن نشانِ کرامات است [2]

شیخ فتح اللہ غازی

وہ دین محمدی میں یکتا اور مستقیم الحال تھے۔ ان کی نیت ہر کام میں رضائے الٰہی پر رہتی تھی۔ نہ کہ ریا اور دکھاوا۔ حق بات یعنی امر معروف کو بادشاہ صاحب قران ثانی شاہ جہاں کے سامنے نڈر ہو کر کہتے تھے۔ اس معاملے میں انہیں کسی کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ پانچوں ہتھیار جو کہ

---

1 مجھ جتلا سے سن تا کہ تجھے پتا لگے کہ یاران محبت نے کیسے زندگی گزاری ہے۔ سعدی رسم وراہ عاشقی کو ایسے جانتا ہے جیسے کہ بغداد میں عربی زبان کو جانتے ہیں۔ دل اپنے محبوب میں لگا لے پھر سارے جہان سے آنکھ بند کر لے۔ اگر لیلیٰ اور مجنون زندہ ہوتے عشق کی دستان (اوّل) اسی دفتر (گلستاں) سے لکھتے۔ نوٹ: یہ حکایت "گلستاں" کے پانچویں باب "در عشق و جوانی" سے ماخوذ ہے۔

2 نیک بات کمال کی بات ہے۔ بلکہ وہ کرامات الٰہی کی نشانی ہے۔

مشہور ہیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جنگ کے اوقات میں باندھتے تھے۔ ایک دن انھوں نے شریعت کی ایک بات سختی کے ساتھ کہی۔ جس کو بادشاہ عادل شاہ جہاں نے برداشت کیا۔ اس کے باوجود بھی ان سے برداشت نہ ہوئی تو وہاں سے اُٹھے اور امروہہ پہنچے جہاں ان کا وطن ہے۔ پھر جب سنا کہ بادشاہ کفار بندیلہ پر لشکر کشی کر رہے ہیں لوٹ کر دہلی گئے اور لشکر اسلام میں شامل ہو گئے۔ بادشاہ نے معلوم کیا کیوں چلے گئے تھے اور کیوں لوٹ آئے۔ کہا کہ میری نیت دین اسلام کے موافق ہے جب میں نے سنا کہ غازیان اسلام (حربی) کفار پر چڑھائی کی غرض سے سوار ہوئے ہیں تو میں نے دل سے کہا۔ وقت جہاد ہے اس وجہ سے واپس آیا ہوں خوشامد کے لیے نہیں آیا۔ اور جب تک کفار دار الحرب کا استیصال اور انہدام وقوع پذیر نہیں ہوا وہ غازیان اسلام کے ساتھ شریک رہے۔ اس کے بعد بادشاہ برہان پور چلے گئے وہ بھی برہان پور چلے گئے۔ پھر جب دیکھا کہ لشکر دکن کی طرف جا رہا ہے تو کہا کہ وہاں اکثر مسلمان ہیں، مجھے نہ جانا چاہیے اور برہان پور سے ہی اس طرف (امروہہ) کو روانہ ہو گئے بغیر بادشاہ سے اجازت لیے۔ ایک منزل تک ہی پہنچے تھے کہ بیمار ہو گئے اور 1046ھ (1636) میں دنیا سے چلے گئے اور راستے میں برہان پور میں ہی دفن ہوئے۔ ملا قاسم اعظم پوری جو کہ خطیب امروہہ تھے بہت نیک آدمی تھے اور مجھے جانتے تھے انھوں نے ان کی تاریخ دفات "ہائے غازی بود" کہی ہے۔ کیونکہ ان کے تمام کام "الحب للہ والبغض للہ" کے مطابق تھے اسی وجہ سے ان کا لقب غازی ہو گیا۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کی تعریف "اِنّک لَعَلی خُلُقٍ عظیم" سے کی ہے۔ وہ اخلاق کیا تھے۔ حضرت (عائشہ) صدیقہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا "کان خلقهُ القرآن" (ان کا اخلاق قرآن تھا) یعنی جس جگہ کہ قرآن کا حکم لطف و مہربانی کا ہے وہاں لطف فرماتے تھے اور جہاں کہ قہر کرنا چاہیے قہر کرتے تھے۔ وہ تو مکمل آئینۂ اخلاق الٰہی تھے۔

بود آئینۂ کہ عکس خورشید وجود　　جاوید در و بصورتِ اصل نمود [1]

1　وہ ایک آئینہ تھے جس میں خورشید وجود کا عکس ہمیشہ اصلی صورت میں نظر آتا تھا۔

کتاب ''سلسلۃ الذہب'' میں ہے

بود ہم بحر مکرمت ہم کان گوہرش بود، خُلقہ القرآن[1]
وصف خُلقِ کسے کہ قرآن است خَلق را نعتِ او چہ امکان است

یہ بھی مشہور روایت ہے کہ ایک بار امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے ایک حربی کافر پر قبضہ پا کر اس کو اپنے نیچے دبالیا اور چاہا کہ خنجر آبدار سے اس کا کام تمام کر دیں۔ اسی دوران اس نے اُن کے روئے مبارک پر تھوک دیا۔ آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ ساتھیوں نے عرض کیا۔ اے امیر! ایسے وقت میں جب کہ وہ یقیناً مستحق قتل ہو گیا تھا آپ نے کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا ''پہلے میری نیت اللہ واسطے کی تھی اسی وجہ سے میں نے اس کو مارنے کا ارادہ کیا تھا مگر اب جبکہ اس نے میرے اوپر تھوکا میرا نفس اس کے قتل میں شریک ہو گیا۔ اسی لیے میں نے چھوڑ دیا۔ انتہیٰ۔

1044ھ (1634) میں جب رستم خاں دکھنی نے کٹھیر کے باغی کفار پر لشکر کشی کی تھی تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان کا ایک لشکر میدان کارزار میں درپیش تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک پر شکوہ لحیم شحیم بزرگ سر پر بڑا سا عمامہ باندھے لشکریوں کا لباس پہنے شمشیر اور ترکش کمر میں لٹکائے، ہاتھ میں کمان لیے اور پیٹھ پر سپر باندھے، ایک بہت اونچے گھوڑے پر سوار، اس یورش میں فوج کے ہمراہ چل رہے ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ان کے گھوڑے کے برابر گھوڑا پہنچا کر میں نے سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور میری جانب متوجہ ہوئے تو میں نے دریافت کیا ''اسم شریف'' کہا۔ فتح اللہ۔ میں نے معلوم کیا۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا ''امروہہ سے'' اسی اثناء میں کوئی صاحب بول پڑے۔ ''شیخ فتح اللہ غازی'' جو ہندستان میں مشہور ہیں۔ آپ ہی ہیں۔ میں نے اظہار نیازمندی کیا اور ان سے جہاد کے بارے میں بہت ہی اچھی اچھی باتیں سنیں۔ جنگ ختم ہونے تک وہ محض نیت جہاد سے لشکر میں رہے اس طرح کہ نہ تو سپہ سالار رستم خاں سے کوئی مطلب نہ دوسروں سے کوئی مقصد و غرض۔ شیخ نور محمد امروہی نے مجھے سنایا کہ ایک دن وہ بیجاپور گئے ہوئے تھے۔ جب تک وہاں رہے وہاں کے والی شہر کو بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہتے

---

1 آپ کرم کے دریا اور اُس کا خزانہ تھے۔ خلق قرآن آپ کا جوہر ذاتی تھا، جس کی صفت اخلاق قرآن ہو بھلا اس کی توصیف مخلوق کر سکے ممکن نہیں ہے۔

تھے۔ایک دن وہ قلعے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے اور خدام سلطان میں سے بھی ایک مغرور شخص وہاں بیٹھا ہوا تھا۔بات چیت کے دوران انھوں نے اس سلطانی سے معلوم کیا کہ تمھارا کیا مذہب ہے؟ کہا۔میں مہدوی ہوں۔وہ اس بات سے بگڑ گئے اور کہا تیرا مذہب باطل ہے۔اس لیے کہ حضرت امام مہدی تو آخری زمانے میں آنے والے ہیں۔اس مہدوی نے بیہودہ بکنا شروع کر دیا۔انھیں غصہ آ گیا اور اس مہدوی کے منہ پر ایسا مکا مارا کہ اس کے آگے کے دو دانت گر پڑے۔شور وغوغا برپا ہو گیا۔والی اندر سے آیا اور اُن کو اپنی حمایت میں لے کر مہدویوں سے خلاصی دلائی۔شیخ عبدالحق دہلوی ''زادالیقین'' میں لکھتے ہیں کہ جب میں مکّے میں تھا تو میں نے شیخ حمید محدث سے سنا کہ فرماتے تھے کہ ایک بار حضرت شیخ علی متقی بیمار پڑ گئے تھے اور بیماری نے شدت اختیار کر لی اور بہت لمبی ہو گئی کہ زندگی کی امید بالکل منقطع ہو گئی تھی لوگ اس کے منتظر بیٹھے تھے کہ شیخ کی وفات کی خبر اب آئی اب آئی۔نماز جنازہ کے لیے حاضر رہنا چاہیے۔دن کا شروع تھا کہ ان پر شدید سکر و جذب کی حالت طاری ہونے لگی۔خادم کو بلایا اور فرمایا۔اے فلانے کیا تو گواہی دیتا ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس میں سچے ہیں؟ خادم نے کہا۔(بیشک) میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ جو فرماتے ہیں یا جو خبر دیتے ہیں اس میں صادق ہیں۔میں نے کبھی آپ کو جھوٹ بولتے سنا، نہ دیکھا۔اس کے بعد فرمایا۔میں مہدئ آخرالزماں ہوں تو میری بات کی تصدیق کر۔خادم نے جواب دیا۔میں نے تصدیق کی اور قبول کیا۔ پھر فرمایا جا (شیخ) عبدالقادر فاکہی کو بلالا۔یہ شیخ عبدالقادر فاکہی مکّے کے اکابر، اعیان، علما اور فقہا میں نہایت فصیح و بلیغ تھے۔آج بھی بیت الفاکہیں مکّے میں مشہور ہے۔وہ شیخ کے حد درجہ محب معتقد اور مرید تھے۔انھوں نے آپ کے مناقب اور احوال میں ایک اجمالی رسالہ بھی لکھا ہے اور مختلف النوع امور میں ان کی دوسری تصانیف بھی ہیں۔انھیں طلب فرما کر کہا۔اے عبدالقادر کیا تم گواہی دیتے ہو کہ ہم سچے ہیں۔کہا ''بیشک آپ جو فرماتے ہیں اس میں صادق ہوتے ہیں۔'' شیخ نے یہ سن کر فرمایا۔تو شہادت دو کہ بیشک میں مہدئ موعود ہوں۔شیخ عبدالقادر نے فرمایا ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ مہدی ہیں''۔اس کے بعد آپ ایسے اُٹھ کھڑے ہوئے گویا کہ بیماری کی کمزوری کبھی انھیں چھو کر بھی نہ گزری ہو حالانکہ اس سے قبل ضعف و ناتوانی کی یہ حالت تھی کہ بستر پر ایسے پڑے ہوئے تھے کہ سانس کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا، ہلنے جلنے کی تو کیا طاقت ہوتی۔اُٹھ کر سرد پانی سے کامل غسل کیا اور سفید

لباس پہنا اور اس مصحف کو جو کاغذ کے ایک دفتر پر حفظ کی آسانی اور نگاہ کی رعایت کی غرض سے واضح طور پر مع دیگر تشریحی فوائد کے اپنے دست مبارک سے انھوں نے لکھا تھا سر کا تاج بنایا اور ہاتھ میں ایک چھڑی لے کر حرم شریف میں داخل ہوئے۔ جمعہ کا دن تھا، بہت سی مخلوق خرد و کلاں کا مجمع وہاں حاضر تھا۔ سب کے روبرو فریاد کرتے ہوئے بآواز بلند کہا ''انـا الـمهـدی الـموعود ، انّـی انـا المهدی الموعود''۔ ''میں مہدیٔ موعود ہوں، میں مہدیٔ موعود ہوں۔ سارا مجمع حیران رہ گیا کہ یہ کیا حال و کیفیت ہے اور کیا ہوا کہ شیخ علی متقی اس ورع و تقوے کے ہوتے یہ دعویٰ کر رہے ہیں اور ایسی صدا لگا رہے ہیں۔ آصف خاں گجراتی نے (جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے) خادموں سے کہا کہ انھیں گوشے میں بٹھائیں اور ان کی محافظت کریں مبادا کوئی انھیں تکلیف پہنچائے۔ آپ اُن کے خادموں کے ہاتھ سے چھوٹ کر باہر نکلے اور شیخ ابوالحسن بھکری کے پاس پہنچے۔ شیخ ابوالحسن حیران رہ گئے کہ اس گھڑی لوگ شیخ کی وفات کی خبر کے منتظر تھے، ان میں یہ سب قوت جوش و خروش اور جلاوت کہاں سے آ گئی۔ سمجھ گئے کہ آج شیخ دوسرے ہی عالم میں ہیں۔

عشق ہر جا کہ سر بر افرازد   پیر صد سالہ را جوان سازد[1]

فوراً آپ شیخ علی متقی کی تعظیم و تکریم کے لیے کھڑے ہوئے اور بہت لطف سے پیش آئے۔ حالانکہ پہلے معمول یہ تھا کہ جب شیخ علی متقی حدیث شریف کے مذاکرے کے لیے شیخ ابوالحسن کے پاس تشریف لے جاتے تو شیخ ابوالحسن اپنی مسند سے نیچے اتر کر ان کے قریب بیٹھتے تھے اور مذاکرہ فرماتے مگر اس دن آپ کو اشارہ فرمایا کہ مسند کے اوپر تشریف لائیں۔ آپ بالاتر آ کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ آج کا دن بہت اچھا دن ہے۔ آج ہم سب سے بالاتر بیٹھے ہیں کہ آج ہمارا (وقت) ہے۔ آج ہماری عزت ہے۔ آج ہماری سلطنت کا روز ہے۔ ہمارے منصب کا زمانہ ہے۔

ز دلبر در دلم غوغاست امروز   ز جانان در سرم سوداست امروز
گدایان را ازین معنیٰ خبر نیست[2]   کہ سلطانِ جہان با ماست امروز

---

1 جہاں بھی عشق سر ابھارتا ہے سو سالہ بوڑھے کو بھی جواں بنا دیتا ہے۔

2 آج میرے دل میں محبوب کی آمد آمد کی دھوم مچی ہے۔ آج میرے سر میں جاناں کا سودا سوار ہے۔ (محرومین وصل کے) گداؤں کو اس بات کی خبر نہیں ہے آج سلطان جہاں موجود حقیقی ہمارے ساتھ ہے۔

اس کے بعد شیخ ابوالحسن سے فرمایا۔ آپ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ میں مہدی ہوں؟ شیخ نے فوراً فرمایا۔ "شهدنا و صدقنا" (ہم شہادت دیتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں) اس کے بعد شیخ ابوالحسن بھکری کے فرزند شیخ محمد بھکری کی جانب متوجہ ہوئے اور شہادت چاہی شیخ محمد نے دیر لگائی تو ان کے والد محترم نے فرمایا۔ اے بیٹے دیر نہ کرو فوراً تصدیق کردو کیونکہ اس وقت ان پر حال طاری ہے اور یہ کیفیت مستی میں ہیں

من نمی گویم انا الحق، یاری گوید بگو　　چون نگویم چون مرا دلداری گوید بگو[1]

اس کے بعد فرمایا۔ کیا ہم لوگوں میں سے اپنے نائبین نہ بنالیں جو کلمۂ حق کے اظہار میں ہماری مدد کریں۔ یہ سن کر شیخ ابوالحسن نے خدام کو اشارہ فرمایا کہ گھر میں ان کے سامنے آ کر بیٹھیں۔ شیخ ابوالحسن کی یہ بات سن کر گویا آپ نے سمجھ لیا کہ وہ ان کا مقصد سمجھ گئے ہیں۔ پھر باہر نکلے تا کہ سلطان روم کے مقرر کردہ بادشاہِ عرب کو دعوت دیں۔ بادشاہ کے گھر کی طرف رُخ کیے چلنے لگے حالانکہ کبھی بھی اس کا گھر آپ نے نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی اس راہ سے گزرے تھے۔ اسی حال میں تھے کہ آپ کے قدم اپنے گھر کی طرف اُٹھ گئے۔ پھر خلوت میں اپنے بستر پر جا کر گر گئے اور سو گئے۔ آدھی رات تک اس عالم کی خبر نہ رہی۔ آدھی رات کے بعد سر اُٹھایا اور خادم کو بلا کر دریافت کیا تجھے کچھ علم ہے کہ ہم سے کیا چیز وقوع میں آئی، کیا سنا اور کیا ہوا؟ کہا۔ آپ بہتر جانتے ہیں آپ پر روشن ہے جو بھی واقعہ تھا۔ فرمایا۔ میں نے جو بھی کہا اور جو کیا اس سے توبہ اور رجوع الی اللہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد تجدید توبہ کی اور استغفار کیا اور جو کچھ کہا تھا اس سے باز آئے۔ جب یہ خبر شیخ ابوالحسن بھکری کو پہنچی، نہایت تیزی کے ساتھ شیخ کے گھر آئے اور حق سبحانہ کا شکر ادا کیا کہ آپ کو اس حال سے نکال کر مقام بندگی پر لے آیا۔ اس کی انھوں نے انھیں مبارک باد دی اور بہت خوشی کا مظاہرہ کیا۔ اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد فرقہ مہدویہ ضالہ کے فسادِ عقیدہ کے رد میں انھوں نے (بہت سے) رسائل تحریر فرمائے۔ اس قصہ ہائلہ کی جیسا کہ سنا گیا یہ کیفیت تھی۔ واللہ اعلم

1　میں انا الحق نہیں کہہ رہا ہوں یار کہہ رہا ہے تو کہہ۔ بھلا میں کیوں نہ کہوں جب میرا دلدار مجھ سے کہتا ہے کہ کہہ۔

مخدوم عالم اور غوث عالم امروہہ

دونوں حضرات شیخ ابنؔ قدس سرہٗ کے پوتے ہیں۔ صفات نیک سے آراستہ اور (گوناگوں) خوبیوں سے پیراستہ ہیں۔ شیخ ابنؔ قدس سرہٗ کی آل واولاد امروہہ میں بہت ہے۔ سبھی اچھے لوگ ہیں۔ روایت ہے کہ شیخ عبداللہ جو کہ شیخ ابنؔ کے نام سے مشہور ہیں۔ ابتدائے راہ درویشی میں امروہہ سے سفر حجاز کے ارادے سے چلے بکنا یج[1] تک پہنچے تھے۔ وہاں ایک مجذوب بامعنی شیخ احمد نام کے رہتے تھے ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ ایک دن اُن مجذوب نے ان سے کہا۔ یہاں سے واپس جاؤ اور دہلی پہنچ کہ تیرے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وصیت ہے۔ اسی طرح کی بشارت خواب میں انھیں بھی دی گئی۔ واپس ہوے۔ اتفاق کی بات ہر دن جس منزل پر آکر ٹھہرتے وہاں بھی کسی شیخ احمد نامی شخص کو ضرور پاتے اور ملاقات کرتے تھے۔ دہلی میں بھی ایک شیخ احمد سے ملاقات کی اور ان کے وسیلے سے شیخ علاء الدین چشتی سے جو مشائخ کبار میں سے تھے اور جامع صفت کرم وسخا تھے اور حضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہٗ سے رابطۂ اخلاص رکھتے تھے اور ''فیل مست'' کہلاتے تھے۔ جن کا 12 ربیع الاوّل 928ھ (1541) میں انتقال ہوا۔ ان سے مرید ہوئے اور فیضیاب ہوئے اور شرح صدر کی دولت پائی۔ شیخ علاء الدین چشتی نے ان سے فرمایا۔ جاؤ اکبرآباد جاؤ۔ انھوں نے اپنے شیخ کا در چھوڑ کر جانے سے گریز کیا تو مکرر تاکیداً فرمایا ''جاؤ'' جب وہاں پہنچے تو وہاں شیخ علاول بلاول نام کے ایک مجذوب تھے صاحب حال وکیفیت۔ انھوں نے شیخ عبداللہ سے کہا۔ ''دو تیغ در یک نیام نمی گنجد'' (ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سماتیں۔) وہ وہاں سے امروہہ آئے اور سلوک طریقت اختیار کیا۔ اسی سلوک کے دوران ہی ''جذبۃ جذبات اللہ'' (اللہ تعالیٰ کے جذبوں میں سے ایک جذبہ) نے انھیں آلیا پھر انھوں نے بہت اونچے احوال حاصل کر لیے۔ وہ سالک مجذوب تھے۔ باوجود مجذوب

---

1 کنایج یا کھانج آج کل کھمبایت کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جگہ کاٹھیاواڑ گجرات میں ایک بندرگاہ تھی۔ کسی زمانہ میں یہ مقام بہت پر رونق تھا۔ اس بندرگاہ کے ذریعہ دوسرے ملکوں سے ہندستان کے تجارتی تعلقات تھے۔ اب یہ ایک ساحلی قصبہ ہے۔

ہونے کے شریعت کے چھوٹے سے چھوٹے حکم کو بھی بلا عمل کے نہ چھوڑتے تھے۔ ان سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ مرید کیا کرتے تھے اور توکلانہ زندگی گزارتے تھے۔ اُن کی وفات 15/ ذی الحجہ 993 یا 995ھ ہے۔ آخری زیادہ درست لگتی ہے۔ کیونکہ ان کی تاریخ وفات کا یہ مصرعہ مشہور ہو چکا ہے

"آہ آہ شیخ ازابن آہ آہ" (995ھ)

ان کے ایک فرزند جن کا نام شیخ نور تھا جو صاحب ذوق وسماع، بااخلاق اور نیک معاملت تھے۔ کہتے ہیں کہ اثنائے سماع ان کے سینے پر سے ان کے قلب کی آگ سے کپڑا جل جاتا تھا۔ لوگوں نے یہ حکایت اکبر بادشاہ تک پہنچائی تو بادشاہ نے ان کو بلایا اور کہا۔ ہمارے سامنے سماع کریں (تاکہ ہم بھی دیکھیں) انھوں نے کہا فقیروں کا سماع اپنے گوشۂ خلوت میں ہوتا ہے۔ بادشاہ کو یہ سن کر غصہ آگیا اور ان کو کشمیر میں قید کرنے کے لیے بھیج دیا کہ انھیں گرمی بہت ہے تاکہ وہ ٹھنڈی پڑ جائے۔ اس سبب سے ان کو بہت محنتیں درپیش آئیں۔ میرے والد صاحب فرماتے تھے کہ میں اس زمانے میں کشمیر میں تھا۔ میں ان سے ملنے کے لیے گیا، اچھا سا نذرانہ اپنے ساتھ لے گیا۔ بہت خوش ہوئے اور مجھ سے دریافت کیا کہ کہاں سے تشریف لائے؟ میں نے کہا۔ سنبھل سے۔ اپنے وطن امروہہ کا پڑوسی ہونے کے سبب وہ اور بھی زیادہ خوش ہوئے۔ بہت اچھی ملاقات اور صحبت گزری۔ دوسرے دن میں شیخ محمود بادل کو جو کہ میرے بزرگوں میں سے تھے، لے گیا۔ خوب ملاقات رہی۔ اس کے بعد شاہی گھرانے کے لوگ ان کی جانب رجوع ہوئے اور ان کے مرید بن گئے۔ جب جہانگیر بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھا انھیں وہاں سے بلا کر ان پر نہایت درجہ مہربان ہوا۔ سنبھل اور امروہہ اور مضافات (امروہہ و سنبھل) کی وزارت وصدارت ان کے سپرد فرمائی۔ وہ باجمعیت تام اپنے محبوب وطن امروہہ آئے اور کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد 1028ھ (1619) میں وصال ہو گیا۔[1] اُن کی قبر ان کے والد محترم شیخ ابن کی قبر کے نزدیک ہے۔ کہتے ہیں کہ شیخ عالم کرمانی سنبھلی جو کہ حضرت شیخ ابن کے خلفا میں سے تھے اور صاحب احوال عظیمہ تھے اور کرامات ظاہرہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک دن حضرت شیخ ابن سے عرض کیا کہ آپ کے

1 ان کے ایک مرید نے مصرعہ تاریخ وفات کہا "ملک جنت پیر ما آباد کرد"، بحوالہ تذکرہ بدر چشت ص 154

صاحبزادے شیخ نور کے کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے دعا و توجہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اولاد نصیب کرے۔ شیخ نے فرمایا۔ ان کا کوئی فرزند نظر (کشف) میں نہیں آتا۔ شیخ عالم کرمانی نے کہا کہ یہ مطلب آپ کی توجہ (دعا) کی برکت سے ظاہر ہوگا۔ فرمایا۔ ہاں ظہور پذیر ہوگا مگر کسی جان کے عوض۔ شیخ عالم کرمانی نے عرض کیا۔ میری جان کے بدلے، کہہ دیں کہ ظاہر ہوجائے۔ شیخ نے فرمایا کہ میرے بدلے بھی دوسرا پسر پیدا ہوگا۔ اس وقت ہی دونوں کے نام مخدوم عالم اور غوث عالم مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دونوں لڑکے شیخ نور کے گھر پیدا ہوئے اور شیخ اس کے قریبی زمانے میں ہی 995ھ (1587) میں اور شیخ عالم کرمانی دو سال کے بعد 26 رشوال 997ھ (1589) کو دنیا سے چل بسے۔ شیخ عالم کرمانی سنبھلی کی قبر سنبھل میں ہے۔ اس وقت ان کے نواسے شیخ عبدالوہاب صالح، صاحب دعا اور نیاز مند فقرا، سنبھل میں ہیں۔ مخدوم عالم کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ پُر نور چہرے والے نیک اخلاق کے مالک بزرگ تھے۔ ایک دن میں نے شیخ امنؒ کے عرس میں دیکھا کہ ایک بہت بڑی جماعت ان کے چاروں طرف بیٹھی ہوئی ہے جو بیعت ہونے کا ارادہ رکھتی ہے اور وہ ہر ایک کو اپنے طریقۂ چشتیہ میں مرید کرکے بہرہ ور کررہے ہیں۔ آج ان کے خانوادے کے مریدین جو شیخ امن کے عرس کے زمانے میں جمع ہوتے ہیں ہزاروں کی تعداد میں بلکہ شمار سے بھی افزوں ہیں۔ ان کی وفات کی تاریخ 1054ھ (1644) ہے۔ آج ان کے صاحبزادے محمد عاشق[1] ان کے سجادہ نشین ہیں جو مقبول عوام و خواص صاحب ذوق و سماع اور فقرا اور درویشوں کے نیاز مند نوجوان ہیں اور ہر آنے جانے والے فقیروں اور غریبوں کی خدمت اپنے ذمے لازم سمجھتے ہیں۔ غوث عالم بھی صاحب ہمت و فتوت نوجوان، صوفیہ کے کلماتِ عارفانہ سے آشنا بزرگ ہیں۔ میرے شیخ جب سے وہ اپنے ابتدائی زمانے میں سید فتح محمد امروہوی کے عشق میں امروہہ پہنچے تھے اور کافی وقت وہاں رہے تھے۔ اتفاق کی بات کہ سید فتح محمد بھی اپنے ہم عمر اور حسن و لطافت میں بھی کامل مخدوم عالم کے نوجوان صاحبزادے محمد کامل پر عاشق تھے۔ جب میرے شیخ امروہہ میں تھے تو ایک رات کو سید فتح محمدؒ، کامل کے دیدار کے لیے حاضر ہوئے، دونوں

---

1 شیخ شاہ محمد عاشق کی وفات 1119ھ/1707 میں ہوئی آپ کی قبر اپنے جد امجد حضرت شیخ امنؒ بدر چشت کے پہلو میں جانب غرب ہے۔

(فتح محمد و محمد کامل) خلوت میں گھر کے اندر جا بیٹھے۔ میرے شیخ بھی اُن کے دروازہ پر پہنچ کر وہیں بیٹھ گئے۔ لیکن اپنے معشوق کے ادب میں جو اپنے معشوق محمد کامل کی صحبت میں بیٹھے تھے اندر نہیں گئے۔ اسی اثنا میں غوث عالم وہاں پہنچے اور میرے شیخ کو اندر لے گئے اور ان کے درمیان شمع روشن کر دی میرے شیخ ان سے بہت دور بیٹھے اپنے معشوق کا نظارہ کرنے لگے اور بہت زیادہ خوش دل اور مست حال تھے۔ اسی حالت شوق و مستی میں انھوں نے یہ دو شعر کہے۔

دو گل دیدم از گلشن خوبروی   بہم بستہ دل فارغ از شور بلبل
یکے بلبل از دور ی گفت بادا   نگہدار آن ہر دو گل حافظِ گل [1]

اس کے بعد یہ رباعی بھی اسی حال میں اپنے معشوق پر کہی۔ رباعی

تاچند براہ دیگران بنشینی   غافل کہ بہ از مشتری و پروینی
عاشق شدہ بگل رُخے پندارم   در چہرہ او سایۂ خود ی بینی [2]

انہی معشوق سید فتح محمد کی توصیف میں میرے شیخ خواجہ خرد نے بہت سے شعر اور بے شمار عاشقانہ باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے ایک رباعی یہ بھی ہے

اے شاہِ فتا(فتح) کہ سردِ شادابی   ظاہر شدہ بجان جہان آبادی
چون حُبِّ رسول ساکن جان و دلی   چون لطف خدا ضامن حاجاتی [3]

ایک بار میرے شیخ دہلی میں تھے۔ سید فتح محمد امروہوی نے امروہہ سے دہلی میرے شیخ کو خط لکھا کہ میری شادی کے دن نزدیک آ گئے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس مجلس میں ضرور تشریف لائیں۔ میرے شیخ کو ایک قوی عذر مانع تھا اس لیے انھوں نے نہ پہنچنے کی معذرت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔

1 میں نے خوبروئی کے گلشن کے دو پھول دیکھے، بستہ دل شور بلبل سے فارغ، ایک بلبل دور بیٹھا کہہ رہا تھا کہ گلوں کا محافظ ان دونوں پھولوں کا نگہبان ہو۔

2 اے محبوب تو کب تک دوسروں کی راہ دیکھے گا۔ اس سے غافل بنا ہوا کہ مشتری اور پروین میں کون بہتر ہے؟ میں گمان کرتا ہوں کہ تو کسی پھول جیسے چہرے والے پر عاشق ہو گیا ہے اور اس کے چہرے میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔

3 اے شاہ سید فتح محمد تو سرسبز و شاداب سرو کا درخت ہے جو میرے دل کی دنیا میں آباد ہو گیا۔ حب رسول کی طرح تو میرے جان و دل میں ساکن ہے اور لطف خدا کی طرح میری حاجتوں کا ضامن ہے۔

اے آن کہ از کمالِ کرم نزد حضرتت — گیرد گناہ و عذر گناہ رنگ یک دگر
گفتی بیا بہ محفل ما و قضا نہاد — بندے بپاے من ز جنبش نماند اثر
تیغ قضا نہ عذر بود کار میدہ است — در حکم تو ہزار قضا و دو صد قدر
لیکن اگر بگوشِ قبولت دہیش جای — آرد زبان شاعریم عذر مختصر
شاہا منم، جدا ز درت جملہ در دو غم — غم را کجا بہ محفلِ شادی فتدگذر[1]

ان سید فتح محمد کو اپنے بڑے بھائی سے عجیب اتحاد و یگانگی اور محبت تھی کہ دونوں ایک ہی سال 1061ھ (1651) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ''بین اتفاق برادری'' اُن کی تاریخ وفات ہے جو کہ شیخ عبداللہ امروہوی نے کہی ہے۔ میں نے یہ قطعہ کہا

سید عبدالرزّاق و شاہ فتاح — چون بسالے بزیر قبر بخفت
سال تاریخ شان خرد مندے — اتفاق برادری بہ بین گفت[2]

وہی غوث عالم آج کل فقرا، غربا، چھوٹے بڑے کی خدمت میں کمر ہمت باندھے ہوئے ہیں اور ان کی خاکساری اور بردباری کی صفت اس سے بھی زیادہ ہے جو بیان کی جائے۔ جیسا کہ آج کل اہل اللہ کی بے قدری اس زمانے میں شائع ہے اُن کے جسم کے کپڑے کھینچتے ہیں اور گندی کھلی گالیاں انھیں دیتے ہیں اور وہ ان کاموں سے تنگ دل نہیں ہوتے بلکہ اور زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں وہ بھی لطف تمام کے ساتھ مجھ سے پیش آتے ہیں۔ شیخ امّن کے عرس

---

1 اے وہ کہ تیری درگاہ میں تیرے کمال کرم کے نزدیک گناہ اور عذر گناہ یکساں رنگ رکھتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ ہماری محفل شادی میں شریک ہو لیکن تقدیر نے پیروں میں ایسی بیڑیاں ڈال دی ہیں کہ جنبش کا بھی یارا نہیں رہا۔ قضا و قدر کا عذر بھی کوئی عذر معقول نہیں کیوں کہ اللہ تعالی کے حکم کے تحت ہی ہیں گو ہزار قضا ہوں یا قدر۔ وہ جب چاہے بدل دے۔ لیکن اگر تو قبولیت کے کانوں میں میری بات کو جگہ دے تو میں شاعری کی زبان میں عذر مختصر عرض کرتا ہوں۔ اے شاہا میں تیری جدائی میں سب کا سب غم بن کر رہ گیا ہوں بھلا محفل شادی میں غم کا کہاں گزارا ہے۔

2 سید عبدالرزاق اور سید محمد فتح ایک ہی سال میں قبر میں سو گئے تو ان کی تاریخ وفات ایک خردمند نے ''اتفاق برادری بین'' (بھائی چارے کا اتفاق ملاحظہ ہو۔ کہی ہے)

میں جس میں ہزاروں فقرا، ان کے خلفا، مریدین اور معتقدین جمع ہوتے ہیں اور یہ مجمع اس ہجوم کثیر اور جم غفیر کے ساتھ پانچ دنوں تک کیسی کچھ دل کشی اور خوش دلی اور سرورِ قلبی کے ساتھ رہتا ہے اور کیسی کیسی دلکش مجالس برپا ہوتی ہیں۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ لوگ (قلندر) انھیں ننگے پیر کھینچے کھینچے پھرتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اُن کے سپرد کیے سب فرمائشیں بجالاتے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر میں نے کہا۔ شیخا! جس کام اور خدمت کے لیے یہ لوگ آپ کو لے جاتے ہیں مجھے حکم دیں اور ان کے چنگل سے خلاصی پائیں۔ کہا۔ نہیں، میں ہی ان کا کام ٹھیک سے بناتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اس جماعت سے کہا کہ اُن کو چھوڑ دو، اور اس کام کو مجھ سے کہو۔ انھوں نے کہا ''نہ'' ہم اُسے تمباکو فروش کی دوکان پر لے جائیں گے تمباکو خریدیں گے اور کھائیں گے۔ آخر کار انھیں نہ چھوڑا لے گئے اور اپنا کام نکالا۔ میں اور دوسرے دوست جو میرے ساتھ تھے اور سب دیکھنے والے حیران رہ گئے کیونکہ ایسی برداشت کا کسی دوسرے سے تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ میں نے اس سر پھری جماعت پر دو شعر کہے

این ملحد گان کہ سر برافراشتہ اند — خود را بخودی موحد انگاشتہ اند
بے قیدیٔ شان شور و شر و حرص طمع — جز قید بروت و ریش نگذاشتہ اند [1]

اس دن کے واقعے سے مجھے یقین ہوگیا کہ مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم بننا دشوار ہے شیخ ہونا سہل ہے مگر مرید (حقیقی) ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ ''رشحات'' میں ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ مرید بہت ہی کم ہیں۔ اسی مجلس میں فرمایا کہ ایک شیخ صاحب نے اکابر میں سے کسی سے کہا کہ اگر کہیں تمھیں مرید صادق کا پتا نشان ہو تو ہمارے واسطے بھی بھیجنا۔ ان بزرگ نے جواب میں کہا کہ یہاں مرید بہت کم ہیں البتہ جتنے شیخ آپ چاہیں آپ کے واسطے بھیج دوں گا۔ (انتہی)۔ حقیقت یہی ہے کہ جو خادم ہے وہی حقیقی مخدوم ہے۔ خادم الفقرا کی شان و شرافت میں ایک حکایت سناتا ہوں کہ اس سے بہتر شاید کوئی روایت نہ ہو جو اس راہ درویشی اور خدا طلبی کے رہرو

---

1 یہ ملحد لوگ جو سر اُٹھائے پھر رہے ہیں اور خود کو بزعم خود موحد سمجھ رہے ہیں۔ شریعت سے ان کی آزادی، شور و شر، حرص و طمع نے علاوہ موچھیں کٹانے اور داڑھی بڑھانے کے کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ یعنی بالکل اتباع شرع شریف سے محروم ہوگئے۔

کے لیے سند ہو۔ وہ یہ ہے کہ ایک بار حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار دار الحرب پر لشکر کشی کیے ہوئے تھے اور دشمن کے قریہ کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لشکر گاہ سے دور تنہا صحرا میں تشریف لے گئے اور کسی کو اپنے ساتھ نہ لے گئے حتیٰ کہ ایک حوض پر پہنچے اور طہارت فرمائی۔ اسی اثنا میں دشمن کا ایک جاسوس حوض کے دوسرے کنارے (کسی حاجت سے) آیا تھا آنحضرت کو دور سے دیکھا تو دل میں سوچا کہ کوئی نیک آدمی لگتے ہیں کیا اچھا ہو کہ لشکر کے احوال اور کیفیت کو ان سے تحقیق کروں؟ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کیا کہ اس لشکر کا سپہ سالار کون ہے۔ اس کا نام کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس لشکر کا خادم میں ہوں۔" اس نے کہا۔ میں لشکر کے سردار کو پوچھتا ہوں نہ کہ خادم کو۔ دوبارہ پھر آپ نے یہی فرمایا کہ "اس لشکر کا خادم میں ہی ہوں۔" تیسری بار بھی یہی سوال جواب ہوئے۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ کوئی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ لشکری لوگ دشمن کے خطرے کی فکر اور حفاظت لشکر سے غافل رہتے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں صبح کی نماز کے وقت سارے اہل لشکر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور لشکر کی حفاظت کے کام سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لشکر گاہ تشریف لے آئے۔ تمام صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) جو لشکر کے کنارے کھڑے ہوئے قدوم میمنت لزوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کر رہے تھے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! ایک دوسرے شخص کو بھی ہم آپ کے پاس دور سے کھڑے دیکھ رہے تھے وہ کون تھا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو واقعہ گزرا تھا بیان کیا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ جاسوس تھا جو دشمن کی جانب سے آیا، خبر لی اور آپ کی بات پر اعتماد کر کے واپس جا کر اہل لشکر کو ہمارے حال سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ اب نماز فجر کے وقت دشمن کی جماعت، ہم پر چڑھائی کر دے گی اور اپنا کام کر لے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے یہ بات سن کر مشورہ کرنے بیٹھ گئے اور یہ طے کیا کہ صبح کی نماز کو اوّل وقت ادا کرنا چاہیے۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی سارے لشکری پہلے کی مانند لشکر کی خبر گیری رکھیں اس جاسوس نے جس نے آپ کا دیدار کیا تھا اور آپ کی معجز بیان باتوں سے آنحضرت کی سچائی کا اسے یقین تام ہو گیا تھا۔ اس جاسوس نے کفار کو جا کر خبردار کیا کہ ایک مرد بزرگ صادق القول سے میں نے

ایسا ایسا سنا ہے۔ انھیں بھی کچھ شبہ اور شک نہیں رہا تو بہت سے کفار ہتھیار باندھ صبح کی نماز کے وقت لشکر پر حملہ آور ہو گئے۔ مسلمانوں نے لشکر میں پہلے سے ہی جا بجا غازیان اسلام کو لشکر کے اردگرد بالکل تیار کر دیا تھا، ان کے آتے ہی جنگ میں کود پڑے اور گھڑی بھر میں انھیں پسپا کر دیا اور پیچھا کر کے اس بستی کے سارے لوگوں کو قید کر لیا۔ اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چین وسکون کے ساتھ بیٹھے تو صحابہ نے سوال کیا آپ نے دشمن کے جاسوس سے تین بار فرمایا کہ ''اس لشکر کا خادم میں ہوں'' اس کی وجہ کیا ہے؟ آنحضرت نے اس وقت بڑی خوش دلی اور سرور کے ساتھ یہ حدیث ارشاد فرمائی۔ ''سید القوم خادمھم'' ''سید الایّام یوم الجمعه'' ''سید الشھور رمضان'' ''سید الطعام لحم''[1] ''نفحات الانس'' کے مقدمے میں ہے کہ سردار کو اس کے خادم سے اس لیے تشبیہ دی ہے کہ وہ ہمیشہ بندگان حق سبحانہ کی خدمت میں لگا رہے اور دل سے یہ چاہے کہ ان کی خدمت میں دنیاوی مالی یا جاہی غرض کا شائبہ بھی شامل نہ ہو اور نیت کو ریا اور ہوس کے شائبہ سے محفوظ رکھے۔ (انتہیٰ)

شیخ حسین اکبرآبادی

شیخ عبدالواحد سنبھلی کے پوتے اور مرید ہیں۔ اور شیخ عبدالواحد شیخ فتح اللہ سنبھلی کے مرید ہیں۔ شیخ حسین صاحب ذوق و وجد وحال اہل معاملت و استقامت تھے۔ ان کی وفات کا سال 1065ھ (1655) ہے ان کے بعد ان کے لڑکے شیخ جمال محمد ان کے جانشین کو میں نے سنبھل میں دیکھا ہے، وہ بھی صاحب ذوق اور ان کے جیسے ہی صاحب حال بزرگ ہیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ اپنے والد سے بھی اونچے ہیں۔ جب 1029ھ (1620) میں میرے والد میرے نانا شیخ یحییٰ صاحب اور میں اکبرآباد پہنچے تو ہم نے شیخ عبدالواحد کی مسجد کے صحن میں قیام کیا اور وہاں چند دن ٹھہرے۔ وہاں میں ہر روز شیخ حسین کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا۔ اپنے وطن اصلی سنبھل کی نسبت سے اور اپنی صفت خلق و کرم سے وہ ہمارے ساتھ بہت خوب سلوک کرتے تھے اور بڑی ہی اچھی صحبتیں گزرتی

---

1 قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔ دِنوں کا سردار جمعہ کا دن ہے، مہینوں کا سردار ماہ رمضان المبارک ہے اور کھانوں کا سردار گوشت ہے۔

تھیں۔ جمعہ کے دن اس مسجد میں خطیب، خطبہ پڑھ رہا تھا درست آہنگ دلکش لہجہ۔ درمیان میں شوق انگیز کلام اور عبارتیں پڑھتا۔ ان کے مریدین میں سے کسی کو وجد ہو گیا، چند بلند نعرے لگائے اور بہت شورش دکھائی۔ اس کا یہ حال دیکھ کر وہ بگڑ گئے اور گردن کے اشارے سے اس کو منع فرمایا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا یہ سکوت مجھے اس شورش سے اچھا لگا۔ ''رشحات'' میں ہے کہ نعرہ لگانا غفلت کی علامت ہے کیونکہ کوئی نعرہ اس وقت لگاتا ہے جب اس کا مطلوب کبھی کبھی حاضر ہو۔ اگر محبوب ہر دم سامنے ہو تو کوئی نعرہ نہ لگائے بلکہ (یہی دوام) حضور وآگاہی اس کی فنا و شہود کا موجب بنتی ہے۔ یہ مقام نعرہ لگانے کا نہیں ہوتا۔ جو بھی نعرے لگاتا ہے اس کی مثال آگ میں جلتی لکڑی کی ہے کہ جب تک اس میں نمی باقی ہے آواز کرتی رہتی ہے۔

یکلخت مکن و بسر مَرو، سر مکشای دیگ را　　　نیک بجوش و صبر کن زانکہ ہمی پزد درست[1]

''رشحات'' میں ہی ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ جس وقت معیت کے اسرار کا بیان فرماتے ذکر کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے جب کسی کو دیکھتے کہ حالت مستی میں نعرہ لگا رہا ہے اس کو خطاب کر کے فرماتے

''نعرہ کم تر زن کہ نزدیک است یار[2]''

''رشحات'' میں ہے کہ مولانا علاء الدین آبنیری کہتے ہیں کہ ایک روز میں سعد الدین کاشغری کے ساتھ خواجہ شمس الدین کاشغری قدس سرہٗ کی مجلس وعظ میں گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پیچھے بیٹھ جا۔ میری عادت تھی کہ میں مجلس وعظ یا مجلس سماع میں بار بار نعرے لگایا کرتا تھا۔ جب خواجہ شمس الدین کاشغری قدس سرہٗ منبر پر آئے اور معارف و حقائق بیان کرنے شروع کیے۔ اسی دوران یہ کیفیت ہوئی کہ ایک حالت پیدا ہوئی اور نعرہ لگانے کا وقت آیا۔ میں نے چاہا کہ نعرہ لگاؤں میری آواز ہی نہ نکلی۔ دوبارہ پھر حالت طاری ہوئی کہ نعرہ لگانے کا تقاضہ ہوا مگر پھر آواز نہ نکلی اسی طرح میں نے تین بار چاہا کہ نعرہ لگاؤں مگر آپ نے میری حفاظت کی اور مجھے نعرہ لگانے کا نہ چھوڑا۔

1　یک لخت مت اکھیڑ اور سر پر لے کر مت بھاگ، نہ دیگ کا ڈھکن اٹھانے میں جلدی کر خوب جوش دے کر چھوڑ دے کچھ دیر صبر کر دیکھ اس طرح ہی ٹھیک پکتی ہے۔

2　نعرہ کم لگا کہ دوست نزدیک ہے دور نہیں ہے۔

''رشحات'' ہی میں ہے کہ مولانا شمس الدین محمد اوجی فرماتے تھے کہ ابتدائے جوانی میں، جب میں اوج قریے میں رہتا تھا، مجھے اس طریق درویشی کا شوق ہوا۔ بعض لوگوں سے میں نے معلوم کیا کہ ہرات میں کوئی بزرگ ہیں کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوؤں۔ لوگوں نے شیخ صدرالدین رودسی کا نام لیا اور بتلایا کہ وہ حضرت شیخ زین الدین خوافی قدس سرہٗ کے خلفا میں سے ہیں اور فی الوقت ارشاد سالکان اور تعلیم طالبان میں مشغول ہیں۔ اسی وقت شہر کی جانب روانہ ہوا اور راستے میں سے ہی حضرت شیخ زین الدین خوافی کے مزار پر پہنچا کیونکہ شیخ صدرالدین اس وقت وہیں تھے۔ اتفاق کی بات آپ وہاں اپنے اصحاب طریقت کے ساتھ ذکر الٰہی میں مشغول تھے۔ میں تھوڑی دیر تک ایک طرف کھڑا رہا اور ان حضرات کے ذکر کی آوازیں سنتا اور حرکات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ یہ طریقہ مجھے پسند نہ آیا اور وہاں سے شہر کا رُخ کیا۔ راہ میں مجھے حافظ اسماعیل ملے وہ اوج کے ایسے بزرگ شخص تھے جو حضرت مولانا محمد اوجی کی خدمت میں آنے سے پہلے حضرت مولانا سعدالدین قدس سرہٗ کی خدمت میں رہے تھے۔ اور شرف قبولیت سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ حضرت مولانا سعدالدین کاشغری کے انتقال کے بعد حضرت مخدومی مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ کی صحبت ومعیت میں حج کر چکے تھے اور اس طریق نقشبندیہ سے بہرۂ تمام رکھتے تھے۔ مولانا شمس الدین اوجی نے فرمایا کہ حافظ اسماعیل صاحب نے مجھ سے معلوم کیا۔ تم کہاں سے آرہے ہو اور کیا ارادہ ہے۔ میں نے سب قصہ سنایا۔ سن کر فرمایا۔ جاؤ جامع مسجد کے دروازے پر جاؤ۔ وہاں ایک بزرگ ہیں جو کبھی کبھی جامع مسجد کی چوکھٹ پر مجمع اصحاب کے ساتھ مجلس صحبت رکھتے ہیں۔ انھیں بھی دیکھ لو۔ امید غالب ہے کہ ان کی صحبت تمھیں پسند آئے۔ اسی قدم پر مسجد کے دروازے کی جانب مڑ گیا۔ اتفاق کی بات حضرت مولانا بزرگوں کے ایک مجمعے کے ساتھ دالان مسجد میں خاموش بیٹھے تھے۔ میں دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا اور دیوار پر تکیہ کیے آپ کو دیکھتا تھا اور آپ کی خاموشی دیکھتا تھا۔ حضرت شیخ صدرالدین کے حلقۂ ذکر اور ان اصحاب کے شور شرابے کو سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں خود سے کہہ رہا تھا وہ فریاد اور اضطراب کیا تھا اور یہ سکوت اور دل آرائی کیسی ہے۔ ناگاہ حضرت مولانا نے سر اوپر اٹھا کر مجھ سے فرمایا برادر آگے آؤ۔ میں بے خود بنا سامنے پہنچا۔ مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا اور فرمایا۔ اگر کوئی

غلام یا نوکر شاہ رخ مرزا کے روبرو کھڑا ہوا اور ہمیشہ اس کے سامنے ہی رہتا ہو۔ اب اگر وہ بلند آواز سے شاہ رُخ مرزا کو پکارتا ہے شاہ رخ شاہ رخ، بڑی بے ادبی اور بے سری کی بات ہے۔ ادب یہ ہے نوکر بادشاہ کے سامنے اور غلام آقا کے سامنے خاموش رہے فریاد و غوغہ نہ کرے۔ اس کے بعد یہ شعر پڑھا

کار نادان کوتہ اندیش است   یاد گیرد کسے کہ در پیش است [1]

مُلّا محبّ علی[2] ٹھٹھی

بڑے قابل قدر و قیمت بزرگ ہیں۔ مخلص اور راست باز۔ وہ اللہ واسطے کی خدمت میں یگانہ وقت تھے۔ ان کے تمام طریقے بڑے بے تکلفانہ تھے۔ شیخ تاج الدین سنبھلی (قدس سرہٗ) کے صحبت یافتہ تھے۔ خلق خدا کو نفع پہنچانے کی مخلصانہ غرض کے ساتھ شاہ جہاں بادشاہ کے دربار میں رہا کرتے تھے۔ بادشاہ صاحب قِران ثانی ان کے ساتھ بڑے الطاف و اعطاف سے پیش آتے انھیں اپنے تخت کے قریب ادب و احترام سے بٹھاتے اور اس راہ محبت الٰہی کی گفتگو کیا کرتے تھے۔ مظلوموں اور محتاجوں کے کام نکلوانے میں انھیں ایک خاص ملکہ تھا۔ شاہ جہاں اور شہزادوں کی درگاہ میں ان کی سفارشیں سبیل کے پانی کی مانند تھی۔ جس کے بارے میں جو کچھ سفارش کرتے یا لکھتے کارگر ہوتی۔ اپنے اسی وصف کاربرآری محتاجاں، مفلسوں اور مجبوروں کے طفیل انھیں راہ سلوک میں کشادگی حاصل ہوئی تھی۔ دربار شاہی کی نوکری کو انھوں نے اپنے حال کا پردہ بنا رکھا تھا۔ میر عبدالاوّل کی ''جمع'' میں حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کا ملفوظ ہے کہ بزرگان دین میں سے ایک بزرگ کو ''طریق حق'' میں مشکل پیش آئی جو کسی سے حل نہ ہوئی۔ ایک بار خواب دیکھا کہ ان سے کہہ رہے ہیں کہ تیری مشکل فلاں دربان سے جو کہ بادشاہی دربار میں رہتا ہے حل ہوگی۔ جب آنکھ کھلی تو خیال آیا کہ ایک دربان جس نے اپنی عمر علی الدوام دربانی کرنے میں برباد کی ہو۔

---

1 جو شخص روبرو ہے اسے پکارنا یاد کرنا، نادانوں اور کوتہ اندیشوں کا کام ہے۔

2 ان کی اصل براس قبیلے سے ہے۔ ٹھٹھ (سندھ) میں ولادت ہوئی۔ ملا محب علی سندھی کے نام سے شہرت پائی۔ خم خانہ وحدت کے جرعہ نوش تھے۔ اکبر بادشاہ اور جہانگیر بادشاہ کے ہم عصر تھے۔ (ریاض الشعراص 662)

اور جو مستقل اہل غفلت میں رہتا ہوا سے ان حالات و کیفیات کی کیا خبر؟ اسی خیال کی بنا پر اُن کے پاس نہ گئے۔ پھر خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ اگر اپنی مشکل کا حل چاہتا ہے تو اسی کے پاس جا۔ مگر پھر وہی خیال کر کے نہ گئے، تیسری بار پھر خواب دیکھا کہ اگر چاہتا ہے کہ تیری مشکل حل ہو تو اس بیساول کے پاس جا۔ سوچا کہ شاید حق سبحانہ کی اس کے اوپر خصوصی عنایت کی نظر ہو کہ کئی اشارے مل چکے۔ اس کے پاس جانا چاہیے۔ جب بادشاہ کے دربار میں پہنچے اس شخص کی تلاش اور معلومات کی۔ اس کو دربانوں کی جماعت اور لباس میں دیکھ کر دل میں کہا کہ ایسے آدمی کو اس علم اور اس حال سے کیا کام اور لوٹ پڑے۔ ان بیساول کو اس سب کی اطلاع اور ہر بات سے آگاہی تھی ان کو بلایا اور فرمایا۔ تیری یہ دیر کرنی بہت بری بات ہے اور بڑی ناپسندیدہ ہے تجھے بار بار کہا کہ بیساول کے پاس جا مگر تو نہ آیا۔ اب بھی جب آیا ہے تو میری صورت لباس رہن سہن دیکھ کر برگشتہ ہو گیا۔ ان بزرگ کو بڑی ندامت ہوئی استغفار کیا۔ اس کے بعد کہا۔ تیری مشکل یہ ہے اور مشکل کا جواب دیا۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ کس عمل کی وجہ سے حق سبحانہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے شرف یاب کیا ہے۔ کہا اس سبب سے کہ میں جب ہر صبح بادشاہ کے دربار میں آتا ہوں میری نیت یہ ہوتی ہے کہ ہر نا مشروع (بات) اور ظلم جو بھی دیکھوں اسے دفع کر دوں اور کسی مسلمان کو راحت پہنچاؤں۔ اگر میسر ہوتا ہے خوش ہوتا ہوں اور حق تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اور میسر نہیں ہوتا تو غم کھاتا ہوں اور صبر کرتا ہوں (اور دعا کرتا ہوں) ان دو کاموں کے سبب سے حق تعالیٰ نے مجھے اس مرتبے سے مشرف فرمایا ہے کہ تو اور تجھ جیسے ہزاروں میرے محتاج ہیں۔ (انتہی) روایت ہے کہ ایک دن ایک قلندر نے محب علی سے کہا کہ ''اے فلاں اگر تو خدا تک پہنچنا چاہتا ہے تو جا ایک دیگ لذیذ کھانے کی پکا اپنی دستار پر رکھ کر یہاں لا۔ وہ گئے اور خود دیگ پکائی باوجود اس شان و شوکت کے کالی دیگ کو اپنے سر پر رکھ کر لائے اور اس قلندر کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ ان کے بہت سے بلند پایہ فصیح اشعار ہیں۔ ان میں سے یہ تین شعر مشہور ہیں

یکے عکس خورشید در آب دید دواں بر سرش دام ماہی کشید [1]

---

1 کسی نے پانی میں جب سورج کی تصویر دیکھی تو اسے نکالنے کے لیے فوراً مچھلی کا جال اس پر پھینکا۔

چون از جنبش باد درہم شکست　　بغواصی (آمد) کش آرد بدست

فرو رفت ناگہہ بکام نہنگ　　ترا زوے ما را ہمین است سنگ[1]

ہندی ٹھٹھیان میں بھی ان کے دوشعر ملتے ہیں

عاشقاں اِلہہ ویلی تار نوسری　　جنسے سر کہو کا مورے نہ منیہ آئی

میں نے ان کو ایک بار بادشاہ صاحب قران ثانی کے دربار میں دیکھا تو ان کی دل پسند اور خوشنما وضع قطع سے نہایت محفوظ و مسرور ہوا۔ وفات کا سال 1040ھ (1630) ہے۔

شیخ دوست محمد سندھی

اللہ تعالیٰ کے دوستوں میں سے ہیں۔ شاہ ابوالمعالی قادری کے مرید ہیں۔ بہت سے سفر کیے ہوئے اور بہت سے مشائخ کی صحبت اُٹھائے ہوئے۔ ان سے بہرہ مند اور فیض یافتہ۔ وہ ہمیشہ طائفہ صوفیہ خصوصاً حضرت غوث اعظم کے ملفوظات کے چند جز و کتاب اپنے ساتھ رکھتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ مجھ سے کہا کرتے کہ فلانے اس راہ کے طالب کو چاہیے کہ مستقل طور پر اس گروہ صوفیہ کے ملفوظات دیکھتا رہے۔ دوستان خدا سے جدائی کے زمانہ میں کوئی نعمت اور دولت اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی حکایتیں اور ان کے احوال کے مطالعے سے بہتر اور مفید نہیں۔ ان دونوں میں اپنے شیخ کے آگے رسالہ ''بہائیہ قدسیہ'' کو سنا رہا تھا۔ میں نے کہا الحق، یہی بات ہے۔ اس رسالے کے مقدمے کو ان کے سامنے پڑھا تو بہت خوش ہوئے۔ اس کے مقدمے کی کچھ عبارتیں یہ ہیں کہ اس گروہ (اولیا و اصفیا) کی باتیں ذوقی اور حالی ہوتی ہیں نہ کہ رٹے رٹائے منقول اقوال بزرگان سے، جیسا کہ اہل بصیرت نے فرمایا ہے کہ...... فقط۔

''اللہ اکبر و برہانہٗ الاظہر''[2]

1　جب سورج کا عکس ہوا کی جنبش سے درہم برہم ہو گیا تو اسے نکالنے کے لیے پانی میں غوطہ لگا کر تلاش کرنے لگا۔ اچانک مگرمچھ کا نوالہ بن گیا۔ ہماری ترازو کے یہی باٹ ہیں۔ یہی ہمارا انصاف ہے کہ جو فانی دنیا کی طلب میں منہمک ہو کر آخرت بھلا دے، ختم ہو جاتا ہے مگر جو باقی یعنی آخرت کی طلب میں سرگرداں رہے تو ہمیشہ ہمیش کی کامیابی عطا فرماتے ہیں۔

2　اللہ سب سے بڑا ہے اور اس کی دلیل بالکل اظہر ہے۔

اہل بصیرت کو جو یقین اس گروہ کی عارفانہ اور محققانہ گفتگو میں غور و تامل کرنے سے حاصل ہوتا ہے وہ اس یقین سے جو کرامتوں کے مشاہدے سے ہوتا ہے، بہت زیادہ قوی اور اعلیٰ ہوتا ہے۔

موجب ایمان نباشد معجزات　　بوے جنسیت کند جذبِ صفات
معجزات از بہر قہر دشمن است　　بوے جنسیت پئے دل بر دن است [1]

کیونکہ اس گروہ کی باتیں کلام الٰہی کی تجلی سے معکوس ہوتی ہیں تو ان باتوں کی خوبی کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اکابرین میں سے کسی کا قول ہے "الحمدللہ الذی جعل الانسان الکامل معلم الملک و اعلیٰ تشریفا و تنیئلاً بانفاسه الفلک۔" [2] مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی بعض منکرین، قرآن کو "اساطیر الاوّلین" کہتے ہیں۔ حق ہے۔ "یُضِلّ بِہٖ کثیراً وَ یَھدی بہٖ کثیراً" [3]۔ پس اس گروہ صوفیہ کی باتیں بھی مصر کی نیل ندی کی مانند ہیں کہ محجوبین کے حق میں تو میٹھا پانی ہیں اور مجوبین کے لیے بلائے جان ہیں۔

ہر کہ افسانہ بخواند افسانہ ایست　　و آنکہ دیدش نقد خود مردانہ ایست
نیل آبست و بقبطی خون نمود　　قوم موسیٰ را نہ خون بد آب بود
دشمن این حرف این دم در نظر　　شد مخلد سرنگوں اندر سقر
گر تو مردی راز جوی (و) راز جوی　　جان فشان و خون گری باز جو [4]

1 پیغمبروں کے معجزات ایمان کا موجب نہیں ہوتے بلکہ ہم جنسیت کی بوصفات کے جذب کرنے کا سبب بنتی ہے۔ معجزات تو دشمنوں کے قہر کے مقابلے کے لیے ہوتے ہیں اور ہم جنس کا میلان ہم جنس کی طرف ہونا دل کی کشش کے لیے ہے۔

2 تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے انسان (کامل) کو فرشتوں کا معلم بنایا اور اسے اپنے بلند مرتبہ کلام سے شرف و قرب میں ساری مخلوق سے بڑھا دیا۔

3 اسی قرآن سے اکثر کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے۔

4 جس نے اس مثنوی کو قصہ سمجھ کر پڑھا اس کے لیے یہ افسانہ ہی ہے اور جس نے اس کے معنیٰ میں گھس کر دیکھا تو یہ اللہ والوں کی نقدی ہے۔ دریائے نیل میں پانی ہی تھا جو قبطیوں کے حق میں خون بن گیا لیکن قوم موسیٰ کے لیے پانی ہی تھا۔ اسی مثنوی کا دشمن اس وقت نظر کشفی میں دوزخ میں سرنگوں دکھائی دیا۔ اگر تو مردان خدا میں سے ہے تو اس کے معنیٰ کو تلاش کر۔ معنیٰ کو تلاش کر جان قربان کر خون رو پھر بھی نہ پائے تو پھر جستجو کر۔

امراض باطنی سے تصفیہ دل کے بعد، ظاہری عوائق اور علائق سے یکسوی میں تامل بسیار کے بعد ان قدسی انفاس بزرگوں کے کلام کے حقیقی معنیٰ جلوہ گر ہوتے ہیں، سمجھ میں آتے ہیں اور فہم حقیقی کا جمال دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس قوم کے ملفوظات علم وراثت باطنی سے عبارت ہیں نہ کہ علم درس و دانائی و عقل حسی سے۔ ظاہری زبان و بیان اس کے حقیقی معنیٰ کے اظہار سے کماحقہٗ قاصر ہے اگر چہ انسان علم و عبارت میں اس قوم اصفیا و اولیاء نے زبان حال و ذوق سے اس طریقے کی جانب اشارے فرمائے ہیں اور جہاں تک ہو سکا اظہار حقائق کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی اس حال و مقام کو پا نہیں لیتا اس کی شرح نہیں کر سکتا۔ ''وما قدر الله حق قدره[1]'' و ما زادهم غير ستر. فانّ الاعراب عنه بغير ذائقةٍ سِترٌ والاظهار بغير وجدٍ اِخفاءٌ[2]'' ایسے جملوں سے کہنے والوں کا مقصد اکسانے اور شوق بڑھانے سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی باتیں طالبین کی طلب کو قوت دیتی ہیں اور ان کی ہمت کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ اور اگر کسی کے سر میں غرور ہو تو شکستہ کرتا ہے تاکہ دوسروں کی دولت اور اپنے افلاس کو دیکھے۔ مشائخ میں کسی کا قول ہے کہ مخلوق کو اپنی ترازو میں مت تول بلکہ اپنے نفس کو صدیقین کی ترازو میں تول تاکہ تو ان کی فضیلت اور اپنے افلاس کا مشاہدہ کرے۔ شہید شیخ مجدالدین بغدادی قدس سرہٗ دعا کیا کرتے تھے اور عرض کرتے تھے۔ الٰہی تیرے کام اسباب کے محتاج نہیں مجھے یا تو اس قوم صوفیہ و اولیاء میں سے کر دے یا ان کے دیکھنے والوں میں سے بنا دے ورنہ میں تو اِن کے سے مجاہدوں کی طاقت و قوت نہیں رکھتا۔

گر نیم مردان رہ را ہیچ کس	ذکر ایشان کردہ ام اینم نہ بس
گر نہ ام ز ایشان ز ایشان گفتہ ام	خوشدلم کاین قصہ از جان گفتہ ام[3]

1 لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا جیسا کہ حق تھا، ادا نہ کیا۔ (القرآن)

2 ان کے بیان سے بجائے حصول معرفت کے اور پردے حائل ہو گئے۔ کیونکہ بغیر لذت قرب الٰہی کو چکھے ہوئے اس کی تعریف کرنا اسے اور پوشیدہ کرنا ہے۔ اور بغیر پائے دکھانا، چھپانا ہے۔

3 اگر چہ میں مردان راہ اور اولیاء کے شمار میں کچھ بھی نہیں۔ میں نے اُن کا ذکر کیا ہے کیا میرے لیے یہی کافی نہیں۔ اگر چہ میں ان میں سے نہیں ہوں مگر میں نے ان کی ترجمانی تو کی ہے۔ میرا دل خوش ہے کہ میں نے یہ داستان جان و دل سے کہی ہے۔

شیخ امام ربانی ابو یعقوب یوسف ابن ایوب ہمدانی قدس اللہ ارواحہم سے پوچھا کیونکہ یہ حضرات اولیاء اللہ خود کو چھپائے رکھتے ہیں کیا کروں تاکہ ان کی باتوں سے واقف ہوؤں۔ فرمایا۔ ہر دن ان کے ملفوظات میں سے ایک پارے کی مقدار پڑھا کریں۔ صدیقین میں سے کسی کا بیان ہے کہ کوئی ہو جو اس محبوب حقیقی کا ذکر کرے اور میں سنوں یا میں اس کی باتیں کروں اور وہ سنے۔ اگر جنت میں اس کا ذکر اور اس کی گفتگو نہ ہو تو مجھے جنت سے کیا لینا ہے۔ ان کے پاکیزہ ملفوظات سے جذبات و مواجید کا اقتباس کیا جا سکتا ہے۔ ''ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ و عمل صالحاً''[1]

مثنوی

گر ندارم از شکر جز نام بہر ۔۔۔ زین بسے خوشتر و اندر کام زہر

آخرم زان کاروان گردے رسد ۔۔۔ قسم من زان رفتگان دردے رسد

نطقہا نسبتِ با و قشراست نیک ۔۔۔ پیش دیگر فہم ہا مغز است نیک

آسمان نسبت بعرش آمد فرود ۔۔۔ ورنہ بس عالیست پیشِ خاک تود[2]

یہ قدسی کلمات اگرچہ قصیر البیان ہیں مگر کثیر المعنیٰ ہیں۔ قلیل کثیر پر دلالت کرتا ہے اور ایک گھونٹ پانی بھی بحر قدیر کی خبر دیتا ہے کہ میٹھا ہے یا کھارا۔ ''قدوۃ الکبار'' شیخ بزرگوار شیخ عبدالرحمٰن سلمی[3] نیشاپوری قدس سرہٗ ''تفسیر حقانی'' اور کتاب ''طبقات مشائخ'' کے مصنف ہیں۔ کتاب ''طبقات مشائخ'' میں مشائخ کبار میں سے ہر ایک کے کم و بیش بیس بیس ملفوظات آپ نے دے دیے ہیں۔ ملفوظات کی اسی مقدار سے اولوالابصار عقلمند اور صاحب دل حضرات نے ان بزرگواروں کے طریقے، علم و عمل اور حال کی سیر کر لی ہے۔ ان چند ملفوظات میں ان کے بعض ایسے علوم و معارف کا

---

1 بھلا اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک اعمال بجالائے۔

2 اگرچہ میں برائے نام ہی شکر رکھتا ہوں مگر منہ میں زہر ہونے سے تو بہت بہتر ہے۔ آخر کار مجھے بھی اس کارواں کی گرد پہنچ گئی ہے۔ اُن گزرنے والوں سے میرے نصیب کی تلچھٹ مجھے مل گئی ہے۔ اس شاہ سخن کے نزدیک ہماری بہت سی خوش کلامیاں چھلکے کی مانند ہیں لیکن اس کے علاوہ دوسروں کے سامنے وہ مغز ہی مغز ہیں۔ آسمان عرش کے مقابلے میں ہی نیچا ہے ورنہ تو وہ مٹی کے تودے کے سامنے تو بہت ہی بلند و بالا ہے۔

3 شیخ طریقت ابو عبدالرحمٰن محمد بن الحسین السلمی نیشاپوری وفات 412ھ/1022 مصنف ''طبقات الصوفیہ''

بیان ہے جن پر سیر و سلوک کی بنیادیں قائم ہیں۔ "ولنا فیه اسوة حسنة فی تقلیل الکلام مع الدلالة علی المرام[1]" حاصل یہ ہے کہ

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام[2]

شیخ داؤد بن شیخ صادق گنگوہی

وہ اپنے والد محترم سے نسبت درست کرتے ہیں۔ اپنے والد کے جانشین بھی ہیں۔ شیخ عبدالقدوس کے پوتوں میں سے ہیں۔ صاحب وجد و سماع ہیں۔ نیک اخلاق، باہمت و فتوت اور معاملات میں مستقیم ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی بابرکت صحبت سے کامیاب ہوے ہیں۔ روایت ہے کہ جب وہ بارہ سال کے تھے کہ اس راہ کی طلب ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ انھوں نے کہا (مجھے) ذکر و طریقہ کی تلقین فرمائیں۔ لیکن ان کے والد اور دوسرے لوگوں نے کہا پہلے پڑھ لو پھر اس طرف آنا۔ آپ نے ضد میں کہا کوئی ذکر مجھے فرمائیں کہ میں کروں۔ ان کے والد نے (پھر) کہا کر لینا لیکن پہلے ذکر کا طریقہ جو اس سلسلے کا ہے وہ سیکھ لو، مگر کثرت شوق سے انھیں رات کو نیند نہ آئی۔ حالت جذب پیدا ہوگئی۔ جب جواں ہوے اپنے والد سے طریقہ ذکر حاصل کیا اور بہت تھوڑی مدت میں اپنے سلسلے کے طریقہ شغل کو جو کہ بہت دشوار ہے ریاضت و مجاہدہ کے ساتھ انصرام کو پہنچا دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک بار وہ معتکف تھے۔ اسی میں ان کے والد شیخ صادق نے کہا کہ ہمارے ساتھ شکار کے لیے چلو۔ ان کے والد کو شکار کا شوق تھا انھوں نے عرض کیا کہ اعتکاف پورا ہونے میں دو روز باقی ہیں۔ آگے جو آپ کی مرضی۔ کہا کہ اعتکاف میں جو فتوح ہوتی وہ شکار میں مل جاے گی۔ ان کو اپنے ساتھ شکار میں لے گئے جب واپس آے تو ان کے والد نے کہا۔ آج کی رات سونا مت بلکہ متوجہ الی اللہ رہنا میں بھی متوجہ رہوں گا۔ ایسا ہی کیا۔ آخری شب کو انھیں فتح ہوگئی۔ ان کے والد اور ان کے یاروں نے صبح کو انھیں مبارک باد دی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن وہ سرگرم سماع تھے، اچانک ان کی پیشانی میں سخت چوٹ لگی اور زخمی ہوگئے۔ وہاں کی کھال پھٹ گئی اور چہرے پر آپڑی اور ان کے

---

1 اس میں ہمارے واسطے تقلیل کلام پر عمل پیرا ہونے کے لیے بہترین دلیل اور نمونہ موجود ہے۔

2 کوئی ناقص کسی کامل کے حال کا پتا نہیں لگا سکتا۔ اس لیے بات کوتاہ (کرنی) چاہیے اچھا سلام۔

کپڑے خون آلودہ ہو گئے مگر اس ذوق و مستی سے بالکل نہ رکے آخر زبردستی ان کو پکڑا اور کھال کو پھر اسی جگہ سی دیا جو بہت مدت میں ٹھیک ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک بار، بادشاہ صاحب قران ثانی نے ان کو اپنے سامنے طلب کیا۔ بادشاہ کو ان کی روش (زندگی) اچھی لگی تو منشی کو حکم دیا کہ ان کا نام اہل وظیفہ میں شامل کر لے کہ صاحب ذوق ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک سازندہ کے لڑکے کو ایک رباب بجانے والے کے سپرد کر کے پوچھا کہ کتنے دن میں بجانا سیکھ لے گا۔ کہا کہ ایک سال میں اور اگر دن رات مشق کر لے تو چھ مہینے لگیں گے۔ انھوں نے کہا۔ اتنے دنوں کا میں کیسے انتظار کروں اور اس لڑکے سے کہا اپنے آپ بجانے کی کوشش کر۔ لڑکا اسی میں لگ گیا اور چند مہینے میں جو چھ ماہ سے کم کی مدت تھی استادوں سے بھی اچھا بجانے لگا۔ ایک دن انھوں نے شیخ عبدالقدوس کا دہلی میں عرس کیا۔ میرے شیخ کی دعوت کی۔ میرے شیخ مجھے اور دوسرے یاروں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بڑی اچھی مجلس ترتیب دے رکھی تھی آخر وہ ذوق سماع میں آگئے اور بڑی ادائے دل کش کے ساتھ گشت کرنے لگے۔ اسی اثنا میں وہ باتیں جو وحدت الوجود سے تعلق رکھتی ہوں کہنی شروع کیں اور جو کچھ کہا از راہ ذوق کہا۔ ان کے سماع کی تاثیر سے ان کے اکثر یاران طریقہ سماع میں تھے۔ وہی رباب بجانے والا غزل کہہ رہا تھا اور بہت اچھا رباب بجا رہا تھا۔ اس دن میرے شیخ اور شہر کے اور درویش وہاں حاضر تھے سب کے سب مسرور وقت تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے والد شیخ صادق اہل کمال اور صاحب ذوق و وجد و حال تھے۔ ان کے زیادہ تر مریدین بہت اچھے حالات رکھتے ہیں۔ اُن کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی۔ کسی وقت عشرت خان جو کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ کی اولاد دختری میں سے تھے دہلی کے حاکم تھے یہ 1040ھ کی بات ہے۔ وہ میرے شیخ کے حد درجہ معتقد تھے۔ میرے شیخ بھی اسی پیرزادگی کی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے خالص دوستی کا برتاؤ رکھتے تھے۔ خوب صحبتیں رہتی تھیں۔ اس زمانے میں میں بھی وہاں تھا۔ ایک دن عشرت خاں نے میرے شیخ سے معلوم کیا کہ اس زمانے میں ایسا شیخ کامل کہ جس کی صحبت سے اس راہ درویشی کا پورا حصہ حاصل کیا جا سکے، کون ہے؟ میرے شیخ نے فرمایا میری عقیدت میں دو شخص ہیں۔ شیخ الہداد خلیفہ خواجہ بیرنگ دہلی میں اور شیخ صادق جو کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے ہیں۔ گنگوہ میں۔ شیخ عبدالقدوس ہندستان کے مشائخ کبار میں سے گزرے ہیں۔ بڑے صاحب کرامات، مقامات و احوالِ صافیہ اور شاندار طور طریق رکھتے

تھے۔ اوران کا انتقال 945ھ (1538) میں ہوا ہے۔ ان کے بہت سے ذوقی رسائل ہیں۔ جیسے ''انوارالعین'' جوسات فنون پر مشتمل ہے۔ وغیرہ ذالک۔ ان میں سے ''رشدنامہ'' جو ہندی اور فارسی اشعار اور دوہوں پر حاوی ہے۔ اس میں کے یہ چند فقرے پیش ہیں: ''اے بھائی! عالم صورت و معنی میں قطعاً اور یقیناً غیر حق کچھ بھی نہیں ہے۔

کہ جہان صورت است و معنی دوست   درین معنی نظر کنی ہمہ اوست [1]

چوپائی

جل تھل میرا ور اکاس   سرب نرنتر تورین پاس

توہ جہان سے کتھوں نجانو   جہان رے با تو تہان تو را نہانو

باہر بھیتر کہا نجائے   سرب نرنتر انگی کائے

الکھداس [2] کو موراکنت   وو نہ سکھی تبہ بسنت

دوہرہ

یہ جگ ناہین ناح کی بوجھو پرم گیان   سوپانی سو بلبلا سوئی سرورجان

بس تجھے چاہیے کہ ہر قدم ہر دم غیر حق پر نظر نہ ڈالے اور اس کے سوا کسی سے دل نہ لگائے اور ہر ایک چیز کہ (جس سے تو دل لگاتا ہے حقیقت میں اس کے) سوانہ ہوگی تو جانے یا نہ جانے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''فاین (ما) تولو فثم وجه الله [3]'' حضرت رسالت (پناہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا۔'' **یا احمد عندنا شرابٌ اذا اشربوا أُسكروا. و اذا أُسكروا واذا اطربوا وجدوا. واذا وجدوا وصلوا. واذا وصلوا لا فرق بيني و بينهم** [4]'' (انتہی) شیخ صادق کے مریدین میں سے آج (شیخ) ابراہیم صاحب

---

1 دنیا صورت ہے اس کا باطن محبوب حقیقی ہے۔ اسی حقیقت میں غور کر کہ سب کچھ وہی ہے۔

2 شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ہندی میں ''الکھداس'' تخلص فرماتے تھے۔

3 تم جدھر بھی رُخ کرو وہی وجہ اللہ ہے۔

4 اے احمد ہمارے پاس ایسی شراب ہے کہ (ہمارے عاشق) اسے پی لیتے ہیں تو مست ہوجاتے ہیں اور جب بے خودی طاری ہوتی ہے مستی چھا جاتی ہے۔ جب مستی چھا گئی تو وجد میں آگئے۔ جب واجد بنے تو واصل ہوگئے۔ وصول میسر ہوجائے تو مجھ میں اور میرے دوستوں میں پھر کچھ تفریق نہیں رہتی ہے۔

وجد وسماع ہیں۔ انھوں نے مدتوں اپنے شیخ کی صحبت میں وقت گزارا ہے۔ اپنے شیخ کے سلسلے کے ذکر کی جو تعداد مقرر و متعین ہے انھوں نے تکمیل کر لی ہے۔ ان کے شیخ اس وجہ سے کہ انھوں نے دیگر مریدین کی نسبت ریاضات شاقہ اور مجاہدات شدیدہ کر کے کام کو بہت جلد کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ان کی بہت تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ میرے مریدوں میں سے ہے۔ اور نسبت عالی رکھنے والوں میں سے ہے۔ شیخ ابراہیم کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر سے جو کہ یوسف زئی قوم میں پشاور کے نزدیک ہے ابتدائے جوانی میں ہمیشہ کے لیے بغرض علم دین نکلا۔ لاہور پہنچا اور علوم ظاہری کی تعلیم شروع کی۔ میرے نوجوان ساتھی لذات جوانی میں پڑ گئے اور میرے مخالف ہو گئے۔ اسی اثنا میں مجھے اس راہ تصوف کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور حالت مستی نے مجھے گھیر لیا تو میں جا بجا کسی بزرگ کامل کی طلب میں گھوما پھرتا تھا آخر بنور پہنچا اور شیخ آدم بنوری کی خدمت میں رہنے لگا۔ ایک دن وہاں کسی نے بلند آواز سے نام مبارک ''اللہ'' زبان سے نکالا۔ مجھے وجد وحال طاری ہو گیا۔ میں منہ کے بل گر گیا۔ اور بے خود ہو گیا۔ جب افاقہ ہوا حالت مستی پھر بھی نہ گئی اور جوش وخروش میں گزارتا تھا۔ شیخ کے اصحاب میں سے کسی نے ایک دن شیخ کی حد سے زیادہ تعریف کی اور مجھ سے کہا کہ تجھے شیخ صادق کے پاس گنگوہ جانا چاہیے۔ غالب گمان یہ ہے کہ ان کی صحبت تجھ میں اثر کرے گی۔ میں نے بھی خواب دیکھا کہ ایک سفید داڑھی والے نورانی صورت بزرگ فرما رہے ہیں کہ ہمارے پاس آ۔ میں نے عرض کیا میں آپ کو نہیں جانتا۔ کہا مجھے ناظر محمد کہتے ہیں۔ جب میں گنگوہ پہنچا شیخ کو جیسا کہ خواب میں دیکھا تھا پہچانا اور ان کے پیروں میں گر گیا۔ اور عرض کیا۔ اے شیخ آپ کو شیخ محمد صادق کہتے ہیں لیکن خواب میں آپ نے اپنا نام ناظر محمد فرمایا، کیا وجہ ہے؟ فرمایا۔ اس عالم (مثال) میں ہمارا نام ناظر محمد ہے۔ میں ان سے بیعت ہو گیا وہ مستی اور وہ کیفیت جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کبھی میں جنگل کو نکل جاتا مستانہ وار گھومتا اور لوٹ آتا تھا۔ ایک دن ایک جنگل میں داخل ہوا اور تین دن تک ایک درخت پر بیٹھا رہا۔ شیخ نے اپنے صاحبزادے شیخ داؤد کو میرے پاس بھیجا۔ پہلے تو میں حالت مستی میں پہچانا ہی نہیں کہ کون ہے۔ جب مجھے افاقہ ہوا درخت سے نیچے کود پڑا اور شیخ (صادق) کے پاس حاضر ہوا۔ تھوڑی ہی مدت میں میرا کام اِتمام کو پہنچ گیا۔ ایک دن میرے شیخ نے مجھے کسی جگہ بھیجنا چاہا ان کے صاحبزادے نے دہلی کا مشورہ دیا۔ کہا اس میں مجذوبانہ شورش ہے وہاں بزرگوں کی صحبت راس نہ آئے گی۔ آخر کار کہا کہ

گنگا ندی کے پار جا کہ ہمارا تصرف وہاں تک چلتا ہے۔ آخر میں مراد آباد پہنچا وہیں قیام کیا۔ مستقل رہنے لگا اس کے بعد کسی جانب نہ گیا۔ یہ سب کچھ شیخ صادق کی وفات کے بعد ہوا۔" میں ان کی خدمت میں بار بار آیا گیا ہوں۔ مجھ پر بڑا لطف و کرم فرماتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کو خواجہ قطب الدین کی خانقاہ میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس کے موقع پر دیکھا حالت سماع میں مست ہاتھی کی مانند جو زنجیریں توڑ کر اپنے نگہبانوں کو اپنے پیچھے دوڑاتا میدان میں آتا ہے۔ ان کے منڈے ہوے سر میں ایک زخم تھا جس سے خون اُن کے رخساروں پر بہہ رہا تھا اور ان کا سارا لباس خون آلودہ ہو گیا تھا۔ شیخ داؤد آخر سماع تک ان کی مدد پر رہے۔

شیخ فرخ نارنولی

وہ شیخ نظام الدین نارنولی کے پوتے اور بچپن ہی سے منظور نظر تھے۔ صاحب علم و عمل پُر ذوق، واجد اور عالی ہمت تھے۔ طلعت نورانی اور فتوت ذاتی سے متصف۔ میں نے ایک بار انھیں خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے عرس کی رات کو دیکھا کہ ذوق و شوق کے عالم میں کھڑے ہیں۔ سب کی نظریں ان کے چہرۂ زیبا پر بے تابانہ پڑ رہی ہیں۔ ان کے حسن و جمال باصفا اور کلام بابہا کی جانب دِلوں کی گرویدگی اہل ولایت کی ایک شناخت ہے۔ جیسا کہ "رشحات" میں ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ حسن کلام سننے والے کو اس سے چھین لیتا (بے خود کر دیتا) ہے۔ نیز کلام میں حسن، تکلم اولیاء اللہ سے آتا ہے۔ اس کے بعد یہ اشعار پڑھا کرتے

سہ نشان بود ولی را زنخست این معنی   کہ چو روے او بہ بینی دل تو باو گراید
دوم آنکہ در مجالس چو سخن کند ز معنیٰ   ہمہ را زمستی خود و حدیث می رباید
سوم آن بود نشان ولی از اخص عالم   کہ ز ہیچ عضوا و را حرکات بد نیاید [1]

1 ولی اللہ کی تین شناختیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ کہ جب تو اس کا چہرہ دیکھے تو تیرا دل اس کی جانب کھینچنے لگے۔ دوسری یہ کہ جب وہ مجالس میں معرفت الٰہی کی گفتگو کرتا ہے تو سب سامعین کو اپنی مستی اور حسن کلام سے دیوانہ بنا دیتا ہے۔ تیسری پہچان ولی اخص عالم کی یہ ہے کہ اس کے کسی بھی عضو ظاہری و باطنی سے کوئی گناہ نہ ہوتا ہو۔ (حفاظت الٰہی میں ہو)

ایک بار میں (سپہ سالار) بھوہ کے ہمراہ لشکری تھا۔ سید موصوف بادشاہ جہانگیر کے حکم سے دہلی سے رانا کے ملک کو روانہ ہوئے۔ یہ 1036ھ (1626) کا واقعہ ہے۔ جب ہم نارنول پہنچے تو ایک جگہ بہت بڑی مجلس برپا دیکھی جس میں سرود و سماع، پھول، خوشبو سب کچھ مہیا تھا۔ میں نے معلوم کیا کہ یہ کس قسم کی مجلس ہے۔ کہا۔ آج شیخ فرخ کی مجلس گل ہے۔

خواجہ عبدالحکیم

بڑے پُرشکوہ بزرگ تھے۔ کار درویشی سے شغف رکھنے والے بڑے پُرنور چہرہ والے تھے۔ وہ کبھی میرے شیخ کے مکان کے نچلے حصے میں اور کبھی جامع مسجد فیروزی میں سکونت رکھتے تھے۔ اس جگہ کے قیام میں شیخ کی صحبت کو بڑی غنیمت سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے کہا ہے۔

این سوے بہشت آمد و آن جانب کعبہ　　مارا بہمہ حال سر کوے تو اولیٰ [1]

مسجد کے بغلی چھوٹے دروازے سے پنج گانہ نماز کے لیے آتے تھے اور بہت دیر تک وہاں قیام کرتے اور اعتکاف میں بیٹھتے تھے۔ حضرت خواجہ نقشبند یہ قدس سرہٗ کے قول "مَا بَيْنَ اللهِ وَ بَيْنَهٗ حِجَاب [2]" کے مطابق وہ عزیمت پر عمل کرتے تھے جیسا کہ رسالہ "قدسیہ بہائیہ" کے ابتداء میں لکھا ہے کہ مسلمانی اور احکام مسلمانی میں تقویٰ اختیار کرنا، عزیمت پر عمل کرنا اور رخصتوں سے جہاں تک طاقت ہو دور رہنا یہ سب چیزیں نور و صفا اور رحمت حق ہیں اور ولایت کے درجات اور مقامات شریفہ اولیاء اللہ کے وصول کا واسطہ ہیں۔ ان صفات پر مداومت سے (طالب) درجات ولایت تک پہنچ جاتا ہے۔ (انتہیٰ) میں نے ان کو بہت دیکھا ہے۔ ان کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی۔ آج کل وہ مکان لطیف موافق شرع شریف میرے شیخ کے استعمال میں ہے۔

1　یہ راہ بہشت کی طرف اور وہ راہ کعبے کی جانب جاتی ہے۔ جائے، مگر ہمارے لیے تو ہر حال میں تیرے کوچے کا خیال اولیٰ ہے۔

2　اللہ تعالیٰ اور معتکف کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔

شیخ بایزید میرٹھی

آپ شیخ پیر میرٹھی کے بھانجے ہیں اور انھیں سے نسبت باطنی درست کرتے ہیں۔ وہ دائم الوجد و ذوق ہیں۔ اور اللہ تعالی سے ان کا روحانی معاملہ خوب درست تھا۔ ہمیشہ سماع سے شغف رہتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ میرے شیخ نے ایک رات ہمایوں بادشاہ کے عرس کے موقع پر ان کے مقبرے میں گزاری ان کے تمام اصحاب اور چاہنے والے بھی ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ ہم نے وہ ساری رات مجلس سماع سے ایک طرف شب بیداری میں گزاری ایسی خوش وقتی اور عیش تمام کے ساتھ بسر ہوئی جس کی تعبیر علاوہ خواجہ شیراز ی کے اس شعر کے نہیں کر سکتے

آن شب قدرے کہ گویند اہل خلوت امشب است　　　یا رب این تاثیر دولت از کدامی کوکب است [1]

میرے شیخ دوسرے دن زوال کے وقت اس مقبرے سے باہر آئے اور اپنی منزل کا قصد کیا۔ ناگاہ دیکھا کہ شیخ بایزید جا رہے ہیں وہ ابھی تک میرے شیخ سے آشنا نہ تھے۔ میرے شیخ اپنے مرکب سے اتر کران کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگے۔ اسی اثنا میں دو گانے والیاں جو دیہاتی تھیں، بھنگ فروش کی دکان پر بیٹھی ہوئی کچھ گا رہی تھیں حالانکہ نہ تو وہ صورت شکل کی ہی اچھی تھیں اور نہ ہی حسن آواز رکھتی تھیں۔ مگر وہ اسے سن کر سماع میں آگئے۔ اور جس جگہ دھوپ تھی وہیں کھڑے ہو گئے۔ اس وقت جو عزیز بھی اس مقربے سے باہر آتے اور میرے شیخ کو (ان کے ساتھ دھوپ میں) کھڑا دیکھتے تو سواری سے اتر کر کھڑے ہو جاتے حتیٰ کہ ایک بہت بڑی مجلس صحبت وہاں منعقد ہو گئی۔ تمام یاران شیخ اس حال کے مشاہدے سے حیران تھے۔ شیخ سعدی کا یہ شعر جو کانوں سنا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا

چون شوریدگان مے پرستی کنند　بر آواز دولاب مستی کنند [2]

ایک گھڑی کے بعد جب وہاں سے ہم لوگ روانہ ہوئے تو راستے میں بھی وہ اسی ذوق و سماع کی

1　اے خلوت گزینوں وہ شب قدر جس کا ذکر کرتے ہیں آج کی رات ہے۔ یا رب دیدار محبوب کی یہ دولت کون سے ستارے کی تاثیر ہے یعنی کس بزرگ کی توجہ کا یہ فیض ہے۔

2　جب شوریدگان عشق مولی میں مے برستی کرتے ہیں یعنی غرق عشق محبوب ہوتے ہیں تو رہٹ کی آواز سے بھی انھیں وجد آ جاتا ہے۔

حالت میں چل رہے تھے۔ میرے شیخ ان کو اپنے مکان پر لے گئے اور تین دن تک مہمان رکھا اور ان کے لیے اچھے اچھے قوال بلوائے اور گانے کی خوب مجلسیں برپا کیں۔ وہ تین دن تک علاوہ اوقات نماز پنج گانہ کے ذوق (مستی) اور سماع میں مشغول رہتے تھے۔ یہ مجلس 1052ھ (1642) کی بات ہے۔ ان کی وفات اپنے شہر پہنچنے کے بعد ہوگئی۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ ایک دن مولانا روم زرکوبوں (سونا کوٹنے والوں) کے محلے سے گزر رہے تھے۔ کوٹنے کی آواز سے ان پر حالت طاری ہوگئی اور ناچنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر شیخ صلاح الدین زرکوب اپنی دوکان سے باہر کود ے اور حضرت مولانا کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ مولانا نے انھیں اُٹھایا اور بہت نوازشات کیں۔ ظہر کی نماز سے عصر کی نماز تک مولانا روم سماع میں رہے اور یہ غزل پڑھتے رہے

یکے گنجے پدید آمد، درین دکان زر کوبے   زہے صورت زہے معنیٰ، زہے خوبے زہے خوبے [1]

شیخ صلاح الدین کے حکم سے نوکروں نے ساری دوکان لٹا دی اس طرح انھوں نے دوکان داری کے جھنجھٹ سے آزادی حاصل کر لی۔ خواجہ محمد دہدار اس کے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ کتاب ''بوستاں'' میں فرماتے ہیں

مگس پیش شوریدہ سر بر نزد   کہ او چون مگس دست بر سر نزد
نہ بم داند آشفتہ سامان نہ زیر   بنالد بر آوازِ مرغ حقیر
نہ مطرب کہ او از سم ستور   سماعست گر ذوق داری و شور
چون شوریدگان مے پرستی کنند   بر آوازِ دولاب مستی کنند
بچرخ اندر آیند دو لاب وار   بگریند بر خود چون دولاب وار [2]

1 اس زرکوب کی دوکان میں ایک خزانہ ملا۔ کیا ہی اچھی صورت ہے کیا ہی سیرت ہے۔ واہ واہ کیا خوب ہے کیا خوب ہے۔

2 کسی شوریدہ سر کے سامنے شہد کی مکھی نے اگر پر پھڑ پھڑا لیا تو اس نے بھی مکھی کی مانند اپنا سر ہاتھوں سے پیٹا ہے۔ آشفتہ سامان آلاتِ سرود کے زیر و بم نہیں جانتا وہ تو چھوٹے سے پرندے کی آواز سے بھی رونے لگتا ہے۔ وہ کسی گانے بجانے والے کی ہی نہیں بلکہ وہ تو جانور کے سُم کی آواز پر بھی سماع کرتا ہے۔ جب شوریدگان جمال حقیقی شراب معرفت سے سرشار ہو جاتے ہیں تو رہٹ کی آواز پر بھی مست و بے خود ہو جاتے ہیں۔ وجد کرنے لگتے ہیں۔ رہٹ کے چرخے کی طرح رقصاں ہو جاتے ہیں۔ رہٹ کی آواز کی طرح خود پر زار و قطار رو پڑتے ہیں۔

شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ نے سماع حالی اور سماع مزاجی میں فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر اچھی آواز اور موزوں نغمات سے ذوق حاصل ہوتا ہے تو اس میں مزاج کو دخل ہے کیونکہ جب تک حسب مذاق کام ہوتا رہتا ہے اچھا لگتا ہے اور جب خلاف مزاج و مذاق کام ہوتا ہے تو برا لگتا ہے۔ اور اگر نفس کا قیدی نہیں ہے کوئی بھی آواز ہو کسی کی بھی ہو اس کو اسی سے ذوق ہو جاتا ہے اور وجد طاری ہو جاتا ہے۔ یہ سماع حالی ہے جیسا کہ شیخ نوری کو جب وہ گھر میں ہوتے تھے۔ راستے میں جاتی بھیڑوں کے قدموں کی آواز سے بھی وجد ہو جاتا تھا۔ پس سونا کوٹنے والے کے ہتھوڑے کی ضرب کی آواز سے مولانا کا چکر کاٹنا غلبہ حال اور وجد کے تسلط کی وجہ سے تھا۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ سنبھل میں ایک بزرگ تھے شیخ حاتم۔ جب گانے کی آواز ان کے کان میں پہنچتی بے قابو ہو جاتے اور اس معاملے میں عنان اختیار ان کے ہاتھ میں نہ رہتی۔ ان کی سماع و وجد کی حالت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ بکری چرانے والے جب بکریاں اکٹھی کر کے چرانے کے لیے جنگل کو گاتے ہوئے لے جاتے تو ان کی آواز کے پیچھے پیچھے وہ اس کبرسنی میں روتے ہوئے چلتے اور کسی ملامت گر کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ آخر اسی حال میں 1007ھ (3/اکتوبر 1598) میں اس دنیا سے چلے گئے۔ روایت ہے کہ انھوں نے اپنی وفات سے دو تین ماہ پہلے کہہ دیا تھا کہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے مہینے دنیا سے چلا جاؤں گا۔ جب ربیع الاوّل کا مہینہ آیا بیمار ہوئے اور 12/ربیع الاوّل کو وفات پا گئے۔

سید ضیاء الدین جونپوری

عالم و فاضل اور شیخ عبدالرشید جونپوری کے شاگردوں میں سے ہیں۔ میرے شیخ کو جانتے ہیں۔ میرے شیخ ان کے استاد سے بھی آشنا ہیں اور دونوں کی خوب تعریف کرتے رہتے ہیں۔ ابتدا میں طلب علوم دین میں گھر سے نکلے، دہلی پہنچے اور (چاندنی) چوک کے مدرسے میں اقامت اختیار کی۔ مولانا حیدر جو کہ میرے شیخ کے اقربا میں سے ہیں اور متبحر علما میں سے ہیں ان سے اور دوسرے فضلاے وقت سے استفادۂ علوم کیا۔ اسی دوران میں انھیں ایک حال پیش آیا کہ علوم رسمی سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ قیل و قام زبانی سے تنگ ہو گئے اور علمیت کی بڑائی سے آزادی حاصل کر لی، طریقہ خاکساری اور نامرادی کو اپنا لیا اور اپنے آپ کو اس راہ میں گھلا دیا۔ اس حال میں اگر کہیں

سے انھیں چند درم بھی فتوح ہوتے تو اسی میں خوش وخرم رہتے تھے۔ایک بار میرے شیخ نے ان کی خدمت میں چند درم پیش کر کے کہا کہ آپ اِس رسمی قیل وقال سے خوب آزاد ہوئے۔ عارف (رومیؒ) نے کہا ہے

علم رسمی سر بسر قیل است و قال　　نے درو کیفیتے حاصل نہ حال [1]

''رشحات'' میں ہے کہ مولانا شہاب الدین برجندی فرماتے ہیں کہ شروع حال میں میں حضرت مولانا سعدالدین کاشغری کی خدمت میں بہت حاضری دیتا تھا مگر ان بزرگواروں کی نسبت کا کوئی اثر اپنے باطن میں نہ پاتا تھا۔اس طرف سے میں بہت ملول ومحزون تھا۔آخر ایک دن نماز جمعہ کے بعد مسجد کے حجرے کے سامنے لوگوں کے اژدحام میں ٹہل رہا تھا۔ناگاہ آپ کو میں نے اس بھیڑ کے درمیان میں دیکھا تو سرراہ آپ کا دامن پکڑ لیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ اپنا حال عرض کیا تو آپ نے فرمایا۔ باوا! جب تک ان علوم رسمی کی جو تیرے سینے میں ہیں تے نہ کرے گا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔اسی گفتگو میں انھوں نے میرے دل کو اپنی جانب منجذب کر لیا۔اور مسجد سے باہر جانے لگے۔میں بھی بے اختیار دیوانہ وار آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا اور دور سے آپ پر نگاہ رکھ رہا تھا۔ جب آپ جامع مسجد سے باہر آگئے اور بازار خوش کی طرف رُخ کیا اور فیروزآبادی دروازے سے باہر نکل گئے ۔میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا دیکھا کہ چوب فروش کی دوکان میں داخل ہو گئے ۔پانچ گزی دوبلیاں عمارتی چھت کے شہتیر کے لیے خریدیں اور اپنی قمیض کو طے کر کے اپنے دوش مبارک پر رکھا اور چاہتے تھے کہ بلی اُٹھائیں میں تیزی سے سامنے آیا اور عرض کیا اگر اجازت دیں تو میں اس خدمت کو بجالاؤں فرمایا کہ اگر علم وفضل کی بڑائی تیرے مانع نہ ہو تو دوسری بلی کو اٹھا لے یہ کہہ آپ ایک بلی اٹھا کر چلے دیے۔فوراً میں دوسری بلی اٹھا کر کاندھے پر رکھ کر شرمایا شرمایا آپ کے پیچھے چل پڑا مگر شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا کبھی اپنی آنکھ بند کر لیتا اور کبھی کھول دیتا مگر آپ رحمۃ اللہ علیہ کسی اہل بازار کی ملامت کی پرواہ کیے بغیر آگے آگے ہٹو بچو کرتے جارہے تھے آخرکار دروازہ آگیا۔میں دل دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش محلہ پاے باڑھ سے ہو کر چلیں کہ وہاں بازار کی بہ نسبت بھیڑ کم رہتی ہے لیکن آپ نے اپنا رخ بازار کی جانب کر لیا

1　علم رسمی تو سراسر قیل وقال ہے۔اس سے نہ کوئی حال حاصل ہوتا ہے اور نہ کوئی کیفیت۔

جب ہم "چارسوق" کے نزدیک پہنچے تو میں نے سوچا کیا اچھا ہو کہ بازار خوش سے گزریں کہ بازار ملک میں کثرت خلق کے باعث چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ خاص کر جب کہ کسی کے کاندھے پر دراز بلی بھی ہو۔ لیکن آپ نے بازار ملک کی ہی راہ لی میں آپ کے پیچھے جارہا تھا اس حال میں کہ میری حالت غیر تھی اور غرور علم کی وجہ سے مجھ پر ایک عجیب خجالت طاری تھی۔ آخر بازار ملک سے گزر کر ایک کوچے میں آئے جو مسجد کی دیوار کے برابر سے جارہا تھا۔ جب میں نے آپ کے گھر پہنچ کر وہ بلی کاندھے سے اتار کر رکھی تو اسی وقت آپ کی عنایت اور حسن تربیت کے طفیل مجھے ایک کیفیت حاصل ہوگئی اور اولیاء اللہ سلسلہ نقشبندیہ کی نسبت میرے دل میں آگئی۔ اس کے بعد سے میں نے آپ کی مطابعت اور ملازمت کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیا۔ (انتہی) میں نے ان سید ضیاء الدین کو سب سے پہلے امروہہ میں دیکھا تھا۔ شیخ ابن کے عرس کے زمانے میں۔ وہ سرتاپا برہنہ، ایک تہبند (لنگوٹ) باندھے آزادانہ اور مستانہ آکر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں اپنے ہندی رسالے "پیم چرت" کو پڑھ رہا تھا انھوں نے اچھی طرح سننا شروع کیا آخر جان گیا کہ وہ بھی صاحب دریافت ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے استاد کے اشارے سے درس طالبان علوم ظاہری اور افادۂ علوم باطنی میں لگ گئے۔ کچھ زمانہ ہوا کہ وہ سنبھل آگئے ہیں اور سرائے نور بخش میں اقامت رکھتے ہیں وہیں شادی کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ طلبا کا ایک مجمع ان کے پاس رہتا ہے اور کتب متداولہ پڑھتا ہے اور وہ بغیر مطالعہ کیے اور بغیر کتاب ہاتھ میں لیے کیا خوب فوائد بیان کرتے ہیں۔ اپنے مشرب کی وسعت کے ہوتے کیا خوب زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس حالت آزادگی کے ہوتے جو آپ کے مزاج میں ہے اور کبھی کبھی ظاہری قید و بند دین سے آزاد ہو کر فارغ البالی سے زندگی گزارنے کے باوجود آپ جب برسر درس ہوتے ہیں تو بغیر کتاب ہاتھ میں لیے بغیر مطالعہ کیے اور بلا مواد سامنے رکھے ایسے عجیب دغریب دقائق کیسے بیان فرماتے ہیں۔ یہ بات بغیر فیض الٰہی اور کیا ہوگی، ذرا فرمائیے تو کہ یہ حال آپ کو کہاں سے حاصل ہوا ہے؟ کہا کہ میں بچپن میں کبھی کبھی شاہ مظفر کی خدمت میں جو کہ صاحب کرامت مجذوبوں میں سے تھے۔ جب کہ وہ جونپور میں تھے حاضر ہوا کرتا تھا اور ان کی خدمت بجالاتا تھا۔ انھوں نے نگاہ لطف و کرم میرے شامل کار رکھی جس کا اثر میں اپنے آپ میں پاتا ہوں۔ مجھ سے وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ پڑھا کرو، پڑھا کرو۔ اس کے بعد سے یہ دولت جو تم مجھ

میں دیکھتے ہو کھلی بات ہے، انھیں کا فیض ہے۔

شیخ عبدالعزیز الہ آبادی

شیخ محب اللہ الہ آبادی کے خالہ زاد بھائی اور ان کے مرید (وخلیفہ) بھی ہیں۔ بچپن سے شیخ محب اللہ کی صحبت میں رہے۔ ان کے لطف وعنایات سے ذوق یاب ہوئے اور فیض پایا ہے۔ صادق القول، راسخ الاعتقاد، عالی ہمت ہیں اوراعلیٰ تریں سخاوت رکھتے ہیں۔ ایک بار اپنے شیخ کی زندگی میں جب دہلی آئے تھے تو میرے شیخ کی خانقاہ میں ٹھہرے تھے۔ ایک دن میرے شیخ ان کے پاس ان کے حجرے میں بیٹھے تھے میں بھی ساتھ تھا کہ میرے شیخ نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے شیخ نے اپنے عقائد میں جو رسالہ لکھا ہے اور گفتگو فرمائی ہے آپ تو اس سے خوب واقف ہوں گے، مجھے ذرا تفصیل سے بتائیں۔ انھوں نے میری جانب اشارہ کیا کہ یہ شخص کہیں چلا جائے تو میں کھل کر بیان کروں۔ میرے شیخ نے میری بابت فرمایا کہ ''ما و وے یکیم'' (ہم اور وہ ایک ہیں) آخر انھوں نے رسالہ ''تسویہ'' نکالا کہ ان کی تصنیفات کا نچوڑ اور ان کے عقائد خاصہ کا مظہر ہے میرے شیخ نے اس کا مطالعہ کیا اور ان سے کہا کہ کیا آپ کے شیخ خلوت میں بھی آپ سے یہ باتیں کرتے تھے۔ کہا کہ ہاں تنہائی میں اپنے اصحاب خاص سے یہی فرمایا کرتے تھے۔ میرے شیخ نے مجھ سے فرمایا کہ اس کی نقل کر لوں۔ اس کے بعد میرے شیخ نے چند باتیں جو ان کے عقیدے کی تھیں اور محقق صوفیہ کی مقرر وتسلیم شدہ ہیں اور ارباب علم ودانش پر ظاہر وباہر ہیں۔ اس میں سے لکھیں ایک دن ایک عزیز چند سوالات لکھ کر میرے شیخ کے پاس لائے اور کہا کہ یہی سوالات اپنے زمانے کے کسی صوفی مزاج شخص نے جو اب کے لیے شیخ محب اللہ کو لکھ کر بھیجے تھے۔ شیخ نے سب کے جوابات لکھے تھے مگر اب وہ جوابات کہیں نہیں پائے جاتے۔ میں حاضر خدمت تھا۔ قلم، دوات اور کاغذ اپنے شیخ کے روبرو پیش کر کے عرض کیا کہ ان باتوں کے جوابات تحریر فرمادیجئے۔ میرے شیخ نے بے تامل سب کے جوابات لکھ دیے۔ وہ سوالات وجوابات یہ ہیں۔[1]

---

1 اس فقیر کے نزدیک وہ سوالات جو کہ دارا شکوہ نے آپ سے کیے تھے اور ان کا جواب مانگا تھا۔ جوابات شیخ جو اس رسالے میں تحریر ہیں وہ شیخ کے جوابات نہیں لگتے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ متن میں لکھے ہوئے سوالات بلا جواب رکھے رہے اور شیخ کے علاوہ کسی عزیز نے وہ جوابات لکھ کر دے دیے ہیں (کمال واسطی)

سوال:1 اس کام کی ابتدا اور انتہا کیا ہے؟

جواب اس کام کی ابتدا توبہ ہے اور انتہا توحید ذاتی ہے۔

سوال:2 وہ کون سا علم ہے جسے حجاب اکبر کہا گیا ہے؟

جواب: وہ علم جو حجاب اکبر ہے وہ غیر اللہ کی حیثیت سے اپنے نفس کی خودی وو جود کا علم ہے۔

سوال:3 سید الطائفہ جنید بغدادیؒ کے اس قول کے جو انھوں نے "منتہائے کار کیا ہے" کے جواب میں فرمایا تھا کہ "ابتدا کی طرف لوٹ جانا ہے" کے کیا معنیٰ ہیں؟

جواب: ابتدا کی طرف لوٹ جانا اس بات سے عبارت ہے کہ اپنے مبدا (بدیع السماوات والارض) کی طرف لوٹ جائے یعنی جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی وہیں اس کی انتہا ہو جائے۔

سوال:4 انبیاء سابقین کو توحید کی معرفت تھی یا نہ تھی؟

جواب: انبیاء سابقین کو بھی توحید کی معرفت تھی مگر ایسی اکمل نہ تھی جیسی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھتے تھے۔ یہ خصوصیت اصلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

سوال:5 ہر چند موجود کا معدوم ہونا محال ہے تو اشیا کو کس طرح معدوم کہہ سکتے ہیں؟

جواب: موجود ہرگز معدوم نہیں ہوتا، اشیا حقیقت میں ہرگز موجود تھیں ہی نہیں ہمیشہ سے معدوم ہیں۔

سوال:6 تصور کا کچھ اعتبار ہے یا نہیں؟

جواب: تصور تاثیر تمام رکھتا ہے۔ اے بھائی تو یہی خیال کر ورنہ حقیقتاً چیزوں کا وجود صرف ہمارا ادراک ہے۔ وجود نہیں ہے۔

سوال:7 ترقی کی انتہا ہے کہ نہیں؟

جواب صفات میں تو ترقی کی انتہا ہے مگر ذات کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں۔

سوال:8 ظلوماً جھولاً انسان کی مذمت میں آیا ہے یا یہ جملہ اس کی مدح ہے؟

جواب: ظلومٌ جھولٌ جو انسان کو کہا گیا ہے یہ مذمت کی شکل میں اس کی تعریف ہے

سوال:9. ارواح بزرگان کی تربیت سے معرفت تامہ کا حصول ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب: ارواح کی تربیت سے معرفت تامہ حاصل ہو جاتی ہے۔

سوال:10 طالب (صادق) کو مرنے کے بعد وصل مطلوب حقیقی ممکن ہوگا یا نہیں؟

جواب: وفات کے بعد وصال مطلوب حقیقی ممکن کیا معنی بلکہ لازم ہے

سوال:11 طالب فانی ہوجاتا ہے یا کہ مطلوب

جواب: پہلے طالب فنا ہوتا ہے پھر مطلوب بھی اس کے ادراک سے گم ہوجاتا ہے۔ بس عشاق کی حقیقت واحدہ باقی رہتی ہے کہ وہاں نہ طالب ہے نہ مطلوب

سوال:12 درد و عشق کا تفرقہ کیا چیز ہے؟ یعنی درد و عشق میں کیا فرق ہے؟

جواب: درد صرف بعض عاشقوں کے لیے خاص ہے اور ایک حال ہے مگر عشق مقام ہے کیونکہ ملائکہ عاشق تو ہیں مگر دردمند نہیں ہیں؟

سوال:13 کیا کوئی شغل ایسا بھی ہوتا ہے جو (مرید سے) بے اختیار صادر ہوتا ہے؟

جواب: (کبھی) بغیر مشغول کے اختیار کے بھی شغل کچھ حکمتوں سے جاری ہوجاتا ہے۔ اس کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں۔

سوال:14 نماز کب بلا خطرہ (وسوسہ) نصیب ہوتی ہے؟

جواب: بے خطرہ نماز مقام توحید کے علاوہ میسر نہیں ہے۔

والعاقبة بالخير

میرے شیخ کی شیخ محب اللہ الہ آبادی سے خط و کتابت رہی ہے جو علم توحید اور تصوف کی دوسری باتوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ ایک بار میرے شیخ نے شیخ محب اللہ الہ آبادی سے ان کی تصنیفات طلب کیں تاکہ مطالعہ کریں۔ انھوں نے پہلے ''مناظرۃ الخواص'' روانہ کی۔ میرے شیخ نے مطالعہ کرکے پسند فرمائی۔ ایک دن میں نے اپنے شیخ سے معلوم کیا کہ ان کے علم حقائق کا کیا مرتبہ ہے۔ کہا وہ جو کچھ لکھتے ہیں بس شیخ ابن عربی کے کلام کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ''مغالیط العامہ'' میرے شیخ کو بھیجی وہ بہت ہی ضخیم تھی۔ یہ کتاب ابھی مطالعہ میں اتمام کو نہ پہنچی تھی کہ (شیخ محب اللہ الہ آبادی) ماہ رجب 1058ھ (یکم اگست 1648) میں دنیا سے چلے گئے۔ قبر ان کی الہ آباد میں ہے۔ کتاب ''مناظرۃ الخواص'' کے منظر 22 میں ہے۔ دقیقہ۔ عاشق یا تو مقام ذکر میں ہے یا مقام فکر میں یا مقام مشہود یا مقام وجود میں۔ جب

تجلی صفات ہوتو مقام شہود میں ہے اور جب تجلی ذات ہوتو مقام وجود میں ہے۔ دقیقہ (حقیقت واحدہ کو) انسان میں ''روح'' کہتے ہیں اور صفات حق میں حی کہتے ہیں۔ انسان میں تو کان کہتے ہیں اسی کو صفات حق میں سمیع کہتے ہیں۔ انسان میں چشم کہتے ہیں وہاں بصیر۔ انسان میں عقل کہتے اور وہاں علیم۔ انسان میں دل کہتے ہیں وہاں مرید کہتے ہیں۔ انسان میں اس کو دماغ کہتے ہیں وہاں قدیر کہتے ہیں۔ اب یا تو انسان ان انسانی قیود سے نکل کر وہاں تک پہنچے یا وہ ذات اپنے مرتبے سے نیچے اتر کر انسان تک پہنچے۔ اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو خود ہی اپنے پاس پہنچے ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود ہی خود کو دیکھے اور سنے ہے

یارِ ما ہر ساعتے آید ببازار دگر　　تا بود حسن و جمالش را خریدار دگر
کسوتے دیگر بپوشد جلوهٔ دیگر کند　　مظہر دیگر نماید بہر اظہار دگر[1]

کمالات کا اظہار کرنا حق کو اور تعینات کا مظہر و مشہد بننا پیغمبروں کے واسطے مقرر و محقق ہو۔ ''الحمدللہ والصلوٰۃ علی رسولہ و آلہ و اصحابہ اجمعین''

شیخ محمدی ہرگانوی[2]

وہ بھی شیخ محب اللہ الہ آبادی کے مرید ہیں۔ عالم و فاضل ہیں۔ آثار عزیمت و شکستگی ان کے چہرے سے ظاہر ہیں۔ شریعت کے معاملے میں درست گو ہیں۔ اور بہت سے سفر کیے ہوئے ہیں۔ آخرکار امروہہ پہنچے اور شیخ عبدالمجید کے بھائی شیخ فیض اللہ کی بیٹی سے نکاح کیا[3] اور وہیں مقیم

1 ہمارا محبوب ہر گھڑی نئے ہی بازار میں آتا ہے۔ تاکہ اس کے حسن و جمال کا کوئی نیا خریدار بنے۔ دوسرے کپڑے پہنتا ہے دوسرا ہی جلوہ دکھاتا ہے۔ نیا جلوہ دکھانے کے لیے اور ہی مظہر دکھاتا ہے۔

2 محمد نام، ابومحمد کنیت، فیاض دہر لقب، نسبا جعفری الزینبی، مولداً ہرگانوی، مسکناً امروہوی مدفناً اکبرآبادی (آگرہ) ابن شیخ عیسیٰ بن جمال بن سید اجمل۔ پیدائش 1021ھ/1612۔ وفات 13 / رجب 1107ھ/ 1697 مزار مبارک ہینگ کی منڈی آگرہ میں۔ متصل آریہ سماج لب سڑک واقع ہے۔ شیخ کبیر حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی آپ کے بارے میں فرماتے تھے۔ اگر محب اللہ نے پہلے اپنے پیر کو نہ دیکھا ہوتا اور محمدی کو اس کمال کے ساتھ پایا ہوتا تو ان سے مرید ہوتا۔ بحوالہ مقاصد العارفین۔

3 آپ کی اہلیہ کا نام ''صاحب دولت'' تھا۔

ہو گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شباب کی آمد کے زمانے میں میں اپنے وطن میں طالب علمی میں مشغول تھا۔ اتفاقاً شیخ محب اللہ الہ آبادی ایک عزیز کی شادی کی تقریب میں ہرگانو تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس قصبے کے اکثر لوگ اس مجلس میں چلے گئے مگر کیونکہ میں اہل تصوف کی مجالس سے متنفر رہتا تھا نہ گیا۔ کسی نے کسی سلسلے میں میرا ذکر شیخ سے کیا شیخ نے کہا اس محمدی نام کے نوجوان کو میرے پاس لاؤ۔ میں آیا اور آکر سلام کیا۔ مجھ سے فرمایا۔ اگر طالب علمی کی جانب میلان ہے تو ہمارے ساتھ چلو اور مجھے اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے اور پڑھانا شروع کر دیا۔ اسی دوران، میں حضرت شیخ سے مرید ہو گیا اور میرا دل ظاہری علوم کی تحصیل سے پھر گیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اہل اللہ کی صحبت تمام فضائل اور کمالات سے افضل اور بہتر ہے۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ شیخ محب اللہ ابتدا میں قصبہ حیدر پور میں پڑھنے میں مشغول تھے اور تھوڑی سی ہی مدت میں علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ دوران مطالعہ انہیں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ذوقیہ ملفوظات کے مطالعے سے اہل اللہ کی صحبت کی طلب و ذوق پیدا ہوا اور گھر سے نکل پڑے بہت سفر کیے کسی کو مغرور وقت، مدعی ولایت پاتے اور کسی کو کثرت زر و مال (کا خواہاں)، اور ایسی ہی دوسری چیزوں کا گرویدہ پاتے تھے۔ وہ کسی (بزرگ کامل) کی صحبت چاہتے تھے مگر میسر نہ ہوتی تھی۔ کوئی ایک شخص بھی انھیں ایسا نہ ملا جو شریعت محمدی اور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مطابعت میں راسخ ہو آخر مدتوں کے بعد اکبر آباد پہنچ کر سنا کہ اس زمانہ میں دو حقیقی فقیر ہیں۔ گنگوہ میں شیخ ابو سعید اور شیخ حسین بوہر میں۔ لیکن طالب کی کارکشاد شیخ گنگوہی کے نزدیک اقرب ہے۔ وہاں سے گنگوہ کا ارادہ کیا۔ راستے میں ایک رات کو (حضرت محمد) مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ محب اللہ تو ٹھیک جا رہا ہے۔ شیخ سعید کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ محب اللہ کی تربیت کریں۔ جس وقت وہ شیخ ابو سعید کے سامنے حاضر ہوئے تو وہ ''لمعات'' پڑھ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر کتاب کو ایک جانب رکھ دیا اور درس موقوف کر دیا۔ وہ بولے اے شیخ جو پڑھا رہے تھے پڑھایئے انھوں نے کہا ''تو عالم شرع ہے عالموں کے سامنے یہ علم تصوف کیا چیز ہے؟'' کہا۔ میں انشاء اللہ مستفید ہوں گا۔ آخر کار شیخ نے بہت سے حقائق و معارف بیان فرمائے۔ صحبت

شیخ نے ان میں اثر کیا اور وہ سلسلۂ قادریہ میں مرید ہو گئے اور بہت کم وقت میں کشادِ کار حاصل ہو گئی اور (یک گونہ) کیفیت و ذوق (فنا و بقا) حاصل ہو گیا ایک رات انھوں نے خواب دیکھا کہ عالم غیب سے انھیں پانچ پھل عنایت ہوئے ہیں۔ شیخ ابوسعید سے عرض کیا تو یہ تعبیر دی کہ حضرات خمسہ (حواس خمسۂ باطن) کے اسرار تجھے نصیب ہوں گے۔ اسی اثنا میں الہ آباد میں ان کے شاگرد جوان کے منتظر تھے مضطرب ہو گئے۔ معلومات کی مگر پتا نہ لگ سکا کہ کہاں گئے آخر ان کی جستجو میں جابجا لوگوں کو بھیجا آخر گنگوہ میں مل گئے تو اپنی غرض شیخ ابوسعید سے عرض کی۔ شیخ نے فرمایا۔ محب اللہ جا الہ آباد جا، وہیں بیٹھنا اور مخلوق کو علوم دین سے فائدہ پہنچانا، اسی جگہ اس مطلب عالی سے جو تجھے درپیش ہے مشرف ہو جائے گا۔ انھیں خرقہ خلافت عطا کیا اور رخصت کر دیا۔ الہ آباد پہنچے اور شیخ کے فرمان کے مطابق درس علم دین میں لگ گئے اور بہت تھوڑی مدت میں اس مقصد عالی سے مشرف ہو گئے تو یہ عطیہ خداندی کا ماجرا شیخ ابوسعید کو گنگوہ لکھا۔ شیخ بہت خوش ہوئے اور شکر خداوندی بجالائے۔ اس کے بعد سے مزید علوم حقائق ان کے دل پر منکشف ہو گئے تصانیف عالیہ ظہور میں آئیں۔ شیخ عبدالعزیز ہی فرماتے ہیں جب شیخ محب اللہ کی عمر شریف 63 سال کی ہو گئی تو بیمار ہوئے تو اشاروں کنایوں میں باتیں کرنے لگے کہ اب مجھے ایک جگہ جانا ہے۔ میں نے عرض کیا" شیخ ابن عربی کی عمر لمبی ہوئی اور آپ کو ان سے مناسبت ہے بہت دنوں جئیں گے (یہ سن کر) شیخ نے فرمایا" اچھی طرح غور (وفکر) کر کہ میری مناسبت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے یا شیخ ابن عربی سے اور بڑے ذوق و شوق میں اسی بیماری میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ شیخ عبدالرشید دہلوی جو شیخ عبدالعزیز چشتی کے پوتوں میں سے ہیں۔ مرد فاضل صاحب اخلاق ہیں اور میرے شیخ خواجہ خرد کے نیازمندوں میں سے تھے سنبھل کے قاضی تھے کہتے تھے کہ میں شیخ محب اللہ کے ساتھ تین سال الہ آباد میں رہا ہوں۔ ان سے بیعت ہوا اور فیض یاب ہوا۔ وہ درس حدیث کے اوقات میں رویا کرتے تھے اور ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ ان کے تمام طور طریق وضع قطع پیغمبر (حضرت محمد) صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے مطابقت رکھتے تھے۔

شیخ شاہ محمد بریلی

اپنے شیخ شاہ محمد سے نسبت درست کرتے ہیں۔ صاحب اخلاق و ہمت و مروت ہیں۔ بہت سے لوگ ان کے خوان احسان سے بہرہ مند ہیں۔ بہت سے اہل ذوق وسماع آپ کے مرید ہیں۔ کہتے ہیں اوّل اوّل وہ نہایت تنگ دستی میں گزارتے تھے مگر اس کے بعد توکل کے سرمایے کی بدولت کافی فتوح ان کو ہوتی ہیں اور اب جمعیت صوری بھی انھیں حاصل ہوگئی ہے۔ ہر سال بڑی خوشی سے بزرگوں کے اعراس[1] کرتے ہیں۔ ''رشحات'' میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ جس وقت حالت احتضار میں تھے ان کی تمام اولاد، پوتے اور ان کے خاص خاص اصحاب ان کے گاؤں کمانگر میں ان کے سرہانے حاضر تھے۔ اس موقع پر حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا۔ ہمارے مریدوں میں سے ہر شخص فقر وغنا میں سے ایک چیز اختیار کرلے۔ پہلے حضرت خواجہ محمد کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ پہلے تو اختیار کر۔ حضرت مولانا محمد نے کہا کہ میں وہ اختیار کرتا ہوں جو آپ کو پسند ہے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ مجھے تو فقر پسند ہے اس کے بعد اپنے ایک کارندے سے اشارہ کیا کہ مولانا محمد کو چار ہزار شاہ رخ[2] دے دے کہ اس نے فقیری اختیار کرلی ہے تا کہ اسے اپنا سرمایہ بنائے اور ان فقرا کی فراغ خاطر میں جو اس کے گرد جمع ہوں گے خرچ کرے۔ حضرت مولانا محمد نے امتثال امر کی وجہ سے اس رقم کو لے لیا اور اپنی اور اپنے اصحاب کی معیشت کا سرمایہ بنا لیا۔ (انتہیٰ) پوشیدہ نہ رہے کہ بزرگان دین نے توکل کی شان جو چیز مقرر کی ہے یہی توکل شریف ہے کہ حلال کمائی سے روزی بہم پہنچائے ہے گو وہ کتنی ہی کیوں نہ ہو لیکن نظر خدا پر رکھے نہ کہ کمائی پر۔ حدیث میں ہے کہ ایک دن ایک صحابی کہیں سے شتر پر سوار آپ (رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے معلوم کیا تم نے اپنا اونٹ کس کے حوالے کیا۔ کہا۔ توکل پر چھوڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''باندھ پھر توکل کر'' پہلے اونٹ کا پیر باندھ پھر توکل کر'' خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ توکل یہ نہیں ہے کہ

---

1 یہ اعراس آج کل کے اعراس نہ تھے جو کھلی بدعات کا مجموعہ ہیں۔

2 سلطان تیمور کے بیٹے شاہ رخ مرزا کے عہد کا سکہ ہے۔

ترک اسباب کریں اور بیٹھ جائیں کیونکہ یہ سوءِ ادب ہے بلکہ سبب مشروع مثل کتابت وغیرہ کو اختیار کرنا چاہیے اور سبب پر نظر نہ رکھنا چاہیے کیونکہ سبب دروازے کی طرح ہے حق سبحانہٗ نے وصول سبب کے لیے بنایا ہے۔ اگر کوئی شخص اس لیے دروازہ بند کر لیتا ہے کہ اوپر سے چھت پھٹ کر آ جائے گا۔ یہ بے ادبی کرنے والا ہوگا۔ کیونکہ دروازہ بنانا اسی بات کی دلیل ہے کہ اسے کھول کر بیٹھیں۔ اس کے بعد وہ خدا تعالیٰ جانے دروازے سے دے یا چھت سے۔ وہ لوگ بھی جو کہ دروازہ کھول کر تو بیٹھتے ہیں مگر نظر لوگوں کے نذرانوں پر رکھتے ہیں متوکلین میں سے نہیں ہیں کیونکہ کسب پر قدرت کے باوجود فتوح پر نظر رکھنی کم ہمتی اور اسباب دنیا کو ترک کرنا ہے۔ (انتہی)

مولانا محمد قاضی کی ''جمع'' میں مسطور ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ فرماتے ہیں ''اس گروہ کے اکابر میں سے کسی نے فرمایا ہے کہ میں دنیا کمانے میں مشغولی اور پھر روز حساب اس کے حساب کی شدت کو بمقابلہ طمع میں مبتلا ہونے کی ذلت کو پسند کرتا ہوں۔ میرا دنیا میں مشغول ہونا کرم و سخاوت کا اظہار کرنے کی غرض سے نہیں ہے بلکہ اس جہ سے ہے کہ لوگوں کو اپنی طمع کے بوجھ سے رہائی دوں۔ انتہیٰ۔ معلوم ہو کہ توکل کے بارے میں صوفیائے کرام قدس اللہ اسرارہم کے بہت سے قول ہیں جیسا کہ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ ابو یعقوب مذبوری سے پوچھا کہ توکل کیا ہے؟ کہا ترک اختیار (یعنی اپنی پسند کو چھوڑ دینا اپنی قوت و طاقت پر بھروسہ نہ کرنا) حضرت سہل تستری سے دریافت کیا تو فرمایا۔ ''ترک تدبیر'' حضرت حافی سے پوچھا تو کہا ''رضا'' ابوحفص حدآد سے معلوم کیا تو بولے۔ ''اپنی توانائی سے تبرّی۔'' اور حلاج سے معلوم کیا، انھوں نے کہا ''مسبب کو دیکھنا'' فتح موصلی سے معلوم کیا، انھوں نے کہا ''اسباب سے مایوسی۔'' حضرت شقیق (بلخی) سے سوال کیا گیا تو جواب دیا ''اس کی قدرت اور مخلوق کی عاجزی کا ملاحظہ کرنا۔'' حضرت شبلی سے لوگوں نے معلوم کیا تو کہا ''اس کی دید میں سب کو فراموش کر دینے کا نام توکل ہے۔'' انتہیٰ۔ میں نے ان شیخ محمد بریلوی کو اپنے مکان پر ایک روز اس حال میں پہلی بار دیکھا تھا کہ خوش آواز گویوں کا ایک گروہ اور ان کے چند مرید ساتھ تھے۔ جب محفل سرود پر رنگ آیا تو ان کا ایک مرید وجد میں گر پڑا۔ انھوں نے اس کو گود میں لیا اور خود بھی مست ہو گئے۔ موسم بہار تھا ایک قوال کا لڑکا جو حسین و لطیف تھا اس نے موسیقی کے پردے میں کچھ کلام کہا۔ تمام حاضرین وقت محظوظ و مسرور الوقت ہوئے۔ میں نے

فی البدیہہ یہ رباعی کہی

مطرب بچہ سرود گفتہ ز نسبت   چون دیدم و بشنیدم گفتم اَحسنت
در پردہ چہ رمز گفت بے پردہ بمن   انتــا الــمــوجــود مــا انــا الا انــت [1]

اس کے بعد میں نے ان کو اپنے شیخ کے پاس دہلی میں دیکھا تھا۔ وہ مجھ پر بڑا لطف و کرم فرماتے ہیں۔

محمد صالح سنبھلی

شیخ محمد عاشق سنبھلی کے پوتے ہیں۔ قابل تعریف و توصیف اخلاق والے اور پسندیدہ ہمت تھے۔ (ان کے اندر) فقراء اور مساکین کی خدمت کا بہت جذبہ تھا۔ جو بھی ان سے ملتا ان کے حسن مروت سے خوش دل اُٹھتا تھا۔ ان کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی۔ جوانی کے ابتدائی زمانہ میں ان کا گزر لکھی [2] جنگل کی طرف ہوا جیسا کہ سید نظیر محمد کے ذکر میں گزرا ہے وہاں یہ قصہ ہوا کہ ایک صاحب جمال مغنیہ پر وہ عاشق ہو گئے اس سے نکاح کر کے گھر لے آے اور برسوں داد عیش دی۔ ایک رات میں سید فیروز، شیخ فتح اللہ اور شیخ معظم وغیرہ ان کے دادا شیخ محمد عاشق کے عرس میں گئے۔ اچھی طرح ان کی عاشقی کی حکایتیں سنیں۔ (رات کو سماع کی) مجلس خوب شباب پر تھی آخر ہم نے چاہا کہ گھر لوٹیں۔ مگر انھوں نے زبردستی ہمیں ٹھہرایا اور آخری شب خلوت میں خود گانا شروع کیا اور تان سین کا ہندی کلام سنایا کہ تان سین کی یاد تازہ کر دی۔ ہم سب بے حد محظوظ ہوے اور حیرت زدہ رہ گئے، رات کے قوالوں کو بھول گئے۔ وہ ساری رات بڑے حظ و انبساط اور سرور میں پوری ہوئی۔ اسی رات میں نے یہ بھی سنا کہ ان کی اہلیہ بھی خوش نوائی میں انھیں کی طرح ہیں۔ کیا ہی دل خوش کن بات ہے میاں، بیوی آپس میں سب امور میں موافق المزاج ہوں پھر محبت و دوستی میں بھی وہ ایک دوسرے کی موافقت کریں۔ شیخ سعدیؒ نے اسی معنیٰ میں کہا ہے

---

1 گانے والے کے لڑکے نے نسبت کی لے میں گایا۔ جب میں نے اسے گاتے دیکھا اور سنا تو احسنت کہا گانے کی دُھن میں مجھ سے بے پردہ کیا رمز بیان کر دیا۔ تو ہی موجود ہے میں نہیں ہوں مگر تو ہی ہے۔

2 توزک جہانگیری میں ''لکھی جنگل'' لکھا ہوا ہے۔

گر یار موافق است سعدی سہل است جفاے ہر دو عالم [1]

مشفی سنبھلی نے، کہ جن کا ذکر آگے آئے گا اس سے بھی واضح تر کہا ہے

مشفی اندر جہان بود دو بہشت ہست معلوم خاطرت یانہ [2]

یار دانا بہشت بیرون است زنِ زیبا بہشت کاشانہ

مشفی نے اسی مضمون قطعہ کو شعر ہندی میں بعینہ باندھا ہے

جگ منہ دوی بیکنٹھ ہینہ رم اوت مم چیت گھر مینہ نار سلکچھنی باہر جا ہرست

مگر جو عورت اس کے برخلاف ہو اس کے بابت شیخ سعدی نے ایسا کہا ہے

زنِ بد در سرای مرد نکو ہمدرین عالم است دوزخِ او [3]

زینہار از قرین بد زنہار وقنا ربنا عذاب النار

نقل ہے کہ شیخ محمد عاشق ہر وقت باطنی طور پر مخلوق سے انقطاع اور بے تعلقی کی حالت میں رہتے تھے مگر بظاہر ہر قسم کے لوگوں کی صحبت سے حظ وافر اٹھاتے خوش رہتے اور خوش خوش زندگی گزارنے میں بے نظیر تھے۔ اچھی آواز کے سننے کی طرف ان کی طبیعت مائل تھی اسی لیے گانے والے ان کے پاس رہا کرتے تھے۔ خود بھی بڑی صاف آواز رکھتے تھے۔ کبھی کبھی گایا بھی کرتے تھے۔ استادان فن کے وہ ترانے اور لہجے جو انھیں یاد تھے اس زمانہ میں ان سے زیادہ بہت کم لوگ جانتے تھے۔ گانے والوں کے وہ استاد تھے۔ گانے کی باریکیوں سے خوب واقف تھے۔ اس فن کے دانا حضرات ان کے ہنر، دانشمندی فن اور مہارت کے معترف تھے اور پسند فرماتے تھے۔ اکثر حالت ذوق وسماع میں رہتے تھے۔ ان کا رونا حاضرین میں اثر انداز ہوتا تھا اور رقت پیدا کرتا تھا۔ شاہ محمد عاشق سید شاہ محمد دہلوی کے مرید تھے۔ میں سید صاحب کی ایک حکایت شیخ شاہی کے ذکر

---

1 اے سعدی اگر تیرا دوست موافقت کرنے والا ہے، تو دونوں جہاں کی (مخالفت کی) جفا بہت آسان ہے۔

2 مشفی کچھ تجھے معلوم ہے یا نہیں کہ دنیا میں بھی دو بہشتیں ہیں۔ دانا دوست تو باہر کی جنت ہے اور سمجھدار بیوی گھر کی جنت ہے۔

3 نیک مرد کے گھر میں بدکار عورت اس کی اسی عالم میں دوزخ ہے، بچو، بچو برے ساتھی سے بچو۔ اللہ تعالی ہمیں آگ کے عذاب سے بچائے۔

میں لکھوں گا۔آزمائش وقت میں ان کے سارے مریدیں ان سے برگشتہ ہو گئے تھے علاوہ سید محمد عاشق سنبھلی کے۔اسی وجہ سے ان کا لقب محمد عاشق پڑا۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں انھیں حاکم سنبھل کے لڑکے سے محبت ہوگئی تھی جب حاکم کا تبادلہ ہوا انھیں قلق واضطراب نے آگھیرا اسی بیقراری کی حالت میں شیخ علی بنی اسرائیل کی خدمت میں جو کہ کاملان وقت میں سے تھے (ان کا مکمل ذکر شیخ نور محمد کے ذکر میں آئے گا۔انشاءاللہ۔) گئے۔اور ساری داستان ''درددل'' بڑی بے صبری اور بے جگری کے ساتھ سنائی کہ شیخ کے دل میں ہمدردی کی آگ جل اٹھی انھیں ایک کمرے میں بٹھایا اور کہا۔تھوڑی دیر ٹھہرو اور خود خلوت میں چلے گئے اور متوجہ ہو گئے۔ وہ حاکم سنبھل سے باہر نکل آیا تھا اور میلوں نکل چکا تھا اس نے دل میں سوچا میں شیخ علی سے رخصت لے کرنہ آیا۔آخر اس لڑکے سے کہا جا تو جا اور شیخ سے میری جانب سے عذرخواہی کر کے رخصت۔لے کرآنا۔جب لڑکا شیخ علی کے سامنے آیا شیخ نے اس کو حجرے کی طرف اشارہ کیا کہ ایک لحظہ بیٹھو جیسے ہی اس نے حجرے میں قدم رکھا وادرد کے موافق پڑی پھر گزرا جو گزرا۔اس کے بعد شیخ نے شیخ محمد سے کہا تو محمد عاشق ہے؟ شیخ محمد عاشق کی وفات 6رشوال 985ھ(1578) میں ہوئی ہے۔ شیخ (محمد صالح) نے ان کی تعریف میں یہ سورٹھہ کہا ہے

الکنہ بھوا سوکھ رسکنہ محمد سیکنہ بھو
پیوت پیم پیو کہ جوت جوت سمانکہ

عالم خاں سنبھلی

آپ بہت سے مشائخ وقت کی صحبت میں رہے ہیں اور اس راہ کے عجائبات دیکھے ہیں۔صاحب ذوق وشوق،راست گفتار،راست کردار تھے۔ان کے اعمال اور افعال راسخ تھے اور ان کے طور طریق انداز واوضاع سب اہل جہان کو پسند آتے تھے۔دوستان خدا کے بھی منظور نظر اور مقبول خاطر تھے۔

بس نکتۂ لطیف بباید کہ تا کسے
مقبول طبع مردم صاحب نظر شود [1]

ایک دن میں نوجوانی کے دنوں میں شیخ فریدالدین گنج شکر قدس سرۂ کے عرس میں سنبھل گیا۔اور ان کے پہلو میں جا کر کھڑا ہوا۔ایک صوفی رقص وسماع میں تھے۔وہ آنکھ بند کیے کلام سن رہے تھے۔

1 نہایت درجے لطیف نازک مزاجی چاہیے تب جا کر کہیں آدمی کسی کا مقبول نظر ہوتا ہے۔

قوال سمجھے کہ انھیں بھی ذوق نے آ پکڑا ہے۔ انھیں اپنے گھیرے میں لے لیا اور ترنم سے گانے لگے۔ انھوں نے سچائی اور سادگی کے ساتھ کہا اس وقت مجھ پر کوئی حال طاری نہیں ہے۔ لیکن تمھارے لیے سماع کرتا ہوں اور یہ کہہ کر بتکلف ہی شامل سماع ہو گئے۔ چند قدم اُن کے ساتھ چلے، اجازت لی اور لوٹ کر پھر اپنی جگہ آ کھڑے ہوئے اور مجھ سے کہا کیا کرتا اگر میں سماع نہ کرتا قوال شرمندہ ہوتے۔ ان کی اس دل پسند ادا سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ان کی وفات کا سال 1020ھ (1611) ہے۔ ان کی قبر سنبھل میں ہے۔ میں نے دہلی میں ایک با معنی، باہوش، پُر ذوق اور دراز دست یعنی سخی درویش کو دیکھا کہ ایک افغانی کے لڑکے کی محبت میں گرفتار تھا۔ اس درجہ اپنے معشوق ومحبوب کی ولداری میں کمر بستہ تھا کہ معشوق کو ہر طرح کی دنیاوی آسائش مہیا کر رکھی تھی کہ اس جیسا کم ہی دیکھا اور سنا گیا ہوگا۔ میں اس کو جانتا تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ بچوں نے اُسے کوچے میں گھیر رکھا ہے اور وہ مجذوبانہ اداؤں کے ساتھ ناچ رہا ہے اور ہذیان سرائی کر رہا ہے اور بچے اس کے پتھر مار رہے ہیں۔ جب وہ فارغ ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔ اللہ کے واسطے بتائیں کہ یہ سب کیا تھا؟ کہا کیا کروں بچوں نے مجھے دیوانہ سمجھا میں نے بھی (ان کی دلجوئی کے لیے) خود ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جیسا کہ ابھی تم نے دیکھا۔ میں نے برجستہ کہا

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　کہ من آن جلوۂ قد می شناسم [1]

شیخ ابوالمکارم سنبھلی

آپ صلاح وسلامتی اور استقامت والے مردان خدا میں سے تھے۔ شروع میں دین ودیانت کے ساتھ (دربار شاہی) میں محتسب تھے۔ اس کام میں رسوخ ووثوق کامل رکھتے تھے۔ آخر الامر اس سے ہاتھ کھینچ لیا اور گوشۂ غربت اور عزلت کو اختیار کر لیا اور اس طریق (تصوف) کے اہل حضرات سے صحبت رکھنے لگے۔ ہمیشہ حضرت شیخ فاضل اور شیخ عبدالکریم کی خدمت میں جو کہ میرے استاد ہیں اور ان دونوں حضرات کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ پہنچتے اور تفسیر حسینی کا دور کیا کرتے۔ اس تفسیر سے انھیں اتنا

1 چاہے کسی بھی طرح کے کپڑے زیب تن کر لے میرے محبوب میں تیرے اس (سرو) قد کو خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

لگاؤ تھا کہ کبھی خود سے جدا نہ کرتے۔ ایک دن ایک بزرگ نے ان سے کہا۔ کبھی دوسری کتابوں میں بھی مشغول ہوا کریں۔ وہ بولے میں چاہتا ہوں کہ آخری سانس تک یہ کتاب میرے ساتھ رہے اور اسی کے ساتھ موت آئے۔ آخر ایسا ہی ہوا کہ جب لمبی عمر پا کر 1040ھ (1631) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جب قمیص کے بند کھولے تو اسی تفسیر کے کئی پارے ملے۔ انھوں نے اس کتاب میں حد درجہ مشغولی کی وجہ سے فارسی کی بعض عبارتوں پر اعراب لگا رکھے تھے تا کہ رعایت اِعراب سے اس کا مطالعہ کریں کہیں عبارت غلط نہ پڑھی جائے۔ ظرافت پیشہ حضرات اس معاملہ میں ان کا مذاق اُڑاتے مگر انھیں اس کی پروانہ تھی۔ کلام مجید کو بھی وہ اسی طرح رعایت مخرج و تجوید سے پڑھا کرتے تھے بلکہ عربی کی دوسری عبارتوں کو بھی اسی انداز سے بلکہ اکثر فارسی کی عبارتیں بھی بلا تکلف قرأت کے اصولوں کے تحت پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن خواجہ شیرازی کا یہ شعر قرأت کے ساتھ پڑھا

والہ و شیداست دائم ہمچو بلبل در قفس　　طوطی طبعم زعشق شکر و بادام دوست [1]

میں اور سارے بچے ان کی اس ادا پر ہنس پڑے اور برسوں ان کی تقلید میں اس شعر کو اسی طرح گایا کرتے تھے۔ وہ برا نہیں مانتے تھے بلکہ خوش ہوتے کیونکہ وہ خود بھی ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ لوگوں کی سخت کلامی پر بجائے خفا ہونے کے مسکرایا کرتے تھے۔ چنانکہ ایک دن ان کے مدرسے میں چھپر کے سایے میں ہمارے استاد صاحبان، وہ اور ہم سب لڑکے یکجا بیٹھے تھے۔ بارش ہو رہی تھی وہ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے اور انگلی کے ناخن سے چٹائی سے کھیل رہے تھے۔ اس سے آواز نکل رہی تھی۔ مجھے یہ گمان ہوا کہ یہ بارش کے قطروں کے ٹپکنے کی آواز ہے جو چٹائی پر گر رہے ہیں۔ میں نے کہا پانی ٹپک رہا ہے کیونکہ میں نے ان کی انگلی کی ضرب کو جو وہ چٹائی پر لگا رہے تھے نہ دیکھا تھا۔ وہ یہ سن کر ہنسنے لگے اور اسی بارے میں ایک مثال سنائی۔ ایک بوڑھا ایک چھپر کے نیچے تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور چھپر ٹپک رہا تھا۔ بوڑھا بولا جتنی وحشت مجھے ٹپکنے سے ہوتی ہے اتنی تو شیر سے بھی نہیں ہوتی۔ اس کا لڑکا بھی یہ بات سن رہا تھا۔ ایک مدت کے بعد اسے بھی یہ معاملہ پیش آیا۔ جب چھپر ٹپکا تو بہت جلد اُٹھا اور فریاد کرتا ہوا گھر سے باہر آیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا؟ کہا کہ ایک روز میرے والد نے ٹپکنے کی دہشت کو شیر کی دہشت سے زیادہ بتلایا تھا اسی لیے میں اس

1　قفس میں قید بلبل کی طرح میری طوطی طبع بھی ہمیشہ شکر و بادامِ دوست کی والہ و شیدا ہے۔

وقت پانی ٹپکنے کی وجہ سے باہر نکل آیا ہوں۔ میں نے کہا اس موقع پر مجھے بھی ایک مثال یاد آئی اگر آپ
بُرا نہ مانیں تو کہوں۔ کہا" ہاں کہو" میں نے کہا کہ کہتے ہیں کہ قزوینیوں میں کا ایک چھوٹا بچہ ایک ٹانڈ پر
بیٹھا دریا کے کنارے زمین میں دبی ہوئی شکر قندیاں نکال کر کھا رہا تھا۔ اچانک شکر قند اس کے ہاتھ
سے گری اور پانی میں پہنچ گئی۔ لڑکے نے جب نگاہ دوڑائی تو اپنی صورت پانی میں دیکھی۔ اس عکس
صورت سے قند مانگنی شروع کی۔ جب مقصد حاصل نہ ہوا تو اپنے چچا کے پاس آیا۔ جو کہ بوڑھے آدمی
تھے اور داڑھی سفید ہو چکی تھی۔ عرض کیا کہ پانی میں کوئی ہے جس نے میری شکر قند چھین لی ہے۔
میں مانگتا ہوں تو نہیں دیتا۔ وہ بوڑھا آدمی اس پانی کے کنارے آیا، پانی میں جھانکا اپنی صورت کا عکس
دیکھا غصے ہو کر کہا۔ اے بوڑھے آدمی اگر کوئی بچہ تیرے سامنے شکر قند کھا رہا تھا کیا تجھے مناسب تھا کہ
باوجود سفید داڑھی کے تو اس کے ہاتھ سے چھینتا۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ چھوٹوں کے ساتھ ایسا سلوک
کرتا ہے۔ جب میں نے یہ کہانی ختم کی۔ میرے دونوں اساتذہ، حاضرین سب چھوٹے بڑے ہنس
رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ حضرت ابوالمکارم نے میری اس جرأت پر اخلاق وانصاف کا معاملہ کیا
اور بڑے خوش ہوئے کہ میں نے برمحل خوب جواب دیا۔ ان کے چار لڑکے تھے۔ شیخ، مشائخ، ولی،
اولیا نام کے۔ آج ان کا نام ونشان بھی نہ رہا۔ الحق، اس سرائے فانی میں نہ شیخ باقی رہے نہ مشائخ نہ
ولی، نہ اولیاء۔" الله الباقی و الکل فانی"

شیخ مصطفیٰ بن ابراہیم سنبھلی

ان کے دل میں بچپن میں ہی اس راہ (تصوف) کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے لڑکپن میں ہی اس راہ
کی کافی فہم وفراست حاصل کر لی تھی۔ جب چودہ سال کے ہوئے تو طریقہ نقشبندیہ کا شغل اختیار کیا
اور مشغول ہو گئے۔ یہی حال تھا کہ عبدالسلام نام کے ایک صاحب باطن غریب (مسافر) طالب علم
فرید آباد پہنچے اور ان سے بہت اخلاص ومحبت کا برتاؤ کرنے لگے۔ انھوں نے ایک دن ان صاحب
سے کہا کہ جو ذکر باطنی آپ کرتے ہیں مجھے بھی سکھائیں تاکہ میں بھی اس میں مشغول
ہوں۔ انھوں نے کہا۔ مجھے اس کام کی اجازت نہیں ہے۔ اس بات کی تحقیق کے لیے دونوں میر
صالح کے پاس پہنچے جو ان کے علوم ظاہری کے استاد تھے۔ انھوں نے اپنا مافی الضمیر اس عبارت

میں عرض کیا کہ اگر کسی چراغ کو دوسرے چراغ سے جلائیں تو کیا پھر بھی اجازت کی ضرورت ہے۔ میر صالح جب سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے تو فرمایا۔ "نہیں۔" شیخ مصطفیٰ مدتوں عبدالسلام کے بتائے ہوئے ذکر پر مداومت کرتے رہے اور جمعیت بہم کرلی۔ عبدالسلام کی جدائی کے بعد "حاجی حسین" نام کے ایک سیاح وہاں آئے تو انھوں نے حاجی صاحب کی صحبت میں رہنا شروع کردیا۔ ایک دن حاجی صاحب پر انبساط کا غلبہ تھا انھوں نے شوق و نیاز کی راہ سے حاجی صاحب کے لیے یہ شعر پڑھا

آنا نکہ خاک را بنظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند [1]

حاجی صاحب نے کہا کیا پڑھا ذرا دوبارہ پڑھو۔ انھوں نے اس سے زیادہ جذبے کے ساتھ پڑھا آخر حاجی صاحب خود ترنم کے ساتھ گانے لگے۔ اِن کو یہ سن کر رقت طاری ہوگئی اور حال جذبہ نے دل کو جکڑ لیا بہت روئے اس کے بعد حاجی صاحب کے پیروں میں لوٹ گئے اور کہا۔ اے شیخ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے اور مجھے خود سے جدا نہ کریں

من از تو ہیچ مرادے دگر نمی خواہم ہمین قدر بکنی کز خودم جدا نکنی [2]

حاجی صاحب نے کہا یہ کوئی مشکل نہیں آسان ہے تیرے ماں باپ کہ تیرے سوا دوسرا کوئی فرزند نہیں رکھتے تیرے فراق میں پریشان اور ہلاک ہوجائیں گے۔ تو دل قوی رکھ اور امیدوار رہ کہ آخر ایک دن تجھے فقر حقیقی نصیب ہوجائے گا۔ ان کا ملفوظ ہے کہ کسی نے حاجی صاحب سے عرض کیا کہ آپ عالم اسرار کے دانا ہیں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی غیبی تماشا دکھائیں حاجی صاحب نے فرمایا۔ بتا کیا چاہتا ہے ان باطل شعبدوں کو دیکھ کر کیا کرے گا۔ مگر وہ بضد ہوگیا۔ کیونکہ وہ حاجی صاحب کا مقبول نظر تھا (اس کی دل داری کی غرض سے) ایک رات کو اسے حوض فرید آباد کے کنارے لے گئے اور عمل کو بروکار لائے۔ ایک لمحے میں باجمال عورتیں رنگین و فاخرہ لباس پہنے روشنیوں کے ساتھ ظاہر ہوئیں اور گانا اور ناچنا شروع کردیا۔ اور بہت دیر تک یہ ہنگامہ گرم رہا سب کو خوش کیا اور نظر سے غائب ہوگئیں۔ وہ ہی فرماتے تھے کہ حاجی صاحب نے فرمایا کہ میرے والد کے کئی بیٹے تھے، میرے علاوہ سب کے سب قابل تھے۔ میں سب سے چھوٹا تھا انھوں نے مجھے گھر سے بھگا

---

1 جو لوگ نظر سے مٹی کو کیمیا بنا دیتے ہیں۔ کاش کہ چشم عنایت کی کوئی نظر ہم پر بھی کریں۔

2 میں تجھ سے اور کوئی مراد نہیں چاہتا بس اتنا کر کہ مجھے اپنے آپ سے جدا مت کر۔

دیا۔ ایک روز میں نے خود سے کہا کہ مجھے خود کو راہ خدا میں ڈال دینا چاہیے کہ مجھ جیسے کا اس کے علاوہ کون خریدار ہوسکتا ہے اس طرح میں اس راہ میں آگیا اور درویشوں کی صحبت اور ان کی خدمت کو اپنے اوپر لازم کرلیا۔ آخر کار اللہ سبحانہٗ نے مجھے اپنے کرم خاص سے قبول کرلیا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ جب سے حاجی صاحب فرید آباد سے سفر پر گئے تھے کافی مدت گزر چکی تھی ایک دن میں حاجی صاحب کی جدائی میں حد درجہ اندوہناک ہورہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا آیا وہ زندہ ہیں یا نہیں۔ اسی اثنا میں دیکھا کہ زینے والے حجرے کے طاق میں حاجی صاحب کی صورت بالکل عیاں اور ظاہر تھی۔ میرا ایک دوست ''نور اللہ'' نام کا تھا اس نے بھی حاجی صاحب کی صحبت اُٹھائی تھی اور بہرہ مند ہوا تھا۔ وہ میرا رفیق حجرہ تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی صورت بعینہٖ حاجی صاحب کی سی ہوگئی مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے اس کو جکڑ کر آغوش میں بھرلیا۔ جب درختوں پر نظر ڈالی تو ہر شاخ اور شگوفہ بصورت حاجی صاحب ہوگیا تھا۔ اس کے بعد میری طلب اور زیادہ بڑھ گئی۔ ایک دن شیخ مصطفیٰ اور میں ایک جگہ سو رہے تھے۔ آدھی رات کو وہ نعرہ شوق مار کر روتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ میں نے معلوم کیا۔ کیا حال ہے؟ وہ ٹھیک سے بات نہیں کر پا رہے تھے۔ کہ سانس ان کے گلے میں اٹکا تھا پھر ایک بار خود کو سنبھال کر کہا کہ ابھی میں نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ میں آنحضرت کے سامنے ادب سے کھڑا ہوں۔ عاجزی و خاکساری دکھا رہا ہوں۔ غایت رقت سوز و گداز سے خود کو محو اور مضمحل پا رہا ہوں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر رہے ہیں کہ یا رسول اللہ مصطفیٰ کو بہت بے چینی ہے۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری تسلی فرمائی۔ یہ واقعہ محلہ بخاری لاہور میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد میں اپنے والد کے ہمراہ بہرہ خوشاب کی طرف گیا اور وہ قصبہ پیلوزی میں جو کہ لاہور کے علاقے میں ہے پہنچے ہیں۔ وہاں سید عارف نام کے ایک فقیر وارستہ، آزاد مزاج، صاحب معنی شیخ سعد اللہ کے مرید جو کہ شیخ عبد الجلیل لکھنوی سے بیعت تھے، کوٹ قبولہ میں سکونت رکھتے تھے، آئے ہوئے تھے۔ روایت ہے کہ شیخ عبد الجلیل فقرائے اہل تجرید و تفرید، صاحب احوال عظیمہ اور کیفیات عالیہ تھے جیسے کہ بعض رسائل میں ان کے مقامات، مقررات و مکتوبات اس کے شاہد و عادل ہیں۔ ان کے بہت سے اہل تجرید اور وارستہ مریدین تھے۔ ان میں سے

سعداللہ اور حسن حافظ ان کے قریے (پپلونڈی) میں رہتے تھے۔ شیخ عبدالجلیل لکھنوی کے کرامات کے عجیب و غریب احوال ہندستان میں مشہور ہیں۔ ان کی وفات کا سال 1000ھ (1594) ہے اور قبر لکھنؤ میں ہے۔ ایک دن مصطفیٰ ان سید عارف کے پاس گئے۔ سید عارف نے ان کی صدق طلب کو دیکھا تو دریافت کیا، کیا حال ہے؟ کہا۔ ''امیدوار ہوں۔'' جو کچھ قباحت ہے بس یہی ہے (یعنی کہ اپنے اعمال کو قابل امید سمجھتے ہو) شیخ مصطفیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ بات گویا ایک آگ تھی جو روئی میں لگ گئی۔ اور میری ہستی کے پنبہ کو بالکل خاکستر کر دیا'' وہ لشکری تھے بس یہ بات سنتے ہی سارا سامان اور گھوڑا چھوڑا اور سب سے ہاتھ جھاڑ وہیں سے سید عارف کے ہمراہ ہوگئے۔ اور راہ درویشی اختیار کر لی۔ ترک و تجرید تام کی دولت ان کو نصیب ہوگئی۔ ترک کے اوّل روز یہ پنجابی شعران کی زبان پر آیا۔

چلکیاں چلکیاں کدیان اور کیلن کریاں   جب گل انکی ستیہ کی بسے بسریاں[1]

''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ نظام الدین (دہلوی) اولیاء قدس سرہٗ نے علوم دینی کی تحصیل و تکمیل کے بعد پہلی رات جامع مسجد دہلی میں بسر کی جب صبح کے وقت موذن مینارے پر چڑھا تو اس نے یہ آیت پڑھی ''الم یان للذین امنو ان تخشع قلوبھم لِذکر اللہ[2]''۔ آپ نے جب اسے سنا تو آپ کے دل کی حالت بدلنے لگی اور ہر جانب سے آپ پر انوار الٰہی ظاہر ہونے لگے۔ جب دن نکلا بغیر زادراہ اور سواری کے شیخ فریدالدین گنج شکر قدس سرہٗ کی خدمت میں اجودھن پہنچے اور بیعت ہو کر چلہ نشین ہوگئے اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ حضرت شیخ نے ان کو دوسروں کی تکمیل و اشاعت کی اجازت دے کر دہلی لوٹا دیا۔ وہاں طلبائے علم کی تعلیم دین اور اہل ارادت کی تکمیل کا مشغلہ اختیار فرمایا۔ (خواجہ) حسن دہلوی اور خواجہ خسرو دہلوی دونوں ان کے مرید ہیں۔ شیخ فریدالدین کو حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے خرقہ خلافت ملا اور انھیں خواجہ معین الدین حسن سجزی سے۔ شیخ مصطفیٰ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ملتان کے نواح میں صحرائے ریگستان میں سروپا برہنہ چلا جا رہا تھا ہوا نہایت درجہ گرم تھی اور آفتاب روشن کہ اچانک ہاتف غیب نے مجھے

---

1   نسخۂ ندوہ میں یہ مصرعہ اس طرح ہے ''جب گل لاگے کنتہ کے بسے بسریاں''۔

2   کیا مومنین کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے جھک جائیں۔

آسمان کی جانب سے یہ آواز دی کہ "جعلت الدموع دماً بطریق الرقیب[1]" جب سید صاحب کے پاس پہنچا تو وہ قیلولہ کر رہے تھے۔ فوراً کمر سے فوطہ کھولا اور مجھے دیا کہ سر پر باندھ لے ننگے سر ایسی دھوپ میں نہ پھر۔ میں نے لے کر سر پر باندھ لیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ غیبی آواز ان پر کشف ہوگئی ہے۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ اسی سفر تجرید میں ایک بار میری آنکھ میں درد ہونے لگا۔ ایسے جنگل میں جس میں درندوں کا خوف تھا رات کو تنہا اور بھوکا سو گیا ناگاہ ایک جانب سے روشنی ظاہر ہوئی اور ایک نورانی بزرگ سامنے آئے اور میرے سامنے بیٹھ گئے اور کہا مصطفیٰ اُٹھ، جب میں اُٹھا تو نہایت مزیدار گرما گرم حلوئ میرے سامنے رکھا اور پیٹ بھر کر کھلایا اور نظر سے غائب ہوگئے۔ پھر ایک زمانے کے بعد میں نے ان کو انقطاع تمام اور تجرید کی حالت میں لاہور میں دیکھا اور دریافت کیا۔ کیسے ہیں؟ کہا "خودی چلی گئی خدا آ گیا" ایک دن محمد صالح بن محمود باول جوان کے ماموں تھے انھیں زبردستی اپنے گھر لے گئے، غسل کرایا اور نفیس کپڑے پہنائے۔ وہ بازار پہنچے کھڑے ہوئے اور کپڑے اتار کر ایک فقیر کو دے دیے۔ سر سے دستار اتاری اس کا کنارے کا سرا ذرا سا پھاڑ کر ایک بچے کے ہاتھ میں دیا اور کہا تو اس طرف جا، میں اُس طرف جاتا ہوں۔ جب دو ٹکڑے ہوگئی پھر چار ٹکڑے کر دی۔ دونوں ایک ایک ٹکڑا پکڑ کر مختلف سمت کو بھاگ گئے۔ اس طرح چند بار میں دستار چندی چندی کر ڈالی۔ اس کے بعد وہ میرے شیخ کے پاس دہلی آئے اور خاموش بیٹھ گئے۔ پہلے تو میرے شیخ نے انھیں پہچانا ہی نہیں۔ جب پہچانا تو ان کے اس طریقۂ آزادگی اور بے تعینی کی داد دی اور کچھ وقت اپنے پاس بٹھائے رکھا خوب صحبت بابرکت رہی۔ جب میں نے لاہور میں اُن سے بہت زور دے کر کہا کہ اپنی والدہ کے پاس ضرور فرید آباد چلے جائیں سنا ہے کہ تمھارے فراق میں ہلاکت کو پہنچ گئی ہیں۔ کہا "میں نہ جاؤں گا کیونکہ میرا یہ حال دیکھ کر میرے رشتے دار شور و غوغا کریں گے مجھے یہ بات پسند نہیں۔ میں نے کہا "اللہ کے لیے میری عاجزی اور الحاح وزاری پر رحم کھائیں اور ضرور جائیں۔" یہ سن کر فرمایا "اچھا" دہلی سے فرید آباد گئے اور انجانوں کی طرح ماں کے سامنے جا بیٹھے۔ ان کی والدہ ان کے مشرب درویشانہ کے مواقق سلوک کرتیں۔ ہر صبح نئے کپڑے کفنی، تہبند اور چرمہ پہناتیں۔ وہ شام تک سب فقراء کو دے دیتے۔ پندرہ جوڑ کپڑے فقرا

---

1 تو نے تو دوست کی راہ میں آنسوؤں کا خون کر دیا۔ (اب تو خود کو راحت پہنچا)

کو دیے اور اس کار درویشی کے اہل لوگوں میں قلندرانہ اور بے تکلفات آزادانہ اٹھتے بیٹھتے۔ بہت سے ان کی صحبت کی برکت سے فتح یاب بھی ہوئے۔ ان میں سے ایک عبدالرحیم تھے ہیں جو آج کل وارستہ اور آزادانہ زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مریدانہ سلوک کرتے تھے۔ برسوں کے بعد سید عارف ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ تیرا کام پورا ہو گیا ہے۔ ''اب جو تیری والدہ کی دلی خواہش ہو وہ کر۔'' وہ اب اپنی والدہ کی مرضی سے عبا پوشی سے قبا پوشی میں آ گئے، شادی کی اور اولاد ہوئی۔ ان میں سے ایک شیخ مرتضیٰ ہیں۔ شیخ مصطفیٰ دوبارہ رستم خان دکھنی کے لشکری بنے۔ اس وقت میں اور وہ بہت ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے ایسے دوست رہے ہیں کہ بایدو شاید۔ وہ اپنے گزرے ہوئے احوال کی عجیب و غریب حکایتیں سنایا کرتے ایک بار سنایا کہ میں ایام جوانی میں ایک باکرہ عورت کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا عجیب و غریب احوال کا ان دنوں مشاہدہ کرتا تھا پہلے دن جب وہ پری پیکر نظر پڑی بے اختیار گھوڑے سے اتر پڑا اور درود پڑھتے ہوئے سر سجدے میں رکھ دیا۔ روز بروز اس کی محبت نے غلبہ کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار صبر و اختیار کی لگام ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دل سے مجبور ہو کر چاہا کہ معشوق کے مکان پہنچوں۔ چلتے چلتے راستہ بھول گیا۔ کھڑا ہوا تھا کہ ناگاہ دیکھا کہ لمبے قد والے ایک صاحب فاخرہ لباس پہنے میرے سامنے حاضر ہیں مجھ سے معلوم کیا راہ بھول گئے؟ میں نے کہا ''ہاں'' کہا میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ میں ان کے پیچھے چند قدم ہی چلا تھا تو انھوں نے کہا۔ راستہ یہ ہے اِدھر جائیں۔ اور وہ نظر سے غائب ہو گئے۔ میں معشوق کے دروازہ پر پہنچا۔ وہاں جو دربان تھا اس نے معشوق کو خبر کی۔ اندر داخل ہوا اور صبح تک محو دیدار حسن محبوب رہا اور خوب خوب محظوظ و مسرور ہوا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ اس پری رُخ کی جدائی میں دن رات چھ مہینے مجھے نیند نہ آئی۔ اس کے بعد ایک رات کو ایک لمحے کو آنکھ لگی تو وہ چاند خواب میں نظر آیا اور ناز دکھاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ جس دن سے تو جدا ہوا ہے میں نے نہ سر میں تیل ڈالا نہ کپڑے پہنے نہ پان کھایا۔ جب میری آنکھ کھلی تو بف خان کا یہ خیال میری زبان پر آیا۔ بف خان (وہ ہیں) کہ جن کی زیبائی اور نغمہ سرائی کا ذکر سید فیروز کے احوال میں آیا ہے۔ خیال

تو نہ آوے ہماری نگری جتے تو بچھرا   نہا لوں تیل نہ مکھ تنبول نہ ہاتھوں بنگری

وہ ہی کہتے ہیں کہ اکثر غلبۂ عشق کے سبب اس معشوقہ کے غم میں اپنے دل کو اس کا دل سمجھتا تھا اور اپنے

جسم کو اس کا جسم اور کسی کو اپنے پہلو میں نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ اگر کبھی کوئی بیٹھ جاتا تو مجھے بڑی غیرت آتی تھی۔ میری اس بات سے مصاحبین حیرت میں پڑتے تھے۔ کھانے میں بھی کسی کو شریک نہ کرتا تھا۔ اسی پر اور احوال کو بھی سمجھو، یہ وہی بات ہے کہ

من لیلیٰ کیست ؟ و لیلیٰ لیلیٰ کیم؟ من انا لیلیٰ و لیلیٰ انا[1]

با دو ردحیم، آمدہ در یک بدن[2]

مولانا عبدالغفور لاری نے ''نفحات الانس'' کے حاشیے کے تکملے میں لکھا ہے کہ مولانا جامی نے فرمایا ہے کہ شروع حال میں جبکہ بعض صور کونیہ سے تعلق خاطر رہتا تھا تو بس نفس محبت اور اس کی آگ سے چین نصیب ہوتا تھا کیونکہ خیال متعلق کی صورت سے بھی دل خالی رہتا تھا، تامل کرنے سے بھی اس تصویر کا حاضر کرنا میسر نہ تھا۔'' اس حال میں وہ مجنون عامری کے موافق تھے کہ مجنون کے سامنے سے لیلیٰ گزر بھی گئی مگر اس نے نہ جانا۔ جب اس نے شکایت کہلوائی تو کہا۔ ''شغلنی حبک عنک[3]'' فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن وضو کرتے ہوئے جب ہاتھ دھونے کی نوبت آئی۔ اپنے ہاتھ کو جس سے تعلق خاطر تھا اس کا ہاتھ پایا۔ جب اس بات کا مشاہدہ ہوا تو دل میں آیا کہ یہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''ھٰذہٖ ید اللہ '' (یہ اللہ کا ہاتھ ہے) اور یہ کہتے ہوئے اپنے دست مبارک کی طرف اشارہ کیا، وہی مثال یہاں گزری ہوگی۔ انتہیٰ) ایک بار شیخ مصطفیٰ کو فرید آباد میں اور مجھے دہلی میں ایک ہی خیال پر حالت طاری تھی وہ خیال ہندی یہ ہے۔

مُنہ پر کیسور سنا بنی نین لال جو چت جدّ ہے للنابل لگاہے دیکھت ہے منہ

ناہی بسپت سیان روپ منہ نجھک موئے رہی تم ہو پیاں من والی منہ

جب وہ انھیں دنوں فرید آباد سے دہلی آئے اسی خیال کو گاتے ہوئے۔ مجھے بڑی خوشی اور حیرت ہوئی کہ کیا عجب اتفاق ہے کہ دنوں پر ایک ہی حال طاری تھا۔ وہ میرے شیخ کی خدمت میں میری ابتدائی مشغولی کے دن تھے۔ مجھے شیخ مصطفیٰ سے خاص محبت تھی اور خوب آپس میں ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ میرے رشتہ دار بھی ہیں میرے برادر نسبتی ہیں۔ ایک دن میں نے ان کو فرید آباد کی مسجد

---

1 میں لیلیٰ ہوں اور لیلیٰ کون ہے۔ میں ہوں۔ میں کون ہوں؟ لیلیٰ اور لیلیٰ کون ہے؟ میں۔

2 دو جانیں ہیں جو ایک بدن میں آئی ہیں۔

3 مجھے تیری محبت نے تجھ سے بے پرواہ بنا دیا۔

کے صحن میں دیکھا کہ جماعت خانے کی طرف جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی میری ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا۔ کچھ دیر پہلے آپ جماعت خانے کی طرف جا رہے تھے کہاں چلے گئے تھے۔ کہا کہ آج تو میں اس سے پہلے بالکل مسجد میں آیا ہی نہیں۔ (اسی طرح میں نے اپنے شیخ کو ایک دن اکبرآباد میں دیکھا ہے، وہ حکایت خاتمہ کتاب میں آئے گی) اسی طرح مجھے ایک صاحب جمال نوجوان سے شورانگیز اور ولولہ آمیز محبت رہی ہے۔ ایک دن اس کے شوق دیدار میں گھر سے نکلا دیکھا کہ اپنے مکتب میں بیٹھا ہوا ہے۔ دل میں آیا کہ یہاں اس سے بات کرنی میسر نہ ہوگی آگے بڑھ اس کے گھر کے راستے میں بیٹھ گیا کہ جب وہ آئے گا بات کرلوں گا۔ اس کو وہاں بیٹھا چھوڑ آگے بڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے آگے تیز تیز جا رہا ہے۔ میں اس سے بھی زیادہ تیز چلا جب اس سے آمنا سامنا ہوا تو میں بھی متحیر کھڑا ہو گیا اور وہ بھی۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ بول سکا۔

تو وتمکین، من و حیرت، نہ ایمائے، نہ تقریرے   بداں ماند کہ ہم بر مست تصویرے بتصویرے [1]

ابتدائے جوانی میں، میں ایک پری چہرہ پر شیفتہ و فریفتہ رہا ہوں۔ اس قسم کے عجائب اس زمانے میں بہت مشاہدہ ہوتے تھے۔ یہ حکایت بہت دراز ہے، یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ ایک بار اس پری رُخ سے مفارقت ہوگئی۔ میری حالت خراب ہوگئی۔ کئی دن تک کچھ نہ کھایا، نزدیک تھا کہ میری روح بدن سے نکل جائے

شنیدہ ام سخنے خوش کہ پیر کنعاں گفت   فراق یار نہ آں ی کند کہ بتواں گفت [2]

شاہ علی نام کے ایک پسندیدہ کردار، صاحب شوق دوست جو شیخ عبداللہ بہتہ کے مرید ہیں، میرے حال پر رحم کھا کر جو اس وقت دہلی اپنے وطن میں تھے روزانہ بدن پر خاک ملتے قلندروں کی طرح کھال اور لوہا پہنتے اور اس پری رخ کے دروازے پر بھیک مانگنے جایا کرتے اور تھوڑی سی چیز اس کے ہاتھ سے مجھے اس گاؤں میں لا کر دیتے جہاں میں رہتا تھا اور اس عطیئے سے جسم کو طاقت اور

---

1 تجھ میں پاسداری، مجھ پر حیرت طاری نہ کوئی اشارہ نہ گفتگو، بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک تصویر دوسری تصویر کے سامنے ہو۔

2 میں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ایک پسندیدہ بات سنی ہے جو انھوں نے فرمائی۔ فراقِ محبوب انسان کے ساتھ کیا کیا کرتا ہے وہ بتایا ہی نہیں جاسکتا۔

قلب کو سکون پہنچاتے۔

شروع میں ایک دن شیخ مصطفیٰ، میں اور سارے احباب حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم گاہ کی زیارت کے لیے گئے وہ غایت شوق سے اثنائے راہ میں سجدے کرتے جاتے تھے اور عجیب حال سے اس مقام عالی میں داخل ہوئے وہاں جا کر انھیں رقت طاری ہوگئی اور بری طرح رونا شروع کر دیا دیر تک یا رسول، یا رسول اللہ کہتے تھے، حاضرین وقت پر بھی ان کے حال کا بہت اثر ہوا آخر رات کے وقت سب واپس گھر لوٹے۔ کبھی کبھی وہ ہندی اور فارسی اشعار بھی کہا کرتے تھے۔ ایک بار کسی مشہور شاعر کا یہ مطلع سنبھل میں پڑھا گیا۔

تا دست تیغ آن بت مغرور شد بلند   صد گردن نظارگی از رشک شد بلند [1]

تو انھوں نے کہا

شد پیش گاہِ موکب عشاق را علَم   آن چوب خشک رایت منصور شد بلند

زاہد لباس غرہ مبر شملہ ات مدام   بر روے پشت چون دُم لنگور شد بلند [2]

انھوں نے ایک ہندی ''کنڈلیا'' کہی تھی۔ اس کا صرف پہلا مصرعہ مجھے یاد رہا۔ باقی کہیں نہیں ملے۔ پس دیگر پانچ مصرعے میں نے کہے ہیں۔ یہ معاملہ ان کی وفات کے بعد کا ہے۔ وہ یہ ہے

مورا چیت تہاں لکھو جہاں نہ آواگون   ناں تہاں نہانو تو ہیں، نہ تہاں ثمر نہ جون

نا تہاں ثمر نہ جوں نا تہاں سمجھیں بوجھن   نا تہاں سدہ نہ بدہ ناں تہاں سوجہ سوجھن

آپ آپ سوں ہست لکھو تہاں ہست نہ روہن   بات کہی نہ جات ہے ایسے اب موہن

آخری زمانہ میں رستم خاں دکھنی نے بادشاہ صاحب قِران ثانی کے حکم سے دارالحرب کوہ کمایوں کے کفار پر لشکر کشی کی تھی اور کارزار عظیم پیش آیا تھا۔ ایک دن انھوں نے ایک شخص کا قرض جوان کے ذمے تھا ادا کیا دیوان حافظ ہاتھ میں لیا اور کہا پتا نہیں اس جنگ میں کیا پیش آئے۔ بغرض فال

---

1   جیسے ہی اس بت مغرور نے ہاتھ میں تلوار لی کہ کسی کو قتل کرے، تو رشک سے سو گردنیں اُٹھیں کہ دیکھیں وہ کون خوش نصیب ہے۔

2   عاشقوں کی سپاہ کے سامنے دار منصور کی خشک لکڑی کا نشان بلند قائم ہو چکا کہ عشق میں یوں جاں دی جاتی ہے۔ اے زاہد لباس زاہدانہ پر ناز نہ کر۔ ہر وقت تیری کمر پر صافے کا لٹکا ہوا شملہ لنگور کی دم کی طرح بلند ہوتا ہے۔

دیوان کھولا تو اتفاقاً یہ نکلا

طہارت ار نہ بخونِ جگر کند عاشق　　بقول مفتی عشقش درست نیست نماز
بیک دو قطرہ کہ ایثار کردی اے خواجہ　　بسا کہ بر رُخ دولت کنی کرشمہ و ناز [1]

یہ فال نکل آنے کے بعد انھوں نے کہا مجھے خون کا رنگ نظر آ رہا ہے۔ میں نے کہا ''آنکھوں کے قطروں کا بہانا بھی عشاق کے لیے لازمی چیز ہے۔ رات کو کہا اور مجھ سے ایسا کبھی نہیں کہا تھا ''اے بھائی آج کی رات ایک ساتھ سوئیں گے۔ دونوں ساتھ سوے۔ وہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ سے شہادت کی دعا کیا کرتے تھے۔ آخر اسی رات کی صبح کو دوران کارزار ایک تیر تفنگ ان کے پیشانی میں آ کر لگا حرف ''ھُوَ'' مد کے ساتھ کہا اور شہادت کے مرتبۂ اعلیٰ سے مشرف ہوگئے۔ 21 ر ذی الحجہ 1048ھ (26 ر مارچ 1639) بروز یکشنبہ۔ میں نے ان کے حال کے بارے میں فال کے لیے دیوان حافظ کھولا یہ شعر نکلا۔

شکر خدا کہ ہر چہ طلب کردم از خدا　　بر منتہاے ہمت خود کامران شدم

اس غزل کے دیگر اشعار یہ ہیں:

اے گلبن جوان بر دولت بخور کہ من　　در سایۂ تو بلبل باغ جنان شدم
در شاہراہ دولتِ سرمد ز بخت نیک　　با جام مے بکام دل دوستان شدم
از آن زمان کہ فتنہ چشمت بمن رسید　　ایمن ز فتنہ بازی آخر زمان شدم
زان روز بر دلم در دولت کشادہ شد　　کز ساکنانِ در گہ پیرِ مغان شدم
دوشم نوید داد عنایت کہ حافظا　　باز آ کہ من بعفو گناہت ضمان شدم [2]

1　آنسوں کے ایک دو قطرے جو کبھی اے خواجہ تو نے بہا دیئے ہیں تو ان پر اتراتا ہے نازاں ہے جب تک عاشق خون جگر سے وضو نہ کرے مفتی عشق کے بقول اس کی نماز درست نہیں۔

2　خدا کا شکر ہے کہ میں نے جو چاہا، آخر کار اس میں کامیاب ہوگیا (اس کو پالیا)۔
اے پھولوں کی جواں شاخ! دولت کا پھل کھا کہ میں تیرے سایے میں جنت کے باغ کا بلبل ہوگیا ہوں۔
مجھے نیک بختی سے ہمیشگی کی دولت کے راستہ میں دوستوں کے منشاے دل کے مطابق وصل الٰہی کی شراب کا جام مل گیا ہے۔ جب سے تیری آنکھوں کے فتنے میں مبتلا ہوا ہوں۔ قیامت کی فتنہ بازی سے مامون ہوگیا ہوں۔ میرے دل پر معانی کا دروازہ اس دن کھلا جبکہ میں پیر مغاں کی درگاہ کے ساکنوں میں ہوگیا۔ کل مجھے عنایت ازلی نے خوشخبری سنائی کہ اے حافظ! واپس آجا! میں تیرے گناہوں کی معافی کا ضامن بن گیا ہوں۔

میں نے واقعہ کے مطابق ان کی یہ تاریخ وصال کہی

مصطفیٰ صاحب صفا و وفا — اہل تسلیم بود مادر زاد
در جوانی ز لطف، ایزدِ پاک — درے از فقر بر دلش بکشاد
عاقبت خورد ز خم اندر دین — حرف ''ھُـــوَ'' گفت وبارضا جان داد
بود وارستہ در طریقہ عشق — رحمتِ حق بروح پاکش باد
سال تاریخ او خرد گفتہ — مصطفیٰ رفت زین جہان آزاد[1]

میں نے ان کے انتقال کے بعد ایک رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک باغ جس کی سرسبزی اور سیرابی بے نظیر ہے اس میں خراماں خراماں چل رہے ہیں۔ شیخ ابن عربی کے رسائل جو اپنے پاس رکھا کرتے تھے اور ان کے مطالعے سے خوب مطالب اخذ کیا کرتے تھے ہاتھ میں ہیں اور کبھی کبھی ان میں سے پڑھ رہے ہیں۔ اس باغ کے تمام درخت جڑ سے شاخوں تک سارے باریک سبزے کے ہیں جو باہم خوب ملے ہیں یعنی ان کا گھنا سایہ ہے۔ آخر وہ ایک بہت بڑے درخت دلکش کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیسا درخت ہے۔ کہا محض قدرت خداوندی ہے اور بھی بہت سی باتیں اس راہ درویشی کی کیں۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد نہ رہیں۔ مجھ پر خصوصی لطف وعنایت دکھا رہے تھے۔ اس خواب میں اور بعد میں بھی یہ معلوم ہوا کہ وہ باغ بہشت کا باغ ہے اور وہ درخت طوبیٰ کا درخت ہے۔ محمد صادق فرید آبادی جن کا ذکر میرے شیخ کے مریدین میں گزرا ان کے بھانجے تھے ان کا بیان ہے کہ ماموں کی وفات کے بعد میں نے انھیں خواب میں دیکھا گویا کہ وہ اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور ان کی نعش کو فقرا، درویشاں اور صفا کیشوں کی بہت بڑی جماعت ادب تمام کے ساتھ لے جارہی ہے چاہتے ہیں کہ انھیں دفن کریں۔ میں قبر میں اترا اور ان کو قبر میں اتارا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ عالم غیب سے بہت

---

1 سید مصطفیٰ مادرزاد اہل تسلیم، صاحب صفا و وفا تھے۔ جوانی میں ہی اللہ تعالیٰ کے لطف سے ان کے دل پر در دولت سرمدی کھل گیا تھا۔ آخر کار دین کی راہ میں شہید ہوئے۔ لفظ ''ہو'' کہا اور خوشی خوشی جان دے دی وہ طریقہ عشق میں وارستہ تھے۔ ان کی روح پاک پر رحمت حق ہو۔ ان کا سال تاریخ اسی لیے (میری) عقل نے کہا۔ ''مصطفیٰ رفت زین جہان آزاد''

زیادہ روشنی ہوئی اور قبر نے بھی بہت وسعت پیدا کر لی۔ ان کا دل اس قدر تیز آواز میں اللہ اللہ کہہ رہا ہے کہ حاضرین کے کانوں تک بھی اس کی آواز پہنچ رہی ہے اور سب کے سب تعجب کناں زور زور سے اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ رہے ہیں اور درود شریف پڑھ رہے ہیں۔ میرے شیخ انھیں بہت دوست رکھتے تھے اور فرماتے تھے۔ وہ ایسے آدمی ہیں جن کی حکایتیں بیان کی جا سکتی ہوں۔ میرے شیخ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے مجھے یہ تحریر فرمایا کہ

> ''بعد از وصال پیشوائے اہل تجرید و تفرید، مستغرق رحمت الٰہی شیخ مصطفیٰ قدس نفسہ چون کتابتے نہ نوشتہ شدہ اولاً این تقریب (تعزیت) مصیبت دل گداز بشما (بشما)، وہم بمتعلقان می رساند۔ چون بہ تفصیل مقدمات تعزیت عادت اہل عرف گشتہ موجب تشبہ بآن جماعت است کہ از حقیقت حال اطلاعے ندارند، می خواہند کہ در غم شادیٔ ہنگامہ سخن گرم دارند، بہمین قدر را اکتفا نمود۔ از خوبیہائے آن مرحوم چہ نویسد حقا کہ باین شکستگی و تجرید و باین ستودہ اخلاقی درین جزو زمان کم کسے (را) بہم می رسد سعادت والائے شہادت ہم قرین چندین اوصاف کاملہ دیگر گشت۔ بلے برموجب مقتضائے حدیث قدسی الٰہی کہ ''من اَحبہٗ قتلتہ (ومن قتلتہ) فانا دیتہ۔ او کما ہو''۔ دور نیست بلکہ متیقن است کہ در آن وقت خاص قتل کہ فنائے حقیقی است نیز مشرف ساختہ باشند۔ انتہی[1]۔''

---

1 اہل تجرید و تفرید کے پیشوا رحمت الٰہی میں مستغرق شیخ مصطفیٰ قدس سرہٗ کے وصال کے بعد کوئی خط نہ لکھا گیا۔ سب سے پہلے اس مصیبت دل گداز کی تعزیت تم سے اور تمام متعلقین سے کرتا ہوں۔ چونکہ تفصیل سے تعزیت کی تمہید باندھنا عام لوگوں کی عادت ہو چکی ہے اس لیے اس جماعت کے ساتھ تشبیہ اختیار کر کے لمبی چوڑی تمہید باندھنا اس جماعت میں جو کہ حقیقت حال سے بے خبر ہیں خود کو شامل کرنا ہے۔ عوام الناس تو یہ چاہتے ہیں کہ غم میں بھی خوشی کا ہنگامہ سخن گرم رکھیں اس لیے اسی پر اکتفا کیا۔ آں مرحوم کی خوبیاں کیا لکھوں حق یہ ہے اس درجہ حالت شکستگی اور تجرید، اور اس درجہ ستودہ اخلاقی بہت کم کسی کو اس زمانہ میں ملتی ہے۔ اوپر سے شہادت کی سعادت اعلیٰ بھی دیگر اوصاف کاملہ کے ہم قرین ہو جانا تو نور علیٰ نور کا معاملہ ہو گیا۔ ہاں حدیث قدسی کے بموجب کہ '' من احبہ قتلتہ ومن قتلتہ فانا دیتہ '' (میں جس سے محبت کرتا ہوں اسے شہادت عطا کرتا ہوں تو جسے میں نے شہید کیا اس کی دیت میرے ذمہ ہے۔) قوی امید ہے بلکہ یقین ہے کہ وقت شہادت، قتل خاص سے بھی جو کہ فنائے حقیقی ہے مشرف ہوئے ہوں گے۔ انتہیٰ

با درد بساز چو دوائے تو منم　　در کس منگر چو آشنائے تو منم
گر بررہ عشق من کشتہ شوی　　شکرانہ بدہ کہ خون بہائے تو منم[1]

شیخ ابراہیم سنبھلی

وہ عجیب وغریب احوال واسرار رکھنے والے بزرگ ہیں۔ صاحبدل درویشوں کی صحبت اُٹھائے ہوئے اور مجاذیب وقت دیکھے ہوئے اور ان سے بہرہ یاب۔ انبیا واولیاء اللہ کو خواب میں بہت دیکھتے تھے۔ ان کے اکثر خواب اور واقعات سچ ہوتے تھے۔ ایک رات انھوں نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور نیازمندی کے ساتھ پیش آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان پر عنایات ونوازشات فرمائیں جس کا اثر انھوں نے خود پر محسوس کیا۔ آخر میں ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں بھی ابراہیم ہوں تو بھی ابراہیم ہے۔ وہ حضرت غوث اعظم قدس سرہٗ کو بھی بہت خواب میں دیکھا کرتے تھے۔ ان کے الطاف حد درجہ خود پر پاتے تھے۔ آپ کے ہی سلسلے میں بیعت تھے اس لیے آپ سے نسبت خاص رکھتے تھے۔ ہر کام اور مہم میں ان کی روح مبارک کی جانب رجوع ہوتے۔ اکثر اہل لشکر کے زمرے میں رہا کرتے تھے۔ اس طرح یہ فن اُن کے حال درویشی کا پردہ بنا ہوا تھا۔ ان کے مخفی احوال وواقعات بہت کثرت سے ہیں۔ خود کو عوام الناس سے پوشیدہ رکھتے تھے۔ بس کبھی کبھی اپنے دوستوں اور مخلصین کو اُن احوال واسرار سے آگاہی دے دیا کرتے تھے۔ مجھ سے بھی ایسے راز بیان فرمایا کرتے تھے۔ میری ان سے سسرالی[2] نسبت ہے۔ اس سے قطع نظر ویسے ہی مجھ پر بے حد الطاف وعنایات ان کی رہتی تھیں۔ وہ صاحب ہمت تھے۔ جس دن کسی گدا یا سائل کو ان سے کچھ نہ جاتا وہ تنگ دل ہو جاتے تھے۔ وہ شیخ مصطفیٰ کے والد ہیں۔ جس دن شیخ مصطفیٰ کوہ کمایوں کے دامن میں شہید ہوئے، وہ سنبھل میں تھے۔ اسی وقت سے انھیں جان کو گھلانے والے غم واندوہ نے گھیر لیا۔ اور سخت قبض پیش آیا۔ اسی سوچ وفکر میں

1　درد کا دم ساز بن جا آخر تیرے درد کی دوا تو میں ہی ہوں۔ کسی کی جانب مدد کے لیے نظر نہ اُٹھا کہ تیرا آشنائے حقیقی تو میں ہی ہوں۔ اگر تو عشق کی راہ میں مارا جائے گا۔ تو میرا شکریہ ادا کر کہ خود میں ہی تیرا خون بہا ہوں۔

2　شیخ ابراہیم آپ کے خسر تھے۔

تھے کہ آیا مصطفیٰ کی خبر کیا آتی ہے۔ روشن دنیا ان کی نظر میں اندھیر ہونے لگی۔ اُٹھے اور ایک دوست کے گھر چلے گئے اور متفکر بیٹھ گئے۔ اسی اثنا میں ایک شخص کو اپنی طرف آتا دیکھا تو یقین ہو گیا کہ مصطفیٰ کی موت کی خبر آئی ہے۔ بات بھی یہی تھی۔ اس کی لاش بھی ان کے دروازے پر پہنچ گئی۔ ان کو کشاں کشاں ان کے گھر لے گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کیا واقعہ ہے۔ مصطفیٰ کی نعش کو کس طرح لائے، کیسے لے گئے اور کیسے دفن کیا۔ یہاں تک کہ میں گھر بھی لوٹ آیا۔ جب میں نے بکّی (بھاتی) کھائی تو پتہ چلا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ مصطفیٰ کو بہت محبوب رکھتے تھے اور اس راہِ تصوف میں اپنے سے بہتر بتلاتے تھے اور ان کی خوبیاں سنایا کرتے تھے۔ جب ان کا وقتِ استحضار آیا کچھ بے خودی سی ہوگئی۔ حاضرین مضطرب ہو گئے یہاں تک کہ انھوں نے آنکھ کھولی آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ اگر جان چاہیے تو یہ حاضر ہے۔ یہ تذبذب کس لیے۔ سب سمجھ گئے کہ ہوش میں ہیں۔ اسی دوران نارنگی اٹھائی اور تھوڑی کھائی اور اپنی بیٹی کو جو کہ میری اہلیہ ہیں کہنا شروع کیا کہ۔ اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا چاہیے اور (زندگی) اسی اللہ سبحانہ تعالیٰ کی یاد میں گزارنی چاہیے۔ پھر کہا مجھے اٹھا کہ میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ جب بٹھایا تو بڑی بشاشت اور شوق کے عالم میں 23 رشعبان 1050ھ (28 رنومبر 1640) کو جان جانِ آفریں کو سونپ دی۔ ان کی، ان کی اہلیہ اور شیخ مصطفیٰ تینوں کی قبریں دہلی میں شیخ فخر الدین کی قبر کی پائنتی ہیں۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے محلے کی عورتوں نے آپس میں کہنا شروع کیا اگر آج مصطفیٰ ہوتے تو والد کی موت میں کفن دفن کی خدمت بجا لاتے۔ اسی رات میں میری اہلیہ نے ان کو خواب میں دیکھا کہ کہہ رہے ہیں "مجھے اپنے جانے کی ساری خبر ہے۔ برخوردار مصطفیٰ بھی نعش کا پایہ پکڑے حاضر تھا۔ تم نے میرا جو ماجرا دیکھا میں اُن تمام احوال سے واقف اور آگاہ ہوں۔ تم بالکل غم نہ کرو اللہ پر نظر رکھو۔" میری اہلیہ میری وساطت سے میرے شیخ کی مرید ہیں اور طریقۂ نقشبندیہ کے ذکرِ باطنی میں مشغول ہیں۔ ان کے بھی اکثر خواب اور واقعات سچے ہوتے ہیں بلکہ سب کے سب جیسا کہ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے۔ ایک بار میرے شیخ دہلی سے لاہور چلے گئے اور وہاں مدتوں رہے۔ میں نے بھی سنبھل سے لاہور جانے کا قصد کیا اور اسبابِ سفر کا تہیہ کر لیا۔ رات کو میری اہلیہ نے خواب دیکھا کہ میرے شیخ لاہور سے دہلی روانہ ہو گئے اور تین منزلیں طے کر لی ہیں۔ یہ خواب سن کر میں نے تامّل کیا اور ٹھہر گیا کہ

یقین تام ہو چکا تھا۔ اتفاقاً چند روز کے بعد خبر آئی کہ میرے شیخ فلاں تاریخ کو دہلی پہنچے ہیں۔ میں نے حساب لگایا تو خواب کی رات کو میرے شیخ لاہور سے تین منزل ہی تک پہنچے تھے۔

شیخ نور محمد کشمیری

وہ خلیفہ کے نام سے مشہور ہیں۔ صاحب ذوق ومحبت، فرید و مجرد ہیں۔ شیخ ابراہیم کے بھانجے ہیں۔ انھیں شیخ ابراہیم کے فرزند شیخ مصطفیٰ سے خصوصی محبت تھی، 1030ھ (1620) میں حالتِ تجرید میں سیر کرتے ہوئے فرید آباد اور دہلی پہنچے۔ میری ان سے وہیں ملاقات ہوئی تھی اور کافی مدت تک یکجا بسر کی۔ سخت درجے کی بے تعلقی اور بے تعینی رکھتے تھے۔ شیخ مصطفیٰ نے ان سے ''دیوان حافظ'' پڑھا ہے۔ میں (بھی) سنا کرتا تھا عجیب وغریب نکتے ومعانی ان کی زبان سے جاری ہوتے تھے۔ ان کی صحبت میں بالکل کھلی تاثیر نمایاں ہوتی تھی۔ ایک رات ان سے مصطفیٰ اور دوسروں نے فرمائش کی تو انھوں نے دلکش آواز سے یہ خیال گانا شروع کیا۔ خیال

آؤ سجن لاگ کریں، دکھ دور کریں　　برہن جوی کہری آنسون بہائی
سوی کیون کیجئے اچھو ار کجو لیلی　　پیاری ہون توہ تون موہ بہریں

یہ سن کر مجھے اچانک کیفیت (وجد) طاری ہوگئی ایسی کہ میں بے خود ہو کر گر گیا۔ تو وہ دیر تک میرا چہرہ تھامے رہے۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھ سے مصطفیٰ نے کہا تیرا یہ حال اس تاثیر محبت سے ہے۔ تجھے مبارک ہو۔ وہ مجھ پر بہت لطف ومہربانی فرماتے اور مجھے اپنے ساتھ حوض اور اس کے آس پاس کے علاقے کی سیر کو فرید آباد لے جایا کرتے تھے۔ بڑی خوش اور دلکش صحبت و خلوت گذرتی تھی۔ اس حال وارستگی اور آزادی کے باوجود معاملات طریقت پر اچھی طرح عمل پیرا تھے۔ ایک دن انھوں نے ایک حکایت بیان کی کہ ''میرے برہان پور میں فنون غریبہ کے ایک استاد تھے۔ ان کی درسگاہ کے سارے ہی تلامذہ اس فن میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ ان استاد نے یہ طریقہ کر رکھا تھا کہ ہر روز ایک شاگرد، تمام تلامذہ اور اساتذہ کی دعوت کرتا تھا۔ ایک دن استاد نے کہا۔ آج کی دعوت میرے ذمہ ہے۔ تمام شاگردوں کو جنگل لے گئے اور ایک عمل کیا۔ دو تین لکڑیاں ہاتھ میں لے کر ان سے ایک دروازہ بنایا اور کہا ایک ایک کر کے

اس دروازے سے گزرو۔ جو بھی اس دروازے سے گزرتا خود کو ایک باغ میں پاتا تھا۔ وہاں ایک محل تھا جس میں قیمتی تخت وفرش بچھا تھا۔ ہم سب اندر داخل ہوے۔ دیکھا کہ اس مجلس کے صدر ہمارے وہی استاد ہیں اور نوخیز لڑکے بڑے حسین وجمیل ان کی خدمت میں حاضر کھڑے ہیں۔ انھوں نے قسم قسم کے کھانے حاضر کیے۔ ہم سب نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ دن کے آخر میں جیسے کہ استاد اندر لائے تھے باہر نکال لاے۔ ہم سب کے سب بڑے حیرت زدہ تھے۔ ہم نے استاد سے دریافت کیا حسبۃً للہ فرمائیں کہ یہ کیا ماجرا تھا؟ کہا۔ عالم غیب کے شعبدوں میں سے ایک شعبدہ ہے۔ ''رشحات'' میں ہے کہ عادل اور ثقہ حضرات میں سے ایک صاحب نے حضرت مولانا زادہ فرکتی سے جو کہ حضرت مولانا نظام الدین علیہ رحمۃ کے مرید تھے اور مولانا نظام الدین کی وفات کے بعد بہت زمانے تک خواجہ احرار قدس سرہٗ کی خدمت میں رہے ہیں نقل کیا کہ انھوں نے بیان کیا ایک دن میں حضرتِ والا کے ہمراہ سفر میں تھا۔ آپ ایک بستی سے دوسری بستی میں جا رہے تھے۔ اتفاق کی بات وہ جاڑوں کا موسم تھا۔ تنگی وقت کے سبب ہم نے عصر کی نماز بھی راستے ہی میں پڑھی وقتِ غروب سر پر تھا۔ سورج زردی مائل ہو گیا تھا اور ابھی دو شرعی (کوس) راہ باقی تھی۔ اس صحرا میں نہ کوئی جاے پناہ تھی نہ آرام کی جگہ۔ میرے دل میں ڈر پیدا ہوا کہ دن چھپ چکا۔ راستہ پُر خوف۔ ہوا نہایت سرد۔ سفر لمبا۔ نہ جانے آگے کیا پیش آئے۔ حضرتِ والا نے تیزی سے گھوڑے کو چلایا۔ جب میرے دل میں یہ وسوسہ دوبارہ آیا اور غلبہ کر گیا تو آپ نے پیچھے چہرہ کیا اور فرمایا۔ مت ڈرو اور تردّد کو دل میں جگہ نہ دو اور تیز ہانکو۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی آفتاب نے غروب بھی نہ کیا ہو اور ہم منزل پر پہنچ جائیں۔ یہ بات کہہ کر گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور زیادہ تیز چلایا۔ میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے تیز تیز ہانکتا آ رہا تھا۔ جب بھی سورج کی ٹکیہ کو دیکھا تو وہ ویسی ہی افق کے کنارے کھڑی نظر آتی اور ڈوبنے اور چھپنے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ سورج ایسے جم گیا تھا گویا اس کو افق پر میخ زدہ کر دیا ہے۔ جیسے ہی ہم بستی کے باڑے پر پہنچے اس وقت آفتاب یک بارگی ایسا غائب ہوا کہ کوئی اثر زردی یا اس کی سفیدی کا آسمان پر جو کہ شفق کے غروب کے بعد رہتا ہے باقی نہ رہا تھا اور سارا عالم یکا یک ایسا تاریک ہو گیا، صورتوں اور رنگوں کی شناخت بھی ممکن نہ تھی۔ مجھ پر حیرت و

ہیبت کا غلبہ تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ آپ کا تصرف باطنی تھا جو آپ نے آفتاب پر کیا تھا۔ آخر کار جب میں حقیت حال جاننے سے عاجز ہوگیا۔ گھوڑا بڑھایا اور حضرت والا کے نزدیک پہنچ کر کہا۔ آقا حسبۃ للہ فرمائیں کہ کیا معاملہ تھا جو میں نے دیکھا۔ کہا کہ یہ طریقت (راستے) کے شعبدوں میں سے ایک شعبدہ ہے انتہیٰ۔ میرے شیخ نے اس کے حاشیے میں لکھا ہے کہ نفس انسانی کمال قوت میں اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ فلکی نفوس پر بھی اس کو حکومت و تصرّف حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ردِ شمس[1] کے واقعے سے معلوم ہوگا۔ حضرت والا نے یہ جو فرمایا یہ طریقت کے شعبدوں میں سے ایک شعبدہ ہے یہ یا تو اس اعتبار سے کہا کہ مقصد اعظم یافتِ حق کے مقابلے میں اس قسم کے تصرّفات سالکان بلند ہمّت کے نزدیک شعبدے ہی لگتے ہیں۔ یا پھر یہ بات ہے کہ واقعی یہ شعبدہ بازی ہے کہ بعض کی نگاہ میں ایسا ہی لگتا ہے۔ لیکن اس صورت میں بعض اسرار اور دقائق برسر کار ہوتے ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے کہ اس کا ایما و اشارہ نہیں پاتا (انتہیٰ) خلیفہ (شیخ نور محمد کشمیری) صاحب کے اشعار کثیر ہیں۔ مجھے سنایا کرتے تھے۔ ان میں سے جو مجھے یاد رہ گئے وہ یہ ہیں۔

اے مسیحا گذری بر سر بیمارے چند — نظر لطف، خدا را، بخود آزارے چند
نکتۂ عشق نہ آنست کہ آید بشرح — عقل بیہودہ سیاہ ساختہ طومارے چند
زہد زاہد پئے جنّت چو بدیدم گفتم — مور پرّاں شدہ اندر طلب مارے چند
مست عشقست خلیفہ ہم از وکسب کنید — لذّت بادہ مجوئید زہشیارے چند[2]

---

1 واقعۂ ردِ شمس عند المحققین اور تاریخ سے ثابت نہیں۔

2 اے مسیحا چند لمحے کے لیے ایک بیار محبت کے پاس سے گزر اور خدا کے لیے اپنے آزردہ خاطر پر چندے نظرِ لطف فرما۔ عشق کی باریکیاں ایسی نہیں کہ ان کی تشریح ہو سکے۔ بے چاری عقل نے بیہودگی سے ڈھیر طومار سیاہ کر دیئے ہیں۔ جب میں نے زاہد کا تقویٰ و زہد بغرض حصول جنّت دیکھا تو دل سے کہا کہ مرغ طاؤس گویا اپنے نفس کی بھوک کے لیے چند سانپوں کی طلب میں نکلا ہے۔ خلیفہ عشق کا مست ہے اسی سے ہی کسبِ فیضِ عشق کرو۔ لذت وصل محبوب کی شراب کسی ہوشیار کے پاس بالکل مت ڈھونڈو۔

اے عندلیب گر گلت اندر چمن بشگفت　　　ئل را گل امید زلعں دمن شگفت
در انجمن فسردہ شود ہر گل چمن　　　مارا گلیست تازہ کہ در انجمن شگفت
پیراہن دیوانگی زیباست بر بالاے ما　　　چاکِ گریبان زیر پا دعطف دامان در بغل
بدین دہن نتوان شد بپایگاہ جناب　　　سبوے بادہ بیارید تاغرارہ کنیم
بترکِ من بنگر کز شکار می آید　　　رکاب سُرخ عنان سرخ و دامن زین سرخ
دوست کو کردم سوال از فاختہ　　از زبانش نیز کو کو یافتم [1]

ایک دن میں اور وہ یکجا بیٹھے ہوئے تھے۔ ناگاہ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے کمر کسی، گدڑی کلائی پر ڈالی اور مجھ سے کہا کسی سے مت کہنا کہ میں چلا گیا۔ دروازے کی راہ چھوڑ کر ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف سے بیگانہ وار کود گئے۔ میں نے ایک شخص کو اشارہ کیا کہ مصطفیٰ کو خبر کر دو اور میں بہت لمبی مسافت تک ان کے پیچھے ہو کر چلتا رہا لیکن مجھے اُنھیں روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں مصطفیٰ بھی رواں دواں پہنچے مگر کچھ نہ بولے۔ کیونکہ انھوں نے سمجھ لیا کہ میرے کہنے سے بھی وہ واپس نہیں آئیں گے۔ باوجود اس اخلاص ومحبت، رشتہ داری اور خویشاوندی کے انھوں نے ذرا بھی پروانہ کی اور جہاں ان کا دل چاہتا تھا چلے گئے۔ طریقت کی راہ میں وہ سب سے یگانہ تھے اور توحید کی راہ سے سب سے بےتعلق اور بےگانہ تھے۔ دوہرہ۔

نانک دعویٰ چیدیاں سب دی کیتی خیر　　　ناں کسھوں سوں دوستی نہ کس ہوں سوں بیر [2]

مشہور ہے کہ خلیفہ کے دنیا سے جانے کا سبب یہ تھا کہ انھیں اپنے بھتیجے سے محبت ہو گئی اور بڑھتی گئی

1　اے بلبل اگر تیرا پھول چمن کے اندر کھل گیا ہے تو ئل کے بھی، دمَن کے سُرخ لبوں کی امید کے پھول کھِل اُٹھے ہیں۔ میرا محبوب انجمن میں کھلا ہوا ایسا گُل تازہ ہے جس سے گلشن کی انجمن کا ہر ایک گُل مُرجھا جاتا ہے۔ ہم پر دیوانوں کا لباس ہی زیبا ہے۔ گریباں کی دھجیاں پیروں میں اور دامن کے ٹکڑے بغل میں۔ گندہ دہنی سے حسن کی سرکار میں نہیں جایا جاتا۔ شراب کا پیالہ لاؤ تا کہ پہلے غرارہ (کُلّی) کرلوں۔ میرے محبوب کو تو دیکھو کہ شکار کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ رکاب سُرخ لگام سُرخ اور زین کا دامن بھی سُرخ ہے۔ میں نے فاختہ سے سوال کیا دوست کہاں ہے۔ اس کی زبان سے بھی یہی جواب ملا۔ کُوکُو (کہاں ہے، کہاں ہے؟)

2　نانک نے تو اعلانِ عام کر دیا کہ وہ سب کی خیر چاہتا ہے۔ نہ کسی سے اس کی دلی دوستی ہے اور نہ کسی سے قلبی دشمنی۔

اور مدتوں فراغ خاطر کے ساتھ (معشوق حقیقی) کے اس مظہر وعکس میں مشغول رہے۔ایک بار وہ نو جوان بیمار ہوگیا اور جینے کی امید نہ رہی۔ایک دن خلیفہ اس کے سرہانے آئے اور ایک گھڑی مراقب ہو کر بیٹھے رہے، پھر کہا۔اچھا اے جوان تو کھڑا ہو جا، میں تیرے عوض جاتا ہوں۔اسی اثنائے گفتگو وہ بیمار ہوش میں آ کر کھڑا ہوا اور ٹھیک ہوگیا اور خلیفہ بیمار ہو کر بستر مرگ پر پڑ گئے اور چالیس سال کی عمر میں 1040ھ (1630) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔یہ بھی روایت ہے کہ خلیفہ کو ان کی وفات کے بعد ایک شخص نے کھلی آنکھوں سے اپنے پیروں پر کھڑا دیکھا۔یہ بات فوراً ایک اور شخص سے آ کر ذکر کی۔جب دونوں مل کر اس جگہ پہنچے تو نہ پایا "رشحات" میں ہے کہ خواجہ احرار قدس سرہٗ سے مولانا قاسم کی وفات کی کیفیت دریافت کی گئی۔مولانا قاسم آپ کے اصحاب میں سے تھے۔آپ نے فرمایا کہ ایک دن وہ ہماری بیماری میں آئے اور کہا کہ میں خود کو آپ پر فدا کرتا ہوں۔میں نے کہا قاسم تو فقیر آدمی ہے اور تیرے متعلقین بہت ہیں ایسا مت کر۔کہا کہ میں اس معاملے میں آپ سے مشورہ کرنے نہیں آیا میں نے تو یہ کام کر لیا ہے اور حق سبحانہ نے قبول بھی فرما لیا ہے۔ہر چند منع کرنے میں مبالغہ کیا گیا مگر انھوں نے اس کے سوا کچھ نہ کیا اور دنیا سے چل دیے۔پھر ایسا ہی ہوا کہ دوسرے دن حضرتِ والا کا مرض مولانا قاسم پر منتقل ہوگیا اور وہ دنیا سے چلے گئے اور آپ بغیر حاجت طبیب کے بالکل اچھے ہوگئے۔انتہیٰ۔

شیخ نور محمد سنبھلی

شیخ نور محمد سنبھلی شیخ علی کے فرزندوں میں اور شیخ تاج الدین کے مریدوں میں سے ہیں۔آپ صلاح وسلامتی میں بھی مستقیم الحال اور مشغولیٔ اعمال میں بھی با استقامت گزرے ہیں۔جس زمانے میں وہ شیخ فاضل کے آگے طلبِ علم میں مشغول تھے میں اس وقت انھیں وہاں دیکھتا تھا کہ وہ علاوہ اپنے کام سے کام رکھنے کے کسی جانب دھیان نہ دیتے تھے۔ان کی وفات 1031ھ (1621) ہے۔مشغولی کی اوقات میں وہ اس طرح غرق رہتے تھے کہ ادھر اُدھر کا بالکل خیال و شعور انھیں نہیں رہتا تھا۔چنانچہ ایک دن اپنے حجرے میں مشغول تھے۔ایک سوراخ سے ایک سانپ نکلا اور ان کے پیر میں کاٹ لیا۔وہ بالکل بھی اس حال سے باہر نہ آئے۔آخر میں بس اس

قدر کہا کہ سانپ کا زہر میرے بدن میں موجیں مار رہا ہے بس چند کالے غبارے نظر آ رہے ہیں۔
نقل ہے کہ بزرگانِ سلف میں سے ایک بزرگ ہمیشہ اپنے گھر میں عشق الٰہی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے۔ بہت سے کام جو نہایت ضروری نہ ہوتے ان میں نہ لگتے۔ ایک دن ایک بزرگ ان سے ملاقات کے لیے ان کے حجرے میں جا کر بیٹھ گئے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ دیکھا کہ اس حجرے کے چھت کی ایک کڑی ٹوٹی ہوئی ہے کہا کہ اے شیخ اس کڑی کو جس کے نیچے بیٹھے ہیں کیوں ٹھیک نہیں کراتے۔ کہا تمیں سال ہو گئے لیکن اس ٹوٹی ہوئی کڑی کو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ انتھیٰ کلامہٗ۔

روایت ہے کہ شیخ علی جوان کے دادا تھے 70 سال قبل علی گڑھ سے سنبھل آئے اور شیخ محمد سنبھلی سے جو کہ اولیائے وقت میں سے تھے پیوستہ ہو گئے اور ریاضات شاقہ اختیار کیں اس طرح کہ بارہ سال تک زمین سے پشت نہ لگائی۔ ایک مرید سے کمبل ادھار لے کر برسوں وہی پہنے رہے اُسی حال میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ روایت ہے کہ ایک دن مریدین توری کی سبزی پکا رہے تھے۔ ایک نے نمک ڈال دیا، دوسرا آیا اس نے بھی ڈال دیا۔ یکے بعد دیگرے کئی نے اس طرح نمک ڈالا۔ وہ سب کو دیکھتے رہے مگر کسی سے نہیں کہا کہ نمک ڈال دیا ہے اور مت ڈالو۔ ان کی وفات 990ھ (1495) میں ہوئی اور قبر سنبھل میں ہے۔

شیخ نور محمد حارث

شیخ نور محمد حارث بن شیخ تاج الدین سنبھلی اپنے والد سے نسبت درست کرتے ہیں۔ صاحب اخلاقِ عظیمہ و اوصافِ لطیفہ ہیں۔ اہلِ فتوت، معاملت استقامت ہیں۔ میں ایک دن شروع حال میں اپنے والد کے ہمراہ ان کی خدمت میں گیا۔ اپنے باغیچے میں جو کہ جو بیلقانِ شہید کے نزدیک ہے بیٹھے تھے۔ بڑا نورانی اور بارونق چہرہ تھا۔ درویشوں کے نیک احوال اور حسن اخلاق کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ہم دونوں آخر خوش ہو کر اُٹھے۔ میرے والد نے اس دن اپنے دوستوں کے مجمع میں ان کی تعریف میں یہ جملے ارشاد فرمائے۔ آج میں نے انسان کے روپ میں ایک فرشتہ دیکھا ہے۔ اس کے برسوں بعد جب میں اپنے شیخ کی خدمت میں اکبرآباد آمدورفت رکھتا تھا صاحب قرآن ثانی

کے جلوسِ اوّل میں ایک دن دیکھا کہ ایک شخص لشکریوں کے لباس قبا در بر، اور شمشیر در کمر آئے اور تھوڑی دیر بیٹھے اور چل دیے۔ میں نے اپنے شیخ سے پوچھا کہ یہ کون تھے۔ فرمایا۔ کیا تم نے پہچانا نہیں؟ وہ شیخ تاج الدین کے پسر محمد حارث ہیں۔ میں نے کہا۔ میں نے ان کو اپنے والد کے ساتھ دیکھا تھا۔ اُس وقت میرے والد نے ان کے بارے میں اپنے دوستوں سے یہ (مذکورہ جملہ) فرمایا تھا۔ اس کے بعد انھیں بہت اچھا منصب مل گیا اور وہ اپنی جاگیر میں چلے گئے۔ وہاں انھوں نے بہت بہادری کے کام انجام دیے۔ اپنے جسم پر 22 زخم لیے ہوئے بادشاہ کے پاس لوٹ کر آئے۔ بادشاہ نے ان پر لطف فرمایا۔ ان کے والد کی نسبت کا خیال کر کے کیونکہ بادشاہ ان کا بہت معتقد تھا۔ ہر سال ان کے والد کی زندگی کے آخری ایام تک ان کے پاس کثیر تعداد میں نذرانے مکہ بھجوایا کرتا تھا۔ ایک بار بادشاہ نے شیخ تاج الدین کو لکھا کہ ہم بادشاہ ہو گئے ہیں۔ آپ کے دیدار کا بہت شوق ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مکے سے تشریف لا کر اپنے دیدار سے مشرف فرمائیں۔ شیخ نے جواب میں لکھا کہ بادشاہان درگاہ اقدس بیت اللہ میں اپنی جانب سے وکلا رکھا کرتے ہیں۔ میں آپ کی جانب سے اس درگاہ میں وکیل ہوں۔ روایت ہے کہ خواجہ ابرار نے شیخ محمد حارث سے کہا کہ آج تمھارے والد دیارِ عرب میں مقتدا اور شیخِ وقت ہیں۔ ان کے پاس جا کر کیوں فیضیاب نہیں ہوتے۔ وہ مکہ گئے۔ والد کی صحبت اختیار کی اور مرزوق (کیفیت فقر سے مالا مال) ہوئے۔ اس کے بعد والد سے جدا ہو کر حجاز کی سرزمین پہنچے اور وہیں اپنے والد سے پانچ دن پہلے انتقال فرمایا۔ ان کی قبر وہیں ہے۔ شروع میں میرے شیخ سے ان کی خط و کتابت رہی ہے۔ ایک موقع پر میرے شیخ نے ان کو یہ لکھا کہ۔ (ترجمہ)

> حضرت مولانا مخدوم زادہ شیخ محمد حارث کو چاہیے کہ اس کی کوشش کریں کہ کوئی وسوسہ دل میں جاگزیں نہ رہے۔ خصوصاً نمازِ فرض میں جیسا کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے تھے کہ حق سبحانہ نے اپنی درگاہ میں داخلے کا کوئی دروازہ نماز جیسا اور نہیں بنایا یعنی صورت خیالی غیر نماز میں تو گنجائش رکھتی ہے بلکہ ضروری ہے یہ بات مقرر قوم ہے کہ معاملہ روح دائم باللہ ہے اور معاملہ قلب پیوستہ بغیر اللہ ہے لیکن دماغ یعنی سر جو

محل خیال ہے مظہر مثال ہوسکتا ہے۔ والسلام علی النبی الامی و آلہ. انتھیٰ

محمد معاذ سنبھلی

وہ بھی شیخ تاج الدین کے پسر ہیں اور اپنے والد سے ہی نسبت درست کرتے ہیں۔ نوجوان صالح اور نیاز مند فقرا و درویشان اور نیک معاملت ہیں۔ ان کی ولادت دنشونما مکّہ میں ہوئی۔ حجاز کے علاقے میں بھی انھوں نے تحصیل علوم دینیہ کی ہے اور اپنے والد محترم کے الطاف وعنایات کے زیر سایہ سلوک طریقت مکمل کیا ہے اور بہرہ ور ہوئے ہیں۔ وہ سال 1060ھ (1650) میں ہندستان آئے اور بادشاہ صاحب قرآن ثانی کے حضور تشریف لے گئے۔ اس دیار اور مکّے کی تحائف وتبرکات بادشاہ کو پیش کیے۔ بادشاہ خوش ہوئے اور انھیں اپنے خوان احسان سے خوش کردیا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ سنبھل بھی آئے تھے چند روز رہے بھی تھے۔ میں نے چند بار انھیں دیکھا ہے۔ بڑے صاحب اخلاق تھے۔ میرے شیخ کے نیازمندوں میں سے ہیں۔ ایک دن میرے شیخ کے پاس آئے اور اپنے گزرے ہوئے احوال سنائے۔ مجھ پر سنبھل کی نسبت کا لحاظ کرکے بہت لطف وکرم فرمایا۔

شیخ عبدالوالی (الواحد) سنبھلی

وہ بھی شیخ تاج الدین کے مرید ہیں اور ان کے برادر نسبتی بھی ہیں۔ اپنے والد شیخ کمال کے صحبت داروں میں ہیں۔ اور ان کے کمالِ لطف سے بہرہ مند بھی۔ شروع میں وہ طالبِ علمِ دین بن کر دہلی گئے اور میرے شیخ کے پاس رہنے لگے اور علمِ دین حاصل کیا۔ میرے شیخ کے ایامِ جوانی، دورِ طالب علمی اور فہم و فراست کے قصّے سنایا کرتے ہیں، تعریف کیا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ۔ ایسی جودتِ طبع اور صرافت و فطرت، مستعدان سابقین میں بھی نہ سنی گئی ہوگی۔ میرے شیخ نے تھوڑا سا نحو وصرف استاد کے آگے پڑھا۔ باقی جو کچھ ان سے ظاہر ہو رہا ہے فیض باطنی ہے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ میرے شیخ کی یہ حالت خواجہ بیرنگ کی نظرِ عنایت کا صدقہ ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ خواجہ خرد مولانا عبدالرحمٰن جامی کی مثل ہوں گے۔ جیسے کہ ان کا یہ ملفوظ میرے شیخ کے ذکر میں گزر چکا۔ ''رشحات'' میں ہے کہ مولانا فتح اللہ تبریزی

متبحر دانشوروں میں گزرے ہیں اور مرزا الغ بیگ کے دربار میں صدارت کا مرتبہ رکھتے تھے، حکایت کرتے ہیں کہ مرزا الغ بیگ نے قاضی روم کی ایک مجلس اپنے مدرسے میں برپا کی تھی جس میں دنیا بھر کے فضلا اور اکابرین کو قاضی صاحب کی مجلس میں بلایا تھا۔ قاضی رُوم نے مجلس میں ایک سلسلہ گفتگو میں جو مستعدان وخوش طبعان کے ذکر میں تھی حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی کی توصیف بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کی جب سے سمرقند بنا ہے جودت طبع اور تصرف باطنی میں آج تک اس نوجوان جامی جیسے کسی شخص نے ولایت ماوراء النہر سے عبور نہیں کیا۔ (انتہیٰ) اس کے بعد عبدالواجد دہلی سے سنبھل واپس آئے اور شہر سنبھل سے ملی ہوئی ایک بہت ہی خوشنما نشست گاہ اپنے رہنے کی لیے تعمیر کرائی اور بعض ظاہری اسباب جمعیت مہیا کیے۔ 1060ھ (1650) میں سفر مکہ مکرمہ کے ارادے سے نکلے اور حرمین محترمین کی زیارت کے شرف سے مشرف ہوئے اور وہاں کے مشائخ سے ملاقاتیں کیں۔ اسی سفر کے دوران میں ایک تفسیر لکھی جو فارسی زبان میں واضح عبارت میں ہے۔ پھر وطن واپس ہوئے اور اس سے بہتر جمعیت بہم پہنچائی۔ وہ قرآن مجید کو خط نسخ میں خوب لکھتے تھے۔ میری ان سے شناسائی ہے۔ کبھی کبھی ملاقات بھی میسر ہو جاتی ہے۔

شیخ عطا محمد سہسوانی

شیخ محمد حاکم کے مرید ہیں جو ایک واسطے سے شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی قدس اللہ سرہٗ کے مرید ہیں۔ شیخ محمد عطا کو سلسلہ قادریہ میں بھی انھوں نے قابل استعداد بنادیا تھا۔ شیخ محمد عطا ایک باشکوہ، خوبصورت بزرگ ہیں۔ ظاہری و باطنی صفات سے متصف۔ امیر غریب جو بھی ان سے ملاقات کرتا ہے ان کے خلق واحسان سے متاثر ہو کر خوش خوش اُٹھتا ہے۔ بہت خوش معاملہ بھی ہیں۔ جس وقت میں لشکری تھا اور مرادآباد میں تھا اتفاقاً ایک دن ایک غنی شخص کے یہاں دعوت میں، میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ میرے دل میں آیا اس راہِ درویشی کی گفتگو چھیڑوں اور ان سے مستفیض ہوں۔ میں نے خود اس قسم کی باتیں شروع کیں۔ انھوں نے بالکل دھیان نہ دیا سوچا کہ لشکریوں کو اس علم سے کیا مناسبت ہے کیونکہ وہ دوسرے بزرگوں کی باتوں کو ادھر اُدھر سے لے کر گفتگو کرتے ہیں اور مقلدانہ رعونت وخودنمائی کے دعوے کرتے ہیں۔ ان کے دل کی یہ بات مجھ پر منکشف ہوگئی۔

میں نے توحید کی ایک دقیق بات ان کے سامنے پیش کر کے عرض کیا کہ میں اِسے سمجھنے سے عاجز ہوں۔ وہ مسکرائے اور فرمایا۔ تم یہ بات کہاں سے کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا۔ "اگر کہیں کا ہوتا تو سمجھ نہ لیتا۔" یہ سن کر خوش ہو گئے۔ اور راہِ درویشی کے نہایت بلند حقائق و دقائق بیان فرمائے۔ پھر تو جو ہوا سو ہوا۔ اس واقعے سے میں نے جان لیا کہ ان حضرات کی صحبت سے فیض اُٹھانے اور ان کا مقبولِ نظر بننے کے لیے درست فہمی اور علم صحیح چاہیے۔ نیک نیتی اور راست کرداری کی ضرورت ہے۔ تب کہیں جا کر کسی کو اپنے دل میں راہ دیتے ہیں اور کارِ فقر سے آگاہی بخشتے ہیں۔

جناب عشق بلند است ہمتے حافظ　　　　که عاشقان ره بے ہمتاں بخود ندہند [1]

مثل مشہور ہے کہ "سرکہ مانگنے کو منہ چاہیے" وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ کے یہاں مہمان آئے۔ بڑے بیٹے کو اپنے ایک شناسا بزرگ کے پاس بھیجا کہ تھوڑا سا سرکہ لے آ۔ وہ گیا اور پہلی بات جو، ان بزرگ سے کہی یہ تھی کہ میرے والد نے سرکہ منگایا ہے، دے دیں۔ اُن بزرگ نے کہا۔ میرے پاس سرکہ نہیں ہے۔ لوٹ آیا، باپ کو ان بزرگ کا جواب سنا دیا۔ انھوں نے چھوٹے بیٹے کو بھیجا کہ ان بزرگ کے پاس سے سرکا لے آ۔ وہ جب گیا، سلام کیا اور بیٹھ گیا پھر عرض کیا۔ میرے والد صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ ایک مہمان آئے ہیں۔ اگر آپ کے پاس سرکہ ہو تو تھوڑا سا عنایت فرما دیں۔ وہ بزرگ خوش ہو گئے اور خوب بہت سا دیا۔ حاضرین نے پہلے بھائی کو نہ دینے اور دوسرے کو دینے، دونوں کی وجہ اُن بزرگ سے دریافت کی تو فرمایا۔ "سرکہ مانگنے کو منہ چاہیے۔" ایک اور مثل ہے (جو اسی معنی میں ہے) مشہور روایت ہے کہ ایک کیمیا گر کو بادشاہ کے روبرو لے گئے۔ بادشاہ نے اس سے کہا۔ مجھے کیمیا بنانی سکھا دے۔ کہا۔ "مجھے نہیں آتا۔" پھر کہا۔ مگر اس نے بالکل انکار کر دیا۔ اُسے ڈانٹا ڈپٹا، پھر بھی وہ تیار نہ ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے قید میں ڈال دیں اور اس پر سختی کریں۔ مگر پھر بھی اس نے حامی نہ بھری۔ آخر کار بادشاہ نے دانا لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے تاکہ وہ کیمیا سکھا دے۔ کہا۔ اس کام کے لیے غریبی نیازمندی اور دلبری درکار ہے نہ حکومت اور داوری۔ آخر بادشاہ نے ایک رات کو سقّوں کا لباس پہنا اور کھانا ساتھ لیا اور قید خانے پہنچا۔ اُسے بھر پیٹ کھلایا اور اپنی مشک

1　اے حافظ ہمت سے کام لے کہ درگاہِ عشق بہت بلند ہے۔ اس لیے کہ عاشق بے ہمتوں کا راستہ نہیں اپناتے۔

سے ٹھنڈا پانی پلایا۔ جب دن نکلا اس کے قتل کا حکم دیا۔ وزیروں کو اشارہ کیا کہ اس کی سفارش کریں۔ چند دن ایسا ہی ظہور میں آیا۔ آخر کار کہا کہ کل کو اسے ضرور قتل کر دیں۔ بادشاہ اسی رات کو وہی سقے والا لباس پہن کر اس کے پاس پہنچا اور کہا کہ کل کے لیے یہ طے ہوا ہے کہ تجھے قتل کر دیں۔'' کیمیا کا ہنر بادشاہ کو سکھا دے اور اپنی جان بچا لے۔ بولا۔ بادشاہ کو تو ہرگز نہیں سکھاؤں گا لیکن تو نے میرا دل جیت لیا ہے۔ اگر میری طرح ہی پوشیدہ رکھ سکے تو تجھے سکھا دوں گا۔ کہا،'' سکھا دے'' آخر وہ ہنر اس نے سقے کو سکھا دیا۔ دن میں بادشاہ نے اُسے اپنے سامنے بلایا، اس کے کان میں کہا میں نے کس طرح کیمیا تجھ سے سیکھ لی۔ (کیمیا گرنے) کہا'' غریب سقہ بنا جب سیکھا اگر بادشاہ رہتا ہرگز نہ سیکھتا۔'' ایک اور بہت اچھی مثل ہے۔ اس مثل کو بلند ہمتی کے موقع پر بولتے ہیں '' خشخاش کے دانے کو اُٹھانے کے لیے چیونٹی چاہیے نہ کہ ہاتھی۔'' خواجہ شیراز نے کہا۔

قیمت ہر کس بقدر ہمت والائے اوست[1]

اس ملاقات کے بعد سے شیخ محمد عطا بندے کو پیوستہ سلام و پیام سے یاد فرماتے رہتے ہیں۔ میں ان کی اس بات پر شکر خداوندی بجالاتا ہوں۔ ایک موقع پر میں اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی میں تھا۔ ایک دن میرے شیخ، شیخ عبدالعزیز چشتی کے عرس میں تشریف لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اپنے طریقے کے مطابق ایک گوشۂ مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتفاق کی بات کہ اُن دنوں شیخ عطا محمد دہلی آئے ہوئے تھے اور اس مجلس میں شریک تھے۔ جب میرے شیخ نے ان کو دیکھا تو پاس آ کر معلوم کیا۔ میں نے ان کی بہت تعریف کی۔ میرے شیخ بہت متوجہ ہوئے۔ وہ بھی میری پہلی ملاقات کے سبب اور میرے شیخ سے ان کی اس غیر مترقبہ ملاقات اور دولت غریبہ توجۂ باطنی شیخ کی نعمت کے حصول سے خوش ہو کر مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آئے، کیا خوب مجلس و ملاقات رہی۔ ہاں ہاں! اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی معرفت اور ان سے شناسائی ایسی ہی نعمت ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی نعمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اس روز شیخ عطا محمد کی ہر عطا کو عطائے الٰہی سمجھا۔ (اور شکر الٰہی بجالایا)

بے معرفت مباش کہ در من یزید عشق   اہل نظر معاملہ با آشنا کنند[2]

---

1 ہر شخص کی قدر و قیمت اس کی ہمت کی بلندی کے مطابق ہوتی ہے۔

2 معرفت کے بغیر مت رہ اس لیے کہ عشق کے بازار میں اہل نظر، جانکاروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔

شیخ امین الدین گنوری

بن شیخ رکن الدین سنامی گنوری۔ صاحبِ اخلاق ومعاملت اور قاریٔ قرآن تھے۔علوم دینیہ کی تحصیل اپنے والد سے کی تھی اور طلبا کے درس وافادے میں لگ گئے تھے۔ میں نے ان کو گنور میں دیکھا تھا اور ان کے طریقۂ غربت اور شکستہ حالی سے بڑا مسرور اور خوش ہوا تھا۔ انھوں نے مجھ پر خاص لطف وعنایت اس ملاقات میں فرمائی تھی۔ اپنے والد کے جانشین ہیں۔ وفات 3 رمضان 1042ھ (1633) میں ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ان کے والد محترم ایام شباب میں بغرض طلبِ علم گھر سے نکل گئے تھے اور علوم دینیہ ویقینیہ کی تحصیل کے بعد شیخ کبیر الدین سے جو کہ شیخ بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کی اولاد میں ہیں بیعت ہوئے اور سلوکِ طریقت طے کیا۔ اس کے بعد گنور واپس ہوئے اور اپنے آبائے کرام کے آستانے میں بیٹھے۔ اور مستعدین اور مسترشدین کے افادے اور ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ کافی دنوں تک لوگ ان کی صحبت وتربیت کی برکت سے ظلمت وجہالت کی وادی سے نکل کر علم ونورانیت کی بلند وبالا پائے گاہ سے مشرف ہوئے۔ ان کا رات دن کا معمول تھا کہ تہجد کے وقت گھر سے نکلتے اور اپنے آبائی باغیچے میں جاتے جو کہ قصبہ گنور کے نواح میں ہے اور نمازِ تہجد ادا کرتے۔ اس کے بعد مسجد کے لوٹوں میں کنوئیں سے پانی بھرتے جو مساکین اور فقرا کے وضو کے کام آتا۔ فجر کی نماز کے بعد اپنے اوراد ووظائف اور ماثورہ دعائیں پڑھتے۔ اشراق کی نماز کے بعد علومِ دینی کے درس میں لگ جاتے۔ صلاح وسلامتی جیسی کہ چاہیے، اعمال واستقامت جیسی کہ درکار ہے، رکھتے تھے۔ اُن کی وفات 1027ھ (1618) میں ہوئی اور قطعہ تاریخ وفات یہ ہے۔

واصل الحق شیخ رکن الدین   می رسد از درِ فیاضش مے
جایگاہش مقامِ خلد بریں   سالِ تاریخ دیست روضہ وے[1]

میں نے ان کی زندگی میں بہت چاہا کہ ان کے دیدار سے شرف یاب ہوں لیکن میسّر نہ ہوا۔ حالانکہ

1 واصل حق شیخ رکن الدین جن کے درِ فیض سے شراب معرفت ملتی ہے۔ ان کے رہنے کی جگہ خلد بریں اور سال تاریخ وفات ''روضہ وے'' ہے۔

کنور سنبھل سے صرف پندرہ کوس ہے۔ میں وہاں اس وقت پہنچا کہ جب وہ دنیا سے چلے گئے تھے۔ قبر پر نیازمندی وادب سے حاضر ہوکر فاتحہ پڑھی اور اس یقین کے ساتھ کہ عالم برزخ میں ان کی قبر پر آنے والوں کی صاحب قبر کو اطلاع دی جاتی ہے، فیض یابی کا امیدوار بنا۔ شیخ جلال الدین سیوطی اکابر محدثین میں سے ہیں۔ وہ اپنے رسالے ''لمعہ'' میں لکھتے ہیں کہ مُردے زائرین کی زیارت کرنے سے خبردار ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ ابن ابی الدنیا سے ''کتاب القبور'' میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی نسبت جو اپنے مسلمان بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے، سلام کرتا ہے اور اس کی قبر کے پاس بیٹھتا ہے، فرمایا ہے کہ وہ مُردہ سلام کا جواب دیتا ہے، اس سے خوش ہوتا ہے اور اُنس حاصل کرتا رہتا ہے جب تک وہ نہ اُٹھے اور اس سے جدا نہ ہو[1]۔ انتہیٰ۔ مشہور روایت ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء خواجہ قطب الدین قدس سرۂ کی قبر کی زیارت کے لیے ہر پیر کے دن جایا کرتے تھے۔ ایک دن شیخ کے دل میں آیا کہ حضرت خواجہ کو میرے آنے کی خبر بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ غیب سے ان کے کان میں آواز آئی۔

مرا زندہ پندار چوں توی من آیم بجاں گر تو آئی بتن[2]

کہتے ہیں کہ شیخ ظاہر محمد مجدالدین کہ شیخ رکن الدین اُن کی اولاد میں سے ہیں۔ صاحب کرامات ظاہرہ تھے۔ ایک بار سنام سے سیر کرتے ہوئے کنور پہنچ گئے۔ گنگا ندی کے کنارے ایک جگہ اُن کو پسند آگئی اور وہیں رہنے لگے۔ اور اپنے تصرفات باطنی کا مظاہرہ کرنے لگے (کہ لوگ ان کی طرف رجوع ہوں اور آپ ان کی اصلاح باطنی کریں) کسی نے اس دیار کے حاکم کالا پہاڑ سے جو ''جیسر میر'' میں رہتا تھا ان کی شکایت کی (کہ وہ اپنا حلقۂ رسوخ بڑھا کر یہاں کی حکومت لینا چاہتے ہیں)۔ حاکم نے ان کو غضبناک ہوکر طلب کیا۔ وہ نہ گئے۔ حاکم جوش وخروش میں بھر گیا۔ پر (بعد میں) آخر ایک دن انھوں نے خود ہی کہلا بھیجا کہ اچھا میں آتا ہوں۔ گئے اور گنگا کے پانی پر

---

1 اس حدیث شریف کا لفظی ترجمہ یہ ہے'' کوئی مرد ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرے اور اس کی قبر پر بیٹھے کہ وہ میت اس سے خوش نہ ہوتی ہو اور اُنس نہ پکڑتی ہو اور سلام کا جواب نہ دیتی ہو یہاں تک کہ وہ اُٹھے اور اس سے جدا ہو جائے۔

2 مجھے زندہ سمجھ اگر تو جسمانی طور پر آتا ہے، تو میں روحانی طور پر آتا ہوں۔

نماز پڑھنی شروع کر دی۔اس حالت کی خبر سن کر حاکم نے عاجزی و نیاز مندی سے اُن کے سامنے آ کر عرض کیا۔''مجھ سے کچھ طلب فرمائیں'' انھوں نے کہا۔''تو ہی مجھ سے مانگ کہ عنقریب اس دنیا سے جانے والا ہے۔کہا۔''اپنی عمر میں سے ایک سال دے دیجیے''۔کہا۔''ایک سال اور ڈھائی مہینے۔'' اس مدت میں حاکم نے ان کے متعلقین کو ستام سے بلا کر گنور میں بسایا اور گوناں گوں خدمات بجالایا اور اسی مہلتی مدت کے بعد بغیر کمی بیشی کے دنیا سے چلا گیا۔ان کے چار بیٹے تھے۔شیخ برہان الدین، شیخ رکن الدین، شیخ ابوالحسن، شیخ نجم الحسن۔ان میں سے ایک (حالتِ وجد میں) اُڑتے ہوئے کبوتروں کے ہمراہ کہیں چلا گیا اور ایک (حالتِ جذب میں) کہیں غائب ہو گیا۔کافی دنوں بعد دونوں پنڈوہ میں دکھائی دیے۔ایک متعلم نے عید کے موقع پر ان کے پسر شیخ رکن الدین سے ان کے بچپن میں عیدی طلب کی۔گھر میں کچھ نہیں تھا۔خالی مٹکے پر لات ماری اور رونے لگے۔ان کے والد کو خبر ہوئی۔کہا۔''رُکا''۔یہ کیا بے صبری ہے۔آئندہ تنگی معاش سے گھبرا کر مت رونا۔کبھی تنگی بہتر ہوتی ہے،تو کبھی فراخی بہتر ہوتی ہے۔آج بھی گنور میں ان کی اولاد اسی حال میں ہے۔کبھی تنگی کبھی فراخی۔آج کل ان بزرگوں کے آستانے میں شاہ غریب نام کے ایک درویش رہتے ہیں۔غریب و نامراد اور صاحب معاملہ ہیں۔

شیخ نظیر علی سنبھلی

شیخ جنید سندیلوی کے مرید ہیں۔معاملات شریعت میں نہایت راسخ۔میرا گمان یہ ہے کہ کبھی ان سے سنن غیر مؤکدہ اور دیگر نفلی نمازیں بھی ترک نہ ہوئی ہوں گی۔دل میں دردِ دیں رکھتے تھے۔ان کی عمر سو سے بھی گزر چکی تھی۔آخر سانس تک بھی اعمالِ شریعت کی نگہبانی رکھی اور درست ہوش و حواس کے ساتھ دنیا سے جمعہ کے دن 1068ھ (1657) میں رخصت ہوئے۔وہ میرے پڑوسی تھے۔میں نے ان سے معلوم کیا کہ اس عمر میں آپ نے کسی ایسے کامل درویش کو دیکھا ہے کہ اس کے احوال خود بار بار بیان کرنے کا تقاضہ کرتے ہوں۔کہا۔ہاں،ایک بار میں اپنے اقربا میں سے مہدی علی کشمیری کے ساتھ ولایت خراسان پہنچا۔وہاں سُنا کہ شہر''ہرات''میں میر جعفر نام کے ایک صاحبِ کمال بزرگ ہیں۔میں نے ان کی زیارت کا قصد کر لیا۔مہدی علی نے اپنا نذرانہ میرے حوالے کیا اور کہا کہ پہلے یہ

میر جعفر صاحب کے نذر گزار دینا اور میری طرف سے اظہارِ نیاز مندی کر دینا۔ اس کے بعد مجھے پیش آنے والی مہم کے لیے توجہ اور عنایت کی درخواست میری جانب سے کرنا۔ جب میں وہاں پہنچا تو انھیں مسجد میں پایا۔ قبلہ رو مراقبے میں سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ایک رعب مجھ پر طاری ہو گیا۔ حیرت زدہ کھڑا رہ گیا۔ آخر کار انھوں نے جب سر اُٹھایا تو میں نے سلام کیا اور مہدی علی کی نذر پیش کی اور ان کی طرف سے بعد نیاز مندی، در پیش مہم کا ذکر کیا۔ قبول نہ کی اور فرمایا: "خدا اسے بخشے" اور پھر مراقب ہو گئے۔ میں اندوہگیں ہو گیا کی اس جملے سے ضرور ایسی چیز ظاہر ہو گی جس کو زبان پر بھی نہ لانا چاہیے۔ انھیں دنوں ہم واپس ہندستان روانہ ہو گئے۔ جب قندھار پہنچے تو مہدی علی میرے لڑکے منظور بیگ کے ساتھ راستے سے بھٹک گئے۔ رہزنوں نے دونوں کو قتل کر دیا۔ قتل کی خبر ہوئی۔ لیکن جس جگہ وہ قتل کیے گئے تھے وہاں ان کی لاشوں کا کوئی نام و نشان نہ ملا۔ میر مفاخر حسین بن میر عماد کہ جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا میر خسرو، ان میر جعفر کے خالہ زاد بھائی لگتے ہیں اور ان کے ہم مکتب بھی۔ جب وہ میر جعفر سے جدا ہو کر ہندستان آئے۔ پھر تیس یا چالیس برس بعد "ہرات" گئے، میر جعفر درویشی میں کمال درجے کو پہنچ گئے تھے۔ کثرتِ مراقبہ اور عالم استغراق سے ان کی گردن کی پچھلی ہڈی اُبھر آئی تھی۔ ملاقات کے وقت کوئی خیر خیریت نہ پوچھی۔ فاتحہ (دعا) کی اور بس (پھر مراقب ہو گئے)۔ جب میر خسرو ملاقات کر کے ہندستان واپس ہوئے۔ چند منزل راہ چلے ہوں گے کہ رات کو چوروں کی ایک جماعت نے کمین گاہ سے نکل کر حملہ کرنا چاہا۔ اسی اثنا میں میر جعفر حاضر ہوئے اور چوروں کو نام بنام آواز دی۔ سب کے سب حاضر ہوئے تو ان سے میر جعفر نے کہا۔ میر خسرو کو مع قافلے کے فلاں جگہ تک سلامتی سے پہنچاؤ۔ چوروں نے سب کو پوری نگہبانی کے ساتھ مقررہ جگہ پر پہنچا دیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک دن میر جعفر ایک جگہ کھڑے کھڑے نماز ظہر سے اگلے دن کی نمازِ عصر تک مراقب رہے۔ جب افاقہ ہوا کہا کہ ظہر کی نماز نکل گئی۔ لوگوں نے بتلایا کہ دو ظہر کی نمازیں چھوٹ گئیں۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ میر جعفر چند بار سحر کے اوقات میں برفیلے موسم میں باہر آئے، برف توڑ کر اُس میں بیٹھ گئے، جو پانی ان کے نیچے سے نکلتا حمام کے پانی کی طرح گرم ہو جاتا تھا۔ ابن نظیر علی کی زندگی میں ان کے چار لڑکے جوان، قابل اور مردانہ صفت گزر گئے۔ ایک سے مجھے اخلاص اور دوستی تھی جن کا نام عبدالمنعم تھا۔ صالح، جوان اور بہادر تھے۔ 1030ھ (1620) میں دنیا

سے گئے۔ وہ ہر لڑکے کے انتقال پر" انا للہ و انا الیہ راجعون" کہتے تھے۔ نہ آہیں بھرتے، نہ روتے، نہ ماتم کرتے۔ ان کے اس حال (رضائے الٰہی) کو دیکھ کر میں اور دوسرے لوگ تعجب کرتے تھے۔ ایک بار میں نے ان کی اس حالت کا اپنے شیخ سے ذکر کیا۔ فرمایا۔ بہتر یہ ہوتا کہ مصیبت اور بلا کے وقت میں عجز و شکستگی کے اظہار کے لیے آہ و زاری کرتے اور آنکھوں کو رونے سے تر کرتے" نفحات الانس" میں ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا۔ جواں مرد، وہ ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آپڑے یا کوئی چیز اس سے فوت ہو جائے تو مصیبت کا اظہار کرے اور حسرت و ندامت سے اس کا تدارک تلاش کرے۔ نہ یہ کہ اہل عزیمت و ہمت بن کر اس کو چھپائے۔ اور اہل عزیمت ہونے کا دعویٰ کر کے مکمل غرور بن جائے (انتہیٰ) نظیر علی فرمایا کرتے تھے کہ میں اکبر بادشاہ کے لشکر میں شیخ مہدی علی کے ہمراہ رہا ہوں۔ ایک رات آندھی اور شدید جھکڑ سے بادشاہ کے سارے خیمے اُکھڑ گئے اور درہم برہم ہو کر گر پڑے اور کہیں بھی چراغ جلتا نہ بچا۔ بادشاہ نے اُسی تیرگی شب میں مغموم و مغبوض بیٹھے بیٹھے صبح کی۔ دن میں بھی اُس اِنقباض طبیعت کا اثر چہرے پر نمایاں تھا۔ بیربل جو کہ بادشاہ کے محرمان خاص میں سے تھا۔ مزاج شناس، نہایت فہیم و ظریف تھا۔ اس نے محسوس کر کے اس بے چینی کا سبب معلوم کیا۔ بادشاہ نے کہا۔ آج رات جب ہوا کے طوفان سے خیمے اُکھڑ گئے تھے اور سارے چراغ بجھ گئے تھے۔ اس تاریکی میں سوچتا رہا اور فکر مند رہا کہ اگر قبر کی تاریکی بھی ایسی ہی ہوگی تو کیا حال ہوگا؟ اس نے کہا۔ "بادشاہ سلامت اس فکر سے خاطر جمع رکھیں" کہا۔ کیسے؟ کہا کہ۔ اس دن سے جب سے محمد الرسول اللہ ﷺ زمین پر تشریف لائے ہیں خدائے تعالیٰ نے اس کی ساری ظلمت اور تاریکی دور کر دی ہے۔ یہ بات سن کر بادشاہ کا سارا انقباض اور حزن کافور ہو گیا اور انبساط لوٹ آیا۔ یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اگر بیربل آنحضرت ﷺ کی نسبت دل میں ایسا اعتقاد رکھتا ہوگا، کوئی تعجب نہیں کہ آخری وقت میں اس کو ہدایت نصیب ہو گئی ہو۔ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ وہ ایک بار شیخ چائلدہ سنگی قدس سرہٗ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا اور حد درجہ نیاز مندی بجالایا تھا۔ اور اس راہ درویشی کی اس نے ایسی صاف ستھری گفتگو ان سے کی کہ شیخ چائلدہ کا وقت خوش ہو گیا تھا۔ انھوں نے بطور لطف و مہربانی پان کا بیڑہ اس کو دے کر کہا۔ "اللہ تعالیٰ تجھے دونوں آگوں سے نجات دے۔" آخر جنگ میں اُس کے مارے جانے کے بعد مرنے والوں کی جماعت میں اس کی نعش کو بہت تلاش کیا گیا لیکن نہ ملی (چنا

کی) آگ میں جلنے سے اس کی نعش کا بچ جانا اس کی اسی خوش اعتقادی اور شیخ کی دعا و توجہ کا اثر رہا ہوگا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ ''رشحات'' میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ اگر مجھے پتا لگے اور سنوں کہ ملک خطا میں ایک کافر راہ درویشی کی صاف ستھری بے خار باتیں کرتا ہے اس کے ہاں جاؤں، اس کی خدمت کروں اور اس کا احسان مانوں۔ (انتہیٰ) شیخ نظیر علی ہی نے فرمایا۔ بیربل سخاوت میں درجۂ کمال رکھتا تھا۔ اس کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار ہندستان کے راجاؤں میں سے ایک نامدار بادشاہ نے ایک بادفروش (مسخرے) کو اس کا امتحان لینے کے لیے بھیجا۔ وہ شہر میں یہ آواز لگاتا پھرتا کہ ہے کوئی جو سو روپے ایک ہاتھ میں لے اور جوتا دوسرے ہاتھ میں لے۔ میں وہ سو روپے اس سے لوں اور اس کے ننگے سر پر سو جوتے ماروں۔ اس آواز کو (بیربل) نے دو بار سُنا لاپرواہی کی مگر جب تیسری بار سُنا تو خود سے کہا کیوں اسے پریشان کروں۔ کیونکہ اس کام کو میرے سوا دوسرا کوئی اپنے ذمے نہ لے گا۔ آخر سو روپے اور جوتا دونوں ہاتھوں میں لے کر سر ننگا کر کے لوگوں کے سامنے ہی کھڑا ہو گیا اور اس مسخرے سے مسکرا کر کہا۔ اپنا کام کر۔ مسخرے نے سو روپے لیے گن کر گرہ میں باندھے اور کہا سر نیچا کر، جوتا اُٹھایا کہ مارے بیربل کو دیکھا کہ اس میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ روپیہ پھینکا اور اس کے پیروں میں گر گیا اور کہا کہ فلاں راجہ نے تیرے امتحان کے لیے مجھے بھیجا تھا واقعی تو ویسا ہی ہے جیسا سُنا تھا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک دن بادشاہ موتی اور جواہرات سے سجا ہوا ایک گل دستہ نہایت نفیس اور پر تکلف ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اور عظیم الشان امرا دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے معلوم کیا یہ گل دستہ کس کو دوں۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ تو بیربل نے کہا بادشاہ دل کی طرف دیکھیں جس کو دل کہے اُسے دے دیں۔ بادشاہ نے اشارہ سمجھ لیا اور اُسے ہی دے دیا کیوں کہ وہ بائیں جانب کھڑا تھا۔ اس کے ہندی کے بہت سے اشعار مشہور و معروف ہیں۔ بہت سے اچھا مضمون رکھتے ہیں۔ ان میں سے اس کا یہ شعر اگرچہ اس کے زبوں اشعار میں سے ہے مگر مجھے پسند ہے۔

چھاڈو یہ دنیا چھچھوری چھنار ہے — او کو نہ پکارو اُن کا ہے نہ کار ہے

یہ اور ہو کی بکری سو تو ہوں کو بیکار ہے — کاہو کو انگ لگاوے کاہو کو من مسار ہے

کاہو تک جھک لاوے، کیل کی کلار ہے — اُر نہ چڈھاؤ نہ بڈھاؤ، نہ لڈاؤ تک

میں نے بھی اس کے تتبع میں یہ سو یہ کہا تھا

دنیا اچھوتی ناری یا سنسار ہے   جوہوز سو ردتن جاوے نہ بولن آوے
واکے نار، واکو نہ بہتار ہے   جو ہو جن نیچ واسون آنچہ کی لوار ہے
بھوگے مار تاہی یہ سنہا رہے   کاہو کو نہ لیجئے اور نہ ریاس کیجیے
ور ہو ی بیا کیسے بھیس اس آیت اتار ہے   نر نر ہے بچار نیچ، نیچ رنجہ چتوار ہے

شیخ حسین محمد سنبھلی

سلسلۂ چشتیہ میں شیخ امان اللہ چشتی کے مرید ہیں۔ پڑھے لکھے نہیں ہیں اس راہِ درویشی میں سخت مستقیم الحال ہیں۔ متوکلانی زندگی گزارتے ہیں۔ پہلے وہ لشکری تھے۔ جب اس راہ میں داخل ہوئے صدق دل اور ہمّت قوی کے ساتھ داخل ہوئے۔ فقر و فاقے کو جیسا کہ مشہور ہے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ وہ میرے پڑوسی ہیں۔ اکثر آپس میں ملاقاتیں رہتی ہیں اور خوب صحبت رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شروع میں جب میں مکّہ کے ارادے سے سنبھل سے آگرہ پہنچا اور کچھ زمانے وہاں قیام رہا ایک رات خواب دیکھا کہ بادشاہِ وقت مجھے طلب کرتے ہیں۔ دوسری رات بھی وہی خواب دیکھا۔ تیسری رات دیکھا کہ محمد معصوم نام کا ایک شخص آیا اور مجھ سے کہا، اُٹھ تجھے بادشاہ سلامت بُلا رہے ہیں اور تین کپڑے مجھے دیے اور کہا یہ پہن کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہو۔ میں نے اس خواب کی یہ تعبیر سوچی کہ پہلے مجھے مکّہ جانا چاہیے۔ حج کر کے پھر مدینے میں مسجد نبوی اور درگاہِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری دیکر بیت المقدس جانا ہے تبھی مقصودِ اصلی یعنی وصالِ حق تعالیٰ سے مشرف ہوں گا۔ میں نے ویسے ہی تین کپڑے پہنے، ہتھیار لگائے لیکن آیتِ کریمہ "مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" کے مطابق نہ کوئی زادِراہ تھا نہ کوئی رفیقِ سفر۔ حیران تھا کہ اسی اثنا میں ایک صاحب آئے اور پوچھا کہ حکیم مسیح الزماں جنھیں بادشاہ نے امیر الحاج بنایا ہے کہاں ٹھہرے ہیں۔ یہ کہا اور چل دیے۔ میں تو خوش تھا کہ چلو خوب اچھا ساتھ رہے گا۔ لیکن اُن صاحب کی بہت تلاش کی نہ ملے۔ آخر اس جگہ سے باہر نکلا اور پوچھتا پوچھتا کچھ منزلوں بعد حکیم صاحب سے جا ملا۔ چند منزلیں ان کے ساتھ چلا۔ اس کے بعد میری ہمّت کا تقاضہ ہوا تو ان کو

راستے میں چھوڑا اور تنہا برہان پور پہنچ گیا اور جمعہ کی نماز کے لیے جب مسجد میں داخل ہوا وہاں شیخ عنایت اللہ خدا نما سے ملاقات کی۔ انھوں نے معلوم کیا تو کون ہے تجھ سے جنسیت کی بو آ رہی ہے۔ میں نے کہا سنبھل کے شیخ امان اللہ کا ایک غریب نامراد مرید ہوں۔ اتفاق دیکھیے شیخ عنایت اللہ اور شیخ امان اللہ دونوں شاہ حسینی کے مرید تھے۔ پھر فرمایا کہاں کا ارادہ ہے۔ میں نے عرض کیا بیت اللہ کا۔ یہ سُن کر کہا کیا تجھے کوئی ایسا نہ ملا جو تجھے وہاں جانے سے روکتا۔ میں نے کہا یہ کیا رازِ (باطنی) ہے؟ کہا "پہلے گھر والے سے شناسائی چاہیے، تب اس کے گھر جانا چاہیے۔ بغیر آشنا ہوے کچھ حاصل نہیں۔" میں نے کہا۔ اب حضرت شیخ ہی مجھے آشنا کر دیں۔ کہا چند دن یہاں رہو، پھر جہاں چاہو چلے جانا۔ میں شیخ عنایت اللہ کی خدمت میں رہنے لگا۔ اس راہِ درویشی میں جو چیز چاہیے حاصل کی اور میں نے بادیہ پیمائی سے دل پھیر لیا۔ شیخ سے دوسروں کی خدمتِ ارشاد کی اجازت پا کر واپس وطن آ گیا۔ "نفحات الانس" میں ہے کہ محمد فضل کہتے ہیں کہ مجھے تعجب ہوتا ہے جب کوئی بیابان اور وادیوں کو طے کر کے اللہ تعالیٰ کے گھر پہنچے اور وہاں جا کر انبیاء کے آثار دیکھ آئے۔ کیوں نہیں نفس و ہوا کی گھاٹیوں کو طے کر کے دل تک پہنچ جاے اور پھر اپنے پروردگار کے آثار دیکھے (انتہیٰ) منقول ہے کہ حضرت رابعہ بصریہ سے پوچھا "الاتسالین الجنة" آپ جنّت کی دُعا کیوں نہیں کرتیں؟ کہا "الجارّ ثم الدّارُ" "پہلے پڑوسی پھر گھر۔"

گر ہست ترا صاف دل و روشن رائے   ہمسایہ طلب نخست آنگاہ سرائے[1]

سنبھل پہنچ کر شیخ حسین محمد کو ایک عجیب حال اور کیفیت پیش آئی۔ چنانچہ معیشت کے تمام ساز و سامان کو درہم برہم کیا۔ مِلکی اور مُلکی ساری جائداد ایک بھکاری کو بخش دی۔ چرخہ، گھڑا، کھانا بنانے اور کھانے کے برتن وغیرہ گھر سے باہر پھینک دیے۔ اسی حالت میں شطحیات آمیز گفتگو کرنے لگے جس سے علما ظاہر کے مطعون بن گئے۔ ایک دن اکابرینِ شہر کی ایک مجلس میں اُن کی کہی ہوئی باتوں کا ذکر آ گیا۔ ایک صاحب نے کہا "اُن پر الحاد کا فتویٰ ہونا چاہیے۔ دوسرے بولے اس کو قید کر کے رکھنا چاہیے۔ تیسرے صاحب نے کہا۔ پہلے اُن کے اقوال و افعال کا روزنامچہ تیار کیا جاے پھر اُس کے مطابق عمل درآمد ہو، تا کہ فتنہ و فساد سر نہ اُبھارے۔ میں بھی

1 اگر تو روشن ضمیر اور صاحب رائے ہے تو پہلے پڑوسی طلب کر اس کے بعد گھر مانگنا۔

اس مجلس میں حاضر تھا۔ عرض کیا۔ پہلے کسی دیندار شخص کو ان کے پاس بھیجا جائے تا کہ ان کے کلام کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھے، پھر آپ حضرات کے سامنے آکر ظاہر کرے۔ ان عزیزوں نے یہ سمجھا کہ وہ میرے پڑوسی ہیں اس لیے میں ان کی طرفداری کر رہا ہوں، حق ہمسائگی کا لحاظ کر رہا ہوں۔ اور بھی رائیں سامنے آئیں۔ میں نے کہا اگر آپ حضرات کے گمان کے مطابق وہ ظاہر شریعت کے خلاف باتیں کرتے ہیں تو میں بھی اُنھیں قبول نہیں کروں گا اور رد بھی نہیں کروں گا کیونکہ ان کی باتیں بے مغز نہیں ہیں اصل حقیقت سے ماخوذ ہیں۔ جب شیخ محمد (تقی) مفتی جو کہ عالم فاضل آدمی تھے اُن کے پاس آئے، ان کی باتیں انھیں اچھی لگیں تو انھوں نے کہا۔ اگر میں ان کو ملحد کہوں تو کوئی شخص بھی مسلمان نہ بچے۔ اُس کے بعد شیخ تاج الدین اور شیخ بدر عالم کہ وہ بھی مفتی ہیں، عالم، فاضل، نیک، دیندار اور صاحب اخلاق ہیں مل کر ان کے پاس آئے تو ان کو ایسی لایعنی باتیں کرتے انھوں نے نہ پایا جیسی کہ عوام ان پر لگا رہے تھے۔ اسی قسم کا تذکرہ ان کے بارے میں ایک دن رستم خان دکنی کی مجلس میں جو کہ سنبھل کے حاکم تھے، آیا۔ میں بھی اس جگہ حاضر تھا کہ ان دنوں میں بھی لشکری تھا۔ میں نے ان کی بزرگی کی ساری باتیں رُستم خان کو سُنائیں اور خیر گزری۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ مشائخین حضرت منصور حلاّج کے معاملے میں مختلف رہے ہیں۔ اکثر نے اُن کی ولایت کا انکار کر دیا ہے۔ مگر چند حضرات جیسے ابوالعباس، عطار، شبلی، ابوعبداللہ خفیف، شیخ ابوالقاسم نصیر آبادی وغیرہ حضرات نے کھلے طور پر ان کے قتل کی رضامندی نہ دی اور فتوے پر دستخط نہ کیے۔ بلکہ فرمایا: ہم نہیں سمجھے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر نے کہا کہ ان پر غلبۂ حال تھا۔ ان کے عہد میں مشرق اور مغرب میں ان جیسا کوئی نہ تھا۔ (انتہیٰ) شیخ حسین محمد کی کتاب میں لکھا ہے کہ اہل اللہ کے چار درجے ہیں۔ خدا خواں، خدا داں، خدا بیں، خدا نما۔ ہر ایک ولی ان میں سے کسی نہ کسی درجے میں ہوتا ہے۔ ایک دن انھوں نے سنا کہ شیخی سنبھلی نے کہ جن کا ذکر آگے آئے گا یہ شعر کہے ہیں۔

سرّ حق را از لب منصور ی باید شنید　　یا ز مَن یا از درخت طور می باید شنید
وعدہ وصلش سر عرش است نہ بر کوہ طور　　ایں ہمہ بانگ دُہل از دور می باید شنید[1]

1　راز الٰہی کو لبِ منصور سے سننا چاہیے یا مجھ سے یا درخت طور سے سننا چاہیے۔ اس کے وصل کا وعدہ سر عرش ہے نہ کہ کوہ طور پر ان ڈھول کی تمام آوازوں کو دور سے سننا چاہیے۔

سن کرکود پڑے اور شیخ سنبھلی کے پاس گئے اور کہا: کیا یہ شعر آپ نے کہے ہیں؟ کہا۔ ہاں، کہا۔ شیخ منصور تو قبر میں لیٹے ہیں اور درخت طور بہت دور ہے۔ اب آپ ہی حاضر ہیں، اب سرّ حق کو آپ ہی بیان کریں کہ کیا ہے۔ شیخ سخت عاجز و درماندہ رہ گئے۔ آخر کہا یہ شعر ہے اس میں مافی الضمیر بیان کرنے میں کمی بیشی ہو ہی جاتی ہے۔ وہ بولے ارے کیا آپ کو پتا نہیں کہ اس راہ فقر میں وہ بات کہنی چاہیے جو موافق حال ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْن (ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں) اس کے بعد شیخ حسین محمد اس مستی اور جوش و خروش سے نکل کر بندگی کے خاص الخاص طریقے پر (جسے طریقہ محمدیؐ کہتے ہیں) گامزن ہو گئے اور عمل بر شریعت کے معاملے میں سخت مردانہ قدم اور مستقیم الحال ہو گئے۔ وہ شب معراج کو جو کہ بقول اکثر علما 27/ رجب المرجب ہے فقرا اور صلحا کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ شب بیداری کیا کرتے ہیں اور ''معراج نامہ'' جو ان کے شیخ نے برہانپوری زبان میں لکھا ہے پڑھتے ہیں۔ اس معراج نامے کا ایک شعر ہندی یہ ہے۔

کیا ماں ناں ہوا بس میں محبت سوں حقیقت مل

نہ بسری تو مجھے احمد نہ بسروں ہوں تجھے اِک تل

وہ ہر کام اللہ کے لیے اور بے ریا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن ایک فقیر مسافر سوسالہ سیلاب باراں میں مردہ پڑا تھا۔ بارش کی کثرت اور سیلاب کی طغیانی سے کسی کو گھر سے باہر نکلنے کا یارا نہ تھا۔ انھوں نے اچھی طرح کمر کسی دو تین لوگوں کو زور دیکر ساتھ لیا اور میت کی اچھی طرح تجہیز و تکفین بجالائے اور جنگل میں لے جا کر سپرد خاک کیا۔ ان کی اہلیہ بھی اس راہ میں مضبوط قدم رکھتی ہیں اور سلوک طریقت میں ان کی موافق اور رفیق ہیں۔ اس بات کو ایک بزرگ نے یوں ادا کیا ہے۔

''چوں یار اہل است کار سہل است [1] ''

وہ ان کو ایسے کار خیر کے لیے اپنے آپ ترغیب دیا کرتی ہیں اور خود بھی ایسی ہی ہیں۔ شیخ عنایت اللہ برہان پوری کے اصحاب میں سے ایک شیخ نعمت اللہ ہیں۔ بادشاہی خاندان کے لوگوں میں رہا کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ ان کے مرید اور معتقد ہیں۔ وہ بھی خود کو خدا نما کہتے ہیں

1 جب دوست (بیوی) مددگار ہے تو کام آسان ہے۔

اوراسی لقب سے مشہور ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لقب ان کے شیخ کے طریقے میں رائج ہے۔ سید خدا خواہ نام کے پوربی علاقے کے ایک شخص ہیں جو اس کار فقر و درویشی کے اہل ہیں۔ اس دور کے نوجوان درویشوں میں ہیں۔ میرے شیخ کے نیاز مند مخلص اور خاص دوستوں میں سے ہیں۔ میں بھی لاہور میں ان سے ملا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن مجھے شیخ نعمت اللہ خدا نما سے سابقہ پڑ گیا۔ انھوں نے خدا خواہ سن کر بطور اعتراض کہا کہ خدا خواہ نام دوئی اور بیگانگی کا مشعر ہے۔ میں نے ان کے جواب میں کہا کہ میرا نام تو واقع کے مطابق ہے کہ میں خدا کا چاہنے والا ہوں اسے چاہتا ہوں (تو میرا نام خدا خواہ بالکل درست ہوا) اگر آپ خدا نما ہیں تو ایک بار دکھائیں کہ خدا کہاں ہے؟ تاکہ میری اور آپ کی سچائی ظاہر ہو جائے۔ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور خاموش ہو گئے۔

جب شیخ حسین محمد 13 رشوال 1075ھ (مئی 1665) کو دنیا سے چلے گئے۔ اتفاق دیکھیے کہ سنبھل کے اس مہینے میں چار شخص یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئے، پانچ دن کے فرق سے۔ شیخ حسین محمد ان میں دوسرے ہیں۔ میں نے یکجائی ان سب کی تاریخ کہی

رفت عادل بہشتمی شوال — کز جہان رفتنش بطرزِ نیکو ست
پنج روز از پیش بہ پنج شنبہ — شد حسین آنکہ بُد خدا را دوست
پنج روز از پیش بدو شنبہ — رفت ہاشم کہ برگ گُل خوشبوست
پنج روز از پیش بآدینہ — رفت قاسم کہ حافظ خوش اوست
راست گفتہ است خواجۂ شیراز — ہر کسے پنج (روز) نوبت اوست
سال تاریخ جملہ را گویم — گر چہ بیش و کمی بگفت وشنو ست
اوّلین بود خادم الفقرا — کہ بسا یافتہ منافع ازوست [1]

1 عادل 8 رشوال کو چلے گئے۔ ان کی دنیا سے رخصتی بہت اچھے طرز پر ہوئی ہے۔ ان کے پانچ روز بعد پنج شنبے کو حسین محمد کا انتقال ہو گیا جو خدا دوست تھے۔ ان کے پانچ روز بعد دو شنبے کو ہاشم چلے گئے جو خوشبودار پھول کی پتی جیسے تھے۔ ان کے پانچ روز کے بعد جمعہ کے دن۔ قاسم جو اچھے حافظ قرآن تھے چل دیے۔ خواجہ شیراز حضرت حافظ نے سچ کہا ہے۔ دنیا میں ہر ایک کی باری پانچ دن ہے۔ میں سب کا سالِ وفات لکھتا ہوں۔ اگر کچھ کمی بیشی ہے تو وہ روایت میں ہے جو مجھے پہنچی ہے۔ سب سے پہلے (عادل) ''خادم الفقرا'' تھے۔ کہ بہت سوں نے ان سے نفع حاصل کیا۔

سالِ آن دومیین است دوستِ خدا　　لقبش ہم خدا نما نیکوست
سالِ آن سیوی است رضی اللہ　　کہ رضاء خدا بہ از ہمہ اوست
چارمیں ہست حافظ نیکو　　حیف رفتہ جوانِ چاراں اوست
من بفضلِ خدا کمال خوشم　　کہ مرا در دوکون مایہ ہوست [1]

شیخ شاہی سنبھلی

سلسلۂ قادریہ میں شاہ قمیص سادھوڑوی کے مرید ہیں۔ وہ نساج تھے۔ ان کا دن رات کا مشغلہ تھا کہ ہر صبح عید گاہ چلے جاتے، صبح کی نماز پڑھتے اور وقت چاشت تک وہاں رہتے۔ دعاے سیفی کے مثل چیزیں بلند آواز سے پڑھتے اور گھر آجاتے۔ دوپہر کی نماز (ظہر) تک کپڑا بنتے تھے۔ نماز ادا کرنے کے بعد کلام مجید کی تلاوت کرتے اور نماز عصر پھر عید گاہ کے قریب کی مسجد میں ہی ادا کرتے اور اپنے وظائف بجالاتے۔ پھر وہیں باقی دونوں نمازیں مغرب وعشا پڑھ کر گھر آتے۔ اکثر شب عبادت میں جاگا کرتے تھے۔ لوگ ان کا بُنا ہوا کپڑا بڑی چاہت کے ساتھ خریدا کرتے تھے کہ سچائی کے ساتھ بیچا کرتے تھے۔ بعض لوگ بطور تبرک بھی ان کا کپڑا خریدتے تھے کہ وہ باعمل درویش تھے اور درویشان سابقین کی وضع پر زندگی گزارتے تھے۔ ان کی دُعا درجۂ قبولیت رکھتی تھی۔ اکثر بیمار ان کی توجہ سے ٹھیک ہو جاتے تھے۔ میں انھیں بچپن سے جانتا ہوں۔ مدّتوں ہم مکتب رہے ہیں۔ جب شیخ فاضل کے بھائی ملا عبدالکریم صاحب سے پڑھا کرتے تھے تب سے آخر عمر تک ان کا لباس ایک ہی انداز کا رہا۔ سر پر ایک صافہ، ایک قمیص اور ایک تہہ بند۔ ان کی آخری بیماری میں جب میں تیمارداری کے لیے حاضر ہوا تو وہ استحضار کی حالت میں تھے۔ میں نے معلوم کیا کیسی طبیعت ہے؟ کہا میں عاجز بندہ

---

1 دوسرے (حسین محمد) کی تاریخ ''دوست خدا'' ہے، ان کا لقب بھی خدا نما ہے اور خوب ہے۔ تیسرے ہاشم کہ اللہ ان سے راضی ہوگیا رضاے الٰہی ہی انکی رضا تھی۔ چوتھے حافظ قاسم جو اچھے حافظ تھے۔ اور جو چاروں میں سب سے کم عمر تھے افسوس کہ وہ بھی چلے گئے۔ کمال، میں اللہ کے فضل سے حد درجہ خوش ہوں۔ کہ دونوں جہاں میں اس کی ذات وحدہٗ میری مایا ہے۔

ہوں، عاجز بندہ ہوں۔ حد درجہ خاکساری وانکساری ان سے ٹپک رہی تھی۔ اسی حال میں 2 / جمادی الآخر 1065ھ (13 / مارچ 1655) میں چل بسے اور ان کی قبر ان کی وصیت کے مطابق ان کی اپنی جگہ میں جہاں انھوں نے بہت سے درخت لگا رکھے تھے بنائی گئی۔

شیخ شاہی سالک راہِ خدا ۔۔۔ زین جہان با ہوش و آگاہی برفت
سال تاریخ وفاتِ آن بزرگ ۔۔۔ عقل گفتہ ''از جہان شاہی برفت'' [1]

''اخبار الاخیار'' میں ہے کہ شاہ قمیص ابن سید ابی الحیوۃ اپنے سلسلہ نسبت باطنی کو سید عبدالرزاق تک پہنچاتے ہیں۔ وہ بنگال کے علاقے سے فقر وتجرید کے لباس میں اس دیار میں تشریف لائے اور قصبہ سادھوڑا [2] خضر آباد میں رہنے لگے اور مدتوں فقر وتجرید کے عالم میں گزارتے رہے۔ سید نصر اللہ ایک عالم فاضل متبع سنت اور مستقیم الحال مرد خدا تھے۔ انھوں نے اپنے جگر گوشہ کو ان کے نکاح میں دے دیا۔ اس تعلق کے وقوع پذیر ہونے پر انھوں نے سادھوڑا کو ہی اپنا وطن بنالیا تھا اور مستقل وہیں کے ساکن بن گئے تھے۔ یہیں مقبولیت عام اور شہرت تام سے مشرف ہوئے۔ کثیر تعداد میں اس علاقے کے اور قرب وجوار کے لوگ ان کے حلقۂ ارادت وعقیدت میں شامل ہو گئے۔ اہل ہنر درویشوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے اپنی نسبت کرتی ہے۔ ان میں سے شیخ عبدالرزاق جو کہ شیخ بہلول کے نام سے مشہور ہیں ان کے مرید وخلیفہ ہیں۔ علم شریعت وطریقت کے جامع ہیں۔ شروع سے ہی عبادت، صلاح وتقویٰ اور عصمت خداوندی کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ علوم دینی حاصل کرنے کے بعد انھیں تہذیب اخلاق اور تبدیلی صفات کی توفیق نصیب ہوئی۔ حق یہ ہے کہ زمرۂ درویشان اور سالکین میں اس زمانے میں ایسے لوگ جو طریق سلوک میں کامل رسوخ رکھتے ہوں اور حضرت سید المرسلین کے اتباع سنت میں بھی راسخ القدم ہوں۔ نادر اور عزیز الوجود ہیں۔ شاہ قمیص کی وفات ولایت بنگال میں واقع ہوئی کہ بادشاہ وقت نے اُن کو وہاں بھیجا تھا۔ وہاں سے

1 شیخ شاہی جو راہ خدا کے سالک تھے اس دنیا سے ہوش وحواس کے ساتھ چلے گئے۔ ان بزرگ کی تاریخ وفات عقل نے یہ کہی۔ ''از جہاں شاہی برفت'' دنیا سے شاہی چلے گئے۔

2 سادھوڑا تحصیل نارائن گڑھ ضلع جمنانگر ہریانہ انڈیا میں ایک قصبہ ہے۔ فارسی کتب میں سادھوڑا کو سالورہ لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ ''اخبار الاخیار'' میں ہے۔

3/ ذی قعدہ 992ھ (26/ اکتوبر 1584) کو ساڈھوڑا لا کر دفن کیا گیا[1]۔ ہمارے علاقے میں جو زیادہ تر مشہور قادریہ سلسلے ہیں وہ اسی خاندان عظیم الشان سے اپنی نسبت کرتے ہیں۔ اس خاندان عظیم الشان سے آپ اور آپ کے خاندانی بزرگ مراد ہیں۔ اس نسبت عالی کے ایک دعوے دار سید شاہ محمد فیروز آبادی تھے۔ ان کے اس دیار میں عجیب قصّے اور حکایتیں مشہور ہیں۔ اس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ وہ سلطان ابراہیم سکندر لودی کے زمانے میں ایک مرد خدا تھے جو دیار دکن سے دہلی پہنچے اور حضرت غوث الثقلین کی نسبت کا دعویٰ کیا۔ ان کے عجیب وغریب طور طریقوں کے ساتھ اس نسبت عالی کا لحاظ کرتے ہوئے اور ان کی صورت استغنا کی عظمت، دعا، اوراد کے مستقل طریقے کے اظہار، حد درجہ طہارت ولطافت اور حضرت غوث اعظم کی جناب میں نسبت معنوی کے بلند پایہ دعوؤں کے سبب اس دیار کی مخلوق ان سے رجوع کرنے اور ان کی معتقد ہونے کو مجبور ہو گئی۔ ان دنوں سلطان ابراہیم لودی کو ظہیر الدین محمد بابر کی جانب سے بہت خدشہ وخوف لگا رہتا تھا۔ ایک بہت مشکل ترین مہم ظہیر الدین محمد بابر سے جنگ کی سامنے تھی جس کے لیے وہ درویشوں کی دعا وتوجہ کے لیے ان سے درخواست کرنے کے لیے بے چین تھا۔ انھوں نے بھی سلطان مذکور کی مطلب براری کے لیے دعائیں کیں اور مشغولی دکھائی۔ کیونکہ کارہائے زمانہ حاکم علی الاطلاق کے حکم سے انجام پذیر ہوتے ہیں اس پر کچھ فائدہ مرتب نہ ہوا۔ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کی سلطنت قائم ہونے کے بعد محمد بابر بادشاہ بھی اسی جگہ فیروز آباد کے قلعے کی عمارت میں ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے بھی ان کے ساتھ ادب واحترام کا معاملہ رکھا۔ سلطان ہمایوں بادشاہ کے عہد میں بھی وہ قدر وعظمت رکھتے تھے۔ مگر ان کی حد درجہ عظمت وشوکت اور مشیخت، اسلام شاہ ابن شیر شاہ کے دور میں رہی۔ انھوں نے اسلام شاہ کو اس طرح اپنے حلقۂ اعتقاد میں لے لیا تھا کہ حدِ تقریر وبیان سے باہر ہے اور اکثر درباری امرا بھی اپنے بادشاہ کے تتبع میں ان کے معتقد اور حلقہ بگوش غلام بن گئے تھے۔ اکثر درویش اور طالبانِ حق ان سے توجہ لیتے تھے اور ان کی خلافت سے

---

1 قصبہ ساڈھوڑہ، ہندوپاکستان اور دوسرے ممالک میں بھی شاہ قمیص کی اولاد آباد ہے جن میں حضرت مہر علی شاہ علیہ الرحمہ (گولڑہ شریف پاکستان) سید شاہ نور الدین قمیصی (حیدرآباد) حضرت پیر علی احمد (ضلع کرنال) پیر مشکور احمد مدیر وناشر رسالہ قمیصیہ وغیرہ ہیں۔

بھی نوازے گئے تھے۔ مختصر یہ کہ ان کی مشیخت کا کاروبار اور بزرگی بغایت لطیف اور رونق پذیر تھی۔
اسی اثنا میں دو بلند مرتبہ سید بزرگ عراق اور خراسان کی جانب سے اس دیار میں تشریف لائے۔
ایک میر شمس الدین محمد (خراسانی) جو فاضل و دانشمند، ولایت شعار، منقبت آثار، اور فنِ طب میں
بے نظیر تھے عالمِ آزادگی، بے تعینی اور تجریدی رنگ میں دنیا کے آباد خانوں کی سیر کرتے ہوئے
آئے۔ چند کتابیں اور دو تین خادم ساتھ رکھتے تھے اس سے زیادہ کی تکلیف خود پر گوارا نہ تھی، عالی
نسبت تھے مدتوں کابل میں رہے تھے۔ نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کو ان سے بہت عقیدت تھی
دوسرے سید ابو طالب عراق کے سادات کی اولاد میں سے تھے، جوان تھے، زیورِ حسن سے آراستہ
اور صفائی ظاہر و باطن سے متصف تھے۔ بعض حوادثات سے مجبور ہو کر وطن سے باہر نکلے تھے اور
بعض سفروں میں میر سید شمس الدین کے مصاحب رہے تھے۔ اور دینی بھائی بن کر ہندستان کی سیر
میں ایک دوسرے کے مددگار اور معافقت کرنے والے بنے ہوئے تھے۔ شاہ محمد فیروز آبادی نے
ان سادات عظام کی آمد کی خبر سن کر چاہا کی اپنی جانب کھینچ لیں۔ اُن کی چند لڑکیاں تھیں روہیلوں
کے اس گاؤں میں نکاح کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ جب انھوں نے ان سادات کو دیکھا کہ مسافر ہیں
اور انجان شہر سے آئے ہیں لوگوں میں یہ ظاہر کیا کہ یہ میرے ہم کفو ہیں بارہا ان کے آنے سے
پہلے کہتے رہتے تھے کہ میرے کچھ اجنبی مسافر شرفا ہم کفو ہیں اگر وہ ادھر آئے تو شاید لڑکیوں کے
رشتے ہونے کی صورت پیدا ہو جائے۔ ان کو اپنا مہمان بنایا اور حد درجہ تواضع، خاطر داری اور تعلق کا
اظہار کیا اور نجابت کا حق ادا کرنے میں کوئی تقصیر نہ کی۔ اور کہا کہ آپ حضرات کے لیے میرے گھر
کے سوا کوئی جگہ مناسب نہیں۔ آپ یہاں رہیں کہ آپ کی خدمت اور سید ہونے کی نسبت میں کسی
تقصیر پر خود سے راضی نہ ہوں گا۔ یہ حضرات چونکہ مسافر اور اجنبی تھے اور ان کا سلطان وقت کے
دربار میں حد سے زیادہ اعتبار دیکھ کر مصلحتاً ان کے ساتھ رہنے پر رضامند ہو گئے۔ اور اپنا ساز و
سامان ان کے گھر میں رکھ لیا۔ ایک مدت کے بعد انھوں نے سید ابو طالب کو اپنی ایک بیٹی کے
نکاح کا پیغام بھیجا۔ یہ بات حالِ دل کے موافق نہ بیٹھی اور کہلوا دیا کہ ہم مسافر ہیں تجرید و تفرید کے
اصولوں پر قائم ہیں مجھے اس سے معاف رکھیں۔ اسی دوران ایک رات کو ان دونوں فرزندوں کو کسی
نے ان کے گھر میں قتل کر دیا۔ مخلوق میں بے اندازہ شور و غوغہ برپا ہو گیا اور کربلا کے روز کی مصیبت

تازہ ہوگئی۔ مخلوق نے سروں پر خاک ڈال لی آنکھوں نے خون بہایا اور سینوں سے آہیں نکل پڑیں شاعر وقت کی زبان ایک قصہ پُر درد کے بیان میں ان شعروں کو پڑھنے لگی

باز آی فلک ز بہر خدا این چہ ماجرا است — باز این چہ ظلم این چہ حسین این چہ کربلاست
باز این چہ کوفہ این چہ فراتست این چہ وقت — عاشورہ نیست ورنہ قضیہ ہمینہاست
این زہر باز با حسن مجتبیٰ کہ داد — این تیغ باز بر سر شیر خدا کراست
باز این چہ درد این چہ الم این چہ بخت است — باز این چہ محشر این چہ فراق این چہ ابتلاست
باز این چہ غصہ در جگر انس و جان گرفت — باز این چہ فتنہ در سر کون و مکان بخاست
باز این باہل بیت نبوت کہ ظلم کرد — باز این بخاندانِ پیغمبر ستم کہ خواست
این ریش کہنہ را دِگر از سر کہ تازہ کرد — این داغ خشک را دگر از برگ و پوست کاست
اے وائے بر محبتِ دنیا و کار او — زنہار دل مبند برین کاروبارِ او[1]

پھر ان دونوں کو روضہ قدمگاہ عالم پناہ (ﷺ) میں دفن کر دیا۔ آج بھی ان دو بزرگوں کی قبریں مخلوق کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہیں یہ واقعہ 955ھ (1548) میں ہوا۔ واقعہ کے وقوع ہونے کے بعد اکثر بلکہ سب نے اس قتل کی نسبت شاہ محمد کی طرف کی اور تمام مخلوق ان سے برگشتہ ہوگئی معتقدین منکرین بن گئے، دوست دشمن، قریبی لوگ دور ہوے اور محبت کرنے والوں نے راہِ فرار اختیار کر لی۔ تاج خان دکنی اور شیخ فرید جو صوبۂ دہلی کے دس ہزاری سپہ سالار تھے حقیقتِ حال کی تفتیش کے لیے حاضر ہوے۔ انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرا کام نہیں نہ میری مرضی سے بلکہ مجھے اس کی

---

1 اے فلک خدا کے واسطے کچھ تو بتا کیا ماجرا ہوا۔ کسی حسین پر پھر یہ کیا ستم ہے یہ کون سا کربلا ہے۔ پھر یہ کون سا کوفہ ہے کون سی فرات ندی ہے کیا وقت ہے۔ بس یہ عاشورے کا دن نہیں ہے ورنہ ہو بہو وہی قضیہ ہے۔ حسن مجتبیٰ کو پھر یہ زہر کس نے دیا۔ شیرِ خدا کے سر پر پھر کس کی تیغ چلی پھر یہ کیسا درد والم ہے۔ پھر یہ کیسی محنت و مشقت ہے اور کیا نصیبہ۔ پھر یہ کیسا روز حشر ہے کیسا فراق اور کیسی آزمائش ہے۔ انس و جان کے جگر میں کیسا غصہ بھر گیا ہے۔ کون ومکان میں پھر یہ کیسا فتنہ اُٹھا ہے۔ اہلِ بیت نبوّت پر پھر یہ کس نے ظلم کیا ہے۔ کس نے پھر خاندانِ نبوّت پر ستم روا رکھا۔ اس پرانے زخم کو پھر کس نے تازہ کر دیا اس خشک زخم سے دوبارہ کس نے کھال ادھیڑ لی۔ ہائے افسوس دنیا کی محبت اور دنیا کے کاسوں پر۔ دیکھ ہرگز اس کاروبار میں دل نہ پھنسانا۔

کوئی اطلاع اور خبر نہیں تھی۔ چور گھر میں گھسے اور یہ کام کر گئے۔ جب اسلام شاہ کو خبر ہوئی تو علما سے کہا مسئلہ شرعی اِس باب میں جو حکم کرے اس پر عمل کریں۔ تمام دہلی، لاہور، جونپور بہار کے علما سلطان وقت کے حکم سے جمع ہوے اور محضر (چارج شیٹ) تیار کیا۔ وہ تو بالکل انکاری ہی رہے جب علما کی اس مجلس میں ان کو حاضر کیا گیا تو کہا۔ میں تو مظلوم اور بے گناہ ہوں اب جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میں تو اس گناہ کے تصوّر سے بھی بالکل کورا اور بری الذمہ ہوں۔ اہلِ بیت کی مظلومی اور بے حرمتی قدیم سے چلی آئی ہے اور بواسطہ ہم تک پہنچی ہے جو بھی سر پڑے گی اسی پر صابر ہوں۔ علمائے وقت میں، ان کے قتل کے فتوے کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر چند جد و جہد کی ایسا شرعی ثبوت جس میں شبے کی گنجائش نہ ہو، نہ ملا۔ مدتوں اس واقعہ پر شور و غوغا برپا رہا۔ انھیں قید کر دیا اور جیل میں ڈال دیا اور اہانت، ذلّت اور خواری جو بھی اُن کے نصیب میں لکھی تھی ایسی نہ چھوڑی جو نہ کی ہو۔ نقل ہے کہ شیخ امان اللہ پانی پتی کو بھی بہت چاہا کہ اس مجلس میں حاضر ہوں، رائے دیں۔ وہ حاضر نہ ہوے اور فرمایا۔ امان کے قدم دوزخ میں کیوں نہ جائیں اگر وہ اس مجلس میں جس میں اہلِ بیتِ پیغمبر کو لا کر ذلیل و خوار کر کے سامنے کھڑا کریں اور وہ عزت و اکرام سے بیٹھا رہے۔ یہ بھی فرمایا کرتے کہ ان دونوں سیدزادوں کا مارا جانا نہایت افسوس کی بات ہے مگر ان سید شاہ فیروز آبادی کو خوار کرنا دوسرا افسوس ہے، اُس سے بھی میرا دل خون ہوتا ہے اور اس سے بھی خوف و خطر میں ہوں۔ ایسے ویسے لوگ تو اس قسم کی اوچھی حرکتیں بہت کیا کرتے ہیں مگر اللہ کی پناہ ان (شاہ فیروز) سے ایسا عظیم گناہ سرزد ہو ہرگز نہیں۔ بالجملہ کچھ زمانے بعد وہ اسی زنداں میں جان بحق ہو گئے۔ بعض بدنصیب اُن کے مرنے کے بعد اُن کے پیر باندھ کر بازار میں کھینچے لیے پھرے اور پھر ایک گڑھے میں ڈال دیا۔ آخر میں قلعہ دہلی کے نیچے کوشک میں دفن کر دیا۔ شیخ یعقوب کشمیری نقل کرتے ہیں کہ ایک بار مہمانوں کی ایک جماعت ان کے پاس تھی اور کھانا تناول کر رہی تھی۔ ان میں سے کسی نے جغرات کی خواہش کی۔ وہ جغرات کا تھال لیے باہر آے اور مہمانوں کے سامنے رکھ دیا، اسی اثناء میں ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ ایک سیاہ غلام بچہ جو سر سے پیر تک ننگا ہے میرا جغرات کا تھال چُرا کر حضرت شاہ صاحب کے حرم میں داخل ہوا ہے۔ اس عورت کو اس کے بدلے میں کچھ دلوایا اور واپس کیا۔ کہتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں جنوں کی تسخیر کے

سب سے ہوتی تھیں جو وہ کیا کرتے تھے۔ان کے بہت سے مرید اور خلیفہ تھے مگر اس واقعے کے بعد کوئی کوئی ہی ان کا معتقد اور محبت کرنے والا رہا ہوگا۔شیخ محمد عاشق جو کہ سنبھل میں تھے وہ بھی ان سے بیعت اور ان کے خلیفہ تھے۔ یہ محمد عاشق حد درجہ نیک اور صاحبِ صدق درویش تھے، ہمت والے بڑے مجاہد اور حال کے حامل اسی تجی عقیدت اور عشق و محبت شیخ پر قائم رہے۔شیخ حسن سرمست جو سکانو[1] میں تھے ان کے ہی مرید تھے۔(انتہی)

خواجہ عطاء اللہ کشمیری

صاحب احوال شریف و وسیع ہیں۔طریقۂ آزادی اور تجرد کو معاملہ شریعت سے خوب ہم کیے ہوئے ہیں وہ حالت بندگی کے ساتھ ساتھ فانی التوحید بھی ہیں اور حال و کیفیت استہلاک میں بھی عبدیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔کسی استاد شاعر کا یہ شعر آج اُن پر پورا اترتا ہے۔

طرز بے قیدی عجب قید یست بے قیدانہ باش گاہ گل، گہہ بلبل و گہہ شمع گہہ پروانہ باش[2]

اکثر چیزیں جوان کو کہیں سے بطور نذرانے آتے ہیں۔فقرائے باب اللہ پر خرچ کردیتے ہیں اور بہت تھوڑی سی متعلقین کے لیے رکھتے ہیں۔کھانے کی فکر بالکل ان کے دامن گیر نہیں ہے۔خوش خوش زندگی بسر کرتے ہیں۔میرے شیخ کو ان کا طریقہ بہت ہی پسند ہے اور وہ کہا کرتے ہیں کہ اُن کا طریقۂ زندگی بہت اونچا ہے۔وہ بھی میرے شیخ کے بہت نیاز مند ہیں اپنے اشعار کو کبھی کبھی میرے شیخ کے سامنے پڑھا کرتے ہیں اور تصحیح و اصلاح چاہتے ہیں۔بڑی اچھی مجلس رہتی ہے۔جس وقت سرہند کے مخدوم زادے[3] سفر حجاز کے ارادے سے نکلے اور دہلی پہنچے تو وہ ان سے ملاقات کے لیے آزادانہ، سرو پا برہنہ مستانہ وار رات کو پہنچے اور بڑی بے تکلفانہ باتیں کرنے لگے سب کے سب تعجب کر رہے تھے اور متحیر تھے کیوں کہ ان مخدوم زادوں کا طریقہ ورع و تقویٰ، وقار اور عظمت و تمکنت

---

1 ''اخبار الاخیار'' میں ''ہرکانو'' لکھا ہوا ہے۔

2 طریقہ آزادی بھی ایک عجیب قید ہے ہر رنگ سے آزاد رہ کر زندگی گزار، کبھی پھول بن جا، کبھی بلبل کبھی شمع اور کبھی پروانہ۔

3 خواجہ محمد معصوم سرہندی اور خواجہ محمد سعید پسران حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی۔

ہے۔اسی حال میں (مست و بےخودانہ) پھر میرے شیخ کے پاس آئے۔میرے شیخ نے دریافت کیا:''کیا حال ہے؟ کہاں تشریف لے گئے تھے؟ کہا مدت کے بعد ہمارے مخدوم زادے سرہند سے ہمارے شہر میں آئے ہیں۔عزیز ہیں، مہمان ہیں، ہمارے پیرزادے ہیں۔ میں حاضر خدمت ہوا، دیدار کیا، خود محظوظ ہوا اور انھیں بھی محظوظ کیا۔یہ چند شعر انہیں کے ہیں۔

از بےخودی بزلف تو دل خانہ کردہ است — ایں شیشہ راحوالے بدیوانہ کردہ است

تا آشنا شدہ بمن آں یار آشنا — از خویش و آشنا ہمہ بیگانہ کردہ است

ہم خانہ یار بامن و من دورازو عجیب — بیگانہ آں نکردہ کہ ہم خانہ کردہ است [1]

ایک دن وہ اپنے سارے اشعار کا مجموعہ دریائے جون کے کنارے لے گئے اور جہاں شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی نے اپنی کتابیں غرق کی تھیں ڈبا کر دور بیٹھے دیکھ رہے تھے۔روایت ہے جس وقت شیخ شرف الدین کو جذبہ حاصل ہوا اُس وقت ان کی زبان سے یہ ہندی شعر نکلا تھا۔

کاگت سیاہی بہا دیا کت منہ واکت نہیں — تاکت ہوں من لاو جاگت ناکت پائی

''اخبار الاخیار'' میں ہے کہ شیخ شرف الدین پانی پتی مشہور اولیاء مجاذیب میں سے تھے، صاحب آیات و کرامات تھے۔شروع میں علم حاصل کیا۔تیس سال تک درس وافادے میں مشغول رہے، سلوک میں ریاضت اور مجاہدہ کے طریق پر گامزن تھے۔آخر میں مجذوب مستہلک بن گئے تھے اور دائرہ تکلف سے باہر آگئے تھے۔ایک بار ان کے لبوں (مونچھوں) کے بال بڑھ گئے۔کسی کی مجال نہ تھی کہ کاٹتا۔مولانا ضیاالدین سندھی [2] نے چونکہ انھیں جوش و لحاظ شریعت بہت تھا، قینچی لی، اپنے ہاتھوں سے ان کی داڑھی پکڑی اور بڑھی ہوئی لبیں (مونچھیں) کاٹ ڈالیں۔کہتے ہیں کہ وہ

---

1 بےخودی سے تیری زلفوں میں دل نے گھر بنالیا ہے اس دل کے آئینے کو ایک دیوانے کے حوالے کر دیا ہے۔ جب سے اس یار سے میری شناسائی ہوئی ہے اپنوں اور پرایوں، سب سے بیگانہ کر دیا ہے۔ دوست میرے ساتھ میرے گھر میں ہے اور تعجب ہے کہ میں اس سے دور و مجبور ہوں۔ کسی بےگانے نے بھی ایسا نہ کیا ہوگا جیسا ہم خانہ (دوست) نے کیا ہے۔

2 مولانا ضیا الدین سندھی حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کے ہم عصر اور ایک کتاب ''نصاب الاحتساب'' کے مصنف ہیں۔

ہمیشہ اپنی داڑھی کو بوسہ دیا کرتے تھے اور کہا کرتے کہ یہ شریعتِ محمدی کی راہ میں پکڑی گئی ہے۔ مزار پانی پت میں ہے بڑی پُرفیض اور پُرکیف جگہ ہے۔ اس کی زیارت کی جاتی ہے اور اس سے برکت حاصل کی جاتی ہے۔ ایک بار سلطان علاء الدین نے چاہا کہ ان کی خدمت میں ہدیہ بھیجے۔ اس ارادے سے اپنے قریبی لوگوں میں سے کسی کو شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں بھیجا کہ امیر خسرو کے لیے پانی پت جانے کی اجازت حاصل کریں۔ آپ نے بڑی کراہیت کے ساتھ تامل بسیار کے بعد قبول کیا اور حضرت امیر خسرو کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ شیخ شرف الدین جو کچھ کہیں اس پر اعتراض نہ کرنا اور دل و جان سے اس کو تسلیم کرنا۔ جب امیر خسرو سلطان علاء الدین کی نشانی اور نذرانہ جو کچھ تھا لے کر پانی پت پہنچے خادموں نے امیر خسرو کی آمد کی خبر یہ کہلائی کہ مولانا نظام الدین کے بھیجے ہوئے امیر خسرو دہلی سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اور حضوری کی اجازت چاہتے ہیں جب امیر خسرو حضرت شیخ کے پاس پہنچے تو شیخ نے ہندی میں پوچھا "خسرو میری تو ی" میر نے ٹوپی زمین پر رکھی اور عرض کیا مجھ غلام کو ہی لوگ اس لقب سے پکارتے ہیں۔ شیخ نے کہا، "اپنے کلام سے کچھ سنا۔" امیر خسرو نے یہ غزل پڑھی۔

اے کہ گوی ہیچ مشکل چون فراق یار نیست	گر امید وصل باشد آنچنان دشوار نیست
عاشقان را در جہان یکسان نباشد روزگار	زانکہ این انگشتہا بر دست من ہموار نیست
خلق را بیدار باید بود ز آبِ چشم من	وین عجب کان وقت ی گریم کہ کس بیدار نیست
یک قدم بر فرق خود نہ و آن دگر در کوے دوست	ہر کہ بیند دوست را با این و بآن کار نیست
چند گویندم برو زنار بند اے بت پرست	بر تن خسرو کدامین رگ کہ آن زنار نیست[1]

1 تو کہتا ہے کہ فراقِ دوست سے بڑھ کر کوئی مشکل نہیں۔ اگر وصل کی امید ہو تو کچھ دشوار بھی نہیں ہے۔ دنیا میں عاشقوں کا روزگار یکساں نہیں رہتا ہے۔ اس لیے کہ میرے ہاتھ کی ساری انگلیاں ہموار نہیں ہیں۔ چھوٹی بڑی ہیں۔ مخلوق کو میرے آنسوؤں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت رو رہا ہوں جب کہ کوئی جاگ نہیں رہا۔ ایک قدم اپنے سر پر رکھ یعنی خودی کو فنا کر دے اور دوسرا دوست کے کوچے میں جو دیدارِ دوست میں محو ہوا ہے اس اُس سے کیا غرض، وہ محبوبِ حقیقی کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ لوگ مجھ سے کتنا کہیں گے کہ جا اے بُت پرست زُنار باندھ۔ بھلا خسرو کے تن پر کون سی رگ ہے جو زنار نہیں ہے۔

یہ شعر سننے کے بعد شیخ نے فرمایا۔ خسرو خوش کلام ہے، خوش ہی جیئے گا اور خوشی خوشی ہی دنیا سے جائے گا اور فرمایا کہ اس درویش سے بھی سنو اور شیخ نے اپنے یہ شعر خود پڑھے۔

دیہیم خسروان بر مانعل اشتراست | خسرو کسے کہ حلقہ تجرید در سراست
سیمرغ وار روی نہفتم بقاف عشق | کو عارفے کہ منظر او عرش اکبر است
عقل کل است علم لدنّی بعار فان | این عقل و علم جسمی و رسمی محقر است
درس شرف نبود ز الواح ابجدی | لوح جمال دوست مرا در برابر است [1]

یہ شعر سن کر امیر خسرو بہت روئے۔ شیخ نے ہندی زبان میں یہ بات کہی "روندا ہے کچھ بوجھدا ہے"[2] امیر خسرو نے جواب دیا "ایہہ روندا ہوں کہ کچھ بوجھدا ناں"[3] اس بات سے شیخ خوش وقت ہو گئے اور امیر خسرو پر کرامات و انعامات کی بارش برسا دی۔ شیخ کے اشارے سے شیخ کے خادموں نے امیر خسرو کو تین دن تک مہمان رکھا۔ تین دن بعد امیر خسرو کو رخصت کیا اور کچھ تحائف شیخ نظام الدین اور بادشاہ سلطان علاالدین کے لیے بھجوائے اور دو کلمے کی یہ عبارت لکھی،

علاء خلجی فوطہ دار دہلی مقرر داند کہ با بندگان خداے تعالیٰ نیکو زندگانی کند[4]

روایت ہے کہ جب یہ تحریر سلطان کے پاس پہنچی تو بعض حاسدین نے سلطان سے کہا، بادشاہ اور خلیفہ کو اس طرح لکھنا کس طرح روا ہے۔ (بادشاہ نے) کہا، اے ناداں (انھوں نے) مجھ پر ہزار رحمت کی کہ سلطانی مجھ پر قائم رہی۔

---

1 بادشاہوں کے زر و جواہر ہمارے لیے اونٹ کے پیروں میں لگے نعل جیسے ہیں۔ سلطان تو وہ ہے جس کے سر میں تجرید کا حلقہ پڑا ہو۔ وہ عارف کہاں ہے جس کی نظر عرش اکبر ہے، میں نے سیمرغ کی طرح کوہ قاف عشق میں اپنا چہرہ چھپا رکھا ہے۔ عارفوں کے لیے علم لدنّی ہی عقل کامل ہے۔ (اس کے سامنے) یہ رسمی اور جسمی عقل و علم تو بہت حقیر ہیں۔ شرف الدین نے الف، ب، ت کی تختی سے سبق نہیں پڑھا۔ جمال دوست کی تختی میرے سامنے رہتی ہے۔

2 بس رو ہی رہا ہے یا کچھ سمجھا بھی ہے۔)

3 اسی لیے تو رو رہا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھا۔

4 دہلی کے فوطہ دار علاء الدین خلجی کو معلوم ہو کہ وہ بندگان خداے تعالیٰ کے ساتھ بھلائی سے زندگی گزارے۔

شیخ ابولمعالی بلگرامی

اپنے والد کے مرید ہیں۔ نیکی والے۔ معاملات شریعت کو مشرب توحید سے آمیز کیے ہوے ہیں۔ ظاہر میں وسیع الطریقہ اور باطن میں لطیف النسبت ہیں۔ بہت سے مشائخ طریقت کو دریافت کیے ہوے اور ان سے بہرہ ور۔ میرے شیخ کے آشنا اور نیاز مند ہیں۔ میرے شیخ کو ان کا طرز بہت پسند ہے اور ان کی وضع اچھی لگتی ہے۔ شروع میں ایک دن وہ میرے شیخ کے پاس قاریوں کے لباس میں آے، بڑی دل نشین داڑھی، نفیس فُرجی اور پرتکلف باریک عمامہ سر پر تھا۔ میرے شیخ انہیں دیکھ کر خوش ہوے اور اس راہ کی بے تکلفانہ گفتگو درمیان میں رہی اور صحبت گرم ہوئی کہ میرے شیخ نے اُن سے بطور دل لگی کہا ''اچھا اے شیخ اگر تمہیں اس لباس اور اس حال میں شیریں آواز اوباشوں کے بازار کی سیر کے لیے لے جاؤں تو کیا کروگے؟ کہا آقا، فُرجی اتارتا ہوں اور بغل میں دباتا ہوں اور غرور کا عمامہ اُتار کر کمر میں باندھتا ہوں اور آپ کے ساتھ چلتا ہوں، جہاں آپ لے جائیں چلا جاؤں گا اور جس جگہ کو دوڑائیں دوڑ پڑوں گا۔ یہ بھی کہا کہ مشرب کی وسعت کے تحت والد کی سجادگی کا بوجھ سر سے اتار دیا ہے اور اپنے بیٹے کے سر ڈال دیا ہے اور میں فارغ البال ہوگیا ہوں، اپنے آباء واجداد، مشائخ و بزرگان کے سلسلہ کے طریقے اور ان کی رسوم سے خود کو خالی و عاری کرلیا ہے۔ اسی اثناء میں شیخ ابوالمعانی نے کلام مجید کی چند آیتیں بہترین آواز تجوید کے ساتھ پڑھیں اور دوسری غریب و لطیف باتیں کیں ایسی کہ میرے شیخ خوش ہو گئے اور میری طرف رُخ کر کے فرمایا۔ یہ اللہ کے مقبولین کی جماعت میں سے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ خواجہ شیراز نے خوب کہا ہے۔

بس نکتۂ لطیف بباید کہ تا کسے　　　مقبول طبع مردم صاحب نظر شود [1]

میں نے ان کو چند بار دیکھا اور ان کے کلام کی شیرینی سے مسرور ہوا ہوں۔ ایک دن میں اکیلا شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار کی زیارت اور شرکتِ عرس کی غرض سے نکلا اور بازار میں آیا۔ دیکھا کہ وہ بھی آگے آگے تنہا جا رہے ہیں۔ میں نے انھیں جا پکڑا اور کہا، شیخ سنو! ایک نکتہ ظریف اور سخن

1　نہایت ہی لطیف مزاج چاہیے تب جا کر کوئی اہل نظر کا مقبول طبع بنتا ہے۔

لطیف ہے کہ ابھی میں تنہا تم تک پہنچا، تمھیں بھی تنہا پایا۔ اب جب کہ ہم دونوں ساتھ چل رہے ہیں پھر بھی اکیلے ہی ہیں۔ اس نکتے سے دونوں محظوظ ہوئے کیونکہ یہ بات سرِ مخفی میں حقیقت مطلقہ کا پتا دیتی ہے۔ جیسا کہ میرے شیخ نے رسالہ ''نور وحدت'' میں لکھا ہے کہ حقیقت مطلقہ کے وصول کی علامت یہ ہے کہ جو ''میں'' تیرے سر سے ابھرتی ہے اس کا سب چیزوں پر اطلاق کر سکے۔ بے تکلف سب چیزوں کو ''میں'' کہہ سکے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ انانیت کا تعین کے علاوہ کوئی حجاب نہیں۔ (انتہیٰ) میرے شیخ نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی رباعیات کی شرح میں خود یہ رباعیاں کہی ہیں۔ رباعی

پیدا چوں آفتاب ہر سو مائیم ہم در صحرا وہم بہر کو مائیم
مارا می جوی واز پئے مای باش چیزے دیگر مجوی کہ خود اومائیم [1]

وے دلبر من چہ خود نمائی ہا کرد جا ن ہا بخشید و دل رُبائی ہا کرد
بیگانہ نمود و آشنائی ہا کرد د ر صورت بندگی خدائی ہا کرد [2]

آخر کار ہم دونوں نے ساری رات روضۂ منورہ کے صحن میں خوش خوش گذاری۔ طریقہ عشق کی کیسی کیسی رنگین حکایتیں اور کیا کیا احوال مشائخ کی شیریں نقلیں ظاہر ہوئیں۔ چند سال بعد میرے شیخ تمام احباب طریقہ کے ساتھ روضۂ قدم گاہِ رسالت پناہ ﷺ کے صحن میں جا کر بیٹھ گئے کہ شہر کے تمام قوال اس دن نسبت کا کلام کہہ رہے تھے جو گانے کے ''پردۂ یمن''۔ اسی اثنا میں ابوالمعالی ظاہر ہوے۔ کمزوری اور ضعفِ بصارت کی وجہ سے میرے شیخ کو نہ پہچانا۔ میں نے آواز دے کر بلایا۔ آے اور بیٹھ گئے۔ میرے شیخ نے پوچھا۔ اے شیخ کیا حال ہے؟ کہا۔ اے بزرگوار میرا حال وہ ہے کہ ایک بزرگ سے پوچھا، کیا حال ہے؟ کہا اس شخص کا حال کیا ہوگا کہ خدا اس سے اپنی طاعت چاہتا ہے، مصطفیٰ ﷺ کی سنت پر عمل، ملک الموت جان اور بیٹے مال چاہتے ہیں مجھے ان

---

1 آفتاب کی مانند ہر سو ہم ہی ظاہر ہیں، ہر صحرا اور ہر کوچے میں ہم ہی ہیں ہم کو ڈھونڈھتا رہ اور ہماری کھوج لگاتا رہ، کچھ اور چیز مت ڈھونڈھ ہر چیز ہم ہی ہیں۔

2 آہ میرے محبوب نے کیسی کیسی خودنمایاں کیں، جان عطا کی اور خود ہی جان لے اُڑا بیگانگی دکھائی اور شناسائی کی، بندگی کی صورت میں خدائی کی۔

کی کمزوری کی یہ حالت دیکھ کر کسی شاعر کی مثنوی کے یہ اشعار یاد آ گئے۔

(مثنوی)

چون عمر از دہ گذشت یا ازبست　　نشاید مر ترا چون غافلان زیست

نشاط عمر باشد تا بہ سی سال　　چو چل آمد فرو ریزد پر و بال

پس از پنجاہ نباشد تندرستی　　بصر کندی پزیرد پاے سستی

چو شصت آمد، نشست آمد بدیوار　　بہفتاد آمد افتاد آلہ از کار

بہشتاد و نود چون رسیدی　　بسا محنت کہ از گیتی کشیدی

چون سال خویشتن تا صدرسانی　　بود مرگے بصورت زندگانی[1]

شیخ محمود سنبھلی

شیخ نور محمد کے مریدوں میں سے ہیں (جن کا ذکر گزر چکا) اور شیخ فاضل سنبھلی کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اہل صدق وراستی تھے۔ شریعت کی صحیح رائے رکھنے کے باوجود سُرود کی جانب میلان خاطر تھا۔ لیکن صوفیان اہل سماع کے طور پر سماع نہیں کرتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ مجلس سماع نہایت گرم تھی کہ آپ کو بھی وجد ہوا اور ایک لمحے میں ہی افاقہ ہو گیا۔ خود بھی خوش آواز تھے۔ ایک رات کو یہ شعر ایسے درد کے ساتھ پڑھ رہے تھے کہ دل پر اثر انداز ہو رہا تھا۔

مست اند کشتگان تو ہر سو فتادہ اند　　تیغے تُرا مگر کہ بے اب دادہ اند[2]

1　جب تیری عمر دس سے یا بیس سال سے آگے نکل گئی تو تجھے غافلوں کی مانند نہیں جینا چاہیے۔ نشاط عمر بس تیس سال تک رہتی ہے۔ جب چالیس سال کا ہوا پر و بال گرنے لگتے ہیں۔ پچاس کے بعد تندرستی نہیں رہتی۔ نگاہ کمزور ہو جاتی ہے اور پاؤں سست۔ جب ساٹھ سال کا ہوا تو دیوار سے لگ کے بیٹھنے لگا۔ جب عمر ستر سال ہوئی اعضا کام سے بیکار ہو گئے۔ جب اسی اور نوے کی عمر پہنچی تو دنیا سے کیا کیا تکلیفیں پہنچتی ہیں۔ جب تو اپنی عمر کے سویں سال میں پہنچا تو زندگی موت کی طرح ہو گئی۔

2　تیرے مارے ہوے مست ہو کر اِدھر اُدھر پڑے ہوے ہیں شاید تیری تیغ کی دھار کو شراب (کے پانی) سے آب دی گئی ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ انوری اور خاقانی کے دیوان بڑے ذوق وشوق اور ہوش وفہم کے ساتھ استاد کے پاس پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار میں اپنے شیخ کے پاس سے سنبھل آیا۔ وہ مجھے ایک کونے میں لے گئے۔ انھوں نے تعجب سے بلکہ اعتراضاً کہا کہ ''تیرے شیخ کا عقیدہ توحید وجودی ہے یا توحید شہودی؟'' میں نے کہا میرے شیخ کا اعتقاد صوفیہ محققین۔ شیخ ابن عربی، مولانا عبدالرحمٰن جامی کے مثل ہے۔ بلکہ اگر اچھی طرح غور کریں تو میرے شیخ خود محققین صوفیہ میں شامل ہیں اور ان حضرات کی کتب میں توحیدِ وجودی کا ذکر ہے نہ کہ توحید شہودی کا۔ اس بات سے وہ بگڑ گئے اور علمائے ظاہر کے عقیدے کے مطابق کہا۔ تمھارا یہ کہنا کیسے درست ہے۔ کثرت، وحدت نہیں ہوسکتی۔ میں نے کہا کثرت کا وحدت ہونا مقرر قوم ہے۔ (البتہ) ابن عربی کے بعد بعض مشائخ کی کتب سے یہ پتا چلتا ہے کہ وحدت دو قسم کی ہوتی ہے شہودی اور وجودی۔ اگر چہ وجودی شہودی سے فوقیت رکھتی ہے لیکن اس طریق محمدی میں ضرورت شہودی کی ہے نہ کہ وجودی کی۔ بعض دیگر مشائخ نے ایسا لکھا ہے وحدت اگر ہے تو شہودی ہے یعنی واقعہ میں وجود متعدد ہیں نہ صرف ایک وجود۔ مدار احکام شرع وحدت شہودی پر ہی ہے۔ اس سے یہ بات دل میں پیدا ہوتی ہے کہ جب شہود مطابق واقعہ نہ ہوا اعتبار سے خارج ہے۔ حالانکہ اکابر نے وحدۃ الوجود کو معتبر جانا ہے اور ضروری سمجھا ہے آخرالامر ایسا ظاہر ہوا کہ شہود چاہے کسی بھی مرتبے پر جا کر منتہی ہو فرد ع صفت علم سے ہے۔ علم سے آگے اس کی رسائی نہیں۔ علم کا کام اندازہ اور تکثیر ہے نہ کہ افراد و توحید۔ تو وحدت ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر بحیثیت وجود (خارجی)۔ حقیقتاً وحدت وجود ہے نہ کہ شہود۔ شہود نسبت ہے جو کہ دوئی کا سبب ہے۔ وحدت وجود ہی ہے جو اپنی حیثیت سے تمام نسبتوں اور اضافات کو ساقط کرتی ہے۔ قوم نے کثرت کو وحدت کی جانب راجح کیا ہے۔ کیوں کہ وحدت کثرت کی ذاتی صفت ہے وحدت کے جو دلائل بزرگوں نے دیے ہیں وہ سب وحدت وجود پر دلالت کرتے ہیں نہ کہ وحدت شہود پر۔ اگر انصاف کے ساتھ ان دلائل پر نظر کی جائے تو حقیقت پتا چل جائے۔ وحدت الوجود کے دلائل ان دلائل سے قوت میں کم نہیں جو علمائے ظاہر اپنے استنباط کیے ہوئے مطالب سے دیتے ہیں اور جن کی مخالفت کرنے والے کو بدعتی کہتے ہیں۔ بلکہ صوفیہ اور متکلمین کے وحدت وجود کے مسئلے میں جو اختلافات واقع ہوئے ہیں اگر ان کو بھی انصاف کی نظر سے دیکھا

جائے تو جانب صوفیہ قرآن وحدیث اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں قوی اور راجح ہے مگر علمائے ظاہر کو تاویلات کی احتیاج اس لیے پڑی کہ وہ حقیقت کو جب نہ پہنچ سکے تو تاویلات کا سہارا لے لیا ہے۔ حالانکہ تاویل نہ کرنا ہی بہتر تھا۔ صوفیہ پر گمان نیک رکھتے ہوئے اسے قبول کر کے تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس میں لگنا چاہیے تا کہ حقیقت ظاہر ہو اور دل پر تجلی کرے اور علم ظاہر، علم نفس الامری بن جائے۔ جب میں نے یہ مقدمات اجمالی طور پر عرض کیے تو شیخ محمود نے کہا اس معاملے میں گفتگو سے میری تسلی نہیں ہوتی اور دل میں نہیں بیٹھتی۔ میں نے کہا کہ یہ بات کہنے سننے سے نہیں آتی۔ جب آپ کو اس علم و دولت اور نعمت کی طلب ہوگی اور کسی فقیر کی صحبت اور ملازمت کو اختیار کرو گے تو خود سمجھ لو گے اور اطمینان خاطر ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ علم بہت غامض ہے۔ دقیق اور وجدانی ہے نہ کہ علمی اور تجرباتی۔ یہ علمی بیانوں سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ اسے وہی سمجھا جس نے چکھ لیا۔ کیا آپ نے نہیں پڑھا کہ ''رشحات'' میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی قدس سرہٗ ابتدائے حال میں بخارا شہر میں تحصیل علوم دین میں مشغول تھے۔ ایک دن وہ اپنے استاد امام صدرالدین نام سے جو کہ اکابر علماء میں سے ایک بزرگ تھے، تفسیر پڑھ رہے تھے جب اس ایک آیت پر پہنچے۔ اُدعو ربکم تضرعاً و خفیه انه لا یحب المعتدین [1] انھوں نے استاد سے پوچھا اس خفیہ کی حقیقت کیا ہے اور اس کا کیا طریق ہے کہ اگر کوئی زور سے ذکر کرے گا، ذکر کرتے وقت اعضا کو حرکت دے گا تو دوسرے کو اطلاع ہو جائے گی اور اگر دل ہی دل میں کہے گا تو شیطان بحکم حدیث ''الشیطانُ یجری فی ابن آدم مجری الدم [2]'' تو وہ واقف ہو جائے گا پھر پوشیدہ کہاں رہی۔ استاد نے فرمایا کہ یہ علم لدُنّی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اہل اللہ میں سے کوئی بزرگ پہنچے گا اور تجھے تعلیم کرے گا۔ حضرت خواجہ عبدالخالق منتظر رہتے تھے یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب حضرت خواجہ خضر علیہ السلام آپ کے پاس پہنچے اور طریقۂ وقوف عددی آپ کو تلقین کیا۔ انتہیٰ۔ میرے شیخ نے اس مقولے کہ یہ علم لدُنّی ہے کی شرح میں لکھا ہے۔ حق یہی ہے کہ حضوری کا حاصل ہو جانا اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور اسی کا عطیہ ہے وقوف عددی آپ کو تلقین

1 اللہ تعالیٰ کو تضرع کرتے ہوئے اور پوشیدہ طور پر پکارو وہ حد اعتدال سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

2 شیطان ابن آدم کے خون کے ساتھ چلتا ہے۔

کیا یعنی طریقۂ ذکر جو کہ اس علم کے حصول کا سبب ہے۔ انتہی۔ ایک بار میرے شیخ دہلی سے سنبھل تشریف لائے اور شیخ محمد حارث بن شیخ تاج الدین کے مکان پر قیام کیا۔ (شیخ) سید محمود روزانہ میرے شیخ کے حضور حاضر ہوا کرتے اور نیاز و اخلاص بجالاتے تھے۔ اب وہی ذوق اس علم سے انھیں وجدانا نصیب ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم۔ وہ میرے والد کے بہت گہرے دوست تھے۔ آپس میں خوب صحبتیں رہتی تھیں۔ مجھ پر مہربانی فرماتے تھے۔ ان کی وفات شروع شوال میں 1038ھ (جون 1629) میں ہوئی۔ ان کی قبر سرائے ترین اور ان کے گھر کے درمیان میں ہے۔ آج سید مسعود ان کے صاحبزادے صالح شخص ہیں۔ اس حالِ غربت میں بھی کیا خوب استغنائے قلبی رکھتے ہیں۔

شیخ عبدالرحیم سنبھلی

شیخ فتح اللہ شیرازی کی اولاد میں ہیں۔ صاحب ذوق اور با استقامت تھے۔ ایک بار وہ دہلی گئے تھے وہاں مشائخ میں سے جن کے پاس بھی جاتے معزز اور مکرم ہوتے اور مقبول نظر شیخ بنتے تھے۔ کئی مرتبہ وطنی نسبت اور والد سے سابقہ تعلق کی بنا پر میرے پاس ٹھہرے اور خوب صحبتیں گذریں۔ بڑا منور چہرہ رکھتے تھے۔ میں بچپن میں ان کو دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ زمانہ ماضی کے اولیاء اللہ ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ بس تقدم اور تاخر کا فرق ہے۔ 1020ھ (1610) میں انتقال ہوا۔ روایت ہے کہ شیخ فتح اللہ شیراز کے بادشاہ کے بھائی تھے اور شاہ ابوتراب شیرازی کے فرزند تھے۔ ایک دن وہ بادشاہ کے ہم راہ شکار کو گئے۔ ہرن سے بادشاہ کا تیر خطا کر گیا انھوں نے ٹھیک ہرن کے مارا۔ اس بات سے بادشاہ کو غیرت آئی، چاہتا تھا کہ ان کو قید کر دے اور دکھ پہنچائے۔ ایک پیادل نے انھیں اس کے ارادے سے آگاہ کر دیا اور کہا کہ جہاں جاسکیں چلے جائیں۔ وہ گھر سے نکلے اور سفر حجاز کا عزم کر لیا۔ اثنا راہ میں ایک جمال شاہ نام کے صاحبِ کمال، علم و حال بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ ان کے مرید ہو گئے اور وہیں رہنے لگے۔ جمال شاہ نے ان کا سارا مال ایک غار میں دفن کر دیا اور ان کو فقیری سے آگاہی بخشی۔ جب وہ فقر پر مستقیم ہو گئے تو چاہا کہ اپنی بیٹی کو ان کے عقد میں دے دیں۔ لڑکی اور اس کی والدہ کو ان کی غربت اور خاکساری سے عار آئی اور غربت کی وجہ سے ان کے کھانے میں زہر ملا کر کھلا دیا۔ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ جب جمال شاہ کو خبر لگی ذرا

سا پانی زہر سے شفا کے لیے پینے کو دیا فوراً شفایاب ہو گئے۔ اس کے بعد اپنی اہلیہ سے کہا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ کہا ٹکڑخورے کے لائق نہیں ہے ہماری بیٹی۔ کہا اچھا ماں کی خواہش ہے۔ آخر جمال شاہ وہ خزانہ جسے بنا کسی کو بتائے چھپایا تھا نکال کر لائے اور اپنی بیوی کو دیا۔ اس کے بعد ان کا نکاح ہوا۔ اس کے بعد وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ ہندستان آئے اور امروہہ میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے میں سنبھل میں ایک امیر تھا جو ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا اور نیازمندی دکھایا کرتا تھا۔ اس نے آخر ایک بار کہا اے شیخ سنبھل میں تشریف لائیں تا کہ میں وہاں مستقل آپ کی صحبت سے فیضیاب ہوا کروں۔ وہ تشریف لے گئے۔ ایک جگہ انھیں پسند آگئی وہاں مقیم ہو گئے۔ بہت سے لوگ ان کی صحبت سے بہرہ ور ہوئے اور بُعد کی پستی سے نکل کر پائگاہ قرب تک پہنچ گئے۔ ان کی تاریخ وفات 980ھ (1572) ہے اور قبر سنبھل میں۔ ان کی اولاد میں ایک بزرگ شیخ شکر اللہ بن شیخ نصر اللہ امروہوی ہیں۔ نیک اور منبسط الحال ہیں۔ ان کا مجھ پر بہت لطف و کرم ہے۔

شیخ بایزید دہلوی

شیخ بہاالدین میرٹھی کے مرید ہیں۔ بڑے صاحب اخلاق اور ہمت والے ہیں۔ نرالے انداز کی دعا، اعمال و اشغال سے متصف ہیں۔ جو کوئی چھوٹا بڑا ان کی صحبت میں جاتا ہے ان کے خلق و کرم، احسان و مروّت سے خوش ہو کر اُٹھتا ہے۔ میرے شیخ سے آشنا ہیں۔ جس وقت میں رستم خاں دکنی کے لشکر میں لشکری تھا تو انھوں نے مجھے ایک کام کے لیے دہلی بھیجا تھا۔ مدتِ دراز تک اپنے شیخ کے پاس سعادت اندوزی کرتا رہا کہ ان ہی انھیں ایام میں خان موصوف کو ایک نہایت اہم مہم پیش آگئی کہ قندھار جانا ہے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ اس مہم کے رفع کے لیے مستجاب الدعوات بزرگوں سے رجوع کر، کہ اس مہم کا کچھ سر و پیر نظر نہیں آتا ہے۔ اپنے شیخ سے دریافت کیا کہ کسی ایسے بزرگ کا پتا ارشاد فرمائیں۔ کہا شیخ بایزید اس کے لیے بہت خوب ہیں ان سے ملا اور مہم کو، خان کی جانب سے عرض کیا کہ دعا فرمائیں۔ پہلے کہا کہ کل آنا تا کہ اس رات کو اس سلسلے میں مجھ پر جو ظاہر ہو تجھے بتاؤں۔ میں نے قبول کر لیا۔ پھر خود سے کہا کہ عصر کا وقت ہو گیا ہے بہتر یہ ہے کہ نماز ادا کر کے جاؤں۔ جب ہم عصر کی نماز سے فارغ ہوئے وہ اور ان کے خادم سجدے میں چلے گئے اور بہت دیر

تک سجدے میں رہے اس کے بعد سر اُٹھایا کہا کہ تمھارے جواب کے لیے جو میں نے کل کا وعدہ کیا تھا اسی وقت سجدے میں مجھ پر کھُل گیا ہے وہ یہ ہے کہ تمھارے حاکم (خان) اس سے نجات پائیں گے۔ تم خان کو لکھو کہ سارے صلحا کو جمع کر کے سورہ اخلاص کا ختم صغیر کرائیں اور صدقہ دیں۔ جب میں نے یہ بات خان موصوف کو لکھی اس پر عمل کیا، پشاور تک ہی پہنچے تھے کہ وہیں سے وہ مہم ختم ہوگئی اور واپس پھر مراد آباد آ گئے۔ میں نے ان کے بعض اصحاب سے معلوم کیا کہ یہ جو تمھارے شیخ نے صبح کی اور عصر کی نماز کے بعد سجدہ لازم کر رکھا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ کہا۔ اس سجدے کو سجدۂ نیاز کہتے ہیں اور مستقل ان دونوں اوقات میں حضرت غوث اعظم کی جناب میں نیاز کامل بجالاتے ہیں اور سجدے میں آنحضرت کے اسمائے گرامی پڑھتے ہیں۔ ایک بار ان کے ایک مرید نے جو پاگل ہو گیا تھا ان کے بارہ سال کے لڑکے کو اپنے گھر ایک تقریب میں ضیافت کے لیے لے جا کر اس کا بند بند خنجر آبدار سے جدا کر دیا اور ہر طرف پھینک دیا۔ بادشاہ نے اس قاتل کو پکڑوا کر آپ کے حوالے کر دیا کہ قصاص میں اس کو قتل کر دیں۔ انھوں نے کہا "از کشتنِ او مقتول نخواہد زیست" (اس کے مارنے سے مقتول زندہ نہیں ہو جائے گا۔ اُسے آزاد کر دیا اور صبر اختیار کیا۔

شیخ حبیب محمد دہلوی

پیدائشی نیک اور بہت خوش اخلاق تھے۔ غربت، شکستگی اس سے بھی عالی تر رکھتے تھے۔ ان کا طریقہ سنیہ اولیائے گذشتگان کی یاد دلاتا ہے۔ شروع میں جب میں اپنے شیخ کی خدمت میں سعادت اندوز تھا تو انہیں دیکھا کرتا تھا کہ کبھی کبھی میرے شیخ کے پاس آتے اور راتوں کو ٹھہرا کرتے اور کبھی میرے شیخ ان کے پاس جاتے تھے میں بھی ہمراہ ہوتا تھا۔ عجیب پر لطف صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ اکثر وقت رات کو عبادت میں گزارتے تھے۔ کبھی کبھی یہ دولت شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے روضے میں میسر آتی تھی۔ تمام رات ذوق و محبت کی ایسی گفتگو کرتے کہ اس سے اچھی کی کہیں توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسی میں صبح ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں، میں اپنے شیخ کے حیرت ناک اور ہیجان آمیز حالات دیکھ کر حیران ہوتا تھا کی ایسے احوال اور واقعات میں نے کسی شیخ کے نہ دیکھے تھے۔ بلکہ کسی کے سنے بھی نہ تھے۔ اس کا مجمل حال خاتمے میں آئے گا۔ انشاء اللہ سبحانہ۔

شیخ حبیب محمد نے ہر بدھ کے دن اور رات کو شیخ نظام الدین اولیاء کے روضے میں گزارنا خود پر لازم کرلیا تھا۔ ایک بار وہیں چلّے میں بیٹھے اور بہت ہی اچھے احوال بہم پہنچائے اور اسی چلّے میں 1040ھ(1630) میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کی قبران کے گھر کے نزدیک ہے۔ آج شیخ رحمت اللہ جو'اخیا'' سے معروف ہیں ان کے اقرباء میں سے ہیں اور شیخ یحییٰ گجراتی کے مرید ہیں۔ وہ غیر شادی شدہ اور نیک مردانِ خدا میں سے ہیں۔ غربت، شکستگی ان کے چہرے سے ظاہر ہے۔ انھوں نے بھی رات کو روضے میں رہنا خود کے ذمے لازم کرلیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے جو کچھ پہنچا شیخ نظام الدین اولیاء کی عنایت سے ہے۔ اپنے پُرانے دوستوں کے ساتھ وفا کا برتاؤ کرتے ہیں۔ جو راستہ کہ انھوں نے اپنے لیے اختیار کیا ہے وہ کہیں نہ دیکھا نہ سُنا۔ کہتے ہیں کہ ایک رات کو تنہا بیٹھے ہوے تھے وہ 27 ویں رجب کی رات تھی۔ اچانک غیب سے روشنی ظاہر ہوئی کہ سارے عالم کو روشن کردیا ایسی کہ اس میں کلام مجید کے الفاظ صاف پڑھے جاسکتے تھے اور لمحے میں غائب ہوگئی۔ غالباً شب قدر کا نور ہو۔ واللہ اعلم۔ میرے والد فرماتے ہیں کہ میں نے سن رکھا تھا کہ جو کوئی چالیس بدھ بلا ناغہ شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضر ہو جو مراد بھی رکھتا ہو حاصل ہوگی۔ میں جس زمانے میں کٹرہ شیخ فرید بخاری کی سرائے کا داروغہ (ناظم) تھا ایک مطلب (مراد وصول حق ہے) عزیز کی غرض سے چالیس شنبوں تک لگاتار اس مقام روضہ شیخ نظام الدین اولیاء پر حاضر ہوا۔ دس ماہ کی اس مدت میں سخت ہوا کے جھکڑ، بادو باراں، راہ کے بہت سے موانع شدیدہ پیش آئے لیکن میں رُکا نہیں۔ آخر وہ مطلب حاصل ہوگیا۔ (انتہیٰ) میں بھی اس زمانے میں جبکہ اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی رہا کرتا تھا اکثر چہار شنبے کو شیخ نظام الدین اولیاء کی قبر کی زیارت کے لیے پہنچا کرتا تھا۔ کبھی تمام رات روضے میں گزارتا تھا۔ وہاں میں ایک سفید داڑھی والے ہندو کو دیکھا کرتا تھا کہ تمام رات شیخ نظام الدین کی قبر کے مقابل کھڑے ہوکر رات گزار دیتا تھا اور صبح کو چلا جاتا تھا۔ اس کا نام داس تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ وہ شروع حال میں غریب آدمی تھا جب سے اس نے ہر پنج شنبے کی رات کو اس روضے میں کھڑے ہوکر گزارنی شروع کی ہے کوئی دن اس سے ناغہ نہیں ہوا ہے۔ اب مالدار ہوگیا ہے اور جمعیت صوری اسے حاصل ہوگئی ہے۔ ''رشحات'' میں ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ مبادیٔ حال میں جب ولایت شاش میں

رہتے تھے شیخ ابوبکر قتال شاشی کی قبر پر مستقل حاضری دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضرت شیخ روحانی طور پر میرے بہت معاون اور مددگار رہے ہیں۔ منقول ہے کہ ایک دن اسماعیل اتا کہ جن کا ذکر خواجہ احمد بسولی قدس سرہٗ کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے شیخ ابوبکر قتال شاشی کی قبر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ وہاں کے کسی آدمی سے معلوم کیا کہ شیخ کی وفات کو کتنے دن ہو گئے ہیں۔ کہا۔ 38 سال۔ یہ سن کر شیخ اسماعیل اتا نے کہا کبھی کے گزرے ہوئے کسی کے کام نہیں آتے۔ اس بات کے کہتے ہی ایک تنکا اُڑتا ہوا آیا اور شیخ اتا کی آنکھ میں گر گیا۔ ہر چند کوشش کی باہر نہ نکلا۔ ان کی آنکھوں میں چبھتا رہتا تھا۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ وہ آنکھ ضائع ہو گئی۔

شیخ قائم محمد

بن شیخ طٰہٰ، بامروت، صاحب فتوت و معاملت اور جوان تھے۔ شروع میں وہ میرے شیخ کے پاس استفادۂ علمی کرتے تھے۔ رات جامع مسجد فیروزی کے حجرے میں جمعیت کے ساتھ گزارتے تھے۔ اسی اثنا میں اس راہ فقر و درویشی کی طلب ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ میرے شیخ سے ہی ذکر باطن کی تلقین حاصل کی اور اس طریق کی کافی مناسبت بہم پہنچائی اور بہرہ ور ہوے۔ جب ان کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو ان کے سجادہ نشین ہوے۔ طریقۂ توکل میں اپنے والد جیسے تھے اور اخلاق و فتوت میں ان سے بہتر تھے۔ ان کا آبائی سلسلہ چشتیہ ہے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ طریقۂ نقشبندیہ کی بوجہ احسن رعایت بجالاتے۔ اس سب کے ہوتے مکاتیب میں اپنا نام صرف ''قائم بہاء الدین'' لکھتے۔ اپنے آباے کرام کے طریقے پر کسی کی تعظیم کے لیے نہ اُٹھتے تھے۔ لیکن جب میرے شیخ کو دیکھتے تو اس طرح استقبال کرتے اور ایسی مشایعت کرتے کہ دونوں نسبتوں کی رعایت ملحوظ خاطر ہوتی۔ میرے شیخ کے مقبول نظر تھے۔ میں نے ان کی رفاقت میں دہلی کی بہت سیر کی ہے۔ اور مشائخ کبار کی قبروں کی زیارت کی ہے۔ کہتے تھے کہ ایک بار مجھے گرم ہوا کے موسم میں ٹھنڈے پانی کی خواہش ہوئی۔ پانی ٹھنڈا کرنے کے آلات (شورہ اور برتن) اکٹھے کیے اور پانی ٹھنڈا کرنے میں لگا۔ اسی اثنا میں میرے والد وہاں سے گزرے مجھے اس کام میں دیکھا تو فرمایا۔ ''بابا فقیروں کو اس قسم کی چیزوں سے کوئی مناسبت نہیں۔'' اسی وقت ادباً فوراً کھڑا ہو گیا اور وہ کام

چھوڑ دیا۔ جب والد دوسری جگہ چلے گئے تو مجھے جوانی کی خواہشوں نے نہ چھوڑا کہ اُسے بالکل ترک کر دیتا۔ پھر اسی کام میں لگ گیا۔ ہر چند قصد کیا تازہ پانی لیا اور شورہ کئی مرتبہ اس میں ڈالا بالکل ٹھنڈا نہ ہوا اور اس کی حرارت میں بالکل فرق نہ پڑا بلکہ اس سے میرا دل ٹھنڈا ہو گیا وہ طلب ہی نہ رہی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرے والد کا تصرف باطنی تھا۔ ایک بار انھیں طاعون کا مرض ہو گیا۔ بے ہوش ہو گئے بس اسی بے خودی میں اوراد وظائف چھوٹ گئے۔ اسی میں 1067ھ (1657) میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے والد دادا اور خود ان کی قبر مسجد کے سامنے ان کے دروازے پر ایک گنبد میں ہے۔ میں نے فی البدیہہ ان کی تاریخ وصال کہی۔ ''آہ شیخ قائم''۔

شیخ محمد (شیخ درویش محمد[1]) وشیخ شاہ محمد

یہ تینوں حضرات آپس میں بھائی اور شیخ عادل کے پسر ہیں۔ درمیانے بھائی درویش محمد کو میں نے نہیں دیکھا کہتے ہیں کہ طریقہ فقر، قناعت وتوکل اور استقامت علی الدین میں یگانہ روزگار تھے۔ راہِ سلوک میں ریاضت ومجاہدے اور مشاہدے میں بھی بے نظیر تھے۔ ان کا 1008ھ (1600) میں انتقال ہوا۔ قبر ان کے دروازے پر ہی ہے۔

شیخ محمد جو سب سے بڑے بھائی تھے، صاحب احوال واخلاق اور ستودہ صفات بزرگ تھے۔ وہ اپنے والد کے مرید ہیں۔ اپنے والد سے ہی اس راہ کی تعلیم اور فیض پائے ہوئے ہیں۔ میں نے انھیں اُن کے پُرانا بانس کے مکان میں چند بار دیکھا ہے۔ مجھ پر لطف وعنایت کی نظر تھی۔ ان کے پسر شیخ امام جن کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا کی شادی میں میر سید فیروز، شیخ مصطفیٰ، میں اور فرید آباد کے دوسرے بھائی برادر حاضر ہوے تھے۔ اس وقت دلہن کو رخصت کرتے وقت گانے والیوں کے گانے کی آواز سن کر ان شیخ محمد کو ذوق ہو گیا، روتے تھے اور فریاد کرتے تھے۔ ان کے اس حال کو دیکھ کر سارے خوشی منانے والے رو رہے تھے، میں بھی ان رونے والوں میں شامل تھا۔ وقت حد درجہ خوش تھا۔ اس وقت جو مضمون دل میں جوش مار رہا تھا اس کلام کا صرف مطلع ہی اس وقت یاد آیا کہ

1 یہ نام نسخۂ ندوہ اور اسی نسخہ کے متن سے اضافہ کیا گیا ہے۔

دوستاں را گریۂ شادیست، بر رخسارہا یا کہ شبنم اوفتادہ بر سر گل زارہا[1]

ان کی وفات 1032ھ (1623) میں ہے اور قبر بھی مسجد کے سامنے دروازے پر ہی ہے۔

شیخ شاہ محمد اپنے بھائی درویش محمد کے مرید ہیں۔ مستقیم الحال، صاحب ذوق وشوق ہیں۔ شروع میں لشکری تھے۔ بڑے خوش منظر، صاحب فراست، فہیم اور مردانہ صفات کے حامل شخص تھے۔ انھیں اس بات کی مہارت تھی کہ تمام ہتھیار لگائے ہوئے بغیر پائیدان پر پیر رکھے اور زین کو پکڑے گھوڑے کی پیٹھ پر کود کر سوار ہو جاتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سنو کہ وہ میدان میں بغیر زہ کی ہوئی کمان کو کہیں تیر کو کہیں اور شست کو کہیں رکھتے۔ گھوڑے کو تیز دوڑاتے۔ گھوڑے پر چڑھتے چڑھتے کمان کو ایک جگہ سے اُٹھاتے اور تیر کو دوسری جگہ سے اور شست کو تیسری جگہ سے۔ کمان پر شست چڑھاتے اور تیر سے جہاں نشانہ لگانا ہوتا نشانہ لگاتے تھے کبھی کبھی نشانے کے دو ٹکڑے بھی کر دیتے تھے۔ اسی حال میں تھے کہ جذب الٰہی نے آکر ان کی یہ سب شوخیاں ختم کر دیں اور سب کچھ اللہ سبحانہ کی راہ میں ترک کر کے پاک وصاف ہو کر اس راہ میں عجز وغربت کی راہ سے آئے نہ کہ حول وقوت لیے ہوئے۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ عبداللہ منازل فرماتے تھے کہ جس نے اس راہ میں اپنی طاقت وقوت پر بھروسہ کیا۔ اپنی کارکردگی پر نازاں ہوا، رسوا ہو جاتا ہے اور جو اپنی کمزوری ناتوانی اور ضعف کا اقراری ہوا اور اللہ تعالیٰ سے طاقت وقوت کی استدعا کرتے ہوئے داخل طریقہ ہوا۔ قوی ہو جاتا ہے۔ (یعنی نیازمندی خدمت گزاری اور عقیدت سے آئے نہ کہ دعویٰ کرتا ہوا خودی اور طاقت دکھاتا ہوا آئے)۔ (انتہی) آج شیخ شاہ محمد کو فقر وتوکل اور انزوا (گوشہ نشینی) کی زندگی گزارتے ہوئے بارہ سال ہو گئے کہ ثابت قدم ہیں اور کبھی کسی امیر وغریب کے دروازے پر بلکہ مشائخ کی قبور کی زیارت کے لیے بھی کہیں نہیں جاتے۔ میرے شیخ کے نیازمند ہیں۔ مخلص ہیں۔ میرے شیخ ان کو فقرا باب اللہ میں شمار کرتے ہیں اور خوب تعریفیں کرتے ہیں۔ (کہ وہ صرف ایک اللہ کے در کے بھکاری ہیں) ایک بار میرے شیخ فرید آباد سے اپنے گھر آ رہے تھے چونکہ ان کا گھر راستے میں تھا میں نے عرض کیا کہ انھیں (شیخ شاہ محمد کو) اپنے قدوم میمنت لزوم سے مستفید فرمائیں۔ پسند فرمایا اور ان کے گھر تشریف لے گئے۔ انھوں نے اس قدر نیازمندی،

1 دوستوں کے رخساروں پر یہ خوشی کے آنسو ہیں یا کہ پھولوں پر اوس بکھری پڑی ہے۔

شکستگی، صدق واخلاق دکھایا اور اپنی عاجزی اور فقر کا ایسا مظاہرہ کیا کہ میرے شیخ مسرورالوقت ہو گئے۔ ان کی اس روش کو بہت سراہا کہ جس شکستگی کی اس راہ میں ضرورت ہے انھیں حاصل ہے۔

در راہ ما شکستہ دِلی می خرند و بس بازار خود فروشی ازاں راہِ دیگر است[1]

انھیں ابتداے جوانی سے مجھ سے ربط واخلاص اور محبت ہے۔ جوانی کے دنوں میں ہم دونوں نے دہلی اور فرید آباد کی بہت سیر کی ہے۔ بڑی اچھی صحبتیں گزاری ہیں۔ دونوں نے ساتھ ساتھ تیر اندازی قواعد وضوابط کے ساتھ سیکھی ہے۔ جب سے ہم نے لشکر کی نوکری ترک کی ہے خوب ملاقاتیں رہتی ہیں۔ آپس میں مراسلت اور مکاتبت بھی رہتی ہے۔ ان کی دُعا اور توجہات میں تاثیر ہے۔ بہت سے محتاجوں کے ان کی دُعاؤں سے کام بنتے ہیں۔ ''اسراریہ'' کی تکمیل کے چار یا پانچ سال بعد وہ بیمار پڑ گئے۔ میں عیادت کے لیے پہنچا۔ جب واپس ہونے لگا تو شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے عرس کی باتیں بڑے انبساط وسرور کے عالم میں کرنے لگے اور میرے شیخ کو بہت یاد کر رہے تھے۔ اسی بیماری میں ایک دن نہایت فصیح انداز میں کلمۂ طیبہ تین بار پڑھا اور چل دیے۔ جمعرات کا دن ماہ ربیع الآخر کی دوسری تاریخ 1072ھ (15/اکتوبر1661) تھی۔ ان کی قبر بھی ان کے دروازے پر ہے۔

شیخ کریم محمد دہلوی

شیخ طٰہٰ کے مرید اور ان کے عزیز ہیں۔ بڑے عابد و پارسا تھے۔ ریاضت ومجاہدے کا نور ان کے چہرے سے جھلکتا تھا۔ غربت اور مسکینی کا لباس ان کے تنِ مبارک پر درست وزیبا لگتا تھا۔ اپنے شیخ سے انھیں خوب حصہ بزرگی پہنچا تھا۔ مجھے جب بھی ان سے ملاقات کا اتفاق ہوتا ایسی گرم جوشی سے جس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا پیش آتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے شیخ کے انتقال کے بعد شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار کے پاس چلّہ کیا اور نہایت قلیل غذا کے ساتھ، آخر میں بالکل ہی کھانا ترک کر دیا۔ حد درجہ ضعف ونا توانی ہوگئی لیکن انھیں اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ مستقل مزاج اور مستقیم الحال رہے۔ حتیٰ کہ اور بھی ضعیف ونحیف تر ہو گئے۔ اسی حال

---

1 ہماری راہ میں تو بس ٹوٹے ہوئے دلوں کی خریداری ہوتی ہے، غرور وناز کا بازار اس راستے سے الگ ہے۔

میں شعبان کے مہینے میں 1054ھ (1644) میں دنیا سے چلے گئے ان کی قبر بھی پُرانا بانس دہلی میں ہی ان کے دروازے پر ہے۔ روایت ہے کہ ایک درویش اپنے شیخ کی وفات کے بعد شیخ کبیر کلہ رواں کے پاس آیا اور مرید ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ شیخ نے اس سے پوچھا کہ تمھارے پیر تم سے کس کام کو کرنے کو فرماتے تھے۔ کہا ہر سال چلے میں بٹھاتے۔ صرف چالیس قرنفل (لونگوں کے ساتھ) کہا کہ میں تجھے چالیس مرغ اور ان کے مصالحے کے ساتھ بٹھاؤں گا۔ جب چلے میں بٹھا دیا تو ہر روز ایک مرغ اس کے مصالحے اور روٹی اس کے کھانے کے واسطے دیا جاتا۔ اسی چلے میں اس کا کام پورا ہو گیا۔ ہاں ہاں یہ کام محض شیخ کامل کی توجہات سے انجام کو پہنچتا ہے نہ کہ چلوں سے۔

آنکہ بہ تبریز، دید یک نظر شمس دیں　　سخرہ کند بردہہ طعنہ زند بر چلہ [1]

خواجہ بیرنگ نے فرمایا ہے کہ حضرت خواجہ احرار نے فرمایا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی پر صفت ارادہ سے تجلی نہ کرے تو کوئی نہ کسی کا مرید ہو نہ راہ سلوک طے کر سکے۔ اہل اللہ کے رسائل میں بھی یہی مذکور ہے۔ اللہ سبحانہ کی جانب سے ارادہ ہونا ہی بہت بڑی چیز ہے۔ (اذا اراد شیئاً قال لہ کن فیکون) تب ہی ان بزرگواروں کی ارواح طیبہ سے دُعاؤں اور استقامت کے لیے درخواست کی جاتی ہے۔

بے عنایت حق و خاصانِ حق　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق [2]

وادیم نشاں از گنج مقصود تُرا　　گر ما نرسیدیم تو شاید برسی [3]

شیخ محمد و شیخ پیر محمد

شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیشری قدس سرہٗ کے نواسے ہیں۔ صاحب اخلاق و مروّت ہیں۔ صاحب صلاح و معاملات شریعت و طریقت والے ہیں۔ دونوں نیک لوگوں کے طور طریقے رکھتے ہیں۔ شیخ پیر محمد نے

1 ہم نے تبریز میں شمس الدین تبریزی کی نظر کا جو کام دیکھا وہ عشرے اور چلے کی عبادت پر طعنہ زن ہے۔

2 بغیر عنایات حق و خاصانِ حق اگر کوئی فرشتہ بھی ہو تو اس کا نامۂ اعمال سیاہ ہے۔

3 ہم نے تجھے گنج مقصود کا پتا بتا دیا۔ اگرچہ ہم نہ پہنچ سکے شاید تو پہنچ جائے

"اسراریہ" کے اتمام کے سال 1069ھ (1659) میں انتقال فرمایا۔ ان کی قبر شیخ اللہ بخش گڑھ مکٹیشری کے روضے کے دروازہ پر ہے۔ وہ میرے شیخ کے نیاز مندوں میں سے تھے۔ جب بھی دہلی جاتے، میرے شیخ کی صحبت کو نعمت شمار کرتے۔ میں ہر سال جب بھی سنبھل سے اپنے شیخ کی خدمت میں آتا جاتا تھا راستے میں شیخ اللہ بخش کی قبر کی زیارت سے مشرف ہوتا تھا۔ ایک دن شیخ پیر محمد نے مجھ سے کہا کہ اپنے شیخ کی کوئی بات سناؤ۔ میں نے کہا۔ اے شیخ اس عارف باللہ کا حال حقیقی کسی طور بھی ہم ناقصوں کی سمجھ میں نہیں آتا واللہ یہ بات تکلف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اس یقین سے

"ہیچو او بے راسزد تعریف او[1]"

لیکن اپنی سمجھ کے مطابق ہر شخص کو ایک حسن ظن ہوتا ہے جیسا کہ میں نے اپنے شیخ کے ذکر میں بیان کیا ہے مجملاً کہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے فلاں الحمدللہ اب میری دل جمعی ہوگئی ہے کہ بعض اُن عام لوگوں سے جنھوں نے اللہ کے دوستوں کے طریقوں کا طریقہ اپنے مزاج سے ہٹا ہوا دیکھا تھا ان کے بارے میں، میں نے بھی کچھ نامناسب سن رکھا تھا۔ اس سے میرے دل میں ایک قسم کا انکار قرار پا گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ دانا حضرات، اللہ کے دوستوں کو دوسرے رنگ میں دیکھا کرتے ہیں اور نادان دوسرے انداز سے۔ دانا سیدھے راستے پر چلتا ہے اس لیے دوستی میں راسخ ہوتا ہے لیکن ناسمجھ ٹیڑھی راہ پر گامزن ہوتا ہے اس لیے انکار میں پختہ ہوتا ہے۔ عارف رومی قدس سرہٗ نے مثنوی میں کہا ہے۔

دید احمد را ابو جہل و بگفت　　زشت نقشے در بنی ہاشم شگفت

گفت احمد مر و را کہ راستی　　راست گفتی گرچہ کار افراشتی

دید صدیقش بگفت اے آفتاب　　نے ز شرقی نہ ز غربی خوش عناب

گفت احمد راست گفتی اے عزیز　　کاے رہیدہ تو ز دنیاے بچیز[2]

1　کوئی اُن جیسا ہی ان کی تعریف کرنے کا سزاوار ہے۔

2　ابو جہل نے حضور (ﷺ) کو دیکھا تو بولا، بنی ہاشم میں یہ بدصورت پھول کھلا ہے۔ محمد الرسول اللہ نے اس کی اس بات پر فرمایا۔ تو نے سچی کہا اگر چہ بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُن کو دیکھ کر کہا آپ ایسا آفتاب ہیں جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ حضورؐ نے فرمایا اے عزیز تو نے سچ کہا۔

حاضران گفتند کاے صدرالوریٰ راست کو گفتی دوضد را گو چرا
گفت من آئینہ ام یزدان پرست گبر و مؤمن در من آن بیند کہ ہست [1]

ایک بار میں اپنے شیخ سے اجازت لے کر سنبھل آ رہا تھا۔ پانچ چھ منزلوں میں (راستے میں قیام کر کے) میں اپنے وطن سنبھل پہنچ گیا۔ ہر روز ہر منزل میں اسرار غیب کا کوئی نہ کوئی راز منکشف ہوتا تھا جو قابل تحریر تھا، میں نے اس کو ضبط تحریر میں لے لیا اور اس رسالے کا نام ''سفر در وطن'' رکھا۔ القصہ جب میں گڑھ مکتیشر پہنچا شیخ اللہ بخش کی قبر کی زیارت کو گیا۔ مجھے حال ہو گیا۔ اسی میں مراقب ہو گیا، گھڑی بھر کو مراقب رہا، تو صورتِ شیخ ظاہر ہوئی۔ دیکھا کہ شیخ ذات حق کے مراقبے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور آپ سے عجیب قسم کی کیفیت ظاہر ہو رہی ہے اور ان کی شکل شیخ محمد ان کے نواسے جیسی ہے۔ جب مجھے افاقہ ہوا تو میں نے شیخ محمد سے معلوم کیا کہ شیخ کی صوت کیسی تھی۔ (وہ بولے) میری طرح سانولے رنگ کی تھی۔ منقول ہے کہ شیخ اللہ بخش کاملین میں سے تھے۔ صاحب آیات ظاہرہ اور کمالات و کرامات باہرہ سے متصف تھے، جیسا کہ شیخ رفیع الدین کے ذکر میں گزرا۔ خواجہ بیرنگ نے سنبھل آتے ہوئے راستے میں شیخ سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے شیخ کی بہت تعریف کی اور ان کے جذبۂ حق کو بہت سراہا اور فرمایا شیخ جیسا ہندستان میں، میں نے کوئی نہ پایا۔ روایت ہے کہ شروع حال میں شیخ اللہ بخش طلب حق میں سنبھل پہنچے اور ایک مسجد میں ٹھہرے۔ ایک دن شیخ حاتم سنبھلی نے جو اعلم العلمائے وقت تھے ان کو دیکھا اور دریافت کیا تم کس جماعت سے ہو۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ انھوں نے پھر یہی سوال کیا، پھر جواب نہ دیا۔ تیسری بار معلوم کیا کہ اے نوجوان تیرے جواب نہ دینے کی کیا وجہ ہے؟ جواب دیا کہ میں جس جماعت میں تھا اس سے نکل آیا ہوں یعنی دنیاداروں سے لیکن جو میرا مقصد و مطلب ہے ابھی اسے نہیں پہنچا ہوں۔ پس خود کو کس میں سے کہوں؟ شیخ حاتم نے کہا۔ جس راہ میں قدم رکھا ہے، تم اس کی منزل مقصود کو پا چکے ہو۔ اپنے آپ کو پہنچے ہوؤں میں شمار کرو۔ آخر اُن کا کام طریقۂ شطاریہ میں سید قوام الدین کے خلیفہ شیخ مبارک کی صحبت میں انجام پذیر ہوا۔ ان کی دفات 9 رمضان 1002ھ (19 مئی 1594) ہے اور پوری صورت اخلاص ان کی تاریخ وفات ہے۔

---

1 حاضرین نے دریافت فرمایا۔ اے رسول اللہؐ فرمائیں کہ دونوں میں سے کون سچا ہے۔ فرمایا کہ میں تو خدا کا ایک بندہ ہوں جو آئینے کا حکم رکھتا ہے۔ کافر اور مومن کو مجھ میں وہی کچھ نظر آتا ہے جیسا وہ خود ہوتا ہے۔

خواجہ قطب حسن پوری

خواجہ بیرنگ کے خلیفہ شیخ عبدالغفور سنبھلی سے اپنی نسبت کو درست کرتے ہیں۔ شیخ آدم سنبھلی کے صحبت دار اور میرے شیخ کے شناساؤں میں ہیں۔ میرے شیخ انھیں نیک حضرات میں جانتے ہیں۔ علوم دین وتصوف، دونوں کے عالم ہیں۔ صفا و لطافت کا نور ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہت مستقیم الحال ہیں۔ اس راہ میں جو چیز چاہیے وہ استقامت ہی ہے قولہٗ تعالیٰ "فاستقم کما اُمرت" ("جیسا کہ تمھیں حکم ہے ویسے ہی جمو") "نفحات الانس" میں ہے کہ محمد ابن الفضل نے فرمایا وہ چیز جس کے ہونے سے تمام برائیاں نیکیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور جس کے نہ ہونے سے تمام نیکیاں آخرکار، برائیاں ہی بن جاتی ہیں وہ استقامت ہے۔ (انتہیٰ) میں ہر سال اپنے شیخ کی خدمت میں آتے جاتے راستے میں ان سے ملاقات کرتا ہوں۔ ان کے جمال حال سے صدق و راستی ظاہر و باہر ہے۔ جب کہ میں کتاب "اسراریہ" تالیف کر رہا تھا۔ میں نے ان کے حالات معلوم کیے تا کہ اس کتاب میں داخل کروں۔ انھوں نے بس یہی کلمہ کہا۔ حقیقت الحقائق کسی صفت کا نام نہیں۔ میرے شیخ نے اپنے رسالے "نور وحدت" میں لکھا ہے کہ جو کچھ بھی ادراک میں آئے اور جو ادراک میں نہ آئے سب وہی ہے۔ جسے وجود کہتے ہیں وہ اس کا ظہور ہے اور جسے عدم کہتے ہیں وہ اس کا باطن ہے۔ اول وہی۔ آخر وہی۔ ظاہر وہی۔ باطن وہی۔ مطلق (آزاد) بھی وہی ہے اور مقید ومتعین بھی وہی ہے۔ وہی کُل ہے وہی جُز ہے۔ منزّہ بھی وہی ہے مشبّہ بھی وہی ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ ہی سب کچھ ہے۔ سب کچھ سے پاک بھی ہے۔ سب کچھ اس سے تو ہے مگر سب کچھ وہ نہیں ہے۔ اس کا یہ اطلاق اس اطلاق سے جدا ہے کہ وہ عین ہمہ اشیا ہے۔ اس نسبت تک نہ کسی عقل کی رسائی نہ وہاں تک کشف وفہم کی پہنچ۔ اسی لیے " ویحذرکم اللہ نفسہٗ " آیا ہے۔ (انتہیٰ) "نفحات الانس" میں ہے کہ کبھی حقیقت الحقائق کسی آزاد کے ہاتھ سے کسی دوسرے اپنے بندے کو رہائی بخشتی ہے اور اس آزاد (نفس وشیطان) کی صورت میں ایسے موقع پر قوم صوفیہ کی نظر میں خود کو نمایاں کرتی ہے تا کہ دیدار کی مشتاق آنکھیں اسے دیکھ کر آرام پائیں۔ اس لیے کہ ایک آزاد کی حقیقت دوسرے آزاد پر آجاتی ہے۔ مگر یہ جب ہوتا ہے کہ کوئی اس غیر اللہ یعنی آزاد کو درمیان میں دیکھنا چھوڑ دے تو جتنا وسیلہ

درمیان سے اُٹھتا جائے گا حقیقت کی جانب بڑھتا جائے گا۔ جب وسیلہ بالکل اُٹھ جاتا ہے۔ کوئی بہانہ درمیان نہیں رہتا تو حقیقت الحقائق آجاتی ہے۔ آدمی کی کیا حقیقت ہے کہ وصل سے سرفراز کرنا آدمی کے بس میں نہیں۔ ایک کا دل اسباب میں پھنسا ہے دوسرے کی نظر حقیقت پر ہے وہاں سب وسیلہ اور بہانے کی کیا قیمت۔ (انتہیٰ)

حاجی عبداللطیف حسن پوری

شیخ جنید سندیلوی کے مرید، پُر ذوق وشوق بزرگ ہیں۔ نیک احوال اور شریعت وطریقت کی راہ میں مستقیم الحال۔ معاملت میں راسخ اور پسندیدہ ہیں، گفتگو میں شائستہ اور سچے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں شیخ جنید نے اپنی وفات سے تین روز پہلے مجھ سے کہا تھا کہ خانقاہ کی خدمت اپنے ذمے لے لے۔ میں نے کہا یہ بھاری بوجھ ہے اس کے اُٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ دوسرے کو حکم فرما دیجیے۔ شیخ نے دوبارہ فرمایا کہ بزرگوں کا وہ خرقہ جو ہم پہنتے ہیں پہن۔ میں نے کہا یہ بھی ویسی ہی بات ہے۔ اس کے بعد اپنی فرجی اتاری، مجھے دی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قصبہ سندیلے کے بیچ پہنچے، مجھے اپنی قبر کا نشان بتایا اور پھر آکر بیمار پڑ گئے اور تین دن کے بعد انتقال فرمایا۔ وہ 7/رمضان المبارک 1048ھ (2 جنوری 1639) کی تھی۔ اصحاب واعزہ غسل دینے کے لیے جمع ہوئے۔ جب نہلانے کے لیے تختے پر لٹایا تو فصیح زبان سے ''اللہ'' کہا۔ حیرت زدہ ہو کر سب حاضرین بولے یہ تو زندہ ہیں کیوں مضطرب ہوتے ہو۔ کفن دینے کے بعد بھی جب مسہری پر لٹایا تو اس وقت بھی کہا ''اللہ''۔ حاضرین اس دوبارہ کہنے پر اور بھی زیادہ حیرت میں پڑے، پھر تو کچھ دیر دفن کرنے میں کی اور محو حیرت بیٹھے رہے۔ اس کے بعد لے جا کر جو جگہ طے تھی دفن کر دیا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ شیخ کی وفات کے بعد ایک رات میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ بڑے لطف میں میرا بازو پکڑے ہوئے کوہ الوند کے اوپر لے گئے اور کھڑا کر دیا۔ وہاں بڑی عالیشان عمارات اور محلوں کے کنگرے نظر آنے لگے۔ جب میں جاگا تو میں نے اس کی تعبیر مکہ مدینہ سوچی اور ان کی وفات کے چالیس دن بعد حرمین محترمین کی زیارت کے لیے نکل پڑا اور تجرید کے قدموں پر دونوں مقامات کے دیدار کی سعادت ابدی سے مشرف ہو گیا۔ مکہ مکرمہ میں شیخ تاج الدین سنبھلی کی صحبت میں رہا۔ واپسی میں

سورت شہر میں ملک نصیرالدین نوساری کی جو کہ ایک کامل درویش تھے خدمت میں بھی رہا۔ ملک (موصوف) خاندانِ چشتیہ کے اس سلسلے سے ہیں جو شاہ عالم گجراتی سے متصل ہے۔ انھوں نے مجھے سعادت سے بہرہ ور فرمایا۔ میں نے اس سفر میں بہت کشادگی ملاحظہ کی۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک بار میں سورت میں دو آدمیوں کے ہمراہ ایک حجرے میں بیٹھا ہوا تھا اچانک اس حجرے کی چھت پھٹی اور اس میں سے دو مرد ظاہر ہوے ایک چھت پر رہا اور ایک نیچے آ گیا اور ہوا میں سیدھا لٹک گیا۔ لٹکنے والے سے چھت پر بیٹھے ہوئے نے دریافت کیا کہ وہ حاضر ہے۔ کہا ہاں حاضر ہے اور میری جانب اشارہ کیا۔ اس کے بعد اس راہ محبت الٰہی کی باتیں وصیت کے طور پر کہنی شروع کیں، اسی اثنا میں مجھ سے کہا تو کیا تمنا رکھتا ہے۔ میں نے کہا رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ آج کی شب شبِ قدر ہے اور اسی راہ سے واپس لوٹ گئے۔ مجھے یہ سب دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ ان دونوں نے جو میرے ساتھ بیٹھے ہوے تھے مجھ سے پوچھا کیا ہوا کیوں ہنسے۔ میں نے کہا اس سے جو تم نے دیکھا اور سنا۔ بولے ہم نے تو نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔ میں اس بات سے اور متعجب ہوا اور خاموش ہو گیا۔ اسی دوران دو آدمی میوہ ہائے خشک و تر سے بھرا ایک طبق لائے اور میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے طبق کو ایک طرف رکھ دیا تو انھوں نے کہا: ''کھا۔ یہی حکم ہوا ہے۔'' میں نے کھایا اور شکم سیر ہو گیا۔ اس سے میرا منہ بے حد میٹھا ہو گیا۔ حاجی عبداللطیف صاحب کا حسن پور کے کنارے پورب رُخا ایک بہترین مکان ہے۔ بڑی ہی دلکش جگہ ہے۔ میں اکثر حسن پور اور دہلی آتے جاتے ان سے ملاقات کیا کرتا ہوں۔ وہ محبت اور اخلاص سے پیش آتے ہیں اور اپنے شیخ کے اشعار اور ان کی حکایات سنایا کرتے ہیں۔ پشتوں میں ان کا کلام بھی ہے جو نہایت بامعنیٰ ہے..........

''اسراریہ'' کی تکمیل کے بعد سے وہ دہلی چلے گئے تھے وہیں بیمار پڑے اور 1071ھ (1661) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ قدم گاہ کے نزدیک ان کی قبر ہے۔

سید غریب حسن پوری

وہ اپنے والد سید مظفر سے نسبت کو درست کرتے ہیں۔ صادق القول اور راسخ الحال نوجوان ہیں۔ اس راہ کا بہت درد انھیں ملا ہے۔

درد تو باید دلم را درد تو لیک نے در خوردمن درخوردتو

درد چندانے کہ می دانی فرست تا بنوشم انچہ بتوانی فرست

کفر کافر را و دین دین دار را ذرۂ دردت دل عطار را[1]

ان کے دنیا میں ظاہری طور پر دو بھائی ہیں عاجز اور درویش نام کے اور دو باطنی بھائی عجز و درویشی نام کے ہیں۔ ان کا ظاہر تو ظاہر (یعنی عاجز و درویش) اور باطن (عجز و درویشی) سے پیوستہ ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ میں نے اس مقصد عظیم کا درویشی کی طلب میں دوسروں کی طرح کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالا میرا جو حصہ مقدر تھا مجھے گھر بیٹھے پہنچ گیا۔

آں را کہ درسرائے نگاریست فارغ است از باغ و بوستان و تماشاے لالہ زار[2]

''نفحات الانس'' میں ہے کہ صاحب ''کشف المحجوب'' فرماتے ہیں کہ میں نے خواجہ مظفر کو فرماتے ہوے سنا ہے کہ بندگان خدا کو جو چیز سفر کی گھاٹیاں طے کر کے شکستہ خاطری و خاکساری کی بدولت فضل الہی سے حاصل ہوتی ہے ہم نے اسے گھر کے کونے میں رہ کر ہی خانہ دل میں پالیا ہے۔

اپنے کمال پر مغرور لوگ ان کے اس قول کو دعویٰ باطل پر محمول کرتے ہیں حالانکہ یہ گمان خود ان کے نقص پر دلالت کرتا ہے کیوں کہ صدق سے کوئی بات کہنی خاص کر اہل دل کے اقوال کہ بطور تحدیث نعمت ہوتے ہیں نہ کہ کسی قسم کے دعوے کے قبیل سے۔ (انتہیٰ) اسی کتاب میں ہے کہ شاہ شجاع نے کہا ہے ''وجدنا فی القبا ما طلبنا فی العبا[3] ''ملا نستی تھانیسری ایک خوش گو شاعر تھے۔ ایک امیر نے ان کو بلایا۔ اسکے جواب میں انھوں نے اسے لکھا۔

---

1 میرے دل کو تیرا درد چاہیے صرف تیرا درد۔ ایسا درد جو تیری درگاہ کے لائق ہو نہ کہ ایسا جو میں نے تجویز کر رکھا ہے۔ جتنے درد بھی تیرے عالم میں ہوں اور تو بھیج سکتا ہے بھیج تا کہ میں نوش کرلوں۔ کافر کو کفر دے اور دین دار کو دولتِ دین بخش مگر عطار کے دل کو اپنی محبت کے درد کا کوئی ذرہ عطا فرمادے۔

2 جس کا محبوب اس کے گھر میں ہے وہ باغ و بوستان اور گلشن کی سیر و تماشے سے فارغ ہے۔

3 جسے ہم نے درویشی میں تلاش کیا وہ ہمیں تونگری میں ملا۔

بیروں نیامدہ ام ہیچ گہ زخانۂ خویش　　سفر چہ داند عنقا در آشیانۂ خویش
نمی پرم بہ پر وبال عاریت چوں تیر　　نشستہ ام چو کماں روز و شب بخانۂ خویش[1]

میں سال میں دو بار اپنے شیخ کی خدمت میں آتے جاتے سید غریب سے دو بار ملتا ہوں۔ جیسا کہ دوستی و اخلاص کا حق ہوتا ہے ان کی جانب سے دیکھتا ہوں۔ اور ان کی مروّت تصور سے بالاتر ہے وہ درو جو گہ وہ رکھتے ہیں وہ پوری طرح ان سے ظاہر ہے۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ الاسلام نے کہا کہ عبداللہ ابن عصام نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ہم فقراء جس مقصد کے در پے ہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ فرمایا کہ جب مخلوق کے ساتھ (معاملہ) ہو تو حق تعالیٰ سے شرمانا اور اس کی جانب کا خیال رکھتے ہوے حامی حق رہنا ہے۔ یعنی چاہیے کہ جب ظاہراً مخلوق کے ساتھ ہو باطناً حق کے ساتھ رہے۔ سبحانہ تعالیٰ۔ اور اس بات سے شرم کرنا کہ باطن بھی مشغول خلق ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا اور تشریف لے جانے لگے۔ میں بھی آپ کے قدم کے آثار پر چلتا چلا۔ پاس جا کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ کچھ اور زیادتی فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ جس وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو تو مخلوق پر بخشش اور مہربانی کر اور ان کے حق کو ضائع نہ کر۔ (انتہیٰ)

ایک دن میں اپنے شیخ کے ساتھ دہلی کی ایک تنگ گلی سے گزر رہا تھا۔ دوسری طرف سے ایک سوار سامنے آیا، مگر ادباً ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا اور میرے شیخ کو راستہ دیا۔ میرے شیخ نے اس سے معلوم کیا کہ آپ کون ہیں؟ کہا۔ عاجز۔ شیخ نے فرمایا جو کچھ درکار ہے وہ بس عجز ہی تو ہے۔ میں نے عرض کیا حسن پور کے سید غریب نام کے نوجوان ہیں، ان کے دو بھائی عاجز اور درویش نام کے ہیں۔ میرے شیخ نے فرمایا۔ ہاں میں انھیں خوب جانتا ہوں، بہت اچھے آدمی ہیں۔ جو غریب ہے وہ اچھا ہے اور جو اچھا ہوتا ہے وہ غریب ہوتا ہے۔ یہ بات ہر معاملے میں جاری ہے۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا۔ ایک زمانے میں، میں اس کو ڈھونڈھتا تھا خود کو پاتا تھا، اب خود کو ڈھونڈھتا ہوں تو اُسے پاتا ہوں۔ جب اس کو پالے گا خود سے چھوٹ جائے گا۔ مگر جب

1　میں کبھی بھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا ہوں میں تو عنقا کے مانند ہوں جس کو سفر کی خبر ہی نہیں ہوتی میں مانگے ہوئے بال و پر سے تیر کی طرح نہیں اُڑا کرتا میں تو کمان بنا روز و شب اپنے گھر میں رہتا ہوں۔

چھوٹے گا تب پائے گا۔کون سا معاملہ پہلے ہوتا ہے وہ جانے۔ جب وہ ظاہر ہوگا تو،تو نہ ہوگا۔ وہ تبھی ظاہر ہوگا جب تو چھپ جائے گا۔کون سا کام پہلے ہوگا وہ جانے۔ بایزید بسطامی فرماتے ہیں" میں جب تک خود سے نہ ٹوٹا اُس سے نہ ملا۔ جب تک اس سے نہ ملا خود سے نہ ٹوٹا،کون سا کام پہلے ہوا خدا جانے۔" شیخ ابوعلی سیاہ کہتے ہیں کہ ماوراءالنہریان کہتے ہیں کہ جب تک خود سے جدا نہ ہوگا اسے نہ پائے گا۔عراقیان کہتے ہیں کہ جب تک اُسے نہ پائے گا خود سے نہ چھوٹے گا۔ دونوں ایک ہی بات ہے چاہے پیالہ پتھر پر مارو یا پتھر پیالے پر۔لیکن میں عراقیوں میں سے ہوں کہ اللہ کی طرف سے سبقت زیادہ اچھی بات ہے۔ابوسعید خراز کہتے ہیں کہ جس نے یہ گمان کیا کہ وہ اپنی کوشش سے منزل مقصود کو پہنچ جائے گا تو اس نے اللہ پر بہتان تراشا اور جس نے مجاہدے اور کوشش کی نفی کی تو اس نے بے جا تمنا کی۔(انتہیٰ)

شیخ صادق حسن پوری

شیخ عبدالحیٰ بھٹھی کے مرید ہیں اور شیخ عبدالحیٰ شیخ احمد سرہندی کے خلیفہ ہیں۔ابتدا ترک و تجرد میں تھے کیا خوب رنگ بے تعلقی اور طور آزادگی رکھتے تھے۔آخر کار ایک عورت کی محبت میں مبتلا ہو گئے۔جب اس کے اشتیاق اور آرزو نے بہت سر اُبھارا تو اس سے نکاح کر لیا اور بچوں والے ہو گئے۔مگر اس بے تعینی کی حالت میں جو انھیں ایک بزرگ کامل سے ملی تھی ذرّہ برابر فتور نہ آیا۔آپ میرے شیخ کے محبین اور مخلصین میں سے ہیں۔ایک زمانے میں وہ میرے شیخ سے ربط باطنی طریق صحبت وخلوت میں ان کے دوسرے احباب کے لیے رشک کا سامان تھے۔وسعت مشرب کی بدولت بادشاہ کے مقربین میں ان کے مریدوں کی خاص تعداد پائی جاتی تھی۔وہ لوگ انھیں برکت کے لیے اپنے گھروں میں لے جاتے اور خدمات بجالاتے تھے۔مگر وہ ان سب باتوں سے بے پروا تھے۔ذرا سی دیر ٹھہر کر مجلس سے اُٹھ جاتے اور میرے شیخ کی خدمت میں پہنچ کر ان کے الطاف وعنایات بزرگانہ کے حق دار بنتے تھے۔میں تیس سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ان کو جانتا ہوں۔ان سے قربت وشناسائی ہے۔اس طویل مدت میں کبھی ساتھ رہے کبھی جدا رہے۔ابتدائی چند روز انھوں نے سنبھل میں بھی

گزارے ہیں۔ کیا ہی آزادمزاج اور پرسکون دل رکھتے تھے۔ ایک دن شیخ بہاء الدین بن شیخ محمود بنی اسرائیلی جو کہ نیک انسان تھے اور مطبوع طبع تھے۔ وہ اور میں یکجا بیٹھے تھے کہ شیخ صادق بھی آگئے اور بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ اچانک کھڑے ہوئے اور چل دیے۔ شیخ بہاء الدین نے تعجب کے ساتھ مجھ سے معلوم کیا کہ یہ کیسا سکوت اور کیسی خاموشی تھی کچھ بولے ہی نہیں۔ آئے اور ذرا دیر میں چل بھی دیے۔ میں نے کہا ان کی یہ خاموشی ہمارے تمھارے، کلام اور گفتگو سے بہتر ہے اور ان کا کلام ہماری تمھاری خاموشی سے بہتر ہے۔ انھوں نے میری یہ بات پسند فرمائی اور خاموش ہو گئے۔ ایک دن میں نے حکیم نور الدین کو کہ جن کی رباعی عبدالواحد سنبھلی کے ذکر میں گزری ہے دیکھا ایک خوش نما باغ میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے اشعار سننے کی فرمائش کی۔ کہا جس حال میں ہوں اس میں گفتگو اچھی نہیں لگتی اور ایک استاد شاعر کا شعر پڑھا۔

زہر کلام کلام عربی فصیح تراست　　مگر کلام خموشی کہ افصح از عربست [1]

میں نے کہا ہاں اس حال (قبض) میں کہ بات کرنا اچھا نہیں لگتا مگر پھر بھی سخن کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ وہ میری اس بات سے خوش ہو گئے۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ مولانا جلال الدین رومی کے ملفوظات میں ہے کہ جس وقت خواجہ حکیم سنائی حالت احتضار میں تھے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے تھے۔ حاضرین نے ان کے منہ پر کان لگائے سنا کہ یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

باز گشتم زانچہ گفتم زانکہ نیست　　در سخن معنیٰ و در معنیٰ سخن [2]

ایک عزیز یہ سن کر بولے۔ عجب حال ہے کہ وقتِ واپسیں بھی جو کہ وقت توبہ ہے، شعر کہہ رہے ہیں۔ (انتہیٰ) حکیم نورالدین کو میں نے'' گلستان شیخ سعدی'' کی عبارت سنائی۔ ''صحیح یہ ہے کہ بولنے کے موقع پر بولے اور خاموشی کے محل میں خاموشی اختیار کرے۔ قطعہ

1　ہر کلام سے کلام عربی فصیح ہے لیکن زبان خاموشی کلام عرب سے بھی فصیح تر ہے۔

2　میں ہر اس بے معنیٰ کلام سے توبہ کرتا ہوں جو مجھ سے صادر ہوا ہو اور ہر اس معنیٰ سے جس کی تائید میں کوئی قول بزرگاں نہ ہو۔

اگر چہ پیش خردمند خامشی ادبست　　بوقت مصلحت آں بہ کہ در سخن کوشی
دو چیز تیرہ عقل است دم فروبستن　　بوقت گفتن وگفتن بوقت خاموشی [1]

میں نے حکیم نورالدین کو ایک دلچسپ ورنگین عبارت سنائی۔ بہت خوش ہوئے اور خوب مجلس رہی۔
وہ حکایت یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک سادہ دل (بھولا) نوجوان ایک بزرگ کے یہاں نوکر ہوگیا۔
ایک دن لوگ ان بزرگ کو دعوت میں لے گئے۔ ان کی اہلیہ نے اس نوجوان کو پیچھے سے بھیجا کہ جا
اور چھپا کر دسترخوان کے ٹکڑے لے آ، کہ بچے بھوکے ہیں۔ وہ جوان گیا اور بھری مجلس میں کہ ابھی
دسترخوان مجلس میں بچھا بھی نہ تھا اپنے آقا سے باواز بلند کہا تمھاری بیوی نے بھوکے بچوں کے لیے
بچا ہوا طعام منگوایا ہے۔ یہ بات سن کر آقا شرمندہ ہوگئے اور سر جھکائے رکھا۔ کھانے سے فراغت
کے بعد جوان کو ڈانٹا اور کہا، بے وقوف اگر تجھے اس کام کے لیے بھیجا تھا تو ایک کونے میں بیٹھ جاتا،
لوگوں کے کھانے سے فارغ ہوجانے کے بعد یہ کام انجام دیتا۔ جوان نے کہا۔ اب تو مجھ سے خطا
ہوئی آئندہ آپ کے فرمان کے بموجب چلوں گا۔ پھر دوبارہ جب آقا کسی دعوت میں گئے اسی اثنا
میں ان کے پیچھے پڑوسی کے گھر میں آگ لگ گئی۔ ان کی اہلیہ نے جوان سے کہا جلدی جا اور آقا کو
بلا لا۔ جب جوان وہاں پہنچا تو ایک کونے میں آرام سے بیٹھ گیا۔ تب تک آقا کا گھر بھی جل کر
خاکستر ہوگیا۔ کھانے کے بعد اس کو منتظر بیٹھا دیکھ کر آقا نے خوش ہوکر پوچھا کہ کیوں آیا ہے؟
نوجوان نے آہستہ سے کان میں کہا کہ آپ کے پڑوسی کے گھر آگ لگ گئی ہے۔ آپ کی اہلیہ نے
مجھے تاکیداً بھیجا ہے کہ فوراً آپ کو بلالاؤں۔ لیکن میں نے آپ کی اس دن کے وصیت پر عمل کرتے
ہوئے آج جلدی نہیں مچائی۔

شیخ ابوتراب ٹھٹھی

شیخ محمد حسین دہلوی معروف بہ شاہ خیالی کے پوتوں میں سے کسی کے مرید ہیں۔ نیک
معاملت اور طریقت میں مستقیم الحال تھے۔ کمال درجے کی غربت اور شکستگی رکھتے تھے۔ میرے شیخ

1　اگر چہ عقلمندوں کے نزدیک خاموش رہنا ادب ہے مگر بوقت ضرورت بات کرنی ہی بہتر ہوتی ہے۔ دو
چیزیں عقل کی کالک ہیں۔ بولنے کے موقع پر تو چپ رہنا اور چپ رہنے کے موقع پر بولنا۔

کے شناساؤں اور نیاز مندوں میں تھے۔ وہ پوربی علاقے میں 1050ھ (1640) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ خیالی نے حرم مدینہ مبارکہ رسول اللہ ﷺ میں برسوں مجاورت اور مجاہدات کیے اور یمن کے مشائخ قادریہ سے تربیت اور اجازت حاصل کی تھی۔ حاجی شیخ عبدالوہاب بخاری جب دوسری مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے تو ان کو لوٹا کر ہندستان لے آئے۔ واپسی سفر ہندستان کے دوران ہندستان میں ایک فقیہ قاری ان سے ملے تا کہ ان سے بحث و گفتگو کریں کہ آپ خود کو کس لیے سماع میں مشغول رکھتے ہیں اور حسن صورت سے کیوں شغف رکھتے ہیں۔ اور سختی کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ انھوں نے کہا آپ کو ایسی گفتگو کا کیا حق ہے اور کیوں میرے مزاحم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں عالم ہوں۔ عالم کے لیے ضروری ہے کہ اہل بدعات کو امر بالمعروف کرے اور ہدایت وارشاد کی راہ دکھائے۔ انھوں نے کہا اگر آپ عالم ہیں تو ذرا بتائیں کہ ''ضرب'' کون سا صیغہ ہے۔ وہ فقیہ قاری ہنسے کہ (ابتدائی) بات معلوم کی۔ انھوں نے کہا میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دینا چاہیے۔ قاری صاحب نے غور کیا بہت عقل لڑائی مگر اس کا جواب نہ بن پایا۔ ساری معلومات اسی وقت ان کے ذہن سے جاتی رہی۔ بس شرمندہ ہو کر اتنا کہا کہ اُس وقت میرے دل (دماغ) سے نکل گیا ہے۔ آخرکار جب وہ قاری اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ آپ کا تصرف باطنی تھا تو بے قابو ہو کر ان کے قدموں میں گر گئے اور معذرت کی۔ اُسی دن سے صدق وارادت برتنے لگے۔ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ 944ھ (1586) میں شاہ خیالی کا انتقال ہوا اور ان کی قبر پرانی دہلی میں 'بدائع النزول' کے مقام پر ہے جو بجمنڈل کے نام سے مشہور ہے۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ۔ جوانی میں، میں علم کلام میں مشغول رہتا تھا۔ اس فن کی چند کتابیں بھی یاد کر لی تھیں مگر چچا مجھے اس سے منع فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن میرے چچا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے پاس آئے، میں بھی ان کے ساتھ میں تھا۔ مجھ سے کہا کہ حاضر (دل) رہ کہ وہ بہت جلد آنے والے ہیں جن کی دید سے اللہ تعالیٰ کی خبر ملتی ہے۔ ان کے دیدار کی برکات کا منتظر رہ۔ جب حضرت شیخ عبدالقادر قدس سرہٗ مجلس میں آکر بیٹھے تو میرے چچا نے عرض کیا۔ اے سیدی! میرا یہ بھتیجا عمر۔ علم کلام میں مشغول رہتا ہے، ہر چند، میں اس سے کہتا ہوں لیکن

باز نہیں آتا۔ شیخ نے دریافت کیا اے عمر! کون سی کتاب حفظ کر لی ہے۔ میں نے کہا فلاں فلاں کتاب حفظ ہے۔ اپنا ہاتھ میرے سینے پر مارا۔ خدا کی قسم ایک لفظ بھی ان کتابوں کا میرے یاد نہ رہا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے مسائل کو میرے ذہن سے نکال دیا۔ لیکن میرے سینے کو علم لدنی سے بھر دیا۔ میں ان کے سامنے سے اُٹھا تو فوراً انھوں نے اپنی حکیمانہ زبان سے مجھ سے فرمایا۔ '' ایے عمر انت آخر المشهورين بالعراق [1] ''

ابوتراب مدتوں ایک امیر کی صحبت میں رہے اور اپنے شیخ کے فرمانے پر محتاجوں کی کاربرآری میں کوشش کرتے۔ میں خود بھی انہی امیر کے لشکر میں لشکری تھا۔ ابوتراب سے ملاقات رہتی اور خوب مجلس رہا کرتی۔ وہ اچھا شعر کہتے تھے۔ ایک بار ایک غزل کہی جس کا بس آخری ایک مصرعہ مجھے یاد رہا وہ یہ ہے۔ مصرعہ

ع ''عشق آں جانی تُرابی را بگرد دوں گل شگفت [2] ''

ایک روز ہم دونوں میں کچھ من مٹاؤ ہو گیا اور میں نے ان سے کنارہ کر لیا۔ اس مدت میں میرے شیخ پے در پے مجھے معارف اور ذوقیات کی باتیں لکھتے رہتے تھے۔ اُسی دوران یہ خط لکھا تھا کہ

> اس مظہر الطاف الٰہی کے جمال باکمال کا اتنا مشتاق ہوں کہ اس کی شرح بیان سے باہر ہے۔ بعید نہیں کہ حقیقت حال کو دل جو کہ اپنی ایک زبان رکھتا ہے وہی تمھارے دل کے کانوں تک پہنچا دے۔ ہائے ہائے یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ یہاں تو دل ہی نہیں۔ کوئی حال نہیں۔ میرا دل تمھارا دل ہے۔ میرا حال تمھارا حال ہے۔ فقرہ ''انـا مـن اسهـری ومن اهویٰ انا'' میں کون ہوں؟ لیلیٰ۔ لیلیٰ کون ہے۔ ''میں ہوں'' (انتہیٰ)

اتفاقاً یہ کاغذ ان کے ہاتھ لگ گیا۔ پڑھا، اپنے شیخ کی وہ عنایات جو مجھ پر رہی ہیں ان کا میں نے ان سے ذکر نہ کیا تھا، معلوم کر کے حیرت میں پڑ گئے، میرے پاس آئے اور اس ماجرے کی معذرت چاہی۔ اس طرح وہ درمیانی دراڑ پٹ گئی۔ یہ معاملہ قصبۂ خوشاب میں 1039ھ (1630)

---

1 اے عمر! تو عراق کے آخری مشہور لوگوں میں سے ہے۔

2 اس محبوب۔ کے عشق نے ترابی کے لیے دنیا کو گل گلزار بنا دیا۔

میں پیش آیا۔ اس قصبے کے تمام سادات یا تو قاضی تھے یا مفتی یا مدرس۔ سب کے سب عالم فاضل لیکن سب وہم و دسوسے کی بیماری میں مبتلا تھے۔ ان کے احوال کو دیکھ کر ہم سب تعجب کرتے تھے۔ ان کی مجمل حکایت یہ ہے کہ ان میں سے تین آدمی ایک دن دریائے بھٹ پر گئے جو اس قصبے کے نزدیک ہے۔ اتفاقاً ایک کے سر میں درد ہونے لگا۔ اس نے کہا سر کا یہ درد پانی کی سردی کی تاثیر سے ہوا ہے۔ باقی دونوں بھی بولے تو ہمیں بھی سردی کا اثر ہو گیا ہوگا۔ تینوں ایک جگہ لیٹ گئے اور اپنے گھروں کو کہلا بھیجا کہ تین چار پائیاں اور بارہ مزدور بھیج دو کہ ہمیں یہاں سے لے جائیں۔ آخر مزدوروں نے ان سب کو ان کے گھروں پر پہنچایا۔ ایک دن سید گل محمد جو مدرسین کے صدر تھے کے سامنے ایک مسافر جنگل سے پیدل چل کر پہنچا اور کہنے لگا کہ آج رات میرا ایک ہم سفر پیاس سے مر گیا۔ سید گل محمد نے کہا اچھا پیاسا مر گیا۔ کہا۔ ہاں۔ اس دن سے ہی سید ہر رات کو پانی کا ایک برتن بھر کر رکھتے اور رات میں گھر کے سب خرد و کلاں کو جگا کر زبردستی پانی پلاتے۔ اسی طرح ان ہی سید گل محمد نے سنا کہ نوچندی کی رات کو امیر کے توپ خانے سے توپ چھوڑتے ہیں وہاں سے بھاگ کر میلوں دور چلے گئے تاکہ اس کی ہیبت ناک آواز ان کے کان میں نہ پڑے۔ حاکم شہر نے جب یہ بات سنی تو بہت ہنسا اور سید گل محمد کے داماد محمد مقیم سے جو کہ اس کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، سے کہا کہ سید کو حاضر کریں۔ کہا کہ آج رات ہرگز نہ آئیں گے کہ نوچندی کی رات ہے۔ کل بلا لاؤں گا۔ امیر نے کہا کہ اس وعدے کی سند لکھوا دیں۔ انھوں نے ایک تحریر لکھی اور اس پر قاضی، اہالی اور موالی کی مہر ثبت کر کے لائے۔ ایک رات کو یہی محمد مقیم اپنی چھت پر سو رہے تھے۔ انھیں خیال آیا کہ سوتے میں اگر خدانخواستہ کوئی کتا یہاں آ جائے اور مجھے کاٹ لے تو کیا ہوگا۔ اسی فکر میں تھے کہ اتفاقاً چھت کے نیچے سے کوئی کتا بھونکا۔ انھوں نے شور مچا دیا کہ مجھے کتے نے کاٹ لیا۔ ان کے گھر کے لوگ وہاں آئے ان کو کشاں کشاں نیچے لے گئے لیکن کہیں بھی ان کے جسم پر کتے کے کاٹے کا نشان نہ پایا۔ میں ان محمد مقیم سے خوب آشنا ہوں۔ خاقانی اور انوری کے اشعار خوب پڑھتے تھے۔ وہ اس دروازے سے جس میں امیر شہر کا چیتا بندھا رہتا تھا نہ جاتے تھے۔ اکثر میں ان کو اس دروازے سے اپنے ساتھ اندر لے جایا کرتا تھا۔ اوّل چند آدمی جمع ہو کر ان کو اپنے بیچ میں چھپا لیتے تھے تب کہیں بڑی مشکل سے اندر داخل ہوتے۔ جس شخص کا نام پلنگ

(چیتا) ہوتا اُسے بھی اپنے سامنے نہ رکھتے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اُسے پلنگ کہہ کر بلائے اور ان پر ڈر سوار ہو جائے اور کہتے کہ ''کیا ناموں کا قحط پڑ گیا ہے جو یہ نام رکھا ہے'' ان حضرات کے یہاں اس قسم کی چیزیں بہت دیکھی اور سنی جاتی تھیں جس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔

شیخ فیروز سنبھلی

شیخ عبدالواحد سنبھلی کے پوتے شیخ حسین کے مرید ہیں جو کہ سنبھل میں آرام فرما ہیں اور ان کا ذکر گزر چکا ہے۔ وہ ایک دراز قد نورانی طلعت، صاحب ذوق وسماع اور وجد و حال کے حال سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ عاجزی، خاکساری، غربت اور شکستگی ان سے ٹپکتی ہے۔ ان کے سماع میں بھی بڑی قوی تاثیر ہے۔ ان کا پیشہ کمانوں کی چوب تراشی ہے کہ لکڑیوں کو بنا سنوار کر کمانگروں کو دیا کرتے ہیں اور سرائے ترین (محلے) میں رہتے ہیں۔ جب بھی میری ان سے ملاقات ہوتی ہے اور میں اظہار نیازمندی کرتا ہوں وہ مجھ سے بڑے ادب اور نیازمندی سے پیش آتے ہیں اور جب بھی میں ان کے احوال باطن کے بارے میں استفسار کرتا ہوں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں تو ایک کمان تراشنے والا شخص ہوں، دور از کار، ناچیز مجھے احوال و واقعات کی کیا خبر، خود کو خوب چھپائے رکھتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ جیسے پہلے زمانے کے درویش لوگ اپنے احوال و واقعات، خوارق وکرامات کو مخلوق سے چھپایا کرتے تھے اور اپنی خواری اور بے اعتباری کے اظہار میں کوشاں رہتے تھے۔ اس زمانے میں بھی یہ لازم وواجب ہے کہ خود کو مخلوق کی نظر میں گرا دیں اور کسی حال وکیفیت کا اظہار نہ کریں۔ شیخ عبدالمومن سنبھلی کہتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے ایک کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ ایک نو شادی شدہ نو جوان شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدین میں تھا اس کو اپنی بیوی سے حد درجہ محبت تھی۔ دونوں اپنے دو منزلے پر من چاہی زندگی گزار رہے تھے اور داد عشرت دے رہے تھے۔ ایک رات کو اس کی بیوی حجرے سے باہر نکلی۔ کچھ دیر بعد اس نے مذاق میں اسے ڈرانے کے لیے کہا ''جھو جھو'' اسے پکڑ لے تا کہ یہ بات سن کر وہ دوڑ کر اس کے پاس آئے۔ جب کافی دیر گزر گئی مگر اس کا کوئی اثر نہ دیکھا نہ پیروں کی آہٹ ہی سنی، خود باہر آیا چھت پر بیت الخلا میں تلاش کیا وہاں اسے نہ پایا۔ پھر

اِدھر اُدھر دیکھا مگر کہیں نہ ملی ، زینے کی زنجیر بھی لگی دیکھی، گھبرایا ہوا نیچے آیا، ماں باپ کو جگایا، دونوں اس کی آواز پر اُٹھ گئے ۔ تمام گھروں میں پڑوس میں اور محلے میں بہت ڈھونڈھا کہیں اس کا نشان نہ ملا ۔ تب نہایت درجہ مضطرب اور سراسیمہ ہوکر اپنے شیخ کی خانقاہ میں دوڑا ہوا گیا ۔ فریاد و فغاں کرنے لگا اور کہا ۔ اے شیخ خدا کے واسطے مجھے تھامیں اور میری گم شدہ (بیوی) کو پھر میرے پاس واپس پہنچائیں ورنہ میں آپ کے در پر ہی جان دے دوں گا ۔ شیخ نے معلوم کیا ۔ کیا ہوا؟ نوجوان نے سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ شیخ ایک لمحے کے لیے متوجہ ہوئے اور فرمایا ۔ جا، جا کر سوق بازار میں بیٹھ، صبح کے وقت گانے بجانے والیوں کا ایک مجمع کہیں سے آرہا ہوگا ان کے ساتھ ایک مزدور ہے جو مخنث بنا ہوا ہے، ڈھول اور ساز لیے ہوئے آئے گا، اس سے اس مہم کے سر کرنے کی درخواست کرنا، بس تیرا مقصود حاصل ہو جائے گا ۔ وہ جوان اس جگہ آدھی ہی رات میں جا کر بیٹھ گیا اور جیسا کچھ شیخ نے فرمایا تھا ظاہر ہوا ۔ جوان نے اس مخنث کے آگے جا کر بڑی عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ اپنا مطلب عرض کیا ۔ وہ بولا ۔ اے بھائی! اگر مذاق ہی کرنا ہے تو ان گانے والیوں سے کر مجھ کمزور عاجز مزدور سے کیا چاہتا ہے ۔ اس نوجوان نے کہا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں حضرت نظام الدین اولیاء کے فرمان سے کہہ رہا ہوں ۔ مزدور نے یہ بات سن کر اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہا ۔ افسوس حاسدین کسی کو اس حال میں بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرتے اور کہا تا کیا چاہتا ہے ۔ کہا اپنی بیوی چاہتا ہوں ۔ انھوں نے چند جملے ایک کاغذ میں لکھ کر اس جوان کو دیے کہ فلاں صحرا میں جا کر فلاں سمت کو دکھانا ۔ اس وقت تو کچھ چھپی مخلوق دیکھے گا پھر اپنی مراد حاصل کرنا ۔ اس جوان نے اس کے کہنے کے مطابق عمل کیا ۔ فوراً جنوں کا لشکر اسی کرّ وفر اور طمطراق کے ساتھ جیسا کہ مشہور ہے ظاہر ہوا اور ان کا بادشاہ تخت پر بیٹھا سامنے آیا اور نوجوان سے کہا ۔ کیا کہتا ہے کہہ ۔ جوان نے جو واقعہ تھا کہا ۔ بادشاہ نے اپنے لشکر کی طرف دیکھا ۔ سب حاضر تھے علاوہ ''جھوجھو'' کے ۔ حکم دیا اس کو فوراً حاضر کرو ۔ جلد، جہاں بھی تھا بلا کر حاضر کیا ۔ بادشاہ نے پوچھا ۔ اس نوجوان کی عورت تو لایا ہے ۔ کہا اے شاہ آج کی رات میرا گزر اس جوان کی چھت کے اوپر سے ہوا ۔ اسی درمیان اس کی عورت حجرے سے باہر نکلی تو جوان نے کہا'' جھوجھو'' اس کو پکڑ لے ۔ پس میں اس کے حکم سے لایا ہوں اور پرانی عمارت کے ایک حجرے میں بند کر رکھی ہے ۔ لیکن اسی وقت سے شیخ نظام الدین اولیاء کے دو مرید بڑے غصے اور ناراضگی کے ساتھ

اس حجرے کے آگے پہرے میں کھڑے ہیں اور مجھے اندر نہیں جانے دیتے۔ القصہ اس عورت کو اس نوجوان کے حوالے کر رخصت کیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

شیخ فتح اللہ سنبھلی

اپنے زمانے کے جوانوں میں سے ہے۔ نیک، صالح، لطیف المزاج، فہیم اور ظریف۔ مجھے جوانی کے دنوں سے ہی ان سے بڑی محبت اور اخلاص رہا اور آپس میں موافقت اور مرافعت بھی خوب تھی۔ میں نے فارسی اور عربی نظم ونثر کے چند سبق ان سے پڑھے تھے۔ بعض رسائل ''اعجاز خسروی'' کے حل میں انھیں مہارت تھی اور اس فن کے تمام اقسام کو وہ خوب جاری فرمایا کرتے تھے۔ شعر بھی کہتے مگر ان کی شعر گوئی پر ان کی شعر فہمی غالب تھی۔ فارسی کے یہ شعر ان ہی کے ہیں۔

یاراں سخن از ترک محبت مکنیدم — دل پیش خود نیست نصیحت مکنیدم
بر نشتر من داروے راحت مفشانید — شرمندۂ ناسور محبت مکنیدم
ایں سبزہ نیست گرد اگرد رخت نیکو — صف بستہ مورچہ زپئے لشکر آمدہ [1]

اگرچہ وہ قد وقامت میں زیادہ نظر نہیں آتے تھے بلکہ ان کا جثہ چھوٹا لگتا تھا لیکن دوڑنے بھاگنے کودنے اور کشتی کے فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ کوئی بھی پہلوان آج تک انھیں چت نہیں کر سکا تھا۔ جوانی میں اگرچہ وہ ان کاموں میں لگے رہے۔ مگر اُن کی حالت صلاح وسلامتی میں کسی طرح بھی کوئی فتور نہیں آیا تھا۔ ''رشحات'' میں ہے کہ جب سید امیر کلال شباب کی عمر کو پہنچے تو کشتی لڑا کرتے تھے اور آپ کے پاس پہلوانوں کا ہنگامہ اور معرکہ برپا رہا کرتا تھا۔ ایک دن کشتی کے ایک مقابلے کے دوران ایک شخص کے دل میں وسوسہ آیا کہ شریف النسل سید زادے ہو کر کشتی لڑتے ہیں اور زور آزمائی کرتے ہیں۔ اہل حرفت عوام کے سے طور طریقے اپنا رکھے ہیں۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں لگتی۔ اسی اثنا میں اس شخص کو نیند آ گئی اور خواب میں ایسا دیکھا کہ قیامت قائم ہو گئی

1 اے دوستوں مجھ سے ترک محبت کی بات مت کرو۔ میرا دل میرے پاس ہی نہیں مجھے (بیکار) نصیحت نہ کرو۔ میرے نشتر پر چین کی دوامت چھڑکو۔ مجھے ناسور محبت کے آگے شرمندہ نہ کرو۔ یہ سبزہ نہیں جو تیرے چہرے کے اردگرد پھیل رہا ہے بلکہ مور چہ نے صف باندھ کر تیرے حُسن کی حفاظت کو لشکر مہیا کر لیا ہے۔

ہے اور وہ ایک جگہ کیچڑ اور دلدل میں کمر تک دھنس گیا ہے اور خود کو سنبھالنے سے عاجز آ گیا ہے۔ ناگاہ دیکھا کہ حضرت امیر کلال ظاہر ہوئے اور اس کے دونوں بازو پکڑ کر آسانی سے اس کو اس دلدل سے نکال لائے۔ جیسے ہی بیدار ہوا حضرت امیر نے کشتی کے دوران ہی اس کی جانب رُخ کیا اور فرمایا میں ایسے ہی دن کے لیے تو زور آزمائی کرتا ہوں۔ (انتہی) ایک نوجوان تھا جو پابندیٔ شرع سے بے قید تھا اور کشتی لڑنے میں شیرِ غرندہ اور تیز رفتاری میں اڑنے والے پرندے کی طرح تھا کہ بعض موقعوں پر جب کہیں اس کے جانی دشمنوں نے اسے گھیر لیا اور جیسے ہی اسے پکڑنا چاہا کہ قتل کر دیں وہ بڑی پھرتی سے کودا اور ان کے سروں کے اوپر سے اُڑتا ہوا سلامت نکل آیا۔ کبھی کبھی وہ شرط لگا کر کنوئیں میں کودتا اور سیدھا جا کھڑا ہوتا اور جب چاہتا بغیر کسی کے ہاتھ کی مدد لیے کنوئیں کی دیوار پر جست لگا کر باہر آ بیٹھتا۔ فنونِ موسیقی اور خوش الحانی میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ سنبھل میں ان شیخ فتح اللہ سے پھرتی کے کاموں میں مقابلہ کرتا تھا۔ لیکن کبھی جیت نہ سکا تھا اور شرمندہ ہو کر بیٹھ جاتا اسی لیے سنبھل سے امروہہ چلا گیا۔ شیخ فتح اللہ کی آخری بیماری میں جب میں ان کی عیادت کو پہنچا تو وہ سخت نحیف و نزار ہو گئے تھے اور اپنی خبر سے گویا بے خبر تھے۔ انھیں تین قسم کی تکلیف تھی۔ سینے میں گرمی، زبان میں کانٹے سے اور تنگیٔ نفس۔ جب مجھے دیکھا بے چین ہو کر لڑکھڑائی زبان میں کہنا شروع کیا۔ اے میرے دوست قریب آ۔ اور میری جان میں اتر جا۔ میں ان کے پاس بیٹھا۔ احوال جہاں کیسے بدلتے ہیں۔ دیکھ کر حیرت زدہ تعجب کرتا تھا مگر تعجب ہی کیا کہ

قضا دستیست پنج انگشت دارد   چوں خواہد از کسے روحے بر آرد[1]
دو بر چشمش نہد، دگردو بر گوش   یکے بر لب نہد گوید کہ خاموش

آخر کار ان کی تسلی خاطر کے لیے میں نے کہا۔ ہمت سے کام لیں آپ کے سینے کی سوزش اور زبان کی خارش تو جاتی رہی بس یہی تھوڑی سانس کی تکلیف رہی ہے۔ انھوں نے اسی حالت کے دوران بطور خوش طبعی فرمایا۔ یہ سانس بھی نہ رہے گا۔ روایت ہے کہ امیر خسرو دہلوی سے ان کی سخت بیماری میں جس میں انھیں کبھی کبھی اپنا بھی ہوش نہ رہتا تھا دوستوں نے بطور مزاح دریافت کیا "میر جیو،

---

1 قضا ایک ہاتھ ہے جس میں پانچ انگلیاں ہیں جب چاہتی ہے کسی کی روح نکالے۔ دو اس کی آنکھوں پر رکھتی ہے دوسری دو کانوں پر ایک اس کے لب پر رکھتی ہے اور کہتی ہے کہ خاموش ہو جا۔

ما کیانیم؟ (میر صاحب "ہم کون ہیں"، اس کا دوسرا مطلب لفظی "ہم مرغیاں ہیں" بھی نکلتا ہے")
امیر خسرو نے برجستہ مزاحاً ہی فرمایا "وہی ہوں جو تم نے (ابھی) کہا ہے" (انتہی) شیخ فتح اللہ کا اسی
بیماری میں 1044ھ (1634) میں انتقال ہوا اور ان کی قبر شاہ فخر الدین کے روضے کے نزدیک
ہے۔ میں نے ان کی تاریخ وفات پر یہ قطعہ کہا تھا۔

وائے از کار جہانِ بے مدار	و او از درد و غم جانکاہ داد
رفت از عالم جوانے پاکباز	کز غم او خاست از صد آہ داد
آسماں در ماتمش شد نیلگون	خاستہ از جان مہر و ماہ داد
سال فوتش چون طلب کردم ز غیب	گفت ہاتف "فات فتح اللہ داد" [1]

1044ھ

شیخ رفیع گوپاموی

صاحب فقر و استقامت، صلاح و سلامتی والے سیاح جوان شخص تھے۔ بعض علوم عربیہ کے عالم
تھے۔ کلام مجید کی کتابت کو جس تیزی سے وہ کرتے تھے نہ دیکھا نہ سنا۔ سخت نامرادی اور غربت کی
حالت میں خوش خوش گزارتے تھے۔ وہ جامع مسجد سنبھل میں رہا کرتے تھے۔ کچھ وقت خلق
خدا سے معاملات اور ربط وضبط کے ساتھ بسر کرنے کے بعد ان پر ایسا حال طاری ہوا کہ سب سے
ہاتھ جھاڑ کر طریقہ رندی و قلندری میں آگئے دنیا اور اہل دنیا سے آزادگی اور وارستگی کا یہ عالم تھا کہ
مدتوں اس مسجد میں جو کہ دلکشی، لطافت، زیبائش اور سکون میں بے نظیر جگہ ہے مست اور خوش
اوقاتی کے حال میں رہا کرتے تھے۔ میں اُن کی دونوں حالتوں سے واقف تھا۔ پھر وہاں سے
کہیں چلے گئے، مجھے نہیں معلوم کہ کہاں گئے۔ شیخ عبدالرحمٰن بن ابوالبرکات اس مسجد کے امام

1 جہانِ ناپائیدار کے کاروبار پر افسوس کہ اس نے جان کو پگھلا دینے والا درد وغم دیا۔ دنیا سے ایک پاکباز جوان رخصت ہوا ہے تو اس کے غم میں سیکڑوں طرف سے آہ و فریاد کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ آسمان کا رنگ اس کے ماتم میں نیلا پڑ گیا ہے۔ چاند سورج سے بھی فریاد کی صدائیں نکل رہی ہیں۔ جب میں نے غیب سے اُن کے وصال کا سال دریافت کیا تو ہاتف نے کہا۔ "فات فتح اللہ"

تھے۔ وہ ایک بابرکت ، صاحب عبادت ، اسمائے الٰہیہ کے وظیفہ خواں،دافع بلیّات اور رافع الدرجات شخصیت کے مالک تھے۔ جب اُن کے والد شیخ ابولبرکات جوان سے پہلے جامع مسجد کے پیش امام تھے کا انتقال ہو گیا اور اسی مسجد کے ایک گوشے میں دفن کیے گئے تو انھوں نے اپنے والد کے نیابت (جو وہ ان کی زندگی میں ہی کر رہے تھے) کے سلسلے میں چاہا کی کسی بزرگ سے اس منصب کی تصدیق وتصحیح کرائیں (تا کہ باضابطہ طور پر بادشاہ وقت سے اس کی سند لے سکیں) شیخ عبدالحیٔ مفتی سنبھل جو کہ علوم لائقہ اور اعمال فائقہ رکھتے تھے اور دین حق کی بہت سی تصانیف کے مالک بھی تھے انھوں نے یہ تصدیق اس طرح لکھی کہ جب سے وہ مسجد میں داخل ہوئے ہیں کبھی مسجد سے باہر قدم نہیں رکھا۔ یہ لطیفہ کارگر ہوا۔ (اور منصب امامت جامع مسجد انھیں کے نام زد ہو گیا) آخر کار آپ بھی 1052ھ (1642) کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ باپ اور بیٹے کی قبر ایک ہی جگہ ہے۔ ایک بار بادشاہ صاحب قران ثانی نے چاہا کہ حکومتِ سنبھل رستم خاں دکھنی سے لے کر کسی دوسرے کے نام کر دیں۔ خان موصوف نے مجھ راقم الحروف (سید محمد کمال سنبھلی) کو سنبھل میں ہی بحال رہنے کے سلسلے میں دعا وتوجہ کی غرض سے شیخ عبدالرحمن کے پاس بھیجا۔ فقیر نے جا کر عرض کیا تو انھوں نے اس باب میں بڑی شفقت فرماتے ہوئے توجہ الی اللہ کی۔ آخر کام انجام کو پہنچ گیا۔ (اور حکومت سنبھل ان ہی کے نام بحال رہی) اب ان ہی امام شیخ عبدالرحمن کے فرزند مصلّے پر ہیں اور ان ہی کا رنگ لیے امام جامع مسجد ہیں۔ مشہور ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہ مسجد ''ہرمنڈل'' نام کا ایک بت خانہ تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک وہ ہندستان کا مشہور مندر تھا۔ ہنود اس کا بڑے بڑے مندروں کی طرح احترام کرتے تھے۔ آخر کار شیخ نجم الدین اور ان کے بھانجے شیخ علی کہ دونوں کا ملانِ وقت میں سے تھے۔ سیاحت کرتے ہوئے سنبھل پہنچے اور اس مندر کے دروازے کے آگے فروکش ہو گئے۔ کفار کی جماعت نہیں چاہتی تھی کہ یہ یہاں رہیں۔ سنّیاسیوں کے گروہ جو اسی مندر میں سکونت پذیر تھے ان بزرگوں سے بھڑ گئے اور شر آمیز گفتگو شروع کر دی اور کہنے لگے اگر کوئی کرامت رکھتے ہو تو دکھاؤ ورنہ ہماری دیکھو۔ اسی اثنا میں ایک سنّیاسی بولا دیکھو ہماری کرامت مشاہدہ کرو اور ہوا میں اُڑ گیا اور اُن کے سروں سے اوپر چڑھ گیا۔ شیخ علی نے اپنے ماموں سے عرض کیا اگر آپ اجازت دیں میں بھی اُڑ جاؤں اور اس کو اوپر سے نیچے اُتار لاؤں۔ کہا۔

اچھا اُڑ جاؤ۔ شیخ علی اُڑے اور اس سے بھی اوپر پہنچ گئے اور پکڑ کر زمین پر لے آئے۔ اُسی دن سے آپ شیخ علی پر ّاں سے مشہور ہو گئے۔ سارے سنیاسی اور دوسرے ہندو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور حد درجہ خاطر مدارات میں لگ گئے۔ وہ دونوں حضرات وہیں مقیم ہو گئے اور اپنی تمام تر توجہ فروغ و تقویت اسلام کی جانب مبذول کر دی۔ وہ اسی کوشش میں مصروف تھے کہ اُسی زمانے میں ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ، اللہ کے فضل و نصرت کی بدولت ہندستان کے خلیفہ بن گئے اور ان کے حکم سے اس بت کدے کو ڈھا کر اس کی جگہ مسجد کی بنیاد سب لوگوں نے مل کر رکھ دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جیسے ہی مسجد کا گنبد بن کر تیار ہوا ٹوٹ گیا اور ایسا کئی بار ہوا۔ بزرگوں کی ایک جماعت نے استخارہ کر کے معلوم کیا یا یہ کہ نجومیوں نے کہا کہ اگر اس تعمیر کا منتظم کوئی ایسا شخص بنایا جائے کہ اس کا نام ایسا ہو جو ہندو مسلمان دونوں میں رکھا جاتا ہو یا یہ کہا کہ دو منتظم ہوں ایک ہندو دوسرا مسلمان تو یہ تعمیر تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ جب یہ بات بادشاہ کے گوش گزار کی گئی تو بادشاہ نے نیک نیتی کے ساتھ مسجد کی تعمیر کے لیے اپنی جانب سے ہندو بیگ مغل کو متعین فرما دیا تو انھوں نے بہت ہی قلیل مدت میں مسجد کی تعمیر کرا دی 933ھ مطابق (1527) اس مسجد کی اتمام کی تاریخ یہ قطعہ ہے۔

جامع اشیۂ فضل و کمال رافع الویۂ ملک و ملل
باسط اجنحۂ امن و امان بانی ابنیۂ علم و عمل
شاہ جم جاہ محمد بابر حفظہ اللہ لۂ عز و جل
شمع دولت چوبر افروخت بہند روشن از پر تو آن شد سنبھل
از پئے ساختن این مسجد کہ مصوّن باد ز نقصان و خلل
کرد فرمان بکہین بندہ خویش کہ بود عمدہ ارکان دوَل [1]

1 فضل و کمال کی چیزوں کے جامع، ملک و ملت کے علم بردار، امن و امان کے پروں کے پھیلانے والے، علم و عمل کی عمارتوں کے بانی، وجاہت و بزرگی کے شہنشاہ محمد بابر نے اللہ عزّ وجلّ انھیں اپنے حفظ میں رکھے جب ہندستان میں شمع دولتِ خلافت روشن کی تو اس کی روشنی سے سنبھل منور ہو گیا۔ انھوں نے اس جامع مسجد کو اللہ اسے ہر قسم کے نقص و خلل سے محفوظ رکھے بنانے کا اپنے عمدہ ارکان دولت میں سے ایک امیر ہندو بیگ کو جو کہ عقل و خرد میں بھی امیر ہی تھے اور نیک اخلاقی کی بھی مثال تھے، حکم دیا۔

میر با عقل و خرد ہندو بیگ　　آن با خلاق نکو گشتہ مثل

چون ز فرمان شہنشاہ جہان　　یافت اِتمام بتوفیق ازل

سال تاریخ مہ و روزش گشت　　یکم از شہر ربیع الاوّل[1]

شیخ نجم الدین ملقب بہ ستونِ سنبھل کی قبر اس مسجد کے صحن میں شمال کی جانب ہے اور شیخ علی بڑا اس کی قبر اسی مسجد میں جانبِ جنوب ہے۔ مسلمان اس مسجد میں بڑے شوق کے ساتھ نماز جمعہ پڑھنے آتے ہیں اور ہندو اپنے سابقہ رسم ورواج کے مطابق آج بھی اپنے مقررہ مواقع پر اس مسجد کے صحن کے پھیرے لگاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ لیں کہ سنبھل کے اکثر مشائخ کے احوال اوران کی اولادوں کے تذکرے اس کتاب میں بیان ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض شہداء صاحب آیات و کرامات جیسے بلیقانے شہید، سید ابراہیم، احمد، محمد قطب الدین محمد، جمال الدین، زین الدین، برہان الدین، سید بیچاسہ، گنج شہیداں وغیرہ ذالک جو کوچہ وبازار اور اس کے دیہی علاقوں میں آرام فرما ہیں جیسی کہ یہ مثل زبان زدعوام ہے کہ پیران بدایوں، شہیدان سنبھل گزرے ہیں لیکن ان شہدا کے احوال تفصیلاً بالکل معلوم نہیں ہیں بس اتنا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرات فتح اوّل میں سید سالار مسعود غازی کے ہمراہ ہندستان آئے تھے اور شہید ہوئے تھے۔ واللہ اعلم۔ سید سالار مسعود غازی کے مجمل احوال یہ ہیں۔ ''اخبار الاخیار'' (مصنفہ شیخ عبدالحق) میں ہے کہ میر سلیم سے بطریق اجمال معلوم ہوا کہ وہ ایک مرد خدا تھے جنھوں نے اوّل فتح اسلام میں جہاد کیا تھا اور بہت سی فتوحات کی تھیں اور درجہ شہادت کو پہنچے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ ان کا نام سپہ سالار مسعود غازی ہے اور وہ سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے غازیوں میں سے ہیں۔ جب سلطان محمد تغلق بہرائچ کے علاقے میں پہنچے تو ان کی قبر کی زیارت کی اور وہاں کے مجاوروں کو صدقات سے نوازا۔ (انتہی)۔ امیر خسرو دہلویؒ نے اعجاز خسروی میں اپنے دوست سنبھل نام کو ایک خط میں لکھا ہے۔ ''برادر سنبھل بہاری (بہرائچ) نضر اللہ ھادیۃ عیشہٖ (اللہ ان کے عیش کی وادی کو ہمیشہ ہرا بھرا رکھے) کو معلوم ہوا کہ قصبہ بہرائچ میں سپہ سالار مسعود شہید کا مزار معطر ہے کہ جن کی ذات سے

1　جس دن توفیق ازلی سے شہنشاہ جہاں کا فرمان تکمیل کو پہنچا یعنی تعمیر مسجد مکمل ہوئی وہ ماہ ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ تھی۔

سارا ہندوستان بوئے (ایمان) سے مہک اٹھا۔ وہاں کے دوستوں کی مجلس بھی وہی خوشبو رکھتی ہے اُسی سے مست رہیں۔ (انتہی) اور کچھ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ وہ خواجہ معین الدین چشتی کے مرید ہیں، یہ ثابت نہیں ہے۔ آپ کے ملفوظات میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ بعض اہل بستی سے بھی سننے میں آیا ہے کہ سید مسعود غازی کی شہادت کی تاریخ 419ھ (1228) ہے کہ لفظ ''سالار حق جوئی'' سے برآمد ہوتی ہے۔ علَم کی جو یہ بدعت نکال رکھی ہے اور شائع ہے وہ ابھی قریبی زمانے کی ہی ایجاد ہے۔ واللہ اعلم۔

میں 1051ھ (1641) میں قندھار سے واپسی میں غزنی پہنچا۔ وہاں کے عوام سے سنا کہ نوے ہزار اولیاء اللہ اس سرزمین میں آسودہ ہیں۔ میں نے وہاں کے بعض مزارات کی زیارت کی۔ جو نام یادرہ گئے وہ شیخ صابر، شیخ علی، شیخ عطا، شیخ عثمان (جو کہ شیخ علی ہجویری کے والد محترم تھے) شیخ شمس، حکیم سنائی، شیخ بہلول دانا اور سلطان محمود ہیں۔ سلطان محمود کی قبر پر ایک کتبہ لکھا ہوا ہے جس میں ان کے مجمل احوال اور ان کی تاریخ وفات 420ھ (1229) لکھی ہوئی ہے۔ کتاب ''نفحات الانس'' میں ابوذر بوز جانی کے ذکر میں سلطان محمود غزنوی کے والد سلطان سبکتگین کا سال وفات 387ھ (997) لکھا ہے۔ صاحب ''ثمرات القدس'' نے لکھا ہے کہ سالار مسعود کے مریدوں میں ایک شخص جنھوں نے ان کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔ لکھا ہے کہ آپ سلطان محمود کے بھتیجے ہیں دوسری مرتبہ جب سلطان محمود ہندوستان آئے اور جہاد کیا تو واپسی کے وقت وہ انھیں (سالار مسعود کو) ہندستان میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ جب سلطان محمود (مع لشکر) غزنی پہنچ گئے۔ کفار کو موقع ہاتھ آ گیا۔ آخر کار ان کو شہید کر دیا۔ اُسی سرزمین میں انھیں دفن کر دیا۔ اس جگہ ایک شہر ''بہرائچ'' کے نام سے آباد کیا گیا اور بعد میں ان کی قبر پر ایک بلند عمارت (روضہ) کھڑی کر دی گئی اور اب یہ بدعت شائع ہے کہ موسم بہار میں جوان کی شہادت کا موسم تھا۔ سرخ اور سبز جھنڈے ساز وسامان اور سونے چاندی کے ساتھ بطور نذرانہ لاتعداد لوگ ہر طرف سے وہاں لاتے ہیں اور ایک مہینے تک بہت بڑا ہجوم (میلہ) لگا رہتا ہے۔ جو نذریں تحائف اور ہدایا وہ مجاورین کے لیے لاتے ہیں انھیں نذر کر کے پھر اپنے اپنے وطن کو واپس چلے جاتے ہیں۔ دفات کے بعد سے آج تک ان کے کھلے خوارق اور کرامات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ہر پیر کی رات کو ان کے روضہ متبرکہ میں زائرین کی

کثرت رہتی ہے۔ روایت ہے کہ صاحب کرامت مجاذیب مجانین اور اہل سکر حضرات میں سے چار شخص 920ھ (1514) میں ایک ساتھ سنبھل پہنچے تھے۔ شاہ فخر الدین، شیخ بہاالدین بودلہ، بابا پربھو اور چندن دیوانہ۔ شاہ فخر الدین کھلی کرامات رکھتے تھے جو بھی ان سے اظہار عقیدت کرتا اور نذر پیش کرتا تو اس کا مقصد برآتا تھا۔ مگر جو ان کی بزرگی کا منکر ہو کر سرکشی دکھاتا خود کو نقصان پہنچاتا تھا۔ ایک دن وہ اہل سنبھل میں سے کسی کے گھر میں داخل ہو گئے۔ اس نے تھوڑا سا کھانا ان کے شکستہ برتن میں حقارت کے ساتھ ڈال دیا۔ وہ غضبناک ہو کر بولے۔ تو اور تیری اولاد پیٹ بھر کر نہ کھائیں گے اور یہ کہہ کر اُٹھ کر دوسرے کے گھر چلے گئے۔ وہ شخص بڑی نیاز مندی سے پیش آیا اور خوب اچھا کھانا کھلایا۔ انھوں نے شکم سیر ہو کر کھایا اور خوش ہو کر کہا تو اور تیری اولاد ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے۔ آخر دونوں شخصوں کے بابت جو کہا تھا وہی ظاہر ہوا۔ آج ان کی اولادیں بھی اسی حال کا پتا دیتی ہیں۔ لوگ ان کے اور بھی بہت سے خارق عادت واقعات نقل کرتے ہیں۔ قریبی زمانے میں ہی ان کا انتقال ہوا ہے اور قبر سنبھل کے مضافات میں سنبھل سے مشرق کی جانب ہے۔ دوسرے شیخ بہاالدین بودلہ جو حضرت خواجہ مودود چشتی کی اولاد میں سے ہیں اور سلسلہ قادریہ میں سید محمود بیابانی کے مرید ہیں۔ وہ زیادہ تر سکر و مستی کی حالت میں رہا کرتے تھے۔ اس حال میں جو کچھ ان کی زبان پر آتا، ہو جاتا۔ ایک دن انھوں نے اپنا جھوٹا لقمہ ایک عالم کو دیا اور کہا، کھا۔ اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ دوسرے کو دیا اس نے کھا لیا تو وہ فوراً جذبۂ قوی سے مشرف ہو گیا اور اس سے احوال و کیفیات کا ظہور ہونے لگا۔ اس عالم نے جو کہ ان کا منکر تھا ایک دن جب داہنی جانب نماز کا سلام پھیرا تو دیکھا کہ بودلہ بیٹھے ہوئے ہیں اور جب بائیں جانب سلام پھیرا تو دیکھا کہ اُدھر بھی بودلہ بیٹھے ہوئے ہیں تو چاہا کہ ان کے قدموں میں گر جائے مگر وہ فوراً ہی نظر سے غائب ہو گئے۔ شیخ عبدالکریم جو کہ میرے استادوں میں سے تھے اور ان کا ذکر پیچھے گزرا ہے کہتے تھے کہ ایک دن میرے دادا شیخ جلال الدین مجھے ایک چھپّر چڑھانے کے لیے لے کر آئے۔ بودلہ بھی از خود آ گئے۔ چھپّر اُٹھاتے وقت پاکھے کی دیوار کو دھکا لگا اور اس نے گرنا شروع کر دیا۔ بودلہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا "بس بس"۔ وہ پاکھا اُسی طرح ٹیڑھا کھڑا کا کھڑا رہ گیا، گرا نہیں۔ وہ ہی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے شیخ بہاء الدین بودلہ کو دیکھا تھا۔ میرے والد نے بھی سُنایا کہ سنبھل

میں ہندو پورہ کے نزدیک سر بازار جو بڑ کا درخت ہے ایک دن انھوں نے مسواک کر کے اس زمین میں گاڑ دی تھی، یہ درخت اسی مسواک کا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک دن شیخ بودلہ سراپا برہنہ اور عریاں گھر سے باہر نکلے ایک بزرگ نے صبح کو جب انھیں دیکھا تو غصے میں بھڑک گئے اور لکڑی کی کھڑاؤں ان کے سر پر ماردی کہ خون ان کے رخساروں پر بہنے لگا۔ اس سے ان کا دل بُرا ہو گیا اور اسی حال میں شیخ عزیز اللہ کے پاس پہنچے۔ شیخ دو کپڑے پہنے ہوئے تھے، ایک اُتار کے انھیں پہنا دیا اور عمدہ کھانا لائے اور ان کو پیٹ بھر کھلایا۔ وہ بہت ہی خوش ہوئے اور کہا۔ ''ایک بے اولاد نے مجھے تکلیف پہنچائی ایک صاحب اولاد نے میرا دل خوش کر دیا۔'' دونوں کی نسبت جو کچھ فرمایا تھا ویسا ہی ظہور میں آیا۔ اُن کی وفات کی تاریخ 24/ جمادی الاوّل 930ھ (30/ مارچ 1524) ہے اور ان کی خود ساختہ ٹیلے پر بنائی ہوئی قبر میرے گھر کے نزدیک ہے۔ یہ شیخ عزیز اللہ شیخ عبداللہ تلنبی کے یارانِ طریقت اور ہم سبقوں میں سے تھے۔ ہدایت وارشاد کے مرتبے پر فائز تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کے عالم تھے۔ ان کے بہت سے تلامذہ مرتبۂ کمال کو پہنچے ہیں۔ شیخ حاتم سنبھلی ان کے بڑے تلامذہ میں سے تھے۔ شیخ حاتم نے اپنی زندگی میں تیس بار ''مفتاح'' کی مختلف شرحیں اور چالیس بار ''مطول'' کو بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک پڑھایا ہے۔ وہ ہندوستان کے عالم العلماء تھے۔ ولایت کے جو تبحر علما ہندوستان آئے ہیں ان کے تبحر اور تعمق علم کے معترف ہوئے ہیں اور ان سے تلمذ کا شرف حاصل کیا ہے۔ ایک بار میر ابوالبقا جو اپنے وقت کے بڑے علما میں سے تھے، ہندستان آئے اور مدّتوں ہندستان میں رہے۔ جب ولایت واپس پہنچے تو وہاں جا کر کہا کہ میں نے ہندستان میں دو آدمی دیکھے ہیں ایک خوش فہم طالب علم دوسرا بیہودہ گو عالم۔ طالب علم سے شیخ حاتم اور عالم سے شیخ لاڈن دہلوی کی جانب اشارہ کیا۔ مشہور ہے کہ شیخ حاتم سنبھلی کے کتب خانے میں سات ہزار کتب متداولہ تھیں۔ شیخ عبداللہ تلنبی کی وفات 922ھ (1516) میں اور شیخ عزیز اللہ کی وفات 932ھ (1527) میں اور شیخ حاتم کی 968ھ (1561) میں اور تاریخ وفات ''عند ملک مقتدر'' ہے۔ تیسرے بابا پر بھوائل حال میں عالم وفاضل تھے۔ آخر کار جذبۂ قوی سے مستہلک ہو گئے۔ خود کو اظہار جنون کے پردے میں پنہاں رکھتے تھے۔ بچے جب ان کے پتھر مارتے تھے تو وہ خوش ہوتے تھے۔

لذت دیوانگی در سنگ طفلان خوردنست حیف زاوقاتے کہ مجنون رابہاموں درگذشت[1]

ایک دن ایک بزرگ نے ان کو بڑے دبدبے اور شاہانہ کرّوفرّ میں دیکھا کہ خوش وقت بیٹھے ہیں، حیرت میں پڑ گئے اور وہیں کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ان بزرگ سے کہا "اگر تو نے میرا راز فاش کیا تو برباد ہو جائے گا۔" کچھ دنوں تک کسی سے کچھ ظاہر نہ کیا مگر ایک دن بچّوں کو دیکھا کہ ان کو پتھر مار رہے ہیں تو بول پڑے۔ "ارے نادانوں کیا کر رہے ہو یہ شخص اللہ والا ہے، ایسا ہے، ویسا ہے، تم برباد ہو جاؤ گے۔ اس بات کے بعد وہ سنبھل سے نکل آئے اور بیانہ چلے گئے اور وہیں 930ھ(1524) میں انتقال ہوا۔ وہاں لوگ ان کو "منگلم" کے نام سے جانتے تھے نہ کہ پربھو سے۔ جس وقت کہ وہ سنبھل سے نکلے ہیں اُن بزرگ کے گھر تفرقہ پڑ گیا اور ان کا معاملہ درہم برہم ہو گیا کہ آج تک بے سروسامانی کا عالم ہے۔

ہرکس کہ سرّ فاش کند ایں سزائے اوست[2]

چوتھے چندو (چندن) تھے وہ سُہاگہ بنانے والے کی دکان پر بیٹھا کرتے اور سہاگہ خوب کھایا کرتے اور عالم مستی میں رہا کرتے تھے۔ ان کی کرامتیں ظاہر ہوا کرتی تھیں۔ اپنے احوال و کیفیات کو دیوانگی کے پردے میں نہاں رکھتے تھے۔ ایک بار حاکم شہر نے سہاگہ بنانے والے کو منع کر دیا کہ ان کے ہاتھ سہاگہ ہرگز نہ بیچے۔ وہ بگڑ گئے اور کہا حاکم نے میرے منہ (کے لقمے) کو منع کیا میں اس کے مقام استنجا کو منع کرتا ہوں کہ نہ کُھلے۔ فوراً حاکم کی راہ پاخانہ بند ہو گئی۔ نہایت دبلا اور کمزور ہو گیا اور مرنے کے قریب ہو گیا۔ آخر جب اسے معلوم ہوا فوراً سہاگہ بنانے والے کو اجازت فروختگی دے دی اور اچھا ہو گیا۔ چندن کی قبر بھی ٹیلے کے نچلے حصّے میں ہی بنی۔ سنبھل کے بزرگوں میں سے ایک صاحب احوال و کیفیات بزرگ شیخ لاہوتی گزرے ہیں۔ ان کا اصلی نام (شیخ) احمد ہے۔ لاہوتی ان کا لقب ہے۔ ان کی نشوونما سرزمین مشرق علاقہ بنگال میں ہوئی۔ کسی زمانے میں وہ سیاحت کرتے ہوئے سنبھل پہنچے۔ وہاں شہر سے ملحق ایک گاؤں اُنھیں پسند آیا وہیں

---

1 دیوانگی کی لذت تو بچوں کے پتھر کھانے میں ہی ہے۔ مجنون کے اس وقت پر افسوس جو اس نے جنگل میں گذارا۔

2 جو کسی کا راز فاش کرے اس کی یہ ہی سزا ہے۔

ایک ٹیلے کو اُونچا اور ہموار کر کے اس پر درخت لگائے اور باقی ساری عمر اسی جگہ گزار دی، شادی بھی کی، اولاد بھی ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے ان کی صحبت سے فیض اُٹھایا اور بعد میں خود کو اسی کار درویشی کے نام کر دیا۔ 900ھ (1495) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی قبر بھی اُسی ٹیلے پر ہے۔ میں نے ان کے دیکھنے والوں میں سے ایک صاحب سے ملاقات کی تھی فرماتے تھے کہ وہ صاحب ذوق وسماع اور صاحب حال بزرگوں میں سے تھے۔ نمدے کی ٹوپی اوڑھا کرتے اور اُون کا جُبہ پہنا کرتے تھے۔ اپنی کرامتوں کا اظہار کیا کرتے تھے۔ بلند احوال رکھتے تھے اور اپنے لقب ''لاہوتی'' پر فخر کیا کرتے تھے۔ خوش وخرم زندگی جیتے اور سب سے خوش معاملگی کا برتاؤ رکھتے تھے۔ یہ بات پوشیدہ نہ رہے کیونکہ ان کا نام احمد اور لقب لاہوتی تھا۔ (نام ولقب کی برکت سے) عجب نہیں کہ پیغمبر ﷺ کی متابعت پر قدم راسخ رکھتے ہوں اور آنحضرت کی عنایاتِ باطنی کی خوشہ چینی سے سرفراز رہے ہوں۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ ''انا احمد بلامیم'' (اس حدیث میں محدثین کو کلام ہے) میں ہے۔ اس کے مطابق نام احمد سے احد کے معنیٰ حاصل کر کے خود کو لاہوتی سے تعبیر کر کے احدیت کے مراتب سے بہرہ ور ہوئے ہوں۔ کچھ بھی وجہ رہی ہو تقلیداً یا تبرکاً خود کو اس قسم کے القاب سے منسوب کرنا لطافت اور شرافت ضرور رکھتا ہے۔ لیکن اس زمانے کے بعض درویش جو خود کو شاہ چنگی، شاہ جانی سے ملقب کرتے ہیں وہ خود کو کیوں ملکوتی جبروتی یا لاہوتی کا لقب نہیں دیتے۔ اس وقت مجھے حسب موقع ایک دلچسپ حکایت یاد آئی کہ صبح صبح ایک گویا ایک ملنگ کی خدمت میں پہنچا اور بیٹھ کر گانا شروع کر دیا۔ ملنگ نے پوچھا یہ کون سی لے ہے؟ بولا۔ ''رام کلی۔'' یہ سنتے ہی وہ ملنگ طیش میں آ گیا اور گویے سے کہا۔ اُٹھ، بھاگ، ورنہ ایک ہی ڈنڈے میں تیرے سر کے دو کر دوں گا۔ گویے نے عرض کیا۔ شاہ جی مجھ سے کیا قصور ہوا؟ کہا صبح ہی صبح دروازے پر آ کر تو نے نہ مدار کلی کہا نہ کپور کلی نہ چمن کلی۔ آیا اور آتے ہی رام کلی کہنے لگا۔ اگر تو نے پھر رام کلی نام لیا۔ زندہ شاہ مدار کی دوستی کی قسم میں تیرا سر پھاڑ دوں گا۔ یہ سن کر وہ گویا ڈرتا لرزتا باہر نکل گیا۔ سنبھل کے درویشوں میں سے ایک شیخ نظام الدین مداری ہیں۔ صاحب معاملہ، اہل حق، اہل دل۔ کہتے ہیں کہ ان کے آباء کا اصلی وطن دہلی تھا جو اہل حکومت میں بڑے جاہ ومرتبے، قدر ومنزلت والے گزرے ہیں۔ خود ان کے والد شیخ رکن الدین بھی سلطانیان میں سے تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا اور انھوں نے سنا کہ بادشاہ کے اہلکار، ان کی مالیت کو ضبط کرنے کی غرض سے آ رہے ہیں ناراض ہوئے اور والد کا سارا مال و

متاع فقرا پر لٹا دیا اور خود وہاں سے نکل کر مکن پور پہنچ گئے اور بدیع الدین شاہ مدار قدس سرہٗ کے روضے پر جا پڑے اور سلیم شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سلیم شاہ، شیخ احمد کے اور وہ خواجہ ارغون کے اور وہ شاہ مدار کے مرید ہیں۔ بارہ سال وہاں گزارے۔ ریاضیات و مجاہدات، اور چلہ کشی کی محنتیں اُٹھائیں۔ آخر ایک رات کو شاہ بدیع الدین مدار نے ان سے خواب میں فرمایا۔ جا سنبھل جا اور وہاں اس ٹیلے پر جو شاہ مدار کا ٹیلہ کہلاتا ہے جا کر رہ۔ انھوں نے وہاں سکونت اختیار کر لی اور عبادت و اطاعت الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں وہاں افغانوں کی حکومت تھی۔ اس جماعت کے بعض لوگوں نے انھیں آزار پہنچایا۔ پریشان خاطر ہو کر بددعا کی اور وہ سب تتر بتر ہو گئے۔ انھوں نے اپنے دنیا سے جانے سے چالیس سال پہلے اپنی قبر کھود کر تیار کر لی تھی اور ہفتہ بھر اُسے جو سے بھرتے رہتے تھے۔ جمعہ کے دن سارا غلّہ قبر سے نکال کر فقرا کو صدقہ کر دیتے تھے اور کئی گھنٹے اس قبر میں لیٹ کر باہر آ جاتے۔ پھر حسب معمول اسے جَو سے بھرا کرتے تھے۔ بعض بزرگوں نے ان سے معلوم کیا یہ آپ کیا کرتے ہیں کہا۔ تم لوگ اپنی دنیا آباد کرتے ہو میں اپنی آخرت آباد کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے وہاں ہی زیادہ رہنا ہے۔ آخر وہ دنیا سے 18/ جمادی الاوّل 975ھ (20 نومبر 1567) کو چل بسے۔ ان کی قبر وہیں تکیہ شاہ مدار یعنی اُسی ٹیلے پر ہے۔ ان کی اکثر اولادیں اس تکیے کے آس پاس آباد ہیں۔ کیونکہ ان کی اکثر گفتگو مسجع ہوتی تھی اس لئے ان کی اولاد بھی مسجع کلام کرتی ہے۔ شاہ مدار کے عرس کے روز کہ وہ بھی ماہ مذکور کی 18/ تاریخ کو ہی ہوتا ہے۔ اس جگہ کافی مجمع اور ہجوم ہوتا ہے۔ میں نے جوانی کے دنوں میں خواب دیکھا کہ آنخضرت (ﷺ) کا تخت اس تکیے (ٹیلے) پر اُترا ہے۔ اسی زمانے میں مجھے شاہ مدار کے عرس کی رات کو اسی تکیے پر وصل معشوق (حقیقی) نصیب ہوا کہ اس نعمت کا شکر بیان سے وراء ہے۔ اس رات کی حکایت دراز ہے۔ یہاں اس کے بیان کی گنجائش نہیں۔ میں نے اس موقع کے متعلق بہت سے اشعار کہے ہیں۔ یہ قطعہ ان میں سے ایک ہے۔ قطعہ

بر تکیہ گاہ شاہ مدار دبعرس وے — ناگاہ رخ نمود مرا آنکہ ماہ بود

بل وے بہ تکیہ گاہ خودم داد وصل یار — گویا مدار کار من آں تکیہ گاہ بود[1]

---

1 شاہ مدار کے تکیے پر ان کے عرس (کی رات) میں، میرے چاند نے اچانک مجھے جلوہ دکھایا۔ بلکہ یوں کہیے کہ شاہ مدار کی روحانی توجہ نے مجھے وصل یار سے مالا مال کر دیا گویا کہ میرے کام کا مدار ان کی تکیہ گاہ تھی۔

شیخ بدرالدین

شیخ ابوتراب کالپی کے مرید ہیں۔ اپنے شیخ ہی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ شریعت اور اعمال شریعت میں واثق، طریقت و معاملت اور اس کے افعال میں صادق ہیں۔ شروع حال میں میرے شیخ سے بطور نیک فالی سی پارہ لے کر مراد آباد پہنچے اور اقامت اختیار کر لی اور دنیاوی ساز و سامان بھی مہیا کر لیا۔ بعض دولت مند حضرات نے ان کے لیے ایک مسجد اور خانقاہ بنا دی۔ بہت سے حجرے اور حوض بھی وہاں تیار کرائے۔ کیا ہی اچھی جگہ اور کیا ہی دلکش مقام ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کی صلاح و سلامتی کے رنگ میں تربیت کی ہے۔ بہت سے لوگ ان کے مرید ہوئے اور ان سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی وہ سنبھل آیا کرتے ہیں اور اپنے دیدار سے دل خوش کرتے ہیں۔ نور اسلام ان کی پیشانی سے جھلکتا ہے۔ میں ایسے تین اور شخصوں سے بھی واقف ہوں جو بظاہر کافر اور بباطن مسلمان گزرے ہیں۔ ایک تو نروتم داس میرٹھی جنھوں نے شیخ طہٰ اور شیخ عبداللہ جیسے درویشوں کی صحبت اُٹھائی تھی۔ شیخ عبداللہ جو خود کو حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کا بھانجہ فرماتے ہیں۔ نروتم داس ان کے پاس جا کر کلمہ طیبہ پڑھ کر (ایمان کا اقرار لسانی کرتے) ان کے کھانے میں شریک ہوتے تھے۔ میں ان سے آشنا تھا۔ ایک بار میرے مکان پر بھی آئے تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو دہلی کے درویشوں کے خدام اور کچھ مسلمانوں نے مل کر انھیں غسل دیا، کفن پہنایا اور ان کی نماز جنازہ پڑھی اور چاہا کہ گور غریباں میں دفن کر دیں۔ اسی اثنا میں بہت سے ہندو جمع ہو کر مہابت خان حاکم دہلی کو اپنا معاون بنا کر زبردستی مسلمانوں سے چھین کر لے گئے اور جون ندی کے کنارے جا کر جلا دیا۔ چونکہ وہ کلی طور پر رسومات ہندوانہ سے بیزار نہیں ہوئے تھے اس لیے جو کچھ معاملہ سوختگی پیش آیا اسی کی بدولت پیش آیا۔ دوسرے "کوب" نام کے مسخرے شخص تھے بہت عمر رسیدہ۔ ابتدائی عمر میں شہر کے درویشوں کے پاس جا کر خود کو دیوانہ ظاہر کر کے رام رحیم کہا کرتے تھے۔ جب ان کی قوم نے ان کو نکال دیا کہ یہ پاگل ہو گیا ہے تو شہر کے لوگوں کے پاس جا کر کلمہ طیبہ پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ میں نے بھی ان کی زبان سے کلمہ طیبہ سنا ہے۔ جب 1060ھ (1650) میں ان کی موت واقع ہو گئی تو مرزا محمد قاضی نے جو کہ شریعت میں راسخ اور حقیقت میں واصل بزرگ ہیں، بلخ کے اشراف اور اعیان

میں اُن کا شمار ہے۔ پہلے وہ سنبھل کے قاضی تھے اور آجکل مراد آباد کے قاضی ہیں ان کی نعش کی تجہیز و تکفین کر کے تمام مسلمانوں کے اتفاق رائے سے نخاسہ سنبھل کے نزدیک دفن کر دیا۔ تیسرے صاحب ''گوجرمل'' نامی جو کہ بادشاہ کے ملازمین میں سے تھے کبھی کبھی میرے شیخ کے پاس آیا کرتے تھے اور خلوت میں اپنے اسلام کا اظہار کرتے تھے۔ کلام مجید کا ہدیہ کیا تھا۔ چھپ کر اس کی تلاوت کیا کرتے تھے اور چُھپ کر ہی نماز پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا روم کی مثنوی کے معنیٰ کو حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کے خلیفہ شیخ عبدالحئی سے اچھی طرح حل کیا تھا۔ ایک دن وہ میرے شیخ کے پاس آئے اور اس راہ کی باتیں دونوں میں ہونے لگیں۔ میرے شیخ نے ان سے دریافت کیا۔ اس راہ فقر کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے اس قوم (درویشاں) کی اصطلاح کے موافق کافی و وافی بیان کیا۔ اس کے بعد حضرت مولانا جامی کی یہ رباعی پڑھی۔

بحریست نہ کاہندہ نہ افزایندہ　　امواج بر د رونده و آینده
عالم چوں عبارت زِہمیں امواجست　　نبود ہر زماں بلکہ دواں پاینده [1]

میرے شیخ نے ان کی جودت طبع اور لطافت فہم کی تعریف فرمائی۔ اس کے بعد میں نے ان کے کان میں کہا۔ اے فلاں ایسی فہم و فراست جو آپ رکھتے ہیں کہ ہوتے اپنے اسلام کو ضائع کر رہے ہیں اور کفر کی ظلمت کو خود سے نہیں اُتار پھینکتے اس کا سبب فرمائیں۔ کہا۔ میرا باپ مالدار آدمی تھا ابھی حال میں اس کا انتقال ہوا ہے۔ میرے دو اور بھائی بھی ہیں اگر میں اپنا اسلام ظاہر کرتا ہوں تو میں والد کی میراث سے محروم رہ جاؤں گا لہٰذا اس میراث کے ملنے تک کفر ظاہری میں ملوث ہوں۔ میں نے کہا ایسا اسلام دین دار مسلمانوں کے نزدیک مقبول نہیں اور ایسا کفر کافرین فاجرین بھی سننا نہ چاہیں گے۔ امیر خسرو اسی بابت فرماتے ہیں۔

گفتم ز تارِ زلف تو زنّار بندم، گفت او　　در کفر ہم ثابت نۂ زُنّار را رسوا مکن [2]

1　حقیقت الحقائق ایک سمندر ہے جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے بس اس میں موجیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ دنیا جہاں ان ہی امواج سے عبارت ہے جو کہ نہ تو ہمیشہ جاری ہی رہتی ہے اور نہ ہر وقت پائی جاتی ہے۔

2　میں نے کہا میں تیری زلفوں کے تاروں کی زُنّار باندھتا ہوں یعنی کافر طریقت بنتا ہوں۔ اس نے کہا ابھی تو تیرا کفر (مسلمانی بھی) ثابت نہیں ہے زنّار کو رسوا مت کر۔

آخر کار وہ اپنا مطلب حاصل ہو جانے کے بعد بادشاہ صاحب قران ثانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ بادشاہ خوش ہوئے اور انھیں مسلمان کرلیا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا اب انھیں کس نام سے پکاریں۔ بادشاہ نے کہا ''عبداللہ'' نام بہتر رہے گا۔ آج انھیں شیخ عبداللہ کہتے ہیں۔ بڑے صاحب معاملہ آدمی ہیں۔ مجھ پر بڑے مہربان ہیں۔ ایک شیخ عبداللہ اور ایک شیخ چنگال پُرانے زمانے میں گزرے ہیں جو مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں ''ثمرات القدس'' میں ہے کہ راجہ بھوج جس کی راجدھانی شہر اجین تھا جس وقت آں حضرت ﷺ نے ''شق القمر'' کا معجزہ مشرکان عرب کو دکھایا تھا (یعنی چاند کے دو ٹکڑے کر دیے تھے) اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا (اگلے) دن اس نے اپنے دربار کے بڑے بڑے پنڈتوں اور نجومیوں کو جمع کر کے اس واقعے کے بارے میں دریافت کیا۔ ان سب نے حق کو چھپاتے ہوئے متفق اللفظ ہو کر کہا۔ یہ فلک کے سیاروں کے بننے مٹنے کی ایک علامت ہے۔ ایسی چیزیں اکثر صادر ہوتی رہتی ہیں کوئی ستارہ ٹوٹ گیا کوئی نیا بن گیا۔ وہ اُن کی اس دلیل سے مطمئن نہ ہوا تو اس نے ان میں سے جو سب سے زیادہ عالم اور سچا تھا اسے خلوت میں بلا کر اس واقعے کی حقیقت دریافت کی۔ اس نے کہا۔ ہم نے پہلی کتابوں میں لکھا دیکھا ہے اور پڑھا ہے کہ ان دنوں ملک عرب میں ایک پیغمبر خاتم پیغمبراں مبعوث ہوں گے اور اس دیار کے مشرکین اُن سے معجزہ طلب کریں گے وہ یہی معجزہ ہے جو آپ نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جب اس نے یہ بات سنی تو اسے شرح صدر ہو گیا اور یقین و اطمینان آ گیا۔ اپنے وزیر کو جس کا نام (برمح) تھا طلب کیا اور اس راز کو بیان کر کے کہا۔ تو فوراً وہاں جا اور اُن سے شرف ملاقات کر۔ انھیں پان کے پتے جا کر تحفتاً پیش کرنا مگر پان کے لوازمات (کتھا چھالی وغیرہ) ان سے چھپا کر رکھنا۔ اگر وہ تجھ سے اس کے لوازمات بھی طلب کریں تو سمجھ لینا کہ وہ خاتم النبیین ہیں ورنہ واپس آ جانا۔ جب وزیر وہاں پہنچا اور آنحضرت سے ملاقات کی اور بغیر لوازمات پان پیش کیے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ان کے لوازمات تیرے آقا نے چھپا کر رکھنے کے لیے کہا ہے وہ بھی تو نکال۔ وزیر نے جب یہ معجزہ دیکھا ایمان لے آیا اور اپنے آقا کی جانب سے بھی آپ کے دست مبارک پر بیعت ایمان کی۔ آنحضرت نے اس کے آقا راجہ بھوج کا نام ''عبداللہ'' رکھا اور ایک (رسالہ) جس میں شریعت

کے اصول وآداب مندرج تھے عنایت فرمایا۔ جب وزیر واپس آیا سارا ماجرا راجہ بھوج یعنی عبداللہ سے عرض کیا اور یہ بھی کہا کہ میرا نام رکھنا آپ کے حوالے کیا ہے۔ اس نے جب یہ باتیں سنیں وہ رسالہ دیکھا فوراً ایمان لے آیا (کیونکہ خواب میں اسے بھی یہ ماجرا دکھا دیا گیا تھا) اس نے وزیر کا نام "چنگال" رکھا۔ ان دونوں شخصوں نے اپنے تابع فرمان لوگوں میں سے بہت بڑی تعداد کو دعوت اسلام دے کر مسلمان کیا۔ راجہ بھوج کی وفات آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی ہوگئی تھی بعض کہتے ہیں کہ ہجرت کے بعد ہوئی۔ اس واقعہ کا حقیقی علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ (انتہیٰ) میں 1036ھ (1626) میں سید بھوہ بخاری کے لشکر میں رانا سانگا کے ملک میں اُن کے ہمراہ تھا۔ اس کے بعد سید موصوف کے ہمراہ دھارانگری پہنچا تھا اور ان کی قبر کی زیارت کی تھی۔

شیخ خیالی دہلوی

صادق کردار اور واثق کار درویش تھے۔ سوز و گداز، ذوق و شوق، محبت حقیقی کا شغف تھا اسی لیے نہایت ذوق و شوق اور درد کے ساتھ ہندی زبان کا درویشانہ کلام گایا کرتے اور رقص کیا کرتے تھے سننے والوں کے دِلوں پر اُن کے حال کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ دہلی کے مشائخ جیسے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی قدس اللہ اسرارہما کے اعراس کی مجالس میں بھی ان کے ذوق و تواجد کے مشاہدے سے اہل مجلس کا وقت خوش ہو جاتا تھا یعنی ان پر بھی حال طاری ہو جاتا تھا۔ سبھی لوگوں کو ان کی وضع اور طور طریق پسند آتے تھے۔ سب کو اُن کے رقص و سرود میں توحید و یگانگی کے حال سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور حاصل ہوتا تھا۔ آخر وہ بھی رقص کرنے اور گانے لگتے تھے کیونکہ ان کا کلام کسی کو گراں نہ ہوتا تھا ان کا کلام شیخ اوحدالدین کرمانی، کہ جن کا ذکر "نفحات الانس" میں ہے، کے اشعار کی بازگشت ہے۔

تا جنبشِ دست ہست مادام سایہ متحرک است تا کام
چون سایہ زدست یافت مایہ پس نیست خود اندر اصل سایہ [1]

1 جب تک ہاتھ ہل رہا ہے اس کا سایہ بھی ساتھ ساتھ جنبش میں ہے کیونکہ سائے نے یہ حرکت ہاتھ سے لی ہے تو سائے کی خود کوئی اصل نہ رہی۔

چیزے کہ وجود او بخود نیست — ہستیش نہادن از خرد نیست

ہست است لیک ہست مطلق — نزدیک حکیم نیست جز حق

ہستی کہ بحق قوام دارد — او نیست و لیک نام دارد

بر نقش خود است فتنہ نقاش — کس نیست درین میان تو خود باش

خود گفت حقیقت و خود آن شنید — و آن روی کہ خود نمود خود دید

پس باد یقین کہ واللہ — معبود حقیقی نیست سوی اللہ [1]

شیخ خیالی ایسی بے تکلف اور سادہ روش رکھتے تھے کہ اہل دل لوگ اُن سے ملاقات کر کے مست اور خوش ہو کر اُٹھتے تھے۔ کبھی کبھی وہ جامع مسجد فیروزی میں بھی تشریف رکھتے تھے۔ ایک دن اُن کا خواجہ ابرار سے سامنا ہو گیا تو اُن سے کہا "آیے میرے جوہر (ذات)"۔ خواجہ یہ سن کر مسکرائے اور دونوں میں خوب خوب صحبت گرم رہی۔ میرے شیخ ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ وہ خدا کے مقبول اور دوست ہیں۔ میں نے 1035ھ (1625) تک تو دہلی میں ان کی صحبت اُٹھائی اور خوب محظوظ ہوا مگر پھر نہ معلوم وہ کہاں چلے گئے۔

شیخ محبا فطرت

والا طینت شیخ محبا فطرت دنیا کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہیں۔ آزاد مزاج موحد اُن کا باطن درویشی کی باریکیوں کی آماجگاہ اور ظاہر میں شریعت پر ان کی استقامت پہاڑوں جیسی ہے۔ اُن کی گمنامی اور استغراق کی حالت سے ایسا لگتا ہے کہ ہمیشہ رجال الغیب کی صحبت میں رہتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت الیاس کے ہم جلیس۔ وہ میرے شیخ کے حد درجہ نیاز مند اور

---

1 جس چیز کا وجود خود بخود نہیں ہے اس کی ہستی ماننا عقل مندی کا کام نہیں۔ مانا کہ خارج میں اس کی ہستی ہے بھی مگر ہستی مطلق تو علاوہ حق تعالی کے اہل خرد کے نزدیک کسی کی نہیں۔ جو ہستی حق سے قائم ہے اس کا ہونا، نہ ہونا ہے بس نام کو ہستی ہے ورنہ نیستی ہے۔ نقاش اپنے نقش پر خود ہی فریفتہ ہے اب درمیان میں کوئی نہ رہا بس ایک تیری ذات سلامت رہے۔ خود اپنی حقیقت کہتا ہے خود ہی سنتا ہے۔ اپنا چہرہ خود ہی دکھاتا اور خود دیکھتا ہے پس یقین مان کہ واللہ معبود حقیقی اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں)۔ (انتہی)

شاگستر ہیں۔ کبھی کبھی صحبت کا اتفاق ہوتا تھا۔ مگر اب ایک قرن سے بھی زیادہ گزر گیا کہ وہ جامع مسجد فیروزی کے متصل اپنے گوشۂ تنہائی میں سب سے علاحدگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں ان کے ابتداے حال سے ہی انھیں جانتا ہوں۔ کیونکہ وہ امیروں کی صحبت ترک کر چکے ہیں اوران کی صحبت سے انھیں وحشت ہوتی ہے اسی لیے انھوں نے گوشہ گیری اختیار کر لی ہے تب سے احوال عجیب اور کلام غریب لیے ان کی زندگی ایک ہی انداز میں گزر رہی ہے۔ وہ نادر کردار اور غیر مکرر گفتار کے حامل ہیں۔ جس کی نہ یافت آسان ہے، نہ بیان ممکن۔ انھوں نے نظم ونثر میں اپنا ایک نرالا طور نکالا ہے جو بظاہر اگلے پچھلوں کے قول وکلام سے بالکل الگ ہے۔ اس کلام کے معنی کا حل کرنا دشواری سے خالی نہیں .... میرے شیخ نے جوانی کے دِنوں میں جب وہ شعروشاعری میں مشغول رہتے تھے، ان کے طرز پر شعر کہہ کر اور عبارت لکھ کر انھیں دِکھائی کہ یہ میری شاعری ہے۔ جب انھوں نے پڑھا تو حیرت میں آ گئے اور کھل اٹھے۔ اور کہا کہ یہ طرز بعض شعرا قدیم کا رہا ہے۔ (تا کہ کسی اجنبی اور نااہل کی سمجھ میں نہ آسکے)۔ میرے شیخ کی اس طرز کی غزلوں میں یہ چند شعر پیش ہیں۔

اے ہمہ سال آزردنِ ما
ژند و پاژند و در رخسار تواند
بالب لعل تو جانہا پیوند
طریم بے دو رُخ رنج الفت
گر چہ خون چو شدم از دیدہ و دل
(ہمگر ہست ترا نیست کرم
کے بر آریم بتوزیر کی چودہر
آورد جنگ افتد بترس)
ہست آوند من این بس کز غم
شادی تو ہمہ آمودہ ہم
معدن حِلم و کرم ہچو نبی

چون فلک جن پر زلفت کرد
گلستان از پئے شان چون است
از سرموے تو دلہا دردا
علم شد جز دو لب تو رسوا
من فرو در کشش ہچوابا
شیخ اگر نیست مراہست بلا
درک من خاک صفت ماند بخانہ ہما
اگر از غند بود کس پسرا
نہ مرا خواب بود نہ آسا
داروے تو ہمہ آغاز بدا
خلف الصدق علی شاہ فنا

آنکہ از سایۂ ابراسایش گل خورشید د مد جاے گیا
آنکہ چون تیغ علی قاطعۂ کفر آنکہ چون تیر فرستد بہوا
گردن ماہ شود سیہ گزین سینۂ چرخ شود پشت کرا

میں نے بھی اس کے تتبع میں ایک قصیدہ کہا ہے وہ یہ ہے۔

حب الی قلب را بشان بداہ ہست تمثال حبۃ البلقا۔الخ

اسراریہ کے اتمام کے دوسال کے بعد 1070ھ (1660) میں محبا فطرت دنیا سے رخصت ہو گئے اور خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے آستانے میں دفن ہوئے۔ اسی دوران میرے شیخ نے مجھے اپنے خط کے حاشیے میں یہ دو جملے بھی ارقام فرمائے کہ

آج جبکہ 25 محرم الحرام ہے ملا محبا (فطرت) دوسری دنیا کو چل بسے۔
''واللہ، اچھے آدمی تھے، اللہ انھیں بخشے۔''

درویش مجہول

1027ھ (1617) میں ایک دن میں فرید آباد کی مسجد کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب جمال پُر شکوہ نورانی طلعت باوقار درویش کہیں سے پہنچے اور صحن مسجد کے ایک گوشے میں تنہا جا بیٹھے۔ بس انھیں دیکھنا تھا کہ میں از خود رفتہ ہو اُٹھا اور مُلاقات کی۔ سلام کر کے باادب بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس وقت میں جوان تھا اور اپنے شیخ سے ایک دو ملاقاتیں ہی کی تھیں مگر شیخ کی ہیبت سے جیسا کہ دل چاہتا تھا بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ میرا حال جیسا کہ میرے شیخ نے اپنے ابتدائی زمانے میں یہ شعر کہا ہے، کے مطابق تھا

بلبل زادب پَر نزند در صفِ گُل زار
تا گل ز طلبگاریٔ او لب نکشاید[1]

اس واقع کی تفصیل میں نے اپنے رسالے ''جمع الجمع'' میں لکھی ہے۔ اجمالاً اس کتاب کے خاتمے میں بھی آئے گی انشاء اللہ سبحانہ۔ القصہ جب میں اپنے شیخ کے صوری اور معنوی فیض کی دریابی اور دریافت میں لگا ہوا تھا تو درویشان با استقامت اور مجاذیب اہل کرامت کی زبان سے نکلے

1 جب تک گل بلبل کی طلب کا اظہار اپنے لب سے نہیں کرتا بلبل ادباً گلشن میں پَر بھی نہیں مارتی ہے۔

جملوں اور بزرگوں کی کتابوں سے اپنے حال کے موافق اپنے شیخ کی صحبت میں مطلب براری کی تائید کے سلسلے میں فال لیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن "دیوانِ حافظ" سے یہ فال نکلی۔

حافظ طمع مبر زعنایت کہ عاقبت　　آتش زند بخرمن غم دودِ آہِ تو[1]

ایک دن اسی مطلب میں یہ شعر نکلے۔

بیادل درخم گیسوے اوبند　　اگرخواہی خلاص ورستگاری
بیاحافظ نبیذ تلخ کن نوش　　چرا عمرے بغفلت می گذاری[2]

ایک دن بغرض فال جب کتاب "نزہتہ الارواح" کھول کر دیکھی تو اسی حصول مطلب کی تائید میں یہ اشعار نکلے۔ مثنوی

زمن جان پدر این پند بپذیر　　برو فتراک صاحب دولتے گیر
کہ قطرہ تا صدف را درنیابد　　نگردد گوہر و روشن نتابد
کہ سنگ از تربیت لعلست ویا قوت　　چنانچہ اطلس سرخ از تربیت توت
اگر تاثیر صحبت نیست اے دوں　　نیا ید ہیچ مرغ از بیضہ بیروں
اساس کار وقتے محکم افتاد　　کہ موسیٰ را خضر می گردد اوستاد
چوں ممکن نیست رفیق بے دلیلے　　بباید مصطفیٰ را جبرئیلے[3]

1　حافظ ناامید مت ہو آخر کار ان کی مہربانی سے غیر اللہ سے اگر تجھے آزادی اور رستگاری کی تمنا ہے تو ایک دن تیری آہوں کا دھواں خرمن غم کو جلا ڈالے گا۔ یعنی وصل حاصل ہو جائے گا۔

2　آ، اے دل اس کے گیسوؤں کے خموں میں خود کو پھنسا لے یعنی اس کی بلاؤں پر دل سے راضی ہو جا۔ رضائے محبوب کا تلخ نبیذ پی لے کیوں غفلت میں عمر گزار رہا ہے۔

3　اے جانِ پدر یہ نصیحت میری مان لے۔ جا کسی صاحب دولت کا توشے دان اُٹھا لے جب تک قطرہ کسی صدف سے ہم صحبت نہیں ہوتا نہ گوہر بنتا ہے نہ روشنی ہی دیتا ہے۔ کہ تربیت کے بعد ہی پتھر لعل و یاقوت بنتا ہے۔ شہتوت کے کیڑے کی رطوبت سے سرخ اطلس تیار ہوتا ہے۔ اے کم ظرف اگر تاثیرِ صحبت نہ ہو تو کبھی بھی کوئی پرندہ انڈے سے باہر نہ آئے۔ بنیاد کار اس وقت مضبوط اور پائیدار ہوتی ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام جیسے بھی خضر جیسوں کو استاد بنائیں۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی ہیں اور خضر ولی۔ بے رہبر کے چلنا جبکہ ممکن ہی نہیں تو مصطفیٰ (ﷺ) کو بھی جبریل کی ضرورت ہے۔

القصہ ان درویش مجہول سے بھی باطنی طور پر میں نے مکمل نیاز مندی کے ساتھ درخواست کی تا کہ ان کی زبان سے نکلے الفاظ میرے لیے نیک فال بنیں اور دل مضطر کی تسلی کا سامان کچھ بہم ہو۔ انھوں نے بڑی لطافت اور بشاشت کے ساتھ میری جانب رُخ کر کے یہ شعر پڑھا۔

اے جوان سرو قد گوی ببر پیش ازاں کز قامت چوگاں کنند [1]

میں نے سمجھ لیا کہ وہ مشرف القلوب بزرگ ہیں۔ میرا وقت خوش ہو گیا یعنی مجھ پر سرور وانبساط طاری ہو گیا اور میری سرگرمی، طلب حق میں بڑھ گئی اور میں نے ان کی خوب خدمت کی۔ دوسرے دن نامعلوم کہاں چلے گئے۔ آخر مدت دراز کے بعد ان درویش کو میں نے دہلی میں دیکھا۔ میں بھی انھیں پہچان گیا اور انھوں نے بھی مجھے پہچان لیا۔ لیکن اس دن میں اپنے شیخ کی صحبت ومحبت کی گرمی سے سعادت اندوز تھا۔ وہ از روئے معنی جان گئے کہ میں جس شے کی تلاش میں تھا مجھے حاصل ہو گئی ہے۔ میں بھی سمجھ گیا کہ وہ میری حالتِ یافت سے مطلع ہو گئے ہیں۔ اس موقع پر مجھے ایک مثل خوب یاد آئی کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ عشق کے چار درجے ہیں۔

اول درجہ یہ کہ معشوق کو پتا چل جائے کہ فلاں میرا عاشق ہے۔

دوسرا درجہ یہ کہ عاشق جان جائے کہ معشوق سمجھ گیا ہے کہ میں اس کا عاشق ہوں۔

تیسرا درجہ یہ کہ معشوق یہ سمجھ جائے کہ میرا عاشق یہ سمجھ گیا ہے کہ میں اس کے عاشق ہونے سے واقف ہوں۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ عاشق کو تحقیق ہو جائے کہ میرا معشوق یہ سمجھ گیا ہے کہ اس کا عاشق یہ سمجھ چکا ہے کہ میں اس کے عاشق ہونے سے آگاہ ہوں۔ (انتہی)

جس زمانے میں میں نے یہ نکتہ سنا تھا اُسی وقت اسی کے مطابق میں نے ایک رباعی کہی تھی۔

چوں عاشق و معشوق شود یکدل وراز کہ ہیچ دلے نیابد آں راز و نیاز
دو آئینہ را مقابلش دار و بہ بیں وے درروے دوے دروے وشمار باز [2]

---

1 اے سرو جیسے قد والے جوان میدانِ زندگی سے بازی لے جا اس سے پہلے کہ زمانہ تجھے چوگان کی گیند کی طرح ادھر اُدھر پریشان پھرائے۔

2 جب عاشق ومعشوق یک دل اور یک راز ہو جاتے ہیں تو کوئی بھی اُن کے راز و نیاز کو نہیں پا سکتا۔ دو آئینوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھ یہ اُس میں وہ اس میں نظر آئے گا (اس طرح بار بار) تو گن بھی نہیں سکتا۔

آخر ختم مجلس پر وہ درویش بھی کہیں چلے گئے اور میں بھی خدمت شیخ سے واپسی پر خود سے مخاطب تھا۔

آں شد کہ بار منتِ ملاح بردے   گوہر چو دست داد، بدریا چہ حاجت است[1]

1039ھ (1629) میں جب میں قصبہ خوشاب میں تھا تو وہاں کے درویش اور فقراء حضرات کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا تو بعض لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ انھیں دنوں اس دیار کا ایک تاجر دیوانہ ہو گیا ہے۔ صحرا نوردی کرتا ہے اور شہر میں نہیں آتا۔ بہت کم بات کرتا ہے اور اگر کبھی بولتا ہے تو ہذیان بکتا ہے۔ اکثر فلاں صحرا کے حوض کے کنارے بیٹھا کرتا ہے اور کسی سے مانوس نہیں ہے۔ مجھ پر اس کا شوق دیدار غالب آیا اور ایک دن صبح کے وقت تنہا گیا تو اس کو اسی حوض کے کنارے بیٹھا پایا۔ دیکھا وہ پچاس ساٹھ سال کی عمر کے ایک پُر خمار آنکھوں والے خوش منظر آدمی ہیں۔ نیلگوں رنگ کی گدڑی پہنے، پشمینے کی ٹوپی اوڑھے، استغراق کی حالت میں دنیا اور دنیا والوں سے آنکھ مونڈے ہوئے، اپنے آپے اور تمام غیر اللہ سے سیر۔ ان کے نورانی چہرے کے جمال باکمال کو دیکھ کر رسالہ ''قدسیہ بہائیہ'' کی یہ رباعی مجھے یاد آگئی۔

سیر آمدہ ز خویشتن می باید   برخاستہ ز جان و تن می باید
در ہر گامے ہزار بند افزونست   زین کرم روے بند شکن می باید[2]

میں بھی از روئے نیاز مندی دیر تک ان کے آگے خاموش بیٹھا رہا۔ کافی دیر کے بعد انھوں نے مجھ پر ایک عجیب نگاہ ڈالی۔ ہشاش بشاش چہرے کے اندازِ نادرہ سے اشارے کرنے شروع کیے اور بہت سی عجیب حرکتیں چشم و ابرو کے اشارے سے ظاہر کیں کہ میری حالت دل بدل گئی، خود سے گم ہو گیا اور ایک ساعت تک مجھے پتا ہی نہ رہا کہ وہ کون ہیں اور میں کون ہوں۔ جب مجھے افاقہ ہوا تو انھوں نے مسکرا کر فرمایا یہی حال ظاہراً اور باطناً ہونا چاہیے صرف باطن کو ہی اس حال میں قید نہ رکھنا چاہیے۔ فراغت سے بھی فراغت چاہیے۔ اسی قسم کی اور بہت سی باتیں (توحید وجودی) کی

---

1 وہ زمانے گئے جبکہ ہم ملاح کے احسان کا بار اٹھاتے تھے جب گوہر حاصل ہو گیا تو دریا کی کیا حاجت رہی۔

2 خود سے بیزار اور جان و جسم سے بے نیاز اور گزرا ہوا شخص درکار ہے۔ راہ سلوک میں ہر قدم پر ہزاروں سے بھی زیادہ رکاوٹیں آتی ہیں۔ نہایت تیز رو اور بندشوں کو توڑ کر گزر جانے والا چاہیے۔

کہیں جن کی اس راہ میں بہت قدر و قیمت ہے۔ مجھے اس موقع پر چند اشعار ''فصوص الحکم'' کے یاد آتے ہیں جن کو ایک دن میرے شیخ پڑھ رہے تھے۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

فـان قـلـت بـالتـنـزیـہ کنت مقیداً — و ان قـلـت بـالتشبیـہ کنـت محدداً

وان قـلـت بـالامـریـن کنـت مسلوداً — و ان قـلـت انـمـا ھوا فی المعارف سیداً

فـمـن قـال بـالا شـفـاع کـان مشـرکـاً — و مـن قـال بـالافـراد کـان موحـداً

فـایـاک والتشبیـہ ان کـنـت ثـانیـاً — وایـاک والتـنـزیـہ ان کنت مفـرداً

فـمـاانـت هـوبل انـت هو اِن تـراہٗ — عیـن الاشـیـاء مسروحاً و مقید اً[1]

شاہ بھوانی

سلسلۂ نسب سے وہ علاقہ سنبھل کے ایک برہمن کی اولاد میں ہیں۔ وہ گائیں چرایا کرتے تھے کہ ایک دن ایک صاحب احوال مجذوب اُن کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے نہایت نیازمندی دکھائی۔ چند گائیں دوہ کر اور دوسری اشیائے خوردنی جوان کے پاس تھی دودھ کے ساتھ ان مجذوب کو شکم سیر کھلائیں وہ خوش ہو گئے اور لطف وعنایت کی ایک نظر خاص ان کے حال پر ڈالی اور ان کی حالت متغیر ہو گئی۔ اپنا کار گلہ بانی چھوڑ کوہ و بیابان کی راہ لی اور جذبۂ قوی حاصل کیا۔ مدت دراز کے بعد سنبھل میں آئے اور شیخ ہلالی کے روضے کے قریب جو، اب محلّہ ''ہلالی سرائے'' کہلاتا ہے اقامت گزیں ہو گئے۔ ان کے بعض پڑوسی ان سے گھلے ملے رہتے تھے مگر کوئی ان کے باطنی احوال سے مطلع نہ تھا کہ ایک دن ایک جوان خوبصورت عورت دودھ کی مٹکی لیے ان کے سامنے سے گزری۔

---

1 اگر تو ذاتِ الٰہی کے تنزیہہ بیان کرے تو وہ صرف تنزیہہ میں مقید ہو جائے اور اگر تشبیہ کی بات کرے تو وہ ذات بے رنگ تشبیہ میں محدود ہو جائے گی۔ اگر تو دونوں قول درست کہتا ہے تو یہ اجتماع ضدین ہو جائے گا۔ اور اگر تو نے کہا وہ وہی ہے، تو تو معرفت الٰہی میں سردارِ قوم ہے۔ جس نے کہا وہ جوڑا ہے اس نے شرک کیا اور جس نے کہا وہ تنہا ایک ہے وہ موحد ہے۔ تو، اے مخاطب تو تشبیہ سے بچ اگر چہ تجھے رنگ تشبیہ صاف ہی نظر آئے۔ اور تنزیہہ سے بھی ڈر اگر چہ وہ واحد و یکتا ہی دکھائی دے۔ تو وہ نہیں ہے لیکن وہ ہی تیری حقیقت ہے۔ اجمالاً اور تفصیلاً اگر چہ تو اس کو چیزوں کا (عین) ہی کیوں نہ دیکھے۔

اُن کی بڑی بڑی آنکھیں اور جوانی کا چمکتا رنگ روپ تھا۔ دونوں کی نظر ملی۔ نظر ملتے ہی وہ عورت خود سے بے خبر ہوگئی، اس کا پیر لڑکھڑایا اور دودھ کا برتن اس کے سر سے گر کر ٹوٹ گیا۔ لمحے بھر کے لیے متحیر رہ گئی۔ جب ہوش آیا روتی ہوئی گھر کو چل دی۔ وہ بولے تو کیوں روتی ہے ؟ بولی۔ میرے ماں باپ دودھ کے گر جانے سے مجھ پر خفا ہوں گے، ایک بزرگ کی نذر کرنے کے لیے کھیر پکانا چاہتے تھے۔ انھوں نے عورت کو اپنے قریب بلا کر چپکے سے اس کے کان میں کہا جا دودھ کی جگہ چھپا کر دیگ میں پانی ڈال کر چاول وغیرہ ڈال اور کسی سے نہ کہنا۔ عورت نے ویسا ہی کیا۔ جب دیگ پک گئی اور تقسیم کی گئی تو جس نے کھائی اس سے زیادہ لذیذ شیرینی اس نے عمر بھر نہ کھائی تھی۔ کھانے والے تعجب کرتے تھے آخر یہ راز زبانوں پر آ گیا۔ دوست احباب نے جو اُن کے پاس نشست و برخاست رکھتے تھے اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے انھیں گھیر لیا اور بولے یہ راز کیا تھا؟ بتائیں ہم پر بھی ایسی ہی ایک نظر ڈالیں اور اپنے فیض سے نوازیں۔ وہ اس مطلب سے تنگ دل ہو کر اُٹھے گدڑی ہاتھ پر ڈالی اور وہاں سے چل دیے۔ دوست احباب بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے، انھیں آگے چلتا دیکھتے، ہر چند تیز چلتے مگر انھیں پکڑ نہ پاتے یہاں تک کہ گنگا ندی کے کنارے پہنچ گئے وہ پانی سے گزر کر ایک طرف جا کر نظروں سے غائب ہو گئے مگر وہ لوگ دریا کے کنارے گھاٹ پر جہاں سے وہ گزرے تھے کسی کشتی کا انتظار کرنے لگے۔ ایک ساعت کے بعد ایک کشتی سوار نے دوسری طرف سے آ کر کہا کہ بھوانی کہتا ہے کہ دوستو! تم اپنے گھر لوٹ جاؤ مجھے نہ پا سکو گے۔ ان کا اس سے اور شوق دوبالا ہو گیا اور کشتی پر سوار ہو کر اس طرف آ گئے۔ ان کے قدموں کے نشانات اس ویرانے میں پائے۔ بغیر کسی ارادے کے ان ہی نشانات سے ایک کارواں سرائے میں جا اُترے۔ بھوکے پیاسے، زار و نزار پیروں میں آبلے پڑے ہوئے۔ جب ایک رات گزر گئی ایک شخص رنگ برنگ کے مرغن کھانے لے کر آیا اور ان سے کہا بھوانی نے کہا ہے کہ کھانا کھاؤ اور کل کو اپنے گھروں کو چلے جانا کہ تم مجھے ہرگز نہ پا سکو گے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ بھی دہلی کے اطراف میں چلے گئے اور مدتوں بیابانوں میں گشت لگاتے پھرتے رہے اور کسی جگہ قیام نہ کیا۔ آخر کار حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے روضے کے جوار میں سکونت پذیر ہو گئے

اور برسوں وہاں بسر کیے۔ اس مدت میں جو بھی ان کے پاس جاتا اس پر لطف فرماتے اور کرم فرمائی کرتے۔ سنبھلیوں سے خاص کر بہت ہی مہربانی کا برتاؤ کیا کرتے تھے اور کسی کھانے کی چیز سے تواضع کیے بغیر رخصت نہ کرتے تھے۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ میں جب بھی ان کے پاس جاتا وہ ازراہ لطف و کرم مجھ سے فرماتے ذرا سی دیر ٹھہرو۔ اسی اثنا میں کہیں سے کھانا منگاتے اور مجھے کھلاتے۔ ایسا ہی شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی کے بھائی شیخ عبدالرحیم نقل کرتے ہیں۔ میں بچہ تھا جب میرے والد مجھے شیخ سراج الدین قدس سرہٗ کے عرس میں آنول لے جاتے۔ مشہور ہے کہ شیخ سراج الدین مشائخ کبار میں سے تھے اور شیخ نظام الدین کے ہم عصر تھے۔ جو کبھی کبھی شیخ نظام الدین اولیاء ان کے پاس آنول تشریف لے جاتے تھے۔ اور خوب صحبت نیک گزرتی تھی۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے اشارے پر ہی انھوں نے اس قصبے میں اقامت اختیار کر رکھی تھی۔ ایک بار جب میں اپنے والد کے ساتھ اس قریے میں پہنچا تو شاہ بھوانی بھی دہلی سے آئے ہوئے تھے، والد نے مجھے ان کے پیروں میں ڈال دیا۔ انھوں نے حد درجہ عنایت و کرم میرے حال پر فرمایا۔ جو کچھ انھوں نے اس وقت فرمایا تھا مجھے یاد نہیں آرہا لیکن ان کی شکل جیسی کہ مجنون کی شکل تصویر میں بناتے ہیں مجھے یاد ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں رنگ سرخ تھا۔ آج پچاس سال سے زیادہ ہو گئے کہ ان کی آنکھوں کی رعنائی میری آنکھوں سے (بھولی) نہ گئی۔ اس کے بعد بھی وہ مدتوں جیے لیکن پھر مجھے ان کا دیدار میسر نہ ہوا۔ آخر وقت وہ روضۂ حضرت نظام الدین سے ''جور باغ'' چلے گئے تھے اور وہیں 1030ھ (1620) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ قبر بھی اسی باغ میں ہے۔ میرے شیخ نے فرمایا کہ ایک رات میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ مجھ پر تصرف باطنی میں مشغول ہیں اور ایک کیفیت پیش آئی ہے۔ اسی اثنا میں شیخ الہداد، آپہنچے اور کہا خواجگان نقشبندیہ کا جذبہ اور ہی ہے۔ بھوانی نام کا ایک اور مجذوب بھی قریبی زمانے میں سنبھل میں گزرا ہے جو ہذیان بکتا تھا۔ بہت سی ہڈیاں اکٹھی کر کے جنگل کو لے جاتا تھا۔ بعض لوگ اس کی کرامات بھی نقل کرتے ہیں کہ اس کو دوسرے شہروں میں بھی دیکھا گیا حالانکہ اس زمانے میں وہ سنبھل میں تھا۔ میں اس کو 1055ھ (1645) تک تو دیکھتا رہا، آخر پتا نہیں کہاں چلا گیا۔

شاہ دولہ

وہ اصلاً لاہور کے دیہات کے ایک ہندو کے بیٹے ہیں۔ بچپن ہی میں ان کو اس راہ عشق الٰہی کا داعیہ پیدا ہو گیا اور سیالکوٹ میں شیخ نصیر الدین بہاری کی خدمت سے جو کہ ایک با معنی مجذوب اور مولانا عبدالحکیم کے والد محترم شیخ شمس الدین کے صحبت یافتہ تھے پیوستہ ہو گئے۔ مدتوں ان کی خدمات بجالائے اور مقبول نظر بنے اور خوب خوب بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہ دولہ کہتے ہیں کہ ''اوسی یک اکھر مینوا کھا''، یعنی انھوں نے مجھ سے ایک جملہ کہا۔ اس کے بعد شاہ دولہ، شاہ شیدائی سیالکوٹی کی خدمت میں جو کہ خود ایک صاحب کرامت مجذوب تھے رہے۔ ان شیدائی سیالکوٹی کے بہت سے فرزند اور مریدین اس راہ کے طلبگار ہوئے ہیں۔ سب نے اپنی اپنی استعداد کے بقدر حصہ پایا لیکن شیدائی نے کسی کو اپنے سینے کی نعمت خاص عطا نہ فرمائی اور نہ اپنا خلیفہ بنایا۔ جب ان کا وقتِ آخر آیا تو چاہا کہ اپنے کسی کامل مرید کو یہ خاص نعمت و دولت عطا فرمائیں۔ آواز دی کہ دروازے پر کون ہے وہاں دولہ کے علاوہ کوئی حاضر نہ تھا جواب دیا میں ہوں، دولہ۔ شیدا خاموش ہو گئے۔ ایک لمحے بعد پھر آواز دی۔ وہی بات کہی اور وہی جواب سُنا۔ آخر جب یقین ہو گیا کہ میں جانے ہی والا ہوں بہت تیز آواز میں پکارے دوستوں میں سے کوئی حاضر ہے۔ پھر شیخ دولہ نے جواب دیا، میں ہوں، دولہ۔ شیدا نے کہا ''حَسبۂ و نسبۂ مولٰی'' (اللہ تعالٰی نے اسے چُن لیا اور اس کے لیے وہ کافی ہے) اپنے نزدیک بلایا اور وہ دولت و نعمت باطنی جُبہ اور گدڑی جو شیخ شیدا کو صاحبان دولت روحانی سے پہنچی تھی انھیں عطا کی اور خود دنیا سے چل دیے۔ اسی وقت ان پر ایک خاص حالت اور کیفیت طاری ہوئی اور جذبہ قوی حاصل ہوا۔ اس معاملے سے شیخ شیدا کے متعلقین اور مریدین کی حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور چاہا کہ جبہ اور گدڑی ان سے لے لیں وہ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور گجرات چلے گئے اور اس شہر کے کنارے اپنے لیے ایک خلوت خانہ تیار کرایا۔ باغ اور آستانہ بھی۔ بہت ہی کم مدت میں ان کے تصرفات کی شہرت ہونے لگی۔ کبھی کہیں سے زمین کھودتے اور وہاں سے اینٹ پتھر نکال کر عمارت کے کام میں لاتے، دوسری جگہ سے لکڑی کی بلی نکالتے جو بہت ہی لمبی اور موٹی ہوتی تھیں۔ شہر کے کنارے ایک سرائے تیار

کرائی تا کہ جاڑا اور برسات میں کابل اور کشمیر سے ہندستان آنے والے مسافر آئیں تو وہاں آسانی کے ساتھ ٹھہریں، فقرا مساکین بے سرو سامان لشکریوں کی رعایت حال اور ضرورت کے سامان مہیا کرنا اپنے ذمے کر رکھا تھا۔ ان کے پاس سے ہر چھوٹا بڑا اپنی طلب کے موافق بہرہ یاب ہو کر جاتا تھا۔ مٹھائی اور کھانا ہر ایک کو پیش فرمانا ان کا عام دستور تھا۔ ان کی بہت کرامات نقل کی جاتی ہیں۔ میر مفاخر حسین ابن میر عماد کہ جن کا ذکر آگے آئے گا جو بڑے بابرکت وسلامت نوجوان ہیں۔ شیخ محمد معصوم سرہندی کے مرید اور میرے شیخ کے نیازمندوں اور معتقدین میں ہیں۔ میرے شیخ کی بیٹی بی بی ستی جن کا ذکر بھی آئندہ آئے گا ان کی اہلیہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ گجرات میں سکونت پذیر تھے مجھے اس زمانے میں ایک بہت تکلیف دہ بیماری ہوگئی جس سے میں بہت پریشان تھا۔ میرے دل میں یہ آتا کہ اگر میں شاہ دولہ کے پاس جاؤں تو ٹھیک ہو جاؤں گا لیکن مجھے وہاں کوئی نہ لے گیا۔ ایک دن اس خیال نے غلبہ اختیار کر لیا اور میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ مجھے شاہ دولہ کے پاس لے چلو۔ یہ کہہ کر میں نے کمزوری کی وجہ سے آنکھ بند کر لی تو میں نے خود کو شاہ کے روبرو بیٹھا دیکھا۔ جب لوگوں نے میری حالت غیر ہوتی دیکھی تو مجھے اُٹھایا اور روانہ ہوئے۔ میں نے کہا۔ کہاں لے جا رہے ہو؟ کہا۔ ''شاہ دولہ کے پاس''، میں نے کہا شاہ تو خود میرے گھر میں بیٹھے ہیں۔ آخر جب میں ان کی خدمت میں پہنچا دیکھتے ہی فرمایا ''تو مجھے یاد کرتا تھا'' لطف فرمایا اور کچھ شکر مجھے کھانے کو دی۔ کھائی اور اچھا ہو گیا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ میرے بھائی شرف الدین حسین شاہ دولہ کے ساتھ عید کی نماز میں تھے۔ ان کے برابر میں کھڑے ایک آدمی کے دل میں خیال آیا کہ اگر شاہ دولہ میرے نزدیک ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا ، اس خیال نے کئی بار غلبہ کیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد شاہ نے اس سے آہستہ سے کہا۔ '' اے بھائی دل نزدیک ہونا چاہیے تن نزدیک ہو نہ ہو'' وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک دن میرے بھائی مظفر حسین شاہ دولہ کے امتحان کی غرض سے ان کے پاس پہنچے کہ اگر آج وہ بجائے شکر کے مجھے میوہ دیں گے تو سمجھوں گا کہ وہ مشرف القلوب ہیں۔ شاہ نے تمام حاضرین کے ساتھ ساتھ اپنی عادت کے موافق انھیں بھی شکر دی اور رخصت کیا۔ روانہ ہوتے ہوئے ان کے دل میں ایک خاص قسم کے انکار نے آنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے شاہ کی خدمت میں میوہ پیش کیا۔ شاہ نے

لوگوں کے مجمع میں سے انھیں دوبارہ طلب کیا اور کچھ میوہ عطا فرمایا تب رخصت کیا۔ محمد صادق
لکھنوی کہ جن کا ذکر شعرا میں آئے گا کہتے ہیں کہ ایک دن میں اور شیخ محب اللہ کے یارانِ طریقت
میں سے شیخ عبداللہ، شاہ دولہ کے پاس گئے اور یہ امید لے کر گئے کہ ان سے اس راہ کی باتیں سنیں
گے اور فیض اُٹھائیں گے۔ شاہ نے جو اول بات کہی وہ یہ تھی۔ ''اے یارو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حکم
فرمایا ہے اور جو پیغمبر ﷺ کی سنت ہے اس پر عامل اور مستقیم رہنا چاہیے اور کچھ درکار نہیں۔ جب میں
1051ھ (1641) میں قندھار سے لوٹتے ہوئے غزنی کی راہ سے کابل پہنچا تو دورانِ واپسی
ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ کی قبر کی حاضری دی۔ اس قبر پر نہ کوئی عمارت ہے اور نہ صُفّہ وغیرہ کے
تکلفات۔ چھوٹی چھوٹی پتھریاں چھوٹے سے چبوترے پر بچھی ہوئی ہیں۔ مشہور ہے اس بادشاہ
نے خود یہی وصیت کی تھی۔ اس قبر پر میں نے اور قبروں سے زیادہ نورانیت اور لطافت محسوس کی۔
یہ بھی روایت چلی آتی ہے کہ وہ بادشاہ مشرب درویشی اور قلندری رکھتا تھا۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ اس
قبر کے اردگرد جو بادشاہ کے عزیزوں کی اور قبریں ہیں انھیں سنگ مرمر اور سونے کے خوشنما پتروں
سے آراستہ کیا گیا ہے اور وہ قبرستان ایک باغ میں بلند زمین میں نہایت صاف ستھری جگہ واقع ہے
وہاں میں نے نمازِ جمعہ ادا کی اور شہر میں داخل ہوا۔ بعض بزرگوں کے آستانوں پر پہنچا، فیض یاب
ہوا۔ ان بزرگ مقاموں کی تفصیل مجھے اچھی طرح یاد نہ رہی اس لیے تحریر میں نہ آئی۔ آخر جب
میں گجرات پہنچا شاہ دولہ سے ملا۔ صبح کا وقت تھا۔ انھیں تنہا بیٹھا پایا۔ ایک روشن اور نورانی چہرے
والے باوقار پر ہیبت بزرگ تھے۔ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھا۔ مجھ پر لطف فرمایا اور اپنے ہاتھ
میں شکر لی اور مجھ سے کہا اے بھائی لے۔ میں نے لی اور رخصت ہوا۔ (اولاً) جب میں ان کے
آستانے میں داخل ہوا، تو دیکھا کہ نہایت سرسبز و شاداب باغ کے اندر ہے اور اس باغ میں جابجا
وحشی جانور، چرندے، پرندے، ہرن، پہاڑی بکرا، گوزن، گورخر، شیر، چیتا، ریچھ وغیرہ اور مختلف قسم
کے طیور بندھے ہوئے اور پنجروں میں قید ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کا کہنا ہے کہ اس دورِ آخر کے
لوگوں کی صحبت سے ان حیوانات کی صحبت بہت اچھی لگتی ہے۔ میں نے ان کے بعض یاروں کو
حالت جذب اور کیفیات نیک سے متصف پایا۔ لوگ ان کی بھی کراتیں بیان کرتے ہیں۔
ہاں اللہ کے دوستوں کی صحبت کی تاثیر ثابت و مقرر ہے۔ اس راہ کے پہلوانوں کی ایک معتبر حالت

تسلیم شدہ ہے جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے۔

گر نتوانی زخود پر یدن در پہلوئے پرندگان ما باش [1]

یار خنداں باغ راخنداں کند صحبت مردانت از مرداں کند [2]

جیسے کھلتی آگ باغ کو جلا کر آگ کی طرح کھلا دیتی ہے یعنی سرخ کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان مرداں خدا کی صحبت جن کے سینوں میں آگ لگی ہوئی ہے اپنے مصاحب کو بھی صاحب آتش عشق الٰہی بنا دیتی ہے۔

شاہ جہاں گیر سنبھلی

صاحب احوال و کرامات، کشف و آیات مجذوبوں میں سے تھے۔ رنگ کے کالے اور ہیبت ناک چہرے والے اور دراز قد تھے۔ اکثر بزرگ ان کا احترام کرتے تھے اور انھیں بزرگ سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ اعزاز و اکرام سے پیش آتے تھے۔ وہ اناج کی پوس کھایا کرتے تھے۔ (فارسی میں لفظ پوست ہے جس کے معنی بھوسی، چھلکا، چھال وغیرہ آتے ہیں) جو چیز بھی سامنے پڑتی اس میں بھوسی ملا کر کھایا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک دن ایک سانپ کو بھوسی میں ملا کر کھا گئے۔ کہتے ہیں کہ اکثر وہ بھوسی کو پانی میں ڈالتے اور بغیر گلے جلد پانی سے نکال لیتے اس کو پھینکتے اور وہی پانی پی جاتے۔ دوسرے لوگوں کے برخلاف بنا ملے ہی نگل جاتے اور ان کو اس میں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ ان کی اس بات کا لوگوں نے بارہا امتحان بھی لیا اور تجربہ کیا ہے۔ یہ ان کا تصرف تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ کسی راستے سے جارہے تھے، ایک آدمی سامنے آیا تو اس سے کہا پوست کے لیے ایک فلس دے۔ اس شخص نے بے اعتنائی دکھائی اور کہا میرے پاس نہیں ہے۔ وہ بولے۔ وہ فلس جو تونے دستار میں باندھ رکھا ہے اور فلاں کام کے لیے لے جارہا ہے، نکال کے دے۔ وہ ڈر گیا اور لرزہ براندام ہو گیا کیونکہ یہی بات تھی۔

---

1 اگر تو خود نہیں اُڑ سکتا تو ہماری راہ کے اُڑنے والوں کے پہلو میں رہ۔ ان کا دامن تھام لے۔ یعنی اللہ والوں کی صحبت اختیار کر۔

2 ہنسنے والا یار اپنے یاروں کو بھی ہنسا دیتا ہے۔ مردوں کی صحبت مرد بنا دیتی ہے۔

فوراً دستار سے نکالا اور انھیں دیا۔ جس دن اُن سے یہ خارق عادت پیش آئی تھی اس وقت میں بچہ تھا ، میں نے بھی اس کا چرچہ سنا تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ میر میراں خواجہ زادۂ عالی نسب سنبھل شہر کے حاکم تھے۔ ایک روز انھوں نے شاہ جہاں گیر کو دیکھ کر ایک ہاتھ میں خربوزہ لیا اور دوسرے ہاتھ میں روپیہ اور ان کے روبرو آ کر کہا۔ یہ آپ کی نذر ہے۔ کہا۔ اچھا نذرانہ لائے ہو مگر چل چلاؤ کے وقت۔ خربوزہ کھالیا اور روپیہ حوض ملک میں ڈال دیا۔ تیسرے روز میر میراں کا سنبھل سے تبادلہ ہو گیا اور چلے گئے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ سنبھل میں ایک ظالم، مردم آزار حاکم تھا کہ ایک عالَم اس کے ہاتھ سے تنگ آ چکا تھا۔ ایک دن اس کی شکایت ان سے کی گئی کہ توجہ فرمائیں کہ مخلوق خدا اس کے ظلم سے رہائی پا جائے۔ شاہ جہاں گیر نے کہا۔ ''رفت رفت'' یا ''می رودمی رود'' انھیں دنوں اس حاکم کو تبدیل کر دیا گیا اور چھوٹے بڑے اس کے چنگل سے آزاد ہو گئے۔ بچپن میں، میں نے بھی اس حاکم کو دیکھا تھا۔ عماد خاں نام تھا۔ میں بہت ہی کم عمر تھا۔ جب ملا عبدالکریم کے مدرسے میں ایک دن شاہ جہاں گیر کا آنا ہوا اور میرے استاد سے ''پوست'' طلب کیا۔ نیم کے درخت کے پتے بھی اس کے ساتھ ملا کر دیر تک پانی میں ملے اور بڑے ذوق کے ساتھ پی گئے۔ ان کے چہرے کے رعب و داب اور ہیبت سے ہم سب باادب کھڑے تھے۔ ان کی بہت سی کرامتیں بیان کرتے ہیں۔ ان کی وفات کا سال 1030ھ (1620) ہے اور قبر اعلم العلماء شیخ حاتم سنبھلی کے روضے کے نزدیک ہے۔ شیخ حاتم کی اولادوں کا شاہ جہاں گیر کے بارے میں حسن اعتقاد تھا۔ شاہ جہاں گیر کی وفات کے بعد شہری لوگ ان کی قبر کی زیارت کے لیے آتے تھے اور اپنی حاجتوں اور مرادوں کے پورا ہونے کے لیے ان کے لیے نذر مانتے تھے۔ اکثر لوگوں کی حاجت برائی اس سے ہو جاتی اور اپنی مراد کو پہنچ جاتے تھے۔ کچھ مدت تک یہ حال رہا پھر ان کے تصرفات کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ جب میں چھوٹا تھا اس وقت جہاں گیر بادشاہ کے زمانے میں دہلی کے کوشک بروز محلّہ میں ایک شہید کی قبر ظاہر ہوئی۔ اس شہید کو ''توعان شہید'' کہتے ہیں۔ کچھ دنوں تک تو زائرین اور حاجت مندوں کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ بہت سے لوگ کثرت زائرین کے سبب زیارت نہ کر پاتے تھے۔ اس سے بے شمار نقدی غلہ اور سونا چاندی نذرانے میں آتا تھا۔ اس قبر کے خادم کا ''بلّو'' نام تھا۔ کچھ دنوں بعد ان شہید کی قبر کا نام و نشان بھی نہ رہا (چہ جائیکہ نذرانے آتے) واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

میں نے ایک بزرگ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ اولیاء اللہ کی وفات کے بعد بھی ان کے
تصرّفات واحوال باقی رہتے ہیں۔ بعض کے لیے چند دن سے زیادہ نہیں رہتے مگر بعض کے
تصرفات باطنی برسوں جاری رہتے ہیں۔ اور بعض کے ہمیشہ۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ
شیخ ابوالحسن قزوینی نے فرمایا کہ مجھے چار بزرگوں کا علم ہے کہ وہ اپنی قبر میں تصرف کرتے
ہیں جیسے کہ زندگی میں کیا کرتے تھے۔ شیخ معروف کرخی، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عقیل منجی
اور شیخ حیوۃ حرانی قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم۔

شیخ اللہ بندہ

ایک فہیم وبامعنیٰ مجذوب ہیں۔ شاہ چوکھا فتح اللہ کی صحبت میں رہے اور جذبۂ نیک بہم پہنچایا۔
میرے شیخ نے انھیں دیکھا ہے اور ان سے گفتگو بھی کی ہے۔ ان کی وفات 1030ھ (1620)
میں ہوئی۔ اپنے مشرب کی وسعت کی وجہ سے وہ فقرا اور اغنیا دونوں سے نشست وبرخاست
رکھتے تھے۔ دانا لوگ انھیں بہت بزرگ سمجھتے تھے ایک زمانے میں وہ شیخ فرید مرتضیٰ خاں
بخاری کے ہمراہ تھے۔ شیخ فرید عقیدت کی راہ سے انھیں خود سے جدا نہ رکھتے تھے۔ ایک بار
جہاں گیر بادشاہ نے ان کو اپنے حضور طلب کیا اور بہت سے سوالات کیے اور خوب جواب
پائے۔ بہت خوش ہوئے اور انعام دینا چاہا۔ انھوں نے کہا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس ایک اچھی
کمان کی بڑی آرزو ہے، دے دیں۔ یہ بھی کہا میری اس کمان کی مہ تھوڑی سی ٹوٹ گئی ہے۔
کمانگر کو اس کی درستگی کے لیے فرمادیں۔ بادشاہ نے نصر اللہ سرہندی کمانگر کو حکم دیا تاکہ دوسری
مہ بنادے۔ انھوں نے اس کمان کو شیخ مصطفیٰ کو جن کا ذکر گزرا عنایت فرمادیا۔ میں نے اس
جیسی کوئی کمان نہ دیکھی جو اس سے بہتر تیرانداز ہو۔ اس کے گوشوں پر لکھا ہوا تھا۔

نصر اللہ وحید کمان ساخت دلپذیر ہمچوں کمانِ ابروئے دلدارِ بے نظیر[1]

شیخ مصطفیٰ ان کے معتقدین میں ہیں انھوں نے اوائل میں ان کی بہت صحبت اُٹھائی ہے۔ فن تیر
اندازی میں شیخ مصطفیٰ میرے استاد ہیں۔ ایک دن میں شیخ مصطفیٰ اور وہ مل کر تیراندازی کا ایک

1 نصر اللہ وحید نے ایک بے نظیر ودل پذیر کمان بنائی جیسے کہ محبوب کے ابرووں کی کمان ہو۔

میدانِ وسیع اور سطح دار میں مقابلہ کر رہے تھے۔ شیخ مصطفیٰ اس علم میں مجھ سے بہتر تھے اور ان کے برابر۔ ایک بار میں نے شیخ مصطفیٰ سے معلوم کیا کہ ایسا تیر جو تیر اندازی کے تمام قاعدوں کی رعایت کے ساتھ پھینکا گیا ہو کتنے وقفے بعد آپ سے چلتا ہے۔ کہا کہ کم و بیش ایک سال میں ایک بار۔ حقیقت یہی ہے جب میں اس فن کا ماہر ہو گیا تو مجھے اس بات کا یقین آیا (ورنہ تواضع پر محمول کیا کرتا تھا) فن تیر اندازی کے قواعد کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ایک رات شیخ مصطفیٰ مجھے ان کے پاس لے گئے اور کہا: لو! ایسا گانا سنو جس سے اچھا کبھی نہ سنا ہوگا اور تان سین کی نغمہ سرائی کی تعریف کرنے لگے۔ انھوں نے کہا میں نے تان سین کو خوب دیکھا ہے اور سنا ہے۔ یہ کہہ کر تان سین ہی کی طرز میں نغمہ سرائی شروع کر دی۔ تان سین کے بھی چند دوہے سنائے۔ سن کر میں بول اُٹھا۔ یقیناً ایسا لگا کہ گویا تان سین ہی کو سنا ہے۔ وہ پڑاوے سے ہر روز نیا کونڈا منگاتے اس میں کھانا کھاتے اور کسی کو شریک نہ کرتے اور باقی کھانے کو کتے کے آگے ڈال دیتے اور بڑے ذوق سے کہتے کتے کا جھوٹا کتے کو ہی سزاوار ہے۔ اگر وہ کسی کو رقعہ لکھواتے تو اس کا عنوان پیشانی یہ ہوتا ''بعد سجود مسجود آنکہ .....) ان کے پاس ایک گدھا تھا جس پر سواری کیا کرتے تھے۔ فرماتے۔ اس زمانے کے شیوخ اور علما اپنی سبکی کے ڈر سے پیغمبر ﷺ کی اس سنت پر عمل نہیں کر سکتے۔ اکثر علما قول رکھتے ہیں عمل نہیں۔ وہ بہت سے علما اور مشائخ دنیادار کو برا کہا کرتے تھے گو وہ پہلے ہی گزرے ہوں اس وجہ سے عام لوگ انھیں ملحد کہا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے شیخ مصطفیٰ سے معلوم کیا کہ ان کی اس بدگوئی کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ کیونکہ اکثر لوگ وہ سالک ہوں یا مجذوب علما اور بزرگان سابقین کے بارے میں نیک اعتقاد ہی رکھتے آئے ہیں۔ اگر اچھا نہ کہا تو برا بھی نہ کہتے تھے۔ شیخ مصطفیٰ نے فرمایا کہ اہل ظاہر کا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ وہ بزرگانِ دین، ذات الٰہی کے علاوہ مستقلاً دوئی اور غیریت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس سے انھیں جوش و خروش پیدا ہوتا تھا۔ عوام کی اس دوئی کو شرک فی الذات والصفات جان کر بُرا کہنے لگتے تھے کیونکہ ان کے دل و دماغ سے غیر کلی طور پر اٹھ چکا تھا۔ وہ موجود حقیقی حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ جانتے تھے۔ بس۔ ایسا شخص اگر کسی کی برائی بھی کرے تو وہ بُرا نہیں ہے (کہ صاحب حال ہے) ایک دن میں نے شیخ مصطفیٰ کا یہ جملہ اپنے شیخ پر پیش کر کے جواب چاہا۔

میرے شیخ نے فرمایا ''اللہ کی پناہ توحید وجودی اعمال ظاہری کے منافی ہو۔ باطن وحدت میں غرق اور ظاہر ہمیشہ شریعت کا محتاج رہتا ہے۔'' اللہ بندہ باوجود یہ کہ اغنیا کے ساتھ صحبت رکھتے تھے مگر ان کو لفظ خر سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ یوں کہا کرتے تھے فلاں خر کہاں ہے۔ کبھی کبھی انھیں مخاطب کر کے کہا کرتے ''اے گدھے تو کہاں سے آیا ہے اور کیسا ہے؟'' غنی لوگ ان کے اس جملے سے ناخوش نہ ہوتے تھے۔ جب بھی کسی مالدار کو کوئی مصیبت اور مشکل پیش آتی ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ وہ پرانی رسی کے بل کھولنے شروع کرتے۔ اس کے پوری کھل جانے پر وہ مہم انجام کو پہنچ جاتی تھی۔ یہ عمل انھیں شیخ چوکھا سے پہنچا تھا۔ ایک دن میں نے بھی ان کا یہ طریقۂ عمل دیکھا ہے۔ شیخ مصطفٰی کا بیان ہے کہ ایک دن انھوں نے حالتِ جذب میں تانبے کے ایک ٹکڑے پر پیشاب کر دیا تو وہ فوراً سونا بن گیا۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ صاحب ''کشف المحجوب'' ایک بزرگ کا نام لے کر کہتے ہیں کہ میں نے اُن سے ''سرجس'' میں سنا کہ فرماتے تھے کہ میں بچہ تھا۔ کرم فیلہ کے لیے توت کے پتوں کی تلاش میں ایک جگہ گیا تھا وہاں ایک درخت پر چڑھ کر اس کی ایک شاخ سے ریشم کے کیڑوں کو جھاڑ رہا تھا۔ شیخ ابوالفضل کا اس کوچے سے گزر ہوا انھوں نے مجھے دیکھ کر نہ دیکھا، نہ یہ شک گزرا کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں کیونکہ غلبۂ حال میں میں ان کی نظر سے غائب تھا۔ مستی میں سر اُٹھا کر فریاد کرنے لگے۔ بارے خدایا، ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ آپ نے مجھے ایک دانگ بھی عطا نہیں فرمایا تاکہ اس سے میں اپنے سر کے بال ترشوا لیتا۔ کیا دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اُسی وقت اس درخت کے تمام پتے، ٹہنیاں، تنا اور جڑ، میں نے سونے کے دیکھے۔ اسی وقت وہ سرور و انبساط کے عالم میں کہنے لگے ''عجیب کاروبار ہے دل کی ذرا سی کشادگی کے لیے بھی آپ سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔''

شاہ پرویز سنبھلی

وہ تیز ہوش، صاحبِ معنٰی مجذوب شخص ہیں۔ اُن کا ظاہری رہن سہن عوام جیسا ہے مگر باطن خواص جیسا ہے۔ عوام کے ساتھ عام اور خواص کے ساتھ خاص ہیں۔ عقلائے زمانے کی نظر

میں دیوانے بنے ہوئے ہیں۔ مگر دیوانگانِ عشق مولیٰ کے لیے عاقل وفرزانہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا کوئی یکساں رنگ متعین نہیں ہے۔ نہ کسی (خاص طریقے کی رسوم کی) قید میں گرفتار۔ میں نے ایک دن ایک عامی شخص سے سنا کہ محلّہ کاغذیان میں ایک دیوانہ ہے اور وہ ہذیان بکا کرتا ہے۔ میں نے سوچا ایک بار اُسے جا کر دیکھوں کہ کیا معاملہ رکھتا ہے۔ میں گیا اور دیکھا ایک خوبصورت بکھرے بالوں والا مست ہے۔ پہلے لایعنی اور بیہودہ بکواس کرتا ہوا مجھ سے پیش آیا اور جو اس کی زبان پر آیا بکا۔ میں نے نیازمندی اور صلح جوئی کے انداز میں عرض کیا۔ شاہا! آپ کی یہ باتیں اور ان کے برخلاف عقل وشعور کی باتیں مقام وحدت میں ایک ہیں۔ بلکہ حقیقت الحقائق) ہر دو سے مبرا ہے۔ مقام کثرت وحدت میں آپ کی یہ گفتگو دونوں قسم کی جدا جدا لطافت اور شرافت رکھتی ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے جس نے جمیع اشکال میں ظہور کر کے رنگ کثرت اختیار کر لیا ہے جدھر بھی چہرا پھیریں اسی کی جانب رُخ ہوگا۔ مولانا جلال الدین دوّانی کے مقالات میں ہے کہ حقیقت ایک ہی ہے اگر وہ کسی شے کے خاص اجزا میں عنصر متعینہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے تو اس کو اعتدال مزاج کہتے ہیں۔ اگر حرکات میں ظاہر ہو تو اس کو ناز و انداز کہتے ہیں اور اگر کلام میں ظاہر ہوتی ہے اس کو فصاحت کہتے ہیں اور بلاغت کا نام دیتے ہیں اور اگر آواز میں ظاہر ہوتی ہے تو اس کو نغمہ کہتے ہیں۔ نفس (مطمئنہ) ہر صورت میں اس معنیٰ (حقیقت الحقائق) کا طالب اور عاشق ہے کسی بھی صورت اور کسی بھی لباس میں آئے۔

الحسن فی وجہ الملاح[1]

کہ من حریف تو انم بہر لباس شناخت بوجہِ ما لقینا ہر چہ ہست برون آی[2]

اب جو آپ جانتے ہیں فرمائیں۔ انھوں نے میری یہ گفتگو سن کر ہوش کی آنکھ کھولی، میری بات کے مغز کو کیونکہ خود آشنائے راز تھے۔ سمجھ لیا کھل کھلا کر ہنس پڑے اور بولے۔ ہاں یہی بات ہے۔ میں اس حقیقت کا طالب ہوں۔ کوئی نہیں ملتا کہ وہ ایسی گفتگو کرے اور میں سنا کروں یا میں سناؤں وہ سنا کرے۔ اس کے بعد اپنے احوال باکمال کا تذکرہ کرنے لگے کہ مدتیں ہوئیں کہ میں نے اس

---

1 حسین صورت میں اس حسین علی الاطلاق کا حُسن ہے۔

2 جس صورت میں ہو باہر آ اور ہم سے مل کہ میں دوست کو ہر لباس میں پہچان سکتا ہوں۔

اُس کی کشمکش سے چھٹکارا پالیا ہے۔ اچھے برے سے دل توڑ لیا ہے۔ اس ہذیان گوئی اور دیوانگی کے پردہ میں مست وخوش حال ہوں کہ کوئی میرے آڑے نہیں آتا۔ میرا دل ایسے مقام سکون میں ہے کہ میں اس کی کیفیت بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ میں ان کے اس کلام سے بہت محظوظ ہوا اور ''رشحات'' کے وہ مقامات یاد آ گئے کہ حضرت سید قاسم تبریزی ابتدائے حال میں مجاذیب اور مجانین کے پاس بہت آمد ورفت رکھتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ روم میں میں نے لوگوں سے وہاں کے مجاذیب کا حال معلوم کیا تو انھوں نے کہا کہ فلاں جگہ ایک قوی حال مجذوب رہتے ہیں۔ وہاں پہنچا ان کو دیکھا اور پہچان گیا کہ مولانا جانی تھے کہ تبریز میں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ میں نے ترکی زبان میں ان سے کہا ''مولانا جانی منی وامیرسن'' کہا کہ واے روم مولانا سیدسین[1] '' میں نے کہا آپ کو کیا پیش آیا۔ کہا میں بھی آپ ہی کی طرح سرگشتہ تھا۔ ہمیشہ ہر چیز مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی، ناگاہ ایک چیز دکھی وہ مجھے سب سے چھین لے گئی، اس کے بعد ترکی رومی زبان میں کہا ''وینکلا ندوم'' یعنی میں آسودہ ہو گیا۔ حضرت خواجہ احرار فرماتے ہیں کہ سید قاسم جب بھی یہ حکایت بیان فرماتے آپ کی آنکھ سے آنسو بہنے لگتے۔ معلوم ہوتا ہے مجذوب کی بات نے ان کے باطن میں بہت اثر کیا تھا۔ حضرت سید قاسم فرماتے ہیں کہ شہر سبزوار میں ایک مجذوب تھے۔ میں ان سے ملاقات کے لیے پہنچا تو دل میں خیال آیا کہ بابا محمود طوسی بہتر ہیں یا یہ مجذوب۔ فوراً ان مجذوب نے میری جانب متوجہ ہو کر فرمایا کہ ''چنداں می زنم کہ بابا محمود را آب بُرد[2] '' صاحب ''رشحات'' کہتے ہیں کہ راقم الحروف کے والد محترم فرماتے تھے کہ میں نے بعض عزیزوں سے سنا ہے کہ جب حضرت سید قاسم قدس سرہٗ اس سبزواری مجذوب سے جو کہ میر دیوانہ کے نام سے مشہور تھا اور اس کی قبر بھی اس دیار میں معروف ہے ملاقات فرمائی اور ان کے دل میں وسوسہ آیا کہ یہ بہتر ہیں یا بابا محمود اور اس نے وہ بات جو حضرت خواجہ احرار نے نقل کی ہے کہی پھر بولا ''بابا محمود میرے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔'' یہ سن کر حضرت سید قاسم سبزوار سے بابا محمود طوسی کے پاس طوس تشریف لے گئے اور میر دیوانہ کی وہ بات خاطر میں لائے کہ ''بابا محمود از ترکش من یک تیر است''۔

---

1 ''مولانا جانی مجھے جانتے ہو'' کہا کہ ''جانتا ہوں مولانا سید قاسم ہو''۔

2 میں نے اتنا رگڑا ہے اتنا رگڑا ہے تب کہیں جا کر بابا محمود میں چمک پیدا ہوئی ہے۔

باباؔمحمود نے اپنی آستین سے سر اُبھارا اور کہا ''مگر بے پر اور پیکاں تیر ہوں'' انتھیٰ۔اس کے بعد شاہ پرویز نے مجھ سے کہا فلاں نے اگر کوئی اہل کار میرے پاس آتا ہے اس سے اس راہ درویشی کی باتیں کرنی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ میں پہلی ہی گفتگو میں دریافت کر لیتا ہوں۔ اگر لائق صحبت ہوتا ہے تو وہ برتاؤ کرتا ہوں جو ابھی تم نے ملاحظہ کیا ورنہ ہذیان بکنے لگتا ہوں جیسا کہ پہلے پہلے تم نے دیکھا۔ تا کہ نااہل سے خلاصی اختیار کروں۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد [1]
ہر بیشہ گماں مبر کی خالیست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد [2]

میں ان کی دیوانگی کے عالم میں رہتے ہوئے ہوش وفہم کی باتوں سے بڑا متعجب ہوا اور خوش ہوا۔ اسی کے متعلق مجھے ایک دل خوش کن واقعہ یاد آیا۔ مشہور ہے کہ عارف محقق مولانا جامی اپنے دوستوں کے ساتھ خلوت میں بے تکلف بیٹھے ہوئے مشغول صحبتِ یاراں تھے۔ سر سے دستار اُتار کر رکھ دی تھی۔ پیر پھیلا رکھے تھے۔ اسی اثنا میں ایک ناشناسا صاحب دروازے میں داخل ہوئے۔ سر پر ایک بڑی سی دستار اور پر تکلف چوغہ پہنے ہوئے سر کے بال اور داڑھی بھی سنوری با وقار چہرہ۔ مولانا نے انھیں دیکھتے ہی اپنی دستار سر پر رکھ لی تعظیم کے لیے اُٹھے اور باادب بیٹھ گئے اور معلوم کیا۔ اسم شریف؟ انھوں نے جواب دیا۔ شیخ السیف۔ آپ مسکرائے اور فرمایا جب آپ شیخ السیف ہیں تو پھر میں کیوں تکلیف برتوں اور زحمت اُٹھاؤں اور پھر اسی طور بے تکلفانہ طریقے پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد چند مرتبہ میں شاہ پرویز سے ملاقات کے لیے گیا۔ ہر بار اس راہ کی گفتگو خلوت میں سُنی۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ فلانے بے تعینی کی یہ جو فقیر کی حالت ہے خوب ہے کہ ظاہراً باطناً ہر قید سے آزادی ہے۔ میں نے کہا (مگر) فقیر کا مشرب یہ ہے کہ باطن کسی قید و تعین میں گرفتار نہ ہو مگر ظاہر ہمیشہ دین محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا متبع رہے۔ بزرگوں نے جس جامعیت کا ذکر کیا ہے اسے حاصل کرے۔ جیسا کہ رسالہ ''قدسیہ بہائیہ'' میں حدیث شریف ہے ''اجمعوا

---

1 جب تک آدمی بات نہ کرے اس کے عیب و ہنر چھپے رہتے ہیں۔ یہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا مشہور قطعہ ہے جس کے دوسرے دو مصرعے یہ ہیں۔

2 ہر جنگل کو خالی مت سمجھو، ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی چیتا سو رہا ہو۔

وضوء کم جمع الله شملکم [1] "میں اس طرف اشارہ ہے کہ ظاہری وضو کو باطنی وضو کے ساتھ جمع کرو تا کہ تمھیں استقامت ظاہر و باطن حاصل ہو۔ اس زمانے میں، میں نے جامعیت خواص کے بیان میں ایک غزل کہی تھی پڑھی وہ غزل یہ ہے۔

منم کہ با ہمہ از ہمہ جدا شدہ ام — چو مہر قدسم و چون ذرّہ جا بجا شدہ ام

بجان خواص خواصم بہ تن عوام عوام — کہ تاج فقر بسر کردہ پادشاہ شدہ ام [2]

ہمہ بکفر و باسلام صلح کل کردم — برنگ ہر دو خوشم ہم زہر دو واشدہ ام

نہ غیر ذاتم و نہ عین ونے فراق و نہ وصل — گذشتہ از ہمہ مذہب و باخداشدہ ام

چو بے خودم بخدا با محمد ہشیار — ازین کمال کہ با وحدت آشنا شدہ ام [3]

اگر چہ وہ یہ جامعیت نہ رکھتے تھے مگر میرے یہ اشعار انھوں نے پسند فرمائے۔ سید جعفر سنبھلی جو کہ خواجہ احمد کے مرید ہیں اور اس راہ کے اہل ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے شاہ پرویز کی بہت صحبت اُٹھائی ہے اور ان کے الطاف سے بہرہ ور ہوا ہوں۔ ایک دن انھوں نے مجھے خواب میں ایک بہت بڑی چادر اُڑھائی۔ جب صبح ہوئی اور میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر نظر عنایت کی درخواست کی تو انھوں نے برجستہ فرمایا" آج رات ہی تو میں نے تجھے چادر بخشی ہے اور کیا چاہتا ہے" ان خواجہ احمد سے میری بھی ملاقات رہتی ہے۔ اچھے انسان ہیں بامراد، شکستہ دل اور لائق کار ولایت۔ وہ کہتے ہیں کہ میں سولہ برس کا تھا جب اس راہ کا شوق میرے دل میں پیدا ہوا۔ سنبھل سے نکل پڑا اور کسی کامل بزرگ کی تلاش میں چل پڑا اور ملتان، اُچہ، ٹھٹہ اور بھکر پہنچا۔ ان سفروں

---

1 وضوؤں کو ملاؤ اللہ تمھارے احوال پریشاں کو مجتمع کر دے گا۔

2 میں وہ ہوں کہ سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب سے جدا ہو گیا ہوں۔ میں مہر قدسی ہوں ہر ہر ذرّے کے ساتھ باوجود سب سے جدا ہونے کے اپنی ضیا پاشی میں رہتا ہوں۔ میں خواص کے ساتھ خاص اور عوام کے ساتھ عام ہوں۔ فقر کا تاج سر پر باندھ کر بادشاہ بن گیا ہوں۔

3 باطنی طور پر میری کفر و اسلام سے صلح ہے اگر چہ دونوں رنگوں سے راضی ہوں مگر دونوں سے آزاد بھی ہوں۔ نہ تو میں غیر ذات ہوں نہ عین ذات۔ نہ جدا ہوں نہ واصل۔ تمام مذاہب سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا ہو گیا ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں خود سے بے خود اور فانی ہوں لیکن شریعت محمدی کے معاملے میں پورا بیدار ہوں، باہوش ہوں۔ اس کمال جامعیت کے ساتھ میں وحدت سے آشنا ہوا ہوں۔

میں بہت سے درویشوں سے ملاقات ہوئی لیکن کسی کو طالب جاہ کسی کو اہل دعویٰ اور کسی کو طالب ثروت وغیرہ وغیرہ پایا۔ ایک بھی ایسا شخص جو صرف طالب خدا ہو نظر نہ آیا، جیسی تمنا تھی میسّر نہ ہوا۔ اس کے بعد دریا کے کنارے کنارے سیر کرتا ہوا بگناءِ گجرات کے بندرگاہ پہنچا۔ وہاں ایک عزیز کو دیکھا اس سے ایک کام کی بات سُنی جس نے دردِ طلب میں اضافہ کر دیا۔ وہاں سے بھی نکل آیا اور اکبر آباد آیا وہاں سے فتح محمد نام کے ایک بزرگ سے جو سنڈیلے کے تھے ملاقات ہوئی۔ کچھ مدت ان کے ساتھ رہا۔ جب بھی ان سے تلقین ذکر کے لیے درخواست کرتا وہ توقف فرماتے تھے۔ ایک دن وہاں سے بھی دل برداشتہ قبرستان میں جا کر رہنے لگا۔ ایک رات ان کو خواب میں کہا گیا کہ خواجہ احمد کو کیوں جدا کر دیا ہے اور اس سے ذکر طریقہ (درویشی میں) سے کچھ کہنے سے کیوں گریزاں ہو۔ اسی رات کو میں نے بھی خواب میں دیکھا کہ آنحضرت (ﷺ) ایک بہت بڑے تخت پر تشریف رکھتے ہیں اور صحابہ کرامؓ اور اولیاے عظام کی ایک جماعت آپ کے گرد و پیش حاضر خدمت ہے۔ آنحضرت نے ایک چیز جو آپ اپنے دستِ مبارک میں لیے ہوئے تھے عنایت فرمائی کہ حاضرین میں تقسیم کر دے اور شیخ فتح محمد کو اس وقت اپنی جستجو میں سرگرداں دیکھا۔ تین روز کے بعد انھوں نے مجھے تلاش کر لیا تو قبرستان سے مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور تلقین ذکر کی۔ اس کے چند روز بعد پھر آنحضرت (ﷺ) کو خواب میں دیکھا۔ ایک تقصیر جو مجھ سے ہو گئی تھی اس کی وجہ سے میں نہایت غمگین تھا سر زمین پر رکھے ہوئے اپنے قصور کی معافی کا اللہ تعالیٰ سے طلبگار تھا۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے میرا سر زمین سے اُٹھا کر میری تسلی فرمائی۔ پھر میں نے شیخ فتح محمد ہی کی صحبت کو لازم پکڑ لیا۔ اُن کی صحبت کی برکت سے تھوڑے ہی دنوں میں، میں جس بات کا طالب تھا مجھے ظاہر ہو گئی۔ آرام دل اور جمعیت خاطر حاصل ہو گئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ "نسبت الٰہی حاصل کر، اس کے علاوہ کچھ درکار نہیں۔" اسراریہ کی تکمیل کے 4 سال بعد 1072ھ (1662) میں شاہ پرویز دنیا سے اُٹھ گئے۔ ان کی قبر ان کے گھر کے نزدیک ہے۔

شاہ پرویز دہلوی

آپ مجذوب شخص ہیں۔ خود سے گئے گزرے، مستہلک، گداز طبیعت، نیک حال اور ایک مقام میں قید۔ مست درفشاں آنکھوں والے، نورانی چمکدار چہرے کے مالک اصل کے اعتبار سے وہ ایک قوال کے فرزند ہیں۔ اپنے قبیلے کے ساتھ دہلی کے بخاریان محلے میں سکونت رکھتے ہیں۔ میں ایک زمانے تک ان کا پڑوسی رہا ہوں۔ اس وقت جبکہ میرے شیخ اپنے برادر نسبتی جن کا نام نعمت اللہ تھا، کے دیدار کی غرض سے میرے مکان پر تشریف لائے تھے عجیب و غریب صحبت اور ملاقاتیں رہا کرتیں۔ اس نوجوان کی جلوہ گری کا بیان ذکر شیخ میں گزرا ہے۔ اس نوجوان نے میرے شیخ سے شکایت کی کہ ان دنوں پیرا قوال کے بیٹے کو جنون ہو گیا ہے۔ نہ کہنے کی بہت سی باتیں کہتا پھرتا ہے۔ جتنا علاج معالجہ کرتے ہیں اس کا جنون اور بڑھتا ہے۔

برجنونِ کہنہ ام بگذشت چندین نوبہار　　عقل ناصح روغن بادام می گیرد ہنوز [1]

اسی جنون میں جذبۂ قوی نے اُن کو آلیا اور اپنے پرائے سے پاک کر دیا۔

خبر برید بلیلیٰ کہ قیس مجنون شد　　زخویش وز ہمہ خویشان خویش بیرون شد [2]

یہ واقعہ 1034ھ (1624) کا ہے۔ آج انھیں 34 سال ہو گئے کہ وہ دہلی میں ریشم فروشوں کے بازار میں پڑے ہوئے باطنی طور پر کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہر قسم کے لوگ اُن کے پاس آتے رہتے ہیں اور ان کے دیدار پُر انوار کا نظارہ کرتے اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات بابرکات کے منتظر رہتے ہیں اس حال میں کہ وہ سب سے فارغ البال اور بے خبر ہیں۔ کھانے پینے کی کوئی چیز کسی سے نہیں مانگتے۔ جب کوئی کھلاتا ہے کھا لیتے ہیں کوئی پلاتا ہے پی لیتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ کسی بھی طور پر ان کی زبان سے یا اشارے سے کبھی کسی چیز کی طمع یا طلب کا لفظ نہ نکلا ہوگا۔ اب اُن کے آخری ایام میں ایک دولت مند نے ان کے رہنے کی جگہ ایک بہت اچھی عمارت

1　میرے جنون کہنہ پر جتنی نئی بہاریں گزریں وہ بڑھتا ہی گیا۔ مجھے نصیحت کرتے کرتے ناصح کی عقل خراب ہو گئی جس کے لیے وہ اب بھی روغن بادام استعمال کرتا ہے۔

2　لیلیٰ سے کہہ دو کہ قیس تیری محبت میں مجنون ہو گیا ہے۔ خود سے اور اپنوں، بیگانوں سب سے بیزار ہو گیا ہے۔

تعمیر کرا دی ہے۔ خود بخود خدام کا ایک مجمع آ کر اُن کی خدمت میں رہنے لگا ہے اور مخلوق خدا سے اُن کے نام پر کھا رہا ہے۔ اُن کی بیوی بھی اُن کے پاس میں آ کر رہنے لگی ہے اور روزی روٹی کا اچھا حیلۂ نذر و نیاز اختیار کر رکھا ہے۔ میں اوّل دن سے اُن کی اس حالت استہلاک و استغراق سے واقف ہوں۔ اُن کا جو معاملہ ہے اس کے ادراک سے وہم و عقل عاجز ہیں۔ میں نے سنبھل اور سرسی کے بزرگوں سے سنا ہے کہتے تھے کہ ہم نے اس علاقے میں ایک عمر رسیدہ جوگی کو جو اپنے علم میں کامل تھا دیکھا ہے۔ ایک بار اس پر حال آیا۔ ایک درخت کے نیچے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ جوگیوں کی اصطلاح میں اس حال کو تاری (یعنی تارک) ہونا کہتے ہیں۔ جب ایک مدت ہوگئی اور ہلنے جلنے اور ہر قسم کی حرکت سے بالکل باز رہا تو جنگلی فاختہ نے اس کے جُوڑے کے اندر گھر بنالیا۔ انڈے دیے اور بچے نکالے ہاں وہ دن رات میں صرف ایک بار آنکھ کھولتا اور اشارے سے پوست طلب کرتا اور پی جاتا تھا اس وقت فاختہ اس کے سر سے اُڑ جاتی جب وہ پینے سے فارغ ہو جاتا پھر آ کر اپنی جگہ بیٹھ جاتی۔ ایک دن اس نے کہا کہ اب مجھے دنیا سے رخصت ہو جانا چاہیے اور کہا کہ قدِ آدم گہری قبر کھودو۔ پھر اس قبر میں اسی مربع حالت میں بیٹھ گیا میدہ کی ایک بڑی روٹی پکی ہوئی اپنی گود میں رکھی اور کہا کہ آہستہ آہستہ چاروں طرف سے مٹی ڈالو۔ اس نے اپنے ہاتھ سے مٹی برابر کرنی شروع کی جب مٹی اس کے سر کے اوپر پہنچی اس میں سے تڑاخ کی آواز نکلی جسے سب حاضرین نے سنا۔ اس کے چیلے نے جب اس کے سر کے اوپر کی مٹی برابر کر دی تو دیکھا کہ اس کی سادھی کے بیچ میں ایک سوراخ ہوگیا ہے۔ میرے والد صاحب کہتے تھے کہ میں اس وقت کم عمر تھا اور یہ واقعہ سنا تھا اس کا نام بھی بتلاتے تھے مگر اب مجھے یاد نہ رہا۔ میں نے اب سے دس سال پہلے سنا تھا کہ سنبھل کے تین کوس کی دوری پر کسی سنیاسی کے لڑکے نے جنگل میں آسن جما رکھا ہے سر زانوں سے لگا رکھا ہے دو سال ہو گئے نہ اس جگہ سے اُٹھتا ہے نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے نہ سوتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کو بارہا دیکھا ہے کہتے تھے کہ جب کوئی اس کے پاس شیرینی لے جاتا وہ سر اُٹھاتا ایک نگاہ ڈالتا اور بس۔ لوگوں نے اس کے اوپر چھپر ڈال کر سایہ کر دیا تھا۔ اس کے کاندھوں پر چادر ڈال دیتے تھے اگر کبھی اس کو کوئی چور لے جاتا تو کوئی دوسرا اور ڈال دیتا۔ مجھے اُسے دیکھنے کا شوق غالب آیا تو میں نے اس کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ اسی

اثنا میں سنا کہ جب وہ مشہور ہو گیا تو بہت سے سنّیا سی حسد کی وجہ سے نہ جانے اسے وہاں سے کہاں اُٹھا لے گئے۔

شاہ بھیکا دہلوی

وہ صاحب معنی با تصرف و ہیبت اور باوقار مجذوب ہیں۔ شروع شروع میں نواحِ شہر میں گشت لگاتے پھرا کرتے تھے اور جو زبان پر آتا تھا ہذیان سرائی کیا کرتے تھے۔ اسی میں بعض باتیں خالص معرفتِ الٰہی کی بھی کہہ جاتے جو ان کی سلامتِ عقل کی گواہ تھیں۔ ایک رات کو میرے شیخ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے آستانے میں تھے، مجھ سے کہا۔ آ۔ یہیں قریب میں ایک مجذوب رہتے ہیں ان سے ملیں۔ ہم پہنچے تو وہ ایک حظیرے میں مل گئے۔ میرے شیخ نے اُن سے جو کچھ معلوم کیا عقل مندانہ جوابات دیے۔ اس کے بعد میرے شیخ نے واپسی پر فرمایا۔ "مجذوب خوب ہیں" شیخ محمد قلی کہتے ہیں کہ ایک دن میں اسی خطیرے میں نیک فالی کی امید لے کر کہ میری نوکری بحال ہو جائے، ان سے ملا اور خواجہ ابرار کی صورت کا تصور کیا۔ جب انھوں نے مجھے دیکھا ایک مجذوبانہ ادا کے ساتھ کہنا شروع کیا جب اللہ تعالیٰ نے سواری کو گھوڑا اور خدمت کو خادم دے رکھے ہیں تو نوکری کیا چیز ہے اور کس لیے کرتے ہیں اور اس کی کیا حقیقت۔ جس کے لیے کوئی سفید ریش بزرگ کو بطور وسیلہ دل میں لے کر آے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مشرف القلوب ہیں۔ ایک بار اور بھی اُن سے ایسی ہی کرامت دیکھی۔ وہ کئی برس سے میرے شیخ کے ایک نیاز مند سعادت شعار، نیک کردار نوجوان شیخ نظام مداری کی مسجد جو سر بازار فیروز آباد ہے، میں اقامت گزیں ہیں۔ ان مداری نوجوان نے اُن کے سایہ کے لیے پتھر کی عمارت بنوادی ہے اور اس کے نزدیک دکان بھی بنوادی ہے۔ اس کے اس وقت اپنی مہمات میں بہت سے سلطانی کارندے شاہ بھیکا سے رجوع کرتے ہیں۔ جو نذر و فتوح آتے ہیں اس کی انھیں بالکل خبر نہیں۔ شیخ نظام مداری اس رقم کو انھیں کے معاملے میں فقیروں، درویشوں اور دیگر آنے والے مہمانوں کی خدمت اور مسجد کی رونق بڑھانے میں خرچ کیا کرتا ہے۔ میرے شیخ بھی کبھی کبھی اپنے یاران طریقہ کے مجمعے کے ساتھ وہاں تشریف لے جاتے ہیں اور وہاں مشغولی کو پسند فرماتے ہیں۔ اسی طرح میرے شیخ زادے بھی

بغرض سیر وہاں جانا پسند کرتے ہیں میں جب بھی دہلی جاتا ہوں وہاں اکثر جایا کرتا ہوں۔ وہ مداری نوجوان مجھ پر بڑا لطف و کرم رکھتا ہے۔ شاہ بھیکا کی بھی میرے حال پر مہربانی ہے۔ اسرار یہ کے اہتمام کے تین سال بعد (1072ھ/1662) شاہ بھیکا کا انتقال ہوگیا اور اپنی اسی قیام گاہ میں دفن ہوئے۔ میں نے ان کی تاریخ (وفات) میں یہ قطعہ کہا

شاہ بھیکا کہ بود مستہلک چون شرف روز و شب بذات خدای
از مقامِ فنا بدارِ بقا رفت گوی کہ شد زجاے بجای
سال تاریخ او خرد گفتہ بکجا رفت شاہ بھیکا ہای[1]

شیخ نظام مداری کی مسجد کی تاریخ سنگ بنیاد بھی میں نے کہی تھی

''مقامِ فیض'' شیخ من خوش کرد[2]

اور یہ قطعہ بھی میں نے کہا ہے

بناے مسجد پُر فیض کرد شیخ نظام کہ ہیچ گاہ مباد از صداے ذکر خموش
چون سال این عملِ خیر جستم از ہاتف ''مقامِ فیض'' رسید از نداے غیب بگوش[3]

نرائن بیراگی فرید آبادی

وہ اصل کے اعتبار سے بیراگی ہندو ہے۔ حسین ولطیف، خوب ونظیف۔ دل چرانے والا سنگیت گاتا بجاتا تھا۔ اس نے خود کو جھانجھر کے لقب سے مشہور اور مقبول خواطر بنا رکھا تھا۔ باوجود اس ظاہری کمال کے میں اس کے حال دل سے بھی واقف ہوں۔ حد درجہ بے تکلفانہ زندگی گزارتا تھا۔ قدرت نے ایک قسم کی آزادی اور بے نیازی اس کی طبیعت میں رکھی تھی۔ ایک وقت جب میں

1 شاہ بھیکا جو کہ روز وشب شیخ شرف الدین پانی پتی کی طرح ذات الٰہی میں مستہلک و مستغرق رہتے تھے جب اس دار فنا سے دار بقا کی طرف گئے تو گویا بس ایک جگہ سے دوسری جگہ جا بیٹھے۔ خرد نے ان کی سال تاریخ کہیں ''بکجا رفت شاہ بھیکا ہائے'' کہ شاہ بھیکا کہاں چلے گئے افسوس۔

2 فیضانِ الٰہی کا مقام میرے شیخ کو پسند آیا۔

3 شیخ نظام نے اس پُرفیض مسجد کی بنیاد رکھی، اللہ کرے کہ کبھی بھی صداے ذکر حق سے خاموش نہ ہووے تو میں نے ہاتف سے اس عمل خیر کی تاریخ بنا معلوم کی تو کان میں غیب سے ندا آئی ''مقامِ فیض'' (1071ھ)

دہلی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ایک دن سیر کرتے ہوئے وہ وہاں پہنچا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ذرا مجھے اپنا گھوڑا دینا میں فلاں جگہ تک جاتا ہوں۔ بے تامل میں نے گھوڑا اس کے حوالے کر دیا۔ جب سوار ہو گیا تو بولا میں فقیر آزاد مزاج بیراگی آدمی اگر تیرا گھوڑا لے کر بھاگ جاؤں تو، تو کیا کرے گا۔ میں نے کہا کچھ بھی نہ کروں گا۔ کیونکہ یہ بات میں نے پہلے دل میں سوچ لی ہے۔ تبھی گھوڑا دیا ہے اگر تو چاہے تو شوق سے لے جا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں نے اس کا دل پڑھ لیا۔ خوش ہو کر بولا بہت اچھا بہت اچھا۔ میرے شیخ فرماتے تھے کہ ایک دن میں خواجہ ابرار کے پاس تھا کہ جعفر نام کا ان کا غلام گھر سے نکلا اور سامنے سے گزرا۔ انھوں نے دریافت کیا کہاں چلے؟ غلام نے لاپرواہی کے ساتھ کہا کھیلنے جا رہا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے کہا ''یہ غلام مجھ سے ذرا بھی تو نہیں ڈرتا۔'' میں نے کہا یہ آپ کو پہچان گیا ہے اسی وجہ سے آپ کی کوئی ہیبت او رڈر اس کے دل میں نہیں ہے۔ خواجہ ابرار بہت خوش ہوئے جس وقت میرے شیخ یہ حکایت بیان فرما رہے تھے اس وقت شاکران قلندر شیرازی جو شیریں کلام نوجوان ہے حاضر تھا اس نے مظفر کاشی کی یہ رباعی برمحل پڑھی

زاہد بکرم ترا چون ما نشناسد | بیگانہ ترا چو آشنا نشناسد
گفتی کہ گناہ مکن اندیش زمن | این را بکسے گو کہ ترا نشناسد[1]

آخر کار نرائن بیراگی کو جذب الٰہی نے شدت سے جکڑ لیا۔ جو کچھ پاس رکھتا تھا سب سے پاک اور فارغ البال ہو گیا اور حوض فرید آباد کے کنارے ایک گنبد میں آ پڑا اور وہیں سکونت اختیار کر لی اور بظاہر (خود کو چھپانے کی غرض سے) ہذیان شروع کر دی۔ علاوہ بعض دوستوں کے جو اس کے محرم راز تھے۔ اس کے پہلے شناسا لوگ اس کی اس حالت کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے۔ کار درویشی کے محرمان کے ساتھ ایما و اشارے سے آشنائی کا دم بھرتا تھا اور غیروں کے سامنے ہذیان سرائی کا پردہ ڈال دیتا تھا۔ مسلمانوں کے سامنے خود کو مسلمان ظاہر کرتا اور ہندوؤں کے سامنے ہندو ہونے کا اظہار کرتا۔ مگر حقیقت میں وہ دونوں سے فارغ تھا۔ ''کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست'' والا

1 (میرے معشوق) زاہد تیرے کرم محبت باطنی کو جیسا ہم جانتے ہیں، نہیں جانتا۔ تیرے بیگانے تیرے آشناؤں کی طرح تجھے کیا پہچان سکتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ میری نافرمانی مت کر، مجھ سے ڈر، مجھ سے بچ کر رہ، یہ بات اُس سے کہنا جو تجھے پہچانتا نہ ہو۔ تیرے دل کی کشش نے ہی تو مجھے نڈر بنا دیا ہے۔ دیوانہ کر دیا۔

معاملہ تھا۔ جیسے کہ جولا ہے کبیر داس[1] جو کہ پرانے زمانے میں پورب کے علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے موحدانہ ہندی اشعار بہت شہرت رکھتے ہیں۔

دوہرہ

ہم جانا ہم ملنکی اور رام کہے سون جای　　رام کبیرا ہوی رہو سیس نواہا کاے

دوہرہ

بھلا مواہر پھیرے سرسوں لیے بلاے　　جیس رتن تیسے لیےاب کچھ کہی نہ جاے

ساکھی

کبیرا روڑا دیجیے تج پاکھنڈ ابھیمان　　ہری جن ایسا چاہیے جاسے ملیں بھگوان

روڑا بھیکو تو کیا بھیا پنتھن کو دک دیہ　　ہری جن ایسا چاہیے جو مارگ کے کھیہ

کھیہ بھیو تو کیا بھیا جیواڑ لاگے انگ　　ہری جن ایسا چاہیے جیون پانی سب رنگ

پانی بھیو تو کیا بھیو سیرا، تاتا ہوئی　　ہری جن ایسا چاہیے جیسا جوہر ہوئی

جوہر بھیوتو کیا بھیو ہیرے سب کچھ ہوئی　　ہری جن ایسو چاہیے جانے کچھ نہ ہوئی

ایک دن میں نے ان کی ایک بیساکھی اپنے شیخ کی مجلس میں پڑھی تو سن کر فرمایا ''کبیر نے اپنے کلام میں پہلے مقام بقا کا ذکر کیا ہے پھر مقام فنا کا۔بہتر یہ تھا کہ صوفیہ محققین کی رائے کے مواقف پہلے فنا کی بات کرتے پھر بقا کی۔میرے شیخ کا کہنا ہے کہ ایک بار میں فرید آباد گیا وہاں ایک مجذوب کے گوشہ تنہائی کے در پر کھڑے ہوکر داخلے کی اجازت طلب کی۔کیا حکم ہے اندر آؤں یا نہیں؟ اس نے کہا ''یہاں تمھارے سوا دوسرا کون ہے تشریف لائیں اور اس راہ کی اور بہت سی صاف ستھری بے خار باتیں کیں کہ میں بہت محظوظ اور مسرور ہوکر اٹھا۔میرا گمان یہ ہے کہ وہ مجذوب نرائن بیراگی ہی رہے ہوں گے۔واللہ اعلم۔حد درجہ جذبے کی اس حالت میں، میں نے انھیں حوض کے کنارے یا جہاں ان کے رہنے کے لیے چبوترہ بنا دیا تھا فرید آباد میں کئی بار دیکھا ہے۔اور ملاقات کی ہے۔ہر مرتبہ اشارے کنایے سے مجھ پر توجہ لطف وعنایت کی ہے۔1062ھ (1652) میں جب میں لاہور سے اپنے شیخ کے ہمراہ دہلی پہنچا تو سنا کہ میرا چھوٹا لڑکا عبدالوالی

1　کبیر کی پیدائش سکندر لودھی کے زمانہ 822ھ/1400 اور وفات 941ھ/1519 بمقام مگھر ہوئی۔

اپنی والدہ کے ہمراہ اُن کے ماموں شیخ محمد صادق کی فاتحہ میں فرید آباد آیا ہوا ہے اور عنقریب سنبھل واپس ہو جائیں گے۔ میں نے اپنے شیخ سے فرید آباد جانے کی رخصت چاہی تو فرمانے لگے تو بھی انھیں کے ہمراہ سنبھل جائے گا؟ میں نے کہا ''نہ'' جب وہاں پہنچا میرا وہ فرزند بیمار پڑ گیا اور بہت حالت بگڑ گئی میں نے چند تنکے (سکے) نذرانہ لیا اور ان مجذوب کے پاس پہنچا اور بیمار کا حال عرض کیا۔ نذرانہ قبول کیا اور خلاف عادت وہ کپڑا جو وہ سر سے باندھے رہتے تھے نذرانہ اس میں باندھ لیا اور مجذوبانہ انداز میں گویا ہوئے۔ توت کے چند پتے اس کے سینے پر رکھو ٹھیک ہو جائے گا۔ میں پتے لے گیا لیکن کسی نے اس کے سینے پر نہ رکھے (اس بات کو کچھ اہمیت نہ دی) اور سنبھل کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں بھی ایک منزل تک ہمراہ گیا جب بہت ہی نحیف اور زبوں حال ہو گیا دوسری منزل تک بھی ساتھ گیا دیکھا کہ اسے اپنا ہوش بھی نہیں رہا مگر میں اپنے شیخ سے کیے وعدے کے مطابق ہاپوڑ سے دہلی آ گیا۔ ان کی والدہ کہتی ہیں کہ گڑھ مکتیسر پہنچ کر اس لڑکے کی زندگی کی امید نہ رہی تو میں نے اسے حضرت اللہ بخش گڑھ مکتیسری کی قبر پر بھیجا اور ایک نذر مانی کہ اگر اسے صحت ہو جاتی ہے تو پوری کروں گی۔ اسی رات، شیخ کو خواب میں دیکھا کہ دو زانو مراقب بیٹھے ہوئے ہیں میں اس کو شیخ کے سامنے لے گئی۔ شیخ نے ہاتھ اٹھائے اور اس کی صحت کے لیے دعا کی اور فرمایا کہ توت کے پتے اس کے پیٹ پر رکھ ٹھیک ہو جائے گا تو اس نے حسن پور پہنچ کر توت کے پتے اس کے سینے پر باندھے سنبھل پہنچنے تک بالکل ٹھیک ہو گیا''۔ جب نرائن کا وقت اخیر ہوا تو میرے چچیرے بھائی محمد صالح کے پاس پہنچے اور کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے دفن کرنا جلانے کے لیے ہندوؤں کے لیے مت چھوڑنا اور تین بار کلمہ طیبہ کہا۔ دوسرے دن جتنے بھی بیراگی (سنیاسی) جوان کے چاہنے والے تھے سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے سے جدا کر دیا اور جنگل میں جہاں کوئی نہ تھا جا کر ایک چیخ ماری اور سر کو زانوں میں جھکا لیا اور چل بسے رمضان المبارک 1064ھ (1654) کی عید کا دن تھا۔ بیراگیوں نے ہندوؤں کی مدد سے ان کی نعش کو آراستہ کیا اور جلانے کا ارادہ کیا۔ یہ خبر جب محمد صالح کو پہنچائی تو انھوں نے ہتھیار لگائے، ایک مجمع کثیر لے کر وہاں پہنچے اور ان کی لاش زبردستی ہندوؤں سے چھین لی اور اپنے باغ میں لے آئے غسل دے کر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا۔ بعد میں سنیاسیوں نے ان کی قبر پر پتھر کی عمارت کھڑی کر دی اور قبر کو چوکور (سمادھی نما) بنا دیا پھر

مسلمان اکٹھے ہو کر آئے اور اس عمارت کو ڈھا دیا اور پہلے ہی کی طرح آراستہ کر دیا پھر وہی نورانیت عود کر آئی۔ آج کل مسلمان ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے ہیں۔ چند بیراگی اور ہندو بھی پوشیدہ طور پر ان کی قبر کو پوجتے ہیں۔ جب میں بچہ تھا سنبھل میں اجیت نام کا ایک بیراگی تھا اس نے خود کو خاکساری اور بے اعتباری کے پردے میں پوشیدہ رکھا تھا اور تسلیم وتفویض کی راہ میں کوشاں رہتا تھا۔ اپنا نام بھڑوا مشہور کر رکھا تھا اس کی روش ننگے منڈے سر بیراگیوں کے لباس میں شہر کی گلیوں کے چکر لگانا تھی۔ بچوں کا مجمع جب بھی اسے تنہا پاتا تو جوتے نکال کر اس کے سر پر بجایا کرتا تھا جب کوئی بڑا آجاتا تو ڈانٹ کر انھیں بھگاتا تو وہ اس منع کرنے والے کو بھی منع کرنے سے منع کیا کرتا تھا جب بچوں کا یہ ظلم جو وہ اس کے ساتھ کیا کرتے تھے میں دیکھتا تھا تو مجھے برا لگتا تھا جب میں انھیں منع کرتا تو وہ جوتیاں کھانے کے لیے خود ہی اپنا سر آگے بڑھا دیتا اور کوئی گرہ اس کے ماتھے میں نہ پڑتی اور نہ ہی کوئی گرانی خاطر اس کو ہوتی تھی۔ راہ حق کے دردمندوں کا کہنا ہے کہ اس راہ کا درد اس کے حال کا اچھی طرح دامن گیر ہے۔ جب بہار کا موسم آتا وہ اور زیادہ دیوانہ ہو جاتا تھا اور کوچہ و بازار میں مستانہ وار پھرا کرتا تھا بچوں کے پیچھے بھاگا کرتا لیکن کوئی آزار کسی کو نہ پہنچاتا تھا۔ آخر میں مجھے پتا نہیں کہ کہاں چلا گیا اور اس کا کیا ہوا۔ آج کل سنبھل کے نواح میں بھکنڈی کے نام سے ایک بیراگی مشہور ہے۔ بیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزرا کہ اولاً وہ جامع مسجد سنبھل میں رہا کرتا تھا اور فی الحال شہر کے ایک کنارے بھولا سرائے کے تکیے پر جو کہ نہایت ہی خوشگوار اور فرحت بخش مقام ہے، رہتا ہے۔ جب وہ بہت بھوکا ہو جاتا ہے کسی ہندو کے دروازے پر جو اس کا آشنا ہو چلا جاتا ہے اور بے طلب جو کچھ ملتا ہے کھالیتا ہے اور پھر اپنی جگہ چلا جاتا ہے۔ میں کبھی کبھی اسے دیکھنے کے لیے جایا کرتا ہوں اور ایک ساعت بیٹھ کر اس سے بات کیا کرتا ہوں۔ بات کا سچا اور ریاضات شاقہ اختیار کیے ہوئے ہونے کے باوجود معرفت وتوحید حق سے بے نصیب ہے۔ وہ اس ٹیلے پر ہی گرمی ہو برسات ہو جاڑا ہو دن ہو رات ہو بغیر کسی سائے کے اور بغیر کسی سامان معیشت کے تنہا خوش خوش گزارتا ہے۔ نہ کسی آشنا سے طالب امداد ہے نہ کسی جگہ جائے پناہ کا روادار ہے۔ نقل ہے کہ پیغمبر عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے جیسا کہ وہ حالت تجرید وتفرید میں رہا کرتے تھے ایک بار سخت بارش میں ایک صحرا میں لومڑی کے بچے کو دیکھا کہ

ایک پتھر کی آڑ میں آرام سے بیٹھا ہے تو یہ شعر ان کی زبان پر آ گیا

لابن الاوی ماوای　　لیس لابن المریم ماوا [1]

اسی دوران ایک کو دیکھا کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی پی رہا ہے پانی کا پیالہ جو آپ کے پاس تھا یہ دیکھ کر فوراً توڑ دیا کہ پانی پینے کا برتن تو خود ہاتھ ہی بن سکتا ہے۔

مجذوب مجہول

لباس خاکساری میں چھپے وہ ایک بادشاہ تھے ابر نو بہاری میں پوشیدہ ایک چاند تھے دہلی میں بخاریان محلے میں رود آسیا سے متصل ایک بڑے مکان کی پشت ان کی قیام گاہ تھی۔ کچھ دنوں میں بھی اسی دیار میں رہا ہوں۔ اپنے رہنے کے مقام پر خوش حال فارغ البال ایک چادر پہنے سر و پا برہنہ پڑے رہتے تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا حال باطنی رکھتے ہیں۔ اور کیا نام ہے۔ کہاں سے کھاتے ہیں اور کیسے گزارتے ہیں انھوں نے کبھی بھی کوئی چیز کسی سے نہیں مانگی اور نہ ہی کسی سے لالچ وطلب کا کوئی لفظ کبھی کہا۔ نہ کبھی کسی سے کہا ''آ'' اور نہ کبھی کسی سے کہا ''جا'' میں ان کو آتے جاتے دیکھتا اور خوش ہوتا تھا۔ باوقار بامعنی شخصیت نورانی چہرہ۔ اگرچہ ان کا ظاہر عوام کے مانند تھا مگر ان کا باطن خواص الٰہی کا سا تھا۔ کتاب ''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ مرتعش کہتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی اپنے باطن کو خواص کے باطن جیسا نہ پایا جب تک کہ میں نے اپنے ظاہر کو ظاہر عوام جیسا نہ کرلیا۔ اسی کتاب میں ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے فرمایا کہ ابوبکر کتانی خضر علیہ السلام کے صحبت داروں میں سے تھے۔ ایک بار حضرت خضر نے اُن سے کہا۔ ابا بکر صوفیوں کے تمام افراد مجھے پہچانتے ہیں۔ لیکن میں انھیں نہیں پہچانتا کیا وجہ ہے؟ اور کہا کہ میں صنعاء کی مسجد میں تھا۔ طالب علم وہاں شیخ عبدالرزاق سے حدیث کا درس لے رہے تھے وہیں مسجد کے ایک گوشے میں ایک نوجوان گریبان میں سر ڈالے بیٹھا تھا میں نے اس سے کہا کہ لوگ شیخ عبدالرزاق سے حدیث پڑھ رہے ہیں اور تو یہاں بیٹھا ہے کیوں نہیں جاتا کہ ان سے حدیث سماعت کرے؟ کہا کہ میں یہاں بیٹھا رزّاق سے حدیث سن رہا ہوں اور تو مجھے عبدالرزّاق کی طرف بلاتا ہے۔ میں

1　لومڑی کے بچے کے لیے تو ٹھکانہ ہے، مگر ابن مریم کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔

نے کہا اگر تو سچا ہے تو بتا میں کون ہوں؟ کہا خضر اور سر پھر گریبان میں ڈال لیا۔'' حضرت شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی کہتے ہیں کہ یہ زیادہ شرافت کی بات ہوتی کہ عبدالرزاق سے بھی سنتے اور رزاق سے بھی۔ کیونکہ ہمارے مشائخ کا یہ حال تھا کہ ان کا ظاہر، ظاہر عوام تھا اور باطن، باطن خواص۔ کہ ظاہر شریعت احکام جسم کے ظاہر کے لیے ہیں اور حقیقت شریعت جان اور سر کا حصہ ہے۔ انتہیٰ۔ اسی کتاب میں ہے کہ شیخ ابوعلی سیاہ نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ اگر کسی چیز سے کچھ جاتا رہے تو کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے مگر جب شریعت سے کوئی چیز جاتی رہے تو کچھ نہیں بچتا۔ حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا کہ بہت خوب فرمایا ہاں یہی بات ہے۔ شریعت حد چاہتی ہے۔ شریعت پر کمی زیادتی نقصان دہ ہے۔ شریعت پانی کی مانند ہے۔ پانی کی خاص مقدار کھیتی کے لیے مفید ہے اگر زیادہ ہوجائے تو ویرانی لاتا ہے اور اگر کم ہوجائے تو سکھا دیتا ہے۔ (شیخ) مرتعش فرماتے ہیں کہ میں نے جب تک خود کو ظاہراً عام نہ کیا باطناً خواص میں نہ پایا۔ (اس پر) شیخ الاسلام نے فرمایا۔ معنیٰ یہ ہیں کہ میری حقیقت درست نہ ہوئی جب تک کہ میری شریعت صاف نہ ہوئی (مطلب یہ کہ جب تک بدعات کلی طور پر ترک نہ کیں) میں 1029ھ (1619) میں اپنے والد کے ہمراہ بلگرام گیا تھا جیسا کہ تاج الدین بلگرامی کے ذکر میں گزرا وہاں کے درویشوں نے متفق اللفظ ہوکر ہم سے کہا کہ دہلی کے اندر ایک صاحب کمال مجذوب رہتے ہیں۔ اور بعض نے عقیدتاً یا حقیقتاً یہ بھی کہا کہ وہ قطب وقت ہیں۔ واللہ اعلم۔ لیکن وہ خود کو خاکساری اور بے اعتباری کے پردے میں چھپائے ہوئے دنیاوی تعلقات سے آزادی اور تہی دامانی میں کوشاں ہیں۔ علاقہ پورب کے رہنے والے ہیں جب اپنے شہر میں مشہور ہونے لگے تو وہاں سے اُٹھ گئے اور غائب ہوگئے اور فی الحال بہت دنوں سے دہلی میں ہیں۔ اس علاقے کے بہت سے لوگ انھیں خوب پہچانتے ہیں مگر ادب کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ اور یہ بھی بیان کیا کہ وہ بخاریان محلے میں رود آسیا کے نزدیک پڑے ہوئے ہیں اپنے آپ اور اپنے غیر سے آزاد و وارستہ۔ میرے والد یہ باتیں سن کر حسرت کرنے لگے کہ افسوس میں نے انھیں نہ پہچانا اور ان سے سعادت حاصل کرنے والوں کے زمرے میں خود کو شامل نہ کیا۔ کیونکہ میں نے آتے جاتے ان کو بہت دیکھا ہے کبھی کبھی نظریں بھی دوچار ہوئیں ہیں میں اپنے والد سے بھی زیادہ حیران تھا مجھے

حیرت اس بات کی تھی کہ آیا مردان خدا کا ایسا بھی خستہ اور شکستہ حال ہوتا ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ فوراً دہلی جاؤں اور ان کے دیدار سے مشرف ہوں۔ آخر جب میں اپنے والد کے ساتھ دہلی روانہ ہوا تو ہم دونوں خوش تھے اور امید رکھتے تھے کہ ان کو دریافت کر لیں گے۔ میرے والد مجھ سے بھی زیادہ ان کے مشتاق دید تھے۔ جب دہلی پہنچے تو ان کو نہ دیکھا۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ وہ کہاں چلے گئے اور کیا ہوا کسی نے ان کا پتا نہ بتایا۔ اب جب بھی اس کوچے سے گزرتا ہوں میں خود سے کہتا ہوں ہائے افسوس، اولیاء کی قدر کوئی نہیں جانتا۔ یہ رباعی موافق حال پڑی

بگذشت بہار و سیرابی نزدیم در سایۂ گل یک مژہ خوابے نزدیم
یار آمد و جلوہ کرد و مابے خبران بردیدہ بخت مشت آبے نزدیم [1]

شاہ آدم سنبھلی

ایک آزاد اور مجرد مجذوب ہیں۔ کسی سے کچھ نہ لیتے اگر کوئی انھیں نقد یا کوئی اور چیز دیتا نہ لیتے نہ ہی کسی کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتے۔ خود میں مست، مستانہ وار پھرا کرتے جب بھوکے ہو جاتے کسی نان بائی کی دکان سے روٹی اُٹھاتے اور وہیں بیٹھ کر کھاتے۔ ان کے اس عمل سے نان بائی بجائے ناراض ہونے کے خوش ہوتا۔ سارے نان بائی اس کی آرزو کیا کرتے کہ وہ ہمارے یہاں سے روٹی کھالیں۔ اس کے بعد کسی کمہار کی دکان سے مٹی کا پیالہ لیتے اس سے پانی پیتے اور اس پیالے کو توڑ دیتے تھے۔ اُن کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی ہے۔ قبر ان کی سنبھل کے بازار میں مسجد کے سامنے ہے۔ پیر کمال سنبھلی فرماتے ہیں کہ میں ان کا معتقد تھا ان کی میرے حال پر بڑی عنایتیں تھیں اور مجھ پر بڑا کرم فرماتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے عرض کیا کہ میری آرزو ہے کہ میں ساز و سامان اور گھوڑوں والا بن جاؤں۔ انھوں نے فرمایا بس ایک گھوڑا کافی ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن مجھے کافی مقدار میں سر و سامان زندگی میسر ہے، حالانکہ گھوڑوں وغیرہ کی تجارت بھی کرتا رہا ہوں مگر میرے پاس اُن کے فرمان کے بموجب ایک گھوڑے سے زیادہ نہیں

1 افسوس بہار گزر گئی اور ہم ذرا بھی سیراب نہ ہوئے۔ پھولوں کے سائے میں ایک پلک بھی نہ لگائی۔ محبوب آیا جلوہ دکھایا مگر ہم بے خبر ہی رہے۔ اپنے نصیب کی خوابیدہ آنکھ پر ایک چلو پانی بھی نہ ڈال پائے۔

رہا۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ اگر کوئی اپنا مطلب اور مراد پوری ہونے کے لیے نان وغیرہ اُن کی خدمت میں بطور نذر پیش کرتا اگر وہ کام ہونے والا ہوتا تو لے لیتے ورنہ نہیں پکڑتے۔ یہ معاملہ بارہا وقوع پذیر ہوتے دیکھا۔ کہتے ہیں کہ ایک رات کو وہ ایک کپڑا بننے والے کے گھر کے پیچھے تھک ہار کر پڑے کراہتے رہے۔ صبح کو وہ کپڑا بننے والا غصے میں بھرا ہوا آیا اور ان کے لات ماری اُسی وقت لنگڑا ہو گیا۔ اور تمام زندگی اس کا لنگ نہ گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ احمد نام کے ایک شخص نے سنا کہ وہ دروازے کے باہر کھڑے ہوئے ہیں کسی بزرگ کی خدمت میں نذر کے لیے وہ جو کھانا پکوا رہا تھا مع شیرینی اس پر فاتحہ پڑھ کر اُن کے سامنے لایا۔ احمد کی بیوی کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ انھوں نے باہر احمد سے کہا کہ تیری عورت اس سے برا مان رہی ہے۔ جب احمد گھر میں گیا انھوں نے اس کھانے کو زمین میں دبا دیا اور وہاں سے چلے آئے۔ انھیں ایام میں وہ عورت مر گئی۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے افسوس کرتے ہوئے خود سے کہا ہائے میں نے انھیں پایا اور ان کی قدر نہ جانی۔ بالکل ویسے ہی جیسے اُن مجذوب مجہول کو ہاتھ سے گنوا دینے پر افسوس ہوا تھا۔ بالکل درست ہے یہ جملہ ''النعمة اذا فقدت عرفت'' (نعمت جب جاتی رہتی ہے تب اس کی قدر پتا چلتی ہے) جب مجھے ان کی حالت بے تعینی اور آزادی (توکل و استغناء) یاد آتی ہے کہ جاڑوں میں ان کی خواب گاہ تنور پر ہوتی تھی تو استاد شاعر کا یہ مشہور شعر یاد آ جاتا ہے۔

شنیدۂ تو کہ محمود غزنوی شب وے — نشاط کرد و شبش جملہ در سمور گذشت
یکے فقیر درآن شب سر تنور گزید — شبے تنور بر آن مستمند عور گذشت
پگاہ نعرہ بر آورد و گفت ہاں محمود — شبے سمور گذشت و شب تنور گذشت [1]

جب کبھی مجھے یاد آتا ہے کہ شاہ آدم سنبھلی کے پاس ایک لنگی کے علاوہ کوئی کپڑا نہ تھا۔ کبھی کبھی عالم استغراق و بے خودی میں لنگی بھی پھینک دیتے اور خود کو عریاں کر لیتے اور گونگے بن جاتے تھے تو مجھے کسی مشہور صاحب کلام کی یہ رباعی یاد آتی ہے

---

1 کیا تو نے سنا ہے کہ جاڑوں کی ایک رات محمود غزنوی نے تو سمور کی پوستین میں عیش و نشاط میں بسر کی اسی رات ایک فقیر بے نوا نے تنور پر ننگے گزاری اور صبح کو مستی میں محمود غزنوی کے سامنے نعرہ لگایا ''اے محمود شب سمور بھی گزر گئی اور شب تنور بھی گزر گئی''، یعنی موت کی صبح کو دنیوی آرام اور تکالیف دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ننگ می باید بود گنگ می باید بود　　آزاد ز قید لنگ می باید بود
یک حرف ز درس عشق می باید خواند　　فارغ ز کتاب جنگ می باید بود[1]

کہتے ہیں کہ ایک مجذوب تھے ایک لنگی کے علاوہ کچھ پاس نہ رکھتے جب ان کی رحلت کا وقت قریب پہنچا اس لنگی کو اپنے جسم سے اتار کر ہاتھ میں لیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''تیری دنیا کی یہی ایک متاع میرے پاس تھی لے یہ بھی لے'' یہ کہہ کر لنگی پھینکی اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔ شیخ نعمت اللہ شیخی کہا کرتے تھے کہ دہلی میں ایک صاحب فہم باہوش مجذوب رہتے تھے۔ علاوہ ایک لنگی کے اور کچھ چیز نہ رکھتے تھے۔ کبھی کبھی قبور مشائخ کی زیارت کے لیے جایا کرتے۔ ایک دن لنگی بھی اتار پھینکی اور عریاں خوش خوش شیخ نظام الدین کی قبر کی زیارت کے لیے جارہے تھے میں نے انھیں اس حال میں دیکھا تو پوچھا ''اے شاہ یہ کیا حال ہے'' مسکرائے اور کہا آج دل میں آیا کہ بالکل مجرد ہو کر جانا چاہیے اسی لیے یوں جا رہا ہوں

برہنہ گانِ طریقت بہ نیم جو نخرند　　قبائے اطلسِ آنکس کہ از ہُنر عاریست[2]

میر عماد

ان کا خاندانِ سیادت ونجابت بہت بزرگ ہے اور ان کی شرافت اور لطافت کی شہرت بہت ہی مسلم ہے۔ ہروی الاصل ہیں۔ اپنے وقت کے مشاہیر میں ان کا شمار ہے اور اپنے وقت کے بے نظیر ہیں۔ ان کی ہمت اور سخاوت اس سے کہیں برتر ہے کہ تحریر میں آئے۔ مروت اور فتوت تو اس سے بھی بالاتر ہے کہ گفتگو میں سمائے۔ جو شرم وحیا وہ رکھتے ہیں اور جو اخلاق اور خوئے کرم ان کی ہے وہ استاد شاعر کے اس قطعہ سے موافقت رکھتی ہے

1　ننگے رہنا چاہیے گونگے رہنا چاہیے۔ لنگی کی قید سے آزاد رہنا چاہیے۔ درس عشق کا ایک حرف (وحدت) پڑھنا چاہیے۔ جن کتابوں میں دوئی کی جنگ ہے ان سے فارغ البال رہنا چاہیے۔

2　جو حضرات عاشقانِ الٰہی ہیں اور راہ محبت میں اپنے آپے سے ننگے ہو گئے ہیں اُن کی نظر میں اُس شخص کی اطلسی قبا کی قیمت ایک جَو کے برابر بھی نہیں جو ہنر عشق خداوندی سے عریاں ہے۔

ہر کس کہ نزد خلق بگوید کہ سیّدم ۔۔۔ باور مکن اگر چہ بود فی المثل ولی
سیّد کسے بود کہ ہویدا بود ازو ۔۔۔ خلقِ محمد و کرم مرتضٰی علی [1]

روایت ہے کہ جس زمانے میں اُن پر دولت کی فراوانی تھی جو سخاوت اور داد و دہش انھوں نے کی ہے اور جو مال و منال انھوں نے مخلوق خدا پر لٹایا ہے۔ اگلے پچھلے صاحب خیر و سخا جواد لوگوں سے بھی ظہور میں نہیں آیا۔ اُن کے فضائل اور ان کی خوبیاں تقریر و بیان سے بڑھ کر اور شرح و امکان سے بالاتر ہیں انھیں اب میرے شیخ سے رابطۂ محبت طریقہ مناسبت اور مستحکم اتحاد ظاہری و باطنی میسر ہے۔ ان کی بیٹی میرے شیخ کے منجھلے بیٹے خواجہ کلمۃ اللہ کی شریک حیات ہیں اور میرے شیخ کی بیٹی ان کے صاحبزادے میر مفاخر حسین کی اہلیہ محترمہ ہیں ان کا ذکر شاہ دولہ کے ذکر میں آیا ہے۔ حضرت میر جعفر جو ان کے بزرگوں میں سے تھے۔ بڑے صاحب کمال اور مکمل تھے اُن کا تھوڑا سا تذکرہ شیخ نظیر علی کے ذکر میں بھی گزرا ہے۔

میر عماد کے دوسرے فرزندان بھی سب کے سب صاحب فہم و فراست، اہل نظافت و لطافت ہیں لیکن میں صرف میر مفاخر حسین سے بخوبی آشنا ہوں اور ان کے نیازمندوں میں ہوں۔ وہ شیخ محمد معصوم ابن حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کے مرید و نیازمند ہیں۔ فضیلت علم سے خوب آراستہ، دل کش خوش اور طبع ہیں۔

طریقہ نقشبندیہ میں مشغولی رکھتے ہیں۔ مجھ پر خاص لطف و کرم ان کا ہے۔ ہم دونوں نے اپنے شیخ کی خدمت میں ایک زمانہ خوش خوش گزارا ہے۔ میر عماد ہندی اور فارسی زبان میں شعر کہتے ہیں ان کے فارسی کے اشعار مشفی سنبھلی کے برخلاف ان کے ہندی کلام سے اچھے ہیں۔ میں نے ان کا ہندی کلام ہندستانی گویوں سے بہت سنا ہے۔ البتہ ان کا فارسی کلام نعت شریف کے تین اشعار نمونتاً لکھتا ہوں (اور تین دیگر علاوہ نعت) کے ہیں۔

---

1 جو شخص مخلوق سے کہتا ہے کہ میں خاندان سیادت میں سے ہوں تو اس کی بات کو باور نہ کرنا جب تک کہ اس کا اخلاق اخلاق محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق نہ ہو اور اس کی سخاوت اور اس کا کرم علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ جیسا نہ ہو، اگر چہ فی المثل وہ ولی ہی کیوں نہ ہو۔

پیکرمہ بتمنای (ملتہاے) شبیہ نو فلک — گہ شدہ نیم رخ گاہ کشد (شد) مستقبل
بیند آخر گہ بدان حسن و لطافت نرسید — کند از حلقہ ہالہ چو حروف مبطل
اندرین عالم ناقص تو صحیح آمدۂ — نہ بماضی است مثال تو نہ در مستقبل
یکدم از قطرہ زدن نہ نشست در رودِ فراق — گرچہ پاے پیکِ اشکم از مژہ پرخار بود
بیادِ عارضت زار و نزارم — سر زانوشدہ آئینہ دارم
بزلفت سراسر مضامین کفر است — ہمان بہ کہ این نامہ پیچیدہ باشد[1]

ایک دن وہ میرے شیخ کے پاس آئے اور ہندی اشعار کا ذکر چھیڑا اور اپنے چند شعر سنائے میرے شیخ نے مجھے اشارہ کیا کہ اپنا ہندی کا سویہ سناؤں۔ شیخ نے میرا وہ ''پرمارتھ'' نام کا سویہ جو میں نے کہا تھا، سن کر پسند بھی فرمایا اور اپنی یادداشت (بیاض) میں لکھوا بھی لیا تھا۔ میں نے پڑھا

لکھ لکھ پوتھی کیا بانچت لوکن مانہہ — بات سن سانجھ بری پوتھی سبھی
پھاردار کی لے مانجھ دھاردار — بدھا ہوسیار وار پارہم آنچ وے
آنکھین کوں تور دارسن کوں نجوردا — مسوانی تیوردار جہاد سات پانچ وے

وہ بہت ہی محظوظ ہوئے۔ ایک بار اور بھی شیخ کی خانقاہ میں ان ہندی اشعار کی مجلس رہی میں نے اپنے رسالہ ''پیم جہت''، ''پیم اشیک''، ''پیم امابن'' انھیں پڑھ کر سنائے بہت ہی مسرور ہوئے۔ شعر فہم اور شعر گو نوجوانوں میں سے ایک صاحب ابو منصور بن محمد ابو بصر نصیر بن محمد شریف خاں ہیں کہ جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ وہ احراری کے نام سے مشہور ہیں اور رسا تخلص کرتے ہیں۔ صاحب فہم و فراست، ہمت و فتوت کے مالک بادشاہ کے درباریوں میں معزز و مکرم ہیں۔ میرے

1 پیکرمہ۔ آسمان کے نوؤں افلاک میں کبھی نیم رخ ہوا اور کبھی سیدھا ہوا اور منتہاے نظر تک دیکھا مگر اسے کہیں آپ کا سا حسن اور آپ کی سی لطافت نہ ملی تو خود مدنی چاند کے ہالے کے حلقے میں حروف باطلہ کی طرح (شرما کر) شامل ہو گیا۔ اس عالم ناقص میں صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کامل الحسن آئے ہیں۔ نہ ماضی میں کوئی آپ کی مثل ہوا نہ مستقبل میں ہوگا۔ ترے درد و غم و فراق میں ایک لمحے کے لیے آنکھوں سے آنسو نہیں رُکے ہیں۔ آنسوؤں کے بہتے بہتے پلکوں کے پیر خاردار ہو گئے ہیں۔ ترے رخسار کی یاد میں زار و نزار ہوں زانو میں سر کا ڈالنا میرے حال کا خود آئینہ دار بن گیا ہے۔ تیری زلفیں سراسر کفر کے مضامین ہیں کہ دیکھنے والے کا ایمان جاتا رہے گا۔ بہتر یہی ہے کہ یہ خط لپٹا ہوا ہی رہے۔

شیخ کے مقبول نظر اور داماد ہیں۔ ان کی مجھ پر نظر لطف وعنایت رہتی ہے۔ یہ چند شعر ان ہی کے ہیں

مخواہ بلبل شوریدہ سر خطاب از گل ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ که نیست هیچ بجز خامشی جواب از گل
زبس خجل شدہ از تاب عارضت چہ عجب ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ بے مضائقہ حاصل شود گلاب از گل
زلفت ز ابتری است ربودہ قرار ما ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گویا کہ ہست ترجمۂ روزگارِ ما
گلہاے داغ تازہ شود از سموم ہجر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہرگز خزان پذیر نگردد بہار ما
در فرقتت ز فرط درازی و تیرگی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تصویرِ زلف تو شدہ شبہاے تار ما
لب تشنگان عشق نخواہند آب خضر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ این طائفہ ز چشمۂ مہر آب خوردہ اند
ی دہد پند حبابت توازان عبرت گیر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ چوپُر باد شوی دہر دہد برباد[1]

مشفق سنبھلی

آپ نہایت فہیم صاحب ظرف، خوش طبع، خوش منظر نرم خو لطیف المزاج اور وسیع المشرب تھے۔ فقرا اور اغنیا سب میں نشست و برخاست رکھتے تھے۔ درویشوں کے مقبول اور صفا کیشوں کے پسندیدہ تھے۔ جب بھی وہ دولتمندوں کی صحبت میں ہوتے ان سے غربا اور مساکین کی مطلب برآری میں کوشاں رہتے اور سفارش سے انھیں کوئی دریغ نہ تھا۔ دانشمند اغنیا کمال محبت کے ساتھ انھیں اپنے ساتھ رکھا کرتے اور اپنی مصاحبت سے جدا نہ کرتے تھے اس وجہ سے بھی کہ آپ نہایت

---

1 اے شوریدہ سر بلبل گل سے جواب سننے کی طالب نہ بن کہ گل کی جانب سے خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ تیرے عارض کی تب وتاب سے پھول ایسا شرمندہ ہوا کہ اس کے عرق ندامت جسے گلاب کہتے ہیں (یعنی پھول کے اشکوں کا پانی) گل سے بے مضائقہ حاصل ہوجاتا ہے۔ آسانی سے نکل پڑتا ہے۔ تیری زلف نے ابتری کے ساتھ ہمارا قرار لوٹا ہے۔ تو وہ بھی پریشان رہتی ہے گویا کہ وہ پریشان ہوکر ہماری پریشاں حالی کو بیان کیا کرتی ہے۔ پھولوں کے دل کے داغ ہجر کی گرم ہواؤں سے اور تازہ ہوتے ہیں ہماری بہار پر کبھی خزاں آتی ہی نہیں۔ تیری فرقت کی درازی اور تیرگی کی افراط مین ہماری کالی راتیں تیری زلف کی تصویر بن گئی ہیں۔ عشق کی پیاس رکھنے والوں کے لب آب حیات نہ مانگیں گے کیونکہ اس گروہ اولیا نے محبت الٰہی کے چشمے کا پانی پی لیا ہے۔ پانی کا بلبلہ تجھے پند ونصیحت کررہا ہے تو اس سے عبرت حاصل کرکہ جب وہ ہوا سے بھر کر پھول جاتا ہے تو پھٹ کر فنا ہوجاتا ہے۔ تو بھی مغرور نہ بن ورنہ ختم ہوجائے گا۔

شیریں سخن اور شکریں کلام تھے۔ اگر چہ انھوں نے علوم عربیہ کی تحصیل نہ کی تھی لیکن خوش گوئی اور خوش خوئی کے سبب علما اور فضلا کی مجالس میں احترام سے بلائے جاتے اور دادِ سخن پاتے تھے۔ اُن کا کلام سب کو پسند آتا تھا (کہ مصلحت وقت سے کلام کرتے تھے) معلوم ہو کہ صوفیائے محققین، خسروانِ نکتہ بیں، اربابِ دولت و فطرت، اصحابِ فضیلت و خبرت کی محافل میں مناسب وقت و حال ہی کلام کرنا چاہیے۔ اس وقت مجھے ہنود کی ایک کتاب کی ایک نقل یاد آئی کہ

''متاعِ نیک ہر دوکان کہ باشد [1] ''

کہتے ہیں کہ ایک راجہ کے دربار میں مہاپنڈت (صاحب علم) اور صاحب سبھا پاتر (صحبت و مصلحت بیں) کی افضلیت کے بارے میں بحث ہونے لگی کہ کون افضل ہے۔ اکثریت اہل علم کو بہتر کہہ رہی تھی مگر کچھ لوگ صاحب صحبت کو ترجیح دے رہے تھے۔ راجہ نے کہا میں دونوں کا امتحان لیتا ہوں۔ پھر جو حقیقت ہوگی خود بخود ظاہر ہو جائے گی۔ راجہ ایک گوشے میں گیا اور سب سے چھپا کر ذرا ذرا سی راکھ دو جگہ کر کے کپڑے کے ٹکڑوں میں لپیٹ کر اور سونے کے کام کے مکلّف تھیلیوں میں ڈال کر ان کے اوپر اپنی مہر لگائی اور اس نے دونوں کو ایک ایک تھیلی دے کر کہا کہ جاؤ تم فلاں اور تم فلاں راجہ کو یہ تھیلی دے آنا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہا اور رخصت کیا۔ جب مہاپنڈت نے اس راجہ کو وہ تھیلی جا کر دی راجہ نے کھول کر دیکھا کہ راکھ ہے۔ حیرت زدہ ہو کر بولا یہ کیا؟ پنڈت نے کہا مجھے علاوہ پہنچانے کے کچھ نہیں کہا۔ حاضرین بولے یہ کوئی جادوگر لگتا ہے۔ راجہ غصے میں بھر گیا اور اس پنڈت کو پٹوا کر شہر بدر کر دیا۔ آخر وہ خائف و خاسر پھرتا پھراتا محنتیں اور پریشانیاں اُٹھاتا واپس آیا۔ لیکن سبھا پاتر جب دوسرے راجہ کے پاس راکھ کی تھیلی لے کر پہنچا راجہ نے اسے کھول کر دیکھا۔ راکھ ہے پوچھا یہ کیا ہے؟ سبھا پاتر نے فی الفور کہا کہ ہمارے راجہ نے فلاں رات میں ''ہَوَن'' کرایا تھا۔ اس علاقے کے تمام راجاؤں کو دعوت دی تھی۔ اس دیار کے سارے ہی بادشاہ آئے ہوئے تھے وہ رات بڑی خوشی والی رات تھی۔ کیونکہ آپ بہت دور ہیں آپ کو تکلیف نہ دی اب اسی رات کا یہ تبرک آپ کے لیے میرے ہاتھ بھیجا ہے۔ راجہ اس بات سے نہایت خوش ہوا اور سبھا پاتر کو خوب نوازا اور عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ اس طرح دونوں کی

---

1 بس سودا اچھا ہونا چاہیے کسی بھی دکان کا ہو۔

حقیقت خود بخود ظاہر ہوگئی۔ شیخ سعدی قدس سرہٗ نے گلستاں میں فرمایا ہے "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز [1] " اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ اب سے چند سال قبل میں سپہ سالار رستم خان دکھنی کے لشکر میں لشکری تھا اور شیخ نجم الدین لونی ایک دوسرے امیرِ لشکر کے ماتحت لشکری تھے۔ ان دونوں امیروں میں ایک پُل کے بارے میں خرخشہ چل رہا تھا۔ ہم دونوں کی، ان دونوں کے وکیل کی حیثیت سے دہلی کے حاکم کے پاس آمد و رفت رہتی تھی کیونکہ حق میری جانب تھا اس لیے میں اُن سے رجوعِ حق کی درخواست کرتا تھا۔ مگر وہ منکر ہو جاتے اور مجھے جھوٹا بناتے۔ ایک دن میں ان کے گھر پہنچا اور تنہائی میں ان سے کہا اے شیخ میں آپ کو دین دار اور نیک کردار جانتا ہوں خدا کے واسطے حق بات بتائیں کہ میرے اور آپ کے درمیان حق کس کی جانب ہے۔ کہا تیری جانب۔ میں نے کہا تو حاکم کے سامنے کیوں اس کا اقرار نہیں کرتے اور کیوں مجھے جھوٹا بناتے ہیں۔ کہا میرے آقا نے مجھ سے ایک کام کے لیے کہا ہے کہ کر، بس وہ کام کرتا ہوں اور چاہے ٹھیک ہو یا غلط، سچ ہو یا جھوٹ۔ میں ان کی اس بات سے بہت محظوظ ہوا۔ اسی معنیٰ میں خود اپنی حکایت یاد آئی کہ اپنی جوانی کے دِنوں کے ایک ماجرے کو میں نے دوسرے کے نام سے نظم کیا تھا۔ وہ منظوم حکایت یہ ہے

نوجوانے بود رہ رو، رازدان	پیر در تدبیر و عشق اندر جوان
ناگہان روزے زنے خوشروے مست	پیش روے آنجوان رفت و نشست
رو برو باہم دو چشمش چار شد	میل دل ہر دوشان لاچار شد
از دلِ زن عشق گشتہ شعلہ زن	چون توان ماند نہان مشکِ ختن
زخمہاے عشق پنہانش فتاد	اخگرے در خرمنِ جانش فتاد [2]

1 کسی مصلحت کے لیے جھوٹ بولنا اس سچ سے اچھا ہے جس سے فتنہ و فساد ہو۔

2 ایک راہ حق کا سالک نوجوان تھا۔ فکر و تدبر میں بوڑھا (تجربہ کار) اور عشق میں جوان۔ ناگہاں ایک روز ایک خوبصورت مست عورت اس نوجوان کے سامنے گئی اور بیٹھ گئی۔ ایک دوسرے کے روبرو دونوں کی آنکھیں ملیں لامحالہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی محبت پیدا ہوگئی۔ عورت کے دل سے عشق کے شعلے بھڑکنے لگے بھلا مشک ختن کی بو کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔ اس کے باطن میں عشق کے زخم ہوگئے۔ اس کی جان کے خرمن میں انگارے آپڑے۔ اگرچہ عشق نے اس کے دل میں گھر کر رکھا تھا بظاہر وہ بے نیازِ عشق ہو کر رہتی تھی۔

گر چہ عشق اندر دلش برپانشست — لیک در ظاہر باستغناء نشست
دلبرا در دل ربودن پروانبود — آشنا از دل برون بیگانہ بود
از درون شرین برونِ تلخ ریز — ازدرون گنجے و بیرون مار تیز
از درون گل گل شگفت و باغ باغ — و ز برون شد خار خار و داغ داغ
آن جوان القصہ پیش آن نگار — گشت چون تصویر از حیران کار
گر چہ آن زن آمدہ ہندو نژاد — لیک با اسلام کارش اوفتاد
کفر و اسلام آمدہ باہم کمال — ہر دو را یکسان شدہ حال و مقال [1]
شیر و شکر چون شود یکجا بجام — در شہودت یک بود گر چہ دو نام
چوب اخگر را بگردان حلقہ دار — حلقہ ہا از و ہم آور در شمار
آنچنان وحدت بکثرت بین یکی — آنکہ کثرت عین وحدت بے شکے
باز آیم بر سر این داستان — کرد اشارت آن زنے با آنجوان
کای جوان در سوی روے من بہ بین — دامن خود را ز کوے من مچین
ننگ و ناموس مرا بنگر کہ چیست — تو کدای من کدام و عشق چیست
بہر وصل من بسوے من بدَو — داد سوگند خودش گفتا برو [2]

---

1 محبوب دل میں تھا مگر باہر سے بے پروا بنتی۔ اندر سے باغ و بہار تھی۔ مگر باہر سے خار خار اور داغ داغ تھی۔ القصہ وہ نوجوان بھی اس معشوقہ کے سامنے اپنے کاروبار سلوک حق میں حیران کار ہوکر رہ گیا۔ اگر چہ وہ عورت ذات سے ہندو تھی لیکن مسلمان ہوگئی۔ اے کمال کفر و اسلام دونوں مل گئے۔ دونوں حال وقال میں یکساں ہوگئے۔

2 جیسے جام میں دودھ وشکر یکجا ہوجاتے ہیں اب دیکھنے میں دونوں ایک ہوگئے اگر چہ نام دونوں کے الگ الگ تھے۔ دہکتے ہوئے سرے والی لکڑی کو گھما کر دیکھو وہم میں دائرے سے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کثرت میں وحدت کا دیدار کرلو کیونکہ بلاشک کثرت عین وحدت ہے۔ میں پھر اس داستان کی جانب رجوع کرتا ہوں۔ اس عورت نے اس نوجوان کو اشارہ کیا کہ اے نوجوان میرے چہرے کی جانب نظر کر میرے کوچے سے دامن بچا کر نہ نکل میری ذات برادری دیکھ میں کون تو کون عشق کیا چیز ہے؟ اپنی قسم دی اور کہا جا میرے وصل کی تدبیر کر۔ سبحان اللہ بات کہاں سے پیدا ہوئی ہے۔

اللہ اللہ این سخنہا از کجا است	ہچو جنگ زرگران کارے بجا است
با چو یوسف کرد با آن داوری	داد وے را ورد بہر یاوری
سرِ و راز است این سخن عین است و عین	عین را دریاب فارغ شو ز شین
پوست کندہ گفتم و حرفیست نغز	پوست را بگذار و بنگر کار مغز
بلکہ می بگذار مغز و پوست را	تا بینی ہیچ غیر دوست را
اے کمال کار تو این است و این	این بخوان و این بدان و این بین[1]

انھیں شیخ نجم الدین سے کہ نہایت حق گو نیکو معاملت شخص تھے ایک دلچسپ حکایت ان کی مجھے یاد ہے۔ وہ سناتے تھے کہ میں اٹھارہ سال کا حسین ولطیف نوجوان تھا۔ ایک رات ایک عورت کی آواز میرے کان میں پڑی کہ کہہ رہی ہے "میں تیرے رُخ کی عاشق ہوں اگر تو کہے تو ظاہر ہو جاؤں میں نے پوچھا کہ تو کون ہے وہ کئی راتیں خلوت میں یہی کہتی رہی تو آخر کار میں نے کہا "اگر مجھے تجھ سے کوئی ضرر نہ پہنچے تو ظاہر ہو جا۔ اس نے اللہ کی قسم کھائی کہ تجھے آزار نہ پہنچے گا یہ کہہ کر بڑے حسن وخوبی، دلبری اور محبوبی کے ساتھ ظاہر ہوگئی اور عشق ومحبت کی باتیں کرنے لگی۔ کہنے لگی، ایک زمانہ سے میں تجھے دیکھتی ہوں اور تجھ پر فریفتہ ہوں لیکن تیرے خوف اور ڈر کا لحاظ کر کے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ القصہ مجھے بھی اس سے تعلق خاطر پیدا ہوگیا۔ پھر ہر روز تنہائی میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ اگر کبھی میں اپنی جانب سے تجھے دیکھنا چاہوں تو کیا کروں؟ کہا، جہاں تو یہ آیت کریمہ پڑھے گا میں حاضر ہو جاؤں گی۔ "وقال نِسوةٌ فی

---

1 اگر چہ بظاہر یہ عشق مجازی کی داستان ہے ورنہ حقیقت میں راز وحدت کا بیان ہے جیسے کے زرگروں کے محلے میں ہتھوڑوں کی آواز سے جنگ کا سماں رہتا ہے ورنہ حقیقت میں تو سونے کے زیور تیار ہوتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ جیسے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا۔ انھیں ورد دے کر پھر ان کی یاوری فرمائی یہ بات ہے کہ ہر شے کا عین وہی ہے ایک خدائی سر اور راز ہے۔ تو عین کو حاصل کر اور شین یعنی ماسوا سے فارغ ہو جا میں نے وہ برملا کہہ دی جو بات نادر تھی۔ چھلکا چھوڑ اور مغز (گری) کو لے لے بلکہ چھلکا اور گری دونوں کو چھوڑ دے تا کہ غیر دوست سب کچھ ہیچ ہو جائے۔ اے کمال تیرے کرنے کا کام بس یہی ہے کہ یہی کہے یہی جانے یہی دیکھے۔

المدینة امراة العزیز تراود فتاھا عن نفسہ قد شغفھا حباً [1] ‘‘ پھر جب بھی میں تنہائی میں اس سے ملاقات کرنی چاہتا یہ آیت پڑھ دیتا وہ فوراً حاضر ہو جایا کرتی۔ مدتوں اس پاک صاف عشق بازی میں خوشی خوشی وقت گزرتا رہا۔ جنوں کے عالم کے چھپے راز اور ان کے طور طریق کے بارے میں خوب سنا اور ملک لاریب عالم غیب کے بہت سے عجائبات کے تماشے میں نے بارہا دیکھے۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ آج کی رات ہمارے قبیلے میں شادی ہے اگر تو کہے تو میں تجھے تخت پر بٹھا کر جسے جن اپنے سروں پر اُٹھائے ہوئے ہوں گے اپنے ساتھ لے جاؤں اور عجیب وغریب تماشا دکھاؤں۔ کیونکہ اس کی طرف سے میرے دل میں کوئی ڈر نہ تھا میں نے ہاں کر دی۔ وہ گئی اور گھڑی بھر میں ایک نہایت آراستہ تخت جسے جن سروں پر اُٹھائے تھے لے کر آ گئی۔ ہم دونوں اس پر بیٹھ گئے اور ایک ساعت میں لونی (بلند شہر) سے دریائے جون کے دوسرے کنارے جہاں ایک بہت بڑی جہاں نما فیروزی عمارت تھی اس کے نزدیک پہنچ گئے۔ میں جنوں کی مجلس کے ایک گوشے میں تخت پر بیٹھا ان کے نئے نئے تماشے دیکھنے لگا۔ ایک عجیب شور وغوغا، عجیب ناچ گانا اور ان کی ایسی عجیب وغریب محافل دیکھیں کہ عقل حیران رہ گئی۔ اسی اثنا میں بعض جنیاں آئیں اور کھڑی ہو گئیں اور آپس میں کہنے لگیں دیکھو یہ زینب کا دوست آیا ہوا ہے۔ اس کا نام زینب تھا۔ پھر ہر قسم کے پُرلذت کھانے لائیں۔ میں نے کھائے۔ پھر پان اور خوشبو لائیں۔ مجھے بہت مزا آیا اسی میں آدھی رات ہو گئی۔ وہ بولی جب تیرا دل چاہے اُٹھ جانا اور کہہ دینا۔ میں تجھے تیرے گھر واپس پہنچا دوں گی۔ میں ساری رات تماشا دیکھتا رہا سحر کے وقت جس طرح گیا تھا واپس گھر آ گیا۔ القصہ جب چھ مہینے گزر گئے اور عشق بازی میں انہماک زیادہ ہو گیا۔ میرے قبیلے کے لوگ میرے تنہائی میں رہنے اور میرے چہرے کی زردی سے حیرت زدہ اور پریشان خاطر تھے۔ انھوں نے مجھ سے زور دے کر پوچھا کہ تجھے کیا پیش آیا جو تیرا یہ بُرا حال ہو گیا ہے۔ میں نے کسی سے اپنا راز نہ کھولا کہ زینب مجھ سے کہا کرتی تھی کہ جس وقت تو یہ راز کھول دے گا پھر مجھے نہ دیکھے گا۔ آخر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ جہاں میرا رشتہ طے ہوا تھا اور نکاح کی تاریخ قریب آ گئی تھی

1 شہر میں عورتوں نے چرچا کیا کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام کا دل لینا چاہتی ہے وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔

لڑکی والے جھگڑنے لگے کہ میں کسی عورت کو تنہائی میں بلاتا ہوں اس وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ اس رشتے کو ختم کر دیں جب مجھے بہت تنگ کیا تو اپنی اس جنی کے ساتھ پاک عشق بازی کو ظاہر کر دیا اور اظہار کی پشیمانی سے تنہائی میں بستر پر آ گرا۔ اسی دوران زینب غصے میں بھری آئی اور ایک سخت طمانچہ میرے چہرے پر مار کر کہا "اے بدنصیب کیوں میرا راز کھولا اور ایسی صحبت عزیز میں فتور پیدا کیا" اور چلی گئی۔ پھر دوبارہ میں نے اسے کبھی نہ دیکھا۔ مشفق سنبھلی فارسی اور ہندی کے شاعر ہیں، ان کا ہندی کلام فارسی شاعری سے اچھا ہے۔ ان کے ہر دو کلام میں سے یہ چند شعر پیش کرتا ہوں

بہر جذبِ یار تعویذ و دعا در کار نیست — میل دل از سدرہ آرد بر زمین جبرئیل را
رخش بچشم سپرداست گنج خوبے را — برو بزاویۂ اش اے دل کہ پاسبان مست است
نالۂ مرغ چمن زمزمۂ خوشحالیست — نالہ آنست کہ از مرغ قفس می شنوم

رباعی

آنکس کہ بعشق بستہ پیان درست — در کفر نہان ساختہ، ایمان درست
دارد بخلاف روش بوالہوساں — صد پارہ دلے زیر گریبان درست

قطعہ

نار گویند ہندوان زن را — گر تو مرد رہی از و زنہار[1]
در کلام مجید واقع شد — وقنا ربنا عذاب النار

---

1 جذب یار کے لیے تعویذ و دعا کچھ درکار نہیں۔ توجہ دلی چاہیے کہ دل کی تڑپ جبرئیل کو سدرۃ المنتہا سے زمین پر لے آتی ہے۔ اس کے چہرے نے اپنے حسن کے خزانے کو آنکھ کے سپرد کر دیا ہے۔ چل اس کے گوشۂ دل میں چل کہ پاسبان یعنی اس کی آنکھ مست و بے خود ہے۔ مرغ چمن کا نالہ تو خوشحالی کا گیت ہے۔ نالہ تو وہ ہے جو میں قفس میں قید پرندے کے منہ سے سن رہا ہوں۔ جس شخص نے عشق میں درست عہد و پیان باندھا ہے وہ کفر (طریقت) کے پردے میں ایمان درست رکھتا ہے۔ وہ بوالہوسوں کی روش کے خلاف چاہیں دل کے سو ٹکڑے ہو جائیں مگر گریبان درست رکھتا ہے۔ ہندو عورت کو نار کہتے ہیں۔ اگر تو راہ خدا کا مرد ہے تو اس سے بچ کر رہ۔ کلام مجید میں آیا ہے "وقنا عذاب النار" (ہمارے رب ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا۔)

دوہرہ

جی نجر تو جارون جنسہ جادن بچھر پے
کہت نہ کہتیوات کہت بہی ہے بہنوبنت ہے
جب وے نوین چیت چدہت کنت کہیا جن سوانس
پریت برلے برن کی کثرت جنہ منہ بہانس

ارن برن دوری بنتے بجئے پیم مجنہ پرکت پوتن لال کے دہکی جانت ہے رینہ
نیزوتن تج بہت ہے ات منہ تورت میت پیم کسے کہو دکہے دہادہ داری بہنت
ہم تہرن کرتار دودہ و ماہے بانہہ رہاتھ اوہ انت دہ تہر رہو ہم سب اونہہ جانت

جب میرے شیخ نے اس آخر شعر کو سنا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کیا عجب کہ ان کا کام اسی شعر سے بن گیا ہو۔ مولانا زین الدین محمود کمان گر علیہ الرحمۃ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ فردوسی طوسی شاعر کو ان کے اس شعر پر ان کے انتقال کے بعد بخش دیا

مشو نومید از فضل الٰہی مدہ بر بخل فضلِ او گواہی [1]

خواجہ محمد یعقوب جو میرے شیخ کے ماموں خواجہ محمد صادق کے صاحبزادے ہیں بڑے سمجھدار اور سنجیدہ جوان ہیں۔ انھوں نے اپنے چشم دید فقرا کی تاریخ لکھی ہے۔ اس تاریخ میں مجھ عاجز کو بھی شامل کیا ہے۔ میرے بارے میں بھی لکھا ہے کہ اس کے ہندی شعر فارسی اشعار سے زیادہ اچھے ہیں۔ جیسا کہ فضلائے وقت نے مشفق سنبھلی مرحوم کے بارے میں یہی کہا ہے۔ میں نے ان کے دونوں کلاموں کا نمونہ دکھا دیا اب اپنے بھی دونوں زبانوں کے اشعار لکھتا ہوں۔

تا عشق نواخت ساز عود دلِ من چون عود بسوخت تارپود دلِ من
می سوزم و می سازم و می نالم و خوش انیست درین جناب سود دلِ من [2]

---

1 اللہ کے فضل سے ناامید نہ ہو، ناامید ہو کر اس بات کا گواہ مت بن کہ وہ ذات فضل کرنے میں بخل روا رکھتی ہے۔

2 جب سے عشق نے میرے دل کی عود (سارنگی) بجائی ہے میرے دل کا تانا بانا عود کی خوشبودار لکڑی کی طرح جل رہا ہے۔ میں جل رہا ہوں کبھی بجتا ہوں کبھی نالے کرتا ہوں مگر اپنے حال میں مست ہوں۔ اس بارگاہ عشق میں رہنے سے میرے دل کا یہی نفع ہے۔

دنیا طلب اے وائے کہ در چہ ماندہ   عقبٰی طلب افسوس کہ در راہ ماندہ
مولاطلب الحمد کہ آن ہردو گذشت   خود ہم زمیان گذشت واللہ ماندہ[1]

رباعی

مستیم ز بادہ نہ جامش پیداست   صیدیم نہ دانہ و نہ دامش پیداست
پیوستہ ہمہ بے سر و پا راہ رویم   بر ہیچ نے نشان نہ نامش پیداست[2]

رباعی

تا چند بعلم و قیل و قال و شر و شور   مغرور شوی چو جاہلے بآوازِ زور
خود را دریاب تا کہ مانی کرّ و کور   تو دریاے نہٖ بسان کد و تور
نگاہِ من بفراق تو ماندہ شد کامروز   زدیدہ تا سرِ مژگان ہزار فرسنگ است[3]

دوہرہ

سندر نار وچتر ہے سکت لیو من لوٹ   جو من بھاوے سو کرے ہاتھی برکھا جوت[4]
سربس اب تو سو بونت ناکر کے اسنہ اپنی   دیو کہی ہے کلاکت مکہ رکہائی بہوئیں بتی
بالوانت نمران ایک بلی من کی ٹوٹت ہے مدہ پان   من منہ چتر سجان تن ہون آنکہ سکھ رمیو
جیوتن لاگے پران برانن منہ سون لاکیو

---

1 افسوس طالب دنیا اسی کنوئیں میں ڈوبا رہ گیا افسوس طالب عقبٰی راستے کی بہاروں میں اٹک کر رہ گیا الحمدللہ کہ مولا کا چاہنے والا اپنے آپ سے بھی گزر گیا اور بس اللہ ہی (اس کا مقصد) رہ گیا۔

2 ہم ایسی شراب معرفت کے مست ہیں جس کا پیانہ نظر نہیں آتا اور ایسے اسیر ہیں کہ نہ تو صیاد کا بچھایا جال ہی ہمیں نظر آتا ہے، نہ اس کا دانہ ہی۔ لگاتار بے سروسامان راستہ چل رہے ہیں ایسی بارگاہ بے نیاز کی سمت کہ جس کا نہ کوئی نام ہے نہ نشان۔

3 تو جاہلوں کی مانند کب تک علمی بحث و مباحثہ کے شور اور بلند آوازی پر مغرور رہے گا۔ پہلے اپنی حقیقت تو جان لے کب تک اندھا بہرا رہے گا تو دریا نہیں ہے تو برے کے مانند شخص۔ آج میری نظر تیرے فراق میں اتنی تھک کر چور ہوگئی ہے کہ آنکھ کی پتلی سے پلکوں تک نظر کے لیے ہزاروں فرسنگ کا فاصلہ ہوگیا ہے۔

4 حسین عورت عجیب شے ہے لمحے میں دل لوٹ لیتی ہے۔ وہ مست ہاتھی، بارش اور آگ کی طرح ہوتی جو اس کا دل چاہتا ہے (اپنے عاشق کے ساتھ) کرتی ہے۔

دوہرہ

دوئی لکھوں تو دوی نہ وہی کہون بھئی (کمال) دوی
اوہیں کہوں تو ایک ہی کہوں جو ہوئی سوہوئی

کہتے ہیں کہ ایک رات کو مشفی کا پڑوسی ان کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میری عورت کے درد زہ ہو رہا ہے، کوئی تعویذ یا دعا جو آپ جانتے ہوں لکھ دیں۔ وہ کوئی تعویذ نہ جانتے تھے۔ بطور خوش طبعی یہ شعر لکھ کر دے دیا

الٰہی غنچہ امید بکشای گلے از روضہ جاوید بنما [1]

شیخ عبدالمومن سنبھلی کہتے ہیں کہ ان کا یہ لکھنا ان کے تصرف باطنی کا اظہار تھا۔ انھوں نے درد زہ کے دفع کے لیے مجھے بھی اس شعر کی اجازت دی ہے اور میں نے اس کا تجربہ بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اوائل حال میں ایک دن مشفی اپنے روبرو شراب کی صراحی اور پیالہ سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ خوش طبعی کے طور پر کہنے لگے۔ صراحی اور پیالے سے لفظ ''آہ'' نکلتا ہے کہ صراحی سے ''الف'' اور پیالہ سے ''ہ'' ایک ظریف آدمی نے کہا مگر اس وقت جبکہ اوپر مد بھی ہو۔ انھوں نے برجستہ کہا۔ شراب تو بیچ میں ہے کیونکہ ''مد'' ہندی میں شراب کو کہتے ہیں۔ ایک بھولے بھالے فقیہ نے ان سے اپنی کھانسی کا علاج معلوم کیا انھوں نے مذاق کے طور پر کہا کہ قند سیاہ کا ٹکڑا اور کیکر کے پتے اور تھوڑا پانی کسی برتن میں لے کر کچھ دیر تک کسی گرم جگہ رکھ کر اس کا عرق نکال کر پی لینا ٹھیک ہو جاؤ گے۔ سادہ دل فقیہ سمجھے ہی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پی کر جب مدرسہ آئے اور جب اس کی بدبو شاگردوں کی ناک میں پہنچی سب حیران و متعجب ہوئے مگر ادباً استاد کے عیب کو چھپا گئے اور ان سے کچھ نہ پوچھا۔ مگر جب طالب علموں سے الگ ہو کر عوام میں پہنچے تو ہنسی پڑی، کھانسی کی صفت میں شیخ احمد ہروی کا کہا ہوا یہ دوہرہ خوب ہے

اِسک مُسک کھانسی کہس کہون کہرا ورند
احمد درے تادر، نہ آنے آوے سد

مشفی سنبھلی کا نام شیخ ماکھن تھا۔ ان کا ایک بیٹا تھا مگر وہ ان کا ہم صفت نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن کسی خوش طبع شخص نے ان سے کہا تم خود تو مکھن بن گئے مگر تمھارا بیٹا چھاچھ بھی نہ ہو سکا۔

---

1 الٰہی امید کا غنچہ کھلا دے گلستاں جاوید کا ایک پھول کھلا دے۔

انھوں نے کہا کیا کہتے ہو میرا بیٹا کھویا (ماوا) ہوگیا ہے۔ میں نے مشفی سنبھلی سے چند بار ملاقات کی ہے اور ان کی دل خوش کرنے والی اداؤں سے بہت محظوظ ہوا ہوں۔ ایک دن میں نے ان کو ایک تماشا گاہ کے ہجوم میں دیکھا۔ بغل کڑھا ہوا کرتا زیب تن کیے ہوئے اور چمکتا چہرہ لیے ہوئے وہ اپنے چند مصاحبین کے ساتھ حسین و جمیل لڑکوں کے نظارے میں از خود رفتہ کھڑے تھے۔ حالانکہ ان کی بڑی عمر ہوگئی تھی میں نے تماشے سے اپنا دل ہٹایا اور ان کے دیدار میں محو ہوگیا۔ کہتے ہیں ان کا عمر نام کا ایک پڑوسی تھا لمبے قد کا۔ میں نے عمر کو دیکھا ہے۔ وہ ان کی بیماری میں ان کی عیادت کے لیے گیا انھوں نے کہا۔ آ جا عمر دراز اچھا وداع کرنے آیا ہے۔ اور اسی بیماری میں جمعرات کے دن کہ دس محرم 1031ھ (15/ نومبر 1621) میں رخصت ہوگئے۔ ''خوش فہم'' ان کی تاریخ وفات ہے۔ شیخ مرتضیٰ سنبھلی کا بیان ہے کہ شیخ ماکھن (مشفی سنبھلی) کی وفات کے بعد میں ان کے غسل اور جنازہ میں حاضر تھا۔ میں نے دیکھا کہ پانی ڈالتے وقت اُن کا تہ بند کچھ کھل گیا۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ چلائے اور جیسا کہ ڈھکنا چاہیے ڈھک دیا۔ اس حال کے مشاہدے سے حاضرین حیرت زدہ رہ گئے اس کے بعد انھوں نے آنکھوں کو کھولا اور اچھی طرح دیکھا اور پھر بند کر لیں۔

رحمۃ اللہ علیہ

شیخی سنبھلی

وہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے دیکھنے والوں میں سے ہیں۔ آپ نے اُن کو جب وہ سنبھل شیخ کبیر کلّہ رواں کے روضے میں تشریف لائے تھے، دیکھا تھا جیسا کہ سید محمد سرسوی کے ذکر میں آیا ہے۔ انھوں نے اپنے دیکھے اور ملاقات کیے ہوئے بزرگوں کی تاریخ بھی ''بحرالعمیق'' کے نام سے لکھی ہے۔ انھوں نے اس میں تحریر فرمایا ہے کہ جب مجھے اس راہ کا داعیہ پیدا ہوا شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی سے تلقین ذکر حال کی اور دو سال تک اسی ذکر کو کرتا رہا۔ فی الجملہ یک گونہ جمعیت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد میں اپنے شیخ سے جدا ہوگیا۔ میرے احوال میں فتور آ گیا۔ عجب قسم کی خرابی نے ابھرنا شروع کر دیا۔ یہ دو شعر کسی بڑے شاعر کے ہیں

باغبان بگذاشت تا بیرون برم گل از چمن   نکہتے ورزیدم و آنہم صبا تاراج کرد
خدا بدستِ من آن طرّہٗ دوتا نگذاشت   غریب سلسلۂ داشتم خدا نگذاشت [1]

بارہ سال تک سرگرداں پھرا اور پھر دولتمندوں کی صحبت میں جا پڑا۔ غلبۂ نفس اور حیوانیت کے زور نے دوسری طرف لاکر ڈال دیا۔ خوب پریشان اور آوارہ پھرایا۔ اس کے بعد برہان پور میں شیخ تاج الدین سنبھلی کی خدمت میں پہنچا۔ پان کے چند دستے اور میوہ سے بھری ہوئی چاندی کی ایک پٹی (ڈبیا) نذر کی۔ شیخ نے پان اور میوے تو تقسیم کر دیے اور چاندی کی پٹی (ڈبیا) مجھے واپس کر دی کہ تو مفلس لگتا ہے، تو ہی رکھ لے۔ میں نے کہا اے شیخ میرا افلاس اس ڈبیہ سے دور نہ ہوگا۔ یہ سن کر انھوں نے قبول کر لی۔ ایک روز آپ نے خوش ہو کر فرمایا کہ تو شیخ کبیر کلّہ رواں کی اولاد میں ہے اور ہم ان کی تربیت سے بہرہ ور ہوئے ہیں اب تو میرے ہاتھ سے خرقہ درویشی پہن اور جا سفری ہو جا۔ میں نے کہا اے شیخ! اگر آپ جانتے ہیں کہ میں اس راہ میں مستقیم رہوں گا اور میرا پیر نہ ڈگمگائے گا ایسا ہی کروں گا۔ اس بات سے وہ خفا ہو گئے اور منہ پھیر کر فرمایا کہ مجھے یہ علم نہیں کہ مرید کی ابتدا اور انتہا کو کشف کروں اور اس کے خاتمہ کار کی خبر دے دوں۔ اس طرح خرقہ موقوف ہو گیا اور میں آتا جاتا رہا کہ ایک رات کو نماز تہجد کے بعد مجھے طلب فرمایا اور تلقین ذکر فرمائی اور طریقہ نقشبندیہ کی جانب رغبت دلائی اور حضرات نقشبندیہ کے سلوک کی رہنمائی کی۔ جب حضرت شیخ سے جدا ہو کر پھر وطن واپس لوٹا اس وقت بھی قناعت اور دولت انزوا نصیب نہ ہوئی تو شعر و شاعری کی جانب توجہ کی اور اکثر مردم زمانہ کی طرح کش مکش میں پڑ گیا۔ شاید انھیں دنوں مشفی سنبھلی نے ان کے موافق حال یہ ظریفانہ رباعی برمحل کہی تھی

شیخی کہ بدل تخم ریا کاشتہ است   دنیا ہم بگذاشتہ پنداشتہ است
دارد زر وسیم و اسپ و قصر و اسباب   جز ریش دراز ہیچ نگذاشتہ است [2]

---

1 باغبان نے مجھے مہلت دی تھی کہ چمن سے پھول چن لوں۔ ابھی میں خوشبو ہی سونگھ رہا تھا کہ اسے بھی باد صبا اڑا لے گئی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ میں زلف دوتا کا سرا بھی نہ چھوڑا۔ مجھ غریب کے لیے ایک سلسلہ تھا وہ بھی ختم کر دیا۔

2 شیخی نے اپنے دل میں ریا کاری کا بیج بولیا ہے۔ اور یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے دل سے دنیا نکل گئی ہے۔ دنیا میں سے مال و دولت سونا چاندی مکان سامان گھوڑا سبھی کچھ اس کے پاس ہے اور دین میں سے علاوہ لمبی داڑھی کے کچھ نہیں چھوڑا۔

''بحرالعمیق''، میں شیخی سنبھلی نے لکھا ہے کہ آج چودہ سال ہوگئے کہ مجھے توبہ وتوکل میں استقامت حاصل ہے اور غربت و نامرادی میں بسر کرتا ہوں۔ قطعہ

شیخی اندر زمان اکبر شاہ عیش و عشرت بکام دل کردم
چون جہانگیر بر سریر نشست طبعئ خویش معتدل کردم
عمر چل سالہ در گناہ گذشت توبہ اندر ہزار و چل کردم[1]

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے حضرت شیخ احمد سرہندی کی صحبت بھی حاصل کی ہے اور ان کی گفتگو سے بہرہ ور ہوا ہوں اسی طرح شیخ پیر میرٹھی، شیخ بدیع الدین سہارنپوری اور شیخ موسیٰ سرہندی سے بھی ملا ہوں اور ان سے بہت سی حکایات سنی ہیں۔ سب کے سب اللہ کے دوست گزرے ہیں۔ (حضرت) شیخی سنبھلی نے میرے شیخ سے دہلی میں ملاقات کی اور اظہار نیازمندی کیا۔ میرے شیخ اُن کے بارے میں فرماتے تھے کہ ''بہت اچھے آدمی تھے'' جب وہ بیمار ہوئے ایک دن افسوس کناں کہنے لگے کہ بہار کا موسم آگیا، افسوس کہ میں نے نغمۂ نسبت نہ سنا۔ اور کہا کہ اب تو دوسرے ہی میرے جنازہ پر پڑھیں گے۔ میں نے بیماری کے اس عالم میں انھیں خط لکھ کر ان کے دل کی کیفیت رضائے الٰہی دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں لکھا پیشاب رُک جانے کی پریشانی لاحق ہے اگر خدا نے چاہا تو ٹھیک ہو جاؤں گا ورنہ اللہ تعالیٰ سے راضی بہ رضا ہوں جو ہونا ہے ہو جائے۔ ان کے حقیقی بھائی شیخ علاء الدین جو کہ صاحب ذوق آدمی ہیں اور اپنے والد شیخ ابدال کے جن کا ذکر گزرا صحبت یافتہ اور حصہ ان سے پائے ہوئے ہیں اور والد کی وفات کے بعد شیخ قاسم اور شیخ طٰہٰ کی بھی صحبت میں رہے ہیں انھوں نے اور شیخ معین الدین و شیخ قطب الدین جو کہ نیک انسان ہیں سب نے مل کر طبیب کو بلا کر علاج کرانا چاہا۔ انھوں نے کہا دیکھو بھائیو اگر خدا نے چاہا تو میں خود بخود ٹھیک ہو جاؤں گا لیکن طبیب کو اپنی شرم گاہ دکھا کر پیشاب کی تکلیف سے خلاصی پانا مجھے ہرگز پسند نہیں اسی مرض میں 1057ھ (1647) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ یاروں نے

---

1 شیخی، میں نے بادشاہ اکبر کے زمانے میں دل پسند عیش وعشرت میں گزاری۔ جب جہاں گیر بادشاہ تخت پر بیٹھا میں نے اپنی طبیعت میں اعتدال پیدا کرلیا، چالیس سال کی عمر گناہ میں گزر گئی، اب 1040ھ میں توبہ کرلی۔

ان کے جنازے پر سرود نسبت پڑھا اور شیخ کبیر کلاں رواں کے روضے کے برابر دفن کر دیا۔ ان کا نام شیخ سعداللہ اور تخلص شیخی ہے۔ میں نے ان کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ کہا

صاحب فضل و زبدۂ شعرا نادر عصر شیخ سعداللہ
نظم و نثرش بغایت شرین بود خوش فہم در سخن ناگاہ
نصف ذی الحجہ و شب جمعہ زین جہان یافت سوے جنت راہ
فکر کردم ز سال تاریخش گفت ہاتف ز شیخ اسعد آہ [1]

''چار چمن'' کے نام سے انھوں نے ایک مثنوی کہی ہے علاوہ ازیں اور بھی بہت فصیح اور شریں کلام ان کا ملتا ہے۔ منجملہ ان کے یہ چند شعر پیش ہیں:

شیخی ز آہ سوختگان جحیم عشق بر شاخ سدرہ طائر قدسی کباب شد
عشق ورزیدن و رسوا شدن آئین منست سنگ طفلان محک چہرہ زرّین منست
اگر مشاہدۂ دوست از پس مرگست حیاتِ خضر و مسیحا نصیب دشمن باد
(مہر) ہندو پسران در دلِ من آتش زد دل جہنم شد و اینہا ہمہ فی النار و سقر
شیخا رفتی، ز تو طرز سخن افسانہ ماند در جہان باقی نمی ماند بجز افسانہ ہیچ [2]

یہ آخری شعر ان کے اشعار میں سے آخری ہے۔ میں نے ان سے بارہا ملاقات کی ہے۔ میرے اور ان کے درمیان خط و کتابت بھی رہی ہے اور فارسی زبان میں سوال و جواب رہے ہیں اور صحرائے سنبھل میں خاص کر برسات کے موسم میں جو کہ کشمیر اور بدخشاں کا پتا دیتا ہے۔ ہم نے باہم

1 صاحب فضل، زبدۂ شعرا اور نادر عصر شیخ سعداللہ جن کی نظم و نثر دونوں ہی شیریں تھیں۔ اور سخن گوئی میں خوش فہم تھے، اچانک وہ جمعہ کی رات میں 15 رذی الحجہ کو اس جہاں سے جنت کی طرف چلے گئے جب میں نے ان کی تاریخ وصال میں غور کیا تو ہاتف نے کہا ''ز شیخ اسعد آہ''۔

2 دوزخ عشق کے سوختہ گان کی آہ سے اے شیخی طائر قدس حضرت جبرائیل کے پر سدرہ کی شاخ پر کباب ہو گئے۔ عشق کرنا اور رسوا ہونا میرا دستور ہے۔ میرے چہرۂ زریں کی کسوٹی بچوں کے پتھر ہیں۔ اگر دوست کا دیدار مرنے کے بعد ہونا طے ہے تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی زندگی دشمنوں کو نصیب ہو۔ حسین نوجوانوں کے خیال نے میرے دل میں آگ لگا دی ہے اور میرا دل جہنم بن گیا تو یہ سب ہندو بچے اس دوزخ میں جل گئے۔ اے شیخی تو چلا گیا مگر تیرے طرز سخن کا افسانہ رہ گیا۔ دنیا میں کچھ نہیں بچتا بجز افسانے کے۔

بہت سیر کی ہے اور بڑی مستی و خوش گواری میں بسر کی ہے۔ حکیمی شاعر جو کہ شیخ حاتم سنبھلی کے پوتوں میں سے ہیں انھوں نے سنبھل شہر کی تعریف میں یہ غزل کہی ہے

گر تو دیدی رے و بخارا را ۔۔۔ گوش کن وصف سنبھلِ ما را

طرفہ شہرے کہ از سر خوبی ۔۔۔ طعنہ زد جنتِ مصفا را

گر تو در وے نظر کنی بینی ۔۔۔ ہر طرف عاشقانِ شیدا را

ماہر و یان این ہمایون شہر ۔۔۔ کرد دیوانہ عقل دانا را

اے حکیمی گذر ز شہر و ببین ۔۔۔ رنگ عشقست روے صحرا را [1]

حکیمی شاعر ایک غریب اور نادار مرد خدا تھے۔ مجھ پر بہت مہربانی رکھتے تھے۔ یہ اشعار بھی ان کے ہی ہیں:

نیست مہرے کہ سراز چرخ برین برزدہ است ۔۔۔ آتشِ سینۂ ما بر فلک اخگر زدہ است

مردم از دست غم ہجر تو، کز ماتم من ۔۔۔ برتن خویش فلک جامۂ اخضر زدہ است

تا سبق گیر حکیمی شدہ در مکتب عشق ۔۔۔ آتش شعلہ زنش در ہمہ دفتر زدہ است [2]

منہٗ

چہ سان بر بستر راحت زنم اے ہمنشین پہلو ۔۔۔ کہ بے او ہم سر موی برتن من نیش می گردد

نہ روزم قاشقِ جغرات و نے شب کاسہ شیرم ۔۔۔ مگر این آرزو حاصل زیک گاو میش می گردد [3]

---

1 اگر تو نے شہر رے اور بخارا کو دیکھا ہے تو ہمارے سنبھل کی تعریف بھی سن۔ کیا خوب شہر ہے کہ خوبی کی وجہ سے جنت مصفیٰ کو طعنہ دیتا ہے۔ اگر تو اس میں جا کر دیکھے تو تو ہر طرف عاشقوں اور شیداؤں کو دیکھے گا۔ اس خوش نصیب شہر کے حسین، داناؤں کی عقل کو بھی دیوانہ کر دیتے ہیں۔ اے حکیمی شہر سے نکل سنبھل کے صحرا کو جا کر دیکھ کہ اس کے رُخ پر بھی رنگ عشق جھلکتا ہے۔

2 یہ سورج نہیں ہے جس نے چرخ بریں سے سر اُبھرا ہے بلکہ ہمارے سینے کی آگ نے فلک پر انگارہ پھینک دیا ہے۔ میں تیرے غم، ہجر کے ہاتھوں کیا مر گیا کہ میرے ماتم میں فلک نے ہرا لباس پہن لیا ہے۔ جب سے حکیمی نے مکتب عشق کا سبق لیا ہے۔ اس نے ساری کتابوں کے دفاتر میں آگ لگادی ہے۔

3 اے ہم نشین میں کس طرح بستر راحت پر پہلو لگاؤں کہ اس کے بغیر بالوں کا ہر سرا میرے جسم میں ڈنک بن جاتا ہے۔ نہ تو مجھے کسی دن اس کی جانب سے جغرات کا ایک چمچہ نصیب ہے نہ کسی رات کو دودھ کا ایک پیالہ لیکن یہ تمنا تو کسی بھینس سے بھی پوری ہو جاتی ہے۔

شعرا سنبھل میں سے ایک ابوالمعالی ہوئے ہیں اور وہ شیخی چشتی تخلص کرتے تھے۔ یہ شعران کے ہیں

اندرین بزم اگر توبہ شکن بسیار است   بادہ ہم درخور این دہر کہن بسیار است

ابلہاں اند کہ گویند تمام است سخن   مخزن فیض تہی نیست سخن بسیار است

بجہان مردہ دگر باز نیاید بیرون   بعدم خانۂ قدرت سر وتن بسیار است[1]

شیخ سید غلام محمد سنبھلی کہتے ہیں کہ ان کے انتقال کے بعد ایک رات کو میں نے انھیں سوتے میں دیکھا کہ شیخ کبیر کلّہ رواں کے روضے کے دروازے پر غم زدہ اور گریاں کھڑے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ پر مرنے کے بعد کیا گزری؟ کہا میرا قصہ یہ ہے کہ بدی کے فرشتے نے مجھے بدبختوں میں لکھ دیا تھا دوسرے نیکی کے فرشتے نے کہا فی الحال تو اس کو نیک بختوں میں لکھ کر فرشتوں کے افسر بڑے فرشتے کے پاس لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ دیکھیں کیا حکم ہوتا ہے۔ جب ایسا کیا تو بزرگ فرشتے نے کہا کہ یہ تو بدبختوں میں داخل تھا تو نے اسے نیکوں میں کیوں کیا میں تیرے جلانے کا حکم دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے شیخ ابوالمعالی سے (خواب میں ہی) معلوم کیا کہ شیخ کبیر کلّہ رواں اور آپ کے دوسرے آباواجداد نے دستگیری نہ کی۔ کہا کوئی بھی میرے کام نہ آیا ہاں کلام اللہ شریف جس کی میں تلاوت کیا کرتا تھا اور وہ ایک شعر جو میں نے حضرت غوث اعظم کی مدح میں کہا تھا ان دونوں کے طفیل مجھے خلاصی ہوئی وہ شعر یہ ہے

نامراداں را مراد و دردمنداں را دوا   عاصیان رادستگیر و گمرہان را رہبر است[2]

میں نے ابوالمعالی سے بارہا ملاقات کی ہے اور ان سے مجھے کام بھی پڑے ہیں لیکن یہاں ان ملاقاتوں کے ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی وفات 1050ھ (1640) میں ہوئی۔ ایک بزرگ

---

1   اس بزم جہاں میں اگر مے نوشوں کی کمی نہیں ہے تو اس دہر کہن کے لائق شراب کی بھی کمی نہیں ہے۔ احمق ہیں وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص پر سخن گوئی تمام ہے۔ فیض کا خزانہ خالی نہیں ہوا ہے میدان سخن بہت وسیع ہے۔ ٹھیک ہے کہ مردہ دوبارہ قبر سے باہر نہیں آتا۔ مگر قدرت کے عدم خانے میں روحوں کی کمی نہیں بے شمار ہیں یہ دنیا قیامت تک یونہی آباد رہے گی۔

2   آپ نامرادوں کی مراد ہیں، دردمندوں کی دوا ہیں عاصیوں کے دستگیر اور گم راہوں کے لیے رہبر ہیں۔

نے ان دو ہم تخلص شاعروں کی نسبت کہا ہے کہ شیخی سنبھلی بہت کہتے ہیں جن میں بلند و پست دونوں قسم کے شعر ہوتے ہیں مگر شیخی چشتی بہت کم شعر کہتے ہیں مگر اچھا کہتے ہیں۔ وہی سید غلام محمد کہتے ہیں کہ میرے والد سید عبد الرسول، شیخ محمد بن شیخ کبیر کلۂ رواں کے نواسے تھے۔ تہجد گزار صالح اور نیک کردار بزرگ تھے۔ ایک دن شیخ محمد نے اپنی بیٹی سے کہا کہ خداے تعالیٰ تجھے ایک لڑکا دے گا اس کا نام عبد الرسول رکھنا کچھ عرصے کے بعد وہ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد نے سنبھل میں نور باطن سے جان لیا اور خوش ہوئے ایک زمانے کے بعد اس بچے کو وہاں سے طلب کیا اور اس کی تربیت کی۔ ایک دن شیخ محمد نماز میں تھے اور وہ رجال الغیب کی جماعت کو شیخ کے چاروں طرف دیکھ رہا تھا پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا میرے نگہبان ہیں۔ جب شیخ محمد دنیا سے رخصت ہوگئے تو سید عبد الرسول میرے والد محترم نے شیخ بایزید کی صحبت کو لازم پکڑ لیا۔ اس کے بعد حضرت غوث اعظم کی اولاد میں سے ایک بزرگ کے پاس گئے پھر وہاں سے اُچہ پہنچے اور چلہ کھینچا اور دستار طریقت حاصل کی وہاں سے اجمیر آ کر خواجہ معین الدین ثانی کی خدمت میں رہے اور ان سے بھی دستار اور خرقہ پایا۔ وہ خواب میں حضرت غوث اعظم سے ملاقات کیا کرتے اور اپنی گزارشات کے جوابات پاتے تھے۔ ایک رات کو خواب میں حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا یہ صحیح حدیث ہے ''من رانی فی المنام فقد رای الحق و من رانی فدخل الجنة بلا حساب[1] '' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صحیح ہے۔ وہ ہی کہتے ہیں کہ میرے والد اور میرے چچا سپاہ گری کی کمائی سے گزارہ کرتے تھے اور کوئی ان کے احوال باطنی سے باخبر نہ تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ بلخ چلے گئے۔ ایک دن شیخ فرید بخاری امیر لشکر کہ یہ دونوں حضرات ان کے ساتھ تھے، ایک درویش کی خدمت میں گئے اور ایک جنگ میں کامیابی کی ان درویش سے درخواست کی۔ انھوں نے کہا خود تیرے لشکر میں ہی درویش کامل ہے۔ اس سے کہہ اور میرے والد محترم شیخ عبد الرسول کی جانب اشارہ کیا۔ جب ان سے رجوع کیا تو کہا میں کل جواب دوں گا۔ اس کے

---

1 جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا (کہ شیطان میری صورت میں نہیں آ سکتا) اور جس نے مجھے دیکھا وہ بلا حساب جنت میں جائے گا۔ مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث صرف اتنی ہے ''من رانی فی المنام فقد رای الحق''۔

بعد میرے والد نے اپنے بھائی سے کہا میں کل دنیا سے چلا جاؤں گا۔ وہ بولے میں بھی آپ سے دس دن بعد چلا جاؤں گا۔ دونوں نے اسی طرح دنیا سے 1057ھ (1647) کوچ کیا۔ وہی سید غلام محمد کہتے ہیں کہ تئیس سال کی عمر میں ایک حال پیش آیا کہ جب میں خود کو طاعات وعبادات اور ذکر اللہ سے قاصر پاتا تو اپنی نسبت میں خلل محسوس کر کے اپنے سید ہونے کا انکار کیا کرتا تھا یعنی جو بھی مجھے سید کہتا اس کو منع کرتا تھا کہ مجھ میں سیادت کے آثار نہیں ہیں۔ بعض بزرگ کہتے بھی کہ اعمال میں تقصیر سے نسبت سیادت برطرف نہیں ہوتی لیکن اچھی طرح سے میری تشفئ خاطر نہ ہوتی تھی اور اپنے آپ سے کہتا تھا کہ اگر سرور جہانیان صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں یا واقعے میں اپنی زبان مبارک سے مجھے سید فرمائیں تو میں سمجھوں گا کہ میں سید ہوں۔ کچھ عرصہ اسی حال میں گزرا ایک دن میرے غم واندوہ کو دیکھ کر میرے چچا سید عبدالغفور نے مجھ سے کہا کہ آیۂ کریمہ ''رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْن ''(اے میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑ، تو تو خیر الوارثین ہے) کو ایک لاکھ مرتبہ پڑھ جو طلب رکھتا ہے میسر ہوجائے گی۔ میں نے پڑھنا شروع کیا اور جمعہ کی رات کو زمین پر سو رہا تھا ایک لاکھ کے نزدیک تک ہی شمار پہنچا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ پہلے آواز آئی کہ حضرت شاہ پیغمبراں یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں گیا دیکھا کہ آنحضرت دروازے کے کنارے ایک تخت پر پیر پھیلائے لیٹے ہوئے ہیں اور سر مبارک جانب قبلہ۔ میں نے پائے مبارک کو بوسہ دیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ السلام علیکم۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور اظہار نیازمندی کیا۔ اس دروازے کے نیچے دائیں طرف کو امیر المومنین حضرت علی (ﷺ) تشریف رکھتے ہیں۔ سپاہیانہ لباس پہنے اور شمشیر لگائے دوسرے صحابہ بھی سامنے ہیں۔ کچھ کھڑے ہیں اور کچھ بیٹھے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں آپ کی اولاد میں سے ہوں؟ فرمایا۔ ہاں۔ تین بار میں نے یہی پوچھا۔ یہ بھی فرمایا کہ تو سید شرف الدین کی اولاد میں سے ہے۔ وہ میرے آبائے کرام میں سے ایک بزرگ تھے جو ولایت ماوراءالنہر سے آئے اور بدایوں شہر میں اترے وہیں سکونت اختیار کی اور وہیں 637ھ (1240) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ''حبیب خدا''[1] ان کی تاریخ وصال ہے۔ میں نے پھر آنحضرت سے التماس کیا

1 حبیب خدا سے 627 عدد برآمد ہوتے ہیں۔

کہ یارسول اللہ میرے کوئی بیٹا نہیں ہے۔ خاموش ہو گئے۔ میں نے تین مرتبہ یہی عرض کیا کوئی جواب نہ دیا اور فرمایا عبدالغفور سے کہنا ہمارا تحفہ کیوں نہیں بھیجا۔ میں نے عرض کیا عبدالغفور نام کے تو بہت سے آدمی ہیں۔ ایک میرے چچا کا نام بھی عبدالغفور ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں وہی۔ جب میں دروازے سے نیچے آیا کسی نے کہا کہ یہ مرتضیٰ علی تشریف رکھتے ہیں آگے بڑھا اور میں نے آپ کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور کہا یا جدی۔ آپ نے مجھے آغوش میں لے لیا۔ میں نے سارا واقعہ عرض کیا کہ میں نے فرزند کے بارے میں جو التماس کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبول نہ ہوئی۔ کہا اچھا میں عرض کرتا ہوں۔ میں نے آپ سے یہ بھی عرض کیا کہ میں آپ کی نسل سے ہوں۔ فرمایا۔ ٹھیک ہے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے گئے۔ اسی اثنا میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُٹھ کر اندر جانے کا قصد کیا۔ میں نے عرض کیا اے امیرالمومنین گزارش کا موقع یہی ہے۔ کہا ''میرے لیے خلوت جلوت دونوں میں اجازت ہے'' اور آنحضرت کے ہمراہ اندر تشریف لے گئے۔ واپس آ کر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی تجھے عنایت ہوئی۔ میں نے خوشی میں کہا۔ لاکھوں کی برابر ہیں۔ یہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس درگاہ میں تحفۂ درود قبول ہوتا ہے۔ ''**اللھم صلی علی محمد و علی آلِ محمد** '' سو مرتبہ پڑھا پھر دست بیعت بڑھا کر مجھے مرید کیا۔ آخر جب سحر کے وقت بیدار ہوا اسی وقت اپنے چچا شیخ سید عبدالغفور کے پاس پہنچا۔ دیکھا کہ صحن کے اندر سورۂ مزمل پڑھتے ہوئے ٹہل رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بولے خلاف عادت بے وقت کیوں آیا ہے۔ میں نے کہا آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تحفہ کیوں نہیں بھیجتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا تجھے کس نے بتایا؟ میں نے کہا خود صاحب درود صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اور سارا واقعہ سنایا۔ انھوں نے فرمایا کہ ایک وقت میں سیالکوٹ میں شیخ کتھہ جو کہ ایک صاحب توفیق اور عامل بزرگ تھے کے پاس پڑھ رہا تھا۔ ایک رات کو ایک روغن گر نے اپنا بیل حاکم کے ڈر سے کہ وہ بیگار میں بیلوں کو پکڑ لیتا تھا ان کے گھر لا کر باندھ دیا۔ جب ان کی والدہ رات کو اٹھیں تو بیل پر نگاہ ڈالی تو اس کی گردن کا گوشت اُٹھا ہوا دیکھا تو سوجن گمان کر کے درود پڑھتے ہوئے اس گوشت پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ دے کر دعا کی، یہاں تک کہ ابھرا ہوا گوشت برابر ہو گیا۔ صبح کو جب بیل کے مالک

نے اس کی گردن پر بڑھا ہوا گوشت نہ دیکھا حیران ہوا اور یہ بات شیخ سے کہی۔ شیخ نے سارا ماجرا اپنی والدہ سے سنا۔ میں اس وقت حاضر تھا اس درود کے پڑھنے کی اجازت میں نے ان بی بی سے حاصل کی وہ درود یہ ہے "**اللھم صلی علیٰ سیدنا محمدٍ عَبْدِک و حبیبک و شفیعک و امینک و رسولک النبی الاُمی و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ و اھل بیتہٖ اجمعین**" اس کو میں ہمیشہ پڑھتا ہوں مگر آج بائیس دن ہو گئے بجائے اس کے اپنا وظیفہ پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد میرے چچا سید عبدالغفور نے مجھ سے معلوم کیا" تجھے لڑکا عطا نہیں ہوا؟ (میں نے حضرت امیر علی مرتضٰی کی سفارش سے بشارت فرزند اور دختر کی ملنے کا سارا واقعہ سنا دیا) پھر میں وہاں سے اٹھ کر حاجی محمود درویش جن کی عمر 135 سال تھی اور انھوں نے بہت سے حج کیے تھے، کے پاس پہنچا۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ تیری حاجت روا ہوگئی کہ تیرے گھر لڑکا آئے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت (دعا و توجہ) سے حضرت امیر کی سفارش کی بدولت اسی رات حمل رہ گیا اور نو ماہ کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام میں نے علی رضا رکھا۔ سنبھل کے شعرا میں سے ایک اسد خاں سنبھلی ہوئے ہیں، بنی اسرائیل کی قوم سے۔ بڑے منصف اور دانشمند بزرگ تھے۔ ایک دن مشفی سنبھلی کا یہ شعر گا کر پڑھ رہے تھے

آئی زپسِ حسن، در آغوش نگنجی   چون ناز کنی در خرد و ہوش نگنجی [1]

یہ دو شعر اسد خاں سنبھلی کے ہیں:

دِے آتش از درد بہ مخزون گریستم   بے درد را خیال کہ من خون گریستم
چشمم سپید گشت ز بس گریہ کردنم   جانا مگر بہجر تو صابون گریستم [2]

وہ تاریخ کہنے میں بہت کم سوچتے تھے اکثر بے تامل برجستہ کہتے تھے شیخ تاج عالم کہ ان کا نام

---

1 تری ذات پس پردہ تشبیہ میں آتی ہے مگر آغوش میں سمانے سے پاک ہے اور نازِ (تنزیہہ) کے وقت ہوش و خرد کے ادراک سے بھی پاک ہے۔

2 کل میں اپنے غم زدہ باطن سے آگ رو رہا تھا دردِ دل سے عاری نے سمجھا کہ میں خون کے آنسوں بہا رہا ہوں تیری جدائی میں روتے روتے میری آنکھیں سفید ہوگئیں، اے محبوب گویا میں نے بجائے اشکوں کے صابون آنکھوں سے بہایا ہے۔

حسین محمد خدانما کے ذکر میں آیا ہے کہتے ہیں کہ عاشق نام کے ایک صاحب کا انتقال ہوگیا۔ کسی نے اسدخاں سے آکر کہا ''عاشق مرگیا'' انھوں نے برجستہ کہا'' آہ

عاشق مردوایماں برد [1] '' اتفاق دیکھیے یہی تاریخ ہوگئی بغیر کسی کی بیشی کے۔ شیخ تاج عالم ہی کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دومرتبہ خواب میں دیکھا۔ پہلی بار دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑے تخت پر تشریف رکھتے ہیں اور اس تخت بزرگ کے چاروں کونوں میں چار نورانی بزرگ کھڑے ہوئے ہیں۔ میں نیازمندی اور انکساری کے ساتھ حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ چاروں کون حضرات ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ ابوبکر ہے، یہ عمر ہے، یہ عثمان، یہ علی اس خواب کو دیکھ کر میں دین ودنیا کی برکتوں سے بہت سعادت اندوز ہوا ہوں۔ دوسری مرتبہ دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک حجرے میں تشریف فرما ہیں اور اس حجرے کے باہر میں بیٹھا ہوں دوسری ایک عورت اور بیٹھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے مع سالن کے مجھے نان عطا فرمایا اور کہا ''بخور حبیبی'' (میرے پیارے کھالے) سنبھل کے ایک شاعر شیخ فتح اللہ دہلوی سنبھلی ہیں۔ دہلی میں محلہ بجل مسجد کے نزدیک رہتے ہیں اور سنبھل میں شیخ علی بنی اسرائیل کی اولاد میں ان کی رشتہ داری ہے۔ صاحب ذوق وشوق بزرگ ہیں۔ اسم مبارک ''اللہ'' ہر وقت ورد زبان رہتا ہے۔ میں نے چند بار انھیں سنبھل میں دیکھا ہے۔ اور ان کے فارسی ہندی کلام سے جسے وہ ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں محظوظ ہوا ہوں۔ یہ ان ہی کی رباعی ہے

در زیر سپہر عکس آبیم ہمہ بر روے زمین آب سرابیم ہمہ [2]

بر بحر فنا شکل حُبابیم ہمہ در بیداری خیال و خوابیم ہمہ

یہ ہندی کے اشعار ہیں۔ سورٹھہ

---

1 عاشق مُردوایماں بُرد'' سے 1029ھ سن برآمد ہوتا ہے جو 1620 کے مطابق ہے۔

2 ہم آسمان کے نیچے رہنے والے سب کے سب پانی پر بنے ہوئے عکس ہیں۔ زمین پر آب سراب کی مانند ہیں کہ دور سے پانی نظر آتا ہے قریب جا کر دیکھو تو صحرا ہے۔ فنا کے سمندر میں سب بلبلے کے مانند ہیں۔ دنیا میں بیداری میں رہتے ہوئے بھی خواب وخیال ہیں۔

عام خاص من مول احد و احمد دوی نہیں　　　بدہ نے نہو رسول جیوں مولی میں انبیا

میں نرکھ پے برن جب بھکو دہرنہ دھیر　　　کر گناہ اک گناہی کے بھر بھر لیاویہ نیر

ایک شیخ سعد اللہ سنبھل کے اور بھی ہیں۔نوجوان اور فہیم۔اسعد تخلص کرتے ہیں۔یہ دو رباعیاں ان کی ہیں

دارد دلِ من ہوائے عبدالقادر　　　جان و دلِ من فدائے عبدالقادر

تا شمع زبان بود بفانوسِ دہان　　　وردِ است مرا ثنائے عبدالقادر [1]

رباعی

مائیم ز جان غلام غوث الثقلین　　　مرغ دلِ ما بدام غوث الثقلین

در روز شکستگی نجات ابد است　　　جرز دلِ ماز نام غوث الثقلین [2]

سنبھل کے شعرامیں سے ایک بزرگ شیخ محمد صادق لکھنوی ہیں۔صاحب ذوق وشوق، دو سال کا عرصہ ہوا نوکری چھوڑ راہ درویشی میں آ گئے ہیں پورے ہوش اور آگاہی کے ساتھ۔ابتدائے حال میں مدتوں کوہ و بیابان میں سرگشتہ پھرتے تھے۔نشہ عشق میں مست اور لذت ذوق میں آسودہ اور خوش۔آج کل سنبھل میں اقامت پذیر ہیں۔میرے مخلص اور مہربان ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میرا یہ نشہ عشق الٰہی میرے دادا شیخ محمود قلندر کی دولت ہے۔وہ صاحب کمال بزرگوں میں سے تھے۔ان کا فرمانا ہے کہ میری اولاد کو میری جانب سے مژدۂ ہدایت ہے۔ان میں کا کوئی اگر کسی ایسے شخص سے جو اس راہ کا اہل ہو اور اس کا ظاہر و باطن حق کے ساتھ چین پائے ہوئے، رجوع کرے اس وقت میں اور وہ (مرجوع شخص) ایک ہی ہوں گے۔الفقراء کنفس واحد (فقراء نفس واحد کی طرح ہے)"راہ گر بسیار باشد، باش، گو منزل یکست [3]"ایک دن میں نے شیخ محمد صادق سے ان کے

1　میرے دل میں شیخ عبدالقادر کی محبت اور تمنا ہے۔میری جان و دل دونوں ان پر فدا ہیں جب تک دہن کے فانوس میں زبان کی شمع جلتی ہے شیخ عبدالقادر کی ثناگوئی میرا وظیفہ ہے۔

2　ہم جان سے شیخ عبدالقادر کے غلام ہیں۔ہمارے دل کا پرندہ غوث الثقلین کے دام کا قیدی ہے۔قیامت کے روز غوث الثقلین کے نام نامی کی نسبت کے طفیل انشاء اللہ نجات ابدی حاصل ہوگی کیونکہ ان کا نام ہمارے دل کا تعویذ ہے۔

3　راستے اگر چہ کتنے ہی ہوں ہوا کریں کہہ دے منزل سب کی ایک ہی ہے۔

احوال اور اشعار کے بارے میں استفسار کیا انھوں نے اپنی ان دو رباعیوں میں جواب دے دیا۔

کس نیست چون من بہ ہجر خونیں جگرے　　در بقعہ نور معرفت بے بصرے
افسوس برآن نہال گلبن کہ بود　　نے رنگ و نہ بوی نہ سایہ نہ ثمرے
چون نیست ز مبدء و معادم خبرے　　و اندر سرِ ما ز سر فیض اثرے
در ملک و جود، بود ما ہست عبث　　از کشمکش زمانے نہ ام رہ گزرے [1]

فانی کشمیری

ان کا نام شیخ محسن ہے۔ فاضل خوش فہم اور خوش گو ہیں۔ صاحب ذوق ومحبت آخوند ملا شاہ رستاق جو کہ شاہ میر لاہوری کے خلیفہ ہیں، کی صحبت اُٹھائے ہوئے۔ بڑی شان وشوکت عظمت ووجاہت کے مالک ہیں۔ اہل ارشاد وہدایت میں سے ہیں۔ کشمیر میں ہی آپ کی قیام گاہ (خانقاہ) ہے۔ روایت ہے کہ جس وقت بادشاہ صاحب قران ثانی کشمیر میں تھے۔ شیخ محسن کو کابل کی صدارت کی خدمت عطا کی، اسی دوران ان کو ''لولی بخی'' نام کی ایک حسین وجمیل عورت سے بہت زیادہ محبت ہوگئی۔ اس کی محبت کا ایسا غلبہ ہوا کہ بے صبر اور بے آرام ہو گئے۔ حضرت حافظ شیرازی کا یہ شعر ان کے حال کے موافق آیا۔

فغان کین لولیان شوخ وشرین کار شہر آشوب　　چنان بردند صبر از دل کہ ترکان خوان یغمارا [2]

ایک رات بادشاہ کے کوتوال نے ان دونوں کو خلوت میں دیکھ لیا۔ بادشاہ سے جاکر ماجرا بیان کیا۔ بادشاہ کو بھی بہت غصہ آیا۔ چاہا کہ انھیں سزا دے۔ آخوند ملا شاہ کی بادشاہ کے دل میں بہت قدر و منزلت تھی انھوں نے فانی کو اپنی ضمانت میں لے لیا۔ اس وقت ظفر خان نے جو کہ کشمیر کا حاکم تھا

1　فراقِ دوست میں مجھ سا خونی جگر کوئی نہیں اور معرفت کے نورانی مقام کو دیکھنے سے بے بصر۔ افسوس چمن کے اس درخت پر جس میں نہ رنگ و بو ہو نہ سایہ ہو نہ پھل۔ کیونکہ مجھے مبدء ومعاد کی کوئی خبر نہیں، نہ ہی فیضانِ الٰہی کا خود پر کوئی اثر دیکھتا ہوں۔ میرا وجود عبث در عبث ہے مگر کشمکش زمانہ سے کوئی راہِ فرار بھی میرے لیے نہیں۔

2　فریاد ہے کہ یہ شریر، شیریں کار، شہر کو فتنہ میں مبتلا کرنے والے معشوق، صبر کو دل سے اس طرح لوٹ لے گئے جیسے ترک سپاہی مالِ غنیمت کو۔

اور صاحب شعر و سخن تھا اور فانی کشمیری کے ساتھ ہنگامہ شاعری اور مجالس سخن وری برپا رکھتا تھا اُن کے عشق کی حالت کو ایک غزل میں کہا ہے جس کا مصرعہ تاریخ یہ ہے

''صدر والا صدر (شد، ز) فرمان بخی''

آخوند (ملا شاہ رستاق) فصیح و بلیغ اشعار رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں کلیات (خواجہ باقی باللہ) کی زبان تصوف میں شرح لکھی تھی اور اس کا نسخہ انھوں نے کشمیر سے میرے شیخ کے پاس بھیجا تھا۔ میرے شیخ کو پسند آیا اور اس شرح کے جواب میں رباعیات کہیں ہیں جو کہ کلیات کی شرح کلاں کے علاوہ ہیں۔ میں نے بھی اُن آخوند کو دیکھا ہے۔ وہ میرے شیخ سے دوستی اور اتحاد مزاج رکھتے تھے اور لاہور میں ان کی کافی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ یہ اشعار ان ہی کے ہیں۔

بنشین ز پریشان روی سیر و خلاص   بگذر ز تمیز کعبہ و دیر و خلاص

اخلاص پراگندۂ خود را ز ہمہ جا   یکجا کن و با خدا دہ و خیز و خلاص [1]

رباعی

بربستگی خویش اگر وا کردی   بر در سعی خویش مہیا کردی

بر گرد بگرد خویش مانند حباب   تا واکردی ز خویش دریا بردی [2]

من بآئینہ رو برو گفتم   حمد را با تو نسبتے است درست

بردر ہر کہ رفت بردر تست   عیب جوی چہ ار نمد پوشی

دنیا بعینہ چو حبابست پوچ و ہیچ   پوچست تادرست بود، چون شکست ہیچ [3]

---

1 پریشاں خاطری سے سیر دل اور آزاد ہو کر بیٹھ۔ کعبہ و دیر کی تفریق سے گزر جا اور آزاد رہ۔ اپنے اخلاص پراگندہ کو ہر جگہ سے سمیٹ کر یکجا کر اور اللہ تعالیٰ کو پیش کر دے کر کس اور غیر اللہ سے آزاد رہ۔

2 اگر تو نے اپنے پوشیدہ اعمال کو ظاہر کر دیا تو گویا تو نے اپنی محنت کو دروازہ پر لا کر رکھ دیا۔ بلبلے کی طرح اپنے آپ میں بند رہ اگر جیسے ہی تو نے خودی سے سر نکالا دریا میں مل جائے گا۔ فنا ہو جائے گا۔

3 میں نے آئینے سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہا اگر چہ تو صوفیوں کی طرح نمد پوش ہے مگر دوسروں کے عیوب کی تلاشی کیسی؟ دنیا بعینہ پانی کے بلبلے کی مانند ہیچ اور کمزور ہے۔ جب تک درست ہے تو کمزور ہے مگر جب ٹوٹا ناچیز ہو گیا۔

اسرار یہ کی تکمیل کے چار سال بعد آخوند نے شہر لاہور میں صفر 1072ھ (1662) میں دنیا سے سفر کیا اور اپنے پیر شاہ میر (لاہوری) کے روضے کے نزدیک دفن ہوئے۔ آخر الامر فانی کشمیری بادشاہ کے لشکر کے ہمراہ اکبرآباد چلے گئے۔ جب کچھ زمانہ گزر گیا۔ روایت ہے کہ بلخ کی فتح جو کہ 1058ھ (1647) میں ہوئی تو توران کے والی کا سامان اور دوسری متاع کو جب بادشاہ کی نظر سے گزار رہے تھے اس میں ایک رسالہ نکلا کہ اس کو فانی نے والیٔ توران کی مدح میں لکھ کر بھیجا تھا۔ یا ان کے کسی مخالف نے یہ کام کیا تھا۔ واللہ اعلم۔ اس سے بادشاہ کا غصہ بھڑک اٹھا اور ان کو قید کر دیا۔ چند دن کے بعد مہربانی اختیار کی اور ان کی تقصیر بخش دی اور ان کو وہاں سے نکال دیا پھر وہ میرے شیخ کی صحبت میں دہلی آئے اور دو تین روز مہمان رہے۔ میں نے وہیں اُن کو دیکھا ہے۔ نہایت شیریں کلام اور خوش بیان ہیں۔ ان کی نظم و نثر لطیف واقع ہوئی ہے، نظم تو خاص کر۔ شیخ بہاء الدین آملی کے رسالے ''نان وحلویٰ'' کے جواب میں انھوں نے ایک رسالہ ''من وسلویٰ'' بڑی میٹھی اور دلکش زبان میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار میں سے یہ چند شعر ہیں

بر دو خدش دوبارہ بین شمس و قمر چہ می کنی — بر دولبش دو بوسہ دِہ شہد و شکر چہ می کنی

شام شمیم موی او، صبح نسیم بوے او — زلف بہ بین بہ روے او شام و سحر چہ می کنی

بشست عرق ز پندم رخ نکوے ترا — زمن مرنج کہ می خواہم آبروے ترا

دراہل سرگرم بودن بے نیازان را تپ است — بدنما تر برلب از تپ خالِ حرف مطلبست

فانی ز آہ و اشک فزون گشت دردِ عشق — آب و ہواے دیدہ دل ہم نمابساخت[1]

---

1 اے شمس و قمر کیا کر رہے ہو بار بار میرے محبوب کے گال دیکھو تم سے زیادہ روشن و چمکدار ہیں۔ شہد و شکر تم کیا کر رہے ہو جاؤ اس کے دونوں لبوں کو دو دو بار چومو تم سے زیادہ میٹھے ہیں۔ اس کے گیسو خوشبودار شام ہیں اور اس کی بو صبح کی نسیم ہے اے شام اور اے سحر کیا کر رہی ہو اس کے چہرے پر بکھری زلف دیکھو۔ اے محبوب میری نصیحت سے (شرمندگی کے) پسینے نے تیرا خوبصورت چہرہ دھو دیا۔ مجھ سے کیوں رنجیدہ ہوتا ہے میں تو تیرے چہرے کی آب و تاب چاہتا ہوں۔ سرگرم آرزو رہنا دنیا سے بے نیازوں کے لیے بخار میں جلنے کے مانند ہے۔ اور لبوں پر کسی سے غرض مندانہ سوال کرنے کا داغ بخار سے بھی زیادہ بدنما ہے۔ اے فانی آہیں بھرنے اور اشک بہانے سے دردِ عشق بڑھ گیا اور دیدہ و دل کے ہوا دینے نے اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔

آخوند ملا شاہ کے یاروں سے ایک مدّ وجوگی کابلی ہیں۔ میرے شیخ کے گہرے دوست ہیں۔ فاضل علم اور خوش کلام۔ وہ مشرب شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین کے معتقد ہیں اور ان کے انداز میں کلام کہتے ہیں۔ میرے شیخ ان کو نیکوں میں سے کہتے ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ یہ رباعی ان کی ہے

آنکس کہ شبے بکوے تو ماوا کرد　　آخر زغم توخانہ را صحرا کرد
یکدل چہ کند ہزار دل می باید　　تا با سر زلفِ تو، توان سودا کرد [1]

وہ مجھ پر کمال مہربانی رکھتے ہیں اور خوب میرے حال کی خبر رکھتے ہیں۔ ارباب حکومت میں سے صاحب عزت اور حرمت والے ہیں۔

منزوی قاشقالی

ان کا نام دولت خاں ہے۔ وہ اہل سلطنت میں سے تھے۔ ناز ونعمت میں پلے بڑھے۔ 1040ھ (1630) میں، جبکہ میں قصبہ ''جاکؤ'' میں ایک سال اور چار مہینے رہا ہوں جیسا کہ خواجہ محمد محسن سمرقندی کے ذکر میں گزرا۔ سارے قاشقالی اسی قصبے میں رہتے تھے منزوی بھی اسی جماعت کے فرد ہیں۔ ایک دن وہ عنفوان شباب میں کہ نہایت حسین اور جمیل تھے تکبرانہ انداز میں نخوت کی چال چلتے ہوئے خراماں خراماں میرے سامنے سے گزرے اور مجھے خاطر میں نہ لائے بلکہ مجھے ایک قسم کی نظر حقارت سے دیکھا۔ اس وقت مجھے محتشم کے بیٹے کی وہ حکایت جس کو حضرت (مولانا) مولوی جامی قدس سرہٗ نے ''سبحۃ الابرار'' میں ذکر کیا ہے، یاد آئی۔ وہ منظوم حکایت یہ ہے

محتشم زادۂ زِ نخوت و جاہ　　می خرامید ظریفانہ براہ
بتبجر قدمے بر می داشت　　وز تکبر علَمے می افراشت [2]

1　جس کسی نے بھی ایک رات تیرے کوچے میں گزاری ہو آخر کار وہ تیرے غم میں گھر کو صحرا بناتا ہے۔ دیوانہ ہوجاتا ہے ایک دل سے کیا ہو ہزاروں دل درکار ہیں تب کہیں جا کر تیری زلفوں کے خیال کا سودا کر سکتا ہے۔

2　محتشم بادشاہ کا ایک لڑکا راستے میں غرور وتکبر میں اتراتا ہوا چل رہا تھا۔ فخر کے ساتھ قدم اٹھاتا تھا اور تکبر کا علم پھہراتا تھا۔

عارفے پشت دوتا در زندہ   ولے از نور الٰہی زندہ
گفت کاے تازہ جوان تند مرو   پند سنجیدہ پیران بشنو
این روش نیست چو خوش پیش خدای   باز کش زین روشِ نا خوش پای
طبعِ او از سخن پیر آشفت   بانگ بر داشت ز نادانی گفت
کاے ز گفتار تو بر من بارے   ی شناسی کہ کیم؟ گفت آرے
اوّلت بود یکے قطرۂ آب   کہ ازان شستن ثو بست ثواب
و آخرت جیفۂ افتاد بخاک   کردہ پنہان بیکے تیرہ مغاک
بر تو آن پردہ بفرض ار بدرند   چشم نابستہ کسان کم گذرند
ور میانہ کہ سراسر خوشی است   روز و شب کار تو سرگین کشی است
تنت آراستہ از گوہر و ذر   چون شکستہ شکم از سرگین پُر
گر بخودنیست شناسای رویت   لب کشادم بشناسا کردنت
از من این نکتہ فراموش مکن   مدحت مدح گران گوش مکن
ناز کم کن کہ تو خوار آمدۂ   از رہ بول دو بار آمدۂ (انتہیٰ)[1]

---

1 ایک عارف اگرچہ جن کی کمر جھکی ہوئی تھی اور فقیرانہ لباس میں تھے مگر نور الٰہی سے ان کا دل منور تھا انھوں نے یہ دیکھ کر اس سے کہا کہ اے نوجوان تند رُو مت بن ٹھہر اور سنجیدہ بوڑھوں کی بات سن۔ یہ چال اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اس ناپسندیدہ چال سے پیر روک لے۔ اس کی طبیعت بوڑھے کی نصیحت سے بگڑ گئی خفا ہو کر نادانی سے چیخا اے وہ شخص جس کی گفتار سے میں غصے کے بوجھ سے دبا جا رہا ہوں۔ مجھے جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ ان بزرگ نے کہا۔ ہاں جانتا ہوں۔ پہلے تو پانی کا ایک ناپاک قطرہ تھا کہ اگر کپڑے پر لگ جائے تو اس کا دھونا ثواب ہے اور آخر میں بدبودار مردہ بن کر ایک اندھیرے گڑھے میں دب جائے گا۔ اگر بالفرض تیرا تختہ قبر کھول دیں تو بغیر ناک بند کیے بہت کم ہی لوگ ادھر سے گزریں گے۔ اس وقت جبکہ سراسر خوش ہے تیرا کیا کام ہے دن رات پاخانہ ڈھوتا پھرتا ہے۔ بس باہر سے ہی تیرا جسم زر و جواہر سے آراستہ ہے اور اگر پیٹ پھٹ جائے تو پاخانے سے پُر ملے گا۔ جب تجھے خود اپنی پہچان نہیں کہ تو حقیقتاً کون ہے تو تجھے شناسا کرنے کے لیے میں نے لب کشائی کی ہے۔ دیکھ میری نصیحت مت بھولنا۔ تعریف کرنے والوں کی تعریف کو کان نہ لگانا۔ غرور مت کر کہ تیری خلقت خواری سے ہوئی ہے تو پیشاب کی راہ سے دو بار گزرا ہے۔ (انتہیٰ)

اس کے بعد میں نے خود سے کہا کہ تجھے اس قسم کے خیالات سے کیا غرض اور اس نوع کی باتوں سے کیا فائدہ کیا تو نے مولانا زین الدین محمود کمانگر کی ''جمیع'' میں نہیں دیکھا ہے کہ اس معاملے میں (انھوں نے) کیا فرمایا ہے۔

ترا بازرگان این چہ کارست   کہ جامہ را بشویند یا نشویند [1]

شیخ عطار قدس سرۂ نے تو اس سے بھی واضح تر کہا ہے

گر آن بہتر در آن ترا چہ   چہ حلقہ ماندۂ بردر تراچہ

توا ے مرد خدا راہِ خدا گیر   خدایت گر ازین پرسد مرا گیر [2]

پھر میں نے خواجہ بیرنگ کی کتاب ''کلیات'' جو میں ساتھ رکھتا ہوں اُٹھائی اور کھولی اور پڑھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں دولت خاں نے مجھے دور سے کتاب لیے دیکھا۔ جلد آیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا اور کتاب مجھ سے لے کر کھولی تو آپ قدس سرۂ کی رباعیات کی شرح میں یہ رباعی اور اس کی شرح سامنے آئی۔ رباعی

ہر صورت علمیہ کہ ہستش گوی   زان ہست کہ بوے اصل از وے بوی

معلوم کہ اصلست وجود علم است   جہل است اگر چہ این روش می پوی [3]

رباعی

ممکن کہ خرد در حدیثش بکشاد   در بدو نظر ہستیش فتویٰ داد [4]

---

1 تجھے دھوبیوں کے کام کی کیا فکر پڑی کہ وہ کپڑے دھوتے ہیں یا نہیں دھوتے۔

2 جبکہ تو گھر کے اندر حلقۂ یاران طریقہ میں بیٹھا ہے۔ تو دروازے کی تجھے فکر کیوں پڑی ہے کہ باہر فلاں یہ کر رہا ہے فلاں وہ کر رہا ہے۔ وہ غلط ہے یہ ٹھیک ہے۔ اے راہ خدا کے سالک مرد خدا تو اپنی راہ پکڑ۔ پھر اگر خدا تجھ سے دوسروں کے بارے میں قیامت کے دن سوال کرے تو مجھے پکڑ لینا (کہ اس نے مجھے روکا تھا)

3 علم کی وہ صورت جسے تو ہوشیاری اور عقلمندی کہتا ہے، بس اتنا ہے کہ اس سے تو حقیقت علم کی بو سونگھ لے۔'' معلوم'' جو کہ منتہائے علم ہے اصل ہے وہی موجد علم ہے حقیقت میں وجود اسی کا ہے۔ وہ علم جو کہ حق کا راستہ نہ دکھائے جہالت ہے، نام کا علم ہے۔

4 ممکن، جس کے لیے خرد نے حقیقت کی معرفت کی راہ میں خدشات پیدا کر دیے ہیں نظر نے اس کی ہستی کا فتویٰ دے دیا ہے کہ وہی ہستی ہے۔

او در ہستی و ہستی اندر دے بود　　بیچارہ باشتباہ گاہے بنہاد[1]

اس رباعی کے پہلے مصرعے میں ان اشکالات کا دفع ہے جو سابقہ مقدمات پر وارد ہوتے ہیں۔ اس کا بیان یہ ہے کہ گذشتہ گفتگو سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ ماہیات کا علاوہ علم کے، خارج میں کوئی وجود ہی نہیں ہے حالانکہ عقلیں ماہیات کے وجود اور ثبوت کا حکم لگاتی ہیں بیشک یہ حکم مطابق نفس الامر ہے کہ چیزوں کی ماہیت پر ذاتی طور پر وجود کا حکم لگانا اسی اعتبار سے ہے کہ وہ ذاتِ حق کے شیون کا آئینہ ہے کہ دیکھنے والے کی نظر دکھائی دینے والی چیز یعنی آئینے کے بجائے دِکھانے والے پر ہے۔ نہ بایں اعتبار کے شیون ذات حق کے آئینے کے سوا ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں۔ غایۃ الامر ناقص عقلیں اس سے واقف نہیں ہو پاتیں۔ اور باطنا بھی ماہیات کے وجود پر حکم لگاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دکھانے والا آئینے کی صورت میں جلوہ گر ہے (باوجودیکہ وہ صفات اشیا سے وراء الوراء ہے)

از صفائے مے و لطافت جام　　در ہم آمیخت مے و جام مدام[2]

ہمہ جامست نیست گوی مے　　یا(مے) مداست نیست گوی جام

اس مقام کی مشکلات کو دور کرنے میں شیخ ابوالحسن اشعری قدس سرہٗ نے بڑے زیبا اشارے فرمائے ہیں کہ وجود ماہیات عین ماہیات ہے۔ یعنی وجود ماہیات وہی ہے جو خارج میں ماہیات کی صورت میں نظر آتا ہے یعنی وہ جس کو عقل ہستی سے تعبیر کرتی ہے۔ اشیا کی تحقیق کے بعد کائنات اور اس کا حصول جو کہ اشیا کے خارجی اثرات سے ہے اور جو اشیا پر ہی مرتب ہوتا ہے وہ اشیا کی ذوات کے اثرات ہیں۔ (انتہیٰ کلامہ) کیونکہ وہ فاضل شخص ہے اس کے معنی میں غور وخوض کیا اور اپنی فہم کے مطابق کچھ سمجھا اور تعجب سے مجھ سے کہا۔ آپ کو بھی اس رباعی کے معنیٰ خاص کی تحقیق ہے؟ میں نے یہ شعر پڑھ دیا

1　مگر اس ہستی کی ہستی اس کے اندر ہے۔ لامحالہ بے چاری عقل چند قدم چل کر رہ گئی اور حقیقت تک راہ نہ پاسکی۔

2　جام اور جام میں بھری ہوئی شراب صفائی اور لطافت کی وجہ سے جام وشراب ایک دوسرے میں مل گئے ہیں گویا کہ سب شراب ہے بلکہ سب جام ہے۔ یا سب جام ہے بلکہ سب شراب ہے۔

رشتہ در گردنم افگند دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست [1]

آخر اس نے اپنے بعض شعر پڑھنے شروع کیے۔ان میں سے یہ شعر مجھے یاد ہے

گر گرد خطا منزوی خستہ بگردید عذرش بپذیرید کہ ایام شباب است [2]

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور اجازت چاہی۔میں نے یہ مشہور شعر پڑھ دیا۔

دیر آمدن و شتاب رفتن آئینِ گل است در گلستان [3]

اس نے کہا میں آپ کی جانب سے اس سے بہتر شعر پڑھتا ہوں

رسید مضطربم کرد، آنقدر ننشست کہ آشنائے دلِ خود کنم تسلی را [4]

اس کی پہلی ادائے نازگستری اور آخری طریقۂ دلبری سے میں حد درجہ خوش ہوا۔ہاں ہاں سوز و گداز دردمندوں کا نفع ہے۔اور راز و نیاز عاشقوں کا میوہ ہے۔خواجہ شیراز نے کہا ہے

عتاب یار پری چہرہ عاشقانہ بکش کہ یک کرشمہ تلافیِ صد جفا بکند [5]

اس کے چند سال بعد میں نے اس کو لاہور میں دیکھا داڑھی نکلی ہوئی ہے۔شاہانہ طمطراق میں شیخ علی ہجویری قدس سرہٗ کے روضے کے در پر کھڑا ہے۔مجھے پہچان لیا اور خیریت معلوم کی اور کہا۔کوئی ایسا شعر جو آپ کی زبان پر رہا ہو پڑھیں۔میں نے حضرت مولوی (مولانا روم) کا مشہور شعر پڑھا

لذّت عشق مرا رفت فرد در رگ و پے عشق می گویم و جان می دہم از لذّت وے [6]

کیونکہ کہنے اور سننے والے دونوں کی صلاحیت اس شعر کے معنوں سے مناسبت رکھتی تھی کیا خوب

---

1 دوست نے میرے گلے میں رسی ڈال رکھی ہے جہاں چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے۔

2 اگر منزوی خستہ جگر خطاؤں کے گرد چکر لگائے تو اے مخاطب اس کا عذر قبول کر لے کہ ابھی اس کے شباب کے دن ہیں۔

3 دیر سے آنا اور جلدی جانا گلستاں میں گلوں کا یہی دستور ہے۔

4 محبوب آیا مضطرب کیا اور اتنی دیر بھی نہ بیٹھا کہ میں اپنے دل بیتاب کو تسلی سے آشنا کر لیتا۔

5 پری چہرہ محبوب کے عتاب کو عاشقانہ انداز سے برداشت کر کہ ان کی کرشمہ بھری ایک نظر سیکڑوں جفاؤں کی تلافی کرتی ہے۔

6 لذت عشق میرے رگ و ریشے میں سما گئی ہے۔عشق کی باتیں کر رہا ہوں اور لذت عشق سے عشق میں ہی جان دے رہا ہوں۔

ملاقات اور صحبت رہی۔ ایک دن میں نے اپنے شیخ کی زبان سے سنا کہ فرمار ہے تھے دولت خان کیا خوب فہیم نوجوان ہے اس کے یہ اشعار مجھے پسند ہیں۔

از صد سخن پیرم یکحرف مرا یاد است عالم نشود ویران تا میکدہ آباد است [1]

دل را بکہ باید برد، جان را بکہ باید داد دل بردن و جان دادن ایں ہر دو خدادا داست [2]

یہ اشعار بھی منزوی قاشقالی کے ہی ہیں:

بیک نگاہ دل و دینِ ما بیغما بُرد دو بارہ دیدن او تا چہ خواہد از ما بُرد

ازین دو گر یکے ی برد دیگر گلہ داشت خداش خیر دہد ہر دو را بیک جا برد

مدام دیدن او کے شود نصیب بکس اگر چہ دید مش امروز فکر فردا بُرد

ندید روے تو جان داد منزوی از غم بزیرِ خاک بہ ہجر تو این تمنا بُرد

بنیادِ جہان منزویا ہمچو حبابست تا چشم بہم بر زدۂ خانہ خرابست [3]

جوانی ہی میں 1055ھ (1645) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ فاضل شعرا میں سے ایک میر عابد ہیں۔ وہ سید ہیں اور کارگزار صاحب وقار سلطانیان میں سے ہیں۔ کم گو مگر خوش گو شعرا میں سے ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں اسرار حقائق میں سے کہتے ہیں۔ اچھا کلام کہتے ہیں اور اچھے صحبت داروں میں سے ہیں۔ ایک دن وہ میرے شیخ کی خانقاہ میں تھے اور میں بھی وہاں تھا (وہیں ان سے ملاقات ہوئی)۔ شیخ ان کو اچھے اور نیک انسانوں میں سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں شعر ان ہی کے ہیں

---

1 مجھے اپنے پیر کی سیکڑوں باتوں میں ایک یاد ہے کہ عالم تب تک ویرانہ نہ ہوگا جب تک معرفت الٰہی کے مے خانے آباد رہیں گے۔

2 سوچتا ہوں دل کسے دوں جاں کس پر فدا کروں۔ دل دینا جاں نثار کرنا سب اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے، ''اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔'' (جگر مراد آبادی)

3 ایک نگاہ میں میرا دل اور دین دونوں لوٹ کر لے گیا دوبارہ نظر ڈالنے میں آخر میرا اور کیا لے جائے گا۔ ان دونوں میں سے اگر ایک ہی لے جاتا تو دوسرا گلہ کرتا اللہ اس کا بھلا کرے دونوں کو ایک ساتھ لے گیا۔ اسے ہمیشہ دیکھنا کس کا نصیب ہے اگر چہ آج میں نے اس کو دیکھا ہے مگر کل کی فکر کھائے جاتی ہے کہ آیا نصیب ہو یا نہ ہو۔ منزوی نے جان دے دی مگر تیرا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ تیرے ہجر میں یہی تمنا لیے قبر میں چلا گیا۔ اے منزوی دنیا کی بنیاد پانی کے بلبلے کی طرح ہے پلک جھپکی کہ گھر برباد ہوا۔

خوداز درون و برون جلوہ کرد من زمیان   چو سایہ محو شدم کز دو سوی چراغ آمد [1]
بیادہ دِہ دل و دین قدر بے خودی دریاب   چہ حالتے کہ نماز اندرو گناہ شود [2]

ایک دن میں اس آخری شعر کو بڑے ذوق وشوق میں پڑھ پڑھ کر محظوظ ہو رہا تھا ایک زاہد خشک نے سنا تو مجھ پر بگڑ گیا اور تعجب بلکہ (صوفیہ سے) تعصب کی راہ سے بولا اس ملحدانہ شعر کو کیوں پڑھ رہا ہے اور نماز کے لیے تحقیر کا جملہ کیوں بول رہا ہے؟ میں نے توحید کے دائرے کو وسیع جان کر اور اس کے مرتبے کو اس کی جگہ رکھتے ہوئے مصرع اخیر کو اس طرح کے لہجے میں پڑھا کہ اس سے حالت استغراق کی تحقیر محسوس ہوتی تھی نہ کہ نماز کی یعنی جس میں نماز گناہ ہو بھلا وہ بھی کوئی حال ہے۔ منقول ہے کہ ابن جوزی جو اپنے وقت کے فضلا اور بلغا میں سے گزرے ہیں ایک روز بیان فرما رہے تھے۔ سنیوں اور رافضیوں کا ایک گروہ حاضر تھا۔ اس جماعت میں سے ایک آدمی نے معلوم کیا اے ابن جوزی ابوبکر اور علی میں سے کون افضل ہے۔ انھوں نے جواب دیا ''من کانت بنتــہ فی بیتــہ [3]'' اور یہ کہہ کر دونوں فریق سے دامن بچالیا۔ شعرا میں سے ایک سید جان ہیں وہ مشکل گو شعرا میں سے مانے جاتے ہیں۔ جب کبھی کوئی شعر یا غزل دل پسند نکل جاتی ہے کود پڑتے ہیں اور رقص کرنے لگتے ہیں اور چکر کاٹنے لگتے ہیں۔ وہ تمام اہل فضل کے پسندیدہ ہیں۔ میں نے ان سے ملاقات کی ہے۔ خاندان عالیشان کے فرد ہیں ان کا وطن (ماوری) پورب میں ہے۔ 1057ھ میں انتقال ہوا۔ یہ چند شعر ان کے پیش ہیں

چون زلف یار گرفت و شکست و (بست) وکشاد   دل فگار گرفت و شکست و بست و کشاد [4]

یہ بیت میرک جان کے ذکر میں گزری۔ اللہ اللہ کیا خوب بیت کہی ہے

---

1 جب میں نے اندر باہر دونوں جانب سے جلوہ نمائی کی تو میں سائے کی مانند محو ہو گیا، کیونکہ دونوں جانب سے چراغ کی روشنی میں میری سایہ ختم ہو گیا ہے۔

2 دین و دل کو شراب معرفت سے مست بنا دے، مرتبہ و مقام بے خودی سمجھ کہ کچھ تو بے خود ہو جائیں۔ حالت استغراق کیا خوب حالت ہے کہ اس میں نماز گزارنی بھی گناہ ہوتی ہے۔

3 جس کی بیٹی اس کے گھر میں ہے۔

4 جیسے ہی زلف یار پریشان ہوئی مڑی تڑی الجھی سلجھی ویسے ہی دل فگار پریشان ہوا مڑا تڑا الجھا سلجھا۔

زمن پرسید زلف او کہ از دست کہ می پیچی | بسان ماہی دلخستہ (کہ) از شست کہ می پیچی[1]
ز بے تابی دل گفتم بہ زلف تابدار او | من از دست تو می پیچم تو از دست کہ می پیچی

خواہی کہ شوی محرم ر از جانان | بگذار ہوا و بگذر از کون و مکان
دین و دنیا دو مصرعہ برجستہ است | یعنی جستہ است از دل سید جان[2]

شعرا میں سے ایک حکیم حاذق[3] گزرے ہیں۔ وہ شاہی خاندان کے فرد تھے۔ صاحب عزت وجاہت، عیش وعشرت کوش ان کے اشعار کا پورا ایک دیوان ہے۔ ان کے بعض شعر اچھے ہیں ان میں سے چند شعر یہ ہیں:

درسخن پنہاں شدم مانند بو در برگ گل | میل دیدن ہر کہ دارددرسخن بنید مرا[4]
ہرخم و پیچے کہ شد از تار زلف یار شد | دام شد زنجیر شد تسبیح شد زنار شد[5]
دلم ہیچ تسلی نمی شود حاذق | بہار دیدم و گل دیدم و خزان دیدم

وہ میرے شیخ کے شناسا تھے۔ ایک دن میرے شیخ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ شیخ دوست نے جو میرے شیخ کے دوست ہیں اور شیخ رستم کے داماد ہیں نہایت فہیم اور سنجیدہ آدمی ہیں، ان سے خفقان کی بیماری کا علاج چاہا۔ انھوں نے ایک پتھر کا ٹکڑا جوان کے گلے میں لٹکا تھا، لیا اور پانی میں

---

1 اس کی زلف نے مجھ سے معلوم کیا کہ تجھے کون بل دیتا ہے تُو ماہی دل خستہ کی مانند کس کی ڈور میں لپٹ گیا ہے۔ میں نے دل کی بیتابی کے ساتھ اس کی زلف تابدار کو جواب دیا۔ میں تیرے ہاتھ سے بل کھا رہا ہوں تو بھی تو بتا تجھے کس نے پریشان کر رکھا ہے۔

2 اگر تو محبوب کے راز سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے تو بس خودی کو چھوڑ اور کون ومکان سے گزر جا۔

3 حکیم حاذق ابن حکیم ہمام ابن مولانا شاہ عبدالرزاق گیلانی، شاہجہاں بادشاہ کے ملازمین میں سے تھے۔ کمال کی قابلیت رکھتے تھے اور اچھے شعر کہتے تھے۔ 1067ھ (1657) میں انتقال کیا۔ (بحوالہ "ریاض الشعراء" و "تذکرہ گل رعنا")

4 میں برگ گل میں خوشبو کی مانند اشعار میں چھپ گیا ہوں۔ جسے مجھے دیکھنے کی چاہت ہے وہ مجھے میرے کلام میں دیکھے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ میں مجھے جو کچھ بھی پیش آیا ہے۔ دام ہو، زنجیر ہو، تسبیح ہو یا زنار ہو محبوب کی زلفوں کے تاروں کی بدولت ہے۔

5 اے حاذق میرا دل کسی چیز سے تسلی نہیں پاتا۔ چاہے موسم بہار ہو، موسم گل ہو یا موسم خزاں ہو کوئی ہو۔

دھویا اور کہا کہ یہ پانی اس مریض کو پلا، ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے شیخ نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کس قسم کا پتھر ہے اور آپ کے پاس کہاں سے پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں کسی خاص طریقہ علاج کا تابع نہیں ہوں۔ جو کچھ میرے دل پر القا کرتے ہیں میں وہ کرتا ہوں اس پتھر نے بہت سے مریضوں کو فائدہ دیا ہے۔ اپنے تصرفات میں سے اسی قسم کی اور بھی چیزیں ذکر کیں۔ اس کے بعد اپنا دیوان منگا کر پڑھنا شروع کیا اور بہت سا پڑھا اور کہنے لگے۔ خواجم! اس دیوان میں سے دو ہزار شعر مقبول بارگاہ خدائے تعالیٰ ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ سعدی کے بارے میں بتلاتے ہیں کہ شیخ سعدی کا ایک یہی شعر

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار　　ہر ورق دفتریست معرفت کردگار [1]

مقبول خدا ہوا۔ حکیم (حاذق) نے میری جانب رخ کیا اور گویا ہوئے ''وہ بھی خدا ہی جانے'' میرے شیخ اور حاضرین ان کی اس ادا سے تعجب کرتے ہوئے مسکراتے اُٹھے۔ میں نے راستے میں اپنے شیخ سے عرض کیا کہ اس شعر کی قبولیت کے بارے میں مولوی جامی قدس سرہٗ نے بھی ''نفحات الانس'' میں لکھا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ حکیم کو اس میں شک ہے اور اپنے دو ہزار اشعار کی مقبولیت کا صریح طور پر دعویٰ کر رہے تھے۔ ایک رفیق نے کہا کہ حکیم ان میں سے ہیں جن کے بارے میں شیدا نے یہ رباعی کہی ہے

دایم (بہ) ہوس سنگ و سبو نتوان شد　　در دیدۂ انصاف چو نتوان شد

صحبتِ حکیم حاذق از حکمت نیست　　بالشکر خبط روبرو نتوان شد [2]

''نفحات الانس'' کی وہ حکایت یہ ہے کہ مشائخ میں سے کوئی صاحب شیخ سعدی کی بزرگی کے منکر تھے۔ ایک رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے۔ ملائکہ نور کے طبق لے کر حاضر ہوئے۔ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ سعدی شیرازی کے لیے (اجر) ہے کہ ان کا ایک شعر

1　عارف کی نظر میں سبز درخت کی ہر پتی معرفت کردگار کا ایک دفتر ہے۔

2　ہمیشہ سنگ و سبو کی ہم مجلسی کا خیال نہیں رکھا جا سکتا۔ انصاف کی آنکھ میں دھول نہیں جھونکی جا سکتی۔ حکیم حاذق کی صحبت حکمت کی بات نہیں ہے۔ پاگل لشکر کے روبرو نہیں جایا جا سکتا۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

حضرت حق سبحانہٗ کی درگاہ میں مقبول ہوگیا ہے۔ وہ بزرگ جب خواب سے بیدار ہوئے رات میں ہی حضرت شیخ سعدی کے مکان کے دروازے پر پہنچے تاکہ انھیں اس کی بشارت سنائیں دیکھا کہ چراغ جلائے کچھ گنگنا رہے ہیں جب دھیان سے کان لگا کر سنا تو یہی شعر پڑھ رہے تھے۔ شیخ سعدی کا جمعہ کی رات میں ماہ شوال 601ھ (1205) میں وصال ہوا ہے۔ (انتہیٰ کلامہ)

آنکہ سعدی آن بلبل شیراز چمن　　در گلستان سخن دستان زن

شد شبے بر شجر بہ حمدِ خدای　　از نوائے سحری سحر نمای

بست بیتے ز دو مصرعہ بہم　　ہر یکے مطلع انوار قِدم

جان ازان مژدۂ جانان می یافت　　بر خرد پرتوِ عرفان می تافت

عارف زندہ دلے بیدارے　　کہ نہان داشت برو انکارے

دید در خواب کہ درہاے فلک　　باز کردند گروہے ز ملک

رونمودند زہر سو زدہ صف　　ہر یک از نور نثارے برکف

پشت بر گنبد خضریٰ کردند　　رو درین معبد غبرا کردند

بادل مست خوش و خوف و رجا　　گفت کاے گرم روان تا بکجا

مژدہ دادند کہ سعدی بسحر　　سُفت در حمد یکے تازہ گہر[1]

1　چمنستان شیراز کی بلبل شیخ سعدی جنھوں نے گلستان سخن کی گل چینی کی ہے۔ وہ ایک رات کو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں محو ایک سبز درخت کے نیچے سے گزرے۔ نوائے سحری میں خوش کلامی اور سحر بیانی کرتے ہوئے دو مصرعوں کو جوڑ کر ایک بیت کہی ان میں کا ہر ایک مصرعہ اللہ تعالیٰ کے نور قدیم کا مطلع تھا۔ روح اس شعر سے محبوب کا مژدہ پاتی ہے۔ عقل پر عرفان کا پرتو پڑتا ہے۔ ایک زندہ دل بیدار ہوش عارف نے جو کہ جوان کی بزرگی کے باطنی طور پر منکر تھے۔ خواب دیکھا کہ فرشتوں نے آسمان کے در کھولے اور ان میں سے صف باندھے ہوئے ہاتھوں پر نورانی خوان لیے ہوئے فرشتے نکل رہے ہیں آسمان کی جانب ان کی پشت ہے اور رخ زمین کی جانب ہے۔ ان بزرگ نے مستی وشوق اور عالم خوف ورجا میں آکر معلوم کیا کہ اے تیز رواں کہاں کا ارادہ ہے۔ خوش خبری سنائی کہ سعدی نے بوقت سحر حمد الٰہی میں ایک نیا موتی پرودیا ہے۔

چشم زخمی نرسد گرد قضا ی سزد مرسلۂ گوش رضا
نقد پا کان نہ بمقدار ویست بہر آن نگہ نہ اسرار ویست
خواب بین عقدۂ انکار کشاد رو بدان قبلہ احرار نہاد
بر در صومعہ شیخ رسید از درون زمزمۂ شیخ شنید
کہ رخ از خون جگر تر ی کرد باخود آن بیت مکرر ی کرد [1]

اس وقت کے دانشمند اور خوش مزاج لوگوں میں سے ایک مُلّا ظاہری پانی پتی بھی ہیں۔ فہیم وخوش کلام مقبول ومطبوع اغنیا فارسی اور ہندی میں شعر کہتے ہیں۔ ان کا ہندی کا کلام فارسی کلام سے اچھا ہے۔ ہندی کلام میں وہ ''اشلیکہ'' زیادہ کہتے ہیں۔ اشلیکہ اسے کہتے ہیں کہ ایک لفظ دو معنی میں آتا ہے اور دہ لفظ شعر کا قافیہ ہوتا ہے جیسے کہ ''نزہت الارواح'' کے یہ دو شعر ہیں

کمال عاشقی پروانہ دارد کہ غیر از سوختن پروا نہ دارد [2]
گر دیو مسخر تو گردد زین ہر دو چہ حاصل تو گردد [3]

ملا ظاہری کا یہ ہندی شعر ہے

ٹا ندا لاد چلا بنجارا اگ لگائی سی بن جارا
باکمیں سریں پھول نہ ہیرا جو جا باسو مہکا جیرا

اس وقت مجھے یہ طرز کلام بہت اچھا لگا تھا میں نے مکمل ایک رسالہ ہندی ''اشلیکہ'' طرز پر لکھا تھا جس کا نام ''پیم اشلیکہ'' ہے جو کہ سلوک کے مراتب عشرہ، جذبہ اور توحید پر مشتمل تھا جب میں نے اپنے شیخ کو سنایا تو بہت پسند کیا۔

1 اللہ تعالیٰ کے اسرار تک چشم کج بیں نہیں پہنچتی ہے تو راضی بہ رضا رہنا ہی اس کے لیے سزاوار ہے۔ پاکوں کی دولت چشم زخمی کے لائق نہیں کیونکہ یہ چیز اس کے اسرار میں سے ہے۔ خواب دیکھنے والے بزرگ نے انکار کی گرہ کھول دی یعنی اس کی بزرگی تسلیم کرلی اور اسی وقت قبلہ احرار کے گھر کی راہ لی شیخ سعدی کی عبادت گاہ کے دروازہ پر پہنچے۔ اندر سے شیخ کے گانے کی آواز سنی چہرے پر آنسوں بہار ہے تھے اور بار بار یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

2 عاشقی میں کمال تو پروانہ رکھتا ہے کہ علاوہ جلنے کے اسے کوئی پروانہیں رہتی۔

3 اگر دیو پری تیرے مطیع اور تابعدار بھی ہوجائیں۔ ان دونوں سے تجھے کیا حاصل ہوجائے گا۔

چوپائی

ہم سنگ چو بدہ کے پوجے   تو بے سادہ دل کے پوجے
یا مارگ چو دہری یک   دکھ سکھ ہم رنگ جیسے یک
فی انفسکم ہوئی جو ہونیا   نوبت بج رہی وہ بہی تا
کہام ہوت جیون رہت نسیت   وَاذْکُر رَبَّکَ اذا نسیت
سو تو کھانڈ جل میں جب پہنچے   کچھ نہ رہے وہ ہی ہوجے
وحدت شاہ چو آوے سونہیں   کثرت ہیر بھجے دا سونہیں
جہان وحدت تہاں کثرت   جہاں سوار دیو تہان کس رت

دوہرہ

آپ تجے سوخبر میں جو نہ تجے سوکور   دایم ذکر تو سی رہے جو ذاکر ہوے مذکور
گیان دھیان کی جگت لب سی جوموکہون سوجان   بند سمند ملاپ کر یو تو بدوسجان
سن دہیان ددہ انبت بادہت ہم ترنگ   کا کی کان الآن کو مانک و نب رنگ
خواجہ بہاء الدین کیلوہن دھیان جب پاے   با یزید بجو جان میر پہلو پاے
سب سینن کو بجوانہ لگت ہوئی محال   الٰہی بد و مقام ہی اس ایم خال

مشہور ترین ہندی اشعار میں ملا ظاہر کا یہ سورٹھہ بھی ہے

مسی روٹی شینٹ جو گھر بیٹھے پائے   کاہوں کچے بہنٹ رہے اپنی شنیٹ سوں[1]

کہتے ہیں کہ جہانگیر بادشاہ ایک دن شکار میں تھا۔ کریل کے درخت کو دیکھا پوچھا کہ اس کو کیا کہتے ہیں۔ کہا ''شنیٹ'' اس پر حاضرین میں سے کسی نے ملا ظاہر کا نام لے کر یہ سورٹھا پڑھا۔ بادشاہ نے ان کو اپنے پاس بلا کر ان کا کلام سُنا اور خوب انعام سے نوازا۔ ایک دن وہ میرے شیخ کے پاس آئے اور اپنے ہندی اشعار پڑھے ''خیال'' کو بھی سنایا جو انھوں نے پردہ عشاق میں لکھا تھا اور شیخ کو محظوظ کیا۔ وہ خیال یہ ہے

---

1 گنجینی کی روٹی اور شنیٹ جو گھر بیٹھے ملتی ہے تو کسی کے دروازہ پر جا کر ملاقات کرنے کی کیا ضرورت، آرام سے اپنی کٹیہ میں رہے۔

ہائے ہائے مائے کانہا ماریں جائے ۔۔۔۔ میر مکّی جھنکی لے بہکی ہون ساتی جلوسنکا ے

پھر میں نے بطور خوش طبعی ان سے کہا کہ ہمارے علاقے میں شنیٹ بالکل نہیں ہوتی اس لیے میں آپ کے اسی سورٹھے کو اس طرح پڑھتا ہوں

مسی روٹی پیاز جو گھر بیٹھے پائے ۔۔۔۔ کاہوں کیجئے نیاز رہئے اپنے ناز سوں [1]

اس سے وہ کھل اُٹھے اور شام تک لطیفہ گوئی میں خوب مجلس رہی۔ آج میں نے ایک سویہ ''اشلیکہ'' سنا۔ کیا ہی خوب کہا ہے وہ ایک ہندی لشکری ''رام کشن'' نام کا ہے جو یہ ہے

لا کے کام تیر منہ ری مہا برنی رتہ ری پیاری ناہیں

لا کے کام تیر منہ ری مہا برنی رتہ ری پیاری ناہیں
تیر منہ ری کہین کی پی برہنہ باتیں جی کی کہے رہتہ ری
سحرت ہی منہ رہے وے ٹوکت ہی رہے
رہتا چھڑی چھت ہی رہتہ ری
آنکھین آنسو پی رہت ری پیاری نیاری نے رہتہ

شعرائے وقت میں سے ایک فارسی گو چندر بھان منشی ہے۔ برہمن تخلص کرتا ہے۔ اس کا یہ شعر مشہور ہوگیا ہے۔

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندین بار ۔۔۔۔ بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم [2]

کہتے ہیں کہ اس کے اس شعر پر ایک خوش مزاج دوست نے اس سے کہا کہ ''ہاں''

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود ۔۔۔۔ چون بیاید ہنوز خر باشد [3]

جب میں نے سنا تو میں نے کہا اس کی بھی ایک توجیہ ہے کہ اس میں احساس ندامت ہے اپنے گناہ گار ہونے کا) اس کے اس سے بہتر بھی بہت سے اشعار لوگ پڑھا کرتے ہیں مگر مجھے دو ہی شعر یاد ہیں۔ دوسرا مشہور شعر یہ ہے

---

1 مسی کی روٹی، پیاز جب گھر بیٹھے میسر ہے تو کیوں کسی کے ناز نخرے دیکھیں، خودداری سے کیوں نہ رہیں۔

2 میرا دل ایسا کفر آشنا ہے کہ میں اسے کئی بار کعبہ لے گیا ہوں جب لوٹا تو برہمن کا برہمن ہی رہا۔

3 عیسیٰ علیہ السلام کا گدھا اگر مکہ بھی چلا جائے مگر جب بھی لوٹے گا گدھا ہی رہے گا۔

بہ بین کرامت بتخانہ مرا اے شیخ　　　کہ چون خراب شود خانۂ خدا گردد [1]

بادشاہ صاحب قر ان ثانی نے جب یہ شعر سنا تو فرمایا یہ شعر اس طرح بہتر ہے

بہ بیں سعادت بت خانۂ مرا اے شیخ　　　کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گر دد [2]

ایک دن ایک شخص نے کہا کہ عبدالرحیم خیرآبادی جو کہ شاہی لوگوں میں سے تھے انھوں نے ایک شعر جو کہ شیدا، شاعر کے ایک شعر پر کہا ہے کہ اگر ایسا ہوتو اچھا ہو۔ شیدا کا شعر یہ ہے

ز ابر نیسان بر صدف لطف است بر قطرہ ستم　　　قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود [3]

اور عبدالرحیم کا شعر یہ ہے

تاک را سرسبز دار اے ابر نیسان در بہار　　　قطرہا ے چو مے تواند شد چرا گوہر شود [4]

عبدالرحیم خیرآبادی سے شیدا کا یہ شعر بلند پایہ ہے اور اتنا مشہور ہے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ ذکر کیا جاتا۔ میں نے شیدا کو دیکھا نہیں۔ اسی زمانہ میں ایک سرمد نام کے مجذوب تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کا کوئی مذہب نہ تھا (موحد تھے)۔ کپڑے بھی جسم پر نہ رکھتے تھے۔ ایک ہندو کے ساتھ جو کسی زمانے میں ان کا معشوق مجازی رہا تھا زندگی گزارتے تھے۔ عربی زبان سے آشنا تھے۔ کہتے ہیں کہ توریت کے بھی عالم تھے۔ میں نے ان کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ لیکن اشعار سنے ہیں۔ یہ تین رباعیاں اور ایک شعر ان کا پیش ہے

سرمدا طلبِ راز، در، در، کردم　　　در شام دریچۂ سحر در کردم [5]

دیدم ہمہ خواب تا نظر وا کردم　　　ہر چند کہ خواب را ز سر وداع کردم

1　اے شیخ ہمارے بت خانے کی کرامت دیکھ کہ جب خراب ہوا تو خانہ خدا بن گیا۔

2　اے شیخ ہمارے بت خانے کی سعادت دیکھ کہ جب برباد ہوا تو خدا کا گھر ہوگیا۔

3　ابر نیساں کا صدف (گھونگھے) پر تو لطف و مہربانی ہے مگر قطرے پر ستم ہے۔ قطرہ جب تک اس کی قدرت میں ہے اپنی اصل دریا سے ملنا چاہتا ہے گوہر کیوں بنے۔

4　موسم بہار میں انگور کو اے ابر نیساں سرسبز رکھ۔ جب قطرے مے بن سکتے ہوں گوہر کیوں بنیں۔

5　اے سرمد میں نے راز عشق کو در در جا کر طلب کیا اور صبح سے شام کردی۔ جب میری خواب سے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاں تک نظر جاتی ہے سب کچھ خواب ہے۔

رباعی

سرمد جسمے است جانش در دست کسے تیریست ولے کمانش در دست کسے
(می خواست کہ آزاد شود از دام جہد گادے شدہ ریسمانش در دست کسے)[1]

رباعی

(سرمد کہ ز راز عشق مستش کردند خواندند سر افرازش و پستش کردند)
می خواست خدا پرستی و ہوشیاری مستش کردند و بت پرستش کردند[2]
در تیرگی نشیند در روشنی نشاند می خواہدت بہ بیند می خواہدش نہ بینی[3]

اور ایک شاہ بیگ اکبرآبادی ہیں جو شیخ مجدالدین سنبھلی کے پوتے ہیں۔ غالباً شاہ بیگ نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اکبرآباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شاہ بیگ حد درجہ نیک تھے مجھ سے اتنا پیار کرتے تھے کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ میرے شیخ کے نادیدہ معتقد تھے۔ 1069ھ (1659) میں انتقال کیا۔ ان کی قبر اکبرآباد (آگرہ) میں ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ یہ تین شعر گھوڑے کی تعریف میں کہے ہیں

چو وہم از ہمسری باوے دویدے ز بیم پا شکستن آر میدے
بصحرا در چو ماہی بر سر آب بآب اندر چو آتش در مئے ناب
سوارے گر بہ پشتش بر رسیدے سپند آسا نہ آنکس بر جہیدے[4]

---

1 سرمد تو جسم ہے اس کی جان کسی اور کے ہاتھ میں ہے وہ ایک تیر ہے لیکن اس کی کمان کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی تمنا تھی کہ آزاد ہو جائے دام سے نکل بھاگے۔ مگر وہ تو ایک بیل کے مانند ہے کہ اس کی رسی دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔

2 سرمد اسے راز عشق نے مست کر دیا ہے اسے بلایا سرفراز کیا اور اس کے دل کی تنگی کو دلبستگی سے بدل دیا ہے۔ وہ خدا پرستی اور ہوشیاری کا طالب تھا۔ یعنی سالک راہ خدا بننا چاہتا تھا مگر اسے تقدیر نے مست بنا دیا اور کافر (طریقت) بنا دیا۔

3 سرمد اندھیرے میں بیٹھتا تھا تیرے کرم کے قربان روشنی میں لا بٹھایا۔ پہلے وہ تجھے دیکھنا چاہتا تھا مگر تو اس کو محروم دید رکھتا تھا۔

4 خیال اگر برابری کے مقابلے میں اس کے ساتھ دوڑتا تو پاشکستہ ہونے کے ڈر سے راستہ میں ستانے لگتا۔ صحرا میں ایسے چلتا جیسے مچھلی پانی میں چلتی ہے اور پانی میں ایسے گزرتا جیسے بجلی چمک گئی ہو۔ اگر کبھی کوئی دوسرا اس پر سوار ہوا ہے تو رائی کے دانے کی مانند کیا ایک آن میں وہ نہ گر گیا ہے

ضیاء دہلوی

ان کا نام ضیاء الدین حسن ہے۔ فاضل وقت اور خوش گو شاعر ہیں۔ فطرتاً مستغنی المزاج ہیں۔
کبھی حقیر دنیا کے لالچ کے لیے جیسا کہ شاعروں کی روش ہے دولتمندوں کے دروازے پر نہیں
گئے۔ اس کارِ درویشی میں اپنے والد حافظ خیالی کی طرح کہ جن کا ذکر گزر چکا کسی دوسرے
سے درخواست گزار نہیں ہوتے۔ شروع حال میں میرے شیخ نے لالچی فقرا کی مذمت میں یہ
قطع کہا ہے

نہ ہمہ شاعرے و خوش گو بے حیالے و طامعے باشد
خاک بر فرق طامعان بادا گر چہ قطران لامعی باشد [1]

ضیاء نے ''حدیقۃ الحققت'' حکیم سنائی کی کتاب کا بڑی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ جواب لکھا
ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے بہت سے اشعار ہیں نہایت درجہ شیریں اور لطیف زبان میں۔ ان
میں سے بعض یہ ہیں

آباد بفقر دار کاشانۂ خویش ازا شک بکن ہم آب دہم دانۂ خویش
برخاک مریز آبرو کہ تراست چون مردم دیدہ باش در خانۂ خویش [2]

من نسیم صبح ام پژمردگیہا گل کنم آفتاب روز ام برتاک اُفتم مُل کنم
برگ گل در آستین پوشیدنم از قحط نیست دیدہ گر رخصت دہد دامان صحرا گل کنم [3]

---

1 نہ ہر شاعر اور صاحب کلام بے حیا ہوتا ہے اور نا ہی لالچی ہوتا ہے۔ لالچی شاعر کے سر پر خاک ہو اگر چہ کوئی مشہور شاعر قطران لامعی ہی ہو۔

2 فقر سے اپنا گھر آباد رکھ، آنسوؤں کو آب و دانہ بنالے۔ کسی کے در پر برائے سوال جا کر اپنی آبرو خاک میں نہ ملا۔ تیرے لیے تو آنکھ کی پتلی کی مانند اپنا گھر ہی بس کافی ہے۔

3 میں نسیم صبح ہوں پژمردگی کو گلزار بنا دیتا ہوں۔ روزِ روشن کا آفتاب ہوں انگور پر گر کر اسے شراب بنا دیتا ہوں۔ میرا آستین میں برگ گل کو چھپانا گلوں کی نایابی کی وجہ سے نہیں۔ میری آنکھیں رونے سے فرصت ہی نہیں دیتیں ورنہ مسکراہٹوں کے گلوں سے دامن صحرا کو بھر سکتا ہوں۔

هر کہ با جانان نشد سرگرم در آرام نیست | خالی از آسیب نبود شیشہ تا پُر جام نیست
گاہ لب می بوسم از مستی دگاہے چشم یار | پیشِ مستان ہیچ فرق از پستہ تا بادام نیست [1]
نشستہ در طلبِ دلر بائے خویشتنم | چو چشم می پرم اما بجائے خویشتنم
مارا روشِ زاہد سالوس ہوس نیست | بدنامی ماکم ز نکونامی کس نیست [2]

برسوں سے میں اُن سے آشنا ہوں۔ وہ میرے شیخ کے عزیزوں میں سے ہیں اور میرے شیخ کے تلامذہ میں بھی۔ کبھی کبھی میرے شیخ کے پاس آتے رہتے ہیں اور رات گزارنے کا اتفاق بھی ہوتا ہے خوب گرم صحبت رہتی ہے۔ کبھی میرے شیخ بھی ان کے والد کے پاس جایا کرتے ہیں اور گرم سے گرم تر صحبت رہا کرتی ہے۔

دانا دہلوی

ان کی کنیت ابوالحسن ہے اور والد کا نام مولانا حسن ہے کہ جن کا ذکر گزر چکا۔ بچپن سے ہی انھیں فہم و فراست عقل و دانائی دی گئی تھی۔ زمانے کے دانا لوگ ان کی بچپن میں ہی حالت دانشمندی سے حیرت میں پڑ جاتے تھے اس لیے انھوں نے اپنا تخلص بھی دانا رکھا تھا۔ وہ میرے شیخ کے خسر کے بیٹے ہیں اور میرے شیخ کے منظور نظر بھی۔ میرے شیخ اپنے سب دوستوں سے بڑھ کر انھیں چاہتے تھے۔ بڑے خوش فہم اور خوش گو انسان تھے۔ ان کی نظم، نثر دونوں ہی بڑی فصیح اور لطیف ہیں۔ یہ چند شعر ان ہی کے ہیں

---

1 جسے عشق جانان کی سرگرمی نصیب نہیں وہ آرام میں نہیں ہے کیونکہ جس پیالے میں مشروب نہ ہو اس کے ٹوٹنے کا ہر وقت خطرہ ہے، وہ آسیب سے خالی نہیں۔ میں کبھی مستی میں اپنے محبوب کے لبوں کو بوسہ دیتا ہوں، کبھی اس کی آنکھوں کو، کیونکہ مستوں کے نزدیک پستہ و بادام میں کوئی فرق نہیں۔

2 میں اپنے محبوب کے انتظار میں بیٹھا ہوں مگر میری نظر چاروں طرف اُڑتی پھر رہی ہے۔ اگرچہ میں اپنی جگہ بیٹھا ہوں۔ ہمیں راہ و روش زاہد فریب کار ریاکار کے طریقے کی خواہش نہیں، ہماری بدنامی کسی کی نیک نامی سے کم نہیں۔

عشق چون شورش دہد دیدۂ خونبار را　　صحنِ گلستان کنم، کوچہ و بازار را
نشۂ وحدت رسید مستِ اناالحق شدیم　　ہان گل دیگر شگفت مردہ سردار را [1]
بر قامت چوں سر و سریشے نہ زدی　　تا دلِ ریش ریش ریشے نہ زدی
اے پیر فلک جوان بمیری کہ مرا　　نوشے نچشاندی تو کہ نیشے نزدی [2]
وے محتسب شہر بمن جنگ برآورد　　من شیشہ برآوردم و او سنگ برآورد [3]

انھوں نے اپنے والد کے ملفوظات کو جمع کر کے ایک کتاب ترتیب دی ہے اور اس کا نام ''اتفاقاتِ حسنہ'' رکھا ہے۔ وہ اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ پاک دِلوں، دقیقہ رسوں، صورنفسوں، خورشید ضمیروں کے آئینۂ ذکاوت میں یہ معنیٰ عکس پذیر ہوں کہ اس حقیر، فقیر کمین و کمین بندے ابوالحسن ابن مولانا حسن کو اکابر بزرگان کے فقرات اور کلماتِ قدسی آیات کے مطالعے کا جوان کی زبانِ حق ترجمان سے وقتاً فوقتاً نکلے یا ان کے محبان خاص الخاص اور معتقدان صادق الاخلاص نے بغرض افادہ طالبان حقیقت اور سالکانِ طریقت اپنے لوحِ دل پر نقش کیے ہیں۔ سننے اور دیکھنے کا حد درجہ ذوق و شوق ہے۔ ایک بار بندے نے حضرت عالی منزلت، افضل ارباب شہود، اکمل اصحاب قائلان وحدت الوجود، الافاضال المرشد الکامل الفیاض، کشاف الحقائق والمعارف زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین استادی، مرشدی قبلتی و قدوتی یعنی تاج الملت والدین مولانا حسن دہلوی الکشمیری والہمد انی سلمہ اللہ علیٰ روس الطالبین و مفارق السالکین کی خدمت میں عرض کیا کہ ضلالت کے جنگلوں میں سرگرداں ہم جیسوں کے لیے خدا شناسوں کے ملفوظات سے ایک دست آویز مرتب

1　جب میرے دیدۂ خوں چکاں کو عشق شورش میں لاتا ہے تو میں کوچہ و بازار کو صحنِ گلستاں بنا دیتا ہوں یعنی ہر جگہ اپنے سرخ آنسوؤں کے پھول برساتا پھرتا ہوں۔ نشہ وحدت چڑھ گیا ہے، ہم اناالحق میں مست ہو گئے، ہاں ہاں لو ایک اور گل منصور کھلا۔

2　اپنے سرو جیسے قد پر حسن کو دوبالا کرنے کے لیے اور بناؤ سنگار نہ کر، تا کہ میرے دل مجروح پر جو تیرے قد بالا سے پہلے سے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہے اور زخم نہ لگیں۔ اے بوڑھے فلک تیری جوان موت ہو تو نے مجھے جب دواءِ درد دی ہے ساتھ ہی ڈنک بھی مار دیا ہے۔

3　افسوس محتسب شہر مجھ سے ہمیشہ لڑائی نکالتا ہے، میں شیشہ (بوتل) نکالتا ہوں، وہ پتھر لاتا ہے کہ اسے توڑ دے۔

ہو جائے۔ آپ حضرت نے ٹال دیا اور قبول نہیں کیا آخر کار ایک دن فرمایا کہ ہم نے زمخشری کی کتاب مستطاب ربیع الابرار کا جو خطبہ انتخابی لکھا ہے اسے پڑھ اور مجھے معاف رکھ۔ جب فقیر نے اس کو دیکھا تو ایزدی تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد یہ عبارت نظر پڑی ''وانما اخرت الانتخاب علی التصنیف والتالیف حرباً عن الاستحذاف والاستعضاف علی ماقیل و نعم ماقیل. و لِلّٰہ دُرہ قیل من التصنیف من انتخب فقد استحذف او استضعف و من من صنف ردایف و لم یخطا او لم ینسب الی الخطاء سیماً عند اخوان الزمان. حفظنا اللہ سبحانہ و ایاک عن الغیبۃ و البھتان [1] '' جب میں نے یہ عبارت دیکھی تو سمجھ گیا کہ باوجود کمال سخن وری آپ کی عدم تصانیف میں یہ نیت رہی ہے پھر اور گستاخی کرنا اور عرض حال کرنا ادب سے دور بے ادبی کے نزدیک گمان کر کے خموش رہنے والوں میں ہو گیا۔ اس کے بعد پھر جب شوق نے غلبہ کیا تو آپ کے ملفوظات اور فقرات کے مسودات کو جن کا نام ''اتفاقاتِ حسنہ'' رکھا گیا ایک زمانے سے بکھرے پڑے تھے۔ تلاش کر کے یکجا کیا اور انھیں دیکھ رہا تھا حسن اتفاق دیکھیے کہ ان اوراق پریشاں کے فقرات میں سے چھانٹ کر چند فقرے خود آپ کے یکجا کیے ہوئے مل گئے۔ کھوئے ہوئے دلوں کے لیے عروۃ الوثقیٰ اور شکستہ جانوں کے لیے ید بیضا کی نقدی ہاتھ لگ گئی۔ اس کے مبادی اور مقدمات سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ عنفوان شباب میں جب آنحضرت مجاہدات شاقہ کر رہے تھے اور اذواق و مواجید اور احوال پیش آتے تھے عارفانہ باتیں زبان وقلم سے نکل جاتی تھیں جیسا کہ سبھی بزرگوں کو جب مجاہدات اور ریاضت ہائے شاقہ سے صفائے دل میسر ہو جاتی ہے۔ بہت سے بستہ راز کھل جاتے ہیں اور ان کے دل انوار الٰہی کے عکس سے منعکس ہو جاتے ہیں تب اسی قسم کی باتیں سرزد ہوا کرتی ہیں۔ اس کتاب میں وہی سب باتیں ہیں۔ اور کبھی کبھی

---

1 بیشک میں نے دوسروں کی تصانیف اور تالیفات میں سے انتخاب کو چھوڑ دیا ہے حذف واضافے سے بچنے کی غرض سے جیسا کہ کہا گیا ہے اور خوب اچھی بات کہی گئی ہے۔ اس کی خوبی اللہ کے لیے ہے۔ کہا ہے کہ جس نے تصانیف سے انتخاب کیا تو بے شک یا تو اس نے کچھ حذف کر دیا یا کچھ بڑھا دیا ایسا کون ہے جس نے کسی کی پیروی کرتے ہوئے کوئی تصنیف کی اور اس میں نہ تو خطا کی اور نہ کبھی علما زمانہ کے نزدیک وہ منسوب الی الخطار ہا ہو (یہ بہت دشوار ہے) اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں غیبت اور بہتان سے بچائے رکھے۔

آنحضرت کا وقت خوش ہوتا تھا تو اپنے گذشتہ زمانے کے احوال خیر مآل جو پیش آئے تھے اس فقیر سے رمز اور اشارے کنائے کی زبان میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ اِن (ارشادات) سے جہالت کی تاریکی کے گریبان سے علم و معرفت سرابھارتی اور نور حقیقی کی جیب سے صبح (یافت) نمودار ہوتی تھی۔ ایک بار صبح کی نماز کے بعد کمال توجہ اور مہربانی سے میری جانب رخ کر کے اس مرید مستفید سے فرمایا کہ ہم اُن دِنوں عالم مثال میں اکثر جمال با کمال مقدس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک واقعہ ''اتفاقات حسنہ'' کے ایک ملفوظ کے تقرب میں انشاءاللہ ذکر کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایام طفولیت میں جبکہ آپ بلوغ کے قریب تھے، غفلت اور بے خبری سے جیسا کہ اس عمر کا تقاضہ ہے آپ کی ایک رات نماز قضا ہوگئی۔ ایسا دکھایا گیا کہ نبوت و رسالت کی آنکھوں کے نور حضرت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک بہت اونچی جگہ کھڑے ہیں اور مجھے ایسی خشمگیں نظروں سے جن میں محبت ملی ہے دیکھ رہے ہیں۔ اسی اثنا میں دو تین بار جلدی جلدی فرمایا کہ نماز پڑھ نماز پڑھ۔ اس کے بعد فقیر ہیبت سے بیدار ہوا جب اچھی طرح غور کیا تو دیکھا کہ میرا ظلمت بھرا دل مطلع انوار الٰہی اور مورد فیوضات لامتناہی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی برکت سے جو کہ مطلق واقع ہوا تھا میں نے فرائض کے علاوہ سنن اور نوافل میں سے بھی کوئی چیز قضا نہ کی، الا ماشاءاللہ۔ بلکہ عبادات زائدہ مثل تہجد اور تسبیحات اور ان کے علاوہ کی بھی توفیق ملی والحمدللہ علی ذالک (انتہیٰ کلامہ) میں دانا کی جودت طبع اور حدت فہم اور طینت فطرت لطیفہ سے آگاہ ہوں۔ ایک رات میرے شیخ نے اور میں نے شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے روضے کے اندر شب زندہ داری میں گزاری۔ کیا نکات دل اور رموزات جاں فزا اس رات میں ان سے ادا ہوئے کہ میرے شیخ حد درجہ خوش وقت ہوئے۔ حالانکہ وہ نوجوان تھے۔ ابھی انھوں نے زمانے کی سردی گرمی نہ چکھی تھی اور اس کی کشمکش نہ دیکھی تھی اسی دوران ایام جوانی میں ہی 1036ھ (1626) میں دنیا سے چل بسے۔ ان کی قبر ان کے والد مولانا حسن قدس سرہٗ کی قبر کے نزدیک ہے۔ ان کے والد ان کے فراق میں نہایت مضمحل اور نزار ہو گئے اور درد و غم بھرے مرثیے اس دور میں کہے ہیں۔ میں نے اسی مدت میں ایک بزرگ سے یہ کہتے سنا کہ اگر دانا اور چند سال زندہ رہتے شاعری میں عرفی کے مرتبے تک پہنچتے۔

اب چند مقبول بارگاہِ خداوندی نساء (عورتوں) کا ذکر مختصراً لکھا جاتا ہے۔ کتاب ''نفحات الانس'' کے آخر میں عارفات نساء کے ذکر میں لکھا ہے کہ قَالَ بَعْضُهُمْ

وَلَوْ كَانَ نِسَاءٌ كَمَا ذَكَرْنَا ۔۔۔ لَفُضِّلَتِ النِّسَاءُ عَلَى الرِّجَالِ
فَلَا التَّأْنِيثُ لِاسْمِ الشَّمْسِ عَيْبٌ ۔۔۔ وَلَا التَّذْكِيرُ فَخْرٌ لِلْهِلَالِ [1]

بی بی سنّی

اُن ستودہ اطوار کا نام بانو ہے۔ وہ پیدائشی ولی ہیں اور رابعۂ زماں ہیں۔ اولیاء اللہ کے اخلاق اور اوصاف حمیدہ بروجہ اتم ان میں موجود ہیں۔ وہ میرے شیخ کی دختر ہیں اور ان کی مقبولِ نظر بھی۔ جب میرے شیخ نے ان کو اس کار درویشی کے مستحق اور لائق سمجھا تو پہلے تلقینِ ذکرِ باطن کی۔ کیفیت معہودہ نے ظہور کیا، اس کے بعد سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ کی خلافت انھیں عطا فرما کر فرمایا کہ جو بھی صالحہ عورت تیرے پاس آئے، طلبِ ذکرِ باطن کرے اور طریقہ چاہے اس کو طریقہ تلقین کر دینا اور توجہ دینا۔ وہ اسی طرح کرتی ہیں۔ میرے شیخ نے ابھی حال میں ان کی صفات عالیہ کے سلسلے میں یہ شعر کہے ہیں۔

انساں بایں خجستہ صفاتے بگو کجاست ۔۔۔ ذاتے چنیں بخوبی و آبی بگو کجاست
درصورت است زن بصفت مرد کامل است ۔۔۔ مردے بایں ستودہ صفاتے بگو کجاست
مثلے کسے کہ خلد با او گشت در مثال ۔۔۔ خہ خہ چہ مرتفع درجاتے بگو کجاست [2]

ایک دن جاڑوں کی ہوا میں جب کہ دریائے جون (جو میرے شیخ کے مکان کے نیچے سے بہتا

---

1 اگر عورتیں ایسی ہوں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے تو عورتوں کو آدمیوں پر فضیلت دی جائے گی۔ سورج کے لیے زنانہ نام عیب نہیں ہے، اور چاند کے لیے مردانہ نام کوئی فخر کی بات نہیں۔

2 آج ایسی مبارک صفات کا انسان بتاؤ کہاں ہے۔ ایسی خوبیوں اور تابناکیوں والی ذات بولو کہاں ہے۔ وہ صورتاً تو عورت ہے مگر باطنی صفات کی رو سے مرد کامل ہے، بھلا ایسی ستودہ صفات شخصیت کہاں ہے، کہو تو۔ اس جیسا عالی مرتبہ جو کہ عالم مثال میں (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ) جنت میں داخل ہوا ہو، بتاؤ کہ آج کوئی کہاں ہے۔

ہے) کا پانی طغیانی لیے ہوے تھا اس میں ایک کسان غوطے کھاتا جار ہا تھا اور اس کے باہر آنے کی امید ختم ہو چکی تھی، لوگ ہر جانب سے شور و فریاد کر رہے تھے۔ اُن بی بی نے حقیقت حال مکان کے اندر سے سنی تو سراسیمہ ہو کر گھر کے صحن میں چکر کاٹنے لگیں اور اکابرین حضرات سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ کو وسیلہ بنا کر اس گرداب میں پھنسے ہوئے کے لیے دعا کرنے اور عزیمت پڑھنے میں لگ گئیں اور منتیں بھی مانیں۔ اسی اثنا میں وہ ڈوبنے والا کسان ان کی الحاح وزاری سے اور دعا و نیاز مندانہ توجہ سے کنارے آلگا اور اللہ سبحانہ نے اسے اس ہلاکت سے بچالیا۔ انھوں نے جو نذر مانی تھی فوراً ادا کی۔

خدا را بر آں بندہ بخشائش است که خلق از وجودش در آسائش است[1]

میں نے بچپن میں ان کو دیکھا ہے، آثار ہدایت وولایت ان کی جبین مبارک سے ظاہر تھے۔ اللہ ان کی عمر عزیز دراز کرے۔

بی بی سایندی

وہ میرے نانا جان شیخ محمد یحییٰ کی والدہ ہیں۔ لمبی عمر پائی۔ جھکی ہوئی کمر اور چلنے پھرنے سے معذوری کی وجہ سے ایک جگہ مضمحل پڑی رہتی تھیں۔ لیکن جب بھی ہمارے قبیلے میں کوئی بیمار ہوتا، سنتے ہی اُن پر ایک حال طاری ہوتا، بہت تیز چل کر بیمار کے سر پر پہنچ جاتیں اور اپنا ہاتھ اس کے سراپے پر پھیرتیں اور وہ ٹھیک ہو جاتا۔ ایک بار مجھے جوانی کے ابتدائی زمانے میں ایسا بخار چڑھا کہ ایک دن میں ہی میرا حال خراب ہو گیا۔ دوسرے دن پتا چلا تو ان پر حالت طاری ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے ہلنے تک کی طاقت نہ ہونے کے باوجود کھڑی ہوئیں، اور اپنے ہاتھ کو میرے سراپے پر پھیرنا شروع کیا۔ میرے بدن کے بال کھڑے ہو گئے اور میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور بالکل ٹھیک ہو گیا۔ 25/شعبان 1020ھ (مطابق 15/ستمبر 1612) کو ان کی وفات ہوئی۔ ان کی قبر بازار سنبھل والے باغ میں ہے۔ میرے نانا جان شیخ یحییٰ حد درجہ نیکوکار اور صالح تھے۔ ان کا طرز

1 اللہ تعالیٰ کی اس بندے پر دونوں جہاں میں بخششیں ہوتی ہیں کہ جس کے وجود سے مخلوق کو آسائش نصیب ہو۔

زندگی بزرگان سلف کی یاد دلاتا ہے۔ مجھ پر بہت لطف فرماتے تھے اور ان مشائخ و مجاذیب جن کی صحبت میں وہ رہے تھے حکایات مجھ سے بیان فرماتے اور وہ سادہ اشعار جو دوستان خدا کے وہ پڑھا کرتے تھے۔ ابتدائے شباب کے زمانے میں میری سمجھ میں نہ آتے تھے، لیکن آج میں دیکھتا ہوں کہ بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ یہ رباعی بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔

از دادہ چہ بہتر است گفتا کہ طعام — نادادہ چہ بہتر است گفتا کہ دشنام

ازخوردہ چہ بہتر است گفتا کہ غضب — ناخوردہ چہ بہتر است گفتا کہ حرام [1]

انھوں نے ایک لمبا عرصہ شہر لاہور میں گزارا اور وہیں 7 جمادی الآخر 1034ھ (7 مارچ 1625) کو انتقال فرمایا، اور قبر شیخ علی ہجویری قدس سرہٗ کے روضے کے نزدیک بنی۔ میں 9 سال کا تھا کہ جب میری والدہ صاحبہ بیمار ہوئیں۔ اس بیماری میں ان کو یہی خیال آتا تھا کہ میرے بعد اس لڑکے کو نہ جانے کیا پیش آئے۔ یہ بات وہ قبیلے والوں کے سامنے افسوس کے ساتھ کہتی تھیں۔ اپنے انتقال والے دن انھوں نے مجھے بلایا اور کہا: ''تیرے قربان جاؤں، اتنا کہہ کر آنکھوں میں پانی بھر لائیں اور کہا جا پڑھ''۔ میں ان کی اس ادا سے بہت متحیر اور مضطرب ہوا اور استاد سے جا کر عرض کیا فال کھولیے میری والدہ ٹھیک ہوں گی یا نہیں۔ جب فال کھولی تو ان کے دنیا سے رخصت ہونے کی خبر تھی، لیکن مجھ سے کہا اچھی فال نکلی ہے۔ اسی اثنا میں میری بیمار والدہ کے دنیا سے اٹھ جانے کا شور مچ گیا۔ میرے والد نے انھیں اسی قریہ پنہرہ میں جو کہ قصبہ لونی کی عملداری میں تھا جہاں آپ کی سکونت تھی بعد نماز مغرب دفن کیا۔ 7 ذی قعدہ 1019ھ (11 جنوری 1611) تاریخ تھی۔ کیونکہ میرے والد نے کبھی دہلی کے مشائخ میں سے کسی سے سن رکھا تھا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ جو میری قبر سے دس بارہ کوس تک کے دائرے میں دفن ہوگا اس کی شفاعت میرے ذمے ہے، میں اس کی سفارش کروں گا، انتہی۔ یہی وجہ تھی کہ میری والدہ کی نعش کو انھوں نے اہل قبیلہ کے اصرار بے حد کے باوجود سنبھل بھجوانا قبول نہیں کیا۔ ''رشحات'' میں ہے کہ حضرت خواجہ محمد پارسا نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ علاء الدین عطار

---

1 دیا ہوا کیا بہتر ہے کہا کہ طعام، نہ دیا ہوا کیا بہتر ہے کہا کہ گالی، کھایا ہوا کیا بہتر ہے کہا کہ غصہ، نہ کھایا ہوا کیا بہتر ہے کہا کہ حرام۔

قدس سرہٗ 795 ھ (1393) اوائل شعبان میں اپنی وفات سے سات سال پہلے چغانیاں سے حضرت خواجہ بزرگ (خواجہ نقشبند) قدس سرہٗ کی زیارت اور ملاقات کی غرض سے بخارا روانہ ہوئے، 18 ردن کے بعد وہاں پہنچے اور اوائل شوال میں چغانیاں لوٹے۔ عید کی رات میں وہاں درویشوں میں سے کسی نے اس رات خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت بزرگ و بالا درگاہ ہے۔ حضرت خواجہ علاء الدین اور خواجہ بزرگ قدس سرہٗ اس کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ ہے۔ حضرت خواجہ بزرگ اس درگاہ میں داخل ہوئے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد مسکراتے ہوئے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ مژدہ سنایا گیا کہ میری قبر سے سو میل تک کے دائرے میں جو دفن ہوگا میں باذن الٰہی اس کی قیامت کے روز سفارش کروں گا اور (علاء الدین) عطار کو اس کی قبر سے چالیس میل کے دائرہ میں مرتبۂ سفارش نصیب ہوگا اور میرے ادنیٰ سے ادنیٰ محب و تبع کو ایک میل تک اس کی قبر کے دائرہ میں دفن ہوئے لوگوں کے لیے مرتبۂ شفاعت عطا ہوا ہے۔ (انتہیٰ)

بی بی رجّی دہلوی

وہ ابھی سولہ سال کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ ہی تھیں۔ ان کا مکان بجلی مسجد کے محلے میں تھا کہ ناگاہ ان پر ایک جذبۂ قوی طاری ہوا اور گھر سے نکل جنگل کی راہ لی۔ لوگوں نے سمجھا کہ وہ پاگل ہوگئی ہیں اور انھیں قید کر دیا۔ وہ بولیں تم مجھے دیوانی سمجھ رہے ہو، ہاں میں اس ذات کی دیوانی ہوں جس نے اپنی نعمت دیدار عطا کر کے مجھے خود سے شناسا بنا دیا ہے اور مجھے اپنی معرفت کی نعمت سے نواز کر مجھ پر احسان فرمایا ہے۔ ''نفحات الانس'' کے یہ اشعار جو کہ حضرت تحفہ رحمۃ اللہ علیہا کی طرف منسوب ہیں ان کے حسب حال پڑتے ہیں۔

يَا مَعْشَرَ النَّاسِ مَا جَنَنْتُ وَلٰكِنْ ... اَنَا سَكْرَانَةٌ وَقَلْبِي صَاحِي[1]
أَغْلَلْتُمْ يَدَيَّ وَلَمْ آتِ ذَنْبًا ... غَيْرَ جُهْدِي فِي حُبِّهٖ وَافْتِضَاحِي

1 اے لوگو! میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست ہوں میرے دل نے غیر اللہ کو چھوڑ دیا ہے اور ان سے صاف ہوگیا ہے۔ تم نے میرے ہاتھوں میں بیڑیاں ڈال دیں، حالانکہ میں بے قصور ہوں۔

أَنَــا مَــفْتُــونَةٌ بِــحُــبِّ حَبِيْــبِ   لَسْــتُ أَبْغِــي عَــنْ بَــابِــهٖ مَنْ يُّرَاحِي
فَصَلَاحِــي الَّــذِي زَعَــمْتُمْ فَسَادِي   وَفَسَــادِي الَّــذِي زَعَــمْتُمْ صَلَاحِي
مَــا أَنَــا عَــلَــىٰ مَنْ أَحَــبَّ الْمَوَالِي   وَارْتِــضَــاهُ لِــنَــفْسِــهٖ مِنْ جَنَــاحِي [1]

پھر انھیں آزاد کر دیا تو مردان راہ کی طرح حسب منشائے دل اس راہ میں آگئیں اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کے روضے کے دروازے پر چبوترے پر بیٹھ گئیں اور آخر عمر تک وہاں سے قدم باہر نہ رکھا اور عالم قدس کے فیوضات سے بہرہ ور ہوئیں، اور انھیں پروانۂ قبولیت مل گیا۔ فقرا و اغنیا اکابر و اصاغر کی ایک بڑی جماعت نے ان سے رجوع کیا۔ جو نذر و نیاز لوگ پیش کرتے اسے اس بقعۂ شریفہ کے مجاوروں کو دے دیتیں۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی، کہ وہاں کے مجاور لوگ بغیر ان کی اجازت کے نذر و نیاز کو خود اٹھا کر لے جاتے، اس حال میں کہ وہ سب سے فارغ البال اور مست الست ہو کر رہتیں۔ میرے شیخ انھیں خوب پہچانتے تھے اور ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے، اور ان کو مردان راہ خدا میں شمار کیا کرتے تھے۔ جب بھی خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے مزار پر حاضر ہوتے ان کے پاس بھی تشریف لے جاتے۔ ایک دن اوائل حال میں ان کے پاس جا کر عرض کیا کہ میرے فلاں کام کے سلسلے میں توجہ فرمائیں کہ جلد بر آئے۔ وہ بولیں شہر کے بزرگ حضرات آپ کے پاس تبرک کے لیے حاضر ہوتے ہیں، میں گنہگار بندی کب اس کے لائق ہوں۔ عاجز و درماندہ ایک غریب ہوں، یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔ اس گفتگو کے دوران، میں نے انھیں دیکھا کہ قبولیتِ دعا کے آثار اُن کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ میرے شیخ نہایت خوش و خرم اٹھے۔ ایک دن اور میرے شیخ نے ان سے معلوم کیا۔ بادشاہ زادہ ''دارا شکوہ'' جب آپ کے پاس آیا تھا تو کیا پیش آیا تھا۔ کہا کہ ایک دن ایک نوجوان میرے پاس آیا، میں نے نہیں پہچانا کہ کون ہے، بیٹھا اور راہ درویشی کی باتیں چھیڑیں۔ مجھے

---

1 میرا قصور اس کے سوا کیا ہے کہ میں اس کی محبت میں کوشاں اور مغلوب الحال ہوں۔ میں محبوب کی محبت میں مبتلا ہوں۔ جو مجھے راحت دیتا ہے میں اس کے دروازے سے نہ ٹلوں گی۔ جسے تم میرا فساد سمجھ رہے ہو وہ میری بھلائی ہے۔ اور وہ چیز میرے لیے باعث فساد ہے جسے تم میری اصلاح سمجھ رہے ہو۔ مجھے ان چیزوں کی محبت نہیں ہے جن کی لوگوں کو ہے۔ اس کی خوشی میں میری خوشی ہے یہی میرا گناہ ہے۔

خیال ہوا کہ شاہی خاندان کا کوئی فرد ہے، فہیم اور ہوش مند۔ جب نذر گزرانی اور اور رخصت چاہی تو چلے جانے کے بعد میں نے پوچھا کہ کون تھا؟ کہا ''شہزادہ''۔ میں نے ان کے اقربا سے ان کے ابتدائی احوال کی بہت سی حکایتیں تفصیل سے سنی ہیں، جو کچھ تحریر ہوا اس سے بہت زیادہ بیان کرتے ہیں۔ بالجملہ مقبولان درگاہ خداوندی بلکہ اس سے بھی بڑی گزری ہیں کہ ان کی کرامات اور خوارق عادات کوئی بیان کرے۔ میں نے ان سے اکثر اپنے شیخ کے ہمراہ ملاقات کی ہے، ان کی مہربانی اور لطف وکرم خود پر پایا ہے۔ میرے والد ان سے آشنا تھے، اکثر ان کے پاس جایا کرتے تھے اور ان کے عجیب وغریب احوال اور طور طریق کی حکایات سنایا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جو کوئی ان کے پاس جاتا کھانے کی جو بھی چیز ہوتی پیش فرمایا کرتیں، یا وہ چند کاک (بسکٹ) جو کہ ان کو حضرت خواجہ قطب الدین کے لنگر سے ملتی تھیں دوسروں پر ایثار کر دیتی تھیں۔ تمام آنے والوں کو خُلق واحسان سے خوش کر دیتی تھیں۔ راہ سنت سے بے قید فقرا لوگ، جو کہ آجکل بہت عام ہو گئے ہیں، جب ان کے پاس آتے اور لایعنی گفتگو کرتے، اور بے مزہ مزخرفات بکتے تو وہ ان طمع سے بھرے ہوئے ضدی لوگوں کی الٹی سیدھی فرمائشوں کا بار خود اٹھاتی تھیں، اور کسی کو بھی اپنے خوانِ نعمت سے ناامید نہ رکھتی تھیں اور ہر حال میں خوش وخرم رہا کرتی تھیں۔ فقر وتجرد میں فارغ البال اور منبسط الحال زندگی بسر کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے گھر کے اندر ایک چھوٹا سا حجرہ تعمیر کرایا تھا اور وصیت کی تھی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو اس حجرے میں دفن کریں۔ ان کی کافی لمبی عمر ہوئی۔ وفات کا سال 1060ھ (1650) ہے۔ قبر ان کی اسی حجرے میں ہے۔

فقیرہ گوالیاری

صاحبان جذبۂ قوی اور سکر ومستی میں ان کا شمار ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں دس سال کی تھی کہ ایک دن بابا پیارے کودر سے ملاقات ہوئی، میں نے اظہار نیازمندی کیا۔ بابا خوش ہو گئے اور میرے اوپر ایک ایسی نظر ڈالی کہ میں بے ہوش ہو گئی اور سات دن تک کچھ نہ کھایا۔ آخر، میں گھر سے باہر نکل گئی اور دیوانہ وار پھرا کرتی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں حجاز مقدس کا سفر کیا۔ یہ سفر

اَنَـــا مَـــفْتُـــونَةٌ بِـــحُـــبِّ حَبِيْـــبٍ لَسْـــتُ اَبْـغِـي عَـنْ بَـابِـهٖ مَنْ يُّرَاحِي
فَـصَلَاحِـي الَّـذِي زَعَـمْتُمْ فَسَادِي وَفَسَـــادِي الَّـذِي زَعَـمْتُمْ صَلَاحِي
مَـا اَنَـا عَـلٰـى مَـنْ اَحَبَّ الْمَوَالِي وَارْتِـضَـاهُ لِـنَـفْـسِـهٖ مِنْ جَنَـاحِي [1]

پھر انھیں آزاد کر دیا تو مردان راہ کی طرح حسب منشائے دل اس راہ میں آ گئیں اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کے روضے کے دروازے پر چبوترے پر بیٹھ گئیں اور آخر عمر تک وہاں سے قدم باہر نہ رکھا اور عالم قدس کے فیوضات سے بہرہ ور ہوئیں، اور انھیں پروانۂ قبولیت مل گیا۔ فقرا و اغنیا اکابر و اصاغر کی ایک بڑی جماعت نے ان سے رجوع کیا۔ جو نذر و نیاز لوگ پیش کرتے اسے اس بقعۂ شریفہ کے مجاوروں کو دے دیتیں۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی، کہ وہاں کے مجاور لوگ بغیر ان کی اجازت کے نذر و نیاز کو خود اٹھا کر لے جاتے، اس حال میں کہ وہ سب سے فارغ البال اور مست الست ہو کر رہتیں۔ میرے شیخ انھیں خوب پہچانتے تھے اور ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے، اور ان کو مردان راہ خدا میں شمار کیا کرتے تھے۔ جب بھی خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے مزار پر حاضر ہوتے ان کے پاس بھی تشریف لے جاتے۔ ایک دن اوائل حال میں ان کے پاس جا کر عرض کیا کہ میرے فلاں کام کے سلسلے میں توجہ فرمائیں کہ جلد بر آئے۔ وہ بولیں شہر کے بزرگ حضرات آپ کے پاس تبرک کے لیے حاضر ہوتے ہیں، میں گنہگار بندی کب اس کے لائق ہوں۔ عاجز و درماندہ ایک غریب ہوں، یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔ اس گفتگو کے دوران، میں نے انھیں دیکھا کہ قبولیت دعا کے آثار اُن کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ میرے شیخ نہایت خوش و خرم اٹھے۔ ایک دن اور میرے شیخ نے ان سے معلوم کیا۔ بادشاہ زادہ ''دارا شکوہ'' جب آپ کے پاس آیا تھا تو کیا پیش آیا تھا۔ کہا کہ ایک دن ایک نوجوان میرے پاس آیا، میں نے نہیں پہچانا کہ کون ہے، بیٹھا اور راہ درویشی کی باتیں چھیڑیں۔ مجھے

1 میرا قصور اس کے سوا کیا ہے کہ میں اس کی محبت میں کوشاں اور مغلوب الحال ہوں۔ میں محبوب کی محبت میں مبتلا ہوں۔ جو مجھے راحت دیتا ہے میں اس کے دروازے سے نہ ٹلوں گی۔ جسے تم میرا فساد سمجھ رہے ہو وہ میری بھلائی ہے۔ اور وہ چیز میرے لیے باعث فساد ہے جسے تم میری اصلاح سمجھ رہے ہو۔ مجھے ان چیزوں کی محبت نہیں ہے جن کی لوگوں کو ہے۔ اس کی خوشی میں میری خوشی ہے یہی میرا گناہ ہے۔

خیال ہوا کہ شاہی خاندان کا کوئی فرد ہے، فہیم اور ہوش مند۔ جب نذر گزرانی اور اور رخصت چاہی تو چلے جانے کے بعد میں نے پوچھا کہ کون تھا؟ کہا ''شہزادہ''۔ میں نے ان کے اقربا سے ان کے ابتدائی احوال کی بہت سی حکایتیں تفصیل سے سنی ہیں، جو کچھ تحریر ہوا اس سے بہت زیادہ بیان کرتے ہیں۔ بالجملہ مقبولان درگاہ خداوندی بلکہ اس سے بھی بڑی گزری ہیں کہ ان کی کرامات اور خوارق عادات کوئی بیان کرے۔ میں نے ان سے اکثر اپنے شیخ کے ہمراہ ملاقات کی ہے، ان کی مہربانی اور لطف و کرم خود پر پایا ہے۔ میرے والد ان سے آشنا تھے، اکثر ان کے پاس جایا کرتے تھے اور ان کے عجیب و غریب احوال اور طور طریق کی حکایات سنایا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جو کوئی ان کے پاس جاتا کھانے کی جو بھی چیز ہوتی پیش فرمایا کرتیں، یا وہ چند کاک (بسکٹ) جو کہ ان کو حضرت خواجہ قطب الدین کے لنگر سے ملتی تھیں دوسروں پر ایثار کر دیتی تھیں۔ تمام آنے والوں کو خُلق و احسان سے خوش کر دیتی تھیں۔ راہ سنت سے بے قید فقرا لوگ، جو کہ آجکل بہت عام ہو گئے ہیں، جب ان کے پاس آتے اور لایعنی گفتگو کرتے، اور بے مزہ مزخرفات بکتے تو وہ ان طمع سے بھرے ہوئے ضدی لوگوں کی الٹی سیدھی فرمائشوں کا بار خود اٹھاتی تھیں، اور کسی کو بھی اپنے خوانِ نعمت سے ناامید نہ رکھتی تھیں اور ہر حال میں خوش وخرم رہا کرتی تھیں۔ فقر و تجرد میں فارغ البال اور منبسط الحال زندگی بسر کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے گھر کے اندر ایک چھوٹا سا حجرہ تعمیر کرایا تھا اور وصیت کی تھی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو اس حجرے میں دفن کریں۔ ان کی کافی لمبی عمر ہوئی۔ وفات کا سال 1060ھ (1650) ہے۔ قبر ان کی اسی حجرے میں ہے۔

فقیرہ گوالیاری

صاحبان جذبۂ قوی اور سکر و مستی میں ان کا شمار ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں دس سال کی تھی کہ ایک دن بابا پیارے کو در سے ملاقات ہوئی، میں نے اظہار نیازمندی کیا۔ بابا خوش ہو گئے اور میرے اوپر ایک ایسی نظر ڈالی کہ میں بے ہوش ہو گئی اور سات دن تک کچھ نہ کھایا۔ آخر، میں گھر سے باہر نکل گئی اور دیوانہ وار پھرا کرتی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں حجاز مقدس کا سفر کیا۔ یہ سفر

خانخانہ بیرم کی بیٹی جانانہ بیگم [1] کی ہمراہی میں ہوا تھا۔ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوکر خشکی کی راہ سے لوٹ کر اُوچ (ملتان) پہنچی اور اس دیار کے مشائخ سے ملاقات کی اور پھر ہندستان واپس لوٹ کر صاحب مجاذیب کی صحبت میں آمد و رفت رکھی۔ اس کے بعد مجھے ایک حالت پیش آئی کہ میں صحرا اور کوہستان کی جانب نکل گئی، اور 12 سال تک اسی حالت جذب میں وہاں درختوں کے پتوں، پھولوں اور مٹی کے علاوہ کچھ نہ کھایا۔ ایک دن اسی جنگل میں میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا شیر آیا اور اس نے سات شیر مار ڈالے۔ اسی اثنا میں ایک ببر شیر نہایت قوی اور ہیبت ناک نکلا اور اس نے بڑے شیر کو مار دیا اور جنگل میں چھپ گیا۔ میں نے مستی اور جذبۂ عشق الٰہی کے عالم میں اس شیر کی کھال نکالی اور اس کا لباس بنالیا اور خوش خوش مستانہ وار پھرا کرتی تھی۔ اس جنگل میں بڑے بڑے زہریلے سانپ وغیرہ اپنے اردگرد دیکھا کرتی تھی اور مجھے کسی پھاڑ کھانے والے جنگلی جانور سے ڈر بالکل نہ لگتا تھا۔ آخر الامر وہاں سے نکل کر سادھوڑہ پہنچی اور سید عبدالوہاب سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کر لی۔ جب فقیرہ گوالیاری اپنے اوائل حال میں سنبھل کے اطراف میں آئی تھیں، بڑی حسین و لطیف تھیں اور سراپا برہنہ جا بجا گھوما کرتی تھیں۔ علاوہ ستر عورت کے کوئی لباس اپنے جسم پر نہ رکھتی تھیں۔ بہت سے ناسمجھ حاسدین خام عوام ان پر زبان طعن دراز کرتے تھے اور ان کو نوجوانوں کے عشق کی تہمت لگاتے تھے۔ وہ سب کچھ سنتی تھیں مگر طعن کرنے والوں کے طعنوں سے بالکل فارغ تھیں۔ اسی حال میں سخت آہ بھر کر کہتیں: ''اب مجھے دنیا اور اہل دنیا سے کیا غرض، لوگوں کے ردّ و قبول سے نہ غم ہے نہ خوشی، اللہ اللہ بس میرا عشق عشق مولیٰ ہے''۔ اس موقع پر ''سبحۃ الابرار'' مولوی جامی قدس سرہٗ کی منظوم حکایت مجھے یاد آئی۔

پور عمران بدل غرقۂ نور   می شد از بہر مناجات بطور [2]

---

1 عبدالرحیم خان خانہ کی بیٹی اور جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے بیٹے دانیال کی بیوی تھیں۔ بڑی عابدہ و زاہدہ اور فارسی زبان کی اچھی و قادرالکلام شاعرہ تھیں۔ قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی۔ زیارت حرمین شریفین سے مشرف تھیں۔ 1070ھ/1660 میں انتقال کیا۔

2 ''عمران کے بیٹے حضرت موسیٰ علیہ السلام مناجات کرنے کے لیے طور پہاڑ پر جایا کرتے تھے۔

دیده در راه شردوران را   قاید لشکر مجهوران را
گفت کز سجدهٔ آدم ز چه روی   تافتی روے رضا صاف بگوی
گفت عاشق که بود کامل سیر   پیش جانان نبرد سجده غیر
گفت موسیٰ که بفر مودهٔ دوست   سر نهد هر که ز جان بنده اوست
گفت مقصود ازان گفت و شنید   امتحان بود محبّ را نه سجود
گفت موسیٰ که اگر حال این است   لعن و طعن تو چرا آئین است
بر تو چون از غضب سلطانی   شد لباس ملکی شیطانی
گفت کین هر دو صفت عاریت اند   مانده از ذات بیک ناحیت اند
گر بیاید صد ازین یا بَرَود   حال ذاتم متغیر نشود
ذاتِ من بر صفت خویشتن است   عشق او لازمه جانِ من است
تا کنون عشق من آمیخته بود   در غرض هاے من آویخته بود
داشت بخت سید روز سفید   هر دم دست خویش (دهم) بیم و امید
این دم از کشمکش اورستم   پس زانوے وفا نبشتم
لطف و قهرم همه یک رنگ شده است   کوه و کاهم همه یک سنگ شده است
عشق شست از دل من نقش هوس   عشق با عشق همه ماندم بس[1]

---

1 راستہ میں انھوں نے حق سے مجبوروں کے لشکر کے قائد شیطان ملعون کو دیکھا تو کہا: ''سچ بتا تو نے کس وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا؟'' بولا: ''جو عاشق کامل ہوتا ہے وہ اپنے محبوب کے سامنے کسی غیر کو سجدہ نہیں کرتا''۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''محبوب جہاں سر ٹیکنے کو کہتا ہے جو دل سے اس کا غلام ہوتا ہے وہیں سر جھکا دیتا ہے''۔ بولا: ''اس حکم دینے سے اللہ کا مقصد صدق عشق کا امتحان تھا نہ کہ حقیقتاً آدم کو سجدہ کروانا''۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اگر تیرا یہ حال تھا تجھ پر لعن وطعن کا کیوں دستور بنایا؟ اللہ تعالیٰ کے غیظ و غصے سے کیوں تیرا مَلَکی لباس شیطانی سے تبدیل کر دیا؟'' بولا: ''یہ دونوں مَلَکی اور شیطانی صفات تو عارضی صفات ہیں میری جان کے اعتبار سے ایک کونے میں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایسی اچھی بُری سیکڑوں صفات بلکہ اس سے زیادہ مجھ پر طاری کر دی جائیں تب بھی میری روح سے اس کا عشق نہ جائے گا۔ جب سے مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے میری اپنی مصلحتیں مجھ سے برطرف ہو گئیں ہیں۔ اب میں ان کی کشمکش سے چھوٹ گیا ہوں۔ لطف و قہر میری نظر میں ایک ہو گئے ہیں۔ پہاڑ اور تنکا میرے نزدیک یکساں ہیں۔ عشق نے میرے دل سے دوزخ کا خوف اور جنت کی ہوس نکال دی ہے۔ میں تو بس عاشق ہوں، اپنے معشوق کے ساتھ۔

اس کے بعد وہ فقیرہ گوالیاری جذبۂ الٰہیہ میں مستقیم الحال ہوگئیں، عالم مستی میں جو ان کی زبان سے نکل جاتا ہو جاتا۔ لوگ ان کے رڈ و قبول میں دو فرقوں میں بٹ گئے تھے، بعض کہتے وہ صاحب احوال مجاذیب میں سے ہیں ان سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے کرامات کی جنس سے ہے۔ بعض کہتے تھے کہ جن ان کے تابع ہو گیا ہے جو کچھ دکھتا ہے اس کی کارروائی ہے۔ لیکن یہ دوسری بات ان پر تہمت صریح تھی، کیونکہ ان کا کلام اس راہ درویشی کا کلام معرفت ہوتا تھا۔ جو کچھ فرماتی تھیں اس راہ کی بے خار گفتگو ہوتی تھی۔ میر سید فیروز نے ایک دن مجھے سنایا کہ ان فقیرہ نے ایک دن قصبہ سہسوان میں مجھ سے کہا: ''جا تیرے لیے دربار شاہی میں خلعت، اضافہ، گھوڑا، شمشیر و سپر سجی سجائی اور دوسرے مراتب مہیا کیے گئے ہیں جا، جا کر لے لے''۔ میں حیرت میں پڑ گیا کیونکہ مجھے یکبارگی ان سب چیزوں کی امید نہ تھی، خاص طور سے شمشیر کی جو کہ بہت ہی عمدہ کارکردگی پر دی جاتی ہے۔ اسی اثنا میں رستم خان دکھنی (جن کا میں لشکری تھا) نے مجھے طلب کیا اور حد سے زیادہ مہربانی فرمائی، اور ان سب چیزوں سے مجھے بے وہم و گمان نوازا، اور اپنی سرکار کا وکیل مطلق بنا دیا۔ (انتھیٰ کلامہ)۔ اُن ہی ایام میں کہ، جب مجھے اہل دنیا کی محبت سے ترک کی دولت نصیب ہوئی تھی، ایک دن وہ فقیرہ میرے مکان کے گوشے میں آئیں اور اس راہ کی باتیں کرنی شروع کیں۔ اسی اثنا میں حضرات نقشبندیہ کی نسبت خاصہ کو جو کہ نہایت پردۂ خفا اور استتار (چھپانا) میں ہے اشارے اور کنائے میں ادا کر گئیں تو میں حیرت زدہ رہ گیا، اور بطور نیک فالی اور بشارت مجھ سے کہا: ''اس راہ میں مردانہ وار رَہ اور کسی تفرقے کو دل میں جگہ مت دے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ تیرے تمام کام اور بوجھوں کو اپنے خزانۂ غیب سے آسان کر دے گا''۔ ایک دن وہ مستانہ اور والہانہ انداز میں عشق و محبت الٰہی میں ڈوبی ہوئی آئیں اور بڑی غمگین اور دلکش آواز میں ایک نقش گانا شروع کیا اور کافی دیر تک گاتی رہیں۔

(نقش)

مین اپنوں من ہر سوں جورو   ہر سوں جورسیں سوں تو رو
نانچ رچوتب کہو ملہت کیسوں   آں کاں در در بھٹک بچھورو
آکہین یا چھیں سوچ منایو   مانجھ بات منکا سو ہورو

کتھو ہوئی سو کہ مری تجنی کہیا پیو کاہو گا ہو مکدر مورد

سورداس پربھو لوگ ہنست ہیں لوک لاج تن کا ہو تو رد

جس وقت وہ یہ گا رہی تھیں میں ایک ایسے خیال میں غرق تھا کہ جس کا بیان ممکن نہیں۔ ایک بار اور وہ میرے گھر آئیں کہ میں اور ایک خشک ملّا یکجا بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجذوبانہ انداز میں اس راہ کی گفتگو شروع کردی۔ وہ غافل عالم تمسخر کے طور پر ان کو دیکھ رہا تھا اور اس نے استہزا آمیز اور نامناسب باتیں کہنا شروع کیں۔ وہ اس بات سے غصے میں ہوگئیں اور مجھ سے کہا: ''ایسے لوگوں کے پاس ہرگز مت بیٹھا کر، اس جماعت سے بچنا اولیٰ ہے کہ بھائی منصور کو ایسے ہی لوگوں نے دار پر چڑھایا ہے''۔ وہ قاری باوجود قدرت اور صلاحیت کے ان کے دبدبے سے کچھ نہ بول سکا اور اٹھ کر چلا گیا۔ آخر ان کی بات مجھ پر ظاہر ہوگئی، وہ میرے شیخ سے دل میں ایک غبار رکھتا تھا، میں اس کی اس دلی کھوٹ سے آگاہ نہ تھا اور اس کے ساتھ نشست و برخاست رکھتا تھا، ان مجذوبہ نے مجھے خوب آگاہ کردیا۔ روایت ہے کہ ایک بار ایک لشکری نے انھیں بہت پریشان کیا اور بے ہودہ گفتگو سے ان کا بہت دل دکھایا۔ انھوں نے کہا: ''اگر تو برباد نہ ہو تو میرا نام فقیرہ نہیں''۔ چند دن میں وہ فوجی بڑی تکلیف گذار کر مر گیا۔ اس کے بعد ان کا یہ سکر و استغراق اور یہ مجذوبانہ کیفیات جاتی رہیں اور معتدل المزاج ہوگئیں۔ غربت اور شکستگی کی خو اختیار کی اور ایک نوجوان فقیر کے نکاح میں آگئیں۔ اس نوجوان سے زیادہ حسن و جمال رکھتی تھیں۔ اس وقت وہ تصرفات اور وہ دعوے جو وہ کیا کرتی تھیں نہ رہے اور گوشۂ توکل اور نامرادی میں قدم جما لیا۔ اب وہ اہل نظر کی نظروں میں پہلے سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول ہوگئیں۔ چونکہ تصرف تصوف کے راستے کی ایک گھاٹی ہے، اس لیے صاحب حال صوفیہ کے دعاوی بھی اس راہ کے اہل کار کے لیے باعث نقص ہیں۔ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ ایک درویش کو صحرا میں پیاس لگ گئی۔ اسے آسمان سے ایک پیالہ ٹھنڈے پانی کا لٹکا ہوا نظر پڑا۔ اس درویش نے کہا: ''فقر کی عزت کی قسم میں تب تک پانی نہ پیوں گا جب تک کہ کوئی مجھے تھپڑ مار کر پانی نہ دے، مجھے کرامت کا پانی نہ چاہیے۔ کرامت کے ناز و غرور سے کہا کہ یا اللہ! آپ تو اس پر بھی قادر ہیں کہ میرے شکم میں پانی پیدا کردیں''۔ ظاہری کرامتیں (صوفی کے فتنے میں پڑ جانے کے) مکر سے مامون نہیں ہوتیں۔ ''رشحات'' میں ہے کہ

خواجہ احرار نے فرمایا: ''مکرالٰہی دو قسم کے ہیں؛ ایک تو عوام کی نسبت سے دوسرا خواص کی نسبت سے، جو مکر عوام کی نسبت سے ہے وہ نعمت کی فراوانی باوجود اس کے کہ نافرمانی میں مبتلا ہے۔ خواص کے اعتبار سے جو مکرالٰہی ہے وہ ترکِ آدابِ راہِ سلوک کے باوجود کیفیات واحوال کا باقی رہنا ہے
''نفحات الانس'' میں ہے کہ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری قدس سرہٗ نے فرمایا: ''حقیقت کی درستگی اور کمال کرامات سے نہیں ہوتے کہ حقیقت تو خود کرامت ہے۔ جو کرامات ابدال اور اوتاد سے ظہور پذیر ہوتی ہیں ہر کس وناکس ان سے پیدا ہونے والے ناز وغرور سے مامون نہیں رہ پاتا۔ جب تیری نظرِ دل عطایا میں پھنس جائے گی تو تجھے اس لائق نہ چھوڑیں گے کہ تو عطا سے معطی کو دیکھے یا کرامت سے مکرِم کو، بلکہ اپنے مقبولِ درگاہ ہونے کے ناز میں دوسروں سے خود کو اعلیٰ سمجھ کر مغرور بن جائے گا۔ یہ بھی فرمایا کہ نازِ کرامت کبھی کبھی سالک کو راندۂ درگاہ بھی کر دیتا ہے۔ جب صوفیوں کے دل بال برابر بھی کرامت پر نظرِ عجیب ڈالیں تو وہ دن ان کا برا دن ہوتا ہے''۔ اسی کتاب میں ہے کہ ابوالخیر سنائی نے کہا: ''جو اپنے عمل نیک کا اظہار چاہتا ہے (وہ) ریاکار ہے اور جو اپنے حال کو ظاہر کرتا ہے (وہ) مدعئ ولایت ہے''۔ ایک بار آپ نے کسی کو دیکھا کہ پانی پر چل رہا ہے، آپ دریا کے کنارے کھڑے ہوئے تھے، (آپ نے) اس سے کہا: ''یہ کیا بدعت ہے؟ زمین پر آ، اور چل''۔ ایک بار کسی دوسرے کو دیکھا کہ ہوا میں جا رہا ہے (تو) کہا: ''یہ کیا بدعت ہے؟ نیچے اتر اور چل''۔ پھر جب وہ نیچے آ گیا تو اسے پکارا: ''کہاں جاتا ہے''؟ (اس نے) کہا: ''حج کو جا رہا ہوں''۔ (آپ نے) کہا: ''اب جا''۔ اسی کتاب میں ہے کہ ابوعمر ودمشقی فرماتے ہیں کہ جس طرح پیغمبروں پر کرامات، آیات اور معجزات کا اظہار فرض ہے اسی طرح اولیاء پر اپنی کرامات کا پنہاں رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ خود اور عوام غرور وشرک وغیرہ کے فتنے میں نہ پڑیں۔
''رشحات'' میں ہے کہ حضرت شیخ عبدالکریم نے فرمایا کہ میرا ایک مرید تھا جو پانی پر چلتا تھا اور ہوا میں اڑتا تھا، یعنی ہوا۔ پانی دونوں میں چلتا تھا، لیکن اس نے توحید کی بو بھی نہ سونگھی تھی۔

جمال چندیری

بڑی حسین وجمیل تھیں، ان کے شوہر شتربان تھے، آپس میں بڑی محبت تھی۔ درویشانِ صاحبانِ

احوال کی صحبت کی برکت سے جمال کا حال دگر ہو گیا اور بڑی ہمت کے ساتھ اس راہ میں قدم رکھا۔ جب ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا، اپنے گھر کا سارا سامان فقیروں، درویشوں، نیکوں اور صفا کیشوں پر وقف کر دیا اور خود بھی ان کی خدمت میں اچھی طرح لگ گئیں۔ اس راہ میں آنے کے بعد انھیں کشادگی، دل جمعی اور سکون و آرام بہت ملا۔ میں 1040ھ (1630) میں چندیری گیا تھا، وہاں کے مزارات اور زندہ درویشان بابرکات کی زیارت کی۔ ایک دن ان جمال کے دیدار کے لیے گیا، دیکھا کہ ایک خوشنما محل صاف ستھرا بنا ہوا ہے، بڑا روح افزا اور دلکشا، اس محل میں جا بجا دنیا ترک کیے ہوئے درویشوں کو ٹھہرا رکھا ہے، سب لوگ خوش و خرم آرام سے لیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ بظاہر خوش پوشاک، مزین، آراستہ، پیراستہ اور نورانی طلعت مگر بباطن مشغول بحقیقت تھیں۔ حالانکہ اس زمانے میں، میں لشکری تھا لیکن درویشوں کا طالب اور ان کا دیدار اور صحبت کا شیفتہ تھا۔ جب انھوں نے مجھے دیکھا تو میری طرف متوجہ ہوئیں اور میری خوب آؤ بھگت کی۔ جب میں وہاں سے اٹھ کر باہر آیا تو میں نے ان کے بارے میں ان کے پڑوسیوں سے معلوم کیا۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ جب اس کا شوہر مر گیا تو شوہر کا مال نوجوان فقیروں اور قلندروں کو کھلا دیا اور برباد کر دیا اور خود کو گمراہی کی وادی میں ڈال دیا ہے۔ ہم لوگوں نے اس سے رشتہ توڑ لیا ہے کہ اس نے ہماری قوم کی شرافت کو بٹا لگا دیا ہے، اب ہم اسے اپنے قبیلے میں نہیں آنے دیتے ہیں۔ جب کوئی خود خراب ہونا چاہے تو ہوا کرے۔ میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا: "سبحان اللہ جو عورت راہ خدا میں آ گئی ہے اور صاحب احوال ہو گئی ہے، اور باطنی راہ سے مرتبۂ خواص بلکہ اخص الخواص تک پہنچ گئی ہے اس کو لوگ ذلیل بلکہ ذلیل تر سمجھتے ہیں"۔ میں نے اس سے بھی اچھا تماشا دیکھا ہے۔ سنو کہ دہلی شہر میں خانشہ نام کا ایک خانہ زادہ (غلام زادہ) گزرا ہے، اس جماعت کی کمائی دنیا جانتی ہے۔ اس کے چند لڑکے تھے۔ ان میں سے توفیق الٰہی سے ایک کا نام عبداللطیف تھا۔ پہلے اپنی قوم خانہ زاد سے علاحدہ ہوا اور طالب علموں کی صحبت میں رہنے لگا، علوم دینیہ حاصل کیے اور علما اور فضلا کا مقبولِ نظر بن گیا۔ ایک دن کسی نے خانشہ سے کہا: "تم بیٹے کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟ اسے آوارہ اور پریشان کیوں چھوڑ رکھا ہے"؟ (اس نے) کہا: "کیا کروں میری کوشش اسے سمجھانے کی کارگر نہیں ہوئی، میری نصیحت نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا، گھر سے چلا گیا اور طالب

علموں کی صحبت میں رہنے لگا اور خراب ہوگیا۔ چلوٹھیک ہے اگر ایک انڈا گندہ ہوگیا بلا سے ہوگیا''۔ اس کے بعد عبداللطیف کو اس راہ درویشی کا شوق دامن گیر ہوگیا۔ درویشوں اور فقرا کی صحبت میں پڑ گیا۔ اور طریق معاملت (راہ شریعت) میں بھی مستقیم الحال ہوگیا اور مقبول خاطر بن گیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے روضے میں سکونت اختیار کرلی اور ریاضت و مجاہدے کا طریقہ اختیار کیا اور جمعیت خاطر اور دل آرامی سے بہرہ ور ہوگیا، اور اہل اللہ کا مقبولِ دل ہوگیا۔ میں نے شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے عرس کی رات کو اسے آپ کے روضے پر دیکھا اور جان پہچان کی۔ باوجود فضیلت علم کے ہندی اشعار کی طرف بھی میلان خاطر رکھتا تھا، بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اس نے اپنے اشعار پڑھ کر سنائے تو میں نے بھی اسے اپنا ہندی کلام سنایا۔ وہ خوش ہوا اور وہ مجلس شب بڑے انشراح کے ساتھ انجام پائی۔ وہ ان ہی ایام میں کہ 1060ھ (1650) تھی بڑے ذوق وشوق کے ساتھ دنیا سے چلا گیا۔ ان کی قبر شیخ نظام الدین اولیاء کے روضے کے نزدیک بنی۔ اس وقت مجھے مولانا معین کی تصنیف تفسیر ''بحرالدُّرر'' سے ایک حکایت یاد آئی۔

قال الاَصْمَعِی رحمة الله رایتُ اعرابیاً بَالْبانیه(بالبادیه) و بیدهٖ سیفٌ مسلولٌ و فظننتُ انهُ سکرانٌ و قالَ لِی اِنْزع ثِیابَکَ و لا تخربُ بیتک بِموتِکُ فقلتُ اتدری مَنْ انا؟ فقال لَیس بِقطاعِ الطریق معرفةُ الاحدِ و لو عرفتُکَ لَانکرتُ المعرفةَ فقلت لهُ اَمَا تعلم ان الله یطالبُکَ لِما تفعلُ بِی فقال الابد من الرزق ان طالبنی بفعلی طالبةُ برزقی فقلت لهُ کَانَّک تطلُب رزقک علی الارض قال فاین اطلبة قلت و فی السماء رزقُکم و ما توعدون رمیٰ السیف من یدهٖ۔ فقال استغفر الله رزقی فی السماء و انا اطلبه فی الارض فلم یتمّ کلامه حتیٰ ظهربین یدیه رغیفان و قصفه مرقةٌ حارة۔ ظهو ذالک من حسنِ توفیقهٖ و صدق نیتهٖ

فالتفت الی فقال هدیک اللہ تعالیٰ کما هدیتنی الی الرزق فخیرت من شانہٖ فانفرقت باکیاً "معجبا" یقدر اللہ تعالیٰ ولا عجبٌ من ذالک لانہٗ قادر فلمّا کان العام القابل حججت بمکة فلقیتہٗ مراقبہ" بعد ذالک فی الطواف فعرفنی فقال او ماکنت صحبتنی بالبادیة فقلت بلیٰ قال لی مااسمک قلت اناالاصمعی قال یا اصمعی من ذالک الوقت الی یومنا هذ یا تینی فی کل لیلة رغیفان و قصقة فرقہٗ جارہ و انا من ذالک الوقت علی العبادت الی الآن لا فعل شیاً الا باذن اللہ بماامرنی بشیٔ فقال لی یا اصمعی زدنی من ذالک الشعر قلت مالنا للعرب ماهو الشعر انما هو کلام اللہ تعالیٰ ثم فرات فَوَرَب السماء و الارض انه، الحق مثل ما افکم تنطقون ۔ فتغیرَ و جهہٗ قدلقیت فرایضه فقال من الجاہ الخلف ثم وقع علی وجہٖ فوجدته میتاً ۔ قال الاصمی فاذا الهاتف یقول باللہ من ارادان یصلی علی و بی من اولیاء اللہ تعالیٰ فلیصل علی هذہٖ البدوی قال فغسلناہ و دفنناہ فرایته، فی المنام بعد الاسبوع علی هیت (حسنةٍ) فقلت بماذابلغت الی هذه المنزلةِ قال سماعی بقرائک القرایه[1] . انتھیٰ۔"

---

1 اَصمَعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے صحرا میں ایک اَعرَابی (بدُّو) کو دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ستی ہوئی تلوار تھی، مجھے خیال ہوا کی یہ نشے میں ہے۔ اس نے مجھ سے کہا: "اگر تجھے مر کر اپنا گھر برباد کرنا نہ ہو تو اپنے کپڑے اتار کر مجھے دے دے"۔ میں نے کہا: "تجھے پتا ہے میں کون ہوں؟" (وہ) بولا: "رہزن کو کسی کے پہچاننے کی کیا ضرورت؟ اگر میں تجھے پہچان بھی لیتا تو پہچاننے سے انکار کر دیتا"۔ میں نے اس سے کہا...... مسلسل

پیر ہروی (شیخ عبداللہ انصاری ہروی) کا مشہور قول ہے کہ:

مسلسل......: ''کیا تجھے پتا نہیں کہ تیرے میرے ساتھ اس فعل کی تجھ سے اللہ تعالیٰ پوچھ گچھ کرے گا؟'' (وہ) بولا: ''میں یہ روزی سے پریشان ہوکر کر رہا ہوں، اگر وہ مجھ سے اس کا مطالبہ کرے گا تو میں اس سے اپنا رزق مانگوں گا''۔ میں نے کہا: ''گویا کہ تو زمین پر اپنی روزی تلاش کر رہا ہے''۔ اس نے کہا: ''پھر کہاں تلاش کروں؟'' میں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے'' وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ '' (تمھارا رزق اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے۔) یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور بولا: ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ، اللہ مجھے معاف کرے میرا رزق تو آسمانوں میں ہے اور میں اسے زمین پر ڈھونڈ رہا تھا''۔ اس کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے سامنے دو نمکین روٹی کی اور سبزی کا ایک بڑا پیالہ آ گیا۔ یہ سب کچھ اس کے نیک گمان اور صدق نیت کی بدولت ہوا۔ پھر اس نے میری طرف ملتفت ہو کر کہا: ''اللہ تجھے ہدایت سے نوازے، جیسی تو نے مجھے رزق کی طرف رہنمائی کی''۔ مجھے اس کے عنداللہ اس مرتبے سے بڑا رشک ہوا اور میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے کارناموں پر تعجب کناں روتا ہوا اس سے جدا ہو گیا، حالانکہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ قحط کے سال میں جب میں حج کرنے مکے گیا تو میں نے اسے حرم میں مراقبے میں پایا، اس کے بعد طواف میں ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے پہچان لیا اور کہا: ''کیا آپ سے جنگل میں صحبت نہیں رہی؟'' تو میں نے کہا: ''ہاں''۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ''آپ کا کیا نام ہے؟'' میں نے کہا: ''میں اصمعی ہوں''۔ (وہ) بولا: ''اے اصمعی! اس وقت سے مجھے آج تک ہر رات کو دو روٹیاں اور گرم ساگ کا بڑا پیالہ ملتا رہتا ہے اور میں تب سے آج تک اس کی عبادت میں لگا ہوں، میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا ہوں، وہی کرتا ہوں جو وہ مجھے حکم دیتا ہے''۔ پھر بولا: ''اصمعی وہ شعر جو تو نے پڑھا تھا اسے پورا سنا دے''۔ میں نے کہا: ''وہ شعر نہیں تھا وہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام تھا''۔ پھر میں نے آگے کی آیت پڑھ دی ''فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ '' (آسمان و زمین کے رب کی قسم، بے شک یہ اسی طرح حق ہے جیسے تم باتیں کیا کرتے ہو۔) یہ سن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، میں نے دیکھا کہ اس کا سینہ شوق کے مارے اٹھ بیٹھ رہا تھا، پھر وہ منہ کے بل گر گیا اور میں نے اسے مردہ پایا۔ اصمعی کہتے ہیں کہ اسی وقت منجانب اللہ ایک ہاتف کہہ رہا تھا کہ جو یہ چاہے کہ کسی اللہ کے ولی پر نماز جنازہ پڑھے تو وہ اس بدو کی نماز میں شریک ہو۔ کہتے ہیں کہ پھر ہم نے اسے غسل دیا اور اس کی تدفین کر دی۔ ایک ہفتہ بعد میں نے اسے خواب میں بڑی اچھی حالت میں اور جنت میں دیکھا تو اس سے پوچھا: ''آپ اس مقام پر کس چیز کے طفیل پہنچے؟'' (اس نے) کہا: ''آپ کی قرأت قرآن سننے کی بدولت مجھے یہ مرتبہ ملا ہے''۔ (انتہی)

ابوجہل از کعبہ برآمد، ابراہیم از بت خانہ کار بہ عنایت است باقی بہانہ [1]

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ [2]

---

1 کعبہ سے ابوجہل نکلتا ہے، بت خانے سے ابراہیم لائے جاتے ہیں۔ کام عنایت وفضل الٰہی سے بنتا ہے باقی سب بہانے ہیں۔

2 یہ محض فضل الٰہی ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اللہ بڑا فضل والا ہے۔

خاتمہ در بعضے احوال آبائے کرام واقربائے عظام کاتبِ حروف

کاتب الحروف کے آبائے کرام اور اقربائے عظام کے بعض احوال کے بیان میں۔ فقیر حقیر کمال محمد بن سید لعل بن سید بڈّ بن سید حامد بن سید چاند بن سید معروف بن سید مجد الدین بن سید عزیز اللہ بن سید شرف الدین بن سید علی بزرگ بن سید مرتضیٰ بن سید ابو المعالی بن سید ابو الفضل واسطی بن سید داؤد بن سید حسین بن سید علی بن سید ہارون بن جعفر ثانی بن امام ہادی علی نقی بن جواد محمد تقی بن امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین شہیدؓ بن علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ۔ کہتا ہے کہ اکثر بزرگوں کے احوال سلف کی کتابوں میں مسطور ہیں اور زباں زد ہیں۔ البتہ سیّد شرف الدین امروہوی ان کی بعض اولادوں اور یاران طریقت کے احوال میں صاحب ''ثمرات القدس'' نے ایسا لکھا ہے کہ سیّد شرف الدین امروہوی ملقب بہ صاحب ولایت نَوَّرَ اللّٰہُ مَضْجَعَہٗ (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے) بزرگان سادات واسطیہ میں سے ہیں۔ صاحب خوارق جلیلہ اور اہل کراماتِ عظیمہ میں تھے۔ علومِ ظاہری و باطنی دونوں میں ہی ان کے زمانے میں کوئی ان کے برابر نہ تھا۔ وہ سلطان فیروز، کہ جسے عوام الناس ہندستان کا آخری بادشاہ کہتے ہیں، کے زمانے میں اپنے والد سیّد علی بزرگ کے ہمراہ ایک کثیر جماعت کے ساتھ واسط سے ملتان کی راستے سے ہندستان آئے اور اس جگہ جہاں کہ آج امروہہ بسا ہوا ہے اقامت اختیار کی۔ کچھ زمانے بعد والد کو جماعت کے ساتھ وہیں چھوڑ کر دامن کوہ میں ساٹھ کوس

دور جا کر پہاڑ کے ایک دڑّے میں عبادتِ حق میں مشغول ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ شیخ شرف الدین پانی پتی[1] طے الارض کر کے ان کے پاس آئے اور ملاقات کی۔

جب کچھ وقت گزرا اور صحبت گرم ہوئی تو شیخ شرف الدین نے اُن سے از روئے خوش طبعی کہا: ''ہم بھوکے ہیں اور گوشت کھانے کو جی چاہتا ہے۔ گوشت آپ کے ذمّے اور روٹی ہمارے''۔ انھوں نے خادم سے کہا کہ اس ٹیلے کے پیچھے ہرنوں کا ایک گلہ کھڑا ہے ان میں سے کسی ایک ہرن سے کہنا کہ تجھے شرف الدین (صاحب ولایت) نے بلایا ہے۔ کرم فرما کہ ایک مہمان عزیز آئے ہیں۔ خادم گیا اور جو انھوں نے فرمایا تھا ہرنوں سے کہا۔ سارا گلہ ہرنوں کا حکم برداری کے لیے آیا تو خادم نے کہا سیّد صاحب نے سب کو نہیں بلکہ تم میں سے کسی ایک کو طلب کیا ہے۔ یہ سُن کر ہرنوں کا سارا ریوڑ کھڑا ہو گیا اور خود میں سے ایک کو اس کے ساتھ کر دیا۔ خادم نے اُسے آپ کے سامنے پیش کیا اور ذبح کر دیا جتنا گوشت چاہیے تھا لے لیا اور کباب تیار کیے اور آپ کی خدمت میں لا حاضر کیے پھر آپ نے شیخ شرف الدین سے کہا کہ ہماری طرف سے گوشت تو حاضر ہے آپ کے نان کہاں ہیں؟ شیخ نے ہوا میں ہاتھ بڑھایا اور چند تازہ نان لے لیے اور آپ کے سامنے رکھے۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد خادم سے کہا بچے ہوئے گوشت پوست اور ہڈیوں کو حاضر کرو۔ انھوں نے دیکھا کہ ہرن کی پہلو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔ خادم سے کہا: ''میں نے ہڈیوں کو توڑنے سے منع کیا تھا ایسا کیوں کیا اچھا اب کھڑا ہو جا اور کوئی کھپچی تلاش کر کے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھ دے''۔ خادم نے ایسا ہی کیا اس کے بعد انھوں نے اپنے پیالے سے ایک چلّو پانی لیا اور اس گوشت، پوست اور ہڈیوں پر چھڑکا اور کہا: ''قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ'' (اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا)۔ ہرن اُٹھا، سر زمین پر رکھا اور چلا گیا اور اپنے ریوڑ سے جا ملا۔ راویوں سے یہ قصّہ دوسری طرح بھی منقول ہے مگر صحیح تر یہی ہے جو کچھ لکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد ایک دن سلطان فیروز[2] اسی سرزمین میں شکار کر رہا تھا۔ اُسی ہرن کو بادشاہ کے لڑکے نے پکڑ لیا جب (ذبح کے بعد) اُس کی

---

1 شیخ شرف الدین پانی پتی معروف بہ شاہ بوعلی قلندر (جن کا مزار مبارک پانی پت میں مرجع خلائق ہے) احقر ان کے روضہ مبارک پر حاضر ہو چکا ہے۔ آپ کی وفات 9/رمضان المبارک 724ھ میں ہوئی۔

2 فیروز شاہ تغلق کا دورِ حکومت 752ھ (1325) سے 790ھ (1388) تک ہے۔

کھال اُتاری تو اُس کے پہلو میں ایک لکڑی بندھی پائی ۔ سلطان کو تعجب ہوا اور فرمایا کہ اس پہاڑ میں تلاش کرو شاید کوئی ایسا آدمی مل جائے کہ یہ حال اس سے کھلے ۔ وہ خادم جس کے سامنے یہ امر واقع ہوا تھا مل گیا اور سلطان کے سامنے حاضر کیا۔ سلطان نے اس سے اس کا سبب دریافت کیا اس نے جو دیکھا تھا سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ بیان کرتے ہیں کہ اُن کے قبیلے میں ان کی آخری عمر شریف میں کوئی اہم کام پیش آیا ایک آدمی بھیجا وہ ان کے امروہہ تشریف لانے کے لیے ملتمس ہوا تو آپ نے منظور کر لیا۔ جہاں آپ رہا کرتے تھے وہاں چند سائے دار درخت تھے انھیں کے سائے میں آپ رہا کرتے تھے ۔ اس شخص کو قریب بلا کر فرمایا یہاں سے امروہہ تک کی لمبی مسافت ہے اور ہوا نہایت گرم ہے میرے پاس سواری نہیں ہے ۔ کیونکہ مجھے ان درختوں میں رہتے ہوئے مدت ہوگئی ہے اس لیے اِن سے بہت اُنس ہو گیا ہے ۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہرگز مجھ سے جدا نہ کریں گے ۔ میری زندگی اور موت کے بعد بھی میرے ساتھ رکھیں گے ۔ فوراً میرا سامان تیار کرو یہ کہا اور دیر تک سر جھکائے رہے ۔ کافی دیر کے بعد سر اُٹھایا اور کہا اُٹھو کہ امروہہ کی سرحد آگئی ۔ وہ آدمی حیران رہ گیا جب اچھی طرح نظر دوڑائی دیکھا کہ وہی بات ہے جو آپ فرما رہے ہیں ۔ اس کے بعد وہاں سے اُٹھ کر چلے اور اپنے لوگوں میں آئے اور ایک دن اُن کے ساتھ رہے ۔ دوسرے دن اپنے لوگوں کو بلا کر فرمایا کہ ان درختوں کو اسی جگہ چھوڑے جاتا ہوں، اس وجہ سے کہ ہم اسی سرزمین میں دفن ہوں گے ۔ جب میرا آخر وقت پہنچ جائے تو تمھیں چاہیے کہ یہاں لا کر دفن کر دو ۔ ان کی وفات کے بعد ایسا ہی کیا گیا ۔ ان کی تاریخ وفات 7 ربیع الاول 783ھ ہے [1] مخدوم صاحب ولایت کی تاریخ وفات ایک معتبر شخص سے بھی سننے میں آئی جو کہ صاحب ''ثمرات القدس'' کے موافق پڑتی ہے۔

قدم مردانہ فوق لامکاں زد [2]

---

1 مؤرخ امروہہ محمود احمد عباسی نے مولوی سید اعجاز حسن کے حوالے سے آپ کی تاریخ وفات کا سن 739ھ (1339) لکھا ہے۔

2 یہ تاریخ از روئے تحقیق غلط ہے ۔ یہ مکمل تاریخی قطعہ آپ کے پوتے سید اشرف جہاں گیر کی وفات پر ان کے کسی عقیدت مند کا لکھا ہوا ہے ۔ سید اشرف جہاں گیر بھی ''شاہ ولایت'' کے لقب سے مشہور تھے ۔ آپ کی وفات 783ھ میں ہوئی ہے ۔ ان کا ذکر اسی کتاب میں آگے آ رہا ہے۔

وہاں ثقات لوگوں سے سنا گیا ہے کہ ان کے روضے میں بچھو بہت ہیں مگر کسی کو کوئی آزار نہیں پہنچاتے، لوگ انھیں ہاتھ میں بھی لے لیتے ہیں، لوگ انھیں جا بجا بھی لے جاتے ہیں مگر ڈنک نہیں مارتے۔ راقم الحروف وہاں کے بچھوؤں کو سنبھل بھی لایا، مگر یہاں بھی ڈنک نہ مارا۔ صاحب ''ثمرات القدس'' یہ بھی لکھتے ہیں کہ سید اعز الدین بھی سادات واسطیہ میں سے ہیں اور سید شرف الدین صاحب ولایت کے صاحب ارادت صوری و معنوی میں سے گزرے ہیں۔ جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو صاحب ولایت کے روضے کے محاذ میں انھیں دفن کیا گیا تھا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد ان کی قبر مسمار ہوگئی اور اس کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ اس زمین میں لوگوں نے مکانات بنا لیے اور پیڑ لگا لیے۔ یہاں تک کہ 970ھ (1563) میں جمن نام کے ایک نیک مرد اور ایک غیر مسلم کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ جمن امروہہ کے خواص و عوام اور حکام سبھی کے پاس گیا مگر کسی نے مدد نہ کی۔ جب سب سے مایوس ہو گیا تو صاحب ولایت کے روضے کی طرف متوجہ ہوا۔ چند راتیں وہاں گزاریں اور حد درجہ عاجزی اور نیازمندی کا اظہار کیا تو ایک رات خواب میں دیکھا کہ صاحب ولایت اس سے فرما رہے ہیں کہ جو کوئی حاجت یا مہم لے کر بلا ناغہ ہر صبح ہمارے روضے پر آئے گا حق سبحانہ اس کی حاجت پوری فرما دے گا، اور اگر تو چاہے کہ جلد اپنے مقصد کو پالے تو اٹھ اور میرے ہمراہ چل تا کہ تجھے ایسے بزرگ کی خدمت میں کہ جن کا نام سید اعز الدین ہے لے چلوں، جو میرے پڑوس میں آسودۂ خاک ہیں۔ جمّن کا بیان ہے کہ صاحب ولایت نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے روضے کے دروازے سے باہر آ گئے۔ چند قدم چلے تو ایک جگہ پہنچے جہاں باہیبت و وقار ایک نورانی بزرگ چبوترے کے اوپر کھڑے تھے۔ جب آپ کو دیکھا تو (وہ بزرگ) چبوترے سے اتر کر نیچے آئے، ہمیں پہچان لیا اور ہمیں اس چبوترے کے اوپر لے گئے اور دونوں بزرگ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر دونوں بزرگ مراقب ہوئے، اس کے بعد صاحب ولایت نے سر اٹھایا اور مجھے پاس بلایا اور سید اعز الدین کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا۔ اس آدمی نے ایک ظالم کی بہت تکلیف برداشت کی ہے اور ابھی تک تکلیف اٹھا رہا ہے، چاہیے کہ اپنی توجہ اس سے اٹھا نہ رکھیں کہ یہ کام آپ کے حوالے ہے۔ یہ کہا اور مجھے ان کے پاس چھوڑ کر خود اپنے روضے میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سید اعز الدین نے میرے احوال دریافت کیے، میں نے اپنے سارے احوال

تفصیل سے عرض کر دیے۔ جب سب احوال سن چکے تو ایک جماعت جو ان کے پاس رہتی تھی ان میں سے کسی سے فرمایا کہ جاؤ اس شخص کو لاؤ جس نے اس پر ظلم کیا ہے۔ وہ شخص گیا اور اس کو لا حاضر کیا۔ مجھ سے کہا کہ اٹھ، اس کے پاس جا کر بیٹھ اور تیرا جو دعویٰ ہے اسے پیش کر۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور جو گزرا تھا اس کو بیان کر دیا۔ اس شخص نے بھی اپنی بات میرے مقابلے میں کہی۔ آپ نے اس کی بات رد کرتے ہوئے کہا: ''کیوں اس پر ظلم کرتا ہے؟ اپنے ظلم سے باز آجا''۔ وہ ظالم جو کہ بر سر عناد تھا بالکل حق ماننے کو تیار نہ ہوا۔ اس کا مقدمہ لمبا پڑ گیا تو آپ نے مجھے بلایا اور میرے ہاتھ میں شمشیر دے کر کہا: ''اس ظالم کی گردن قلم کر دے''۔ میں نے اس کی گردن کاٹ ڈالی، آپ نے مسکرا کر شمشیر میرے ہاتھ سے لے لی اور کہا: ''جا اس ظالم کے شر سے اللہ تعالیٰ نے تجھے آزاد کر دیا، لیکن چاہیے کہ کل علی الصباح تو اس سرزمین پر آنا اور اس چبوترے پر سے تھوڑی سی مٹی کھودنا، ایک قبر ظاہر ہوگی، وہ میری قبر ہے اس کی مرمت کرنا، اسی زاویے میں اپنے لیے بھی جگہ درست کر لینا، جو مشکل تجھے اور ساری مخلوق کو پیش آئے تو میری طرف توجہ کرنا، مجھے تیرے حال کی خبر ہو جائے گی، پھر اس مشکل کے حل کے لیے میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ کروں گا''۔ (یہ کہہ کر) مجھے رخصت کر دیا۔ جب میں خواب سے جاگا تو میں اپنے واقعے سے حیران تھا کہ ناگاہ ایک شخص دروازے سے داخل ہوا اور بولا: ''خوش ہو جاؤ کہ فلاں شخص جو تم پر ظلم کیا کرتا تھا آج رات چوروں نے اس کو قتل کر دیا''۔ میں نے یقین سے جان لیا کہ جس شمشیر کو رات خواب میں، میں نے اس پر چلایا تھا وہ اسی سے مر گیا ہے۔ میں اٹھا اور صاحب ولایت کے روضے کی طرف چلا، جب میں وہاں اس زمین کی شناخت کے لیے پہنچا جس کا رات مجھے نشان بتایا تھا، میں نے اس جگہ کی ان کے روضے کے اطراف میں شناخت کر لی۔ میں نے پھاوڑہ اٹھایا اور تھوڑی سی مٹی اس چبوترے سے اٹھائی، ایک قبر ظاہر ہوئی، اس کے بعد میں نے اس جگہ کو پاک وصاف کیا، اس قبر کو ٹھیک کیا اور اپنے لیے وہاں ایک گوشہ مقرر کر لیا۔ اب جیسا انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا میں اپنی اور مخلوق کی حاجات کے سلسلے میں ویسا ہی عمل درآمد کرتا ہوں۔ جب بھی مجھے یا مخلوق خدا میں سے کسی کو کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے میں آپ کی روح پُرفتوح کی جانب توجہ کرتا ہوں، ان کی روح مجھ پر ظاہر ہوتی ہے اور ان مشکلات کا حل کرتی ہے۔ ہر ایک کے مقصد دلی اور مطلب اعلیٰ کو مجھ پر

ظاہر کرتی ہے پھر میں ان لوگوں سے کہتا ہوں۔ روایت ہے کہ جُمّن نام کا یہ شخص اکبر بادشاہ کی حکومت کے زمانے تک زندہ تھا۔ آخرکار 990ھ (1583) میں اس دنیا سے اٹھ گیا اور ان کی قبر کے جوار میں دفن ہوا۔ ''ثمرات القدس'' میں ہی ہے کہ قاضی عبداللطیف امروہوی بھی ملک واسط سے امروہہ آئے تھے، وہاں کے قضاۃ میں سب سے بڑے قاضی اور اپنے زمانے کے علمائے فحول میں سے تھے۔ جب ہندوستان پہنچے تو منصب قضا سے دست بردار ہو گئے اور حق تعالیٰ کی عبادت کی جانب متوجہ ہوئے اور مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ کہتے ہیں کہ جب ان کا وقت آخر پہنچا تو کفن چور کو جو کہ امروہہ میں مشہور تھا بلایا اور اپنے کفن کی قیمت کے برابر رقم اس کو دے کر کہا: ''دیکھ میری قبر کے پاس ہرگز چکر مت لگانا''۔ اس نے یہ بات قبول کر لی۔ جب ان کی وفات ہوگئی اور ان کی تدفین ہو چکی تو اس کفن چور کے لالچ نے سر ابھارا اور اپنا وعدہ بھلا دیا۔ وہ گیا اور اس نے ان کی قبر کھودی، اور جب کفن چرانے کے لیے ہاتھ اندر بڑھایا تو انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس بے چارے نے ہیبت میں فوراً جان دے دی۔ صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ تو قبر کے اندر ہے اور خود باہر مردہ پڑا ہے۔ ہر چند کوشش کی کہ اس کا ہاتھ نکال لیں لیکن نہ کر سکے۔ یہ خبر سید شرف الدین (جہاں گیر)، کہ ان کا ذکر ''ثمرات القدس'' میں ہے جو انشاء اللہ آگے آئے گا، کو پہنچی تو انھوں نے قبر پر کھڑے ہو کر کہا: ''قاضی صاحب کے لیے زیبا نہیں کہ عوام الناس پر خود کو ظاہر کریں، کیونکہ یہ اس راہ میں پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ یہ کہنا تھا کہ قاضی صاحب نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ حضرت قاضی عبداللطیف رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے دیکھا کہ فرما رہے ہیں: ''اس کفن چور کو میرے قریب دفن کر دیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے''۔ اور فرمایا: ''جو کوئی بھی میری زیارت کو آئے پہلے اس کی قبر کی زیارت کرے''۔ اب اس کی قبر ان کی پائنتی ہے۔ (انتہیٰ) ''ثمرات القدس'' میں ہی بیان کرتے ہیں کہ سید شرف الدین امروہوی، جن کا لقب جہانگیر ہے، وہ صاحب ولایت سید شرف الدین کے پوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سید شرف الدین صاحب ولایت کو ان کے والد محترم سید امیر علی نے خواب میں دیکھا کہ ان سے فرما رہے ہیں: ''حق سبحانہ وتعالیٰ تجھے ایک بیٹا دے گا کہ دنیا اس پر فخر کرے گی، جب پیدا ہو تو اس کا نام شرف الدین رکھنا اور جہانگیر لقب دینا''۔ روایت ہے کہ جب وہ حد تمیز کو پہنچے تو اپنے والد امیر علی سے بیعت ہوئے۔

ان سے اجازت لے کر دہلی آئے۔ وہاں علوم دینی کو بہت محنت اور لگن سے پڑھا اور خود کو سخت محنت میں ڈالا۔ چنانچہ چھٹی کے دن اپنے لیے روٹی کی ایک بہت بڑی ٹکیہ پکا کر اور چھری سے کاٹ کر لقمہ لقمہ (ٹکڑے ٹکڑے) کر کے ایک طباق میں رکھ دیتے تھے۔ علی الصباح جب درس کے لیے جاتے تو ایک ٹکڑے کو کھا کر پانی پی لیتے۔ اُن دنوں میں جو بھی خط ماں باپ یا رشتہ داروں کا آتا اسے بغیر پڑھے ایک گھڑے میں ڈال دیتے۔ اس طرح تھوڑی سی ہی مدت میں اپنے زمانہ پر علم میں فائق ہو گئے۔ جب تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو ان کے والد جو کہ قاضی تھے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بادشاہ وقت کو جب اس کی خبر ہوئی تو دریافت کیا: ''کیا ان کا کوئی خلف بھی ہے؟'' کہا: دو بیٹے ہیں؛ ایک تو اسی شہر دہلی میں ہیں ابھی ابھی تحصیل علوم سے فارغ ہوئے ہیں اور ان کے کمالات کی بہت تعریف کی'۔ بادشاہ نے انھیں اپنے حضور میں طلب کیا اور ان کے والد کی وفات کی خبر سنائی۔ انھوں نے آیت کریمہ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ'' پڑھی۔ بادشاہ نے کہا: ''آپ اپنے والد محترم کی جگہ بیٹھا کریں کہ آپ کو میں اس مقام کے لائق پاتا ہوں''۔ انھوں نے اس منصب سے انکار کیا، مگر بادشاہ نہ مانا، خلعت منگائی، بڑی مشکل سے انھیں پہنوائی اور منصب قضا اور زمین کا فرمان ان کے سپرد کیا۔ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' (اللہ اور اللہ کے رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کرو) کے پیش نظر قبول کر لیا اور دربار سے باہر آ کر خلعت اور فرمان خادم کو دے کر امروہہ کی راہ لی۔ جب دو تین منزل نکل چکے تو ان کے بھائی سید محمود[1] راستے میں ملے۔ ان سے معلوم کیا: ''کہاں جا رہے ہیں؟'' بھائی نے کہا: ''دہلی جا رہا ہوں تا کہ والد کی چھوڑی ہوئی ملکیت اور باغ کا فرمان لے کر آؤں کہ کسی کا اس میں دخل نہ رہے''۔ انھوں نے خادم سے کہا: وہ فرمان اور خلعت بھائی کو پیش کر اور کہا کہ اگر اس کے لیے

---

1 مؤرخ امروہہ محمود احمد عباسی کی تحقیق ہے کہ ''ثمرات القدس من شجرات الانس'' اور ''اسراریہ کشف صوفیہ'' کے نیشنل میوزیم کے نسخہ میں سید محمود کا نام نہیں ہے۔ بلکہ امروہہ کے ایک مؤرخ جناب عبدالرحیم برتر نے نیشنل میوزیم والے نسخہ میں ''برادر'' کے بعد ''سید محمود'' کا اضافہ کیا اور ان سے اپنا شجرۂ نسب جوڑ دیا۔ سید شرف الدین جہانگیر کے بھائی کا نام سید محمود نہیں ''سید تاج الدین'' ہے۔ لیکن ندوۃ العلماء لکھنؤ اور رضا لائبریری رامپور کے نسخوں میں سید محمود کا نام موجود ہے۔

جاتے ہوتو یہ حاضر ہے لیجیے۔ بھائی نے کہا: ''مجھے تمھارے لائے ہوئے فرمان اور خلعت کی ضرورت نہیں، میں خود جاتا ہوں۔فرمان اور خلعت لے کر آتا ہوں''۔انھوں نے کہا:''اب ایسا نہ ہو سکے گا، باقی آپ کی مرضی جاتے ہیں تو جائیں''۔ یہ کہا اور روانہ ہوئے۔ بھائی دہلی کی جانب روانہ ہوئے اور ادھر یہ امروہہ آگئے۔ چند دن وہاں رہے اور اس فرمان وخلعت کو کسی کے سپرد کر کے کہا: مجھے یقین ہے کہ بھائی نامراد واپس ہوں گے، جب یہاں پہنچیں تو اس امانت کو ان کے سپرد کر کے کہنا کہ آباء واجداد کا مرتبہ صفائی رکھتا ہے، کدورت کو اس میں جگہ نہ دیں''۔ یہ کہا اور خود جہاں ان کے دادا میاں بزرگ بسر کرتے تھے عبادت کے لیے پہاڑ پر چلے گئے اور مشغول عبادت ہو گئے۔ جب ان کے بھائی سید محمود دہلی پہنچے کسی نے ان کا اعتبار نہ کیا لوٹ کر امروہہ آئے اور اسی فرمان وخلعت کو لے کر والد کی جگہ پر بیٹھ گئے اور کار قضا میں مشغول ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ جب سید شرف الدین جہانگیر پہاڑ پر چلے گئے اور عبادت میں مشغول ہو گئے صرف ایک غلام ان کے پاس رہا کرتا تھا۔ ایک بار عید کی رات کو غلام کے دل میں آیا۔''آہ کل امروہہ میں عید گاہ پر مخلوق جمع ہوگی اور آپس میں مصافحہ کرے گی''۔ انھوں نے غلام کی خواہش کو نور باطن سے سمجھ لیا اور غلام سے کہا۔ آج رات ہمارے حجرے میں سونا تا کہ کل عید اور عید گاہ کا تماشہ دیکھیں۔ اس نے ویسا ہی کیا۔ جب سو کر اٹھا تو خود کو امروہہ میں دیکھا۔ تعجب سے قدم آگے بڑھایا دیکھا خلق کثیر عید گاہ کی طرف جارہی ہے۔ اس کے آشنا لوگ سامنے آئے ان کے ساتھ عید گاہ گیا، نماز پڑھی اور مصافحہ کیا اور پھر ان کے ہمراہ امروہہ واپس آ گیا۔ جب رات کو سویا اور صبح کو نیند سے جاگا پھر خود کو آپ کی خدمت میں پایا۔ اس واپس آنے سے اور بھی حیرت زدہ ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب پہنچا پہاڑ سے امروہہ آگئے اور تمام یاروں رشتہ داروں اور اقرباء کو جمع کر کے کہا۔ اب میں اس عالم سے چلا جاؤں گا۔ چاہیے کہ تجہیز وتکفین اور بعد نماز جنازہ مجھے بزرگوں اور پدر نامدار کے پہلو میں دفن کر دیں۔ سونے کی جگہ آئے، سر تکیے پر رکھا اور داہنہ ہاتھ رخسار کے نیچے رکھا قبلہ رو ہو کر ''اللہ'' کہا اور واصلِ حق ہو گئے۔ آپ کی وفات 6/ربیع الاوّل 783ھ (30/مئی 1381) کو ہوئی۔ ''ثمرات القدس'' میں ہے کہ سید محمود دودھ دھاری صاحب ولایت شیخ شرف الدین کی اولاد میں ہیں۔ وہ کھانے سے ہاتھ کھینچے رکھتے تھے صرف تھوڑا سا دودھ ان کے لیے کفایت کرتا تھا۔ دودھ دھاری کا

مطلب یہ ہے کہ جس کی خوراک دودھ ہو۔ کہتے ہیں کہ وہ خوفناک جنگلوں اور پہاڑوں میں کہ جہاں کبھی آدم زاد کے قدم بھی نہ پہنچے ہوں اپنی عمر اللہ تعالیٰ عز اسمہٗ کی عبادت میں گزارتے تھے۔ شیر چیتے ان سے مانوس ہو گئے تھے کبھی کبھی ان پر سوار ہو کر شہر میں آتے تھے۔ایک دن ان کا ایک مرید کسی سے کہنے لگا کہ میرے پیر کبھی کبھی شیر کی سواری کرتے ہیں اور سانپ کی چچی بناتے ہیں۔اس شخص نے کہا تیرا عقیدہ اپنے پیر کی نسبت ایسا ہی ہے مگر ہم لوگ جب تک اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں تیری بات کو باور نہ کریں گے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ شہر میں غوغائے عظیم مچ گیا لوگ کہہ رہے تھے کہ میر سید محمود شیر پر سوار ہو کر اور سانپ کو تازیانہ بنائے ہوئے شہر میں آ گئے ہیں۔ ذرا سی دیر نہ گزری تھی کہ اپنے اس مرید اور اس شخص کے روبرو پہنچ گئے۔اس کی جانب رخ کر کے فرمایا کہ شیر کو اپنا مطیع کرنا اور سانپ کو ہاتھ کا کوڑا بنانا کچھ کام نہیں ہے۔کام تو اس سے بالاتر ہے۔ چونکہ میرے اس فرزند (روحانی) نے تجھ سے بحث کی۔اب اگر میں اس ہیئت میں نہ آتا تو، تو کرامات اولیاء کا منکر ہو جاتا اور یہ انکار آدمی کو کفر و زندقے میں گرا دیتا ہے، میں نے نہ چاہا کہ تو کفر و زندقے میں پڑے، یہ کہا اور واپس چلے گئے۔(انتہیٰ کلامہٗ) پوشیدہ نہ رہے کہ ''ثمرات القدس'' میں جو کچھ تحریر ہوا میرے والد اس سے بھی زیادہ سنایا کرتے تھے۔صاحب ولایت ان کی اولاد اور ان کے اصحاب کے احوال لکھے جا چکے۔سادات امروہہ اس سے بھی اور زیادہ واقعات نقل کرتے ہیں۔لیکن یہاں ان ہی پر اکتفا کیا گیا۔میرے والد یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ صاحب ولایت کے دو بیٹے تھے۔سید امیر علی اور سید عزیز اللہ۔ان دونوں بزرگوں کی اولاد میں امروہہ، سنبھل اور دوسری جگہوں پر بڑے بڑے مشہور مردان خدا اور اہل کار درویش پیدا ہوئے جیسا کہ ظاہر ہے۔میرے والد یہی فرماتے تھے کہ سید چاند بن سید معروف بن سید مجد الدین بن سید عزیز الدین بن صاحب ولایت، امروہہ کے مضافات میں قریۂ بود پور (بھوج پور) میں سکونت رکھتے تھے۔ بڑے نیک معاملت اور صاحب استقامت اور لائق کار درویش تھے۔ایک بار شیخ عمر شہ سنبھلی کی ان سے ملاقات ہوئی۔سنبھل میں فتح شہ اور عمر شہ نام کے دو بھائی گزرے ہیں۔ دونوں ہی صاحب جاہ و مرتبہ عالم فاضل بزرگ اور اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے۔ ملاقات کے آخر میں عمر شہ نے سید چاند سے کہا: ''آپ سنبھل شہر میں آ کر کیوں نہیں اقامت گزیں

ہو جاتے ، میری صرف ایک دختر ہے اسے آپ کے فرزند سید حامد کے نکاح میں دے دوں گا۔ سید چاند نے یہ بات قبول کر لی اور سنبھل آ گئے ، اور بی بی خدیجہ، عمر شہ کی بیٹی سید حامد کے نکاح میں آ گئیں۔ اس طرح حویلی باغ اور ساری ملکیت ان بی بی کے نام ہوگئی۔ آج اس باغ میں، جو کہ ''چندن پٹی'' کے نام سے مشہور ہے، صرف آم کے چند درخت بچے ہیں۔ وہ حویلی بھی ''سید واڑہ'' ہے۔ سید چاند کے دو بیٹے تھے۔ ایک تو وہی سید حامد جو میرے والد کے دادا ہیں دوسرے سید اکرم۔ سید اکرم کے بھی دو لڑکے تھے ایک سید امجد جو سید فیروز کے والد تھے دوسرے اشرف جو سید شاہ محمد کے پدر ہیں۔ یہ تمام کے تمام بزرگان دین گزرے ہیں صفات حمیدہ سے متصف اور اخلاق حمیدہ کے حامل جیسا کہ ان میں کے بعض حضرات کے احوال کا تذکرہ ان کے موقع پر لکھا جا چکا ہے۔ سید حامد کا ایک بیٹا زندہ ہے۔ سید بدھ جو کہ میرے جدّ پدری ہیں اور اکبر بادشاہ کے دربار میں منصب دار تھے معزز روشناس بادشاہ تھے چنانچہ ایک دن وہ بادشاہ کے حضور میں کھڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے چمڑے کے بنے پانی کے حوض سے جو کہ سفر میں ساتھ رہتا تھا اپنے ہاتھ سے ڈولچہ لے کر وضو کے لیے نمازیوں کے لوٹوں میں بھرا ڈولچہ سید بدھ کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ سید بدھ جس نمازی کو بھی پانی چاہیے، دیں۔ بادشاہ یہ کہہ کر خیمے میں تیار شدہ مسجد میں جا کر مصلے پر بیٹھ گیا۔ اور سید بدھ جماعت کی تکبیر ہونے تک نمازیوں کو پانی دیتے رہے۔ جب تکبیر ہوئی نماز میں حاضر ہو گئے۔ میرے والد یہ بھی فرماتے تھے کہ میرے والد سید بدھ نے بہت سے درویش اور صاحب کمال حضرات کی صحبت اٹھائی تھی اس گروہ صوفیہ کی محبت ان کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ جس وقت وہ مشرقی ہندستان میں تھے شیخ احمد برہی سے انھیں ربط اور اخلاص و محبت ہو گیا تھا۔ سنبھل کی واپسی کے وقت شیخ احمد کو مع ان کی اہلیہ بی بی پھول کے سنبھل اپنے ساتھ لائے اور اپنے مکان میں انھیں بسایا۔ وہ کچھ زمانے یہاں رہے۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ میں اس زمانے میں بارہ سال کا تھا۔ مجھے چیچک کے آبلے نکل آئے تھے۔ میرے والد مجھے شیخ احمد کے سامنے لائے۔ انھوں نے تھوڑی سی راکھ دعا پڑھ کر میرے تمام بدن پر ملی۔ اس کے ملنے سے میں بہت جلد ٹھیک ہو گیا۔ میرے والد نے راکھ کا ایک بڑا پیالہ ان سے دعا پڑھوا کر رکھ لیا تھا۔ جب تک وہ راکھ باقی رہی اس سے بہت سے صاحب چیچک اچھے ہوئے۔ پھر جب سید بدھ اکبر آباد گئے، شیخ احمد کو بھی اپنے

ساتھ لے گئے۔ایک دن بادشاہ کی ہمراہی میں تمام سردار اور لشکری ہمراہ تھے۔ راستے میں ایک گرجتا ہوا ڈراؤنا بادل آیا اور چاروں طرف چھا گیا۔ سید بدھ نے شیخ احمد سے کہا۔ اے شیخ ہم چالیس پچاس نفر ہیں راستے میں کوئی جاہ پناہ نظر نہیں آتی اور بارانی (برساتی) ساتھ نہیں اب کیا ہوگا۔انھوں نے کہا غم مت کرو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ اور ایک ٹیلے پر سب کو لیجا کر کھڑا کر لیا اور ہر ایک کو اسمائے الٰہیہ میں سے ایک اسم مبارک الگ الگ پڑھنے کو کہا۔ سب نے پڑھنا شروع کیا۔ جب بارش ہونے لگی ٹیلے پر کھڑے ہوؤں پر ایک قطرہ نہ پڑا اور ٹیلے کے نیچے اور ادھر ادھر ہر جگہ بہت زیادہ پانی برسا دھارے بہہ گئے۔ جب بارش رکی سب لوگ سفر پر روانہ ہوئے سب کے کپڑے سوکھے ہوئے اور پاک وصاف تھے۔ اس راستے کے آنے جانے والے ان کا حال دیکھ کر تعجب کرتے تھے۔ یہ تصرف شیخ احمد کا تھا۔ فصیح ہندی میں شیخ احمد کے بہت سے اشعار ہیں جو معانی وحقائق سے پُر ہیں۔ نظم ''رنگ ریکھا'' بہت خوب ہے۔ میرے دادا کی بیاض میں جو کہ اب بھی میرے پاس ہے اس میں یہ نظم موجود ہے۔ اسی بیاض میں ان کے دوہرے بھی ہیں۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ چند دوہرے خود شیخ احمد کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ آخری عمر میں شیخ احمد کو سفر مکہ کا شوق غالب ہوا اور اپنی اہلیہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جب کشتی میں بیٹھے تو یہ سورٹھا کہا اور مکہ روانہ ہوئے۔ وِے جَن رَہے اُوَ اُرجن سَر بھاری بھار نہ احمد اتر پار بھا جھونکے سب بھار موں[1] زین خاں جوان کے مخلص اور ان کے محب تھے انھوں ان کے دونوں فرزندوں عبدالسلام اور عبدالرحمٰن کو اپنے پاس رکھا خان موصوف نے ان کی صحبت اٹھائی تھی اور سفر بھی ساتھ کیے تھے۔ دونوں بھائیوں کی یہ بھی روایت بیان کرتے ہیں کہ ایک دن وہ دونوں بے تکلفانہ بزرگوں کے مقابر کی میر کو اپنے والد کے ہم راہ نکلے۔ راستے میں جب ایک کنوئیں پر پہنچے دیکھا حسین جمیل عورتیں پانی کھینچ رہی ہیں۔ یہ دونوں کنوئیں کے کنارے ان کا تماشہ دیکھنے لگے تو شیخ احمد نے سرخوشی کی راہ سے اس وقت ہندی کا یہ شعر کہا:

احمد کوا کی پان راہ بدہنا کہن بکاے — کہن کہن نیر پلپھارتی ترہت لاگت پاے
بھُو نہ گوٹ اور مانگ مکھ احمد نین سراے — آنسوں چھرکت جک کے پی پی لبے نہ آئے

---

1 وہ لوگ اس کنارے ہی رہ گئے جن کے سر پر بھاری بوجھ تھے۔ احمد پار اتر گیا سب کچھ بھاڑ میں جھونک کر۔

ذکھ کنجن پر آنسونک احمد درسکی چاو   برہن بھی جرا دہی جراد جراد
احمد برج پر ہیں دادی لادت لوں   بے مرون ہوں پی کی بے پی کہے سوکوں
احمد نکہ سکہ پے بنی روم روم تن مانہ   ہوں ناتھ بوں ناہ ری ہوں ماہیں ہو مانہ

جب شیخ احمد حرمین شریفین کی زیارت سے فارغ ہو گئے تو وہیں مکّے میں 990ھ (1583) میں دنیا سے چلے گئے اور مکّے ہی میں دفن ہوئے۔ زین خاں اور سید بدہ نے جب سنا تو بڑا غم کھایا اور آہ و زاری کی۔ زین خاں مالدار آدمی تھے ان کے ایصالِ ثواب کے لیے خوب خیرات کی۔ چنانچہ ہر ایک شیخ، بزرگ اور فقیر کو جو اکبر آباد میں تھے ایک ایک بکری اور ایک ایک من آٹا مع نمک مرچ وغیرہ دیا تا کہ اپنے اپنے متعلقین کو کھلائیں ایک بار میرے دادا پسرِ صالح کی تمنا لے کر خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ کی زیارت کے لیے اجمیر گئے۔ قبرِ مبارک کو بوسہ دیتے وقت لعل پھول ان کے دامن میں آ گرا۔ انھوں نے اپنے دل میں نیت کی کہ لڑکا نصیب ہوا تو اس کا لعل نام رکھوں گا، مدّت مقررہ گزر جانے کے بعد میرے والد پیدا ہوئے۔ اپنی نیت کے موافق ان کا نام لعل رکھا اور جو نظر مانی تھی، ادا کی۔ آخیر میں میرے دادا بادشاہ سے رخصت لے کر اپنی جاگیر پر جالندھر چلے گئے۔ وہیں بیمار پڑے اور 13 یا 14 شعبان 990ھ (21 راگست 1583) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی قبر اسی جگہ ہے۔ 14 شعبان زیادہ درست ہے، کیونکہ میرے والد شب برأت کو بہت کھانا تیار کرایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آج کا دن میرے والد کی وفات کا دن ہے اور اس رات کو بہت سے صلحا اور فقرا کو دسترخوان پر مدعو کرتے تھے۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ میرے والد محترم کی وفات کے بعد میرے بڑے بھائی، جن کا نام سید پسر تھا، کو لے جا کر اکبر بادشاہ کے حضور کھڑا کر دیا۔ وہ نہایت وجیہ تھے اور دراز قد بہادر اور طاقت ور بھی۔ بادشاہ کو پسند آ گئے اور کہا ایسے نوجوان کو پہلے سے میرے پاس کیوں نہ لائے اور ان کی بہت قدر کی۔ جب کافی دیر تک کھڑے رہے تو ناز پروردہ ہونے کی وجہ سے تنگ آ گئے اور وہاں سے واپس سنبھل آ گئے۔ پھر سنبھل سے کلھوائی چلے گئے اور وہیں 990ھ میں انتقال ہو گیا۔ اس خبر کو سن کر ان کی بیوی جو کہ سید امجد کی بیٹی تھی چھ مہینے تک سر جھکائے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی اور کوئی سانس نہ نکالا، اسی

حال میں دنیا سے چل بسیں۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ میرے دو اور بھائی جوان دنیا سے اٹھ چکے ہیں سید شاہ محمد اور سید عثمان۔ ان کے علاوہ میرے اور بھی بہت سے بزرگان خاندان اور رشتہ دار جیسے سید قاسم، سید جوگی، سید معروف وغیرہ، کہ سنبھل جن کا وطن تھا، نیک پاکباز حضرات گزرے ہیں۔ اس وقت ان کے حالات تفصیل کے ساتھ ذہن میں نہیں ہیں مگر مجملاً جو کچھ یہاں لکھ دیا گیا۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ میرے والد بزرگوار سید لعل کی تاریخ پیدائش ماہِ رجب المرجب 976ھ (1569) ہے۔ وہ مادرزاد ہی صالح پیدا ہوئے اور بچپن سے ہی آثار ہدایت وسعادت، سلامتی اور استقامت ان سے ظاہر تھے۔ خلق و مروت اور فتوت ذاتی سے متصف تھے۔ حلم و تواضع، جیسی کہ ان کی سنی اور دیکھی گئی کم ہی کسی میں دیکھی اور سنی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک بار اپنے پڑوسیوں سے بڑی سخت جفائیں اور سختیاں اور غلیظ قسم کی گالیاں انھوں نے دیکھیں مگر سب کو معاف کر کے شام کو جفا کاروں کے گھر کھانا بھجوایا ایسا کئی جگہ اور کئی بار وقوع پذیر ہوا۔

بدی را بدی سہل باشد سزا   اگر مردی اَحسِن اِلیٰ مَنْ اَسَاء[1]

میرے والد شروع میں شیخ مرتضیٰ خاں کے اس کے بعد مرتضیٰ خاں کے بھانجے شیخ سلیم کے اور پھر سید بہوہ بخاری کے لشکری رہے۔ اپنے مقررہ وظیفے کے علاوہ انعام وغیرہ سے سروکار نہ رکھتے تھے۔ ہمیشہ ان کا اٹھنا بیٹھنا اس راہ جذب وسلوک کے مردان راہ جیسے ابا بکر سنبھلی، شیخ عبدالوہاب، سراج الدین لونی (جن کا ذکر گزر چکا) سے رہتا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی جو مردان خدا گزرے ہیں ان کی بھی صحبت میسر رہی ہے۔ چونکہ آپ کی پیدائش اور وفات ماہ رجب میں ہوئی ہیں، اس لیے اس مہینے کی ساری تنخواہ میں ایک فلس (پیسہ) بھی اپنی ذاتی ضرورتوں میں صرف نہ فرماتے تھے، بلکہ سب کا سب راہِ خدا اور صلہ رحمی میں بانٹ دیتے تھے۔ ہر علاقے کے درویش حضرات جب ان کے پاس جاتے تو کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے ابا اماں کے گھر جا رہے ہیں۔ بچپن سے آخر حیات تک وہ جن عارفان باللہ اور فقرا سے ملے یا ان کی صحبت اٹھائی مجھ سے بیان کیا کرتے تھے،

1 برائی کا بدلہ برائی سے دینا (اور بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دینا) تو آسان ہے، اگر تو مردِ خدا ہے تو اس کے ساتھ بھلائی کر جو تیرے ساتھ برائی سے پیش آتا ہے۔

اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔ان میں سے خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی صحبت اکسیر آسا (مانند اکسیر) تھی جیسا کہ شیخ ابا بکر کے ذکر میں گزرا۔شیخ تاج الدین سنبھلی کی صحبت کی خاطر آپ نے سنبھل سے دہلی کا سفر کیا۔ پہلے دن شیخ تاج الدین نے فرمایا: ''اس نوجوان سے خوب صلاحیت جھلکتی ہے''۔ پھر ان کے احوال دریافت فرمائے۔ انھوں نے بڑی خاکساری اور نیازمندی کے ساتھ اپنی حقیقت حال کہہ دی۔ شیخ نے بہت مہربانی فرمائی اور ہر روز کھانے کے دسترخوان پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے درویش حضرات سے جن کا ذکر اس کتاب میں گزرا ملاقات اور صحبت رہی ہے۔ شیخ قطب عالم کے ذکر میں آچکا کہ درویشوں کی صحبت سے جو آپ نے حاصل کیا اگر اس کا ذکر تحریر میں آئے تو اس کی تفصیل میں کتاب بہت ضخیم ہو جائے گی۔ان سب میں سے سید محمد سنبھلی کو بہت یاد کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہ راہ محبت میں سچے اور صاحب ذوق ولطافت تھے، جو بھی ان کو دیکھتا معتقد ہو جاتا تھا۔ایک دن یاران طریقت میں سے کسی نے ان سے کہا: ''سیّدی میری تمنا ہے کہ کوئی اللہ والے مرنے کے بعد کے احوال جوان پر گزریں مجھے بتلائیں اور میری اس دیرینہ خواہش کو پوری کریں''۔ انھوں نے کہا: ''جب میں دنیا سے جاؤں گا تو انشاء اللہ سبحانہ وتعالیٰ خواب میں تیری بات کا جواب دوں گا''۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو ان کا وہ مصاحب اس بات کے جواب کا انتظار لے کر سوگیا۔ سیّد صاحب کو خواب میں دیکھا اور وہ سوال دریافت کیا۔انھوں نے کہا: ''بیٹے وہاں کی کیفیت کہنے میں نہیں آتی، جب تو وہاں پہنچے گا تو خود دیکھ لے گا، یہی جواب ہے''۔ان دنوں جبکہ میری والدہ دنیا سے گزری تھیں میرے والد دہلی سے اکبرآباد روانہ ہو گئے تھے۔ جب لاہور پہنچے تو وہاں شیخ ابراہیم سے ملاقات کی۔ وہ میرے والد کے طریقۂ نسبت، صلاحیت اور دوسری کیفیات سے واقف ہوئے تو ملاقات میں بہت سرگرمی دکھائی اور رات کو پیغام بھیجا کہ میری ایک نیک دختر ہے اس کو اپنی زوجیت میں قبول کرلیں۔ میں نسبا آل موسیٰ کی قوم سے ہوں۔ میرے والد اس بات کو تقدیر پر موقوف رکھ کر وہاں سے روانہ ہوئے، آخرالامر یہ معاملہ میری والدہ کی خالہ کی بیٹی سے ظہور پذیر ہوا کیونکہ ان سے قرابت قریبہ رہی ہے۔ میرے والد فرماتے تھے کہ شیخ ابراہیم خوش اخلاق

اور نیک معاملت بزرگ آدمی تھے۔اس کے بعد میں نے شیخ کی اسی قصبہ میں صحبت اختیار کی۔ قصبے کے ایک جانب نشست گاہ تھی اس میں باجمعیت گزارتے تھے۔مجھ پر ان کا بڑا لطف وکرم تھا۔آج اسی قصبے میں ایک بزرگ شکراللہ نام کے رہتے ہیں، بڑے نیک معاملت خوش طور وطریق والے۔میرے شیخ سے آشنائی ہے۔میں بھی ان سے آشنا ہوں، مدتوں انھوں نے دہلی میں وقت گزارا ہے، فی الحال اپنے مقام پر ہیں۔اپنے والد شیخ رفیع الدین بن شیخ قطب الدین بن شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی کے خلیفہ ہیں۔ان ہی سے ذکر باطن کی تلقین حاصل کی ہے اور سکون و جمعیت باطن سے خوب سیر ہوئے ہیں۔اپنے احوال مجھے سنایا کرتے ہیں اور میرے احوال معلوم کرتے رہتے ہیں، مگر میں از روئے ادب بہت کم کہتا ہوں۔جب میرے والد 63 سال کی عمر کو پہنچے، خوشاب (پنجاب) کی حدود سے سات میل دور دیا بن ملوکی قصبے کے نواح میں دوشنبہ کے روز 12 رجب المرجب 1039ھ (16 فروری 1630) میں شہید ہوئے اور اس قصبے کے جنوب میں دفن ہوئے۔ان کا کچھ ذکر سیّد اسحاق کے ذکر میں گزرا ہے۔اس حکایت کی تفصیل میں نے اپنی کتاب ''جمع الجمع'' میں لکھی ہے۔البتہ میں اس جنگ میں زخمی ہو کر گر گیا تھا۔اُن دنوں کے عجائبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پدر محترم کی شہادت سے چالیس روز بعد تک میں انھیں ہر رات بڑی شان بان اور نیک وضع میں دیکھا کرتا کہ میری تسلّی اور دل جمعی اور استفسار حال کی باتیں کیا کرتے۔اس زمانے میں مجھے سارے خواب یاد تھے۔علاوہ دوشنبہ کی رات کے زیادہ تر راتوں کے خوابوں کے میں سب کو بھول گیا۔منجملہ ان خوابوں میں سے ایک بار میں نے دیکھا کہ میرے والد ایک موضع میں ہیں۔سارا گھر ہری بھری گھاس سے مزیّن ہے، اس میں کوئی دیوار نہیں ہے۔وہ گھر کے بیچوں بیچ ایک تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں اور دوسرے تخت پر ان کے برابر میں، میں اور میرے شیخ بیٹھے ہیں۔وہ اس عالم کے عجیب وغریب حالات میرے شیخ کو سنا رہے ہیں۔جب ہم کھڑے ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں موجود تمام ساکنانِ زنان صاحب حسن لطیف ونظیف وظریف ہیں۔لباس فاخرہ میں ملبوس۔معلوم ہوا کہ وہ مقام مقامِ بہشت ہے، اور وہ عورتیں بہشت کی حوریں ہیں۔میں اُن دنوں اکثر اپنے والد کی قبر کے اردگرد پڑا رہتا تھا۔ایک

دن ایک سفید داڑھی والے بزرگ کو دیکھا کہ آئے اور نزدیک بیٹھ گئے اور کلام مجید کی ایک سورت پڑھی اور چلے گئے۔ پتا نہ چلا کہ وہ کون تھے۔ پھر میں نے مدتوں بعد 1050ھ (1641) میں قندھار کے سفر کے دوران اپنے والد کی قبر کی زیارت کی، دیکھا کہ وہاں کے لوگوں نے وہاں کی رسم کے بموجب قبر کو پتھروں کے ٹکڑوں سے آراستہ کرلیا ہے، اور جمعہ اور دوشنبہ کی رات کو اس کی چہار دیواری میں چراغ جلاتے ہیں اور زیارت کو آتے ہیں اور اس قبر سے برکت چاہتے ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ میرے شیخ نے میرے والد کی تعزیت میں یہ خط لکھ کر مجھے بھیجا تھا۔

خداست آنکہ نمردہ است، جاوداں جامی
وما سواہ خیال است و مزخرف و باطل [1]

اللہ تعالیٰ بلا پر صبر دے اور نعمتوں پر شکر کی توفیق عطا کرے۔ بلا پر صبر یہ ہے کہ بلا کو مولیٰ کی جانب سے جانے اور دیکھے اور خود کو جزع فزع سے فارغ رکھے، بلکہ بلا میں مولیٰ کی مرضی کا دیدار کرکے رضا اور انسیت کی صفت سے متصف اور متحقق ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ سب سے زیادہ بلائیں انبیاء پر آتی ہیں اس کے بعد درجہ بدرجہ اولیا پر، پھر جو اُن حضرات سے مماثلت رکھتے ہیں اُن پر۔ حضرت سیادت پناہی کا گزرنا بیشک بہت بڑی مصیبت ہے، لیکن کیا چارہ ہے۔ اب دعا سے ان کی مدد کریں کہ یہ غم واندوہ سے اچھا ہے۔ تمام امور میں جو پیش آتے ہیں دست خدا کو ملاحظہ کرکے خوش حال رہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ ہر وقت توجہ الی اللہ اور توکل علی اللہ رکھیں، اس کے بعد جو پیش آئے راضی برضا رہیں۔ ہمیشہ جناب الٰہی میں متضرع اور ملتجی رہو اور اس کے علاوہ کچھ نہ چاہو کہ حق سبحانہ اپنے کرم خاص سے محبت ماسوا سے پاک وصاف کرکے اپنی محبت میں ایسا گرفتار کرلے کہ تم میں تمھارا نام ونشان ہی نہ رہے۔ اگر دیکھو، تو اس کو

---

1 اے جامی صرف ایک اللہ کی ذات ہی جاوداں ہے، بس اسے ہی موت نہیں ورنہ جو کچھ اس کے سوا ہے مانند خیال اور باطل حق مذاق ہے۔

دیکھو، ڈھونڈو تو اس کو ڈھونڈو، اپنے راز کے جویاں رہو، ہاں مگر جس حال میں رہو اس کی کوشش رہے کہ غیر سے دل کا کوئی تعلق نہ رہے کہ اس کاروبارِ عشق کا یہی سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ جتنے اضافی کمالات و مقامات ہیں اگر وہ حاصل ہوں فبہا ورنہ چنداں ضروری نہیں کہ لامحالہ حل مشکلات کے لیے ارواح طیبات کی طرف ہی متوجہ ہوں۔ انشاء اللہ، اللہ کے کرم سے تمام دشواریاں آسان ہو جائیں گی۔ مضطرب نہ ہوں اور رشتۂ رضا کو ہاتھ سے نہ دیں۔ تمھاری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کوئی ایسی بات یا کام سرزد نہ ہو جسے شرع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے۔ جو کچھ قبر میں کام آئے گا یہی اتباع سنت ہے باقی جو کچھ بھی طریقہ آداب صوفیہ میں سے ہے اس کا طور یہ ہے کہ اگر مخالف شرع نہیں ہے تو فائدہ ہے اور اگر مخالف ہے تو نقصان ہے۔ اگر ہو سکے تو نمازِ شب یعنی تہجد میں کچھ دیر خاموش بیٹھیں اور اپنے محبوب کو حاضر خیال کر کے اسم ذات الٰہی کی جانب دل میں ذاکر رہیں اور اگر ایسا نہ کر سکیں تو یہ خیال کریں کہ محبوب کو اپنے خانۂ دل میں حاضر جانیں اور دل کے دروازے پر محبوب کے انتظار میں دل کی طرف متوجہ بیٹھے رہیں۔ اس بات کو ذکر میں بھی تصور میں رکھیں تا کہ نظر خارجِ دل نہ پڑے محبوب کو خود میں ڈھونڈیں نہ کہ بیرون میں، بلکہ جو بھی طلب کریں اپنے دل پر عرض کریں تا کہ جمعیت خاطر ہاتھ سے نہ جائے۔''

کاتب حروف (محمد کمال واسطی) کے احوال: میرے مجمل احوال یہ ہیں کہ میری ولادت مغرب کے وقت 2 / ربیع الاوّل 1011ھ (19 / اگست 1602) کو ہوئی۔ ''اعظم'' اس کی تاریخ ہے۔ اس دن آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم کے عرس کی ابتدا ہے کہ آپ کا وصال ہجرت سے گیارھویں سال میں وقوع پذیر ہوا ہے'' (11 ہجری) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وصال کہ ایک دن میرے دل میں آئی اور میں نے یہ قطعہ کہا

چوں رفت ازیں جہاں محمد گفتند جہانیانِ خدا ہُو
تاریخ وصال او بجستم گفتند ملائکہ ھُوَ ھُوْ [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سے میری پیدائش کے دن تک کم وبیش ایک ہزار سال ہوتے ہیں۔ ربیع الاوّل کی تین تاریخ کی شب میں ہی حضرت خواجہ بہاء الدین محمد نقشبندی قدس سرۂ کا وصال ہوا ہے۔ میری بسم اللہ ہونے کا دن 6 رجب المرجب ہے جو خواجہ معین الدین حسن سجزی کا یوم عرس ہے۔ میری رسم بسم اللہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرۂ کی مسجد منورہ میں جو کہ حضرت کے روضہ کے متصل ہے اور آپ نے خود اپنی حیات مبارکہ میں بنوائی تھی اس مسجد کے پتھر ان بزرگوں نے ڈھوئے تھے جو آپ کی خدمت میں رہتے تھے۔ شیخ عبدالعزیز کی اولاد میں سے ایک بزرگ جن کا نام ''شاہ عالم'' تھا کہ آگے ہوئی ہے وہ دن مجھے خوب یاد ہے۔ 6 رجب المرجب ہی میرے شیخ کی ولادت کا دن ہے، جیسا کہ میرے شیخ کے ذکر میں گزرا ہے۔ اللہ کے کرم سے میں نو سال کی عمر سے نماز پڑھ رہا ہوں اور گیارہ سال کی عمر سے روزے رکھ رہا ہوں۔ جب میں چودہ سال کا تھا کہ ایک بار حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواجہ بیرنگ کی صورت میں خواب میں دیکھا۔ دریائے جون میں کشتی پر قلعہ فیروزی سے جانب بالا دو تیر کی دوری پر آپ کی خدمت میں حاضری کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔ دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے بیٹھے ہیں گویا کہ کچھ پڑھ رہے ہیں اس کے بعد روئے مبارک میری طرف کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی شفقت فرماتے ہوئے آنکھ اور سر کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے فرمایا۔ میں نے سلام کیا اور نیازمندی دکھلائی اور کھڑے کھڑے آپ کے اوپر نازل انوارِ الٰہی کا نظارہ کرنے لگا۔ آخرکار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کشتی سے اتر کر دریا کی سمت والے دروازے سے قلعہ کے اندر تشریف فرما ہوگئے۔ اگلے سال ہی میں عنایات الٰہی کے طفیل اپنے شیخ خواجہ خرد کی صحبت سے پہلی بار مسجد جامع فیروزی دہلی میں مشرف ہوا اور آپ کے پیچھے نماز عصر پڑھی۔ اس وقت وہ سولہ سال کے تھے اور میں پندرہ سال کا۔ وہ مجھ سے عمر میں سات مہینے اور

---

1 جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاں سے چلے گئے تو گویا بوئے الٰہی دنیا سے رخصت ہوئی۔ جب میں نے ان کی تاریخ وصال کی جستجو کی تو ملائکہ نے کہا ھُو ھُو (11ھ) وہ وہی تھے۔

چوبیس دن بڑے ہیں۔ اس پہلی حاضری میں انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا نام ہے اور کہاں سے آئے ہو؟ میں نے حقیقت حال عرض کی۔ سن کر وہ کھڑے ہو گئے اور ایک نگاہ دلکش و کلام مے وش سے مجھے اسیر کر لیا اور اپنی محبت خاص کے دریا میں خوب خوب غوطے کھلائے۔ اس کے بعد جہاں بھی انھیں دیکھتا ان کے جمال باکمال پر شیفتہ اور فریفتہ ہوتا اور اس رباعی کا مضمون جو کہ میں نے اپنے موافق حال کہی تھی جوش مارتا تھا۔

زآں روز کہ در کوے تو بشتافتہ ام　　روئے خود زغیر برتافتہ ام
عشاق جہاں بصورت قانع وبس　　من صورت ومعنیٰ بتو دریافتہ ام [1]

اس کے بعد وصل کی راہوں سے گزرتے ہوئے عجیب وغریب احوال پیش آئے۔ ان کی یاد اور ان کے شوق ومحبت میں کتنے ہی خدا پرستوں کا دیدار نصیب ہوا اور کتنے ہی شاہدان شیریں کام سے ملاقات ہوئی جو ایک لمبی حکایت ہے۔ اور ہر مقام پر سفر ہو یا حضر، ان کے درد عشق ومحبت میں خواجہ خسرو دہلوی کا یہ شعر میرے حسب حال آجاتا تھا۔

آفاق ہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام　　بسیار خوباں دیدہ ام، اما تو چیزے دیگری [2]

ان ہی احوال میں کم وبیش ۱۰ سال کی مدت گزر گئی تو 1035ھ (1625) میں حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے عرس کی رات کو بغیر کسی کی وساطت کے میں نے بڑے عجز وانکسار کے ساتھ طریقہ نقشبندیہ کے ذکر خاص کی تلقین کی درخواست کی، آپ نے قبول کر لی اور چند دن کے بعد کہا۔ کلمہ طیبہ لاکھ مرتبہ پڑھ اور اس معاملے میں استخارہ کر۔ ایک لاکھ بار کلمہ کی تعداد پوری کرنے کے بعد جمعہ کی شب میں، میں دعائے استخارہ کی (دو رکعت نماز پڑھ کر) سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ کی صحبت سے مشرف ہوا اور آپ کی عنایات مجھ پر ہوئیں۔

حضرت خواجہ نے چند اشعار پڑھے جو حسب ذیل ہیں۔

1　جس روز سے میں تیرے کوچے کی جانب دوڑا ہوں میں نے اپنا چہرہ دوسروں کی طرف سے پھیر لیا ہے دنیا کے عاشق تو بس ظاہری حسن پر قناعت کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے تیرے حسن ظاہری وباطنی دونوں کو پالیا ہے۔

2　میں نے ساری دنیا کے چکر کاٹے ہیں کتنے ہی حسینوں کی محبت میں مشغول رہا ہوں۔ بڑے بڑے خوبان جہاں دیکھے ہیں لیکن تو تو چیز ہی اور ہے تیرا کوئی جواب نہیں۔

اے بے سر و پا بہرزہ مخروش   داری سر رہ وگر نہ خاموش
گر بار ہمی نہد تو می کش   در زہر ہمی دہد تو می نوش
ہر چند نمی رود تو می رو   تاآنکہ نمی کشد تو می کوش

اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو بیگانے لوگوں میں باکراہ بیٹھا پایا۔ یہ لوگ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ کیوں فلاں سے مرید ہو رہے ہو اور میرے شیخ کا نام لیا۔ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ کیوں فلاں شیخ کے پاس جو میرے شیخ کے ہم نام ہیں نہیں جاتے اور مرید ہو جاتے۔ یہ بات سنتے ہی میں ان کی صحبت سے تنگ دل ہو کر اٹھتا ہوں اور اپنے شیخ کے پاس پہنچتا ہوں اور خواب کے ماجرے کو خواب ہی میں عرض کرتا ہوں، جب چوتھے یا پانچویں شعر پر پہنچا تو میرے شیخ نے آنکھ اور سر کے اشارے سے پسندیدگی کا اظہار کیا، مگر چھٹے شعر پر رُک کے اور کہا: ''ہاں خوب ہے خوب ہے''۔ دن میں جب حاضر خدمت ہوا، براہ لطف و کرم جیسے ہی تلقین ذکر باطن کی۔ نقشبندیہ کی کیفیت معہود نے ظہور کیا۔ سب سے پہلا شخص جو آپ سے بیعت ہوا وہ میں تھا۔ یہ بات میں نے بارہا آپ کی زبان مبارک سے سنی ہے۔ اس کے بعد رسالہ ''قدسیہ بہائیہ'' کی آپ کے آگے میں نے قرأت کی۔ خواجگان نقشبندیہ کے مشہور و معروف ختم کی اجازت بھی میں نے آپ سے پائی ہے۔ اور بھی عطایاہائے کثیر سے میں مشرف ہوا ہوں، جن کی تفصیل اگر بیان کروں تو بہت دراز ہو جائے۔ الحمدللہ علیٰ ذلک۔ دوسری مرتبہ میں نے (محمد) مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شیخ کی صورت میں خواب میں دیکھا، اتنا لطیف و حسین، خوبرو کہ اس کی تعبیر سے عاجز ہوں۔ مصرعہ

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من[1]

خواب ہی کے دوران کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور میں کہہ رہا ہوں نہ یہ تو میرے شیخ ہیں۔ وہ شخص پھر کہتا ہے کہ ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو نہیں ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ جیسے ضرور ہیں۔ اس جمالِ باکمال کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایک کیفیت عظیم مجھ پر طاری ہو گئی۔ اسی اثنا میں بادشاہ وقت کو دیکھا کہ مکمل رعب و دبدبہ کے ساتھ ظاہر ہوئے اور دو روٹیاں اور لذت دار گوشت اپنے دست خاص سے میرے ہاتھ میں دے کر کہا: ''کھا''۔ اور کہا: ''ہر سانس کی

---

1 میرا دل جانتا ہے اور میں جانتا ہوں اور بس میرا دل جانتا ہے۔

نگہداشت رکھ کہ غفلت میں نہ گزرے، مجھ سے واصل ہو جائے گا''۔ اس معاملے اور گفتگو سے مجھ پر ایک ایسا حال اور ایک ایسی کیفیت الٰہی طاری ہوئی کہ جس کا بہت دیر تک اثر رہا۔ اس کے بعد اپنے شیخ کے سامنے اور ان کی غیبت میں دونوں حالتوں میں عجیب وغریب احوال اور واقعات رونما ہوئے۔ وہ میرے سامنے اتنے حقائق، اس راہ کے رموز اور دوسری باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں انھیں لکھوں تو کتاب بہت دراز ہو جائے گی۔ ان میں کی اکثر باتیں میں اپنی کتاب ''جمع الجمع'' میں لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے چند ملفوظات تبرکاً اور تیمناً انشاء اللہ اس کتاب میں لکھوں گا۔ تیسری مرتبہ (محمد) مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد کی صورت میں دیکھا کہ کمیت گھوڑے پر کہیں تشریف لے جا رہے ہیں، اور میں آپ کی ہم رکابی کی سعادت سے بہرہ مند ہوں۔ میری جانب متوجہ ہو کر عنایت و بشاشت کے ساتھ مجھے خطاب کر کے کچھ فرما رہے ہیں، مگر اب مجھے یاد نہیں کیا فرمایا تھا۔ مختصر یہ کہ آپ کی ان مہربانیوں اور الطاف سے میں مستانہ وار خوشی خوشی ان کے ہم رکاب چل رہا ہوں۔ ایک دن سید اللہ یار امروہوی نے کہ جن کا ذکر گزرا مجھ سے معلوم کیا: ''کون ہو، کہاں سے آئے ہو''؟ میں نے نام پتا بتلایا اور یہ بھی کہا کہ سید شرف الدین صاحب ولایت امروہوی کی اولاد میں سے ہوں۔ انھوں نے بڑی نرمی سے دریافت کیا: ''تمھارے پاس کوئی نسب نامہ ہے'' ؟ عرض کیا: ''میں نے اپنے والد سے سنا ہے اور انھوں نے اپنے والد سے، اسی طرح آخر اُن تک سلسلۂ نسب مسلسل ہے''۔ القصہ سید اللہ یار سے اس گفتگو کے بعد بار بار دل میں آتا تھا کہ کاش خواب یا حالت واقعہ میں اس نسب نامے کی تحقیق ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ آخر جمعہ کی راتوں میں سے ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک بلند چھت پر پہنچا ہوں، میں نے دیکھا کہ وہاں حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سفید لباس زیب تن کیے نوجوان کی شکل میں تشریف فرما ہیں۔ میں باادب تمام ان کے پاس بیٹھ گیا۔ آپ نے از روئے عنایت فرمایا: ''سید کمال!'' میں نے عرض کیا: ''جی حضرت حاضر ہوں'' آپ نے فرمایا: ''ہمارا حصہ نیکوکار فقرا کو پہنچانے والا بن جا''۔ میں نے نیاز مندی دکھائی اور اس بات کو دل و جان سے قبول کیا''۔ جب جاگا تو وہ دغدغہ جو دل پر چھایا رہتا تھا جاتا رہا۔ آخر اس خواب اور سید صاحب کے ساتھ گزرے واقعے کو میں نے اپنے شیخ سے عرض کیا۔ میرے شیخ نے فرمایا: ''مبارک خواب ہے''۔ اور یہ بھی فرمایا کہ حضرت امیر کرم اللہ وجہہ کے عرس یعنی وصال

کے دنوں میں جو کہ 17 سے 21 رمضان المبارک میں کسی دن ہوا ہے جو بھی کھانا میسر ہو نیک فقرا کو پہنچایا کر۔ میں نے قبول کیا اور اس دن سے آج تک اپنے شیخ کے حکم کو بجالا تا رہا ہوں اور انشاء اللہ آگے بھی اس پر عمل پیرا رہوں گا۔ اس مبارک خواب کی وجہ بننے کے لیے سید اللہ یار کا اپنے اوپر بہت احسان سمجھتا ہوں۔ حضرت خواجہ محمد پارسا قدس سرہٗ کی کتاب ''مستطاب فصل الخطاب'' میں حضرت امیر المومنین کے ذکر وفات کے سلسلہ میں مسطور ہے: ''توفی رضی الله فی الكوفة ليلة الاحد التاسع والعشرين من شهر رمضان سنة اربعين و غسله الحسن و الحسين و عبدالله بن جعفر رضی الله عنهم [1] ''

ایک بار سحر کے وقت جب میں اپنے شیخ کی محبت میں مستغرق تھا اور نہایت مسرور الوقت تھا۔ میں نے آنکھ بند کی تو خواجہ خضر علیہ السلام کو واقعے میں دیکھا کہ جہاں میں بیٹھا ہوا تھا تشریف لائے۔ میں نے اظہار عقیدت و نیاز مندی کیا۔ انھوں نے اپنے داہنے ہاتھ میں میرا داہنا ہاتھ لیا اور کس کر مٹھی بھینچ کر کلمات عجیب اور نکات غریب ارشاد فرمائے۔ اسی اثنا میں مجھ سے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''جس طرح تو نے یہ سحر کی ہے اگر ایسے ہی چالیس سحر گزارے تو مجھے پالے گا''۔ ایک رات حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا کہ آپ بڑی آن بان اور جوانانہ انداز میں، دراز قد اور فاخرہ لباس زیب تن کیے ایک راستے سے تشریف لے جا رہے ہیں۔ میں اس راہ کے کنارے کھڑا ہوں اور آپ کے جمال جہاں آرا کا نظارہ کر رہا ہوں۔ آپ نے عنایت خاص کی ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ اس عطیہ سے مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ خواب میں نے آپ کے عرس (وفات) کے دن کے قریب ماہ ربیع الآخر میں دیکھا۔ ایک رات حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کو خواب میں دیکھا کہ ایک تخت کے درمیان بیٹھے ہیں، میں اور میرے شیخ آپ کے نزدیک بیٹھے ہیں۔ آپ بطور لطف و مہربانی مجھ سے فرما رہے ہیں کہ ہم محض تمھارے لیے اُس عالم سے اِس عالم میں آئے ہیں۔ میں نے کما حقہ نیاز مندی کا اظہار کیا، اس کے بعد عرض کیا کہ حضرت میری سفارش میرے شیخ سے کر دیجیے۔ آپ نے اس بات پر مسکرا کر فرمایا: ''اپنے دل کی

---

1 آپ کی وفات کوفے میں ہفتہ کی رات کو 17 رمضان المبارک 40ھ میں ہوئی۔ حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے آپ کو غسل دیا۔

حالت سے نہیں سمجھتے''؟ اس بات سے جو میرے دل نے پایا وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ چونکہ میرے والد نے بچپن سے ہی بزرگوں کے طریقہ صلاح وسلامتی پر میری تربیت کی ہے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اُن کی تربیت کے اثر اور شیخ کی عنایات اور توجہات سے جیسا کہ چاہیے میری سلامتی کے ساتھ نگہداشت کی ہے۔ ہر چند میری جوانی کے دنوں میں بعض اوقات ہوائے نفسانی کے غلبے اور صفت حیوانی کے استیلا سے بہت سی چیزیں سدراہ بننا چاہتی تھیں، لیکن ہر وقت اپنے شیخ کی توجہ باطنی کے طفیل کہ

''چون ترا تومست کشتیبان زطوفان غم مخور [1]''

اللہ تعالیٰ نے ان مہلکات سے نجات بخشی۔''الحمدللہ علی ذالک النعایم والحمدللہ علی التوفیق [2]''۔ نگہداشت الٰہی کی عنایتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بار ایک حسین وجمیل عورت نے مجھے اپنا فریفتہ بنالیا۔ ہر چند میں خود کو صلاح وتقوے کے قلعے میں بند کرتا لیکن شیطانی لشکر مجھے اپنی طاقت سے بے بس کر دیتے اور عنانِ اختیار میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتی۔ ایک رات اچانک مست و بے اختیار اپنے بستر سے اٹھا اور اس راہزن عورت کی طرف قدم بڑھایا۔ میرا ایک نہایت ہی سدھا ہوا اونٹ تھا جو، نہ کبھی کسی کو کوئی گزند پہنچاتا اور نہ کسی کو لات مارتا، راستے میں بندھا ہوا بیٹھا تھا۔
جب میں نے اس اونٹ کے آگے سے گزرنا چاہا تو اس نے اپنی گردن لمبی کی اور منہ کھولا، اور میرا عضو پوشیدہ منہ میں بھر لیا، ایسا لگا جیسے اس نے میرا عضو خاص مجھ سے جدا کر دیا۔ جونہی میں نے استغفار کیا فوراً اونٹ نے مجھے چھوڑ دیا، اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ میں خجل و پریشان ہو کر پھر بستر پر آ گیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بذریعۂ شتر اس نے توجہ شیخ کی برکت سے ارادۂ بد سے نگہبانی فرمائی۔ اس وقت مولانا علاء الدین آبنیری کی حکایت جو کہ ''رشحات'' میں ہے مجھے یاد آئی کی ایک دن مولانا موصوف نے خواجہ ابوالوفا خوارزمی کی درج ذیل رباعی پڑھی

---

1 جب تیری کشتی کے کھویا اللہ کے دوست ہیں تو طوفان کا غم مت کر۔

2 اس اللہ کی تمام تعریف ہے جس نے مجھے یہ نعمتیں بخشیں اور مجھے توفیق عطا کی۔

چوں بعض ظہورات حق آمد باطل　　پس منکر باطل نشود جز جاہل
در پردۂ کل ہر کہ بجز حق بیند　　باشد ز حقیقت الحقائق غافل [1]

اور اس کے ساتھ مولوی جامی قدس سرہٗ کے "سبحۃ الابرار" کے درج ذیل اشعار گنگنانے لگے۔

گفت با فرح کہ بد خود بد نیست　　آنچہ بر دیدۂ تو ایں بد نیست
احمقے دید کافر قتال　　کرد از خیر او ز پیر سوال
گفت باشد درو دو چیز نہاں　　کہ نبی و ولی ندارد آں
قاتلش غازی ہست در رہ دین　　یا زمقتول از شہید گزین
نظر پاک ایں چنیں بیند　　نازنین جملہ نازنیں بیند [2]
ایں چنیں بودہ اند درویشاں　　اے دریغا ز صحبت ایشاں

حضرت مولانا علاء الدین آبنیری نے (ان اشعار کے بعد) فرمایا کہ چالیس سال گزر گئے تب ہی سے مجھے اس رباعی کے مضمون کا یقین اور تحقق ہے۔ جوانی کے زمانے میں ایک مرتبہ میں داعیہ فسادی و شیطانی سے مغلوب گھر سے باہر نکلا۔ ہمارے گاؤں میں ایک نہایت شریر اور بدنفس کوتوال تھا کہ اس سے زیادہ برا میں نے دوسرا نہ دیکھا تھا۔ بستی کے سارے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ آدھی رات کو میں نے اسے دیکھا کہ چوروں کی گھات میں ایک جگہ کھڑا ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو اس کے ڈر سے میں نے اس برائی کا ارادہ ترک کر دیا۔ تب میں نے جانا کہ دنیا کے اس

1　چونکہ حق کے بعض ظہورات صورتاً باطل ہوتے ہیں، باطل کی حکمت کا انکار جاہل کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔ جو شخص بھی مظہر موجودات میں حق کے سوا کو دیکھتا ہے وہ حقیقت الحقائق سے غافل ہے۔

2　اس نے مستی میں آکر کہا کہ بد بذات خود بد نہیں ہے، جو کچھ تیری نظر کے سامنے ہے وہ بد نہیں ہے، کیونکہ ہر بد و باطل میں کوئی حکمت حق چھپی ہے (فعل حکیم باطل کب ہو سکتا ہے) ایک احمق نے ایک جنگجو کافر کو دیکھا اور پیر سے معلوم کیا کہ آپ کو اس میں کیا خیر نظر آتی ہے؟ کہا کہ اس میں دو خیریں چھپی رکھی ہیں جو کسی بھی نبی یا ولی میں نہیں ملتیں۔ ایک تو یہ کہ جو اسے قتل کرے وہ اصول دین میں غازی کا مرتبہ رکھتا ہے، اور اگر وہ کسی کو قتل کر دے تو اُس مقتول کو شہید کا درجہ ملے گا۔ پاک نظر حضرات اسی طرح ہر شر میں خیر دیکھ لیتے ہیں، جو خود حسین ہیں وہ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی حسن دیکھ لیتے ہیں۔ اللہ والوں کی یہی صفات ہوتی ہیں، افسوس اس پر جو ان کی صحبت سے دور ہے۔

کارخانے میں بُرائی کی بھی بہت ضرورت ہے۔ اُن بزرگ نے یہ رباعی تحقیق کے بعد کہی ہے۔

لَا تُنْکِرِ الْحَقَّ فِی طَوْرِهٖ　　فَاِنَّهٗ بَعْضُ ظُهُوْرَاتِهٖ

''رُشحات'' میں ہے کہ یہ شعر ابو مدین مغربی کا ہے۔ ان کے دوسرے بعض اشعار یہ ہیں:

وَاَعْطِ مِنْکَ الرِّضَا بِمِقْدَارِهٖ　　حَتّٰی تَوَفّٰی حَقَّ اِثْبَاتِهٖ

فَالْحَقُّ قَدْ یَظْهَرُ فِی صُوْرَةٍ　　یُنْکِرُهَا الْجَاهِلُ فِی ذَاتِهٖ [1]

اس کے بعد سے اپنے شیخ کی صحبت کی دولت کی برکت سے جہاں کہیں بھی عشق مجازی میسر ہو جاتا عشق حقیقی نظر آتا۔ حق بات یہی ہے جو کسی بزرگ نے اس شعر میں کہی ہے۔

عشق حقیقی است مجازی مگیر　　ایں دُمِ شیریست بازی مگیر [2]

ایک وقت تھا کہ جب میرے شیخ جوانی کے دنوں میں اپنے سر میں عشق و محبت کا ایسا شور و ولولہ رکھتے تھے کہ جو بھی انھیں اس حال میں دیکھتا حیرت کرتا تھا۔ بے حل محلے کی مسجد میں دن رات گزرتے، میں بھی ان کی خدمت میں رہتا تھا۔ آپ میں ایک عجیب قسم کی بے تعلقی اور بے تعیُّنی کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ چنانچہ حاضرین بھی ان کے حال کی تاثیر سے بے خود ہو جاتے تھے۔ ایک رات مجھے اور سب کو اپنے پاس سے رخصت کر دیا اور بوقت سحر وہاں سے کسی کی ہمراہی کے بغیر اور کسی کو بتائے بغیر فرید آباد پہنچ گئے۔ اسی اثنا میں ان کے ماموں خواجہ محمد صادق نے انھیں خط بھیجا جس میں اس سفر کی موقوفی کے مقدمات اور دوسری نصیحتیں لکھی تھیں۔ جب وہ خط ان کے پاس پہنچا تو پڑھ کر یہ جواب تحریر فرمایا۔ ''نامہ گرامی جو کمال شفقت اور مہربانی سے آپ نے تحریر فرمایا تھا اس کا مطالعہ کیا۔ آنحضرت اس فقیر کے ولیِ نعمت اور مربّی ہیں جو بھی لکھیں یا کہیں بجا اور آپ کو سزاوار، لیکن آپ خود مہربانی فرما کر اجازت سخن دیتے ہیں تو چند جملے عرض کر دوں تو گستاخی نہ ہوگی۔ قبلہ گاہی باطنی بے چینی کہ جس کا کوئی علاج نہیں آرام سے چھوڑتا۔ اور کمال استقامت میسر نہیں ہوتا۔ یہ فقیر اس

1　باطل کو کسی بھی طرح باطل جان کر اس کی حکمت کا منکر مت بن، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بعض ظہورات میں سے ہے۔ خود کو اس کی تقدیر پر ایسے راضی رکھ کر تو اثبات قدر کا حق گزار ہو جائے، کیونکہ حق کبھی ایسی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے جاہل آدمی اس کا انکار کر بیٹھتا ہے۔

2　عشق مجازی کو مجازی نہ سمجھنا، یہ منجانب حق ہوتا ہے۔ یہ شیر کی دم ہے اس سے مت کھیلنا۔

کی دوا اپنے ادراک ناقص میں اور اپنی فہم ناتمام میں اس عالم میں بظاہر دو چیزیں سمجھا ہے، یا تو خلوت کہ بجز کوہ و بیابان جہاں کسی کی نشست و برخاست نہ ہو یا پھر سفر حجاز جو بیماروں کے لیے مبارک ہے۔ یہ علاج اس اضطراب کا ہے کہ جس سے جان کو خطرہ ہو، ورنہ اس سے کم درجے کے اضطراب کے دفع کے لیے ذکر واذکار وغیرہ کافی ہیں۔ مجھے بار بار خیال پیدا ہوتا ہے کہ خود کو باوجود اس بے بضاعتی اور اور بے کسی کے حرمین شریفین پہنچادوں اور فی الحال یہی داعیۂ زیارت حرمین محترمین اس کا محرک بنا ہے، اگر چہ دوسروں کو کسی کی حالت حقیقی کی خاص کر فقیروں کے حالات کی خبر نہیں۔ حضرت میرزا جیو نے وہ جو فرمایا ہے بالکل حق ہے:

گر مرشدِ من پیر مغان شد چہ تفاوت　　　در ہیچ سرے نیست کہ سرّ ے ز خدا نیست [1]

حضرت قبلہ گاہی میاں جیو قدس سرہٗ جو کہ اس قدر رعایت ظاہر شریعت فرماتے تھے، اس فقیر کے لیے وسعت مشرب اختیار کرنے کو فرمایا تھا۔ غرض یہ ہے کہ آپ سے ایسی امید رکھتا ہوں کہ مہربانی فرما کر مجھے رخصت کریں، حالانکہ فقیر کا داعیۂ سفر دراز ہے، لیکن فقیر عنایات الٰہیہ کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ پاتا ہے۔ براہ لطف و کرم والدہ سے رخصت دلوادیں۔ کتاب (نقد النصوص) میرے پاس ہے، فصوص الحکم اور دوسری اسی قسم کی کتابیں جو آپ کے دل میں آئیں بھجوادیں، لیکن کلام الٰہی کو علاحدہ سے کسی کپڑے میں بندھوا کر بھجوادیں''

میں نے جب اس خط کو خواجہ محمد صادق سے لے کر پڑھا تو قلق و اضطراب کی ایک عجیب حالت ہوگئی کیونکہ شیخ کی ہم سفری اپنے سامان سفر کو دیکھ کر بظاہر دور لگتی تھی اور ان کے بغیر رہنے کا نہ یارا تھا نہ صبر۔ حیران و پریشان، بے چارہ اور آوارہ پھرتا تھا، حالانکہ اس زمانے میں میری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور لشکر میں نئی نئی نوکری تھی۔ ان دونوں موانع سے قطع نظر والدہ سے اجازت لینا سب سے اہم کام تھا۔ یہ آخری شق ممکن نہیں لگتی تھی، آخر اپنی جگہ آکر لیٹ گیا اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا کہ کیا چارہ سازی کروں کہ کام بن جائے کہ دل ہاتھ سے چھوٹا جائے ہے۔

1　اگر میرے مرشد صاحب میخانہ ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے، کوئی بھی سر ایسا نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی راز الٰہی نہ چھپا ہو۔

بوادیٔ غم منم فتادہ، زمام فکرت ز دست دادہ　　نہ بخت یاور، نہ عقل رہبر، نہ تن توانا نہ دل شکیبا[1]

اسی اثناء میں دل میں آیا کہ خواجہ بیرنگ کے آستانے پر جا کر قبر منوّر کی پائنتی بیٹھ کر اپنے حال خراب کا علاج ان سے چاہوں گا۔ فوراً اٹھا اور گرتا پڑتا شکستگی تمام کے ساتھ روانہ ہوا اور زبانِ نزار اور دلِ فگار سے اس قسم کے اشعار پڑھتا جاتا تھا

حب تو مراد ما محمد باقی　　بر نام تو جاں فدا محمد باقی
فرمای بحال خستہ یکرہ نظرے　　اے خواجہ خواجہا محمد باقی[2]

عجز و نیاز مندی سے سر اس خاک پاک پر مل رہا تھا اور انکساری اور فقیری کی زبان باطن سے عرض کر رہا تھا کہ اے میرے خواجۂ بیرنگ یہ درماندہ بالکل دیوانہ بنا اپنے شیخ کے پیچھے پیچھے خوش خوش پھرا کرتا تھا اور ان ہی کے ساتھ رہتا تھا، اور کسی دوسرے کا خیال دل میں نہ لاتا تھا۔ اے شیخ عبدالباقی میرے شیخ جہاں تک پہنچے ہیں وہیں سے یہاں واپس لوٹ آئیں اور مجھ تباہ حال کو بحال کریں۔ اسی قسم کی باتیں دیر تک کرتا رہا۔ اسی وقت وہ بے چینی جو دل پر طاری تھی جاتی رہی۔ اور دل میں القا ہوا کہ فرید آباد تک جانا چاہیے۔ جلد آ کر والد سے فرید آباد کی اجازت لے کر روانہ ہو گیا، اور دل میں یہ نیت کر لی کہ وہاں پہنچ کر اپنے معاملے کے اختیار کی باگ ڈور اپنے شیخ کے ہاتھ میں دے دوں گا کہ جہاں پہنچانا چاہیں لے جائیں اور جو چاہیں کریں اور پھر اس معاملے میں والد کی مرضی کو نہ دیکھوں گا۔ نئی نئی شادی کے خیال کو دل سے یکسو کر کے دل کا چہرہ پوری طرح اپنے شیخ کی جانب پھیر دوں گا تا کہ درج ذیل شعر کا مضمون میرے حال کے موافق ہو جائے۔

ایں سوے بہشت آمد و آں جانب کعبہ　　مارا بہ ہمہ حال سرِ کوئے تو اَوْلیٰ[3]

1　میں وادیٔ غم میں گر پڑا ہوں، فکر کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے، نہ عقل رہبری کرتی ہے نہ ہی نصیب یاوری کر رہا ہے، نہ جسم میں ہی طاقت ہے نہ دل ہی صابر ہے۔

2　اے شیخ محمد عبدالباقی! آپ کی محبت میری مراد ہے، آپ کے نام پر میری جان فدا ہے، اے خواجہ خواجگان! مجھ خستہ حال پر ایک نظر فرمائیں۔

3　یہ راہ تو بہشت کی طرف آتی ہے اور وہ کعبے کی جانب آتی ہے، ہمیں ہر حال میں تیرے کوچے کا خیال اولیٰ ہے۔

اس حال کے مطابق ایک مجذوب با معنیٰ کی حکایت ''چنداین'' کتاب کے مصنف ''سادھن'' کے ساتھ یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ ہندی شاعر سادھن بادشاہ وقت کا مصاحب تھا، بادشاہ کی خلوت میں بھی اسے آنے جانے میں کوئی مانع نہ تھا۔ جس دن وہ ''چنداین'' نام کی کتاب کی تصنیف سے فارغ ہوا تو اسے اپنے ساتھ لے گیا تاکہ بادشاہ کی نظر سے گزارے۔ راہ میں ایک مجذوب پڑتے تھے انھوں نے اس سے پوچھا: ''کیا کتاب ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''چنداین''۔ مجذوب نے کہا: ''اس میں سے کچھ سناؤ''۔ اس نے کہا: ''پہلے بادشاہ کو سناؤں گا پھر آپ کو''۔ مجذوب کو یہ جملہ اچھا نہ لگا اور کراہیت سے کہا: ''جا، جا''۔ وہ اپنی سابقہ عادت کے مطابق بادشاہ کی جائے خلوت میں پہنچا۔ اتفاق کی بات کہ بادشاہ اس وقت اپنی محبوبہ کے ساتھ تنہائی میں محو گفتگو تھا۔ اسے دیکھتے ہی برہم ہو گیا اور کہا کہ اسے شہر بدر کر دو۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ان ہی مجذوب کے دل کی گرہ کا نتیجہ ہے، لوٹ کر اسی صحرا میں دوڑا تاکہ ان مجذوب کو تلاش کر لے۔ جب وہ مل گئے تو نہایت ادب اور نیاز مندی سے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ انھوں نے پوچھا: ''کیا حال ہے؟'' اس نے کہا: ''سب آپ کے سامنے ہے''۔ مجذوب بولے: ''اچھا کچھ سنا''۔ اس نے یہ دوہرا پڑھا:

ایک بات کہت ہر دے سے دوسر کہت جھوٹ — اَوبے بات کے ہوئی چاندا کوئی بات تو ہوت[1]

وہ مجذوب اس کو سنتے ہی وجد میں آ گئے اور ناچنا شروع کر دیا اور ذوق میں آ کر یہ دوہرا پڑھنے لگے:

دکھ دور جائے ہر دے سے پیر دور جائے چھوٹ — جھ کو سنائے نہ سنیں ان سے بات اب ہوت[2]

جب بادشاہ کا مزاج خوش ہوا تو سادھن کو پھر طلب کیا اور کتاب سنی اور اس کا دل خوش کر دیا۔ القصہ جب میں فرید آباد پہنچا تو اپنے شیخ کو نہ پایا۔ میں نے اپنے چچیرے بھائی محمد صادق (جن کا ذکر گزرا) سے پوچھا: ''میرے شیخ کہاں ہیں؟'' اس نے جواب دیا: ''تین دن رات یہاں رہے،

---

1 ایک بات تو وہ دل سے کہتا ہے، دوسری جھوٹ موٹ کہتا ہے۔ آخر کوئی تو بات ہے کیوں کہ بے بات کوئی ناراض نہیں ہوتا۔

2 جب میرے دل سے دکھ دور ہو گیا اور تکلیف جاتی رہی، جن کو تو سنانے گیا تھا مگر انھوں نے نہ سنا تو جا اب سنیں گے۔

اسی آدھی رات کو ناگاہ بستر سے اٹھے اور کہا: ''میں واپس دہلی جاتا ہوں''۔ میرے چچازاد بھائی نے ان سے کہا: ''خداوندا ! اس عزیمت کے ساتھ گھر سے نکلنا اور پھر اس طرح راستے سے ہی لوٹنے کا کیا سبب بنا؟'' تیرا نام لے کر فرمایا: ''میں فلانے کی خاطر واپس جا رہا ہوں''۔ میں اس نوید حیات بخش کو سن کر ایزد تعالیٰ وتقدس کا شکر بجا لایا اور کام کو حسب مراد پالیا۔ جلد وہاں سے دوڑا، کہتے ہیں کہ جب میرے شیخ صبح کے وقت اپنے مکان پر پہنچے سب سے پہلے مجھے معلوم کیا کہ کہاں ہے اور اس کا کیا حال ہے۔ جو لوگ واقف تھے انھوں نے بتایا کہ آج آپ کی صحبت میں رہنے کے لیے فرید آباد گیا ہے۔ فرمایا کہ جس نے کہا ہے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

دل را بدل رہے است درین گنبد سپہر [1]

جب میں اس صاحب دو جہانی کے دیدار پُر انوار سے مشرف ہوا تو ان کے بے حد لطف وعنایت سے بہرہ مند ہوا پھر تو جو گزرا گزرا۔

عید نو روز ہیچ دانی چیست   آں کہ طالب رسد بمطلوبے [2]

ایک بار میرے شیخ اکبر آباد میں تھے۔ میں بھی اسی شہر میں دو میل کی مسافت دوسرے محلے میں تھا، اور ہر دن ان کے دیدار کے لیے پہنچتا تھا، کبھی رات کو بھی رہتا تھا۔ ایک دن جب میں آیا تو ان کو نہ پایا۔ میں نے پوچھا: ''کہاں ہیں؟'' لوگوں نے کہا سید محمد فتح امروہوی کے مکان پر گئے ہیں۔ میں نے شوق میں اس جگہ کا قصد کیا۔ اثنائے راہ میں دیکھا کہ میرے شیخ تیس چالیس قدم آگے آگے جا رہے ہیں۔ ہر چند تیز سے تیز قدم اٹھاتا مگر ان تک نہ پہنچ پاتا۔ جب جلد تر اس مکان پر پہنچا تو ان کے ابھی ابھی پہنچنے کا کوئی نشان نہ دیکھا۔ بڑا تعجب ہوا۔ ان سے اور ان کے بعض خدام سے بھی معلوم کیا کہ یہاں کب پہنچے ہیں۔ سب نے بالاتفاق کہ تیرے آنے سے ایک پہر پہلے آئے ہیں۔ یہ سن کر مجھ پر کیفیت انبساط طاری ہوگئی اور مجھے وہ معاملہ یاد آگیا جو شیخ مصطفیٰ اور میرے شیخ کے درمیان ہوا تھا۔ شروع حال میں اس نوجوان کی رفاقت میں جو میرے شیخ کا معشوق تھا رانا کے ملک میں سپہ سالار بھوہ بخاری کے ہمراہ رہنا ہوا۔ بلکہ میں نے یہ سفر ہی اپنے شیخ کی خوشنودی کے

---

1 واقعی اس جہان میں دل کو دل کی طرف راہ ہے۔

2 تجھے کچھ خبر بھی ہے عید نوروز کیا ہوتی ہے، جس دن طالب اپنے مطلوب سے مل جائے وہی عید نوروز ہے۔

لیے کیا تھا۔ ''تمھیں چاہوں تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں''۔ اس کے رخصت ہوتے وقت میں نے خواجہ حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا

میل من سوے وصال وقصد او سوے فراق　　　ترکِ کام خود گرفتم تا برآید کار دوست [1]

اس ایک سالہ سفر میں عالم غیب کے کیسے عجائب وغرائب اپنے شیخ کی توجہ سے مشاہدہ کیے۔ حقائق و معارف سے لبریز اس قدر کلمات ان کی طرف سے ادا ہوتے تھے کہ اگر سب کو جمع کیا جائے تو ایک کتاب علاحدہ سے مرتب ہو جائے۔ ان میں سے بعض ''جمع الجمع'' کے نسخے میں تحریر ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس پورے سفر میں باوجود یکجا رہنے کے اور اس نوجوان کے دن رات کے واقعات لکھنے کے جن کا مجھے میرے شیخ نے حکم فرمایا تھا اور اس نوجوان کی پاس داری اور ناز برداری کرنے کے، میں نے کبھی اس کے چہرے کی طرف نظر نہ اٹھائی۔ اس کی وجہ صرف اپنے شیخ کا ظاہراً و باطناً ادب ملحوظ رکھنا تھا۔ اس معاملے کو اس پر محمول کیا جائے کہ جب سے میں اپنے شیخ کی غلامی میں آیا ہوں کبھی بھی ان کی جانب ان کی غیبت میں بھی پیر دراز نہیں کیے۔ نہ کبھی اس سمت کو تھوکا، نہ پیشاب یا پاخانہ کیا، چاہے میں ان کے ہم شہر و ہم دیار رہا، خواہ سنبھل، لاہور، قندھار یا کہیں کے سفر میں رہا۔ ایک دن میں سنبھل میں اپنے شیخ کی یاد میں غمگین تھا، اور اپنی خرابی حالِ ایمان و یقین پر نظر کرتا تھا۔ ناگاہ اس شعر کے معنیٰ مجھ پر منکشف ہوگئے اور اپنے دل میں اس کا وجدان بھی پایا۔

مانند حبابیم کہ بر آب سواریم　　　چوں باد رسیدہ ہمہ در آب خزیدیم [2]

کچھ دیر تک میں اس کی کیفیت میں مست رہا، اس کے بعد یقین کامل ہوگیا۔ انوکھے نکات اور معنیٰ سمجھنا اور بات مگر اس کی لذت کو باطن میں چکھنا اور چیز ہے۔ جیسا کہ مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا:

صفتِ بادۂ عشقش ز منِ مست مپرس　　　ذوق ایں مے نہ شناسی بخدا تا نچشی [3]

1　مجھے تو اس کے وصل کی لگی ہوئی ہے مگر اس کا قصد جانب فراق ہے۔ میں ہی اپنا من مارے لیتا ہوں تا کہ دوست کا مقصد پورا ہو جائے۔

2　ہم تو بلبلے کی طرح سطح آب پر تیر رہے ہیں۔ ذرا ہوا لگی اور پانی میں مل گئے۔

3　اس کے عشق و محبت کی شراب کی صفات مجھ مستِ مئے عرفان سے مت پوچھ۔ تو اس کی لذت جب تک خود نہ چکھ لے کسی کے کہے سے نہیں جان سکتا۔

ایک دن مجھ پر ایک حال آیا، اس حال کے مطابق کسی بڑے شاعر کا یہ شعر اپنے شیخ کے سامنے پڑھا اور اس کے معنیٰ دریافت کیے۔ وہ سمجھ گئے کہ مجھ پر کیا حالت طاری ہے، اس کے معنیٰ بتلائے اور خود بھی مسرور الوقت ہو گئے۔ وہ شعر یہ ہے

منم کہ رنگ من و بنگ من معین نیست   نہ قب قرابم و نے قب قزل نہ قب سارق [1]

ایک رات میرے شیخ کا وقت خوش تھا۔ ذوق سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد کی یہ تاثیر ہے کہ طالب کے سراپے اور بال بال میں سما جائے، اور خود بخود ذاکر کو اس سے چرا لے۔ اس وقت میں اپنے سر سے پیر تک بال بال کو ذکر الٰہی میں پاتا تھا۔ یہ حال وجدانا میرے دل پر ظاہر تھا۔ اوائل سلوک میں چہار شنبہ، مہینے کی آخری رات میرے شیخ نے حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے روضے میں گزاری اور بوقت سحر حضرت شیخ نظام الدین کی قبر کے مقابل مراقب ہوئے اور مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اس وقت عجیب کیفیت نمودار ہو رہی تھی۔ میں اس حال میں فجر کی نماز کے بعد خوشی تمام کے ساتھ بچشم سر ان کے جمال باکمال کا مشاہدہ کر رہا تھا، اور مجھ میں ایسی بات پیدا ہو گئی تھی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ اس وقت شیخ رفیع الدین کے بیٹے شیخ لطف اللہ سکھرائی کے پردے میں یہ شعر پڑھ رہے تھے

گر بچشم سر کسے را صورت جاں دیدہ شد   چشم خسرو بود در وے کن حکایت مختصر [2]

میں وجدانا دیکھ رہا تھا کہ یہ حال فی الوقت ان کے جمال باکمال کے، جیسا کہ میرا مشاہدہ تھا، کے موافق تھا۔ اور وہ حال آج تک میری نظر میں ہے۔ اس حال میں انھوں نے اپنی دستار خوش رنگ اپنے سر مبارک سے اتاری اور میرے سر پر رکھ کر میری دستار اپنے سر پر رکھ لی۔ ان کی اس لطف فرمائی سے مجھے جو کچھ ملنا تھا ملا۔ وہ دستار آج بھی میرے پاس ہے، اسے عید کے ایام میں سر پر باندھ کر شرف یاب ہوتا ہوں۔ ایک رات سنبھل میں ہندی کے ایک شعر کے معنیٰ میر سید فیروز

---

1 میں وہ ہوں کہ جس کا نہ کوئی خاص رنگ ہے، نہ کوئی خاص ذاتی حال ہے۔ میں نہ کالے رنگ کا، نہ سرخ، نہ زرد، یعنی میں آئینہ ہوں جیسا رنگ جیسی نسبت میرے آگے آتی ہے وہی میری نسبت اور میرا رنگ ہو جاتا ہے، حالانکہ میں ان سب سے جدا بے رنگ و بے کیف ہوں۔

2 اگر کسی کو ظاہری آنکھ سے روح کا دیدار ہونے لگے تو اس کے سر میں کسی عاشق کی آنکھ ہو گی، قصہ مختصر کر دے۔

جیسے دوستوں کے سامنے تصوف کی زبان میں بیان کیے، پھر جب میں اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی پہنچا اور اس ہندی شعر کے معنیٰ ایک صاحب دل شیخ نظام کے سامنے، جو کہ میرے شیخ کے صحبت دار ہیں، میں نے بیان کیے تو انھوں نے کہا کہ ہندی کے اس شعر کے یہی معنیٰ تیرے شیخ نے بھی بیان کیے تھے۔ میں نے پوچھا: ''کتنے دن پہلے کی بات ہے''۔ انھوں نے کہا: ''دس دن پہلے کی''۔ اتفاق دیکھیے کہ مجھے سنبھل میں اس کے معنیٰ بیان کیے ہوے بلاکم وبیش دس دن ہی گزرے تھے۔ یہ اتفاق اسی قبیل سے ہے، جیسا کہ ایک ہندی خیال کے بارے میں شیخ مصطفیٰ کا گزرا۔ میں ہر سال سنبھل سے اپنے شیخ کے پاس دہلی آکر تین مہینے رہا کرتا ہوں اور نو مہینے سنبھل میں گزارتا ہوں۔ ایک دن ان ہی شیخ نظام الدین نے مجھ سے معلوم کیا کہ کیوں تین ماہ دہلی اور سنبھل میں نو ماہ رہنا لازم کر رکھا ہے۔ میں نے جواب میں بطور خوش طبعی یہ کہا

نگویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن ۔۔۔ سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسامی باش[1]

اور کہا کہ خواجہ شیرازی کا یہ شعر میرے مناسب حال ہے۔ انھوں نے پسند کیا اور خوش وقت ہو گئے، کیونکہ وہ خود میرے شیخ کی محبت کے جام پیے ہوے ہیں

''کہ آشنا بہ یقیں قدر آشنا داند''[2]

میں نے ان سے کہا کہ اس شعر کے معنیٰ ایک دوسری نوعیت سے بھی میرے دل میں آئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ ''انسان کی ایک سال کی عمر میں بارہ مہینے مان کر کہتے ہیں کہ عمر کی بھی چار قسمیں ہیں؛ بچپن، شباب، ادھیڑپن اور بڑھاپا۔ پس جس طرح سال کے تین مہینے رجب، شعبان اور رمضان کو طاعت وعبادت ذکر و اشغال اور نیک کاموں سے معمور رکھنا باقی نو ماہ کے لیے طاعت و عبادت میں معین و مددگار ہوتا ہے، یہ تین ماہ بھی سال کا چوتھائی حصہ ہیں، اسی طرح عمر کی چار قسموں میں سے ایک قسم شباب ہے، چاہیے کہ اسے خاص کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت میں خرچ کرے تاکہ ساری عمر میں حسب مراد دین ودنیا کی بھلائی میسر ہو جائے اور باقی تینوں قسمیں بھی پارسائی میں گزریں۔ ایک دن یہی شیخ نظام الدین میرے شیخ کو سنا رہے تھے کہ گذشتہ شب میں

---

1 میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ سارے سال مے نوشی کر، بلکہ تین ماہ شراب پی اور نو مہینے پارسا بن کر رہ۔

2 آشنا ہی یقینی طور پر آشنا کی قدر جانتا ہے۔

نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میں دنیا سے چلا گیا ہوں اور مجھے قبر میں اتار دیا ہے، اور میں قبر میں کھڑا ہوں اور رخ آپ کی جانب ہے۔ اتنے میں شمال کی جانب سے قبر میں ایک کھڑکی کھلی اور دو شیخ ماوراء النہر کے مشائخ کے لباس میں اس دریچے سے اندر آئے، ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے، مگر اس کی کیفیت میرے خیال میں نہیں رہی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: "مَنْ رَبُّکَ ؟" (تیرا رب کون ہے)۔ میں نے کہا: "اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ"۔ اس کے بعد انھوں نے معلوم کیا: "مَنْ نَبِیُّکَ ؟" (تیرے نبی کون ہیں)۔ میں نے کہا: "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُولُہٗ"۔ دریں اثنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے پیچھے سے برآمد ہوئے اور ان سے خطاب کر کے فرمایا: ''کچھ مت پوچھو یہ میری آل میں سے ہے''۔ خواب سن کر میرے شیخ نے فرمایا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں حاضر کیا جائے گا تاکہ میّت کا حال بیان فرمائیں اور اس کے دین کی حالت کی خبر دیں، تیرا یہ خواب اس کے موافق پڑا۔ یہ بھی کہا کہ تیرے مرنے کے بعد ہوسکتا ہے تجھ سے قبر میں سوال نہ ہوں اور یہی خواب جو تو نے دنیا میں دیکھا ہے کفایت کرے۔ ایک دن ایک قاری نے میرے شیخ سے کسی سلسلۂ کلام میں کہا کہ میں نے سنبھل دیکھا ہے اور اس کی سیر کی ہے، ایک ویران شہر ہے اور اسکی آبادی تتر بتر ہے۔ ایسی ہی اور بہت سی کمیاں بیان کیں۔ مجھے برا لگا کیونکہ وہ میرا وطن ہے۔ "حُبُّ الوَطَنِ مِنَ الاِیْمَانِ" (وطن کی محبت ایمان میں سے ہے) میں نے اس قاری سے کہا: ''وہاں کسی صاحب دولت باطنی سے بھی ملے؟'' میں نے ویرانی اور ابتری کے علاوہ کچھ نہ دیکھا۔ میں نے کہا: ''پھر تو عارف رومی کی مثنوی کے یہ اشعار آپ کے حسب حال ہیں۔ مثنوی

گاوے در بغداد آمد ناگہاں　　می گذشت او زیں سرائے تا آں سرائے
زاں ہمہ لطف و خوشی ہا و مزہ　　او نہ دیدہ جز کہ قشر خربوزہ [1]

میں نے اس خشک عالم سے یہ بھی کہا: ''کیونکہ اس وقت میرا وطن سنبھل ہے لہٰذا میں نے جو کچھ کہا اسی لیے کہا، ورنہ میرا وطن قدیم تو شہر واسط ہے، اور اگر اصلی ہی وطن کو کوئی پوچھے کہ جسے حقیقی کہتے

1　ایک بیل ناگہاں بغداد کے اندر آگیا، اور اس سرائے سے اُس سرائے تک گزر گیا، مگر اس نے بغداد شہر کی رونقیں، خوشیاں، اور عیش و آرام کچھ نہ دیکھا علاوہ خربوزوں کے چھلکوں کے۔

ہیں تو وہ وحدت ہے۔ کیونکہ میرا مبداو معاد، صدور ورجوع اس جانب ہے

جاے معاد و مبدء ما وحدت است و بس ما درمیانِ کثرت و کثرت میانِ ما [1]

جیسا کہ ''نفحات الانس'' میں ہے کہ ابو ہاشم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا

لَقَلْعُ الجِبَالِ بِالاِبَرِ اَيْسَرُ مِنْ اِخْرَاجِ الكِبْرِ مِنَ القُلُوبِ [2]

بسوزن کوہ کندن ہست آساں زبیروں کردنِ کبر از دل و جاں

خواجہ محمد دہدار محشی ''نفحات الانس'' نے اس بات پر فرمایا ہے کہ اس کبر سے مراد لغوی کبر نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ خود کے وجود کو کسی نہ کسی وجہ سے دیکھتا ہو، اور اپنی ہستی کا شعور رکھے کہ میں بھی کچھ ہوں۔ یہ گھاٹی بہت ہی بڑی ہے اس لیے اسے کبر سے تعبیر کیا ہے کہ

وُجُودُکَ ذَنْبٌ لَا يُقَالُ بِهٖ ذَنْبٌ [3]

خواص جسے کبر کہتے ہیں وہ کبر خاص ہے ورنہ کبر عام وہی ہے جو شریعت ظاہرہ میں مراد ہے۔ مَنْ حَمِلَ سِلْعَةً لَقَدْ بَرِئَ مِنَ الكِبْرِ (جس نے سامان کی ٹوکری سر پر اٹھا کر بازار سے گھر پہنچادی وہ کبر سے بری ہوگیا، اسے پہاڑ کھودنے کی حاجت نہیں، واللہ اعلم)۔ میرے شیخ نے اس حاشیہ پر بھی حاشیہ لکھا ہے: ''ہوسکتا ہے کہ گھر سے مراد اصلی وطن ہو کہ وحدت ہے اور بازار سے مراد عالم کثرت اور سلعہ سے مراد وجود و صفات جو کہ وجود سے نسبت رکھتی ہوں، سر پر رکھ کر بازار سے گھر پہنچانا اپنے وجود کا اٹھ جانا اور حضرت وحدت میں استغراق جو حقیقتِ فنا ہے، پس جس نے بھی اس حدیث شریف پر ایک بار عمل کیا اس نے الفَانِي لَا يُرَدُّ اَبَداً [4] کی رو سے کبر خاص و عام سے آزاد ہوگیا۔ شروع حال میں ایک بار میں نے اپنے شیخ کو خواب میں دیکھا کہ وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں: ''تو نے شہرت تو حاصل کر لی مگر جو کرنے کا کام ہے وہ نہیں کرتا''۔ میں سرِ خجالت جھکائے

---

1 ہماری جاے مبدا و معاد بس وحدت ہے، ہم کثرت کے درمیان ہیں اور کثرت ہمارے درمیان ہے۔

2 عربی و فارسی شعروں کا یکساں ترجمہ :۔ دل و جان سے برائی اور غرور نکالنے کے مقابلے سوئی سے پہاڑ کھودنا آسان ہے۔

3 تیرا خود کو موجود جاننا ہی گناہ ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ تیرے وجود میں گناہ ہے۔

4 جو فنافی اللہ ہوگیا پھر وہ کبھی مردود نہیں ہوتا۔

پوری انکساری اور نیاز مندی کے ساتھ سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ کوئی چیز ان کے ہاتھ میں تھی، اپنی انگشت مبارک سے میری پیشانی پر لفظ ''اللہ'' لکھا، اور میں بے خود ہو کر زمین پر گر پڑا، اپنا اور غیر کا کوئی شعور نہ رہا، اسی بے شعوری میں آنکھ بند کیے دیکھ رہا ہوں کہ ہر طرف سے ایک خاص روشنی اور نور ظاہر ہو رہا ہے اور مجھے اپنے دائرے میں لے لیا ہے۔ اس اثنا میں وہ خود اچھل کر ایک بلند زینے پر چڑھ کر ایک نہایت بلند مقام گویا الوند پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے، اور مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ جب میں قریب پہنچا تو انھوں نے میری جانب رخ کر کے کہا: ''یہ ذاتِ الٰہی تک رسائی ہے''۔ پھر ہم دونوں اسی مقام کے اوپر یکجا ہوئے اور ایک عجیب حال اور کیفیت حاصل ہوئی، اور بہت ہی زیادہ انبساط اور نشاط طاری ہوا۔ چنانچہ اس حالت کا اثر خواب سے جاگنے کے بعد بھی دیر تک رہا۔ شروع میں ہی ایک رات کو خواب میں دیکھا کہ میرے شیخ مجھے ''یوسف زلیخا'' کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اس میں سے یہ شعر مجھے یاد رہا ہے۔

حال ایں عالم بتو گویم کہ چیست   از ازل (ہم) تا ابد ہرزہ گریست [1]

اس شعر کو میں نے نہ کہیں دیکھا نہ کبھی سنا۔ اس شعر کے معنیٰ عربی کے اس شعری مصرعے کے موافق ہیں

اَلا کُلُّ شَیءٍ مَا خَلَا اللّٰهُ بَاطِلُ [2]

جب اس خواب کو میں نے ان کو سنایا تو ذوق میں آکر یہ شعر پڑھا :

توئی بس در جہانِ ہیچا ہیچ   ہیچ من ہیچ من ہزاروں ہیچ [3]

ایک بار لگاتار بارہ راتوں کو انہیں خواب میں دیکھا، اور ہر رات ان کے الطاف وعنایات سے بہرہ ور ہوا۔ آخری دن جب ان خوابوں کا ذکر میں نے ان کے معشوق سے، جو کہ ''رانا'' کے ملک میں میرا رفیق تھا، ذکر کیا تو تیرھویں رات کو خواب مسلسل سے محروم ہو گیا۔ بزرگوں کا قول ہے: ''افشاءِ سرّ، خسران پیوستہ [4] ''ایک بار 1036ھ (مطابق 1626) میں جبکہ شہر لاہور میں

---

1   اس عالم کا حال میں تجھے بتاؤں کہ کیا ہے؟ ازل سے ابد تک ہرزہ گری ہے۔

2   آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز باطل ہے۔

3   جہانِ ہیچا ہیچ میں حقیقتاً تو ہی ہے۔ میں تو ہیچ در ہیچ بلکہ ہزاروں بار ہیچ ہوں۔

4   افشا راز نقصان کا موجب ہے۔

اپنے شیخ کے ساتھ رہتا تھا۔ شب جمعہ کے آخری وقت خواب دیکھا کہ انھوں نے مجھے فجر کی نماز کی امامت کے لیے اشارہ کیا اور میں نے ان کے امتثال امر میں نماز پڑھائی۔ میری دائیں جانب وہ کھڑے ہوے اور بائیں طرف ایک دوسرے بزرگ۔ جب آنکھ کھلی تو انھوں نے مجھے اسی انداز سے صبح کی نماز کے لیے اشارہ فرمایا اور خود اقامت کے لیے دائیں جانب پیچھے کھڑے ہو گئے اور ایک دوسرے، ان ہی بزرگ کو جنھیں خواب میں دیکھا تھا، بائیں جانب کھڑا کر لیا۔ دونوں رکعات میں، جن سورتوں کی خواب میں قرأت کی تھی، بغیر ارادہ کیے زبان پر جاری ہو گئیں۔ ایک رات، نوکری چھوڑنے کے دنوں میں خواب دیکھا کہ میرے شیخ پُر تکلف سرخ رنگ کا فاخرہ لباس زیب تن کیے دل سے اللہ اللہ کا ذکر کر رہے ہیں اور میں اس ذکر کو سر کے کانوں سے خوب سن رہا ہوں، اور میں بھی سامنے بیٹھا اس ذکر کو دل ہی دل میں کہہ رہا ہوں۔ اسی اثنا میں میرے دل میں آیا کہ ذکر اللہ کی یہ دولت مجھے محض ان کی صحبت کی برکت سے نصیب ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا: ''ہاں یہی بات ہے جو تو سوچ رہا ہے''۔ پھر ذوق میں، میں نے دل میں کہا: ''اب میرے اور ان کے درمیان کوئی جدائی نہ رہی ہے''۔ انھوں نے کہا: ''ہاں میں اور تو ایک ہیں''۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ میں سید اعظم کی جانب سے فکر مند ہوں، کاش اس کی صحبت فقرا صالحین کے ساتھ ہوتی تو بہتر ہوتا۔ میں نے کہا حضرت وہ ابھی تک دولت بزرگانِ نقشبندیہ سے فیضیاب نہیں ہوا ہے، لیکن اس کا بڑا بھائی سید کاظم طریقہ نقشبندیہ میں ملقن ہے، علم باطن سے آگاہ اور راہ حق کو سمجھا ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ بھی حضرت کی توجہ سے اس طریق کے بزرگوں میں سے ہو جائے گا۔ اس خواب کے دوسرے دن سید اعظم جب مراد آباد سے سنبھل آیا تو میں نے خواب کا ماجرا اس سے بیان کیا۔ اس نے کہا کہ آپ کے شیخ کی جانب سے مجھے طریق کی آگاہی مل گئی ہے۔ اس بے قیدی کو جو طریقہ نقشبندیہ کے خلاف ہے مجھ سے انھوں نے اپنی قوت توجہ سے چھین لیا ہے۔ اب میں اپنی سابقہ بے راہ روی سے سخت نادم و پشیمان ہوں۔ سید اعظم کا مجمل قصہ یہ ہے کہ وہ میرا درمیانہ (منجھلا) لڑکا ہے۔ بچپن سے ہی صالح اور غیر معمولی پیدا ہوا تھا۔ بلکہ پیدائشی دولت رکھتا تھا۔ شیخ مصطفیٰ اس کے ماموں نے کہ (جن کا ذکر گزرا) ایک دن بچپن میں اس سے پوچھا: ''تیرا نام کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''اللہ''۔ جب یہ

واقعہ شیخ مصطفیٰ نے میرے شیخ سے ذکر کیا، ان کا وقت خوش ہو گیا اور کہا: ''اس کی استعداد باطنی نہایت بلند واقع ہوئی ہے۔ ابتدائے عمر شباب میں میرے ہم راہ سنبھل سے میرے شیخ کی خدمت میں آ کر ذکر باطنی سے ملقن ہوا (بیعت ہوا) اور طریقہ نقشبندیہ کی جو معہودہ کیفیت ہے وہ حاصل کی اور بڑے اچھے مقامات پیدا کیے۔ ایک بزرگ سے میرے شیخ کے رسالہ ''نور وحدت'' کو بڑی گہرائی سے پڑھا، جانا اور سمجھا، شیخ کے روبرو اس کی قرأت کی اور حیرت انگیز اعمال کی توفیق سے موفق ہوا اور مشرب عالی اکابرین نقشبندیہ کی نسبت کے تواجد سے مشرف ہوا۔ اس نے سلوک کی راہ کو توحید خالص سے آمیختہ کر دیا تھا۔ اس راہ درویشی کی باتیں خوب کیا کرتا اور خوب سمجھنے بھی لگا۔ آخر کار میرے شیخ کا مقبول نظر اور منظور خاطر بن گیا۔ پھر جب میرے شیخ سے رخصت ہو کر سنبھل آیا تو بیمار پڑ گیا۔ آٹھ مہینے تک، جب تک تھوڑی سی طاقت بھی رہی، میرے ساتھ جماعت میں کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتا تھا۔ اس کے بعد بیٹھ کر جماعت سے نماز پڑھنے لگا۔ اس کے بعد چارپائی پر لیٹ کر، اس کے بعد، جب اس کی بھی طاقت وقوت بالکل جاتی رہی، تو تصور سے نماز ادا کیا کرتا۔ جس رات کو وہ دنیا سے چلا جائے گا کوئی حس و حرکت اس میں نہ رہی تھی، کچھ دیر تک آنکھ بند کیے رہا، اس کی والدہ سمجھیں کہ چلا گیا، اضطراب میں رونا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھ کھول کر کہا: ''آپ کو معلوم نہیں کہ میں آنکھ بند کیے تصور سے نماز ادا کرتا ہوں، اب بھی نماز ہی پڑھ رہا تھا۔ اسی رات کی صبح کو کہ جمعرات کے دن 13 / رمضان المبارک 1058ھ (مطابق 9 / ستمبر 1648) تھی ہوش تمام کے ساتھ اللہ کے ذکر میں اور میرے شیخ کی محبت لیے دنیا سے رخصت ہوا۔ میں نے اس کے احوال میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام میں نے اس کے نام پر ''رسالہ عظیمہ'' رکھا ہے۔ جس زمانے میں، میں لشکری تھا، شاہی خاندان کے ایک مغرور و متکبر شخص سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ جب اسے پتا چلا کہ میں اس سلسلۂ طیبہ نقشبندیہ کے غلاموں اور نیازمندوں میں سے ہوں، اور سلسلے میں میری نسبت دو واسطوں (خواجہ خرد اور مجدد الف ثانی) سے خواجہ بیرنگ سے ہے۔ اس نے خواجہ کا نام لیا اور اپنے زعم میں ایسا جملہ کہا جو نہایت نازیبا تھا۔ اس کو سن کر میری حالت بگڑ گئی اور میرا دل خون ہو گیا۔ غضب کی زیادتی میں بھرا مولانا عارف رومی قدس سرہٗ کے یہ دو شعر آہستہ آہستہ گنگنانے لگا:

چون خدا خواہد کہ پردہ کس درد میلش اندر طعنۂ پاکاں برد
ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد تا دلے مرد خدا ناید بدرد [1]

وہاں سے میں غم میں بھرا غصے سے دھواں دھواں خود کو ملامت کرتا ہوا کہ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے اوران کی باتیں سننے کی کیوں پڑی۔ رات کو اسی خلجان اور پریشانی میں سوگیا۔ دوسرے دن وہ بے ادب کہیں سفر پر روانہ ہوا، رات کو رہزنوں نے اس پر حملہ کردیا اور اس کے گلے پر ایسی آبدار شمشیر ماری کہ ایک روز تو ان بزرگوں کو خلاف ادب کہنے والے نے سخت تکلیف اٹھائی اور پھر حال تباہ اور محنت تمام کے ساتھ چیخ مار کر مرگیا۔ اسی بابت خواجہ شیرازی فرماتے ہیں

بس تجربہ کردیم دریں دار مکافات با دردکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد [2]

ایک رات کو میں نے اپنے بھائی سید حامد کو خواب میں دیکھا بعد اس کے کہ وہ کفار حربی کے ہاتھوں جمعہ کے روز ذی الحجہ 1055ھ (مطابق 4/فروری 1645) کی آخری تاریخ کو شہید ہوئے، اور محرم کی چاند رات 1056ھ (مطابق 5/فروری 1645) کی پہلی تاریخ کو اپنے دروازے کے آگے دفن ہوئے تھے کیونکہ انھوں نے خود اپنے دوستوں سے چند روز پہلے کہا تھا کہ میرا انتقال ہوجائے تو مجھے اس جگہ دفن کرنا، اور بھی باتیں اپنے انتقال سے متعلق کہی تھیں۔ وہ ایک سخی مزاج اور درویش صفت انسان تھے۔ میرے شیخ کو مانتے تھے، ان کے معتقد تھے اور شیخ وزیر محمد، سے، کہ جن کا ذکر گزرا ہے، صحبت رکھتے تھے۔ القصہ اس خواب میں ان کی نعش کو لائے اور اسی جگہ رکھا ہے۔ میں دیکھ کر رونے لگا تو انھوں نے کہا، ''خاموش خاموش یہ رونا کس لیے''؟ آخر میں نے ان کو شہید جان کر از روئے نیاز کہا کہ میں مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا [3] کی تمنا رکھتا ہوں کہ مجھے نصیب ہوجائے۔ انھوں نے نہایت فصیح زبان میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آخری

---

1 جب اللہ تعالیٰ کسی کو رسوا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو نیکوں اور بزرگوں پر طعنہ زنی میں مبتلا کردیتے ہیں۔ کسی قوم کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک رسوا نہیں کیا جب تک کہ کسی مرد خدا کا دل نہ دکھا ہو۔

2 ہم نے اس دار مکافات یعنی بدلے کی دنیا میں خوب تجربہ کرلیا ہے کہ جو بھی تلچھٹ پینے والوں سے (اہل دل سے) بھڑا وہ ڈھیر ہوگیا۔

3 موت سے پہلے مرجاؤ۔

منزل تک پہنچا دیا۔ قبر میں ایک مردہ زمین پر پڑا ہوا ہے، جب میں نے نگاہ ڈالی اور اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ ایک فقیر شخص ہے جس میں کوئی حس وحرکت نہ ہوئی۔ اسے دیکھ کر دل کا جو حال ہوا ہوا اس سے پہلے اسی سال 1055ھ میں جبکہ مجھے اپنے شیخ کی توجہ خاص سے اہل دنیا کی صحبتوں کے ترک کی سعادت نصیب ہوئی تھی اور طریقہ نقشبندیہ اور قادریہ کی اجازت ملی تھی اور دونوں شریف سلسلوں کے خرقۂ خلافت سے مشرف ہوا تھا، اور اسی سال شیخ نے مجھے ایک رسالہ ''طریقہ عالیہ'' کے نام سے، جو کہ دونوں طریقوں کی اجازت ارشاد اور ان فوائد جمیلہ پر مشتمل ہے، دیا۔ اس کے مطالعے کے بعد میں نے چند سوالات اپنے شیخ سے تحریراً دریافت کیے، انھوں نے ان سوالات کے جوابات تحریر کر کے ایک رسالہ بنا دیا۔ اس رسالے کے مقدمے سے بعض خاص مضامین کی عبارتیں ذیل میں لکھتا ہوں۔

''جب سیدی حقیقت ومعرفت آگاہی سید کمال محمد واسطیؒ اس فقیر کی وساطت سے حضرات نقشبندیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مخلصین اور محبین کے زمرے میں داخل ہوئے اور ان اکابر کی محبت اور خلوص میں استقامت حاصل کر لی اور خلوص نیت، ظاہری وباطنی اصلاح اور عزم واستقلال شریعت کے ساتھ ساتھ ان کے طریقے سے بہرہ ور ہو گئے تو سیدی ومولائی کو طریقہ عُلیہ کی تعلیم اور بیعت توبہ کرانے کی اجازت اور رخصت دی گئی۔ اسی رسالے میں ہے: ''چونکہ سیدی ومولائی سید کمال اس فقیر سے اتحاد وارتباط قوی رکھتے ہیں، اس لیے محبت اس کی مقتضی ہوئی کہ عطایائے الٰہی سے جو کچھ اس فقیر کو پہنچا تھا سیدی کو اس میں اپنا شریک کر کے طریقۂ قادریہ میں بھی خرقہ پہنانے اور مرید کرنے کی اجازت دے دی'' انتہیٰ۔ انھوں نے مجھے دعائے سیف دوانی (رحمانی) اور حزر یمانی، جو کہ دعائے سیفی سے مشہور ہے، حزب البحر اور اسماء اربعین اور دوسرے اعمال کی، کہ جن کی تفصیل دراز ہے، کی بھی اجازت عطا فرمائی ہے۔ شیخ کے قلم سے تحریری اجازت کی نقل:

(ترجمہ) فقیر حقیر عبداللہ (المعروف بخواجہ خرد) نے نجابت انتساب، محبت ومعرفت نصاب، اخوی، اعزی، اکرمی، اخی السید کمال کو مشہور اوراد اور دعاؤں کے پڑھنے کی اجازت دی، جیسی کہ اس حقیر نے شیخ عالم، عامل محقق، نقد المحدثین حضرت شیخ عبدالحق القادری سے اور انھوں نے اپنے شیخ کامل اور مکمل شیخ عبدالوہاب مکی متقی سے اور انھوں نے شیخ علی متقی سے

اور آگے اسی طرح ان کے منتسبین سے ان دعاؤں یعنی حرز یمانی المعروف
بسیفی، اور مشہور دعاء سیف رحمانی، اور مشہور دعاء حزب البحر اور الاسماء
الاربعین وغیرہ کی اجازت حاصل کی تھی۔ انتہی۔

پوشیدہ نہ رہے کہ پیران سلسلہ نقشبندیہ کا شجرہ پہلے ہی خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے ذکر میں مذکور ہو چکا ہے۔ باقی پیران قادریہ کا شجرہ، جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غوث کے آباء کرام کی معرفت ان تک پہنچ کر آگے بڑھا ہے، خواجہ محمد عارف تک یہ ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، حضرت سید علی، حضرت سید عبداللہ، حضرت سید موسیٰ، حضرت سید عبداللہ حضرت سید موسیٰ ثانی، حضرت سید محمد، حضرت سید اویس، حضرت یحییٰ زاہد، حضرت سید محمد عبداللہ، حضرت ابوالخیر، حضرت شاہ محی الدین عبدالقادر جیلانی، حضرت سید عبدالرزاق، حضرت سید شرف الدین قتال، حضرت سید بہاء الدین، حضرت سید عبدالوہاب حضرت سید عُقَیل، حضرت سید شمس الدین، حضرت سید گدا، حضرت سید شمس الدین عارف حضرت سید گدا رحمانی، حضرت شاہ فضل، حضرت شاہ کمال (کیتھل)، حضرت شیخ اسکندر حضرت شیخ گدا، حضرت شیخ محمد سعید، حضرت خواجہ محمد عارف، حضرت شیخ عبدالحق دہلوی قدس اللہ اسرارہم۔ جب میں اہل دنیا کی محبت کے ترک کی سعادت حاصل کر کے اور مذکورہ بالا عنایات کا مورد بن کر اپنے وطن پہنچا تو لڑکوں اور ان کی والدہ کو چھوڑ کر بعض متعلقین کے دلوں میں ضروریات زندگی کے سلسلہ میں یک گونہ تردد ملاحظہ کیا، تو میں نے دل میں عہد کیا اور نیت کی کہ توکل اور جمعیت خاطر کے باب میں کلام پاک کھول کر جو بھی آیت پہلے صفحہ کے اوپر آئے گی میری فال اس کے معنیٰ ہیں۔ جب کلام مجید کھولا تو یہ آیت کریمہ "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجاً وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ. وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْراً [1] " انہی دنوں شائبۂ غیر سے صاف

---

1 اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے (تنگیوں سے نکلنے کی) راہ نکال دیتا ہے، اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اپنا وہ امر تکمیل کو پہنچائے گا (البتہ) اس نے پہلے سے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

ستھری توجہ، اور خواہش کمالات و مقامات سے عریاں، احوال و کیفیات سے بے نیاز اختیارِ شغلِ باطن کے باب میں پہلی ہی طرح کلام مجید کو لے کر جب کھولا تو صفحہ اوّل پر پہلی سطر میں یہ آیت نکلی "قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوضِ يَلْعَبُونَ "[1] اس کے بعد اپنی خرابیوں پر جب نظر جاتی تو یک گونہ درماندگی اور اس راہ کی ناواقفیت سے خود کو حد درجہ شکستہ خاطر اور اس کارِ اصلاح کے لیے بالکل ناموزوں پاتا تھا۔ ایک دن اسی بارے میں خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی "کلیات" کو، جو میرے پاس رہتی ہے، کھولا تو یہ شعر نکلا:

وقت کماں است نشستن کہ چہ　　آخر زہ نیست شکستن کہ چہ [2]

ایک دن میں خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کی قبر مبارک کے پاس نہایت عجز و نیاز کے ساتھ مراقب بیٹھا تھا۔ بےخودی، بے صفتی اور بے رنگی کی نسبت نے جلوہ دکھایا کہ کسی طرح بھی اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے شیخ کی بات یاد آ گئی، کہتے تھے کہ جن ایام میں خواجہ بیرنگ لاہور تشریف رکھتے تھے، وہاں کے مشائخ میں سے کسی نے لوگوں سے کہا کہ ہم نے خواجہ کی نسبت سلب کر لی ہے۔ آخر یہ جملہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ تک پہنچ گیا۔ سن کر فرمایا کہ پہلے تحقیق کریں پھر ایسا کہیں۔ یہ ویسی ہی بات ہوئی کہ ایک بزرگ نے حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ سے اعتراضاً کہا۔ چاہے آدمی کے پاس مالِ حلال ہی ہو مگر حساب تو درپیش ہے ہی۔ آپ نے فرمایا تب ہی تو حساب کی پکڑ فرمائیں گے جب کوئی کسر دیکھیں گے۔ رسالہ "قدسیہ بہائیہ" میں حضرت خواجہ محمد نقشبند نے فرمایا ہے کہ حضرت اویس قرنی کی روح مبارک کی جانب متوجہ ہونے کا اثر انقطاع تام اور خلائق سے تجرید کلی بالکل کھلی بات ہے۔ جب قدوۃ الاولیاء خواجہ محمد علی حکیم ترمذی قدس اللہ روحہ کی روحانیت کی طرف توجہ کی جائے تو اس کا اثر ظہورِ احدیت ہوتا ہے۔ جس کو بھی یہ توجہ نصیب ہو جاتی ہے اس میں کوئی اثر، کوئی گرد صفات کی نہیں دیکھی جاتی۔ جب کسی کی روح انوارِ احدیت میں محو ہو جاتی ہے تو ہر چند کوئی اپنے کشف و ادراک کو بروئے کار لائے، اس میں بے صفتی اور بے تعینی کچھ نہ دیکھے گا۔ انتہیٰ۔ حضرت خواجہ محمد پارسا قدس سرہٗ نے اسی ضمن میں اس رسالہ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت

1　اللہ نے کہا (ان کفار کو) ان کی لایعنی گفتگو میں رہنے دیں۔ (یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے)

2　کمان اٹھانے کا وقت ہے بیٹھنا کیا۔ کیا تو کمان کا چلہ نہیں ہے ٹوٹتا کیوں نہیں۔

خواجہ محمد نقشبند نے ان باتوں کو اپنے مبادیٔ سلوک کے زمانے کی حکایت کے طور پر، جب آپ مشائخ کبار کی ارواح طیبات کی جانب توجہات کیا کرتے تھے اور ان کی نسبتوں کا آپ پر ظہور ہوتا تھا، بیان فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے: ''اولیاء اللہ مختلف قسم کے ہیں، بعضے بے صفت و بے نشان اور بعضے صاحب صفت ونشان صاحب صفت ونشان کے لیے مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ اہل معرفت ہیں، فلاں اہل معاملت یا اہل محبت یا اہل توحید میں سے ہیں، حالانکہ درجات اولیاء کا اکمل درجہ بے صفتی، بے نشانی اور بے رنگی کو کہا گیا ہے۔ بے صفتی سے اشارہ تحقق اور کشف ذات بہت ہے جو کہ نہایت بلند اور شریف مقام ہے۔ عبارتیں اور اشارے اس مرتبے کی کنہ سے قاصر ہیں۔ یہ باتیں متوسط لوگوں کی نسبت سے ہیں کہ بے صفتی کا ادراک نہیں کر سکتے، ورنہ کاملان اس مرتبہ کے ادراک سے قاصر نہیں۔ مثنوی

بر تر از علم است و بیرون از عیان	دانش اندر ہستی خود زد نشان
نشان او جز بے نشانی کس نیافت	چارۂ جز جان فشانی کس نیافت
گر عیان جوی نہان آنکہ بُود	ور نہان خوانی میان آنکہ بُود
ور بہم جوی چون بے چونست او	چون و بے چون ہر دو بیرونست او
صد ہزاران طور از جان برتر است	ہر چہ خواہم گفت او زان برتر است[1]

اس کی یافت میں عاجزی اس لیے ہم راہ ہوگئی کہ وہ نہ تو وصف میں آتا ہے نہ شرح میں۔ اس بے صفتی کے مرتبے کا کمال تو حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے خاص ہے۔ تمام اولیاء اللہ ان مرتبوں کے لحاظ سے ان ہی کے خرمن سعادت

---

1 وہ ذات وحدہ لا شریک لہٗ علم وبیان سے برتر ہے۔ عقل نے یہاں آکر خود پر سوالیہ نشان لگا دیے ہیں کہ میں یہاں ہیچ در ہیچ ہوں۔ اس کا نشان بے نشانی کے علاوہ کسی نے نہیں پایا۔ اس کی یافت کے لیے علاوہ جاں فشانی کوئی چارہ نہیں، یعنی فنا شرط ہے۔ اگر تو اسے ظاہر میں تلاش کرے گا تو وہ نہاں ہو جائے گا اور اگر باطن میں ڈھونڈے گا تو وہ عیاں میں چھپ جائے گا۔ اگر تو اسے کثرت میں تلاش کرے تو وہ تو بے چوں ہے چوں کیسے ہو۔ وہ ذات چون و بے چون دونوں سے باہر ہے۔ سیکڑوں ہزاروں طور سے جان سے وراء الوراء ہے، حالانکہ شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ میں جو کچھ بھی بیان کروں گا وہ ذات اقدس اس سے بالاتر ہے۔

کے خوشہ چینوں میں ہیں اور ان ہی کے باطن مقدس سے مدد لے کر اس مرتبے کے درجات میں ترقی کرتے ہیں جو حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہے۔ یہ اس مرتبے کے کمال کی جانب اشارہ ہے۔ بے صفتی کے مرتبے کے خواص میں سے یہ بات ہے کہ اس مرتبے کا صاحب اہل تمکین میں سے ہوتا ہے، مقلب القلوب کے دست قدرت سے پیوستہ ہوتا ہے، تمام صفات اور اخلاقیاتِ الٰہیہ سے متصف ہوتا ہے۔ اور متصرف ہوتا ہے۔ اسے ابوالوقت کہتے ہیں۔ ایک صفت سے دوسری صفت کی جانب خود منتقل ہوسکتا ہے۔ بشریت کے بقایا جاتِ نفسانی سے بالکل صاف ہو چکا ہوتا ہے۔

صوفی ابن الوقت باشد در مثال   لیک صافی فارغست از وقت و حال
حالہا موقوف عزم و رائے اوست   وقت ہا باشد جہان آرائے اوست [1]

ایک دن میرے شیخ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی قبر پر مراقب ہوئے اور مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا، میں بھی مراقبے میں بیٹھا۔ اس مراقبے میں میں نے ذوق وشوق اور عشق ومحبت محسوس کی۔ افاقت کے بعد حقیقت حال کو شیخ سے عرض کیا تو کہا: ''الحق نسبتِ شیخ یہی ہے''۔ اس اتحاد پر میں نے شکر الٰہی کیا کہ اپنی دریافت کی سچائی کی میں نے ان سے تصدیق کر لی۔ ایک بار میں صاحب ولایت امردہوی قدس سرہٗ کی قبر پر مراقب ہوا۔ نسبتِ بے رنگی نہایت لطافت کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ اس نسبت کی ہم رنگ جیسی خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ سے پائی جاتی ہے۔ ایک بار میں کچھ دیر کے لیے شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری قدس سرہٗ کی قبر کے پاس مراقبے میں بیٹھا، شیخ کو مراقبے میں متوجہ وحدہٗ لاشریک لہٗ بیٹھا دیکھا۔ یہ واقعہ شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری قدس سرہٗ کے نواسے کے ذکر میں بھی مجملاً گزرا ہے۔ اس حکایت کی تفصیل میں نے اپنے رسالے ''سفر وطن'' میں لکھی ہے۔ ایک دن میرے شیخ لاہور میں ایک تازہ وفات پائے ہوئے مردے کی قبر کے پاس مراقب ہوئے تا کہ اس کی نسبت معلوم کریں، اور مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا، خود میں بھی مراقب ہوا۔ انھوں نے دریافت کیا: ''کیا ظاہر ہوا؟'' میں نے کہا: ''اسے بے چین دیکھتا ہوں''۔ انھوں نے بھی فرمایا

---

1 یوں سمجھو کہ صوفی وقت کا تابع ہوتا ہے، لیکن صافی وقت وحال سے فارغ ہے۔ حال تو اس کے ارادے اور رائے کا غلام ہے۔ وقت کل جہاں آرائی صافی ہی کا کام ہے۔

:''میں بھی اس کو مضطرب پاتا ہوں''۔ یہاں بھی اپنے صدق دریافت پر خدا کا شکر بجالایا۔(سچ ہے)۔ كَمَا تَمُوتُونَ تُبْعَثُونَ [1]

''چوں میرد مبتلا میرد چوں خیزد مبتلا خیزد'' [2]

دلاورامروہوی جو کہ ایک صاحب ذوق وسماع صالح مرد ہیں، شیخ فریدالدین شکر گنج قدس سرہٗ کے عرس (وفات) کے روز فقرا کو ان کے ایصال ثواب کے لیے وہاں جاکر شکر تقسیم کیا کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک رات گنج شکر کو خواب میں دیکھا کہ فرمارہے ہیں کہ کچھ شکر سنبھل میں بھی پہنچاؤ۔اس کے بعد سے وہ ہر سال کچھ شکر سنبھل پہنچاتے ہیں تاکہ فقرا میں تقسیم کریں۔میر سید فیروز نے ایک دن مجھ سے کہا کہ میرے دل میں یہ وسوسہ آیا کہ سید کمال کو اس راہ سے کوئی بہرہ نصیب ہوا ہے یا نہیں؟ اسی خیال میں جب رات کو سویا تو دیکھا کہ بہت سے مشائخ کبار اور فقرا باوقار نماز کی صف میں بیٹھے امام کا انتظار کررہے ہیں کہ تو پہنچا اور اس جماعت کی امامت کے لیے آگے کھڑا ہوگیا۔'' پوشیدہ نہ رہے کہ میرے شیخ نے خاص تنہائیوں میں اپنے خصوصی احوال اور مکاشفات مجھے بتلائے ہیں، اور ان کو فی الحال لکھنے سے منع فرمایا ہے اور ان کے ظہور کے اوقات پر موقوف رکھا ہے۔خود مجھے بھی ان ہی احوال و مکاشفات کی بشارت دی ہے۔ان کو کسی مناسب وقت میں بندہ انشاءاللہ سبحانہ علاحدہ لکھے گا۔میرے شیخ نے مجھ پر جو لطف وعنایت کی ہے اس کے لکھنے کی بھی قدرت نہیں ہے۔اس میں سے جتنا کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ میری بابت بارہا فرمایا کہ'' اِس دنیا میں میرا دوست اور میرا یار علاوہ کمال کے کوئی نہیں''۔والحمدللہ والمنۃ کہ میں بھی اِس دنیا اور اُس دنیا دونوں میں ان کی ذات اقدس کے علاوہ کوئی دوسرا یار و مددگار نہیں رکھتا۔الحمد للہ ثم الحمدللہ والمنۃ للہ۔

اب اس راہ فقر و درویشی کی وہ باتیں لکھتا ہوں جو مجھے میرے شیخ نے تحریراً عطا کی ہیں۔ان میں سے چند مکتوبات یہ ہیں۔مناجات۔(خداوندا اپنے تمام دوستوں، اولیاءاللہ، فرشتوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے یا جنوں میں سے خاص کر اپنے حبیب اور صفی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم،

---

1 جیسے مروگے ویسے ہی اٹھائے جاؤگے۔

2 جب مرتا ہے بلاؤں میں مرتا ہے، جب اٹھتا ہے بلاؤں میں مبتلا اٹھتا ہے۔

ان کے صحابہ کرام، ان کی اولاد عظام علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والتحیات کے صدقے، خداوندا! تمام امت کے مشائخ وہ سلف ہوں کہ خلف ہوں، مقدم ہوں یا مؤخر کی حرمت کے طفیل، اے اللہ ! جو کچھ تیرے لفظ ''کُن'' کے تحت آتا ہے، ارضیات ہوں، فلکیات ہوں روحانیات ہوں یا موجودات، جنھیں تو نے اپنی ذات، صفات اور افعال کے مظاہر کے طور پر بنایا ہے، اپنی اس فطرت کے صدقے، اے اللہ! نیازمندی کی اس شان کے صدقے جو ہر موجود کی پیشانی میں تو نے ودیعت کی ہے۔ خداوندا! تجھے اپنی اس محبت کا صدقہ جو تجھے اپنے آپ سے ہے۔ اے اللہ! ہر اس رحمت کا واسطہ جو تیرے علم میں ہے۔ اے اللہ! تجھے تیری عزت کا واسطہ کہ مجھے میرے حوالے نہ چھوڑ اور عدم کے دریا میں ایسا گم کردے کہ پھر اپنا نام ونشان نہ پاؤں۔ اے خدا ! تیرے دریائے قدرت میں میری ہستی کے قطرہ سے کیا بڑھ جائے گا اور میرے نہ ہونے سے کیا کمی آجائے گی۔ اے اللہ! یہ بلبلہ جو دریا کی سطح پر جلوہ گری رکھتا ہے اسے گم کردے۔ خداوندا! مجھے نیستی کی ہوا میں اڑا لے جا۔ اے اللہ! جو کچھ ہے تو ہی ہے، مجھے کب ''میں'' کہنا چاہیے ''میں'' کہنا تو تجھے ہی سزاوار ہے۔ جب تو ''میں'' کہتا ہے تو میں ''میں'' کہتا ہوں۔ خداوندا! ہستی تیری ہی ہے، میں کب تک خود پر تہمت ہستی رکھوں۔ اے اللہ! جسم میں گرفتار میری زندگی کو موت سے وابستہ کر، ایسا عدم بخش کہ نہ میری روح رہے، نہ میرا نام۔ اے اللہ! دوزخیوں کو دوزخ، جنتیوں کو جنت دے دے اور مجھے ان دونوں کی دردسری سے آزاد کردے۔ اے خداوند! مجھے دنیا اور آخرت نہیں چاہیے میرے لیے بس تو کافی ہے۔ اب فقیر چند جملے عشق کے مراتب کی تحقیق میں لکھتا ہے، گوش تامل سے سنیں۔

ا۔ سب سے اعلیٰ درجے کا عشق تو وہ ہے جو حسن حقیقی کو اپنی ذات سے ہے۔

دوسرا مرتبہ جو اس سے متصل ہے وہ صفات حق کو ذات حق سبحانہ سے ہے۔

اس کے بعد وہ عشق ہے جو صفات حق کو اپنے آپ سے ہے۔

اس کے بعد وہ عشق ہے جو افعال حق کو ذات حق سے ہے۔

اس کے بعد وہ عشق ہے جو افعال حق کو صفات حق سے ہے۔

اس کے بعد وہ عشق ہے جو افعال حق کو خود سے ہے۔

اس کے بعد وہ عشق ہے جو آثار افعال حق کو ذات حق سے ہے۔

اس کے بعد وہ عشق ہے جو آثار افعال حق کو صفات حق سے ہے۔

اس کے بعد وہ عشق ہے جو آثار افعال حق کو خود سے ہے۔

یہ عشق کا ادنیٰ درجہ ہے۔ جب تم نے یہ بات سمجھ لی کہ ہر مرتبے کا وجود و ظہور واجب الوجود کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے جو واسطۂ عشق ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو موجودیت کوئی صورت نہ پاتی۔ ہر مرتبۂ وجود کی تحقیق اور توضیح اُس مرتبے کے ادراک اور وصول پر موقوف ہے (نہ کہ صرف پہچاننے پر)۔ انشاء اللہ اگر وقت ملا تو اس کی تحقیق اور توضیح کے سلسلے میں لکھا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ وحدت اشیا کے معنیٰ کے ملاحظے میں وجود حقیقی نہیں رکھیں، متوجہ رہیں۔ فقیر کی خاطر کو اپنے شامل توجہ سمجھیں۔ والسلام والتحیہ۔

سیدی کمال کا گرامی نامہ عجیب صفائی پیدا کرتا ہے۔ دل جو تصورات گونا گوں کا نگار خانہ تھا، وحدت آباد اور قرار گاہ احدیت بن گیا ہے۔ الحمد للہ والمنۃ بندہ محض الطاف ربانیہ سے اس دیرینہ آرزو سے سرخ رو ہو گیا۔ خداوند مجھے اپنے ہر ماسوا سے رہائی بخش کر اپنے دریائے جمال بے نہایت میں مستغرق اور مستہلک بنا کر خود نمودار ہو گیا ہے۔ کیونکہ میں غیر حق کو حق سمجھ کر بہت زمانے تک نادانی کی وادیوں میں بھٹکتا پھرا ہوں، اس لیے آجکل میرے دل میں داعیہ ابھر رہا ہے کہ ایک رسالہ ایسا ترتیب دیا جائے جو کہ کمالِ انسانی کی دلیل بنے، اور تمھاری محفل کے لیے ایک تحفہ قرار پائے۔ توجہ فرمائیں کہ اس کے سرانجام کی صورت پیدا ہو جائے۔ والسلام۔

آں برادر کو معلوم ہے کہ فرصت اور مشغولی کے اوقات میں جس لباس میں، جس حال میں، جہاں بھی رہیں، جس طرح بھی میسر ہو اس شغل باطنی سے خالی نہ رہیں۔ معبود اسے جانیں، مقصود اسے سمجھیں اور موجود اسے پائیں۔ پہلی بات شریعت ہے، دوسری طریقت ہے اور تیسری حقیقت ہے۔ اگر یہ تینوں شریعت، طریقت اور حقیقت ایک اجتماعی صورت پیدا کر لیتی ہیں تو یہ شئے واحد معرفت ہے۔ نہایتِ کار یہ ہے۔ اس عبارت کی ہر سطر معرفت کا ایک دفتر ہے۔ تیسری چیز ''حقیقت'' کی تقویت میں کوشاں رہیں جو سب سے اہم ہے، اور پہلی چیز ''شریعت'' دوسری ''طریقت'' اور چوتھی ''معرفت'' کے لازم ہے۔ مگر کوشش کا نتیجہ اختیاری نہیں ہے۔ اختیار اللہ

وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لیے ہی ہے۔ نماز پنجگانہ کے بعد خلوت ہو یا جلوت، صحبت ہو یا عزلت، اس معنیٰ کا ہر دم دھیان رہے اور وحدت کے معنیٰ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیں، اسی میں ہماری تمھاری بھلائی ہے۔ اس لیے بندہ بہت تاکید کر رہا ہے، اور باوجود خود میں اتنی خرابیاں ہوتے ہوئے اس راہ عشق و محبت و حقیقت کی باتیں کر رہا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے اور تمھیں غیر سے نجات دے کر خود کا اسیر بنالے اور اس گرفتاری میں ایسے کر دے کہ ہمیں اپنا شعور ہی نہ رہے

کار این است و غیر ایں ہمہ ہیچ [1]

ہمیشہ یادِ خداوندی میں رہیں۔ ہمیشہ درگاہ خداوندی میں تضرع کے ساتھ دعا کیا کریں کہ حق سبحانہ اپنے کرم سے اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سیدھے راستے (صراط مستقیم) کی ہدایت بخشے۔ ہمیشہ بغیر کسی صفت کا لحاظ کیے مطلق ذکر ذات خداوندی کرتے رہیں۔ ذکر (طریقۂ نقشبندیہ) یہ نہیں ہے کہ زبان سے لفظ ''اللہ'' یا اور کسی صفاتی نام کے ساتھ تکلم کریں یا اس کا تصور کریں۔ تحقیقی اور ذاتی ذکر وہ ہے جو صفات میں مقید نہیں ہے، خواہ وہ صفات وجوبی ہوں یا امکانی۔ وہ ذات جو کہ نہ صرف واجب ہے، نہ صرف ممکن، بلکہ واجب بھی ہے، ممکن بھی ہے اور ہر دو سے وراء الوراء بھی ہے۔

نہ واجب ہے نہ ممکن، چاہیے کہ ہمیشہ نظر میں رہے۔ اس ذات لامحدود و لامتناہی کے ظہور وجود بسیط غیر متجزیٰ میں منحصر خیال کریں۔ جب اس مرتبۂ ذکر کی مداومت اور ملازمت میسّر ہو جائے تو امید ہے عکس وحدت باطن پر پڑ جائے اور تجھے تجھ سے لے اڑے۔ یہ اس راہ کا پہلا قدم ہے اللہ تعالیٰ نصیب کرے۔ اے بھائی عجب زمانہ آ گیا ہے، کارِ وحدت (عقیدۂ توحید) میں ہوشیار رہنا چاہیے تاکہ شیطان دھوکہ نہ دے سکے۔ خواجہ حسام الدین احمد کا اس عالم سے چلے جانا مسلمانوں کے لیے عظیم آزمائش کا وقت ہے۔ دنیا جہان کی خیر و خوبی اس قسم کے لوگوں کے وجود سے وابستہ ہے، جب ایسے حضرات گزر جائیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ برائیوں اور خرابیوں میں مبتلا نہ فرمائے۔ حضرت شیخ میاں مرتضیٰ کا وجود سنبھل میں بہت غنیمت ہے، جبکہ تم وہیں رہتے ہو، ہمیشہ ان کی ملازمت میں رہا کرو اور ان کی صحبت کو خوش نصیبی سمجھو۔ اس فقیر کا بھی ان کی خدمت میں کبھی کبھی تذکرہ کرتے رہا کرو، اور ان سے اس فقیر کے لیے دعا اور توجہ کی

---

1 کام تو یہ ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے ہیچ در ہیچ ہے۔

درخواست کیا کرد، اور خود بھی فاتحہ (دعا) کریں اور توجہ الی اللہ فرمائیں کہ حق سبحانہٗ آفات اور بلاؤں سے محفوظ رکھے اور اس عالم سے ایمان کے ساتھ لے جائے۔ اور کیا لکھوں، جو لکھوں گا تم بھی جانتے ہو۔ اگر ہزاروں دفاتر بھی لکھ کر بھر دیے جائیں، حاصل ان سب کا یہی ہے کہ با خدا رہیں، خدا کو سب کے ساتھ اور سب سے جانیں اور دیکھیں۔

اے بھائی! وصیت بس یہی ہے کہ خدا ایک ہے، اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ موجود حقیقی۔ دوسروں کی ذوات ہوں، صفات ہوں، ایک افعال ہوں، سب تجلئ ذات وصفات وافعال خداوندی کے پرتو کے آثار ہیں۔ جو کچھ سمجھ وخیال میں آتا ہے یا جو کچھ نظر آتا ہے وہ تجلئ افعال ہوں، صفات ہوں یا ذات ہوں، وہی ہے۔ ایک ہی موجود ہے کہ اس کا باطنی نام ''رب'' اور ظاہری نام ''عبد'' ہے۔ ہمیشہ اپنی حقیقت، جو کہ حقیقت الحقائق ہے، کی جانب متوجہ رہو۔ اس طرح کہ جیسے روح جسم کا لباس ہے، روح حق کا لباس ہے۔ بس جسم وروح دونوں حق کے جسم ہیں اور وہ ان دونوں کی روح (روح الروح اور روح الجسم) ہے، فافہم۔

دوسری وصیت یہ ہے کہ تہذیب اخلاق کے بغیر چارہ نہیں ہے، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ ہر ایک سے دوستی رکھو، مگر ہمیشہ دوست (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ رہو۔

ایک وصیت یہ ہے کہ ہرگز فرائض، واجبات اور سنن مؤکدہ کسی بھی عمل سے غافل نہ رہو، اور محرمات ومکروہات سے اجتناب رکھو، اس طور پر کہ جو کچھ دین میں ہے اسے بجالاؤ۔

ایک اور وصیت یہ ہے کہ ہمیشہ ایسے حضرات خواجہ بزرگ، خواجہ محمد نقشبند، خواجہ عبید اللہ احرار اور خواجہ باقی باللہ قدس اللہ اسرارہم کی قبور وارواح طیبہ کی جانب ہمیشہ ایسے متوجہ ہو جیسا کہ اہل قبور کی طرف توجہ کا طریقۂ بزرگان نقشبندیہ رہا ہے۔ حق سبحانہ اپنے کرم خاص سے سلوک اور عجز و نیازمندی کی توفیق کو روز بروز افزوں کرے۔ وہ مقام وحال جس کے ساتھ رنگ فنا اور نیازمندی نہ ہو علّت ہے اور اس حال ومقام کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہاں ہاں فنائے کامل کے بعد جو عنقا سے بھی زیادہ نایاب اور کم یاب تر ہے، کبریائی دیگر صفات کے ساتھ ظہور کرتی ہے۔ یہ فانی فی اللہ مظہر حق اللہ پاک کی درگاہ میں مقبول ہے نہ کہ دور، حالانکہ اس کا نام ونشان بھی نہیں رہا ہے۔ اس مرتبے پر پہنچ کر جو کچھ ظاہر ہوتا ہے سب حق سبحانہ سے منسوب ہوتا ہے۔ غوث پاک سے اللہ

تبارک وتعالیٰ کا جو کلام واقع ہوا ہے اسی مقام کو بیان کرتا ہے۔ اے غوث جب فقر تمام ہو جاتا ہے تو فقیر کا عیش گویا اللہ کا عیش بن جاتا ہے۔ اللہ والے تخلق الٰہی سے متصف ہو جاتے ہیں۔ احقر اپنی خرابیٔ حال کو کیا لکھے کہ اس خرابی کے باوجود اس طرح کی گفتگو کرتا ہے، پتا نہیں اس میں کیا راز پوشیدہ ہوگا کہ جس کا بار نہ مومن اٹھا سکتا ہے نہ کافر، نہ بہشت اس کی جگہ ہے نہ دوزخ، وہ ایک گناہ گار بندے سے اٹھوا رہا ہے۔ اللہ اللہ بات کہاں سے کہاں جائے گی اور میں ہوں کیا؟ میں تو کچھ بھی نہیں، جو بات آسمان وزمین سے آگے کی ہے میری زبان سے کہہ رہے ہیں اور مجھے ویسے ہی حیرت اور وارفتگی کی گھاٹی میں سرگرداں کر رکھا ہے۔ آخر کون سے دروازے میں داخلہ دیں گے اور کون سے در سے باہر نکالیں گے۔ کبھی کبھی اس درماندہ محروم ومہجور کے حق میں فاتحہ (دعا) کیا کریں اور توجہ الی اللہ بھی مبذول رکھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ کے گھر میں اللہ تعالیٰ نے لڑکا عطا کیا ہے، یہ بھی اشارہ ہوا ہے کہ میں اس کا نام متعین کروں۔ اس فقیر کے دل میں ایسا آتا ہے کہ مخدوم زادے کا نام "سید وحید الدین محمد ابوالمعالی [1] " رکھیں۔ وحید الدین لقب، محمد نام، اور ابوالمعالی کنیت ہے حق سبحانہٗ وتعالیٰ مبارک کرے اور اس کو برخوردار اور سعادت بار بھی کرے۔

الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفیٰ، اما بعد: آں زبدۃ الاخوان سید کمال کے دو مکتوب ایک ساتھ پہنچے، ایک لاہور سے لکھا ہے اور دوسرے کا پتا نہیں چلا کہ کہاں سے ارسال کیا ہے۔ دونوں شفقت اور محبت تمام پر مشتمل تھے۔ **جزاک الله خیر الجزاء**، آں برادر کو معلوم ہو کہ اس کام میں اصل چیز فنا اور نیستی کی صفت ہے۔ حضرت **خالق السماوات والارض جل وعلا** کی درگاہ سے ہمیشہ نرمی وانکسار کے ساتھ پیوستہ رہیں، ساری مخلوقات کے سامنے وہ عالی ہو یا اسفل، شریف ہو یا رذیل، فرشتے ہوں، جن ہوں یا انسان، شکستہ اور خاکسار بن کر رہنا چاہیے (خود کو سب سے کمتر سمجھنا چاہیے) ہر چیز کو مقصود کا وسیلہ بنانا چاہیے اور شریعت مصطفویہ علیہ الصلاۃ والسلام کے چمکیلے زیور سے خود کو آراستہ پیراستہ رکھنا چاہیے۔ **اللهم صل وسلم وبارک علی صحبها صلاةً وسلاماً وبركةً تامةً وكاملةً وعلى آله وصحبه وتابعيه الى ابد الآباد**۔ اے برادر اس خاص الہامی مضمون کو میں نے بار ہا لکھا ہے، اور ان ہی دونوں دولتوں کے

---

1 پسر سوم سید کمال محمد واسطیؒ

حصول کے لیے بار بار تاکید کرتا رہا ہوں۔ جب بھی چاہتا ہوں کچھ اور مضمون تحریر کروں یہی دو معنیٰ سبقت کرتے ہیں۔ خدا سے چاہتا ہوں مجھے اور تمھیں دونوں کو اس کا سامان مہیا کرے۔

اے بھائی! توحید میں درجہ اوّل توحید افعالی ہے کہ تمام افعال کو اسی طرف سے از روئے حال جانے نہ کہ از روئے علم وتقلید جو کہ عوام المسلمین کو بھی میسر ہے۔ جب یہ درجہ کسی کو از روئے حال نصیب ہو جائے تو یقینی بات ہے کہ اس کے دل ودماغ سے ہر ایک کی عداوت اور نزاع اٹھ جاتا ہے۔ اس مقام کی پہچان یہ ہے کہ حلوا بخشنے والا اور تھپٹر مارنے والا ایک ہو جائے۔ کیونکہ توحید کے درجات عالیہ کا منشا صفتِ محبت وجذبے کا اظہار ہے۔ اسی لیے صاحب توحید اوّل، اوّل درجات میں ہی مقام رضا کو پہنچ جاتا ہے۔ دوسرا مرتبہ توحید کا توحید صفاتی ہے کہ تمام اوصاف ذات کو جو کہ افعال کے ظہور کا مبدا ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرے، جیسے حیات، علم، ارادہ اور قدرت، ''قدیر'' اور ''عالم''، اسی طرح ''حی'' اور ''مرید'' اسی کو جانے۔ اس مقام میں تمام اجزائے عالم کو جماد محض سمجھے۔ توحید میں اصل توحید، توحید ذاتی ہے جو یہ ہے کہ ساری ذوات کو اور موجودات کو اسی کی طرف لوٹائے اور صرف تنہا ایک ذات غیر متناہی کو دیکھے کہ وہی صور روحانیہ اور جسمانیہ میں متمثل اور مصور ہے۔ اس مقام میں معقول، محسوس اور موہوم، عاقل، حساس اور واہم فقط وہی ایک ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ ہوتی ہے۔ معقول عالم ارواح ہے، موہوم عالم مثال ہے اور محسوس عالم شہادت ہے۔ حالانکہ یہ تینوں طبقے خارج میں علم وعقل، وہم وخیال اور تمثل کی وجہ سے حقیقت وجود کا پردہ بن گئے ہیں۔ اس مقام اصل توحید میں تمام اوصاف کاملہ کے ساتھ شہود وجود اسی کی ذات ہے، سالک کا نام ونشان بھی درمیان میں نہیں رہتا۔ بقا کے تحقق کے بعد جو فنائے حقیقی ہے، اس مقام میں میسر ہوتی ہے۔ صفات وجوبیہ کی تحقیق بھی اسی مقام میں ہوتی ہے۔ ناقصین اور مریدین کے ارشاد اور کمال بھی اسی مشہد میں ہیں۔ خوارق اور عجائب کا ظہور بھی اسی توحید کی تحقیق کے مقام میں ہوتا ہے۔ جو مذکورہ بالا علامات سے بہرہ ور نہ ہو اور اس مقام تک نہ پہنچا ہو، اور ابھی تک اس کا علم اس کے ساتھ ہے، اور اس مقام کا مدعی ہو، اسے حال کا ایک حرف بھی نہیں، صرف تخیل محض رکھتا ہے۔ اس تطویل سے مقصد یہ ہے کہ اس زمانے میں ایک ایسی جماعت یکجا ہوگئی ہے جو ہر ذرّے میں شہود حق کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ کہہ کر (اس جماعت کے لوگ) اپنی گردن کو شریعت کے

پٹے سے آزاد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب بیگانگی نہ رہی، یگانگی آگئی تو عبادت کی ضرورت نہ رہی۔ نماز روزہ غافلوں کے لیے ہیں نہ کہ حاضروں کے لیے۔ یگانگی کے موقع پر دوئی کا اظہار کرنا کفر ہے۔ یہ مردود اور ملحدان خدا اور رسول ہیں۔ حاشا وکلا کہ توحید منافئی اعمال شرعی ہو۔ باطن ہمیشہ وحدت میں غرق رہے اور ظاہر ہمیشہ محتاج اعمال و احکام شرعیہ رہنا چاہیے کہ باطناً وحدت الوجود کے معتقد رہیں، یہی اصل نصیحت ہے جو بار بار کہی گئی ہے۔ جب تک کسی شخص میں عقل وہوش ٹھکانے ہے، ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ تکلفات شرعیہ سے باہر نکل آیا ہے، اب اسے عمل بر شریعت کی حاجت نہیں۔ خوب سمجھ لیں کہ (ایسا کرنیوالا) طریق حق صراط مستقیم سے منحرف ہوگیا ہے۔ اور جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے اسے عین مقصود بنائیں اور ہر ایک کے ساتھ نیازمندی اور خاکساری سے معاملہ کریں، یہ بات اس کے مظہر حق بننے کی وجہ سے ہے۔ جب دین ومذہب کی بات آئے تو مستقیم رہیں اور ذرہ بھر تجاوز نہ کریں۔ جو جماعت شریعت کی بے ادبی کرتی ہے وہ حق سے محروم ہو جاتی ہے۔

ذوالفضل والکمال الاخ السید الشریف الکریم الموسوم بالجمال (کمال) اسعد اللہ العاشقین بجمالہ کی خدمت میں دعوات طیبہ وفاتحہ اجابت کی امید کے حال اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ وعزّ برُھانہ کی طرف سے جس کی ذات صاحب فضل وانعام اور سب سے بلند و برتر ہے، قبولیت کے اوقات میں پہنچے۔ رقیمہ کریمہ، جو کہ گوناگوں مہربانیوں اور خاطر شریف کی اقبال مندیوں کی مثال ہے، حسینِ وقت اور ملیحِ زماں شیخ محمدی کے بدست پہنچوایا ہے۔ وہ لذات قویہ معنویہ کے حصول اور وصول کا ذریعہ بن گیا۔ قلمدان، ٹوپی اور کمربند اور جو کچھ قلمدان میں سامان کتابت تھا، مل گیا۔ آلات کتاب بھیجنے سے اشارہ اس طرف ہوتا ہے کہ صحیفۂ دل پر علوم حقیقیہ اور معارف یقینیہ کو لکھنا چاہیے، اور اس محل پر ثبت کرنا چاہیے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قلم سے ذکر کی طرف اشارہ ہے، لیکن ہر ایک ذکر نہیں بلکہ اس ذکر کی جانب اشارہ ہے جو ذاکر کو مذکور تک پہنچادے اور وصل کا ذریعہ بن جائے۔ لہٰذا اس کو واسطہ کہتے ہیں جو کہ اس ذکر کے مشابہ ہے جو قوت وصل رکھتا ہے۔ سیاہی کا قلمدان میں ہونا، اُس سے اِس جانب اشارہ ہے کہ یہ ذکر سیاہی سے ملا دیتا ہے، کیونکہ فنائے ذاتی میں سارے انوار کوتاہی کرتے ہیں، یہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے جو انوار کی اصل ہے۔ قلم تراش

سے تیزئی طلب کی جانب اشارہ ہے کہ قلم تراش طلب قلم ذکر کو ناراستی اور ناروانی سے محفوظ رکھتا ہے۔ جبکہ طلب شدید دامن گیر نہ ہو ذکر کا کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا اور دل پر نقش جمتا ہی نہیں۔ بغیر طلب شدید کے ذکر اوراد کا حکم رکھتا ہے جو وصل میں بالکل نفع نہیں دیتا۔ اس حقیقت کو سمجھ لے کہ بہتیری یہ تیزئی طلب ہی تیری خطاؤں اور تیری بھولوں کو، جو غیر اللہ کی محبت سے عبارت ہیں، اس ذکر کے وسیلے سے ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ کاغذ کے بنڈلوں سے مراتب اور طبقات انسانی کی جانب اشارہ ہے۔ علم ذکر اور ہے اور اصل ذکر اور ہے۔ ذکر لسانی تو ذکر قالب، ذکر تخیل اور ذکر نفس ہے، جس میں ذاکر کا علم کہ میں ذکر کر رہا ہوں، مذکور پر غالب رہتا ہے۔ حق کا ظہور اگر اس درجے تک ہو جائے کہ ذاکر کے حق میں اپنا اور مذکور کا علم مساوی ہو جائے تو وہ ذکر قلب ہے۔ اگر ظہور حق اس طرح ہو کہ علم پر غالب آ جائے تو ذکر روح ہے۔ اور اگر ظہور حق اس درجہ ہو جائے کہ علم بالکل جاتا رہے تو ذکر سرّ ہے۔ جب ظہور بھی نہ رہے تو وہ ذکر خفی ہے۔ یہ علم کہ ظہور کا ختم ہو جانا ہی اصل حضور حق ہے۔ جب اس کا بھی علم نہ رہے تو یہ ذکر اخفی ہے۔ یہی کمال کی انتہا ہے، اور نہایتِ فضل اور حضور حقیقی اسی مقام میں ہے جس کا نام بقا باللہ سبحانہ ہے۔ ملکوت کا ظہور اور اس مرتبے کی تحقیقات اسی طرح مرتبۂ جبروت، جو کہ صفات اللہ کا مرتبہ ہے، کی تحقیق بھی اسی مقام میں ہوتی ہے۔ مجملاً یہ ہے کہ بس حقیقتاً ایک ہی امر ہے، وہی حقیقت نفس۔ جب حضوری پیدا ہو گئی قلب ہو گئی، اس کے بعد وہی حقیقت روح ہے، اس کے بعد وہی سرّ ہے خفی ہے، اخفی ہے، ذات بحت ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ ساتوں لطیفے تفصیلاً افراد انسانی میں موجود ہیں، بلکہ یہ ذکر و حضور کے نام اور مراتب ہیں۔ فافہم۔

کاغذ کے جو بنڈل اور قلمدان (اور جو کچھ اس میں ہے)، آپ نے بھیجے ہیں ان سے معنوی کتابت کے آلات کی حفاظت کی جانب بھی اشارہ ہے اور مداومت اور ہمیشگی کی طرف بھی۔ کیونکہ بغیر محافظت، دوام اور ملازمت کے مراد تک پہنچنا نہیں ہو سکتا۔ کمر بند سے خدمت کے لیے کمر کسنے اور ہمت بلند رکھنے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس راہ میں بھی یہ چیز اصل اور ضروری کا درجہ رکھتی ہے۔ اس راہ میں کمر ہمت و خدمت باندھنی چاہیے۔ ایسی ہمت ہو کہ خود کو غم دائمی کے لیے وقف کر دے۔ تمام مطالب اور تمام مقاصد سے گزر جانا آسان نہیں ہے، بہت دشوار بات ہے۔

دونوں عالم کے آگے خود کو خادم بنانا ہر کسی کی ہمت کا کام نہیں۔ اس معاملے میں ایک ایسے راز کی یافت درکار ہے جو سخت مشکل ہے۔ نہایت عجیب ہے، جس نے وہ خبر پائی کامیاب ہو گیا، اور جسے اس راز کی خبر نہ ہوئی محروم الوصل رہ گیا۔ اسے گفت و گو سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ کم ہمت یہ ہے کہ تمام مخلوقات سے تواضع اور نیازمندی سے معاملہ کریں جیسا کہ بار ہا لکھا گیا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے، اور جن احکام کی پابندی کا حکم آیا ہے مثلاً فرائض، واجبات اور سنن، انھیں ادا کرتا رہے۔ ٹوپی سے کھلا اشارہ کلاہ ارادت کا اوڑھنا ہے۔ جسے یہ کلاہ ملی اسے گویا اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی مصاحبت کی سند مل گئی۔ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ کی کامل محبت نے اسے گھیر لیا ہے اور یہ سعادت اس کے نام ہو گئی ہے جس کو یہ ٹوپی ارسال ہوئی ہے۔ چونکہ یہ آپ کی جانب سے ہے، اس لیے اس حقیر کے حق میں امیدیں تحقق کو پا گئی ہیں۔ زیادہ کیا لکھے۔

برادر عزیز سید کمال! اللہ کرے کہ اس راہ کے طالبان و مشتاقان کی مراد کو پہنچ جائیں۔ آمین، آمین، آمین۔ معلوم ہے اس کام کی اصل کیا ہے؟ اپنا گمان ہے کہ جانتے بھی ہو، اس چیز میں سے تمھیں عنایت بھی کیا ہے، اسے خود میں پاتے بھی ہو اور اس کی مٹھاس تمھارے کام و دہن نے چکھی ہے، لیکن یہ تمنا ہے کہ ایسے ہو جاؤ کہ خود سے بے خود ہو کر اسی چاشنی میں اپنی لذت کو بھلا کر وہ لذت ہی بن جاؤ اور اس لذت کو بھی فراموش کر دو۔ تمام مخلوق کے ساتھ یہ سوچ کر کہ یہ تجلیاتِ الٰہی کی صورتیں ہیں شکستگی اور نیازمندی کو بروئے کار لاؤ۔ یہ بات حد درجہ غامض ہے، کہنے اور لکھنے سے ٹھیک نہیں بیٹھتی بلکہ دل سے تعلق رکھتی ہے۔ بچو! ہزار بار غرور و ناز سے بچو۔ کبھی بھی خود کو نیازمندی سے کنارہ کش نہ کرنا کہ راہ بس یہی ہے۔ اپنے دشمن کے بھی عاشق بنو، پھر دوستوں کے بارے میں کیا کہنا، ہمیشہ اس کا خیال رکھو کہ تم سے کسی بھی شخص کو یا کسی بھی چیز کو کوئی رنج یا آزار نہ پہنچے خواہ انسان ہو یا حیوان ہو یا نبات ہو یا جماد، کہ ہر چیز میں جان ہے اور بحق حاضر ہے۔ ہاں، ہاں، عوام الناس میں جس طرح حضور متحقق ہے غفلت بھی متحقق ہے، اور یہ دونوں ایک ہی ذات میں متحقق ہیں، مگر حضور اصلی ہے اور غفلت عارضی ہے۔ تمھاری نظر کا مقصد ہر وہ چیز ہونی چاہیے جو اصلی ہے۔ یہ مادر علم وحدت الوجود سے تمسک کیے بغیر انبیا اور اولیا کے علوم قطعیہ یقینیہ سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے اور تمھیں چاہیے کہ وحدت الوجود کی

جانب رجوع کریں کہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے اس سے بہرہ ور رہیں۔ کیا خیال ہے تمھارا کیا وہ موجود نہیں ہے؟ حاشا وکلا عقل و نقل اس کے وجود پر اتفاق رکھتے ہیں۔ ہاں غلط بین عوام اس کے معنیٰ سے غافل ہیں، اس میں بھی ایک راز ہے جس سے ہر عارف آگاہ ہوتا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ تمھیں بھی کشف ہو جائے۔ اور کیا لکھوں، سب سے زیادہ فرائض، واجبات اور سنن مؤکدہ کا بجالانا ہے۔ حضرت شاہ عبدالباقی قدس سرہٗ کے خلفاء کی سنت ہمیشہ نیازمندی رہی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ ان دونوں امر میں مستقیم رہو گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔۔۔۔۔۔۔ برادر سید کمال اپنے مخلص کا سلام و تحیہ قبول فرمائیں اور اس کو اپنی دعاؤں کا امیدوار سمجھیں۔ اپنی عنایت اور توجہ کو اس فقیر کے لیے دونوں جہان کی سعادت سمجھیں۔ اُس بارگاہ کی جانب ہر صورت میں متوجہ رہنا چاہیے، نہ جانے کب اس کے لطف کا ظہور ہو جائے اور ہمیں ہم سے چھین لے اور خود آگاہ بنا دے۔ جو کچھ ہے یا تو اس ذات کا غیر ہے یا اس کا عین ہے۔ عالم جو اس کی ذات کا غیر ہے چاہیے کہ نظر سے محو ہو جائے۔ وہ اس طرح سمجھے کہ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اس شخص سے کٹنا بھی آسان نہیں جو اس ذات کا عین ہو۔ اس شخص کا نفس بھی اس کا حقیقتاً غیر ہی ہے، اس سے بھی محبت توڑ دینی چاہیے۔ باقی رہی روح کہ جسے "میں" کہتے ہیں وہ نہ تو تن ہے نہ صورت ہے۔ طالب کو اس کی جانب متوجہ رہنا چاہیے اور یہ سمجھے کہ آفتاب ذات کا پرتو ہے، اس کی نہ جہت ہے نہ جسم نہ صورت۔ اس کی جانب اگر کچھ زمانے اس طرح توجہ رہے تو یقین کے ساتھ سمجھے کہ یہ قطرہ ایک دن دریا میں محو ہو جائے گا۔ اس وقت جانیے گا کہ علاوہ ایک حقیقت کے کسی کا ہونا متحقق نہیں۔ اس کا جو ظہور ان جسموں میں دکھائی دیتا ہے نہایت ہی اَلطف ہے۔ اے برادر! ایک ہی روح ہے، قدس نے تمام اجسام میں استعداد کے بقدر ظہور کیا ہے جیسے کہ آفتاب روشن دانوں میں اور سوراخوں میں سوراخ کے مطابق ظہور کرتا ہے اور وہ روح عقل کل ہے، روح اعظم ہے وہی خلیفۂ حق ہے۔ روح محمدی بھی وہی روح اعظم ہے، وہ جان ہے اور تمام عالم اس کا بدن ہے، اور اس کا سایہ ہے کہ وہ سب میں ظہور کیے ہوئے ہے۔ وہ ازل سے ابد تک خلیفہ ہے قطب الاقطاب ہے۔ وہ روح ہرگز نہیں مرتی، حق کی مظہر اتم ہے، وہ حقیقتاً غیر حق نہیں ہے، بس اسی قدر فرق ہے کہ اسے تعین لاحق ہو گیا ہے، اور سارے موجودات جو کہ غیر نظر

آتے ہیں حقیقت میں اس کے غیر نہیں ہیں، بلکہ تعینات میں جو روح کو لاحق ہوگئے ہیں بس حقیقت میں ایک ہی ذات ہے جو کہ تعینات کے ساتھ موجودات بن گئی ہے۔ اس پر نظر کرتے ہوئے طالب مبتدی کے لیے، کیونکہ وہ اس کے قریب تر ہے، بہتر یہ ہے کہ اپنی روح کی طرف متوجہ ہو، تا کہ روحانیت کے پردے میں اسے ربوبیت نظر آجائے۔ عالم اجسام میں قطع نظر کرنی چاہیے، حالانکہ اس شخص کی دید میں اس کا عالم جسم بھی داخل ہے، اس راز میں اور کیا زیادہ عرض کروں۔ ہمیشہ اپنی روحانیت کی طرف متوجہ رہنا چاہیے تا کہ لطافت روح اور اس کا بھید ظہور کرے۔ مگر اس توجہ میں بندگی کو جو کہ اس تعین کے لوازم میں سے ہے، ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے (ورنہ الحاد وزندقہ میں جا گرے گا)۔

مجملاً کچھ اپنے احوال تحریر کرتا ہوں۔ بندے کا حال وہی ہے جو آپ کے علم میں ہے، بلکہ اس سے بھی ابتر اور ضائع تر ہے ہر لحظہ یہ مشہور شعر دل میں آتا ہے:

نہ کارے آخرت کردم نہ دنیا   یکے بے سایہ نخل بے بر ہستم [1]

بندے کا آخری حال فنائے ہستی ہے۔ سیادۃ الوجہ فی الدارین (دارین میں سرخ روئی) جس کا شعار ہے۔ اس عالی مقام میں نہ طلب دنیا ہے نہ آخرت۔ اسی طرح بندے کا ابتدائی حال ہوتا ہے کہ ابتدائے کار درویشی میں نہ دنیا سے غرض ہوتی ہے نہ آخرت کی چاہت ہوتی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔ غور کریں کہ قول وکلام چاہے کتنا ہی بلند اور صاف ہو، حال محض اور معنائے خالص کو نہیں پہنچ سکتا۔ جو لذّت خاموشی میں پائی جاتی ہے کسی انجمن میں نظر نہیں آتی۔ ہاں سخن معرفت کی انجمن، جہاں کثرت میں وحدت کا مشاہدہ ہوتا ہو، سخت مطلوب ہے، مگر آج کے اس دور میں ایسی محافل بہت نایاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمھیں اور ہمیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اصحاب اور ان کی آل کی حرمت کے طفیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اخوی، اعزی، اکری اخی سید کمال احقر کو اپنا مشتاق دیدار جانیں، اور اس شوق دیدار کو اپنے اس مخلص خیر خواہ کے باطن سے بے آب مچھلی کی مانند جدا خیال نہ کریں، گویا کہ یہ اشتیاق اس اشتیاق کا عکس ہے جو ہر موجود کو اپنی حقیقت سے ثابت وواقع ہے۔ دونوں جانب کے اشتیاق کا جو فرق

---

1 میں نے نہ تو آخرت کا کوئی کام کیا اور نہ دنیا کا۔ ایک بے سایہ و بے ثمر کا درخت ہوں۔

اور غیریت خیال کی جاتی ہے، اس کی وجہ دید و دریافت کی کدورت ہے، ورنہ جب دید و دریافت صفایاب ہو جاتی ہیں اور رنگارنگ جہالتوں سے طہارت نصیب ہو جاتی ہے تو جو حقیقت ہے وہ پردۂ مجاز میں بھی بے پردہ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ معرفت ان ساری صفات اور شانوں میں، جنھوں نے علو مرتبہ اور آزادگی کی بلندی سے ذُلِّ بندگی کی پستی میں نازل ہو کر دوسری صورت اختیار کر لی ہے اور مجازی نیاز اور مظہر ذات و صفات بن گئی ہیں، جاری ہے۔ وہی نازل شدہ صفاتیں اور شانیں یہاں عالم تعین میں ذات بندہ بن گئی ہیں۔ خوب غور کرو کیونکہ یہ معرفت نہایت دقیق ہے۔

وہ کمال جو کہ فطرت انسانی کا مقصود ہے، اور جو اس کی خلقت سے مقصد حق ہے تمھیں میسر اور محصل ہو۔ غرض یہ ہے کہ كُنْتُ كَنزاً مَخفِياً فاحبَبتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الخَلْقَةَ [1] کے قابل ہو جاؤ۔ فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ سے تجلّیِ اوّل اور ظہور اوّل کی طرف اشارہ ہے کہ اس کو وحدت الوجود، نفس الرحمٰن، برزخ کبریٰ، اور تجلّیِ ذاتی وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ فَخَلَقْتُ الخَلْقَةَ سے اشارہ صور علمیہ کی طرف ہے جو فیض اقدس سے پیدا ہیں۔ اس مرتبۂ صور علمیہ کو احدیت، حقیقت امکانیہ، برزخ ثانیہ وغیرہ اعتبارات مختلفہ کے اعتبار سے کہتے ہیں، كَنزاً مَخفِياً سے حقیقت انسانیہ اصلیہ کی جانب اشارہ ہے۔ فافہم۔

برادر باجان برابر سید کمال! اللہ کی یاد میں لگے رہیں۔ فقیر کو اپنی عنایات توجہات کا امیدوار جانیں۔ توجہ فرمائیں کہ باطن غیب الغیب میں گرفتار رہے کہ اس مقام میں اسم و صفت کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہاں تعین اور ظہور کا کوئی نام و نشان نہیں، لیکن ظاہر اس کے اسما و صفات کے مراتب سے محفوظ رہے، اسے باہمہ جانے اور بے ہمہ دیکھیں۔ سب کچھ وہی ہے اور سب سے منزہ ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ درجۂ کمال تشبیہ اور تنزیہ کے جمع کرنے میں ہے۔

احقر فقیر احمد عبداللہ کی جانب سے سیدنا و مولانا سید کمال وَصَلَهُ اللهُ اِلىٰ دَرَجَةٍ يجمل الرجال (اللہ انہیں ایسے درجے سے ملادے جو رجال اللہ کو صاحب جمال بناتا ہے)

اے برادر، پختہ عزم کرو اور کوشش دکھاؤ کہ جس کا نام ماسوا ہے اس سے اعراض کلی میسّر ہو جائے اور کلی طور پر حضرتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف اِقبال اور توجہ نصیب ہو۔ بندہ جس بات کو جسبی اپنے حق

---

1 میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا تو میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

میں چاہتا ہے۔آں برادر کے حق میں وہی چاہتا ہے۔ پتانہیں یہ مراد کب نصیب ہوگی۔الٰہی اپنے حبیب ﷺ کی حرمت کے طفیل جلد سے جلد عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

سیدی سید کمال پیوستہ یاداللہ میں رہیں

ذکر گو، ذکر تا ترا جان است　　پاکیٔ دل ز ذکر رحمان است [1]

یہاں دل اور جان شئے واحد ہے اگر بعض استعارات کی وجہ سے فرق بھی ہوتا ہے۔کیونکہ دل قلب کا ترجمہ ہے اور جان روح کا ترجمہ ہے۔لطیفۂ قلبی اور ہے اور لطیفۂ روحی اور کیفیت قلب روح کے مراتب تنزیلیہ میں سے ایک ہے۔اسی طرح سر، خفی، اخفی روح کے مراتب ترقی یافتہ ہیں'' تا ترا جان است'' (جب تک تجھ میں جان ہے) سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ذکر اسی وقت تک ہے جب تک ہستی باقی ہے۔ہستی کے فنا ہونے کے بعد ذکر نہیں اس کے بعد اگر ذکر ہے تو وہ لَا یَذکر الله اِلّا الله (اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر اللہ) کی تصدیق ہے۔اسی طرح کمال کی تمام نسبتیں جیسا کہ مشہور ہے معرفت ہے اس مقام فنا میں بندے کے سارے کے سارے اوصاف اور افعال حق تعالٰی کی طرف راجع ہیں۔وَاعْبُدْ حَتّٰی یَاتِیکَ الْیَقِین (عبادت کر یہاں تک کہ تجھے موت آجائے) اسی معنٰی پر نظر ہے کہ یہاں عابد و معبود ایک ہیں یہ بات نہیں ہے وصول الی اللہ کے بعد تکلیف عبادت ساقط ہوگئی۔یہ تو دین سے اتحاد ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔

فالحمد لله رب العالمين و الصلوة و السلام على خير خلقه محمد و آله و صحبه اجمعين . ظاہر کو امور شرعیہ سے آراستہ رکھنا اور باطن کو نسبت نقشبندیہ سے پیراراستہ کرنا تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے۔نسبت نقشبندیہ کی حقیقت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جو کچھ بھی ماسوا سے موسوم ہے اس کے دیکھنے سے،اور جو کچھ بھی حضرت ذات اقدس اس کے اسماوصفات کی نسبت شائبہ غیرت پیدا ہوتا ہے اس سے نظرِ دل کو ہٹا کر اپنی توجہ کو ذات مقدس اور منزہ سے متصل کردیں۔اگر نظر کو تنزل واقع ہو تو مرتبۂ شہود وحدت الوجود یا بمقام محبت و عشق میں نزول کرے زیادہ کیا لکھو۔و السلام على النبى و آله.

1　جب تک تیری جان میں جان ہے ذکر کرتا رہ، کیونکہ دل کی پاکی ذکر رحمٰن سے ہے۔

میرے بھائی میری جان اور میری زندگی سید کمال عنایت الٰہی سے محفوظ اور محظوظ رہیں۔ **الحمد لله ثم الحمد لله** کہ آج وحدت الوجود کا بازار گرم ہے۔ خاص وعام کی زبان پر جانے انجانے سمجھے نا سمجھے، ارادتاً اور بے ارادہ مختلف زبانوں اور مختلف لغات میں اسرارِ حقیقت منصۂ ظہور پر جلوہ گری کر رہے ہیں۔ کیونکہ حقیقت کا سورج مشرق خلق وصورت سے قریب الوقوع ہے لامحالہ افق پر کثرت سے طوعاً، عرضاً انوارِ وحدت دکھائی دے رہے ہیں۔ آج کل چند رباعیاں ان کی شرح کے ساتھ لکھی گئی ہیں بندے کے پاس بس یہی ایک نسخہ تھا اسے آپ یارِ جانی اور رفیقِ جاودانی کی خدمت میں بھیج دیا ہے اس کی نقل لے کر نسخے کو واپس بھیج دیں۔

مراقبے کی حقیقت مراقبہ، انتظارِ شدید ہے۔ اس انتظارِ شدید کے اظہار کے بعد مقصد لمحے بھر میں میسّر ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ لطفِ حق رونمائی کرے اور مراد کے چہرے کا نقاب الٹ دے۔

برادر با جان برابر سید کمال یادِ حق سے اس طرح پیوستہ رہیں کہ اس سے بالاتر کوئی یاد نہ ہو۔ معلوم شریف ہے کہ یادِ الٰہی بہت سے مراتب رکھتی ہے۔ یادداشت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ حق کو اس طرح یاد کریں جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہے وہ صورت خود معلوم ہے کہ وہ ذات جمیع صفات وتعینات سے منزّہ بھی ہے اور جمیع صفات اور تعینات کے ساتھ ظاہر بھی ہے، بلکہ تمام اعتبارات سے چاہے وہ تشبیہ کے اعتبار سے ہو چاہے اطلاق کے اعتبار سے ہو چاہے تنزیہ کے اعتبار سے پاک ہے۔ یہ حقیقت کلیہ صوفیہ کی اصطلاح میں احدیت اور لاتعینی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ طریقۂ شریفۂ عُلیہ نقشبندیہ کے سالکان کی نظروں کا نظارہ یہ مرتبہ ہے۔ اور یہ جو میں نے کہا کہ اس صورت پر یاد کریں اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ صورت ملحوظ رہے، مراد یہ ہے کہ وہ ذات درحقیقت ذات بحت ہے کہ کثرت عالم کون بلکہ کثرت صفات کا بھی وہاں نام ونشان نہیں۔ جب یہ دید دوام پذیر ہو جاتی ہے تو سالک نہایت النہایت کو پہنچ جاتا ہے۔ تمام منتہیوں کی انتہا یہی ہے۔ اس مقام میں صرف توحید کی باتیں کرنا بیکار اور بے فائدہ چیز ہے۔

صاحبِ من میر سید ہمیشہ یادِ حق میں رہیں۔ حضرت قبلہ گاہی، ولایت دستگاہی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ شریعت کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے۔ طریقت اور حقیقت، حقیقتِ شریعت کی تحصیل کے لیے ہیں تاکہ مرتبۂ تکمیل جو کہ مقام نبوّت کا ایک پرتو ہے میسر

ہو جائے۔ الحق کس قدر زیبا فرمایا ہے، یہ معنیٰ ہر کسی کی فہم کے لائق نہیں ہیں بلکہ عنایات رب اور فضل الٰہی سے یہ بندے کی استعداد میں مقامات انبیاء سے مناسبت رکھی گئی ہے۔ اسی وجہ سے شریعت، طریقت اور حقیقت کی صورتوں میں سے کوئی بھی صورت ہو اس کا ادراک کر سکتا ہے۔

بزرگوں کی اس جماعت کے معارف جو کہ کاملین کے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں اور اپنی ذاتی مناسبت استعداد کی وجہ سے ظلاً قرن اوّل، جو کہ صحابہ کے زمانے کے بزرگوں کے زمرے میں داخل ہیں، علوم شرعیہ کے سوا اور کیا ہوں گے۔ اس جماعت کے حق میں اسرار صوفیہ فقہا کے مسائل شرعیہ کی حقیقت بن گئے۔ کسی بشر کے حق میں اس سے بالاتر کسی مقام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ جماعت ہے جو شیخ اکبر، کبریت احمر، شیخ اکمل، قدوۂ اکمل امام الائمہ، ہادی الامۃ، ابوعبداللہ محی الدین بن محمد علی العربی الہاشمی الطائی الاندلسی قدس سرہٗ کی اصطلاح میں ''ملامتیہ'' سے موسوم ہیں۔

اس مقام کے سردار حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لمبی چوڑی گفتگو کا مطلب اس کے سوا نہیں ہے کہ راہ سلوک کے تمام مرتبوں میں ہر حال میں شریعت پر نظر رکھنی چاہیے، اس کی حقیقت کو طلب کرتے رہنا چاہیے اور اس بات پر اعتقاد محکم رکھنا چاہیے۔ فقیر نے کسی جگہ لکھا ہے کہ منشا شریعت مقام عبدیت ہے جو کہ مقام احدیت سے بالاتر مقام ہے۔ اس مقام پر ہی اہل کمال کی اقربیت کی حقیقت مکشوف ہوتی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب وحدت، اتحاد اور غَیبت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہیں اور پھر اس سے آگے بڑھتی ہیں تو دوئی کا ظہور ہوتا ہے جو مصدر شریعت بنتی ہے۔ سبحانہٗ سبحانہٗ مِنْ اَنْ یُدْرِکَ حَقَائِقَ ذَاتِہٖ اَحَدٌ، فَھُوَ الْعَالِمُ بِذَاتِہٖ وَصِفَاتِہٖ [1] بندہ زیادہ کیا عرض کرے کہ اس بات کی کوئی انتہا ہے ہی نہیں، اس سے زیادہ عذر بالفعل اور کیا ہوگا۔

یہاں تک میرے شیخ (خواجہ عبداللہ خرد) کی تحریریں مکمل ہوئیں۔

واضح ہو کہ میرے شیخ نے ان تحریروں کے علاوہ جو گزری اس راہ کی نہایت دقیق اور غامض دیگر باتیں اور بھی کہی ہیں اور لکھی بھی ہیں جو ایک علاحدہ کتاب میں آنی درست لگتی ہیں۔ ان میں سے اکثر میں نے (اپنی) کتاب ''جمع الجمع'' میں لکھ دی ہیں، اس جگہ تبرکاً اور تیمناً اتنی ہی کافی ہیں۔

---

1 پاک ہے پاک ہے وہ اس بات سے کہ کوئی اس کی ذات وصفات کا ادراک کر سکے وہ اپنی ذات و صفات کا خود ہی جاننے والا ہے۔

میں نے اپنے شیخ سے سوال و جواب بھی کیے ہیں جو اس راہ درویشی سے متعلق ہیں۔

سوال۔ حضرت صاحب دو جہانی سلامت۔ بندہ مجمل طور پر اپنے احوال خدمت اقدس میں عرض کرتا ہے۔ عنایت اور بندی پروری فرما کر اس کو جواب سے سرفراز فرمائیں تا کہ اس کام کی حقیقت اور ان احوال کے اسرار منصۂ ظہور پر آئیں۔ وہ احوال یہ ہیں کہ بندہ آجکل توحید صرف کے معنٰی کو اشیا ظاہرہ کے لباس میں بلا کسی تعین اور تقید کے پاتا ہے، خود کو بھی ان اشیا میں سے ایک دیکھتا ہے، اس حال کے غلبے اور استیلا سے خود کو بھول جاتا ہے، بس اسی کو دیکھتا ہے کہ یہ سب چیزیں وہ ہی ہیں۔ اسی نے ان مظاہر میں حسن رنگ اور حسن لباس کو پسند فرمایا اور ظہور کیا ہے۔ اس وقت تمام اعمال جن کا مکلف انسان کو بنایا گیا ہے آسان ہو گئے ہیں، اور کسی تکلف کے بغیر گویا خود بخود سرزد ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جہاں نیاز برتے اور جہاں چاہے ناز کرے۔ پس اعمال کے وجود و عدم سے کوئی غم نہیں ہے۔ باوجود اس حال کے اعمال ظاہرہ پر عمل ہاتھ سے نہیں جاتا۔ اسی طرح ذکر باطن میں دیکھتا ہے کہ جب چاہتا ہے خود بخود ہونے لگتا ہے، اور جب بندہ نہیں چاہتا اختیار نہیں کرتا۔ اسی طرح بہت سے برے اعمال بلکہ کبیرہ گناہ تک نظر میں آتے ہیں کہ اگر چاہے گا خود بخود ہو جائیں گے اور اگر نہ چاہے گا نہ ہوں گے، اور ان میں سے کوئی ایک بھی ظہور میں نہیں آئے گا۔ لیکن جو لذت حسین عورتوں خاص کر عورتوں کی صورت میں پاتا ہے دوسرے مظاہر میں نہیں پاتا۔ نامحرم کے حسن پر بھی یہ سوچ کر نظر پڑ جاتی ہے کہ اس میں اس ذات کی صفت حسن پنہاں ہے، محظوظ ہوتا ہے۔ مگر اور کوئی ایسا عمل بد جو کہ داخل معصیت ہو وجود میں نہیں آتا۔ اگر خدا نہ خواستہ وجود میں آ بھی جائے تو کچھ غم نہ ہوگا۔ اسی طرح جو اوراد و وظائف خود پر لازم کر لیے ہیں ان کی ادائیگی میں کوئی تکلیف نہیں رہی ہے۔ یہی حال ظاہری اور باطنی ادب کا ہے کہ آں صاحب دو جہانی کی نسبت ادب ظاہری و باطنی کا یہ حال ہے کہ کبھی بھی اس سمت کو جدھر آں صاحب ہیں پیر دراز نہیں کرتا، آب دہن، پیشاب، پاخانہ وغیرہ کچھ نہیں کرتا اور دوسرے آداب بھی جو تکلف کے ساتھ ظہور میں آتے ہیں بے تکلف ہوتے ہیں۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ جب چاہے گا ظہور ناقص کو جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بروئے کار لے آئے گا۔ خواجہ ابوالوفا خوارزمی کی رباعی حسب موقع مناسب معلوم ہوتی ہے:

چون بعض ظہورات حق آمد باطل پس منکر باطل نشود جز جاہل
در کل وجود ہر کہ جز حق بیند بازمزمہ حق الحقائق غافل [1]

ابھی جس کا ذکر ہوا جمیع موجودات کائنات جو کہ اللہ کی صفات کی مظہر ہے، یہ ناقص ظہور، ظہور کامل جو کہ سب سے الطف اور اکمل ہے، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہے کی جانب نیازمندی کے ساتھ رجوع رہتا ہے۔ اس قسم کے خیالات میں اعلیٰ کمالات اور مقامات بلند کی طلب سے جو کہ کبریائی کی صفت کا عکس ہے، فارغ رہتا ہے۔ بس ایک اسی کی ذات کی طلب ہے، مگر صفت طلب میں بھی سستی آ گئی ہے۔ حالانکہ صفت طلب اس کے ظہورات میں سے ظہور محبت الٰہی ہے، جو کم نہیں ہونی چاہیے۔

در راہ حق جملہ ادب باید بود تاجان باقیست در طلب باید بود
در یکدم اگر ہزار در یاپکشی طلب کم نباید در طلب باید بود [2]

اس قصور طلب کے ہوتے کمالات تک نہ پہنچنے کا کوئی غم نہیں ہے۔ اسی طرح بہت سی اور بھی چیزیں کشف ہوتی ہیں۔ بندہ سوچتا ہے کہ آں صاحب دو جہانی جو کہ اللہ سبحانہٗ کے ظہورات خاصہ میں سے ہیں سب چیزوں کی حقیقت و اصلیت جانتے ہیں۔ بات مختصر قصہ ختم، جواب عنایت فرمائیے۔

جواب۔ الحمد للہ والمنۃ کہ جو کہ عزیز الوجود یگانۂ روزگار نے لکھا ہے، حقیقت، معرفت توحید ہے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ۔۔۔۔۔ اے بھائی! عارف تمام نیک کام کرتا ہے، مگر خود کو اس کا کرنے والا نہیں سمجھتا۔ اسی طرح ہر برے کام سے دور رہتا ہے، مگر خود کو مجتنب نہیں سمجھتا۔ سب سے گھلا ملا رہتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے دل کو ان سے کوئی دلی تعلق ہو، وہ سب کے ساتھ ہو کر بھی سب سے جدا رہتا ہے۔ سب کا عین خدا کو جانتا ہے اور سب میں اسے دیکھتا ہے، بنا اس کے کہ کسی ایک کو بھی خدا

---

1 چونکہ حق کے بعض مظہر باطل ہوتے ہیں، اس لیے ہر عارف اس کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ ہر مظہر میں جو شخص حق کو نہ پہچانے وہ حقیقت الحقائق کی ذات سے غافل ہے۔

2 راہ حق میں سراپا طلب بن جانا چاہیے۔ جب تک جان میں جان ہے طلب میں سرگرم رہنا چاہیے۔ اگر ایک سانس میں ہزاروں دریا بھی پی جائے تب بھی طلب کم نہ ہو، طلب رہنی چاہیے۔

کہے، اور خدا کو ان سب میں اس طرح پاتا ہے کہ دوئی درمیان سے اُٹھ جاتی ہے۔ ہر عارف کا تمام مشربوں سے جدا اپنا ایک خاص مشرب ہوتا ہے، بغیر اس کے کہ کسی کے مشرب کو بھی اپنے طریقے سے جدا سمجھے۔ وہ تمام مشربوں کو اختیار کرتا ہے بغیر اس کے کہ کسی شخص کے مشرب سے آلودہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو چاہتا ہے بغیر اس کے کہ بے چین اور دردمند ہو۔ کبھی خدا سے غافل بھی ہو جاتا ہے بغیر اس کے کہ اس غفلت کو حضوری کا غیر سمجھے۔ عین غفلت میں حاضر ہوتا ہے اور عین حضور میں غافل۔ عورتوں کے حسن میں عارف شہودِ حسن و جمال مطلق اور مظاہر سے زیادہ ہوتا ہے، یہ بات پیغمبر اکمل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حال اور طریقے میں اتباع کی وجہ سے ہوتی ہے۔ عارف تمام شیووں اور تمام کاموں سے بغیر ناز کیے لذّت یاب ہوتا ہے۔ وہ تو درد والم میں مزہ محسوس کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو عیش و آرام سے زیادہ رنج والم سے لذّت حاصل کرتا ہے۔ عارف حق بھی ہے مخلوق بھی وہ خدا کو بندہ اور بندے کو خدا پاتا ہے۔ نہ اسے بندے سے غرض نہ خدائی سے واسطہ، کیونکہ حقیقت خدائی اور بندگی سے وراء الوراء ہے۔ اگر آپ کسی عارف باللہ سے معلوم کریں کہ تو کچھ جانتا ہے، کچھ پاتا ہے تو وہ فوراً کہے گا "میں نہ کچھ جانتا ہوں نہ کچھ پاتا ہوں"۔ اور اگر تو اس سے کہے کہ کوئی چیز ایسی ہے جسے تو جانتا ہو یا کوئی چیز ایسی ہے جو تیرے پاس نہ ہو تو وہ کہے گا "کچھ بھی نہیں"۔ (اس کے نزدیک جو موجود ہے وہ عدم ہے اور جو معدوم ہے موجود ہے)۔ عارف سب کچھ رکھتا ہے اور کچھ بھی نہیں رکھتا۔ عارف کا معاملہ ضد در ضد، حیرت در حیرت ہے۔ اس پر وہ اپنے کام کے ضد در ضد اور حیرت در حیرت سے کوئی فکر اور اندیشہ نہیں رکھتا۔ وہ خود بخود ہے اور خود از خود ہے، خود سوئے خود ہے کسی کا اختیار درمیان نہیں ہے۔ عالم میں جو کچھ واقع ہوتا ہے عارف کی پسند ہے نہ کہ اس کی ناپسند۔ نہ تو واقعہ عارف کا مقصود ہے اور نہ اس کا رد کیا ہوا۔ عارف علاوہ نام عارف کے اس سے زیادہ کچھ نہیں بلکہ عین معروف ہے۔ معروف علاوہ نام کے کچھ بھی نہیں عین عارف ہے، بلکہ عارف و معروف حیرت ہی حیرت ہے۔ کہاں معرفت کون سی حیرت، دونوں عارف کی ذات میں گم ہیں۔ عارف سے علاوہ "عین" "الف" "فا" کے کچھ معلوم نہیں، باقی سب وہی ذات کہ جو معلوم بھی ہے مجہول بھی ہے۔ نہ معلوم ہے نہ مجہول بھی۔ کیونکہ عارف نفع و نقصان کے حساب سے باہر نکل آیا ہے، اس لیے اس کی نظر میں دنیا اور آخرت یکساں ہیں۔

بہشت اور دوزخ ایک ہے۔ اس وقت اجمالاً کہا گیا، کیونکہ یہ وقت تفصیل کی گنجائش نہیں رکھتا۔
مجمل یہ ہے کہ خدا کو بغیر کسی غرض اور کسی مطلب کے یاد کریں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جو شریعت
میں ممنوع ہے، اس حال میں کہ شریعت کی طرف سے کوئی تنگی یا نفرت اپنے آپ میں پائیں۔
صفات حمیدہ اور حسنہ کو اختیار کریں، بغیر اس کے کہ علاوہ اطاعت کے کوئی دوسری غرض یا تعلق
رکھتے ہوں۔ جو بھی تقاضائے وقت ہو، اسی حال کو اختیار کریں، بغیر اس کے کہ کسی غیر کا دل میں
گزر یا اس سے تعلق خاطر ہو۔ شرعی لذتوں سے بہرہ ور ہوں، بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی
غفلت ہو، اور بغیر اس کے کہ کوئی دعوائے معرفت ہو یا ادعائے شہود، نہ حضوری ہو نہ غفلت، نہ بندگی
ہو نہ خدائی، نہ ہستی ہو نہ نیستی۔ (سب رنگوں میں رہتے بے رنگ ہو)۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی اتباع کو لازم جانو، مگر اس طرح کہ محمد کو حق کا غیر نہ سمجھو، اور حق کو صرف محمد میں منحصر نہ سمجھو۔
محمد حق ہیں اور حق محمد ہیں، محمد عالم ہیں اور عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!
آپ عالم بھی ہیں، حق بھی ہیں۔ حق آپ ہی ہیں مگر اس کے باوجود حق حق ہے اور محمد محمد صلی اللہ علیہ
وسلم ہیں۔ سارے کمالوں کا کمال یہ ہے۔ اللہ ہی حقیقت حال کا جاننے والا ہے، بلکہ وہ خود ہی
حقیقت حال ہے۔ فقط والسلام۔

کتاب ''اسراریہ''، جس کا مقصود اللہ تبارک وتعالیٰ کے دوستوں کے احوال اور مقامات کی شرح تھی،
اللہ کے وہ دوست جنہوں نے صدق کے قدموں سے راہ وصول الی اللہ کی تکمیل کر لی ہے، اور سیر فی
اللہ میں کعبۂ مقصود تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ عالم کے وجود کی ایجاد کا مقصد اور حکمت ان
حضرات کی شان شہود حق اور نور حق کا بنی آدم کے سامنے اظہار کرنا ہے۔

رباعی

این نسخہ ذکر اہل دلہاے کرام　　کز وے ہمہ بوے انس آید مشام
زان بوی رسید بادۂ مقصود بکام　　در سال ہزار و شصت و نہ گشت تمام[1]

1069ھ (کمال)

1　اہل دل حضرات کے ذکر میں یہ ایک نسخہ ہے جس سے بوئے انس الٰہی دل و دماغ تک آتی ہے، پھر اس خوشبوئے محبت سے شراب مقصد حلک تک پہنچ جاتی ہے یعنی مقصد وصل حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا اتمام 1069ھ/1659 میں ہوا۔

اِشاریہ

رجال، اماکن، کتب

رجال

الف

ش

ظ

ع

اماکن

پ

ٹ ت

ج

چ

ح

ش

ص ط ظ

ع

غ

ف

ق

ک

کتب

اسرار یہ کشف صوفیہ عہد شاہجہانی میں لکھا گیا صوفیہ، علما وشعرا کا ایک نادر تذکرہ ہے۔ اس میں معروف صوفیہ، علما اور شعرا کے حالات بڑی تحقیق وتلاش کے بعد جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے مؤلف امروہہ کے معروف بزرگ حضرت شاہ شرف الدین حسن معروف بہ شاہ ولایت کے نوے پوتے شاہ محمد کمال سنبھلی واسطی ہیں۔ جن کا شمار عہد جہانگیری وشاہجہانی کے قادرالکلام فارسی وہندی شعرا میں ہوتا ہے۔ شاہ محمد کمال سنبھلی واسطی کی اسرار یہ کشف صوفیہ کے علاوہ بھی پانچ تصانیف کا تذکرہ ملتا ہے جو ہندی وفارسی نظم ونثر میں تصوف پر لکھی گئیں مگر وہ تصانیف نایاب ہیں۔ اسرار یہ کشف صوفیہ کو ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے 2013 میں رضا لائبریری رام پور سے شائع کیا تھا اس کے بعد انھوں نے اس کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا اور اس میں مفید وکارآمد حواشی کا بھی اضافہ کیا۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی کی تقریباً 13 کتابیں فارسی و اردو میں شائع ہوچکی ہیں جن میں تذکرۂ علمائے امروہہ، شعرائے امروہہ، امروہہ کے ہندو شعرا اور شعرائے رام پور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025